

ڈاکٹر پرمیقل قادرون

ظہیر الدین بابرؒ



ڈاکٹر پرمیقل قادر روف

طہیر الدین بابر

(ایک تاریخی ناول)

رکتاب پبلی کیشنز
پوسٹ بکس ۳۴۱۳، کراچی
۱۰۹۔ بمبئی ہوٹل، آئی۔ آئی۔ چندریگر روڈ۔ کراچی

© کاپی رائٹ بحق ناشر محفوظ

اشاعت اول	جنوری 1997ء
سرورق	عالیہ نثار
کمپوزنگ	فوکس کمپوزنگ سینٹر
مطبع	احباب پرنٹرز کراچی
قیمت	=/300 روپے
ناشر	نثار حسین
	رکتاب پبلی کیشنز
	پوسٹ بکس نمبر 3413، کراچی

ترتیب

۵	کچھ اس ناول کے بارے میں	شوکت صدیقی
	پہلا حصہ - چشمہ خوابیدہ	
۹	قوا	
۲۸	آ خسی	
۳۹	اند جان	
۶۳	قوا	
۷۸	اوش	
۱۱۹	سمرقند	
۱۳۱	اند جان	
۱۷۶	سمرقند	
۲۱۰	دوبارہ سمرقند میں	
۲۳۳	تاشقند اور اتپا اور اسفرہ	
	دوسرا حصہ - گردش فلک	
۲۸۳	ہرات اور مرو	
۳۳۳	قندز.... اور ایک بار پھر سمرقند	
۳۷۲	کابل	
۴۱۲	نئے کنارے - لاہور، پانی پت، دہلی	
۴۳۵	آگرہ	
۴۸۲	فتح پور سیکری	
۵۰۰	ایک بار پھر آگرہ	
۵۱۵	اختتامیہ	



**RAKTAB
PUBLICATIONS**

109' Bombay Hotel,
I. I. Chundrigar Road Karachi.
P.O. Box No. 3413 Karachi 5.

کچھ اس ناول کے بارے میں

تاریخ میں نام و مقام حقیقی ہوتے ہیں باقی بہت کچھ فرضی ہوتا ہے۔ لیکن ناول اور افسانے میں صرف نام و مقام فرضی ہوتے ہیں باقی سب کچھ سچ ہوتا ہے۔ تاریخ کے بارے میں یہ بات شاید معتبر نہ ہو مگر تاریخی ناولوں پر بڑی حد تک صادق آتی ہے۔ ”ظہیر الدین بابر“ بھی تاریخی ناول ہے، لیکن یہ عام تاریخی ناولوں سے اس حیثیت سے مختلف ہے کہ اس میں نام و مقام حقیقی ہیں اور واقعات بھی۔ ”ظہیر الدین بابر“ بلاشبہ ایک اہم اور بڑا ناول ہے اور بڑا ناول گہرے مشاہدے اور وسیع مطالعے کے بغیر نہیں لکھا جاسکتا۔ تاریخی ناول کے لئے تو وسیع مطالعے کے ساتھ ساتھ واقعات کی تحقیق اور چھان پچک بنیادی شرط ہے، پر عقل قادر و ف نے اس ناول کی تصنیف کے عمل میں تاریخ کا بہت وسیع مطالعہ کیا ہے، حالات و واقعات کی دقت طلبی اور باریک بینی سے تحقیق و تدقیق کی ہے اور اس حقیقت کو پیش نظر رکھا ہے، جس کے متعلق کارل مارکس نے کچھ یوں اظہار خیال کیا ہے۔ ”عظیم حکمران، عظیم سپہ سالار، اور عظیم مدبر تاریخ تخلیق نہیں کرتے، وہ صرف اسے آگے بڑھانے اور انقلابی تبدیلیوں کی رفتار تیز کرنے میں معاون و مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ تمام انسانی تاریخ، طبقاتی

جدوجہد کی تاریخ ہے جس میں عوام بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔“

تاریخ کی کتابوں میں ظہیر الدین بابر کے بارے میں عام تاثر یہ پایا جاتا ہے کہ وہ فنون حرب کا ماہر ایک مہم جو فاتح، جاہ پرست حکمران اور سلطنت مغلیہ کا بانی تھا۔ پر عقل قادر و ف نے اس تاثر کو باطل قرار دیتے ہوئے بتایا ہے کہ بابر صرف عظیم فاتح اور حکمران ہی نہیں تھا، وہ دانش و حکمت کا خوشہ چیں، شعر و ادب کا دلدادہ اور علم و فضل کا پرستار تھا۔ اعلیٰ پائے کا شاعر اور صاحب طرز انشا پرداز تھا۔ نثر میں اس کا اسلوب منفرد و نگفتہ تھا جس کا اندازہ اس کی آپ بیتی ”ترک بابری“ سے بخوبی ہوتا ہے۔ ترکی زبانی و ادب میں اسے نمایاں مقام حاصل ہے۔ اس کی شاعری اور منفرد نثر نے ازبیک زبان کی تعمیر و تشکیل میں نہایت اہم کردار ادا کیا ہے وسطی ایشیا، خصوصیت کے ساتھ ازبیکستان میں بابر، بیدار مغز حکمران، پیکر شجاعت اور اولوالعزم فاتح سے زیادہ بلند پایہ شاعر اور دانشور کی حیثیت سے پہچانا جاتا ہے۔ مصنف نے اس ناول میں بابر کی ہمہ صفت زندگی کے ان مخفی گوشوں کو اس طرح اجاگر کیا ہے کہ اس کی پہلو دار شخصیت، ایک مکمل اکائی کی صورت میں ابھر کر سامنے آتی ہے۔

حق بات تو یہ ہے کہ مصنف نے اس ناول کے ذریعے ظہیر الدین بابر کی بازیافت کی ہے۔ اسے ایک نئے روپ میں پیش کیا ہے۔ ایسا روپ جو اب تک نگاہوں سے اوجھل تھا۔ اور یہ حق پر عقل قادر و ف ہی کو پہنچتا ہے۔ ان کا تعلق ازبیکستان سے ہے۔ انہوں نے ان مقامات کا چہ چہ دیکھا ہے جہاں بابر نے آنکھ کھولی، پروان چڑھا، حکمران بنا، ولولہ انگیز پر خطر معرکے سر کئے۔ داد شجاعت دی۔ کبھی فتح و نصرت نے اس کے قدم چومے، کبھی ہزیمت اور پسپائی کا منہ دیکھنا پڑا۔ کبھی عظمت و سطوت اور کبھی صبر آزما دور ابتلا۔ ایسا بے یار و مددگار بے خانماں، خستہ اور شکستہ ہوا کہ سر میں یہ سودا سمایا کہ حکمرانی اور جہاں بانی کو ٹھکرا کر گوشہ نشینی اور درویشی اختیار کی جائے۔ ایسا اضطراب طاری ہوا کہ برہنہ پا اور برہنہ سر پھرتا تھا اسی عالم شینگنی میں ایسی بلند پایہ اور وجد آفریں غزلیں کہیں جو آج بھی ازبیکستان کے آتش ندامتی لبک لبک کر گاتے

ہیں۔ تقریبات اور محفلوں کو طرب انگیز اور وجد آفرین بناتے ہیں۔

ڈاکٹر پر مقل قادروف ازبیک زبان کے معروف افسانہ نگار اور ناول نویس ہیں۔ مستند دانشور ہیں۔ ماہر لسانیات، اور ماہر تعلیم ہیں۔ انہوں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا۔ ان کے افسانوں کے کئی مجموعے اور معرکتہ الاراء ناول شائع ہو کر قبول عام کی سند حاصل کر چکے ہیں۔ وہ ۱۹۳۸ء میں تاشقند میں پیدا ہوئے۔ تاشقند یونیورسٹی کی علوم شرقیہ فیکلٹی سے اپنی تعلیم مکمل کی۔ لسانیات میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ازبیک سائنس اکیڈمی کے ازبیک زبان و ادب کے انسٹی ٹیوٹ سے وابستہ رہے۔

ان کے افسانے، خاکے اور مضامین موقر ادبی رسائل اور اخبارات میں شائع ہوتے ہیں جنہیں ذوق و شوق سے پڑھا جاتا ہے۔ ان کی اولین تصنیف ”طلباء“ ۱۹۵۰ء میں شائع ہوئی۔ ناول ”تین جڑیں“ سے انہیں ایسی شہرت ملی کہ ان کا شمار ازبیک زبان کے صف اول کے اہل قلم میں ہونے لگا۔ ”ظہیر الدین بابر“ کے علاوہ ان کا ایک اور تاریخی ناول ”تاروں بھری راتیں“ بھی بہت مشہور ہے۔ ان کے ناولوں اور افسانوں کا ترجمہ مختلف غیر ملکی زبانوں میں ہو چکا ہے۔

میں نے پہلی بار اس ناول کو پڑھا تو بہت متاثر ہوا۔ یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب گورباچوف کے ہاتھوں سوویت یونین کا تیاپانچا نہیں ہوا تھا۔ کراچی میں سوویت قونصل خانہ قائم تھا۔ اس کے ثقافتی مرکز ”ایوان دوستی“ کے سربراہ مرزا تائیٹ تھے۔ اردو پر انہیں ایسی دسترس حاصل ہے کہ اہل زبان کی طرح دانی سے اردو بولتے ہیں۔ شعر و ادب کا بھی نہایت پاکیزہ ذوق رکھتے ہیں۔ ایک ملاقات میں مرزا صاحب سے میں نے قادروف کے ناول ”ظہیر الدین بابر“ کے بارے میں اظہار پسندیدگی کیا تو بہت خوش ہوئے اور یہ فرمائش کی کہ میں ناول کے اردو ترجمے پر نظر ثانی کروں اور اسے شائع کیا جائے۔ مصنف اور ناول کے ناشر، رادوگا اشاعت گھر، تاشقند کی جانب سے اپنی ذمہ داری پر پاکستان میں اس کی اشاعت کی باضابطہ اجازت بھی دے دی اور میں

نے وعدہ بھی کر لیا۔ اس سلسلے میں ”رکتاب چلی کیشنز“ کراچی کے مالک ثار حسین سے بات کی۔ وہ اسے چھاپنے پر رضامند ہو گئے۔

مگر میں اپنی گوناگوں مصروفیات کے باعث کئی برس کا عرصہ گزر جانے کے باوجود اب تک ناول پر نظر ثانی کرنے کے لئے وقت نہ نکال سکا۔ کچھ یہ بھی خیال دامن گیر رہا کہ اس ناول کا اردو ترجمہ منظر سلیم نے کیا ہے۔ وہ اردو کے نامور شاعر ہیں، کئی مشہور ناولوں کے مصنف ہیں، ماہر مترجم اور اردو کے کسنہ مشق صحافی ہیں۔ عرصہ دراز تک تاشقند میں رادو گا اشاعت گھر کے ساتھ وابستہ رہ چکے ہیں۔ اور سوباتوں کی ایک بات یہ کہ میرے یار عزیز اور ہمدردینہ ہیں۔ کچھ یہی وجہ تھی کہ ناول پر نظر ثانی کرنے کی جانب طبیعت راغب نہ ہوئی۔ چنانچہ ناول ”ظہیر الدین بابر“ کی ازسرنو ترتیب و تدوین پر اکتفا کیا گیا۔ اب اسی تدوین جدید کے ساتھ اسے شائع کیا جا رہا ہے۔

شوکت صدیقی

قوا

1

ہجری سن ۸۹۹ چل رہا تھا.....

فرغانہ کی گرمیوں کے تپتے ہوئے آسمان پر دن میں کالے کالے بادل منڈلاتے رہے تھے، وادی میں سخت امس محسوس ہو رہی تھی لیکن شام ہوتے ہوتے تیز موسلا دھار بارش ہوئی اور آسمان صاف ہو گیا۔ سرخ مٹی کے ٹیلوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے دریا قواسائے میں اچانک طغیانی سی آگئی اور پانی ارغوانی ہو گیا۔ لگ رہا تھا جیسے دھارے میں خون کے جھاگ اٹھ رہے ہوں۔ دریا کے کنارے بید مجنوں کے درختوں میں سے ایک کی شاخوں تلے ایک نوجوان اور ایک لڑکی دنیا کی نظروں سے چھپے کھڑے ہوئے تھے۔

”ارے رابعہ، مجھ پر بھروسہ رکھو نا“ نوجوان نے مضطرب لہجے میں چپکے چپکے کہا۔ ”جب تک میں زندہ ہوں، تمہیں کسی مصیبت سے ڈرنے کی کیا ضرورت۔“

”خدا آپ کو ہمیشہ زندہ و سلامت رکھے، طاہر جان..... لیکن ہمارے وطن پر تو ہزاروں لاکھوں دشمن ٹوٹ پڑے ہیں۔ کیا انہیں روکا جاسکتا ہے؟..... اور پھر روکے گا بھی کون؟..... ذرا ادھر تو دیکھئے، اور بھی پناہ گزین بھاگے چلے آ رہے ہیں..... کتنی زیادہ تعداد ہے ان قسمت کے ماروں کی!“

طاہر نے لڑکی پر سے نظریں ہٹا کر اس سمت دیکھا۔

تو اسائے کے اس پار دور تک دلدلی علاقہ پھیلا ہوا تھا جس پر سرکنڈے کی گھٹی جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ ختم ہوتی ہوئی بارش میں دریا کے لمبے چوہل پل کی ہلکی سی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔ پل پر انسان، گھوڑے اور بھیڑیں چیونٹیوں کی سی قطار میں رینکتے معلوم ہو رہے تھے، اوپر تک لدے پھندے ارا بے دھندلے دکھائی دے رہے تھے۔

دشمنوں کے لشکر نے سمرقند کے حکمران کی سرکردگی میں مرغیلان پر دھاوا بول دیا تھا اور یہ مصیبت زدہ لوگ اپنے سامان اور بیٹیوں، بیویوں کی عزت آبرو کو لٹنے سے بچانے کی کوشش میں قوا سے ہو کر اندجان کی طرف بھاگ رہے تھے۔

”بھاگنا تو ہمیں بھی پڑے گا!“ رابعہ نے گہری ٹھنڈی سانس بھر کے کہا۔ ”امی جان نے میرے جینز کا صندوق محسلے میں چھپا دیا ہے..... آپ میری فکر نہ کیجئے۔ آج شام کو محمود مجھے اندجان کے قلعے میں پہنچا دیں گے۔“

اندجان کا قلعہ طاہر کی نگاہوں میں پھر گیا۔ اس نے سوچا کہ محمود اپنی بہن کو قلعے میں تو پہنچا دے گا پر اس کے بعد کیا ہو گا؟ وہاں کے مطلق العنان اور بے حد طاقتور بیگ، کو زہر کی حسین بیٹی کے لئے کچھ خطرناک ثابت ہوں گے؟

”نہیں!“ طاہر نے بلند آواز سے کہا۔ ”تمہیں میرا ذرا بھی خیال ہو تو وہاں نہ جاؤ!.....“

طاہر کی ہتھ کرگے کی بھیگی دھاری دار قمیص کے اوپر کمر میں خنجر لٹکا ہوا تھا۔ وہ لڑکی کے چہرے اور شوخی سے معمور رہنے والی آنکھوں کو جن میں اس وقت خوف اور تشویش کروٹیں لے رہے تھے، دیر تک تکتا رہا۔

”جانے کو تو میرا بھی جی نہیں چاہتا لیکن ہو بھی کیا سکتا ہے؟ اتنا تو خطرہ ہے یہاں!.....“

لڑکی نے طاہر سے ملاقات کے لئے گھر سے نکلتے وقت غلبت میں باپ کے سیاہ اونٹنی چونغے ہی کو سر پر ڈال لیا تھا۔ بارش میں بھیگ جانے کے بعد یہ چونغہ خاصا وزنی ہو چکا تھا اس لئے اس نے اسے سر سے کھسکا کے شانوں پر لٹکا لیا۔ اتنے میں اس کے کرتے کے گلے کا بند کھل گیا اور طاہر کی نگاہیں اچانک کرتے کے گریبان سے جھانکتے سرخ و سفید مثلث پر جم کر رہ گئیں۔ سبز صدری سترہ سالہ رابعہ کی نرم دنازک پتلی کمر اور ابھرے ہوئے سینوں پر بالکل کسی، چپکی ہوئی سی تھی۔

طاہر نے رابعہ کے ساتھ ہی ساتھ پروان چڑھتے ہوئے وادی شباب میں قدم رکھا تھا، طاہر کو اب کہیں جا کر پہلی بار صحیح معنوں میں احساس ہوا کہ کتنی نازک و حسین ہے رابعہ، اس کی اپنی رابعہ۔ اور جیسا کہ طاہر تھا، کتنی ہوس ہو سکتی تھی دوسری سرزمینوں کے بیگوں اور بھاڑے کے

سپاہیوں کو اس کی جیسی نازک حسیناؤں کی!

موسم بہار میں دونوں کے والدین نے ان کی منگنی کی رسم ادا کر دی تھی۔ طاہر کو رابعہ اس موقع پر بھی اتنی زیادہ خوبصورت نہیں معلوم ہوئی تھی! شادی میں اب بس رمضان شریف کے گزرنے ہی کی تو دیر رہ گئی تھی۔ دونوں کو یقین تھا کہ جلد ہی ساتھ رہنے لگیں گے اور وہ راحت کے خوابوں سے پیدا ہونے والی پرسکون اور بے فکر زندگی گزار رہے تھے۔ لیکن ہوا اس کے بالکل برعکس: جنگ کی تیز آندھی قوا کے دروازوں کو بھڑکانے لگی۔

دفعۃً طاہر نے رابعہ کو بچپن کی کوشش کی، چونکہ زمین پر گر گیا اور فوراً ہی طاہر کو احساس ہوا کہ وہ کانپ رہی ہے، سر سے پاؤں تک کانپ رہی ہے۔

”اتنی بزدل تو تم کبھی بھی نہیں تھیں، رابعہ“ طاہر نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں ہو کیا گیا؟“

”میں نے بڑا ڈراؤنا خواب دیکھا ہے، طاہر جان! پروردگار، ہمیں بلاؤں سے محفوظ رکھ!“

”ڈراؤنا خواب؟..... میرے بارے میں؟ بتاؤ تا کیا دیکھا۔“

”اسے زبان پر لانے کی تاب نہیں۔“

”خوابوں میں انسان کیا کیا نہیں دیکھتا..... جو دیکھا ہو بتاؤ بھی!..... ہونے والی بات ہو کر رہے

گی!.....“

”میں نے ایک سیاہ سائڈ کو دیکھا، اس کے خنجر جیسے سینک تھے جن پر اس نے آپ کو اٹھالیا..... نہیں، نہیں!“ اور اس نے اپنا جسم طاہر سے بالکل سدا دیا۔ ”جب بھی خیال آتا ہے، روتے کھڑے ہو جاتے ہیں!“

طاہر خوابوں میں یقین رکھتا تھا اور وہ بھی کسی بلا کے اندیشے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اس نے رابعہ کو اپنی بانہوں سے آزاد کر دیا۔

”ذرا تفصیل سے بتاؤ تا..... مجھے سائڈ نے سینگوں پر اٹھالیا..... تو کیا خون بھی دیکھا تھا تم نے؟“

”ہاں، ہاں..... دیکھا کہ خون کا فوارہ پھوٹ نکلا!“

طاہر نے اطمینان کی سانس لی۔

”اگر ایسا ہوا تو ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ خواب میں خون دیکھنا اچھا شگون ہے۔ ابا جان ہمیشہ یہی کہتے ہیں۔“

”خدا کرے ایسا ہی ہو! طاہر جان، میں..... اگر آپ اندجان نہ جائیں گے تو میں بھی نہ جاؤں

گی۔ کچھ ہونا ہی ہے تو بیس ہو..... لم از کم ہم ساتھ تو ہوں گے.....“

بارش کے قطرے بید مجنوں کی پتیوں سے چھن چھن کر نیچے گر رہے تھے۔ پھوار کبھی کبھی لڑکی کی لمبی لمبی پلکوں پر بھی پڑ جاتی تھی۔ طاہر کو لگا کہ رابعہ رو رہی ہے۔

”ارے رابعہ، میرے لئے کیوں کڑھتی ہو۔ میں ٹھہرا معمولی کسان۔ سورج نکلنے اور آسمان صاف ہونے ہی بیلوں کو لے کر کھیت پر چلا جایا کروں گا۔ فصل کاٹوں گا۔ مجھ سے کسی کو کیوں پر خاشا؟ میں کس کا دشمن ہوں؟ رہے دشمن تو مجھے ان سے کیا سروکار؟..... ارے ہاں..... مجھے یاد آگیا۔ اندجان کے قلعے میں تو تمہاری سگی پھوپھی رہتی ہیں۔ تم ان ہی کے ہاں چلی جاؤ۔“

”اندجان میں تو آپ کے بھی ایک رشتے دار رہتے ہیں نا!..... ہم لوگ ساتھ ہی کیوں نہ چلیں؟“

طاہر خیالوں میں کھو گیا۔

ہاں، ماموں جان فضل الدین اندجان ہی میں تو رہتے ہیں۔ میر عمارت ہیں۔ قوا میں بھی ان کی شہرت ہے۔ دریا پر یہ سامنے والا چوٹی پل ان ہی کے نقشے کے بموجب تو تعمیر کیا گیا تھا۔ اور جب اندجان میں ان کی نگرانی میں تعمیر کیا جانے والا دیوان خانہ جسے گل بوٹیوں اور نیلگوں پکھنچنے ٹھیکروں کی پچی کاری سے آراستہ کیا گیا تھا، مرزا عمر شیخ کو پسند آگیا تھا تو ماموں جان کتنے مشہور ہو گئے تھے! طاہر یقینی طور پر سن چکا تھا عمر شیخ نے خوش ہو کے انہیں ایک قدم باز گھوڑا اور اشرافیوں سے بھری ایک تھیلی عطا کی تھی اور یہ کہ وہ قلعے میں نہیں بلکہ شر کے باہر بڑے عیش و آرام سے اکیلے رہتے ہیں۔

فضل الدین ماموں جب قوا میں رہتے تھے تو اسے پڑھنا لکھنا سکھایا کرتے تھے۔ اب وہ ان کے ہاں پناہ لینے کے لئے پہنچ جائے تو یقیناً اسے اپنے سائے میں رکھ سکتے ہیں۔ لیکن ضعیف والدین کو اس کے اس فیصلے کا علم ہو گا تو جانے کیا کہیں۔ وہ اکلوتا بیٹا ہے، ہو سکتا ہے کہ والدین اسے جانے ہی نہ دیں۔ اور اچانک اندجان جانے کا اصل سبب بتانا کچھ اچھا نہیں لگتا..... تو کیا وہ محمود سے کہے کہ اس معاملے میں ابا جان سے بات کر لیں؟

”اچھی بات ہے، رابعہ، ہم ساتھ ساتھ اندجان چلیں گے۔ ابا جان کو راضی کرنا البتہ ٹیڑھی کھیر ہے..... تمہارے محمود بھائی گھر پر ہیں کیا؟“

”کیس گئے تھے لیکن کہا تھا کہ افطار کے وقت تک لوٹ آئیں گے۔ کیا بات ہے۔“

”ان سے کہنا کہ روزہ افطار کرنے کے بعد ہمارے ہاں آجائیں، مجھے کچھ باتیں کرنی ہیں۔“

”ٹھیک ہے، کہہ دوں گی۔“

رابعہ نے اپنا چہرہ طاہر کے چوڑے چکے سینے میں چھپا دیا اور اس سے چٹ کر بولی۔ ”خدا کرے ہم کبھی بھی جدا نہ ہوں!“ اور دوسرے ہی لمحے طاہر سے الگ ہو کر یسوعی مجنوں کی شاخوں کے نیچے سے نکل گئی۔

دریا کنارے اس کی چھوڑی ہوئی تانبے کی گاگر پر بارش کے قطروں کی ٹپ ٹپ صاف سنائی دے رہی تھی۔ گاگر کو دیکھتے ہی رابعہ کو یاد آگیا کہ دراصل وہ پانی بھرنے ہی تو آئی تھی اور اب گاگر کو بھر کے گھر لوٹنا چاہئے۔

رواج کے مطابق مگنی کے بعد لڑکا اور لڑکی چوری چھپے ملاقات کر سکتے تھے۔ رابعہ دریا کے کنارے سے دور نکل گئی تو طاہر بھی اس جگہ سے باہر آگیا جہاں وہ دونوں اچھے کھڑے تھے۔ اچانک اسے رابعہ کا ڈراؤنا خواب یاد آیا اور اس کا دل کسی بلائے ناگہانی کے انیشے سے بے چین ہوا تھا۔

۲

اس سال رمضان کا مہینہ اس زمانے میں آیا تھا جب قیامت کی گرمی پڑ رہی تھی۔ تپتے ہوئے دنوں میں پیاس کی شدت روزہ داروں کو بہت پریشان کرتی تھی اس لئے وہ نماز مغرب کا وقت ہونے کے بے چینی سے منتظر رہتے تھے۔

آخر کار قوا کی مسجد کے مینار سے موزن نے اذان دی جنگ اپنی جگہ پر تھی لیکن کھانا پینا بہر حال ضروری تھا اور لوگ شام کو دسترخوان پر بیٹھ کر کچھ دیر ہی کے لئے کیوں نہ سہی، دنیا کے باقی سارے جھمیلوں کو طاق پر رکھ دیا کرتے تھے۔

طاہر اپنے بوڑھے والدین کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا۔ فضا میں گرم گرم تانوں اور سردوں کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ نائیں بھی ڈالتے دار تھیں اور وہی پڑا ستاوا بھی۔ طاہر اپنے اند جان جانے کی بات چھیڑنا چاہتا تھا لیکن ہچکچاہٹ محسوس کر رہا تھا۔

اتنے میں کسی نے چابک کے دستے سے پھانک کو کھٹکھٹایا۔ کچی دیوار کے پاس لیٹا ہوا بوڑھا دوغلا کتا زور زور سے بھونکنے لگا اور طاہر جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”زرا احتیاط برتنا!“ اس کے باپ نے بلی بلی آواز سے تنبیہ کی۔ ”پہلے پوچھ لیتا کہ ہے

کون۔“

بارش تو تھم چکی تھی لیکن کالے کالے بادل اب بھی چھائے ہوئے تھے اس لئے شام کی تاریکی بہت بڑھ گئی تھی۔ طاہر پھانک کے بالکل قریب پہنچ گیا۔

”کون ہے؟“ اس نے پوچھا۔

کتنے دن دوبارہ بھونکنے شروع ہی کیا تھا کہ باہر سے کسی نے یہ آواز بلند کہا:

”ارے طاہر، یہ تم ہو؟ دروازہ کھول دو، میں ہوں، تمہارا ماموں!“

”ابھی کھولتا ہوں، ماموں جان“ طاہر نے کہا اور گھر کی طرف رخ کر کے آواز دی۔ ”ارے امی

جان، فضل الدین ماموں آئے ہیں۔“ پھر اس نے جلدی سے کنڈی کھول دی۔

بوڑھے اور بڑھیا نے گھر کے باہر نکل کر پھانک کے پاس کھڑے کھڑے ہی اپنے قریبی عزیز سے بڑے تپاک کے ساتھ صاحب سلامت کی اور دیر تک خیر و عافیت دریافت کرتے رہے۔ طاہر بھی باہر نکل آیا۔ ان کے گھر کے قریب ہی ایک ڈھکے ہوئے ارابے کا دھندلا دھندلا سا خاکہ نظر آ رہا تھا۔ اس میں جتے ہوئے گھوڑے کی کانٹھی پر سے کوئی شخص بم پکڑ کے تیزی سے نیچے اتر آیا۔

”یہ ارابہ کس کا ہے؟“

وہ شخص خاموش رہا، جواب فضل الدین نے دیا:

”میرا ارابہ ہے، طاہر جان۔ میں اپنے سارے سامان کے ساتھ یہاں آیا ہوں۔“

”کیا؟“ طاہر حیرت ظاہر کئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کے لئے ماموں کا استقبال یقیناً باعث مسرت تھا لیکن یہ کیا ہو گیا؟..... وہ تو آس لگائے بیٹھا تھا کہ اندجان جا کے ان کے ہاں رہے گا لیکن وہ خود ہی یہاں آگئے اور خالی نہیں بلکہ تمام اسباب کے ساتھ۔ اس کا مطلب تو یہ تھا کہ اندجان راستہ اس کے لئے بند ہو چکا ہے۔ لیکن راجہ پر کیا گزرے گی؟

”ارے طاہر، یہ تم منہ سکوڑے کیا کھڑے ہوئے ہو، ارابے سے سامان اتر واؤ نا!“ اس کی ماں

نے کہا۔ ”تمہارے ماموں تو صاف لگ رہا ہے کہ بارش میں کافی پریشان ہو چکے ہیں۔“

”ہیشہ محترمہ، یہ کہنا کہ پریشان ہو چکا ہوں، بہت ہی نا کافی ہو گا! ارابہ قدم قدم پر کچھ میں دھنس جاتا تھا، بس جوں توں گھسٹتے رہے، رینگتے رہے۔ میں تو عاجز آ گیا ایسی زندگی سے! اور پھر راستے میں قیامت کی بھیڑ بھاڑ تھی، کوئی شارٹ ہوڑی ہے پناہ گزینوں کا۔“

طاہر سامان اتارنے میں کوجوان کی مدد کرنے لگا۔ اتفاقاً اس کا ہاتھ گھوڑے سے لگا اور فوراً ہی گرم گرم گیلی مٹی میں سن گیا۔ گھوڑا کچھڑ میں بری طرح لت پت تھا۔ اف، کتنی مصیبت جھیلنی پڑی تھی پچارے مسافروں کو!..... لیکن آخر ایسے میں جب کہ قوا کے سارے لوگ حملے سے جان بچانے کی فکر میں اندجان کو بھاگ رہے تھے، ماموں کو یہاں آنے کی کیا پڑی تھی؟..... طاہر کوجوان کے پکڑائے ہوئے بورے کو جس میں کوئی کافی وزنی چیز رکھی ہوئی تھی، زمین پر اتارنے کی کوشش کرنے

لگا۔

”ارے۔ رے ذرا ہولے ہولے، بڑا وزنی ہے۔ دونوں مل کے اتارو“ ماموں نے کہا۔
 بورے میں چھوٹا لیکن بہت وزنی آہنی صندوق رکھا ہوا تھا جسے فضل الدین نے کسی زمانے میں
 قوا کے آہن گروں سے بنوایا تھا۔ اس میں نہ پانی رس سکتا تھا اور نہ آگ اسے نقصان پہنچا سکتی
 تھی۔ میر عمارت اس میں اپنے نقشے بھی سنبھال کر رکھتا تھا اور اپنے ایک دوسرے فن کے بہترین
 نمونے یعنی تصاویر بھی۔ فضل الدین نے تین سال سمرقند اور چار سال ہرات میں تعلیم حاصل کی
 تھی اور اس نے فن تعمیر کے ساتھ ہی ساتھ جانداروں کی جیتی جاگتی تصاویر بنانے کی فنی باریکیوں پر
 بھی عبور حاصل کر لیا تھا۔ ہرات میں رزمیوں کے قلمی نسخوں کو گل بوٹوں ہی سے نہیں بلکہ تصاویر
 سے بھی آراستہ کئے جانے کا عام رواج تھا اور ہزاروں اپنے قلم اور رنگوں سے علی شیر نوائی اور
 حسین بیقرا کی جو تصاویر بنائی تھیں ان کی بدولت اسے کافی شہرت حاصل ہوئی تھی۔ لیکن سمرقند
 اور وہاں سے بھی زیادہ فرغانہ میں انسانی چہرے کی نقاشی کو سخت سزا کا مستحق جرم تصور کیا جاتا تھا۔
 تعلیم دی جاتی تھی کہ اللہ جانداروں کا واحد خالق ہے اور فانی انسان کو اس معاملے میں پروردگار
 سے مقابلے کی جرات بھی نہ کرنی چاہئے۔ اسی بنا پر فضل الدین اپنی بنائی ہوئی تصویروں کو آہنی
 صندوق میں محفوظ رکھتا تھا۔

طاہر نے صندوق کو اکیلے ہی اٹھا کر گھر کے اندر پہنچا دیا۔ فضل الدین نے موٹا بھورا چکمان ☆
 اور پوری طرح بھیکھے ہوئے جوتے دہلیزی پر اتار دئے اور چرمی پاتا بے پین کر صاف پانی کی نالی سے
 منہ ہاتھ دھوئے۔ بارش سے چکمان کے نیچے اس کا کرتا بھی بھیک گیا تھا لیکن گرمی اور امس کے
 مد نظر اس نے کرتا نہ بدلا۔

سفر نے اسے اس بری طرح ہلکان کر دیا تھا کہ اس نے متاوے کو چھوا تک نہیں، سروے کی دو
 قاشیں کھائیں، چائے کے چند پیالے پئے اور بس۔ کھانے پر بلا لیا جانے والا کو جوان البتہ وہی
 پڑے متاوے پر بڑے نندے پن سے ٹوٹ پڑا اور دو بڑے بڑے پیالے خالی کر دئے۔ اس کے
 بعد وہ گھوڑے کی دیکھ بھال کرنے کے لئے احاطے میں چلا گیا۔

”اوہ، فضل الدین!“ طاہر کے باپ نے اپنی لمبی سفید داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بات شروع
 کی۔ ”اچھا ہوا کہ آپ آگئے، بہت ہی اچھا ہوا۔ ایسے پر آشوب ایام میں ہمیں ساتھ ہی رہنا
 چاہئے۔“

”آنے کو آؤ گیا ہوں لیکن کیا یہ عجیب نہیں لگتا؟ لوگ تو حملے کے خوف سے بھاگ رہے ہیں اور

میں خود ہی موت کے منہ میں چلا آیا۔“ فضل الدین نے طاہر کی طرف دیکھا۔

”تو ماموں جان، اس کا کوئی اہم سبب ہے کیا؟“ طاہر نے پوچھا۔

”سبب؟ ارے طاہر، سبب بس ایک ہی ہے، جنگ چھڑتی ہے تو عمارتوں کی تعمیر کے کام مفلوج ہو جاتے ہیں اور جنہیں یہ فن آتا ہے ان کی کسی کو ضرورت نہیں رہ جاتی.....“

”لیکن آپ کو تو خود ہمارے شاہ نے تعمیرات کے کام کی نگرانی سپرد کی تھی نا؟“

”ہمارے شاہ کو تو ان دنوں ساری فکر اس بات کی ہے کہ آخنی کا قلعہ زیادہ سے زیادہ طاقتور ہو جائے۔ کہتے ہیں کہ تاشقند کے خان محمود بھی ہمارے دشمن ہو گئے ہیں اور لشکر تار کر لیا ہے۔

اور مشرق سے کاشغر کے شاہ ابو بکر دولت سیدھے اوزگنت پر چڑھے چلے آرہے ہیں۔“

طاہر کے باپ نے سم کے اپنے گریبان کو تین انگلیوں سے مضبوطی کے ساتھ پکڑ لیا۔

”یا خدا! ادھر سے کاشغر والا چڑھتا چلا آرہا ہے اور ادھر سے سمرقند والا..... مطلب یہ کہ دشمن

تین طرف سے یلغار کر رہے ہیں؟ بھلا کیسی بد نصیبی ہے، فضل الدین؟ یہ شاہ اور سلطان لوگ کہیں مل بیٹھ کے کیا نہیں ملے کر سکتے کہ امن و سکون سے زندگی گزاریں گے؟ خاص طور سے اس لئے

اور بھی کہ سب ایک دوسرے کے قریبی عزیز ہیں، درست ہے نا؟“

”جی ہاں، یہ تو درست ہے۔ ہمارے شاہ عمر شیخ تاشقند کے خان کے بہنوئی ہیں اور سمرقند کے شاہ

سلطان احمد مرزا جو لٹے ہوئے قوتد سے ہمارے اوپر حملہ کر رہے ہیں، ہمارے شاہ کے برادر حقیقی ہیں۔ یہی نہیں، دونوں بھائیوں نے تو ایک دوسرے کے سمدھی بن جانے کا بھی فیصلہ کر لیا تھا۔ سر

قند کے شاہ کی صاحبزادی سے ہمارے ولی عہد مرزا بابر کی مگنی پانچ سال کی عمر ہی میں کردی گئی تھی مطلب یہ ہوا کہ برادر برادر پر اور برادر برادر نسبتی برادر نسبتی پر برہنہ شمشیریں لئے چڑھائی کر رہے ہیں!“

”یا پروردگار! یہ قرب قیامت کے آثار ہیں کیا؟ ارے فضل الدین، کیسے دنیا کا خاتمہ تو نہیں

قریب آرہا ہے؟“

”کچھ کہہ نہیں سکتا!..... ہاں یہ ضرور جانتا ہوں کہ لڑتے جھگڑتے تو یہ لوگ ہیں اور مصائب

اور مظالم کے پہاڑ دوسروں کے سروں پر ٹوٹتے ہیں۔ آپ اور ہم جیسوں کے سروں پر.....“

”گویا ہمارا نصیب ہی بُرے ہوا ہے.....“

”جی ہاں، نصیب سیدھا نہ ہو تو جینا مشکل ہو جاتا ہے۔“ فضل الدین نے جیسے اپنے ہم کلام کی

بات سنی ہی نہ ہو اور اپنے خیالات کی رو میں ہمہ نکلا۔ ”میں دل میں کیسے کیسے خوابوں کو بسانے

ہوئے ہرات سے واپس لوٹا تھا۔“ اپنے فرغانہ میں اتنے ہی خوبصورت مدرسے تعمیر کرنا چاہتا تھا

جتنے کہ سمرقند اور ہرات کے ہیں..... شاہ اور سلطان ہمیشہ زندہ نہیں رہتے۔ ہمیشہ زندہ رہتا ہے الغ
بیک کا مدرسہ، نوائی کا ”خمسہ“ اور ایسی ہی دوسری یادگاریں!“

فضل الدین نے کہنے کو تو یہ کہہ دیا لیکن اپنی بات سے خود ہی سسم گیا اور جلدی سے رخ موڑ
کے دروازے کی طرف دیکھا۔ ”ماموں درباریوں کے درمیان زندگی گزارنے کے عادی ہو چکے ہیں،
مخبروں سے ہوشیار رہتے ہیں۔“ طاہر نے سوچا۔

”ارے ماموں جان، آپ اپنی بات جاری رکھئے، یہاں کوئی غیر نہیں ہے..... آخر آپ اند جان
میں کیوں نہ ٹھہر سکے؟“

فضل الدین نے فوری طور پر جواب نہ دیا، وہ خیالوں میں غرق ہو گیا۔



گزشتہ شام کو فضل الدین پڑوس کی گلی میں رہنے والے اپنے خوش نویس دوست کے ہاں گیا ہوا
تھا تو خود اس کے گھر میں کچھ اجنبی افراد داخل ہو گئے۔ انہیں دیکھتے ہی کتابھونٹنے لگا تو اس کے
انہوں نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے اور گھر میں موجود نوجوان نوکر کی (جو کوچوان کی حیثیت سے قوا
آیا تھا) مشکلیں باندھ کر منہ میں کپڑا ٹھونس دیا۔ پھر ان لوگوں نے سارے گھر کو چھان مارا اور جب
انہیں آہنی صندوق مل گیا تو کھٹاڑے سے اس کا قفل توڑنے لگے۔

فضل الدین کے گھر سے ملحق دائیں اور بائیں جانب کے گھروں میں دم توڑتے ہوئے کتے کی
دردناک چیخ سنائی دے گئی تھی۔ ان پڑوسیوں نے تاڑ لیا کہ ضرور کوئی ایسی ویسی بات ہے اور ان
میں سے ایک اپنے احاطے سے دبے پاؤں نکل کر گلی میں پہنچا تو اسے درخت کے نیچے ایک شخص
چار گھوڑوں کی لگائیں تھامے کھڑا نظر آیا۔ پڑوسی اس شخص کے چہرے کو نہ دیکھ سکا کیونکہ سیاہ
نقاب پڑی ہوئی تھی اور صرف آنکھیں ہی چمک رہی تھیں۔ لیکن فضل الدین کے گھر کے اندر سے
دھات کے دھات سے ٹکرانے کی زوردار جھنجھناہٹ مسلسل ابھر رہی تھی۔ پڑوسی لپک کے خوش
نویس کے ہاں پہنچا جہاں سے فضل الدین بھاگا بھاگا گھر آیا۔

وہ اندر داخل ہوا تو نامعلوم افراد و زنی صندوق کا قفل توڑنے میں آخر کار کامیاب ہو چکے تھے۔
مالک مکان کو دیکھتے ہی ان میں سے دو تو کھڑکی توڑ کر باہر کود گئے اور تیسرا باہری دروازے کی طرف
لپکا۔

”ٹھہر جا، بد معاش!“ فضل الدین نے لٹکارا لیکن رپچھ جیسے ہٹے کٹے نوجوان (وہ بھی نقاب پوش
ہی تھا) نے اسے زور سے شانہ مار کر دکھیل دیا اور بھاگتا ہوا گلی میں پہنچ گیا۔ ڈاکو آنا مانا گھوڑوں پر

سوار ہو کے بھاگ کھڑے ہوئے اور گھپ اندھیرے میں ان کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔
 فضل الدین کھلے ہوئے صندوق پر جھک کر اندر دیکھنے لگا۔ طاق پر رکھی ہوئی شمع کی مدھم مدھم روشنی میں نظر آ رہا تھا کہ ڈاکو صندوق کو چھان مارنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ عمارتوں کے نقشے کہیں کہیں سے مڑے ہوئے تھے اور شاہ فرغانہ کی عطا کی ہوئی اشرافیوں کی تھیلی غائب تھی۔ لیکن فضل الدین کو سونے کی اتنی فکر نہ ہوئی جتنی ایک دوسری بات کی۔ اس خفیہ خانے کا کیا حشر ہوا جس میں اس کی بنائی ہوئی تصاویر رکھی تھیں؟ خدا نخواستہ وہ لوگ اسے کھولنے میں کامیاب ہو گئے ہوں تو؟ اس نے جلدی جلدی کاغذات کا سارا انبار صندوق سے باہر نکال کے اس کے پیندے پر لگے اور خوب چمکتے ہوئے آہنی چوکنے کو بائیں جانب کھسکایا اور اندرونی قفل دکھائی دینے لگا۔ فضل الدین نے مڑ کے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ گھر میں اس وقت اور کوئی بھی نہ تھا، پڑوسی احاطے میں نوکر کی مشکلیں کھولنے میں مصروف تھے۔ اس نے اپنے چوکنے کی اندرونی جیب سے چھوٹی سی کتھی نکال کر خفیہ قفل میں لگائی..... ڈمکن کو دھیرے سے اٹھایا۔ یہ رہیں اس کی تصاویر کاغذات میں لپٹی ہوئی۔ اسے یہ تک یاد تھا کہ تصاویر کس ترتیب سے رکھی ہوئی ہیں..... پودوں کو سینچتا ہوا بوڑھا باغبان..... چملم محرم پہاڑیوں پر شکار..... اور نیچے جنگ بجاتی ہوئی حسینہ کی تصویر، شاہ عمر شیخ کی دختر، شہزادی خان زادہ بیگم کی تصویر۔

فضل الدین نے ہرات سے واپس لوٹنے کے بعد اند جان میں اپنی سرگرمیوں کا آغاز عرش کی شہر سے باہر واقع حویلی کی اندرونی دیواروں پر گل بوٹے بنانے والے مصور کی حیثیت سے کیا تھا۔ خان زادہ بیگم کو پتا چلا کہ فضل الدین تصاویر بنانے میں بھی مہارت رکھتا ہے تو اس نے اپنی تصویر بنانے کی فرمائش کی۔ یہ کام چوری چھپے انجام دیا گیا تھا کیونکہ شاہ کو علم ہو جاتا تو وہ یقیناً رکوا دیتا۔ یہی نہیں، حسین و جمیل شہزادی کی خواہش کی تکمیل کرنے والے مصور کی جان کے لالے بھی پڑ جاتے! نوکر آخر کار ہوش میں آگیا اور اس نے گھر ہونے والے حملے کی تفصیلات ایک حد تک تسلسل کے ساتھ بیان کر دیں۔ فضل الدین نے اس کی اور واقعے کے چشم دید گواہ پڑوسی کی باتوں پر غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ اجنبی عام ڈاکو نہ تھے۔ وہ تو کسی کے اشارے پر یہ کام کر رہے تھے۔ آخر انہیں تلاش کا ہے کی تھی؟ عمارتی نقوش کی ”لیکن نقوش کو تو وہ لوگ اپنے ساتھ نہیں لے گئے تھے حالانکہ بالکل اوپر ہی رکھے ہوئے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ تصویریں ڈھونڈ رہے تھے..... اس کا مطلب یہ بھی تھا کہ انہیں کوئی ایسا شخص ہی بھیج سکتا تھا جسے فضل الدین کی مصوری میں مہارت کا علم رہا ہو اور جو کسی بات کا بدلہ لیتا چاہتا ہو۔

فضل الدین کو یاد آیا کہ موسم بہار میں حسن یعقوب نے جو اندجان کے مشہور اور بہت دولت مند بیگوں میں سے ایک تھا، اسے اپنے ہاں بلا کر بڑے گھمنڈ کے ساتھ کہا تھا۔

”میں ایک ایسا شاندار حمام تعمیر کرانا چاہتا ہوں جو لاٹانی ہو! اس کے اندر گرمیوں میں غسل کے لئے سنگ مرمر کے حوض ہونے چاہئیں!.....“ پھر حسن یعقوب نے ذرا دھیرے سے کہا۔ ”میں کئی خوبصورت لڑکیاں خریدوں گا، سونا میرے پاس بہت ہے..... میں چاہتا ہوں کہ ان لڑکیوں کے نہاتے وقت چھوٹی کھڑکیوں سے ان کا نظارہ کر سکوں اور مجھے کوئی نہ دیکھ سکے۔ یہ کھڑکیاں بڑی صفائی سے بنائی جانی چاہئیں، خفیہ ہونی چاہئیں، سمجھ گئے نا؟“ بیگ نے اپنے آپ سے کافی مطمئن ہو کر زوردار قہقہہ لگایا۔ ”آپ کو اسی لئے زحمت دی ہے کہ آپ اس کام میں مصروف ہو جائیں۔ منہ مانگی اجرت دوں گا!“

فضل الدین فن عمارت سازی کے تقدس میں یقین رکھتا تھا۔ وہ اپنی ناپسندیدگی کو چھپانہ سکا اور اس نے اس ”ناپاک“ تعمیر کی ذمہ داری سنبھالنے کی تجویز مسترد کر دی۔

”اس میں ناپاک بات کون سی ہے؟..... حمام تو میں اپنے پیسوں سے تعمیر کراؤں گا!“

”میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں، حضور کہ ایسی کھڑکیاں بنانے میں مہارت رکھنے والے استاد موجود ہیں۔ بہتر ہوگا اگر آپ یہ کام ان ہی کو سپرد کریں۔ مجھے تو بادشاہ نے مدرسوں کی تعمیر کا حکم دیا ہے اور میں ان کے ابتدائی نقشے تیار کرنے میں مصروف ہوں..... میں آپ سے معافی چاہتا ہوں.....“ حسن یعقوب نے فضل الدین کو قہر آلود نگاہوں سے دیکھا:

”کوئی بات نہیں!..... لیکن میں نے جو کچھ کہا ہے اسے ہم دونوں کے درمیان راز ہی رہتا چاہئے، جناب۔ ورنہ.....“

”ہماری یہ گفتگو یہیں شروع ہوئی اور اسے یہیں پر ختم سمجھئے۔ لیکن آپ بھی مجھ سے ناراض نہ رہیں گے، سچ ہے نا، حضور؟“

”مجھ سے ناراض نہ رہیں گے.....“ بھلا یہ کیسے ممکن تھا! موٹی گردن والے حسن یعقوب نے اپنی توہین کا انتقام لے لیا۔ اس بیگ سے پیچھا چھڑانے (فضل الدین نے یہی سوچا تھا) کے کوئی پندرہ دن بعد ہی شام کے جھپٹے میں ایک اور دولت مند بیگ احمد تہل اس کے ہاں آدھمکا۔ بیگ نے تہائی میں اس کی طرف اشرفیوں کی تھیلی بوھاتے ہوئے کہا:

”جناب میری عمارت، یہ سونا قبول کیجئے اور میرے لئے ایک تصویر بنا دیجئے.....“

”کیسی تصویر؟“

احمد تبیل کی عمر پچیس سال سے تجاوز کر چکی تھی لیکن چہرے پر ابھی تک ایک بال بھی نمودار نہیں ہوا تھا۔ بے ریش بیگ نے اپنے پتلے ہونٹوں کو فضل الدین کے کان کے پاس لاکے چپکے سے کہا:

”مجھے شہزادی کی تصویر چاہئے۔“

”کس کی؟“ فضل الدین چونک پڑا۔ ”خان زادہ بیگم کی؟“

”جب آپ ہمارے حکمران کی شہر سے باہر والی حویلی کی دیواروں پر نقاشی کر رہے تھے تب آپ نے انھیں پہلی بار دیکھا تھا نا؟..... میرا مطلب ہے، خان زادہ بیگم کو؟ وہ خود بھی آپ کے فن کے بارے میں گہری دلچسپی سے باتیں کرتی رہتی ہیں.....“

اندیشوں کے مارے فضل الدین کے دل کی دھڑکنیں اتنی تیز ہو گئیں کہ اسے لگا جیسے پھٹ ہی جائے گا۔ اس بے ریش کو قصے کی واقعی بھنک لگ گئی تھی کیا؟

”یہ آپ کو کس نے بتایا؟..... میں ٹھہرا میر عمارت..... میں تو عمارتوں ہی کے نقشے، تصویریں بنا سکتا ہوں.....“

”ارے جناب مجھ سے اس رازداری کی کیا ضرورت! میں جانداروں کی تصویریں بنانے والوں کو پریشان تھوڑی کرتا ہوں..... لوگ سچ ہی کہتے ہیں تاکہ ہرات میں عالی جاہ شاہ رخؒ نے بائے سنقر مرزا کے لئے جو محل بنوایا تھا اس کی دیواریں حسیناؤں کی تصاویر سے آراستہ ہیں۔ کیوں، ہے نا سچ؟“

”سچ ہے لیکن..... ہر شہر کے معیار جدا جدا ہوتے ہیں، کسوٹیاں الگ الگ ہوتی ہیں۔ شہزادی کی تصویر کی بات کہیں ہمارے حکمران کی کانوں تک پہنچ گئی تو؟ آپ نے اس بارے میں بھی سوچا ہے؟“

”کیا مجال جو کسی کو بھنک بھی لگے“ احمد تبیل نے پھر سرگوشی کی۔ ”یہاں گواہ کون بیٹھا ہے! راضی ہو جائیے، جناب! یہ اشرفیاں لے لیجئے!“

”اتنی غلت بھی کیا، بیگ صاحب..... آپ سے یہ کس نے کہہ دیا کہ میں انسانوں کی تصویریں بنا سکتا ہوں؟“

”میں نے سنا ہے..... لوگوں کو علم ہے.....“

”کس سے سنا تھا؟ حسن یعقوب بیگ سے؟“

”حسن یعقوب بیگ نے یہ بات ایک باغبان سے سنی تھی.....“ اچھا تو ان دونوں نے سازش

کر رکھی ہے فضل الدین نے سوچا۔ ”اب یہ مجھے پھانسا چاہتے ہیں..... میں اور ایسے مینڈک کے لئے شہزادی کی تصویر بناؤں؟ ہرگز نہیں، میرا دماغ تھوڑی خراب ہوا ہے!“

”معزز و محترم بیگ، آپ کا یہ حکم بردار کاغذ پر باغات کی تصویر بتاتا ہے تو اس کے ایک گوشے میں کسی حقیر یا غبار کو بھی دکھا سکتا ہے۔ فنِ تعمیر کے نقطہ نظر سے یہ کوئی میعوب بات نہیں۔ لیکن شہزادی خان زادہ بیگم کی تصویر بناؤں؟ یہ کبھی بھی نہیں ہو سکتا۔ مجھے نہ اس کا حق ہے۔ نہ میں اتنی مہارت رکھتا ہوں اور نہ ہی ہمت پڑ سکتی ہے!“

”مطلب یہ ہوا کہ آپ مجھے نکالنا جواب دینا چاہتے ہیں؟ مجھے؟“

”صد افسوس کہ اور کوئی چارہ نہیں۔ مجھے معاف کر دیجئے..... میں تو سمجھتا ہوں کہ اس قسم کی تجویز لے کر میرے پاس آنا بھی خطرے سے خالی نہیں! خود آپ کے لئے بھی!“

”میں بزدلوں میں سے نہیں ہوں!“ احمد تبیل غصے سے اچھل کے اٹھ کھڑا ہو گیا۔ ”لیکن کسی بزدل پر کف افسوس ضرور ملنا پڑے گا!“

اور اس دھمکی کو چار نامعلوم افراد کے ذریعے گھر پر حملہ کرا کے عملی شکل دی گئی..... فضل الدین نے سوچا کہ بھلا میرے جیسا تنہا میر عمارت احمد تبیل جیسے بیگ کی جو دو سو سفاکوں اور قاتلوں کا آقا ہے، سازشوں کے سامنے کبھی ٹک بھی سکے گا؟ کبھی بھی نہیں! لیکن خاموش بیٹھ رہنا بھی مناسب نہ تھا۔ کوئی جوابی کارروائی نہ کرنے کا مطلب یہ ہوتا کہ سر پچرا تبیل اور زیادہ کمینہ حرکتوں پر اتر آتا۔

فضل الدین نے ساری رات آنکھوں میں کاٹ دی اور صبح کو عرش کے عطا کئے ہوئے گھوڑے پر سوار ہو کر داروغہ شہر سے ملنے گیا۔ دہلا پٹا، طویل قامت داروغہ شہر ازون حسن میر عمارت کی باتوں کو بے توجہی سے سنتا رہا، اسے تو بس ایک ہی فکر تھی اور وہ یہ کہ شاہی لشکر کے لئے زیادہ سے زیادہ جوان بھرتی کرے اور شہر کی مورچہ بندی کو اور زیادہ مستحکم بنائے۔ پھر اس نے میر عمارت کے جھکے ہوئے سر کے اوپر سے لاپرواہی کے ساتھ کہیں دیکھتے ہوئے کہا:

”مہربانی کر کے مجھے معاف کیجئے، دراصل ایسے کاموں کے لئے اس وقت مجھے ذرا بھی فرصت نہیں..... اشرافیوں سے ہاتھ دھو بیٹھنا یقیناً بڑے افسوس کی بات ہے..... لیکن آپ کے نقشے محفوظ ہیں جس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ حرکت شہر کے گرد و نواح کے جنگلات میں چھپے ہوئے ڈاکوؤں ہی کی ہے۔ ہم لوگ پاک پروردگار کی عنایت سے ذرا جنگ کے جھمیلوں سے نیٹ لیں تو جنگلوں سے چوروں ڈاکوؤں کا ضرور صفایا کریں گے..... ابھی تو جیسا کہ آپ خود ہی دیکھ رہے ہیں، اس کی

فرصت نہیں ہے.....“ اور داروغہ شہر نے اپنا ہاتھ جھٹک دیا۔

فضل الدین نے اس کے کچھ قریب جا کر احتراماً سر جھکا لیا۔

”لیکن حضور، میرا قیاس کچھ اور ہی ہے“ اس نے کہا اور پھر اس سے احمد تبتل نے کسی کی تصویر خریدنے یا بنوانے پر جو دھمکی آمیز اصرار کیا تھا اس کا مختصراً تذکرہ کر دیا۔

”تصویر؟ کس کی تصویر؟“ داروغہ شہر نے دلچسپی لی۔

”کسی پری کی..... میں ٹھیک سے سمجھ نہیں سکا تھا کہ کس کی.....“

”ارے آپ کے صندوق میں کہیں تصویریں تو نہیں تھیں؟ پریوں یا حسیناؤں کی، کیوں جناب؟
ڈاکو کہیں تصویریں تو نہیں اٹھالے گئے؟“

”تصویریں کیسے ہو سکتی تھیں، سرکار؟ میرے لئے حکمران عالی نے مدرسوں کی تعمیر کا حکم صادر فرمایا ہے اور میں ان ہی کے نقشے بنانے میں مصروف ہوں۔ تصویریں بنانے کی نہ مجھے فرصت ہے اور نہ ہی اس فن پر عبور رکھتا ہوں..... اور یقین مانئے، آقا، ایسا کرنے کی خواہش بھی نہیں رکھتا۔ صندوق میں صرف نامکمل نقشے ہی تھے اور کچھ بھی نہیں!“

”وہ نقشے تو صحیح سلامت ہیں نا؟..... اور جب یہ بات ہے تو احمد تبتل پر شک کیوں؟“

وہ دونوں ایک دوسرے کے سامنے خاموش کھڑے رہے۔

”حضور، میں نے اپنے گھر پر ہونے والے حملے کا سچا قصہ آپ کے گوش گزار کر دیا ہے۔ التجا ہے

کہ معاملے کی تحقیقات کی جائیں۔“

”میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ آقا احمد تبتل شاہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ ہمارے

حکمران کی بڑی ملکہ فاطمہ سلطان بیگم کے رشتے دار ہیں۔ ہاں، یاد آگیا، آج صبح ہی صبح وہ ہماری سلطنت کے دار الحکومت آخى روانہ ہو گئے، فاطمہ بیگم صاحبہ نے یاد فرمایا تھا۔“

”اگر صندوق والی تصویریں اس بے ریش کے ہاتھ لگ جاتیں تو وہ انہیں آخى لے جا کر یقیناً

شاہ یا ان کی بڑی ملکہ کو جو اس کی بہن ہیں، دے دیتا۔“ یہ سوچ کر فضل الدین کا دل دھک سے

ہو گیا۔ ”خان زادہ بیگم کی تصویر کی ضرورت احمد تبتل کو کیا صرف اس لئے پڑی تھی کہ وہ مجھے تباہ

کر دے؟ کیوں نہیں؟ شاہی خاندان سے تعلق جو رکھتا ہے۔ کنوارا بھی ہے اور عمر کے لحاظ سے

اس کی شادی ہو جانی چاہئے تھی۔ اسے شاہ کا داماد اور خوبصورت شہزادی کا خاوند بننے کی سوجھی

ہے۔“

فضل الدین کو لگا جیسے وہ کمزری کے لئے جالے میں پھنس گیا ہو اور اس نے سوچا کہ اس جالے

سے نکلنا چاہئے، کسی بھی طرح!

”داروغہ صاحب، ہمارے مہمان حکمران نے یہاں اندجان میں مجھے آپ کی حفاظت میں رکھا ہے۔ اگر آپ ڈاکوؤں کو سزا نہ دیں گے تو یہ خادم براہ راست شاہ معظم سے درخواست کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔“

”یہ نہ بھولے، میر عمارت صاحب کہ شاہ معظم تک آپ سے پہلے آپ کے وہ الفاظ پہنچ جائیں گے جنہیں آپ بار بار دہراتے رہتے ہیں۔“

”کون سے الفاظ، داروغہ صاحب؟“

”کچھ لوگ ایسے ہیں..... جنہیں یہ کتنا پسند ہے۔“ لوگوں کے دل دماغ پر اپنی چھاپ بادشاہ نہیں بلکہ شاعر، معمار اور مصور چھوڑ جاتے ہیں۔“ دراصل کچھ لوگ کہتے ہیں، کچھ سنتے ہیں..... شاعروں اور معماروں کے دوست ہمارے بھی تو دوست ہوتے ہیں۔“

”ارے، تو یہاں مخبر اور چغل خور چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں لیکن اپنے خوف کا اظہار سب سے زیادہ خطرناک ہو گا“ فضل الدین نے سوچا اور تلخ لہجے میں کہا:

”یہ سب محض بہتان تراشی ہے۔ میں ایسے بہتوں سے واقف ہوں جو آپ کے بارے میں بھی الٹی سیدھی افواہیں پھیلاتے رہتے ہیں! اور یہ بات آپ کے علم میں بھی ہے..... میں اندجان میں جتنی بھی شاندار عمارتیں تعمیر کرتا ہوں ان پر اپنے قلم سے اپنے حکمران شاہ عمر شیخ کے نام ہی کو جاوداں کرتا رہتا ہوں! قلعے والے محل کے پھانک پر ذرا ایک بار پھر تو نظر ڈالئے! ذرا شہر کے باہر والی شاہی حویلی کو تو دیکھئے! وہاں کہیں میرا نام بھی لکھا ہے؟ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تاریخ میں میرا نام نہیں بلکہ ہمارے حکمران کا نام ہمیشہ زندہ و تابندہ رہے گا۔ یہی وہ بات ہے جس کا میں خیال رکھتا ہوں۔ یہ سچ ہے یا نہیں؟ فرمائیے!“

ازون حسن بوکھلا اٹھا، اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

”اور آپ ہیں کہ چوروں ڈاکوؤں سے میری حفاظت کرنے کے بجائے میرے خلاف جھوٹی افواہوں کو ہوا دے رہے ہیں! اوہ، خدایا! میں شاہ والا شان سے آپ کی شکایت کروں گا!.....“

اسے یہ بات نہ کہنی چاہئے تھی۔ ازون حسن فوراً ہی شیر ہو گیا:

”میری شکایت کیجئے گا؟“ اس نے اپنے سر کو کچھ اور تان لیا۔ تو جابیئے، ناکہجئے شکایت! آپ سے ڈرنا کون ہے۔ اس قیامت کی گھڑی میں جب کہ دشمن ہمارے اوپر تین طرف سے یلغار کر رہے ہیں، شاہ والا شان کو سلطنت کے جنگ جو بیگم کی ضرورت ہے، عمارت سازوں کی نہیں!

احمد تہل اور میرے جیسوں کی خاطر ہمارے حکمران آپ کے جیسے دسیوں کو دھتکار کر نکال باہر کریں گے۔“

”جب ہم آخری پہنچیں گے تو دیکھیں گے کہ کس کو دھتکار کے بھگایا جاتا ہے!“ فضل الدین آگ بگولا ہو کہ چیخ پڑا۔

وہ تیزی کے ساتھ مڑ کے داروغہ شہر کے دفتر سے اس انداز سے نکلا جیسے اسی وقت آخری جا رہا ہو۔ لیکن گھر پہنچ کے اس کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ اڑون حسن کے الفاظ واقعی تلخ حقیقت ہی تو تھے۔ مرزا عمر شیخ کے میر عمارت کی طرف ندراری اور بیگوں اور سپاہیوں کی مخالفت (ایسے نازک وقت میں!) کرنے کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔ وہ لوگ تو اصلی فوجی تھے، لشکر میں زبردستی بھرتی کئے جانے والے اناڑی دھقان نہ تھے۔ ”اور نہ ہی بے مصرف میر عمارت“ فضل الدین تنگی سے مسکرایا۔ اس نے سوچا اس کا مطلب یہ ہے کہ احمد تہل آج ہی آخری پہنچ کر محل میں جائے گا اور جھوٹی سچی بکواس شروع کر دے گا۔ فضل الدین نے شہزادی کی تصویر بنائی ہے..... شاہی خاندان کی ناک کٹ گئی! کینیڑوں کو الگ ہٹا کر منڈوے میں خازنہ بیگم سے ملاقات؟! جاندار فرد کے جاندار حسن و جمال کو کانڈ پر اتارنا اور وہ بھی ایسے فرد کے حسن و جمال کو؟!

دختر شاہ کی توہین کرنے والے درے برسائے جائیں، اسے سنگ سار کیا جائے تاکہ کبخت تڑپ تڑپ کے جان دے!

فضل الدین پر بخوبی واضح ہو گیا کہ خان زادہ بیگم کی فرمائش پوری کر کے اس نے کتنا سنگین خطرہ مول لے لیا ہے۔ کتنی بے پایاں مسرت کا احساس ہوا تھا اسے برش اور قلم کے ذریعے اس حسن بے مثال کو کانڈ پر منتقل کرتے وقت! لیکن اس تصویر کے غیروں کے ہاتھ لگ جانے یا اس پر کسی غیر کی نگاہ پڑنے کا بھی مطلب یہ تھا کہ جس کا یہ حسن ہے خود اسی کے سر پر بلائیں منڈلانے لگیں۔ فضل الدین نے مرتعش ہاتھوں سے خان زادہ بیگم کی تصویر کو خفیہ خانے سے باہر نکال لیا۔ کینے بیگوں کے لئے کوئی ثبوت نہ باقی رہنا چاہئے، تصویر کو ضائع کر دینا چاہئے! اسے نذر آتش کر دینا چاہئے، نذر آتش!

برش اور قلم کے ذریعے یہ تصویر بڑی باریکی کے ساتھ بنائی گئی تھی۔ اس سے ایک عجیب و غریب دو شیزہ جھانک رہی تھی، ہو ہو کسی جیتی جاگتی دو شیزہ جیسی۔ شمع کی دھندلی روشنی میں بمشکل ہی نظر آنے والی لمبی لمبی پلکیں مرتعش سی معلوم ہو رہی تھیں اور سرخ لبوں پر دلاویز تبسم رقصاں تھا۔ خان زادہ بیگم کی خوبصورتی اور دلکشی نے میر عمارت کو ایک بار پھر اپنا گرویدہ بنا لیا۔ ”کیا میں

واقعی اس دوشیزہ کی محبت میں گرفتار ہو گیا ہوں؟“ فضل الدین نے حیرت و مسرت کے ساتھ سوچا۔
 ”کوئی مفلوک الحال شخص شہزادی کی محبت میں گرفتار ہو جائے تو کیا یہ ہنسی کی بات نہیں؟ لیکن جب
 وہ مفلوک الحال شخص مصور بن جائے تو؟ نہیں! میں تو اپنے شاہکار سے محبت کرتا ہوں۔ اسے نذر
 آتش کر دینا چاہئے! زندہ رہوں گا تو ایسی ہی دوسری تصویر بنالوں گا!“

وہ تصویر کو جلانے کے لئے بڑھا لیکن جلا نہ سکا۔ اسے یوں لگا جیسے خان زادہ بیگم کا چہرہ بے رحم
 لپٹوں میں گھر کر شدت درد سے مسخ سا ہو گیا۔ وہ شمع کے پاس سے الگ ہٹ گیا۔ زندہ فرد کی جان
 لے لینا، خود اپنی محبوبہ کو نذر آتش کر دینا۔ بھلا یہ کیسے ممکن تھا؟! اسے اپنے دل کی گہرائیوں سے
 دھمکی آمیز چیخ سنائی دی۔ تم بزدل ہو! بزدل! تمہارے حریفوں نے ابھی تمہارے در پر دستک بھی
 نہیں دی اور تم ارتکاب جرم پر آمادہ ہو گئے! خود کو فریب دینے کی حماقت میں نہ مبتلا ہو۔ ایسے
 شاہکار کی تخلیق تم اور کبھی بھی نہ کر سکو گے! تم نے صرف ایک ہی حسن کی نقاشی نہیں کی، تم تو
 شہزادی کی ساری نزاکت و نفاست کی، اس کی یکتائی کی عکاسی کرنے میں کامیاب ہو گئے ہو اور ایسی
 شاندار کامیابی دوبارہ حاصل ہونے سے رہی!.... مرو ہو تو اسے محفوظ رکھو!

فضل الدین نے تصویر کو دوبارہ صندوق کے خفیہ خانے میں چھپا دیا۔ پھر اس نے نوکر کو آواز دی
 ”فورا سامان باندھو، ارابے میں گھوڑا جو تو! ہم یہاں سے چلے جائیں گے! آج ہی! اسی وقت!“



فضل الدین نے بہنوئی کے گھر پر آپ بیتی سناتے وقت قریبی عزیزوں کو بھی نہ بتایا کہ اس نے
 آہنی صندوق کے اندر خان زادہ بیگم کی تصویر کو چھپا رکھا ہے۔ اس راز کو وہ اپنے سینے کے اندر ہی
 دفن رکھنا چاہتا تھا۔

”ہائے مقدر، ہمارا مقدر!“ طاہر کے والد نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”آپ ہمارا سارا تحفہ،
 ساری امیدیں آپ ہی سے وابستہ تھیں، فضل الدین۔ اور اب آپ خود ہی قسمت کی بے رحمی کا
 شکار ہو گئے..... ہمارے حکمران آپ کے آڑے نہ آئیں گے کیا؟“

”جنگ ختم ہوگی اور اللہ ہمیں فتح سے ہمکنار کرے گا تو میں حکمران کی خدمت میں حاضر ہوں
 گا۔ وہ میری داستان غم سن کر کرم فرمائیں تب تو کہنا ہی کیا لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا تو ہرات چلا جاؤں
 گا۔ سنا ہے کہ علی شیر نوائی کوئی شفا خانہ تعمیر کرانا چاہتے ہیں۔ ہم عمارت سازوں کے لیے چراغ
 امید اگر کہیں روشن ہے تو صرف نوائی کے ممکن ہی میں ہے۔“

”آخر ہرات ہی کیوں؟ ارے فضل الدین، دنیا میں اکیلا ہرات ہی تو نہیں ہے جو آپ کے فن

کی قدر وقت جانتا ہو۔ فرغانہ میں بھی ایسے لوگ موجود ہیں اور اہل قوا تو آپ کے اس پل کی بنا پر آج تک آپ کا نام احترام کے ساتھ لیتے ہیں۔“

”اس پل کے اوپر سے گزر کر کل یا پرسوں دشمن کا لشکر آئے گا! ہمارے سروں پر جو قیامت منڈلا رہی ہے اس کا تصور کر کے افسوس ہونے لگتا ہے کہ پہاڑوں سے بہتی ہوئی سیل بھی نہیں آرہی ہے جو اس پل کو بہا کر لے جائے! مجھے بہت خوشی ہوگی اگر یہ پل جل ہی جائے تاکہ اس پر سے گزر کے دشمن یہاں نہ آسکے!“

”واقعی پل تو کھڑی کا ہے اور اس پر تیل چھڑک کر آگ لگائی جاسکتی ہے“ طاہر نے جو خاموش بیٹھا ہوا تھا، سوچا۔ ”دشمن کی فوج صرف اسی پل کے ذریعے دریا کو پار کر سکتی ہے۔ دریا اترنے کے گھاٹ ہیں ہی نہیں، دور تک سرکڈے کی جھاڑیوں والا دلدلی علاقہ ہی پھیلا ہوا ہے۔ اگر یہ پل جل جائے....“ طاہر کو گرمی لگنے لگی گویا شعلوں میں لپٹا ہوا پل چٹاخ چٹاخ کی آوازوں کے ساتھ جل رہا ہو۔ ”یہی وہ سر ہے جو راجہ کو بچا سکتی ہے!“ اس نے اپنے والدین کی طرف دیکھا۔ ”ان لوگوں سے ذکر کروں؟ نہیں! ابا جان ایسے پر خطر کام میں پڑنے نہ دیں گے کیونکہ اکلوتا بیٹا ہوں.... ماموں جان تعلیم یافتہ آدمی نہ رہے، انہیں ایسے چکر میں نہ الجھانا ہی بہتر۔ مجھے جوان لڑکوں کو تلاش کرنا چاہئے جو وفادار اور دلیر ہوں۔“

طاہر دسترخوان کے پاس سے چپکے سے اٹھ کر احاطے میں آیا اور پھر گھر کے باہر گلی میں پہنچا۔ گھنے سیاہ ابر پاروں کے بیچ اب بھی کہیں کہیں ستارے نظر آرہے تھے۔ گھروں میں بتیاں گل ہو چکی تھیں چاروں طرف سنائے کا دور دورہ تھا۔ کتوں کے بھونکنے کی آوازیں تک نہیں سنائی دیتی تھیں۔

محمود بھی باہر آگیا گویا انی دونوں نے پہلے ہی سے ملاقات کا وقت طے کر رکھا ہو۔ اس نے فوراً ہی اپنی بہن کے جانے کی بات چھیڑ دی:

”وہاں دو قلعے میں رہے گی۔ اند جان کا قلعہ بہت مضبوط ہے....“

”کچھ ایسا مضبوط بھی نہیں“ طاہر نے اسے ٹوکا اور اپنے ماموں سے سنا ہوا قصہ فوراً بیان کر دیا۔

”اب کہاں پناہ نصیب ہوگی، خدایا!“

”ہمت مرداں، مدد خدا۔“ محمود تمہیں یہ کماوت یاد ہے نا؟ آؤ، میرے احاطے میں چلو۔ تمہیں

راز کو راز رکھنا آتا ہے؟“ اور دوسرے ہی لمحے اضافہ کیا: ہم پل کو نذر آتش کر کے دشمن کو آگے

بڑھنے سے روک دیں گے، سمجھے؟“

محمود نے طاہر کی اس تجویز کے قابل عمل ہونے پر شروع میں شک ظاہر کیا۔ اتنا بڑا توپیل ہے، بارش میں لکڑی کے آگ پکڑنے کا سوال ہی نہیں اٹھتا اور پھر پہرا بھی رہتا ہے۔

”ایسی جلد بازی بھی کیا! سنا ہے کہ آخی سے ہمارے حکمران لشکر کے ساتھ آرہے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے فوجیوں کو پل کی ضرورت ہوگی!....“

”حکمران نے اہل سمرقند سے نکر لینے کے لئے کوچ کیا ہوتا تو وہ کبھی کے یہاں پہنچ گئے ہوتے! دراصل وہ قلعے سے باہر آنے کا ارادہ نہیں رکھتے.... اور پھر قلعے بھی تو شکست تسلیم کر لیتے ہیں۔

مرغیان ہی کو دیکھو، ہتھیار ڈال دئے نا! میں تو کہتا ہوں:

”ہمت مرداں، مدد خدا“

”مجھے نہیں معلوم۔ گاؤں کے مقدم نے تو کہا تھا کہ حکمران آرہے ہیں۔ ہماری مدد کرنے آرہے

ہیں اس نے یہی کہا تھا“

”مجھے یقین نہیں ہے!“

”مجھے تو یقین ہے!“

”مجھے نہیں!“

آخی ۱

بلند پہاڑی پر واقع آخی کا قلعہ رات میں نوکیلی چٹان جیسا لگ رہا تھا۔ پہاڑی کے دامن کے قریب ہی کا سان سائے دریا سیر دریا پر ٹوٹ پڑا تھا اور دونوں طوفانی دریاؤں کی لہروں کے ایک دوسرے سے ٹکرانے اور کناروں پر تھپیڑے مارنے کی آوازیں دور سے ہی سنائی دے رہی تھیں۔
فرغانہ اور آخی کے حکمران مرزا عمر شیخ نے یہ رات حرم کی خواب گاہ میں اپنی اٹھارہ سالہ بیگم قارا کو زکے ہاں گزاری تھی۔

پلنگ ریشمی پردے کی آڑ میں تھا اور پردے کے سامنے رکھی ہوئی واحد شمع کی ہلکی سی لویوں ٹمٹا رہی تھی جیسے ارد گرد کی تاریکی سے خوف زدہ ہو کر کانپ رہی ہو۔
بچھلے پھر سرنہ کی دھیمی اور اداس صدا نے قلعے کے سنائے کو جھنجھوڑ دیا۔ پھر دو تاشوں کی تڑتڑ بھی اس صدا میں شامل ہو گئی۔ روزے رکھنا ہر مسلمان کا فرض ہونے کی بنا پر سحری کے وقت کا اعلان کرنے والے تاشوں اور سرنہ کی آوازوں پر شاہ و غلام یکساں طور پر متوجہ ہو جاتے تھے۔
گرمیوں کی راتیں چھوٹی ہوتی تھیں۔ صبح سے قبل بیدار ہونا اچھا نہیں لگتا تھا لیکن مجبوری تھی، سحری کی پابندی ہی ایسی تھی۔

قارا کو ز بیگم چپکے سے پلنگ پر سے اتر آئی۔ لیکن عمر شیخ نے جو بظلوں میں دو تکیوں کو دبائے، طاقتور ہاتھوں کو ریشمی چادر سے باہر نکالے لیٹا ہوا تھا، جہش تک نہ کی۔
خواب گاہ سے دو کمروں کے بعد ایک آراستہ و کشادہ طعام گاہ میں لگا ہوا شاندار دسترخوان عمر شیخ

کا منتظر تھا۔ شاہ نے گزشتہ شام کو افطار کے بعد ہی کہہ دیا تھا کہ سحری کے وقت اس کی تینوں بیگمات اور بچے موجود رہیں۔ بڑی بیگم فاطمہ سلطان، بھلی بیگم قتلوغ نگار خانم، سترہ سالہ شہزادی خان زادہ بیگم اور دس سالہ شہزادہ جمالتیر دسترخوان زادہ بیگم اور دس سالہ شہزادہ جمالتیر دسترخوان کے پاس پہنچ چکے تھے لیکن جب تک خود شاہ وہاں پہنچ کر کھانا نہ شروع کرتا تب تک ان لوگوں کے کھانے کو ہاتھ لگانے کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔

اتنے میں خواب گاہ کی طرف کھلتے ہوئے نقشی دروازے سے پتہ دروازے سے پتہ قد خوش سلیقہ اور خوش رو قارا کو ز طعام گاہ میں داخل ہوئی۔ اس نے شرماتے لگاتے ہوئے بڑی بیگمات کو سلام کیا اور بتایا کہ وہ حکمران کو بیدار کرنے کی جرات نہیں کر سکی۔

قارا کو ز کے شباب، حسن اور ہچکچاہٹ (ہچکچاہٹ؟ لیکن کون نہیں جانتا کہ یہ الہزلو کی ہی ان دنوں مرزا کی سب سے زیادہ منظور نظر بیگم ہے؟) نے فاطمہ سلطان کی پوشیدہ جلن کو فوراً ہی ابھار دیا:

”آپ نے ہمارے سر تاج کو ایسی گہری نیند سلا دیا ہے تو انہیں بیدار کرنے کی جرات کیوں نہیں کر پاتیں؟“

قتلوغ نگار بیگم کو یہ چوٹ! اچھی نہ لگی۔ اس قسم کی بات کیوں؟ وہ بھی بچوں کے سامنے؟ ”چھوڑیے بھی، بیگم، یہ سب نہ کہنے بھلا اس میں قارا کو ز بیگم کا کیا قصور!“ اس نے کہا۔ خان زادہ بیگم نے اپنی والدہ کو سوالیہ نگاہ سے دیکھا: ”کیا سارا قصور ابا حضور ہی کا ہے؟“ اس نے سوچا کیسا عجیب و غریب ہے والد محترم کا طرز عمل بھی۔ جنگ کے خطرے نے سب کو بدحواس کر رکھا ہے، دشمن آخسی کے دروازے پر آن کھڑا ہوا ہے جب کہ وہ خوب راحت میں کھوئے ہوئے ہیں اور ویسے بھی..... کتنا زیادہ وقت گزارتے ہیں وہ حرم میں! قارا کو ز بیگم ان کی دختر کی ہم عمر ہیں۔ شرم آتی ہے ان کی حالت کو دیکھ کر تو!

خان زادہ بیگم کو لگا کہ والد اندر آئیں گے تو وہ ان کی طرف نظر اٹھا کے دیکھ بھی نہ سکے گی۔ ”مجھے اجازت دیجئے، والدہ صاحبہ کہ یہاں سے چلی جاؤں..... سحری کا وقت ہو گیا..... میں اپنی کنیزوں کے ساتھ....“

”آپ کے والد صاحب پوچھ بیٹھے کہ خان زادہ بیگم کہاں ہیں تو ہم جواب کیا دیں گے کہیں برانہ مان جائیں۔ انتظار کر لیجئے، بیٹی..... ایسی عجلت بھی کیا!“

چاشنی گیر عورت اندر آ کے سب کو کورنش بجالائی اور دھیرے سے بولی:

”آسمان میں ستارے روپوش ہوتے جا رہے ہیں۔ سحری کا وقت نکلا جا رہا ہے۔ عالی جاہ نے سحری نہ کھانے کا فیصلہ کیا ہے کیا؟“

شوہر کو سحری کھلائے بغیر گرمیوں کے طویل دن میں روزہ رکھنے ورنائیک بیوی کے لئے خود سحری کھائے بغیر روزہ رکھنے سے کہیں زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔ لیکن بادشاہ کی نیند میں اس کی کون سی بیگم خلل ڈال سکتی تھی۔

صرف قارا کو بیگم۔ مرزا نے رات اسی کے ساتھ گزار دی تھی اور وہ خواب گاہ کے جہاں مرزا خواب شیریں میں کھویا ہوا تھا، دروازے پر جا کر میت کی طرح کھڑی ہو گئی۔

”گلے میں آلی ہے، آوارہ آلی ہے، آوارہ گھوڑی کہیں کی!“ قاطمہ سلطان نے سوچا۔ ”بیچاری کتنی بزدل ہے“ قلوغ نگار خانم نے سوچا۔ اور چاشنی گیر عورت نے معذرتی انداز سے قارا کو بیگم کی طرف دیکھا اور بولی:

”خدا آپ کو رستم جیسا طاقتور فرزند عطا کرے بیگم صاحبہ!..... ہماری امیدیں آپ ہی سے وابستہ ہیں۔“

قارا کو ز کے چہرے پر چھائے ہوئے سکون کی جگہ اچانک فکر مندی نے لے لی، وہ چپکے سے مڑ کے خواب گاہ میں داخل ہوئی اور اپنے پیچھے دروازہ بند کر لیا۔

مرزا عمر شیخ اب بھی گہری نیند سو رہا تھا۔ قارا کو ز بیگم طلائئ شمع دان اٹھا کر پردے کے پیچھے گئی اور اسے طاق پر رکھ دیا۔ شمع کی روشنی سیدھی مرزا کے چہرے پر پڑنے لگی لیکن وہ روشنی سے بھی بیدار نہ ہوا۔

قارا کو ز نے اپنی گستاخی سے خود ہی ڈرتے ہوئے دھیمی آواز لیکن ذرا سخت لہجے میں کہا:

”میرے سرتاج..... میرے سرتاج!..... آنکھیں کھولے!.....“

پھر وہ پلنگ کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی، اپنی کانپتی ہوئی نرم و نازک ہتھیلیاں شاہ کے ہاتھوں پر رکھ دیں اور گہرا کرٹھنڈی سانس لی۔ بستر سے گلاب کی خوشبو بکھر رہی تھی۔ گزشتہ شام کو عرق گلاب چھڑکا گیا تھا۔ نیند کی قوت سے مغلوب قارا کو ز دیر تک خاوند کے چہرے کو کتنی رہی۔ نیم دا لب اور زرد زرد سا پر سکون چہرہ۔ خونخوار حکمران؟ ارے نہیں، وجہ و تکلیل، طاقتور مرد۔ ابھی چالیس کے بھی تو نہیں ہوئے تھے۔ اس کے شوہر، اس کے آقا، پلوان..... اور نیند بھی پلوانوں ہی کی جیسی۔ کتنے عزیز و قریب تھے وہ! قارا کو ز بیگم کو جتنی ہوئی رات کا سکون یاد آیا اور دوسرے ہی لمحے اس کے رخساروں پر حیا کی سرخیاں پھیل گئیں۔ اچانک اسے خیال آیا کہ محبت کتنی نازک

اور تباہ کن چیز ہوتی ہے۔ آج آخری پر دشمن ٹوٹ پڑنے کو ہیں، کل جانے کیا ہو۔ قارا کو زیگم کا دل ڈوبنے سا لگا گیا کہ اس پر عمر شیخ کی موت کے لمحے کی جو بہت ہی قریب تھا، پیش خبری کا منحوس سایہ پڑ گیا ہو۔ وہ تیزی سے جھکی اور مرزا کی آنکھوں، ہونٹوں اور ہاتھوں کے بوسے لینے لگی۔

عمر شیخ چونک کے جاگا اور اٹھ کر بلیک پر بیٹھ گیا۔ وہ خواب آلود نگاہوں سے چند لمحات تک قارا کو زیگم کو یوں تکتا رہا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔

قارا کو زیگم کی بڑی بڑی آنکھیں خوف کے مارے کچھ اور زیادہ پھیل گئیں۔ خاوند کو بیدار کرنے کے لئے بوسے لے لئے تھے، کہیں وہ اسے بد تمیزی تو نہ تصور کریں گے؟

”آپ؟“ مرزا نے انگڑائی لی اور اپنی بیگم کے خوف کا سبب تازہ کر رہا۔

قارا کو زیگم نے سکون کی سانس لی۔

”میرے فرماں روا، سحری کا وقت گزرا جا رہا ہے۔“

”آپ کے بوسے ہر طرح کے کھانے سے زیادہ شیریں ہیں۔ ذرا قریب آئے ناں.....“

”لیکن وہاں.....“ قارا کو زیگم نے ہاتھ اٹھا کر دروازے کی طرف اشارہ کیا، ”وہاں بڑی بے چینی سے آپ کا انتظار کیا جا رہا ہے۔“

مرزا عمر شیخ کی نیند پوری طرح غائب ہو گئی اور وہ کام یاد آگئے جن سے دن میں بپتا تھا۔ اس نے اپنی بیگم کو ایک طرف ہٹا دیا اور بھویں سکوڑے، منہ سے ایک لفظ بھی نکالے بغیر بلیک سے نیچے اتر آیا.....

طعام گاہ میں جہاں فرش پر زردوزی کے کام کے گدے بچھے ہوئے تھے، وہ خاص دروازے سے اندر داخل ہوا۔ جسم پر شاندار لباس اور رعب دار چہرے پر کچھ کر گزرنے کا عزم۔ دستار میں نٹکے ہوئے قیمتی موتی اور پتکے پر زردوزی کا کام بڑی شان سے چمک رہا تھا۔ صیافت کی منتظر بیگمات معمول کے مطابق کورنش بجالائیں اور معمول کے مطابق ہی خاموش رہیں۔ اس کے سامنے بہت ہی اہم اور سنجیدہ مسئلہ یہ تھا کہ بیگمات میں سے کس کو کس جگہ پر بٹھائے۔

وادی فرغانہ میں دشمن تین اطراف سے دھاوا بولتے چلے آ رہے تھے اور خطرہ ہو گیا تھا کہ آخری کے قلعے کا محاصرہ کر لیا جائے گا۔ مرزا عمر شیخ اپنی بیگمات میں صلح صفائی کے مسئلے پر غور کر رہا تھا، مناسب اشاروں سے واضح کرنا چاہتا تھا کہ وہ ان میں سے ہر ایک کا خیال رکھتا ہے۔ بڑی بیگم سلطان کو اپنی اہمیت جتانے کی اوروں سے زیادہ ہی فکر رہا کرتی تھی۔ اس سے مرزا نے سب سے پہلے اپنے پہلو میں بیٹھنے کو کہا۔ فاطمہ کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں، وہ حکمران کے دائیں طرف

بیٹھنا چاہتی تھی لیکن عمر شیخ نے بائیں جانب بیٹھنے کا اشارہ کر دیا۔ دائیں جانب سے سب سے اہم جگہ پر بیٹھنے کا اشارہ اس نے قتلوغ نگار خانم کو کیا۔ عمر شیخ نے جان بوجھ کر ایسا کیا۔ خانم ولی عہد ظمیر الدین بابر کی ماں تھی۔ فاطمہ سلطان نے جلن کے مارے آنکھیں بھیجنی لیں۔

ہرن کے گوشت کے بیج کباب، بھنے ہوئے تیز اور دوسرے کھانے عمر شیخ کے بعد قتلوغ نگار خانم کو اور بعد میں کہیں جا کر فاطمہ سلطان کو پیش کئے جا رہے تھے۔ بالکل تازہ و نرم، منہ میں رکھتے ہی گھل جانے والا گوشت بھی فاطمہ سلطان کو گرم کئے ہوئے باسی کھانے کی طرح بے ذائقہ معلوم ہو رہا تھا۔

کسی کو بھوک نہیں لگی تھی لیکن طویل دن کا تصور کر کے ہر ایک زبردستی زیادہ سے زیادہ کھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ صرف قارا کو ز بیگم ہی جو قتلوغ نگار خانم کے پہلو میں بیٹھی ہوئی تھی گوشت کے بجائے کھیرے اور خربوزے کھا رہی تھی اور شربت پیتی جاتی تھی۔ گزشتہ روز وہ پیاس کی شدت سے تڑپتی رہی تھی اس لئے آج زیادہ سے زیادہ پی لینا چاہتی تھی۔

کھانے کے بعد چائے کا دور چلا جس کے دوران مرزا نے اپنی بیگمات کو بتایا کہ ریاست کے معاملات کتنے زیادہ الجھ گئے ہیں۔ پھر اس نے کہا:

”جسم کے تمام حصوں کو ساتھ رہنا چاہئے دانش مند ہمیں یہی سکھاتے ہیں۔ فاطمہ سلطان، قتلوغ نگار خانم، قارا کو ز بیگم اور میرے جگر کے ٹکڑو، خان زادہ اور جہانگیر“ مرزا نے ہر ایک کا نام لیتے وقت اس کی طرف دیکھا، آپ میں سے ہر ایک اس خاندان کا حصہ ہے۔ میری خواہش ہے کہ مصیبت کے ان ایام میں آپ ایک دوسرے کی عزت اور مدد کریں۔ ہاتھ اپنی جگہ پر اہمیت رکھتے ہیں اور آنکھیں اپنی جگہ پر۔ ہاتھ اور آنکھیں ایک دوسرے کو نقصان پہنچاتے ہیں تو دراصل تمام جسم کو نقصان پہنچتا ہے۔ اور انہیں اس کی سزا دی جائے گی!

سب پر واضح ہو گیا کہ طنز کے یہ تیر کس پر چلائے گئے ہیں۔ فاطمہ سلطان کی آنکھیں کچھ اور زیادہ سکلز گئیں۔ قتلوغ نگار کو فوراً ہی اپنے واحد فرزند بابر کا خیال آیا جو والدین سے دور اند جان میں مقیم تھا۔ حکمران نے اس کا نام نہیں لیا تھا۔ کیوں؟

”حکمران کے یہ الفاظ در بے بہا ہیں“ قتلوغ نگار خانم نے کہا اور پھر اضافہ کیا۔ ”اجازت ہو تو میں کچھ غرض کروں....“

عمر شیخ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”جنگ کا خطرہ بہت سنگین معلوم ہوتا ہے۔ میں ولی عہد مرزا بابر کی طرف سے فکر مند ہوں، وہ

ہم لوگوں کے پاس موجود ہوتے تو شاید اتنی فکر نہ ہوتی.....“
 ”اند جان کا قلعہ مضبوط ہے اور مرزا بابر کی موجودگی میں تو یہ ناقابلِ تسخیر ہے۔ میں نے ان سے
 بہت امیدیں وابستہ کر رکھی ہیں۔“

خانم سے انکار کر دیا گیا تھا۔ فاطمہ سلطان نے اپنے بیٹے جہانگیر کو جو نیند سے مغلوب ہوا جا رہا
 تھا، قریب کھینچ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا گویا کہ کہہ رہی ہو۔ ذرا یہ لومڑی دیکھ لے کہ ان دونوں
 میں زیادہ خوش قسمت کون ہے! میرا بیٹا میرے پاس ہے، اپنی ماں کے پاس ہے۔ اور وہ ”ولی عہد“

.....

”مرزا بابر کی ماں ولی عہد کی تعریف کے لئے حکمران کا شکریہ ادا کرتی ہے۔“ قتلوغ نگار خانم پل
 بھر کے لئے خاموش ہو گئی۔ ”لیکن..... آخر ایسا کیوں؟ نابالغ جو ابھی بارہ برس کا بھی نہیں ہوا.....
 اسے میدانِ جنگ میں....“

”ارے بیگم، کوئی خطرے کی بات نہیں۔ مرزا بابر کے ساتھ ہمارے بہترین بیگ وہاں مامور
 ہیں۔ وہ کم سن ضرور ہیں لیکن انہیں فنِ حرب میں مہارت حاصل کرنی ہی ہوگی۔ میری قسمت میں
 مرنا ہی لکھا ہو تو میری جگہ سپہ سالار بابر ہی لیں!“

شاہ کی زندگی کا یہ انتالیسواں ہی سال ہے اور وہ اچانک اپنی موت کی باتیں کرنے لگے۔ لعنت ہو
 جنگ پر! بیگمات اس خیال سے مغموم ہو گئیں۔ خان زادہ بیگم کے دل میں باپ کے متعلق ابھی ذرا
 دیر قبل ہی جو خیالات آئے تھے انہیں بھول کر وہ مرزا کے چہرے کو محبت بھری ہمدردی سے نکتے
 لگی۔ عمر شیخ نے اس خیال سے کہ سب صاف صاف سن اور سمجھ لیں، اپنی بات واضح اور بلند آواز
 سے جاری رکھی:

”اگر میں میدانِ جنگ میں کام آجاؤں یا اتفاقاً“ کسی اور وجہ سے چل بسوں تو آپ سب کو مرزا
 بابر کے احکام کی تعمیل اسی طرح کرنی چاہئے جیسے اس وقت میرے احکام کی کرتے ہیں۔ مرزا
 جہانگیر! آپ سو رہے ہیں کیا؟“

شہزادہ اچانک چوکنے لگا اور اس نے فوراً ہی تعظیماً ”سنئے پر ہاتھ رکھ کر کہا:

”فرمائیے، حکمران!.....“

”میرے ان الفاظ کو آپ بھی یاد رکھئے گا! مرزا بابر آپ سے صرف دو سال بڑے ہیں لیکن اگر
 وہ میرے جانشین بنیں تو آپ ان کے وفادار فرزند بن کر رہئے گا۔“

”بے شک، حکمران!“

لڑکا باپ کے ان لفظوں میں مضمحل مگر معنویت کو نہ سمجھ سکا لیکن فرماں برداری کا وہ بہر حال عادی ہو چکا تھا۔ دونوں بڑی بیگمات پر ہول طاری ہو گیا لیکن خود اپنی فکر کرنے کی بنا پر۔ قارا کو زکی آنکھیں ڈبڈبا آئیں (وہ خاندان کے چہرے کو ٹٹکی باندھے دیکھ رہی تھی)۔ عمر شیخ نے اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ لئے اور اسے بیگم کے پچھلے پہر کے بوسے یاد آ گئے لیکن اس یاد سے جانے کیوں اسے مسرت کا احساس نہ ہوا۔ ”لگتا تھا میت کے الو داعی بوسے لے رہی ہوں“ اس نے سوچا۔ ”اور خود میں نے جو کچھ کہا وہ بھی وصیت جیسا لگتا ہے۔“ عمر شیخ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا گویا انباہ دے رہا ہو۔ یہ مجھے ہو کیا رہا ہے؟ کیا واقعی مجھے عزرا نسل کی آمد کا احساس ہو رہا ہے؟ نہیں، نہیں!“

خان زادہ بیگم نے اپنے والد کے دل کی پریشانیوں کو بھانپ لیا، ”انہیں مدد کی ضرورت تھی، بیٹی کی مدد کی!“

”میرے حکمران، آپ کی دختر دعا کرتی ہے کہ پروردگار تپ کو شیخ سعدی جیسی طویل عمر عطا کرے! آپ سو برسوں تک زندہ و سلامت رہیں!“

”خدا آپ کی دعا قبول فرمائے، عزیز دختر“ مرزا عمر شیخ جیسے سوتے سے جاگ پڑا، جیسے اسے پہلی بار احساس ہوا کہ بیٹی کتنی عقل مند ہے، اس کی خوبصورتی میں کیسی چٹنگی آچکی ہے۔ ”پہلا کام میں اب جو کروں گا وہ ہے آپ کی شادی!“

خان زادہ بیگم کی شادی سمرقند کے حکمران کے بیٹے بائے سنقور سے کرنے کی بات ایک بار چلی تھی لیکن عمر شیخ نے اس رشتے کی منظوری قطعی طور پر ابھی نہیں دی تھی۔ اور اب سمرقند کے حکمران سے جنگ چھڑنے والی تھی۔ یہ سچ تھا کہ عمر شیخ سنگین صورت حال پیدا ہو جانے پر بیٹی کی شادی اپنے بڑے بھائی کے بیٹے سے کر کے اس قدیم روایت کا سہارا لیتے ہوئے جنگ کو امن کی شکل دے سکتا تھا۔ لیکن خود خان زادہ بیگم بھی اس بات کو سمجھتی اور اس کے امکان سے اتنی ہی خائف تھی جتنی کہ شب کی تاریکی سے۔ اس کے خواب تو کچھ اور ہی تھے۔ یہی سبب تھا کہ اس نے گفتگو کا رخ شادی سے ہٹا کر اس مسئلے کی طرف موڑنے کی کوشش کی جو پہلے چھڑا ہوا تھا۔

”اگر برادر عزیز مرزا بابر کو آخسی بلانا ممکن نہ ہو تو آپ مجھے اور میری والدہ محترمہ کو اندجان جانے کی اجازت دے دیجئے“ اس نے ہمت کر کے تجویز پیش کی۔

”دختر من، آپ تو میرے خزانے کا در بے بہا ہیں۔ میں ایسے پر خطر ایام میں آپ کو اپنے سایہ عاطفت سے جدا نہیں کر سکتا!“

”اس صورت میں، حکمران، مجھے اکیلے ہی جانے کی اجازت دے دیجئے! قتلوغ نگار خانم میں

دوبارہ جان پڑ گئی۔

”آخر اتنی عجلت کیوں، خانم؟ ہمیں مرغیلان سے قاصد کی آمد کا انتظار ہے۔ ممکن ہوا تو اجازت مل جائے گی۔۔۔۔۔“

عمر شیخ نے جلدی جلدی نماز فجر ادا کی، کھڑا ہوا اور حرم سے باہر نکل آیا۔ اب اس کا ذہن جنگ کے مسائل سے معمور تھا۔

مرزا کے محافظین حرم میں داخلے کی ممانعت کی بنا پر تمام رات باہر کھڑے حکمران کا انتظار کرتے رہے تھے۔ اب وہ چند قدم الگ ہٹ گئے تاکہ حکمران کے غور و خوض میں خلل نہ ڈالیں، اپنی طرف اس کی توجہ نہ مبذول کرائیں۔ پھر وہ دھیرے دھیرے، دبے پاؤں اس کے پیچھے پیچھے چل دئے۔

سحر نمودار ہوئی۔ سپہ سالار بیگ اور درباری ظلوع آفتاب سے قبل ہی جمع ہو چکے تھے۔ ان لوگوں نے دیوان خانے میں کورنشات کے ذریعے مرزا عمر شیخ کا خیر مقدم کیا۔ سب سے پہلے وزیر اعظم۔ جسم پر زری کا شاندار چونچہ، کمر پر عمراور عمدے کے بموجب پٹکا اور چہرے پر کھنی کھنی سی داڑھی۔ اپنی جگہ پر سیدھا کھڑا ہوا۔ مرزا نے اس سے دریافت کیا کہ قاصد کہاں سے آیا ہے۔

”اسفرہ سے، عالی جاہ۔“

اور وہ دوبارہ اس طرح کورنش بجالایا کہ اس کا چہرہ چھپ گیا۔

”خبریں کیا ہیں؟“

”عالی جاہ اپنے غلام پر رحم فرمائیں۔۔۔۔۔“

”اچھا، مطلب یہ کہ اسفرہ پر بھی دشمن قابض ہو گیا!“

پھر عمر شیخ نے اپنے جسم میں مسلسل کپکپی محسوس کرتے ہوئے مرغیلان کے قاصد کے متعلق دریافت کیا۔

”عالی جاہ، مرغیلان کے قاصد کا بڑی بے تابی کے ساتھ انتظار کیا جا رہا ہے۔“

کیا مرغیلان کو بھی شکست کا منہ دیکھنا پڑے گا؟ لیکن تب تو اندجان کے لئے بھی خطرہ پیدا ہو جائے گا! آخر قاصد آئے کیوں نہیں؟ کہیں پھندے میں پھنس گئے، مگر فادار کر لئے گئے کیا؟ کہیں خود اہل مرغیلان ہی نے تو غدار ی نہیں کر دی؟

”کیا عالی جاہ دوسرے قاصدوں کی روانگی کا حکم صادر فرمائیں گے؟“

”جو اب لانے والے قاصدوں کا ایک بار پھر راستہ دیکھا جائے؟ آخر کتنے دنوں تک انتظار

کرتے رہیں گے؟“

وزیراعظم دوبارہ کورنش بجالایا اور معذرت چاہنے کے انداز میں اگلے قدموں پیچھے ہٹ گیا۔
مرزا پر روز روشن کی طرح عیاں ہو گیا کہ آخسی یقیناً محاصرے میں آجائے گا۔ اس نے چھ
مہینوں کے لئے کافی رسد جمع کر لئے جانے کا حکم دیا۔ قلعے کے بلند پہاڑی پر واقع ہونے کی بنا پر وہاں
آب رواں میسر نہ تھا۔ مرزا نے عقل مند اور انتظامی صلاحیتوں کے مالک تیس سالہ قاسم بیگ کو
قلعے میں پتھروں کا ایک بہت بڑا حوض تعمیر کرا کے اسے ستوں کے ذریعے لبالب بھروانے کی ذمہ
داری سپرد کر دی۔

بیگوں نے یہ دیکھ کر کہ شاہ بہت بھنایا ہوا ہے، اس کے احکام کی تعمیل جلدی جلدی شروع
کر دی۔ خود عمر شیخ گھوڑے پر سوار ہو کر گھڑسوار محافظ دستے کی معیت میں قلعے سے روانہ ہو گیا۔
یہ گھڑسوار دریا کے بلند کنارے پر واقع کبوتر خانے کی طرف گئے جس کا اوپری برآمدہ کراڑے
پر آگے کی طرف نکلا ہوا تھا۔ آخسی سے روانہ کئے جانے والے قاصدوں کے لاپتا ہو جانے کی بنا پر
مرزا نے نامہ بر کبوتروں سے کام لینے کا فیصلہ کیا تھا۔

در اصل اب ساری امیدیں اڑ کر مرغیلان اور قوقند جانے کے لئے سدھائے گئے انہی کبوتروں
ہی سے وابستہ تھیں۔ کبوتروں کو باہر نکال کر انہیں ذرا پرسکون ہو جانے کا موقع دیا گیا اور پھر گول
گول لپٹے ہوئے خط ان کے بازوؤں کے نیچے باندھ دئے گئے۔ مرزا عمر شیخ کو خود بھی کبوتر اڑانے کا
بہت شوق تھا۔ وہ ایک نیلگوں کبوتر کو ہاتھوں میں احتیاط سے پکڑ کے چوبلی زینے سے کبوتر خانے کی
چھت پر چڑھ گیا۔

وہاں سے قرب و جوار کا سارا علاقہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ دور پہاڑیوں کے عقب سے
آفتاب دھیرے دھیرے ابھر رہا تھا اور نیچے اس کی شعاعوں میں دریا کی سطح جھلما رہی تھی۔ نسیم سحر
رخساروں کو ہولے ہولے سلاتی ہوئی سی معلوم ہو رہی تھی۔ مرزا آخسی کے قلعے کی مورچہ بندی
اور پہاڑی کے نیچے پیچھے ہوئے خندقوں کے ٹیڑھے میڑھے جال کو کافی دیر تک دیکھتا رہا۔ ”یہ
خندقیں میرے دشمنوں کی لاشوں سے پٹ جائیں گی“ اس نے سوچا۔

اسے یا اس کے آدمیوں کو کبھی شک بھی نہیں ہوا تھا کہ دریا کا تیز دھارا جانے کب سے
کنارے کو کاٹتا جا رہا ہے، نیلے کے نیچے کی چٹانوں کو برہنہ کر کے کبوتر خانے کی بنیادوں کو کھوکھلا کرتا
جا رہا ہے۔ کبوتروں کو البتہ جیسے خطرے کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ اپنے صاف ستھرے خوبصورت
ڈربلوں میں بے چینی سے پر پھر پھڑپھڑاتے رہتے تھے۔ اس وقت بھی گلنے کے دانے اور صاف پانی کی

طرف ذرا بھی نہیں متوجہ ہو رہے تھے اور گھبراہٹ کے ساتھ ڈربوں کی تیلیوں میں چونچیں مار مار کر باہر نکلنے کے کوشاں تھے۔ کبوتر باز سمجھ نہیں پاتے تھے کہ آخر کبوتروں کی ان حرکات کا مطلب کیا ہے اور ان سے درباری کبھی اس بارے میں پوچھتے تو وہ جواب نہیں دے پاتے تھے، بس شانے اچکا کے رہ جاتے تھے۔ اس وقت فقط وہی ایک نیلا کبوتر پرسکون تھا جو مرزا کے ہاتھوں میں تھا۔

عمر شیخ نے چھت کے بالکل کنارے پر جا کر کبوتر کے نرم پروں کو پل بھر کے لئے ہونٹوں سے سنا لیا اور یوں سرگوشی کی گویا کبوتر اس کی بات کو سمجھ سکتا ہو: ”عزیز کبوتر، اڑ کے مرغیلان جا۔ جلدی سے خوشخبری لا جا۔۔۔۔۔“ اس نے پیچھے ہٹ کر اپنے طائر امید کو نیلگوں فضاؤں میں اچھال دیا۔ عین اسی لمحے، اسی معمولی سے جھکے سے بنیاد کا جو کٹ کر کرہہ چلی تھی، سہارا نہ رہ جانے کے باعث کبوتر خانے کا چوبی ڈھانچا خم ہو کے چر مارتا ہوا نیچے گرنے لگا۔ پہلے اگلا حصہ پانی میں گر کے کھسنے لگا اس کے بعد کبوتر خانے کی پچھلی دیوار اور اڈا دیرے دیرے پھر تیزی سے لڑھکتے غبار کے بادل اڑاتے، عمر شیخ کے بھاری بھر کم جسم کو ساتھ لئے ہوئے خندق میں آن گرے۔ اس کی دل دوز چیخ نیچے گرتے ہوئے شہتیروں، تختوں، اینٹوں کے ٹکڑوں اور دریا کے شور میں ڈوب کر رہ گئی۔ وہ اپنی زندگی کے آخری لمحے میں صرف غبار کے بادلوں سے تیزی کے ساتھ آسمان کی سمت پرواز کرتے ہوئے کبوتر ہی کو دیکھ سکا۔۔۔۔۔

۳

میت کو محل میں لا کر غسل دیا گیا۔ اس بری طرح زخمی ہو گیا تھا کہ پہچانا نہیں جاتا تھا۔ کشادہ کمرے میں جہاں چند گھنٹے قبل تک سحری کھانے کے سلسلے میں سارا خاندان موجود تھا، قارا کو زینیم، قلوغ نگار خانم سے لپٹی ہوئی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

”میں، میں ہی وجہ ہوں حکمران کی موت کی، ہائے، خانم آیا! کیوں جگایا تھا میں نے، کیوں جگایا تھا اپنے سر تاج کو؟!۔۔۔۔۔ ہائے کتنی منحوس ہوں! میں ہی قصور وار ہوں ان کی موت کی! میں!“ قلوغ نگار خانم کو یاد آگیا کہ مرزا ان لوگوں کے سامنے کیسے عجیب انداز سے باتیں کر رہا تھا، لگتا تھا کہ جیسے وصیت کر رہا ہے۔ یہ یاد کر کے وہ زور زور سے رونے لگی۔

”ہائے ہائے، ارے انہیں اپنی موت کا احساس کیسے ہو گیا تھا؟ کس طرح کی باتیں کر رہے تھے آج وہ ہم سے، کس طرح کی باتیں!“

قارا کو زینیم، قلوغ نگار خانم سے الگ ہو کر بیٹھ گئی، سسکیاں بھرنے اور سر پیٹنے لگی۔

”ہائے، خانم آیا، میں نے اپنے فرزند کو پیدا ہونے سے پہلے ہی والد سے محروم کر دیا!“ وہ شدت

غم سے دھیرے دھیرے بولی۔ ”انہیں تو گزشتہ شام کو پہلی بار علم ہوا تھا اور انہوں نے خواہش ظاہر کی تھی: ”خدا ہمیں فرزند ہی عطا کرے!“ فرزند..... لیکن خود اس کے والد اب کہاں ہیں؟ کہاں؟..... ہائے، کیوں بیدار کیا تھا میں نے، کیوں بیدار کیا تھا میں نے حکمران کو؟ اس سے تو کہیں اچھا تھا کہ مجھ ہی کو موت آجاتی، کراڑے پر سے میں ہی گر پڑی ہوتی!“

”ایسی بات منہ سے نہ نکالے، عزیز ہمشیرہ!..... آپ کو تو فرزند کی خاطر جینا چاہئے! اور کراڑا؟..... کراڑے کے کنارے پر تو ہم بھی کھڑے ہیں! خطرناک کراڑا تو ہم بھی کا خطر ہے! یا خدا!“

قلوغ نگار خانم سوچنے لگی کہ شوہر کی یہ اچانک موت کیا عجیب و غریب اور پر سرار نہیں ہے؟ جنگ جو بادشاہ اور بہادر سپہ سالار مرزا عرش خانے کتنی ہی بارتنگی تلوار لئے گھوڑے کو میدان جنگ میں سرپٹ دوڑاتے رہے تھے لیکن وہ وہاں نہیں مارے گئے، مارے گئے تو دیر پا کا کراڑا منہ دم ہو جانے سے۔ کیا یہ محض اتفاقی بات ہی ہے؟ کہیں یہ خاندان کی بد بختی کا اشارہ تو نہیں؟ شوہر کے آبا و اجداد کی قائم کی ہوئی سلطنت کیا کراڑے پر بنی ہوئی عمارت جیسے نہیں ہے؟ اقریاش جنگوں سے ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہوا یہ ملک..... قلوغ نگار خانم کے پردہ تصور پر اچانک مستقبل کی تصویر نمودار ہونے لگی۔ وہ لرزا اٹھی کیونکہ اسے اپنا واحد بیٹا، اپنا لخت جگر باہر دکھائی دے گیا۔ اس نے سوچا کہ باپ کی زندگی کا چراغ کراڑے پر سے تباہ کن دھارے میں گر جانے سے گل ہو گیا۔ اب یہ بے درد لہرس کہیں باہر کو بھی تو نہ بھالے جائیں گی؟

نہیں! نہیں! اللہ انہیں ہمیشہ سلامت رکھے!.....

”اچھا اب میں اجازت چاہتی ہوں، بیگم“ اس نے قارا کو زینگم سے معذرت کی۔ ”جا کے اندجان کو قاصد روانہ کروں گی۔ بیٹے کو والد کے انتقال کی اطلاع مجھے خود ہی بھجوانی چاہئے.....“

قاسم بیگ شاہ مرحوم کی اس منجھلی بیگم کا برابر وفادار رہا تھا اور اب وہی غم زدہ اور شکوک اور اندیشوں کی ماری ہوئی قلوغ نگار خانم کے خط کو اس کی والدہ ایسان دولت بیگم کے پاس پہنچا سکتا تھا جو اندجان سے باہر واقع شاہی حویلی میں باہر کے ساتھ رہتی تھی۔

لیکن خانم کا یہ خط جس وقت قاسم بیگ کے ہاتھوں تک پہنچا اس وقت سلطان احمد تہل جسے فاطمہ سلطان نے خفیہ طور پر اندجان روانہ کیا تھا، دریاے سیر کا پل پار کر چکا تھا اور اس طرح قاسم بیگ سے کافی آگے نکل گیا تھا۔ اس نے لوگوں کی توجہ اپنی طرف نہ مبذول کرانے کے خیال سے صرف ایک سپاہی اپنے ساتھ لیا تھا حالانکہ گزشتہ روز جب وہ اندجان سے آخی آیا تھا تو ساٹھ گھڑ سوار سپاہی اس کے ہم رکاب تھے۔ آج فاطمہ سلطان نے اس سے بہت بہت بڑے انعام کا وعدہ

کیا تھا، اگر وہ فاطمہ سلطان کے وفادار بیگوں کو متحہ کر کے مرزا بابر کے بجائے مرزا جمالتیر کو تخت پر بٹھانے میں کامیاب ہو جائے گا تو..... احمد تہل کو عمر شیخ کے دربار میں کئی برسوں سے دوسرے درجے کے بیگوں کے ساتھ بیٹھنا پڑ رہا تھا جو اس کے لئے توہین آمیز بات تھی۔ اس صورت حال کو وہ بہت جھیل چکا تھا؟ جمالتیر کے تخت نشین ہونے کی صورت میں اس کا وزیر اعظم کے عہدے پر مامور ہونا یقینی تھا۔ اور اتنے کم سن لڑکے کی بادشاہی میں وزیر اعظم بننا۔ کیا خود ہی تخت شاہی پر جلوہ افروز ہونے کے مترادف نہ تھا؟ تب تو اسے خان زادہ بیگم کی تصویر کے پیچھے بھاگنے کی ضرورت ہی نہ پڑے گی۔ وہ تو خود خان زادہ بیگم ہی کو حاصل کر لے گا! اور یہ ایک حقیقت تھی کہ ایسی حور کے آقا بن جانے کے خواب سے زیادہ شیریں خواب احمد تہل نے اپنی زندگی میں کبھی بھی نہیں دیکھا تھا۔

اندجان

۱

اندجان میں ابھی امن کا دور دورہ تھا۔

شہر سے باہر واقع بلند چمار دیواری والی خوبصورت حویلی کے پھانک پر معمول کے مطابق پیریدار مامور تھے۔

”جنگ“ تو چمار دیواری کے اندر ہو رہی تھی۔ مرزا بابر بڑے جوش کے ساتھ فن حرب سیکھ رہا تھا۔ اس نے گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتے ہوئے لگام چھوڑ دی اور مستعدی اور پوری طاقت سے تانت کو کھینچ کر تیر چلایا۔ سنسناتا ہوا یہ تیر تیزی سے جا کے اس تختے میں چبھ گیا جو نشانے کا کام دے رہا تھا۔

چنار کے سائے میں کھڑے ہوئے گھڑسوار ولی عہد کو نشانے بازی کی مشق کرتے دیکھ رہے تھے۔ وہاں سے مزید بیگ اپنے مٹکی گھوڑے پر سب سے پہلے نشانے کے پاس پہنچا۔ وہ مرزا بابر کا استاد تھا۔ بابر اپنی جگہ واپس لوٹ آیا تو استاد نے جان بوجھ کر لاپرواہی سے کہا:

”نشانہ کچھ اونچا باندھا گیا تھا۔“ لیکن یہ دیکھ کہ لڑکے کے چہرے پر اداسی چھا گئی ہے، فوراً ہی اضافہ کیا: ”بس ذرا ہی سا اونچا۔ ویسے تیر چلانے کا انداز بہت خوب تھا۔“

مزید بیک نے تیر کو تختے سے نکال کر نشانے کی گہرائی اپنی انگلی سے ناپی اور بابر کو دکھائی:
 ”ولی عہد، آپ کے ہاتھوں میں بلا کی طاقت ہے! شیر کے بچے ہیں! ہمارے حکمران نے آپ کا
 نام بابر یوں ہی تھوڑی رکھا ہے۔“

مرزا بابر کے محافظین، خدمت گار اور کھیل کود میں ساتھ دینے والے ہم عمر بھی نشانے کے تختے
 کے پاس جمع ہو گئے۔ سب کو معلوم تھا کہ کمان بابر کی عمر اور قد کو مد نظر رکھتے ہوئے بنائی گئی ہے پھر
 بھی سب نے خوب خوب تعریفیں کیں۔ لیکن بابر کو خود بھی یہ سب معلوم تھا:

”شیر کے سے بچے تو میرے والد محترم کے ہیں۔ میں خود دیکھ چکا ہوں، ان کے تیر میرے تیروں
 کی نسبت دس گنی طاقت سے نشانے میں سرایت کر جاتے ہیں۔ وہ تو طاقتور سے طاقتور جوان پر بھی
 سکے سے وار کر دیں تو بچار ازمن پر ڈھیر ہو جائے گا۔“

”آپ کا یہ فرماں بردار بھی یہی عرض کرنا چاہتا ہے کہ آپ عالی جاہ پر پڑے ہیں اس لئے آپ
 کے ہاتھ شیر کے بچوں کے سے ہیں!“ مزید بیک نے بڑی ذہانت سے بات کا رخ موڑ دیا۔

بابر مسکرایا اور خاموشی کے ساتھ دھوپ سے سوتلائی ہوئی اپنی کشادہ پیشانی اور اوپری ہونٹ
 سے پسینے کے قطرے پونچھ ڈالے۔

”گرمی میں شدت پیدا ہوتی جا رہی ہے، ولی عہد۔ ایسے میں روزہ رکھنے سے آدمی غڑھال ہو جاتا
 ہے۔ افطار کے وقت تک آپ کو کسی طرح کی کمزوری نہ محسوس ہونی چاہئے۔ سائے میں بیٹھ کر ذرا
 دم لے لیجئے۔ آپ کا حکم بردار آپ سے رخصت ہونے کی اجازت چاہتا ہے، اسے اند جان کے
 دفاع کی تیاریاں کرنی ہیں۔۔۔۔۔“

لیکن بابر کو آرام پسند نہ تھا۔ اس کا جی تو گھونٹنے پھرنے اور شرارتیں کرنے کو چاہ رہا تھا۔ مزید
 بیک کے وہاں سے جاتے ہی اس کی آنکھیں شرارت سے چمک اٹھیں۔ اس نے گھوڑے کو روک
 کر چاروں طرف نظریں دوڑائیں اور اپنے ایک محافظ کو اشارے سے پاس بلایا۔ پھر بابر نے ہاتھ
 بدھا کر اس کے ماتھے پر تارے والے گھوڑے کی کاٹھی کو جھٹک کے دیکھا کہ کسی ہے یا نہیں۔
 کاٹھی مضبوطی سے کسی ہوئی تھی۔ تب اس نے سپاہی کو حکم دیا کہ پیچاس قدم آگے جا کے وہ اپنے
 گھوڑے سے نیچے اتر آئے اور اس کی لگام پکڑے ہوئے بابر کے قریب سے گزرے۔

بابر کے کم عمر ہم رکابوں میں سولہ سالہ نویان کو کھٹاش کی بات سب سے زیادہ مانی جاتی تھی۔ وہ
 بابر کی بہن کے ساتھ اس کی والدہ کے دودھ پر پلا تھا۔ نویان بابر کے ارادوں سے متاثر ہو کر فکرمند
 ہو گیا:

”ولی عہد“ آپ نے ابھی ابھی تو ایک مشق پوری کی ہے۔ کیا یہ کافی نہیں؟ باقی پیچیدہ مشقوں کو کل پر کیوں نہ اٹھا رکھیں؟“

”یوں ہی سہی۔ پیچیدہ مشقیں کل کے لئے چھوڑ دیتے ہیں۔ آج صرف ہلکی مشقیں ہی کریں گی۔“ بابر ہنس پڑا اور اپنے گھوڑے کو زور سے ایڑ لگائی۔

گھوڑا فوراً ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ بابر نے محافظ کو جو عام رفتار سے چلا آ رہا تھا، قریب پہنچ کے اپنے پیر رکابوں سے نکال لئے اور جیسے ہی اس کا بھورا گھوڑا کیت کے برابر آیا ویسے ہی اس کی طرف جھک کے دونوں ہاتھوں سے اس کی کاٹھی پکڑ لی اور اپنے گھوڑے کے اوپر سے بہ آسانی چھلانگ لگادی۔

محافظ کا کیت چھلانگ سے خوف زدہ ہو کے بھڑکا اور ایک طرف ہٹ گیا۔ بابر ایک لمحے تک فضا میں معلق سا رہا پھر اس کے پیر زور سے زمین سے ٹکرا گئے۔ لیکن کیت کی کاٹھی اس کی گرفت ہی میں رہی (واقعی اس کے ہاتھ بہت طاقتور تھے) اور وہ اسے پکڑے ہوئے لٹکا رہا۔ محافظ نے آنا ”فانا“ لپک کر گھوڑے کو روک لیا۔ بابر کے پیروں کے زمین پر گر کر کھانے سے نیم دائرہ سا بن گیا، اس کی ریشتی دستار سر سے اچھل کر دور جا گری لیکن وہ اپنے قدموں پر ٹکا رہا اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔ چہرے پر البتہ خاصی زردی چھا گئی تھی۔ نویمان اپنے گھوڑے کو دوڑاتا ہوا بابر کے پاس پہنچا اور دستار اٹھا کے دینے لگا لیکن بابر نے غبار آلودہ دستار پر اچھتی سی نظر بھی نہ ڈالی۔ وہ چابک کو ہاتھ میں پکڑ کر منہ سے ایک لفظ بھی نکالے بغیر ہی محافظ کے لائے ہوئے بھورے گھوڑے پر سوار ہو گیا۔

دوسرے ہی لمحے اس نے گھوڑے کو چابک رسید کیا اور اسے راستے کی پرواہ کئے بغیر درختوں کے درمیان سرپٹ دوڑانے لگا۔

گھڑ سوار عموماً ”باغ کے کنارے کنارے واقع راستے کو استعمال کیا کرتے تھے لیکن بابر سیدھا باغ کے اندر سے مل کھاتی ہوئی کنکریلی پگڈنڈی پر گزرنے لگا۔ گھوڑا ٹالیوں کو چھلانگ لگا کر پار کرتا تو بابر کا سر خوبانیوں کی مضبوط شاخوں سے ٹکرانے سے بال بال بچتا۔ اس نے جھک کے گھوڑے کی گردن مضبوطی سے تھام لی تھی اور اسے سرپٹ دوڑائے چلا جا رہا تھا۔ اس کے شانوں سے ٹکرا کر شاخوں سے ٹوٹ جانے والی خوبائیاں پانی میں چھپ چھپ کر رہی تھیں۔

”ارے احق، تم نے گھوڑے کو مضبوطی سے کیوں نہیں پکڑ رکھا تھا!“ نویمان غصے سے بابر کے محافظ پر برس پڑا۔ ”ولی عہد، ہم لوگوں سے ناراض ہو گئے ہیں۔ تمہاری وجہ سے ہم سب کو سرزنش

جھیلنی پڑے گی۔“

بابر نے گھوڑے کو باغ کے وسط میں واقع شاندار طور پر آراستہ برآمدے کے سامنے روک دیا۔ خدمت گار جو لگام تھامنے کے لئے بھاگا بھاگا باہر نکلا تھا، بابر کو برہنہ سر دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ خود بابر کا چہرہ یہ خیال آتے ہی سرخ ہو گیا کہ ثانی ایساں دولت بیگم ابھی اس کی یہ حالت دیکھ کر فوراً ہی سمجھ جائیں گی کہ قصہ کیا ہے۔ خدمت گاروں اور محافظوں کا اس سلسلے میں سزا بھگتنا یقینی تھا کیونکہ شاہ فرغانہ نے ثانی سے بابر کو آنکھ کی پتلی کی طرح رکھنے کو کہا تھا اور اسی لئے خدمت گاروں اور سپاہیوں سمیت یہ جاگیر عطا کی تھی۔

اتنے میں قریبی دوست لڑکے اور محافظ ڈرے سہے برآمدے کے سامنے پہنچ گئے اور بابر اندر چلا گیا تو یہ لوگ اپنے گھوڑوں سے نیچے اتر آئے۔ نویان کو کلتاش نے بابر کی دستار کا غبار جھاڑ دیا تھا اور اب اسے ہاتھوں میں سنبھالے ہوئے تھا۔ بابر ٹوپی پن کر اس اطمینان کے ساتھ باہر آیا کہ اب ثانی کچھ بھی نہ پوچھیں گی۔ اس نے آئے ہوئے لوگوں پر نظریں دوڑائیں۔ وہ محافظ جو بھڑک جانے والے گھوڑے کی لگام کو تھامے نہیں رہ سکا تھا، معافی مانگنے کے لئے بابر کے قدموں پر سر رکھنے کو لپکا لیکن بابر نے اسے فوراً ہی گھٹنوں کے بل بٹھادیا اور خود مڑکے نویان کو کلتاش کی طرف رخ کر لیا۔ نویان کو دیکھ کے ہنسی آتی تھی، دستار کو دونوں ہاتھوں سے تھامے یوں سنبھال سنبھال کے چل رہا تھا گویا کوئی نازک اور بہت ہی قیمتی صراحی اٹھائے ہوئے ہو۔ محافظوں اور قریبی احباب کو ڈانٹ سننے کی توقع تھی لیکن سنا انہوں نے قہقہہ۔ بابر بچوں کی طرح سر پیچھے کی طرف جھکا کے قہقہے لگا رہا تھا۔ نویان کو کلتاش نے بھی اپنے ہاتھوں کی دستار کو اب دوسری ہی نظروں سے دیکھتے ہوئے قہقہہ لگایا۔ دوسرے لوگوں کے سروں سے بھی پہاڑ ٹل گیا اور وہ بھی ہنسنے لگے۔ پھر بابر ہنسی روک کے اس محافظ کی طرف مڑا جس کا گھوڑا بھڑک گیا تھا اور بولا:

”تمہارا کوئی قصور نہیں تھا.....“

محافظ اتنا بڑا انعام پا کر بار بار سر کو تعظیماً خم کرتا ہوا، دھیرے دھیرے اٹلے قدم پیچھے ہٹ گیا۔

تب بابر نے نویان سے کہا:

”ثانی جان کو بھنک بھی نہ لگتی چاہئے۔“

”ہاں، ولی عمد، ہماری بھی یہی خواہش ہے“ نویان کی باچھیں کھل اٹھیں اور اس نے اپنے

ساتھیوں کو آنکھ ماری۔

وہ سب لڑکے تھے اور جانتے تھے کہ لڑکپن کے راز کیسے ہوتے ہیں۔

حصول تعلیم ان میں سے تقریباً سبھی کو گراں گزرتا تھا۔
 بابر کو یاد آگیا کہ آج اسے معلم سے درس لینا ہوگا اور کم سن مرزا کی طبیعت ایک بار پھر مکرر
 ہوئی۔

۲

شہر کے باہر والی حویلی اپنے شاندار ماحول، بہت زیادہ آراستگی اور نقشِ دروازوں کے ساتھ محل
 کی یاد دلاتی تھی۔ بابر کو اس عمارت کے صرف ایک ہی کمرے سے دلچسپی تھی۔ معلم اس کا انتظار
 کر رہا تھا پھر بھی وہ اسی کمرے کی طرف مڑ گیا جس میں اس کی محبوب کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ اسے
 لگتا تھا جیسے سترے اور اراق اور مخملی اور چرمی جلدوں کے اندر عظیم شعرا کی سانسیں محفوظ ہوں۔
 اسے فردوسی، سعدی اور نوائی کے سینکڑوں اشعار زبانی یاد تھے۔ بابر نے ”فرہاد و شیریں“ نکالی اور
 دور دراز ہرات میں رہنے والا شاعر میر شیر نوائی اس کے تصور کی نگاہوں کے سامنے آن کھڑا ہوا۔
 اندجان کا میر عمارت فضل الدین جس نے ہرات میں تعلیم حاصل کی تھی، اس حویلی، سترے
 رنگوں کے گل بوٹوں سے آراستہ برآمدے اور سنگ مرمر کے حوض کی تعمیر کے دوران بابر کو میر علی
 شیر نوائی کے بارے میں عجیب عجیب باتیں بتاتا رہا تھا۔ فضل الدین ہرات سے معروف مصور بزرگ
 کی بنائی ہوئی نوائی کی مشہور تصویر کی ایک نقل بھی اپنے ساتھ لایا تھا۔ میر عمارت کو اس عظیم شاعر
 سے بابر کی گہری دلچسپی کا علم ہوا تھا تو اس نے یہ نقل اسے نذر کر دی تھی۔

بابر نے ”فرہاد و شیریں“ کے ضخیم قلمی نسخے سے تصویر کو نکال کر اپنے اسباق کے دفتر میں رکھ
 لیا۔

درس کا وقت ہو چکا تھا۔

مطالعے کے کمرے کے وسط میں معلم ربیعی گدے کے اوپر بیٹھا ہوا تھا۔ گھنی گھنی بھوس، پیٹ
 تک لٹکتی ہوئی سفید داڑھی اور سر پر بڑا سامانہ۔ اس نے فارسی میں فقہ پڑھانا شروع کیا۔ بابر عربی
 اور فارسی کی اچھی استعداد رکھتا تھا، قرآن کی بہت سی سورتیں بڑی خوشی سے زبانی سنا سکتا تھا اور
 اسے قانون سے بھی دلچسپی تھی لیکن اس وقت اس کے اندر جوش امنڈا پڑ رہا تھا، شرارت کی سوچ
 رہی تھی، کوئی جیالی قوت کچھ کر گزرنے کو بے تاب تھی۔ اور اسے بے حس و حرکت بیٹھ کر سبق
 پڑھنے پر مجبور کیا جا رہا تھا۔ اس نے سوچا: لیکن معلم کی باتیں سنی ہی کیوں جائیں، سننے کا ڈھونگ بھی
 تو کیا جاسکتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ..... فرہاد کے کارناموں سے متعلق اپنے شعر کو بھی دل ہی دل
 میں دھرایا جاسکتا ہے.....

دلیری اگر سیکھنا چاہتے ہو
تو پاکوں سے سیکھو، دیروں سے سیکھو

بابر نے معلم کی نظر بچا کر تصویر دفتر کے اندر سے نکال لی۔ لمبے سیاہ چکمان میں لمبوس نوائی چھڑی کی ٹیک لگائے کھڑا تھا اور اس کی آنکھوں میں نیکی چمک رہی تھی۔ بابرنے دل ہی دل میں سوال کیا: ”اے عظیم امیر، اگر مجھے آپ سے شرف ملاقات حاصل ہو اور..... اگر میں ان سب اٹھ دھوں اور دیووں پر جو میری زندگی کے راستے میں حائل ہوں گے، فرہاد کی طرح فتح حاصل کر لوں..... تو کیا آپ مجھے شاعری کی طلسمی دروازے کی کلید عنایت کر دیں گے؟“

معلم اپنے گدے پر سے چپکے سے اٹھا اور غیر معمولی تیزی کے ساتھ بابر کے پاس پہنچ گیا۔ باہر تصویر کو چھپا نہ سکا۔

”انسان کی تصویر ہے؟!“ معلم نے سخت لمبے میں دریافت کیا۔ ”سبق کے بجائے تصویر پر توجہ؟ یہ تو شرعاً ممنوع ہے.....“

”استاد محترم، یہ تصویر..... ہرات سے لائی گئی ہے۔ ملاحظہ ہو، یہ ہیں عظیم میر علی شیر۔“

معلم نوائی کی شاعری کے تذکرے سن چکا تھا لیکن خود کبھی پڑھی نہیں تھی۔

”میرے شزاوے، انسانی تصویریں بنانا، دیکھنا اور دینا لینا سب شیطان کی حرکت ہے! مجھے دیجئے

یہ تصویر لائیے!“

معلم صاحب اتنے ناراض ہیں تو کون جانے، تصویر کو لے کر اس کے ٹکڑے ٹکڑے نہ کر ڈالیں، بابرنے سوچا اور کہا: ”جی نہیں!“ اس نے یہ الفاظ اتنے سخت لمبے میں کہے کہ معلم دلی عہد کے غصے سے خوف زدہ ہو گیا۔ لیکن اس نے درس روک دیا اور بابر کی نانی ایسان دولت یتیم سے اس کی شکایت کرنے چلا گیا۔

اور پھر کوئی بچپن سال کی ایک فریہ اندام عورت اپنے اٹلی لباس سے سرسراہٹ پیدا کرتی ہوئی مطالعے کے کمرے میں داخل ہوئی۔ بابر جلدی سے اٹھ کر نانی کو کورنش بجالایا۔ ایسان دولت یتیم نے اس بچاری تصویر کو لے لیا اور گہری دلچسپی سے دیکھنے لگی۔

”میر علی شیر کے چہرے میں تو لگتا ہے کہ فرشتوں کی سی کچھ صفات پائی جاتی ہیں“ وہ بولی اور یہ ایسی بات تھی جس کی معلم کو قطعاً توقع نہ تھی۔ پھر اس نے اپنے ریشمی لباس کے آئینے سے چہرے کو ڈھکتے ہوئے معلم کی طرف رخ کر کے کہا: ”محترم معلم، یہ تصویر ہرات میں علمائے دین کی اجازت سے بنائی گئی ہے۔“

پھر وہ بابر سے مخاطب ہوئی:

”معلم صاحب یقیناً درست فرما رہے ہیں۔ عزیز مرزا، فقہ کے درس میں تصاویر خواہ وہ کیسی بھی کیوں نہ ہوں، دیکھنا ناجائز ہے۔ وقت آنے پر انشاء اللہ تعالیٰ آپ کو ملک کی عتوان حکومت سنبھالنی ہوگی۔ فقہ تو آپ کو اول تا آخر جانتی ہی ہے۔ رہی یہ تصویر تو اسے میں اپنے پاس رکھوں گی۔“

بابر نے ثانی سے پل بھر کے لئے تصویر مانگ کر دوبارہ کتاب کے اندر رکھ دی۔

”میں اپنا خواب آپ کے سپرد کر رہا ہوں۔“ اس نے کتاب کو ایوان دولت بیگم کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

ثانی نے نواسے کی اس بات کو بہت پسند کیا۔

”کیا میر علی شیر کو اند جان آنے کی دعوت دی جائے؟“

”اوہ، کیا یہ بھی ممکن ہے؟“ بابر کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

”میر علی شیر سمرقند آکر بھی تو اس کی شان دوبالا کر چکے ہیں۔ جہاں تک فرغانہ کا تعلق ہے تو اس کی خوبیوں سے سارا زمانہ واقف ہے..... مجھے خبر ملی ہے کہ میر علی شیر بہت ہی شریف اور پاک و پارسا انسان ہیں۔ وہ ہمارے ہاں تشریف لائیں گے تو محترم معلم کو اس کا یقین آجائے گا۔“

معلم کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا اور اس نے کھڑے ہو کر کہا: ”آمین!“

۳

دوپہر تک حویلی کے اندر سناٹا چھا گیا۔

لوگ پیاس کی شدت سے بری طرح نڈھال تھے اور بے چینی کے ساتھ شام کے منتظر۔ عالی شان مکانات کے مالک عالی نسب افراد بھوک پیاس سے بچنے کے لئے ٹھنڈے ٹھنڈے کمروں میں نیند کے سہارے وقت کاٹ رہے تھے۔

بابر کو کسی طرح نیند ہی نہیں آرہی تھی۔ اسے شاعرانہ خوابوں نے سخت مضطرب کر رکھا تھا۔ اپنے کمرے میں تہوارہ جانے کے بعد وہ کاغذ قلم لے کے بیٹھ گیا۔ شعر کہنے کی کوشش کی لیکن دوسرے شعرا کے جو اشعار اسے یاد تھے ان کے سوا ذہن میں کچھ آہی نہیں رہا تھا۔ تب اس نے ایک دفتر اٹھایا اور وادی فرغانہ کے متعلق اپنے تاثرات قلم بند کرنے لگا: ”یہاں بلند کوہستانی سلسلہ دور دور تک پھیلا ہوا ہے اور بیابانی طائروں کی افراط ہے۔ ہم نے آخسی سے کچھ فاصلے پر ویران علاقے میں سفید ہرن دیکھا تھا۔ یہ ہرن مرغیلان کے قرب و جوار میں بھی پائے جاتے ہیں۔“

کتنی خوبصورت تھی وادی فرغانہ! کتنا مشکل تھا اس کے سارے حسن اور قابل دید مقامات کا الفاظ

میں تذکرہ کرنا! لوگ میری علی شہر کے پاس ہرات جاتے تھے تو صرف اپنی شاعری لے کر ہی تھوڑی جاتے تھے.....

بابر لکھنے میں اتنا زیادہ کھویا ہوا تھا کہ اسے گھوڑے کی ٹانگیں بھی نہ سنائی دیں۔ ٹانگیں تو اسے اس وقت کہیں جا کے سنائی دیں جب گھڑسوار دروازے کے بالکل سامنے پہنچ گیا۔ چند ہی لمحات کے بعد سناٹے میں ڈوبی ہوئی حویلی کے کسی کمرے سے خواتین کی گریہ وزاری کی صدائیں بلند ہوئیں۔ بابر نے چونک کے سراٹھایا۔ یہ کیا ہو گیا؟ رونے کی آوازیں ایساں دولت بیگم کی رہائش والے حصے سے آرہی تھیں اور برابر تیز ہوتی جارہی تھیں۔ بابر فوراً ہی سر پر پاؤں رکھ کر نانی کے کمرے کی طرف دوڑ پڑا۔

اس کمرے کا دروازہ پوری طرح کھلا ہوا تھا۔ بزرگ خاتون کے سر کے اوپر سے رومال کھسک گیا تھا۔ وہ رومال کو ہاتھ سے مل رہی تھی، اپنی بیٹی قتلوغ نگار خانم کے خط کو بار بار پڑھ رہی تھی: ڈیڑھائی ہوئی آنکھوں کو الفاظ واضح طور پر نظر نہیں آرہے تھے۔

آخسی سے مرزا عمر شیخ کے انتقال کی خبر لے کر آنے والا بیگ دیوار کی ٹیک لگائے بمشکل ہی کھڑا ہو پا رہا تھا۔ اس نے سستائے بغیر گھوڑے پر کوئی بیچتیس کوس کا فاصلہ طے کیا تھا اور سراپا غبار سے اٹا ہوا تھا۔

والد کے انتقال کی خبر آفت ناگمانی کی سی تھی۔ بابر کے چہرے پر ہوائیاں اٹنے لگیں، اس نے قاسم بیگ پر نظریں جمادیں اور اس کا سارا جسم کانپنے لگا۔ قاسم بیگ فوراً ہی لپک کے بابر کے پاس پہنچا، اس کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور رندھی ہوئی، التجا بھری آواز سے بولا:

”میرے شہزادے! خدا آپ کو ہمت عطا فرمائے۔ اب آپ ہی ہم لوگوں کا سہارا ہیں! دشمنوں کے لشکر تین طرف سے یلغار کر رہے ہیں۔ آپ کی والدہ صاحبہ نے فرمایا ہے کہ آپ کو فوراً ہی اندجان کے لئے روانہ ہو جانا چاہئے، اپنے وفادار بیگیوں کو قلعے میں بلا لیتا چاہئے!

ایساں دولت بیگم سمجھ گئی کہ غم کے ان لمحات میں بھی امور دنیا سے غافل نہیں رہا جاسکتا، گریہ وزاری کے لئے وقت ہی نہیں۔ اس نے قاسم بیگ سے کہا:

”اٹھئے..... وفاداری کے لئے ہم آپ کے شکر گزار ہیں۔ آپ مرزا بابر کے ساتھ جایئے۔ سب لوگ یہ حویلی چھوڑ دیں، سب قلعے کو چلے جائیں!“

بابر جیسے بت بن کے رہ گیا۔ اس نے خاموشی سے جوں توں کپڑے پہنے، خاموشی ہی سے گھوڑے پر سوار ہوا اور ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ اس کے دل میں خیال آیا کہ یہ پھولتے پھولتے

اشجار، یہ والد مرحوم کا تعمیر کرایا ہوا سنگ مرمر کا حوض۔ یہ سب بھی اس شخص کی یاد میں مغموم و طویل ہیں جو اب کبھی بھی ان کے پاس نہ آئے گا۔ ناشپاتی کے یہ درخت تو خود مرزا عمر شیخ کے لگائے ہوئے ہیں، ان پر پھل آگئے ہیں، کچھ ہی دنوں میں یہ پک بھی جائیں گے لیکن جس نے یہ درخت لگوائے تھے کبھی بھی ان پھلوں کا ذائقہ نہ چکھ سکے گا۔

وہ لوگ پختہ راستے سے گزرنے لگے تو بابر ایک بار پھر اپنے والد کی یاد سے تڑپ اٹھا۔ راستے پر پتھر انہی کے حکم پر تو جڑے گئے تھے۔ اور سامنے دوری پر نظر آتا ہوا قلعہ بھی تو انہی کا تعمیر کرایا ہوا ہے۔ اور اب وہ دنیا سے اٹھ چکے ہیں۔ نہیں، نہیں! بابر کی روح کو بخوبی احساس تھا کہ اب وہ اپنے والد کو کبھی بھی نہ دیکھ سکے گا نیز یہ کہ اس کا نقصان ناقابل تلافی ہے۔ اچانک اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور آخر کار روح کو مضطرب کرتے اور ساتھ ہی ساتھ تسلی دیتے ہوئے اشک بہہ ہی نکلے۔

وہ لوگ قلعے (ارد گرد کی خندقیں بھی گہری تھیں اور فصیل بھی بلند۔ تلے اوپر گیارہ روے ☆ رکھے گئے تھے، بابر نے غیر شعوری طور پر شمار کیا) کے قریب پہنچے تو اس کے صدر دروازے سے پانچ گھڑ سوار ان کی طرف آئے۔ بھورے سے گھوڑے پر سوار چھوٹی چھوٹی آنکھوں اور منگول ناک نقشے والا بیک (بابر اپنی والدہ کے اس رشتے دار سے واقف تھا) آگے آگے تھا شیرم بیگ طغانی نے ان لوگوں کے پاس پہنچ کر بابر کے چہرے پر منڈلاتے ہوئے غم کو دیکھا تو وہ گھوڑے سے نیچے کود پڑا۔ اس کی آنکھوں آنسو تو نہ آئے لیکن اس نے سرود آہ بھری اور کہا:

”مجھے یقین نہیں آیا، یقین ہی نہیں آیا، شہزادے! تو یہ سچ ہے کہ ہم اپنے سارے سے محروم ہو گئے..... آہ، بے رحم دنیا!“

”آپ نے کس سے سنا؟“ قاسم بیگ نے پوچھا۔ ”اس سانحے کو ابھی رازی رہنا چاہئے۔“

شیرم بیگ نے اپنا گریبان پکڑ لیا۔

”مشیت ایزدی کو بھلا کون جان سکتا ہے..... میرا ایک کبوتر اڑتے اڑتے اچانک غائب ہو گیا تھا۔“ اسے کس نے مار گرایا؟“ میں نے سوچا اور چھت پر چڑھ گیا۔ کافی دیر کے بعد وہ کبوتر واپس لوٹا اور آگے میرے سامنے بیٹھ گیا۔ اس کے پروں کے نیچے کانغ کا ایک کلزا نظر آیا جسے نکال کر میں نے کھولا۔ اسی سے یہ افوسناک خبر ملی۔ میں کچھ کہہ نہیں سکتا کہ کس نے لکھا تھا اس پرچے کو، شاید آسمانی فرشتوں کی تحریر ہو۔“

شیرم بیگ نے بابر کے گھوڑے کی کاٹھی پر ہاتھ رکھا اور منہ قریب لے جا کر دہلی آواز سے کہا:

”میرے مرزا، قلعے کے اندر تشریف نہ لے جائیے، خطرہ ہے۔“

یہ بات قاسم بیگ نے بھی سن لی۔ عرش کی حکمرانی میں شیرم بیگ کوئی خاص اونچا عہدہ نہیں حاصل کر سکا تھا اور ناراض رہتا تھا۔ اب وہ اوروں سے ہی مرزا باہر کے آڑے آکر اس کا اعتماد حاصل کرنے کی فکر میں تھا تاکہ عہدے میں ترقی ہو جائے۔ قاسم بیگ نے اس بات کو بھانپ لیا اور پرسکون لہجے میں کہا:

”میرے شہزادے، قبل از وقت ڈرنا کیا معنی۔ ہمیں جلد از جلد قلعے میں پہنچ کر بیگوں کو اکٹھا کر لینا چاہئے۔“

شیرم بیگ کو زمین پر کھڑے کھڑے گھوڑے پر سوار قاسم بیگ سے گفتگو کرنا مناسب نہ معلوم ہوا۔ وہ اچھل کر اپنے گھوڑے پر سوار ہو گیا اور سخت لہجے میں بولا:

”جناب قاسم بیگ، ابھی آپ کو ذرا بھی علم نہیں کہ وہاں کیا ہو رہا ہے! آپ کے وفادار بیگوں نے جو جند کو دشمن کے حوالے کر دیا اسفرہ کو بھی! مرغیلان کو بھی!“

”مرغیلان کو بھی؟“ باہر اتنے زور سے چیخا کہ اس کا جسم لرز اٹھا ”کب؟“

”ابھی ابھی خبر موصول ہوئی ہے! دشمن کے بڑے بڑے لشکر چاروں طرف پھیلتے جا رہے ہیں۔ قوا کے قریب پہنچ چکے ہیں۔ اب اندجان کی باری ہے!..... کیا آپ چاہتے ہیں کہ آپ کے وفادار بیگ اندجان کے ساتھ ہی ساتھ مرزا باہر کو بھی دشمنوں کے حوالے کر دیں؟ نہیں! جب تک میں زندہ ہوں.....“

شیرم بیگ اپنے گھوڑے کو بڑھا کر باہر کے گھوڑے کے پاس لایا اور اس کی لگام تھام لی:

”میرے مرزا، میں آپ کا ماموں ہوں، آپ کا وفادار ہوں، مجھے اجازت دیجئے کہ آپ کو یہاں سے نکال لے چلوں۔“

باہر ٹھیک سے سمجھ نہ سکا کہ شیرم بیگ اس سے کیا کرنے کو کہہ رہا ہے۔ لیکن اس کی غم زدہ روح اور تشنگی سے مایہ بے آب جسم نے اس وقت بند اور محض بھرے قلعے کے بجائے کشادہ کھلے میدان میں رہنا بہتر تصور کیا۔ یہی سبب تھا کہ باہر نے مخالفت نہ کی۔ قاسم بیگ نے البتہ دوبارہ اعتراض کیا:

”میرے مرزا، آپ کی والدہ صاحبہ نے تو کچھ اور ہی کرنے کی ہدایت کی تھی.....“

”قلوغ نگار خانم سپہ سالار کب ہیں!“ شیرم بیگ نے اس کی بات کاٹ دی اور ضدی پن کے ساتھ باہر کے گھوڑے کی لگام پکڑ کر اس کا رخ موڑ دیا۔

لیکن قاسم بیگ کو بھی اپنی بات پر اڑنا آتا تھا۔ وہ اپنے گھوڑے کو آگے بڑھا کر باہر کے قریب

پہنچا، اس کے گھوڑے کی ایال پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا:

”آپ کی والدہ صاحبہ، ہماری ملکہ آج شاہ مرحوم کی تدفین کے بعد اندجان کے لئے روانہ ہو جائیں گی۔ کل وہ یہاں پہنچ جائیں گی۔ اور آپ کی ثانی جان بھی قلعے میں قیام کے لئے آتا چاہتی ہیں۔ یہ لوگ آخر آپ کو ڈھونڈیں گی کہاں؟“

بابر کو کچھ ہوش آگیا، اس نے شیرم بیگ سے پوچھا:

”تو ہمارا کدھر جانے کا قصد ہے؟“

شیرم بیگ نے بابر کے کان کے قریب منہ کر کے کہا:

”الٹاؤ کی طرف چلیں گے۔ پھر اوش۔ بعد میں شاید اوزگنت۔“

بابر سفر کے اس راستے کو قاسم بیگ سے چھپانا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے چپکے سے اس سے کہا:

”ہم لوگ اوش کے راستے میں کسی جگہ پر مل جائیں گے۔ والدہ صاحبہ کو بتا دیجئے گا۔“

”میرے شہزادے، پہلے تو میں قلعے میں جا کر بیگوں سے صلاح مشورہ کروں گا۔ مجھے پتا چل جائے

گا کہ آخر ان لوگوں کے ارادے کیا ہیں۔“

”سب سے اچھا تو یہ ہو گا کہ آپ میرے محترم استاد خواجہ عبداللہ سے ملاقات کریں۔“

”جو حکم۔“

اور قاسم بیگ اپنے گھوڑے کو موڑ کر قلعے کے پھانک کی طرف چل دیا۔

۴

ان لوگوں کی بحث پر تفصیل قلعہ کے ایک کنگورے سے کوئی فریہ اندازم گھٹھلا سپاہی نظر رکھے ہوئے تھا۔ اس نے قاسم بیگ کو تیزی سے پھانک کی طرف بڑھتے دیکھا تو پھانک کے اوپر سے دھیرے دھیرے نیچے اترا اور اپنے مالک احمد تہل کے پاس چلا گیا.....

خوبانیوں کے ایک وسیع باغ کے وسط میں ٹائل دار گنبد کا کشادہ حمام بنا ہوا تھا۔ باغ کا مالک یعقوب شدید گرمیوں کے ایام میں اسی حمام کے ایک کمرے میں جو اپنی اندرونی آرائش کی بنا پر کسی محل کے دیوان خانے سے مشابہہ تھا، آرام کیا کرتا تھا۔ اس وقت اس کمرے میں معزز مہمان کے لئے مخصوص جگہ پر احمد تہل بیٹھا ہوا تھا۔

اس نے توہنی کے پیالے میں جس پر جنگلی گلاب کی پنکھڑیاں بنی ہوئی تھیں، قہر نہ اندھا اور اسے پی کر تھیلی سے اپنی ٹھوڑی پونجھی۔

”پروردگار میرا گناہ معاف فرمائے، میں نے روزہ توڑ دیا“ اس نے پرسکون لہجے میں کہا۔ ”یہاں

تک آتے آتے زبان میں کانٹے پڑ گئے۔ بے ہوش ہو کر کھوٹے سے گرتے گرتے پجا۔
 ”آج آپ کو اس گناہ کی اجازت ہے“ یعقوب بیگ نے کھینس نکال دیں۔ ”اشد ضروری ہو تو اسے معاف کیا جاسکتا ہے۔۔۔ آپ نے بڑے مشکل کام کا بیڑا اٹھایا ہے، محترم بیگ۔ لیکن اگر آپ کی قسمت کا ستارہ چمک اٹھا اور مرزا جہانگیر تخت نشین ہو گئے تو ان کی نگاہ میں سب سے زیادہ معتبر آپ ہی ہوں گے۔ آپ ہی تو وزیر اعظم ہوں گے، درست ہے نا؟“

احمد تبتل اپنے اس شاندار مستقبل کا تصور کر کے دل ہی دل میں خوشی سے پھولانہ سما یا۔
 یعقوب بیگ بھی مسکرانے لگا۔ اس کی یہ مسکراہٹ اگلے دو دنوں کے غائب ہونے کی وجہ سے کچھ اور بھی مضحکہ خیز معلوم ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھیں البتہ غور سے احمد تبتل کا جائزہ لے رہی تھیں جیسے کہہ رہی ہوں: ”تم کہیں یہ تو نہ بھول بیٹھو گے کہ اتنے پر خطر کام میں، میں بھی تمہارا ہاتھ بٹا رہا ہوں؟“

احمد تبتل چوکنا ہو گیا:

”ارے بیگ صاحب، آپ اور میں دونوں ہی مغل ہیں۔ وقت آگیا ہے کہ فرمانہ میں برلاسوں ☆ کی حکومت ختم کر دی جائے۔ اب تو ہماری باری آگئی ہے۔ ہمارے جو مغل بیگ ہیں نا ان میں آپ کو میں سب سے زیادہ ممتاز مانتا ہوں۔ خدا کے فضل و کرم سے میں وزیر اعظم بن گیا تب بھی آپ کو میرے واحد دوست اور استاد کی حیثیت حاصل رہے گی۔“

”آمین!“ یعقوب بیگ نے مطمئن ہو کے کہا اور اپنی ترشی ترشائی کچی داڑھی پر ہاتھ پھیرے۔
 اتنے میں احمد تبتل نے پیالے کو ایک طرف کھسکا دیا اور دروازے کی طرف مڑ کر آہٹ پر کان لگا دیئے۔

اس کا سپاہی اندر داخل ہوا اور کورنش بجالایا۔

”سوپوچی ☆☆“ میرے آقا، سوپوچی!“ اس نے سیدھے کھڑے ہو کر کہا۔ ”مرزا بابر قلعے میں نہیں داخل ہوئے، مڑ کر کہیں چلے گئے۔“
 ”شیرم بیگ کے ساتھ؟“

”جی ہاں، حضور!“

احمد تبتل کے لئے واقعی یہ خوشخبری ہی تھی۔ اس نے چرمی تھیلی سے ایک اشرفی نکال کر حلیز پر پھینک دی۔ گٹھیلے سپاہی نے سکے کو فوراً ہی اندرونی جیب میں رکھ لیا اور شکریہ ادا کرنے کے طور پر دوبارہ کورنش بجالایا۔ پھر وہ احمد تبتل کے اشارے پر کمرے سے باہر نکل گیا اور دروازے کو کس

کے بند کر دیا۔

احمد تہل اندجان پہنچتے ہی سیدھا یعقوب بیگ کے ہاں جا کے مقیم ہو گیا تھا۔ لیکن مرزا عمر شیخ کے انتقال کی خبر پہلے اسے نہیں بلکہ شیرم بیگ کو دی تھی۔ شیرم بیگ جلد باز اور بہ آسانی مشتعل ہو جانے والا جو تھا۔ یہی نہیں، وہ کچھ سادہ لوح بھی تھا: احمد تہل نے خود کو پس پردہ رکھنے کے لئے کبوتر کے ذریعے جو پرچہ بھیجا تھا اس پر وہ یقین کر بیٹھا۔

”آپ کے مشورے سے تیار کیا جانے والا منصوبہ کامیاب رہا، اس سے بہتر نتیجے کا تو تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا!“ احمد تہل نے میزبان سے احسان مندی کے ساتھ کہا۔

”جی ہاں، اب شیرم بیگ اپنے بھانجے کو ”خطرے“ سے دور ہی دور رکھے گا۔ وہ ایڑی چوٹی کا پسینہ ایک کر دے گا کہ کسی طرح بابر کا سب سے معتبر بیگ بن جائے، اسے الٹاؤ کے پار لے جائے گا، شکر خدا.....“

”اور ہم..... ہم اب بابر کے بھاگ کھڑے ہونے کے خبر رعایا تک پہنچائیں گے..... کہیں گے کہ وہ خطرے سے خائف ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ لوگوں کو معلوم ہو جائے گا کہ برا وقت پڑا تو بابر اپنے وطن اندجان کو چھوڑ کے کیسے فرار ہو گئے۔ اس کے بعد..... اس کے بعد مرزا جہانگیر کو تخت پر بٹھادیا جائے گا۔“

یعقوب بیگ اپنی داڑھی پر مسلسل ہاتھ پھیرے جا رہا تھا۔
 ”افواہیں پھیلانے کے لئے بہترین جگہ ہے۔ بازار“ اس نے کہا۔ ”کچھ موزوں سوداگر میرے اثر میں ہیں، وہی کریں گے یہ الٹی سیدھی باتیں۔“

”جی ہاں، پر کسی کو بھٹک بھی نہ لگنی چاہئے کہ افواہوں کا آغاز ہم نے کیا ہے!“

”آپ مطمئن رہئے، احمد بیگ صاحب۔ ہمیں راز کو راز رکھنا خوب آتا ہے.....“

اندجان میں ویسے بھی ایک سے ایک بری افواہ نے قیامت کی کھلبلی مچا رکھی تھی۔ دشمنوں کے لشکر قریب سے قریب تر آتے جا رہے تھے جس سے لوگوں پر بری طرح خوف طاری تھا اور جہاں خوف کی حکمرانی ہو وہاں افواہوں کا بازار گرم ہو ہی جاتا ہے۔ لوگ کانپا پھوسی کر رہے تھے: ”بادشاہ کراڑے پر سے دریا میں کود پڑا اور اب آج نہیں تو کل شہر پر دشمنوں کا قابض ہو جانا یقینی ہے۔“ پھر ایک اور افواہ اڑی: ”مرزا بابر ڈر کے مارے بھاگ کھڑے ہوئے، ہمیں مقدر کے حوالے کر کے بھاگ گئے۔“ دن کا وقت تھا، بازاروں میں خرید و فروخت عروج پر تھی لیکن اچانک دکانیں یکے بعد دیگرے بند ہونے لگیں۔ ٹھیک سے کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ افواہیں اڑ کہاں سے رہی ہیں لیکن

لوگ انہیں سنتے اور اپنی طرف سے خوب نمک مرچ لگا کر، اور بھی زیادہ خوفناک باتیں جوڑ جوڑ کے دوسروں کو سناتے تھے۔ آخر میں نوبت اس افواہ تک پہنچ گئی کہ آخسی پر دشمنوں نے قبضہ کر لیا اور شاہ فرغانہ کو کراڑے پر سے دریا میں پھینک دیا گیا۔ خبر جلدی جلدی داروغہ شہر کے پاس جا جا کر اسے بازاروں میں سنی ہوئی تازہ ترین خبروں سے مطلع کرتے تھے۔

بیگوں میں بھی کھلبلی مچ گئی۔ یہ لوگ قاسم بیگ سے شاہ کے انتقال کی خبر سن کر خوف سے پوری طرح مغلوب ہو گئے اور اس فکر نے کہ اب تخت پر کون بیٹھے گا، انہیں جنگ کے بجائے دیگر باتیں سوچنے پر مجبور کر دیا۔ نئی نئی سیدھی افواہیں سن سن کے داروغہ شہر ازون حسن کا دماغ چکر اٹیا: یہ افواہیں تو بے بنیاد ہیں پر جانے اصلیت کیا ہے.....

بیگ ایک جگہ جمع ہوئے لیکن کسی فیصلے پر نہ پہنچ سکے۔

”بات یہ ہے صاحبان کہ تقدیر نے ہم سے منہ پھیر لیا ہے“ داروغہ شہر نے جھینکنا شروع کیا۔ ”قلعے کے باہر دشمن کھڑے ہیں اور قلعے کی اندر بھگدڑ مچی ہے۔ نہ ہمیں کچھ معلوم ہے نہ ہم کسی بات کے لئے تیار ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ مرزا بابر قلعے میں داخل ہوئے بغیر ہی بلا سبب نہیں چلے گئے۔“

”تو پھر ہمیں بھی بھاگ کھڑے ہونا چاہئے؟“ مولانا عبداللہ نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

خواجہ عبداللہ کو اپنے سیاہ بالوں اور علم و فضل کی بنا پر شہرت حاصل تھی اور وہ اند جان کے بیگوں کا بہت ہی با اثر پیر تھا۔ خود مرزا بابر بھی اپنے آپ کو اس کا مرید تصور کرتا تھا اس لئے ازون حسن سیاہ ریش خواجہ کو ناشائستگی سے جواب نہ دے سکا اور خاموش ہی رہا۔

”مرزا بابر کو اند جان سے زیادہ دور نکل جانے سے قبل ہی واپس بلالیا جانا چاہئے“ قاسم بیگ نے خیال ظاہر کیا۔

”میں مرزا بابر سے بخوبی واقف ہوں“ خواجہ عبداللہ نے حاضرین پر نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔ ”نہیں، وہ یہاں سے ڈر کے بھاگے نہیں ہیں۔ وہ تو صرف ہماری وفاداری کا امتحان لینے کے لئے ہمیں چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ دراصل فساد اور سازشی لوگ عوام میں اشتعال پیدا کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شاہ کے انتقال پر ملال کی خبر ہم تک پہنچنے سے قبل ہی بازاروں تک پہنچ گئی۔“

درست، ساری بات بالکل درست! ازون حسن حیرت میں پڑ گیا کہ خواجہ عبداللہ نے وہیں، ان سب کے درمیان رہتے ہوئے بھی مرزا بابر کے خیالات کا اندازہ لگالیا۔ اس نے سوچا کہ خواجہ تو صبح معنوں میں دلی ہیں، دلی!

”لگتا ہے کہ ہمارے پیر صاحب کو تو سب کچھ واضح طور پر معلوم ہے! ازون حسن نے مصنوعی احترام کے ساتھ کہا۔ ”آئیے، ہم لوگ دیکھیں جیسا کہ مولانا فرمائیں۔“

”مجھ کو واضح طور پر بس اتنا معلوم ہے“ خواجہ عبداللہ نے دھیرے سے کہا، ”کہ سب کو متحد ہو کر مرزا بابر کی خدمت کرنی چاہئے اور تب ہی ہم زندہ بچ سکیں گے اور ہم میں سے کسی کا بال بھی بیکا نہ ہوگا۔“

درست، یہ بھی بالکل درست، ازون حسن نے سوچا۔ اور کتنے یقین کے ساتھ کہہ رہے ہیں خواجہ عبداللہ یہ ساری باتیں! پھر بھی خوف تو محسوس ہی ہوتا ہے..... اگر حالات نے ایسا رخ اختیار کیا کہ خواجہ عبداللہ کی بات سچ ثابت ہوئی اور بابر شاہ فرغانہ بن گئے تو داروغہ شرکی آج کی اس ہچکچاہٹ کو کیا معنی پہنائے جائیں گے؟ کیا خود اسی کے لوگ ہی اس کی اس ہچکچاہٹ کے متعلق مرزا بابر کے کان نہ بھرس گئے؟ تب کیا وہ داروغہ شہر کے عہدے سے ہاتھ نہ دھو بیٹھے گا؟ نہیں، نہیں، اوزون حسن، تم نے جو راستہ منتخب کیا ہے اس سے نہ ہٹو۔

”محترم پیر، آپ کا حکم ہو تو میں خود مرزا بابر کی خدمت میں حاضر ہوں“ ازون حسن نے کہا۔

”میں جا کے انہیں سارے بیگوں کی طرف سے وفاداری کا یقین دلاؤں گا اور درخواست کروں گا کہ وہ قلعے میں آجائیں۔“

”آپ کے ارادے قابل ستائش ہیں، داروغہ صاحب۔ لیکن میں کہنا چاہتا ہوں کہ جب تک آپ اس عہدے پر مامور ہیں تب تک آپ کو چاہئے کہ شہر میں فساد کو چکلیں، فساد یوں کے اڈے کا پتہ لگا کر اسے نیست و نابود کر دیں اور اند جان کے دفاع کے لئے پتہ لگا کر اسے نیست و نابود کر دیں اور اند جان کے دفاع کے لئے ضروری تیاریاں کریں۔ آپ اپنے انہی کاموں کی بنا پر مرزا بابر کی عنایات کے مستحق ہو سکتے ہیں۔“

پیر نے واقعی ازون حسن کے دل کی بات بھانپ لی تھی۔

۵

موسم گرما کے آفتاب نے زمین و آسمان میں آگ سی لگا رکھی تھی۔ گھوڑوں کے سموں سے اوپر اٹھتی ہوئی دھول لپٹوں کی طرح گھڑسواروں کے چہروں کو جھلس رہی تھی۔ ہوائیں یوں ساکت تھیں کہ کوئی خفیف سا جھونکا بھی نہیں چل رہا تھا۔

بابر کا تمام جسم پسینے میں نہایا ہوا تھا، پیاس کی شدت سے منہ بری طرح خشک ہو گیا تھا اور کل عین اسی وقت وہ اند جان سائے کے کنارے کتے مزے سے وقت گزار رہا تھا! سرسبز و شاداب جاگیر

کی صاف ستھری فضا، شفاف پانی، ہوادار برآمدہ، شرارتیں۔ سب کچھ اس ماضی کا جزو بن چکا تھا جو جیسا کہ اس وقت اس پتے اور دھول سے اٹے راستے پر محسوس ہو رہا تھا، پیچھے، بہت پیچھے چھوٹ گیا تھا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے پریوں کی کسی کمائی کا سا کوئی بگولا اچانک اٹھا تھا جس نے عنفوان شباب کی پر مسرت زندگی سے اس کا رشتہ توڑ دیا تھا اور اب اسے تنکے کی طرح اڑائے لئے جا رہا تھا۔ وہ اڑتی ہوئی ریت اسی بگولے کی ریت تھی۔ والد کو دریا میں گرانے والی طاقت اسی بگولے کی طاقت تھی۔ اور اس کے پیچاس ہم سفر کی وہ دھندلی دھندلی پر چھائیاں بھی اسی بگولے کی پر چھائیاں تھیں جس نے ان سب کو اپنی مہیب بانسوں میں جکڑ رکھا تھا۔

بھوک کی شدت سے سر جکڑا رہا تھا، لگ رہا تھا جیسے کوئی دیوانہ لوگوں کو سیدھے راستے سے بھٹکا رہا ہے۔

وہ اوزگنت جانے والے راستے سے نماز گاہ تک پہنچ گئے۔ اب انہیں برنیز چوٹیوں والے پہاڑ نظر آنے لگے۔ بابر کی آنکھوں کو ٹھنڈک محسوس ہونے لگی، اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور خشک لبوں کو بمشکل کھول کر شیرم بیگ سے کہا:

”آپ لوگ رفتار تیز کیجئے! رفتار تیز کیجئے!“

”کوئی قاصد آرہا ہے، کچھ دیر انتظار کر لیں؟“ شیرم بیگ نے پیچھے دیکھ کر کہا۔

قاصد نے آکر بابر کو خواجہ عبداللہ کا خط دیا۔ بابر نے گول لپٹے ہوئے خط پر بندھا ہوا ریشمی فیتر کھول کر پرچے کو نو بیان کو کھٹاش کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا:

”پڑھئے۔“

خط میں اندجان کے بیگوں کی وفاداری کا تذکرہ تھا۔ احتیاطاً اشاروں اشاروں یہ بھی لکھا تھا کہ شر میں جھوٹی افواہیں پھیلائی جا رہی ہیں گویا کہ ”مرزا بابر بھاگ کھڑے ہوئے“ نیز یہ کہ ان افواہوں کے ذریعے فساد کی لوگ عوام کو بابر سے دور کرنا چاہتے ہیں۔

”میرے شہزادے، انہی فساد کیوں سے تو میں آپ کو محفوظ رکھنا چاہتا تھا!“ شیرم بیگ نے بابر سے کہا۔ ”وہاں کے حالات بہت خراب ہیں، بہت ہی خراب! قلعہ ان لوگوں کا اڈا بن گیا ہے۔ وہاں واپس نہ جائیں، مرزا اگر بیگ آپ کے وفادار ہیں تو انہیں یہیں آنے دیجئے!“

”..... ڈر کے آباؤی وطن سے بھاگ کھڑے ہوئے“ ہاں یہ افواہ ایسی ہی تھی کہ اسے ایک کان سے دوسرے کان تک، ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں تک پھیلا یا جاتا۔

”نہیں! میں بھاگ کھڑے ہونے کا قطعاً ارادہ نہیں رکھتا!“ اور بابر نے اپنے گھوڑے کا رخ

پیچھے کی طرف موڑ دیا۔

”یہ محض ایک چال ہے، شہزادے، یقین مانئے۔“

”میں خود ہی ساری باتوں کی تصدیق کر لوں گا۔ میں ان لوگوں کو دکھا دوں گا کہ بزدل نہیں ہوں۔ سب لوگ واپس چلیں! اندجان کو واپس چلیں!“

بابر نے لگام ڈھیلی چھوڑ کے گھوڑے کے چابک رسید کر دیا۔ گھوڑا تیزی اور غضبناکی کے ساتھ دوڑنے لگا، ہوا کا ایک جھونکا بابر کے سینے سے ٹکرایا جس سے اسے کچھ راحت محسوس ہوئی۔ اسے لگا کہ وہ مسیب بگولا پیچھے چھوٹ گیا، رستے میں کہیں کافور ہو گیا۔

آفتاب غروب ہونے کو تھا تو وہ لوگ قلعے کے اندر داخل ہو گئے۔ شام کو جن راستوں پر عموماً بڑی چل پھل نظر آیا کرتی تھی ان پر اس وقت سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ساری دکانیں بند تھیں۔ چاروں طرف دیرانی سی برس رہی تھی۔ دہشت زدہ شہر اپنے ڈر بے میں دلکا ہوا تھا۔

بابر کی حفاظت کی طرف سے مسلسل فکر مند شیرم بیگ نے سپاہیوں کو اشارہ کیا کہ وہ بابر کو جو اپنے گھوڑے پر آگے آگے چل رہا تھا، گھیرے میں لے لیں۔ بابر کو یہ دیکھ کر ایسا لگا کہ جیسے اسے قید کر لیا گیا ہو، جیسے اس بگولے نے ایک بار پھر یازدوں میں جکڑ لیا ہو۔ اس نے گھوڑے کو ایز لگائی اور حصار کو توڑ کر دوبارہ آگے نکل گیا۔ شیرم بیگ نے ایک بار پھر حکمت عملی دکھائی، اس نے بابر کے پہلو پہ پہلو چلنے کی کوشش کی تاکہ لوگ دیکھ لیں کہ وہ اپنے بھانجے کو نظرید سے محفوظ رکھنا چاہتا ہے لیکن نویان کو کھٹاش نے اس کے گھوڑے کی لگام تھام لی:

”بیگ صاحب، آپ شہزادے کو آگے آگے ہی چلنے دیجئے۔ عوام کو موقع دیجئے کہ وہ ولی عہد کو دیکھ کر مطمئن ہو جائیں۔ لوگ اپنی کھڑکیوں کے شگافوں سے جھانک رہے ہیں، وہ دیکھ لیں کہ فسادیوں کی اڑی ہوئی انواہیں بالکل بے بنیاد تھیں۔“

”اور کہیں باغیوں نے کسی شگاف سے تیر چلا دیا تو؟“

”انہیں اس کی جرات ہی نہیں ہو سکتی!..... ولی عہد آگے آگے ہی رہنا چاہتے ہیں۔ اللہ ان کا

نکمبان ہے۔“

اوریوں بابر دوسرے گھڑسواروں سے آگے آگے چلتا ہوا قلعے کے قریب پہنچا۔ فوراً ہی صدر دروازہ پوری طرح کھل گیا اور خواجہ عبداللہ، قاسم بیگ اور شاہی سپہ سالار اس کے خیر مقدم کے لئے باہر نکلے۔ بابر نے گھوڑے سے نیچے اتر کے اپنے استاد کو سلام کیا، اس کا دل بھر آیا اور رخساروں پر آنسو بہہ نکلے۔ خواجہ عبداللہ نے بابر کو گلے سے لگالیا: لڑکے کو حوصلہ افزائی اور

شفقت کی ضرورت تھی۔ لڑکے کو جو کہنے کو تو لڑکا لیکن بہر حال ولی عہد تھا! بیگم اور خدمت گاروں کی نگاہیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ خواجہ عبداللہ کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے خود کو سنبھال لیا۔

”ہمیں سخت صدمہ پہنچا ہے، عزیز شنراوے“ اس نے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے کہا۔
 ”آپ تو ہمارے حامی و محافظ بس آپ ہیں!“

اتنے میں بیگم میں سے کسی نے دو قدم آگے نکل کر خواہ عبداللہ کی بات کاٹ دی:

”معزز ولی عہد ہم سب بیک آپ کی خدمت کے لئے حاضر ہیں!“

بابر نے جواب دیا لیکن اس کی آواز اب بھی مرتعش تھی:

”بہت بہت شکریہ!“

سب لوگ قلعے میں داخل ہونے لگے تو یعقوب بیک بھی آکے بیگم کے گروہ میں شامل ہو گیا وہ بابر کی واپسی کی خبر سننے ہی بھاگا بھاگا وہاں پہنچا تھا مگر اس پر کسی قسم کا شک نہ کیا جاسکے۔

ماضی میں جب اند جان دار حکومت تھا تو تخت شاہی سرا محل میں رکھا ہوا تھا اور یہی محل قلعے کا مرکز بھی تھا۔ لیکن آخسی کے پائے تخت بن جانے کے بعد سسرے گل بوٹوں سے آراستہ سنگ مرمر کی سیڑھیوں والے اس محل کی شان و شوکت بتدریج گھٹنے لگی تھی۔ بابر کی آمد سے قبل خواجہ عبداللہ کے حکم سے محل کی سیڑھیوں پر شاندار قالین لپے اور دیوان عام کے اس چوترے پر جہاں کبھی تخت شاہی رکھا رہتا تھا، قیمتی ترکمانی قالین بچھائے گئے تھے۔ قالینوں کے اوپر نرم نرم گدے بھی بچھائے گئے تھے۔

بنفشی قالینوں پر سے گزرتے ہوئے بابر کو کھانسی آگئی کیونکہ حلق بری طرح خشک ہو چکا تھا۔ تاہم اس نے ذرا بھی آرام نہ کیا اور اسی حالت میں سیدھے شاہ نشین پر پہنچ کر بیٹھ گیا۔

دوسرے افراد بھی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے۔ پھر خواجہ عبداللہ نے شاہ مرحوم مرزا عمر شیخ کو ثواب پہنچانے کے لئے فاتحہ پڑھا۔

”یا اللہ! انیس جنت نصیب کر!“ سارے بیک ایک ساتھ کہہ اٹھے۔ بابر کی طرف متوجہ چہرے ہمدردی اور غم کے جذبات کے آئینہ دار تھے۔

”محترم حضرات! اساتین حکومت“ خواجہ عبداللہ نے کہنا شروع کیا۔ ”جنگ کی بلا ہمارے سروں پر نہ مڑنا رہی ہوتی، فوری اہمیت کے مسائل سے نپٹنا نہ ہوتا تو ہم یقیناً سوگ مناتے۔ مرحوم حکمران کو ان کی نیک نامی اور رتبے کے بموجب پورے شاہی اعزاز کے ساتھ آخسی میں

سپر دھاک کیا جا چکا ہے۔ لیکن ہم پر ایسے نازک وقت میں جب کہ دشمن اند جان کے دروازے پر آن کھڑا ہوا ہے، بہت بڑی ذمے داری عائد ہو گئی ہے۔ دلی عہد کو اپنے نئے حکمران کو بلا تاخیر عثمان حکومت سونپ دینے کی ذمے داری.....“

یعقوب بیگ نے اوروں سے قبل ہی الفاظ کی تائید کر دی:

”آپ نے بڑا دانش مندانہ قدم اٹھایا ہے، پیر صاحب۔ ہمیں اس لمحے مرزا ظہیر الدین محمد بابر کو قانوناً فرغانہ کا حکمران تسلیم کر لینا چاہئے۔“

بابر نے یعقوب بیگ پر اچھتی سی نظر ڈالی۔ اس کی آواز سے ٹپکتی ہوئی نرمی اور وفاداری، اس کی چہرے سے نمایاں پریشانی حتیٰ کہ ٹوٹے دانتوں والے منہ پر چھائی ہوئی مسکراہٹ بھی۔ سب کچھ بابر کو جو پیاس کی شدت اور طرح طرح کے اندیشوں سے پریشان تھا، اچھا لگا۔ کون نہیں جانتا تھا کہ یعقوب مغل بیگوں میں سب سے زیادہ با اثر ہے۔ جو شیلے بابر کا ایک خواب یہ بھی تھا کہ وہ اپنے والد کے تخت پر بیٹھ کر تمام بیگوں کی قیادت سنبھالے اور سچے مسلمان سورما اور مرد کی طرح دشمنوں پر فتح حاصل کرنے کے لئے ساری طاقت سے کام لے۔ اس نے سوچا کہ والد دنیا سے کوچ کر چکے ہیں لیکن اس نقصان کی ذہن یعقوب بیگ ایک حد تک تلافی کر رہا ہے۔ مغلوں کی اس حمایت کے بعد دوسرے خاندانوں کے بیگوں نے بھی یکے بعد دیگرے بابر کو فرغانہ کا حکمران تسلیم کر لیا۔ اور بابر کا خواب سیاہ بادلوں سے نکل آنے والے ماہتاب کی طرح حقیقت بن گیا، اس کا دل خوشی سے ناچ اٹھا، گولے کے باعث اس پر ٹوٹ پڑنے والی بلائیں اور جسمانی تکالیف جو اسے جھیلنی پڑی تھیں، سب کی سب جیسے اچانک کا فور ہو گئیں۔ ہاں، اب وہ طاقتور حکمران بن جائے گا جس کے احکام بے شمار افراد بے چوں و چرا بجالائیں گے۔

اسے خود کو سپہ سالار تصور کرنا بہت پسند تھا۔ ایسا سپہ سالار جیسا کہ اس کا مورث اعلیٰ امیر تیمور تھا۔ بابر نے تیمور کی سنگ دلی کے قصے سن رکھے تھے اور وہ اس سنگ دلی کا اعادہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ عوام کی یادوں میں زخم نہیں چھوڑنے چاہئیں بلکہ انہیں اپنی جرات و شجاعت سے متحیر کر دینا چاہئے۔ اس کے لئے اپنے مورث اعلیٰ کی سنگدلی نہیں بلکہ لڑائیوں میں عظیم فتوحات باعث کشش تھیں۔ زبردست قوت ارادی اور وہ متاثر کن نام بھی باعث کشش تھا جس سے سارے کے سارے خود رائے بیگ لرزہ بر اندام ہو جاتے تھے۔

اس اثناء میں ازون حسن دروازے سے اندر آکر جلدی جلدی کئی بار کورنش بجالایا۔

”بندہ پرور! اپنے اس غلام پر جو جنتاب کے استقبال کے لئے حاضر نہ ہو سکا، رحم فرمائے۔ میں

اندجان میں جھوٹی اور بے بنیاد افواہیں پھیلانے والے باغیوں کے خلاف کارروائی میں چوبیسوں گھنٹے مصروف رہا ہوں۔ ان کے ایک سرغنہ کو ابھی ابھی گرفتار کر کے لا رہا ہوں۔“

بابر چونک اٹھا:

”سرغنہ؟ کون ہے وہ؟ اندر لائیے!“

ساری نگاہیں دروازے کی طرف مڑ گئیں۔ یعقوب بیگ کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ احمد تہل کو واقعی گرفتار کر لیا گیا کیا؟ تب تو ان کا بھانڈا پھوٹ جائے گا! اس نے بوکھلا کر جلدی جلدی دیواروں پر نظریں دوڑائیں۔ کھڑکیاں چھوٹی بھی تھیں اور اس جگہ سے کافی دور بھی جہاں یہ فریہ اندام بیگ بیٹھا ہوا تھا۔ نہیں، یہاں سے بھاگ کر جان نہیں بچائی جاسکتی تھی!

اسی لمحے دروازے کے باہر کوئی بھاری آواز سنائی دی:

”میرے ہاتھوں کو کھول دیجی، میں بے قصور ہوں!“

”شکر خدا“ یعقوب بیگ دل ہی دل میں خوش ہو گیا۔ ”یہ آواز احمد تہل کی نہیں۔“

دو سپاہی ایک موٹے ٹھڑے طویل قامت شخص کو اندر لائے جو لمبا سفید کرتا پہنے ہوئے تھا۔

”ارے، درویش گاؤ!“ یعقوب بیگ کہہ اٹھا اور اس کے ساتھ ہی ساتھ کئی دوسرے بیگ بھی۔

یہ شخص اندجان کا صدر میر آب تھا اور اپنی چوڑی چکنی گردن سائڈ کی طرح آگے نکالے رہتا تھا اس لئے اس کا نام ”گاؤ“ پڑ گیا تھا۔ درویش اسے اس لئے کہا جاتا تھا کہ وہ غریبوں کی حمایت کے لئے ہمیشہ تیار رہتا تھا۔ ”ان سے خدا خوش رہتا ہے“ گاؤ کہا کرتا تھا۔ اندجان کے قلعے میں صاف پانی تو تالیوں سے آتا تھا لیکن بہت سے باغات کی سیرپائی کے باعث موسم گرما میں پانی کی سخت قلت محسوس ہوتی تھی۔ بیگ ”کنگالوں“ کو پانی لینے والوں کی قطار سے نکال باہر کرنا چاہتے تھے۔ لیکن درویش گاؤ ان غریبوں کی طرفداری کرنے کی جرات کیا کرتا تھا۔

”آپ بیگ ہیں تو صرف اپنے لئے“ وہ کہتا تھا۔ ”اللہ کی نظروں میں تو سب برابر ہیں!“ عام لوگ بالکل فطری طور پر اس شخص کی حمایت کرتے تھے جبکہ بیگوں کو اس سے سخت نفرت تھی۔ اور ازون حسن تو خاص طور سے بھنایا رہتا تھا، جانے کب سے خار کھائے بیٹھا تھا۔

درویش گاؤ نے جس کی مشکیں بندھی ہوئی تھیں، پہلے بابر کی طرف رخ کر کے تعظیماً ”سر جھکایا پھر اس سے ذرا فاصلے پر بیٹھے ہوئے خواجہ عبداللہ کی طرف رخ کر کے۔

”انصاف کیجئے شہزادے!“ اس نے خودداری سے کہا۔ ”میں باغی نہیں ہوں، محترم پیر!.... بازار

میں ایک سپاہی نے مجھ سے کہا تھا: ”حکراں نشے میں دھت تھے، کراڑے پر سے گر کے چل بے اور مرزا بابر دشمنوں کے خوف سے الٹاؤ بھاگ گئے۔“

”یہ بہتان ہے!“ بابر بارود کے دھماکے کی طرح گرج اٹھا۔

”اس کے بہتان ہونے کا پتا تو مجھے بعد میں چلا۔ سپاہی سے سنی ہوئی بات کا میں نے کسی سے بھی تذکرہ نہیں کیا۔ رحم کیجئے مجھ پر، بندہ پرور!“ درویش دو تین قدم آگے بڑھ کر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ ”میں جانتا ہوں، مجھے یقین ہو گیا کہ یہ کسی بزدل کا چہرہ نہیں ہو سکتا۔ میں یہ مانتا ہوں کہ بازار میں بھگدڑ مچی، لوگ مارے ڈر کے دکانیں بند کرنے لگے تو میں بھی گھبرا گیا تھا لیکن میں نے افواہیں نہیں پھیلائی تھیں، میں نے تو بس ایک شخص کو روک کر پوچھا تھا: ”سنا تم نے، لوگ کیا کہہ رہے ہیں؟“ اور اس نے جواب دیا: ”ہاں، سنا۔“ پھر میں نے دریافت کیا کہ کیا یہ سچ ہے اور اسی لمحے داروغہ صاحب کے مخبروں نے مجھے گرفتار کر لیا.....“

”نہیں، تو جھوٹ بول رہا ہے کہ اس شخص سے صرف پوچھا۔ تو خود ہی جھوٹی افواہیں اڑا رہا تھا اور رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہے!“ ازون حسن درویش پر برس پڑا۔

”تو قرآن پاک منگوائیے، میں قرآن اٹھانے کو تیار ہوں!“

”ارے، یہ مجرم قرآن پاک کو بھی ہاتھ لگانا چاہتا ہے؟!“ یعقوب بیگ، بابر کی طرف رخ کر کے غصے سے چلایا۔ ”عالی جاہ، اگر یہ ناپاک شخص آپ کا وفادار غلام ہوتا تو اس سپاہی کو جو اس کے کہنے کے بموجب جھوٹی افواہیں پھیلا رہا تھا، فوراً ”پکڑ کے داروغہ صاحب کے پاس لے گیا ہوتا!“

”یا خدا!“ درویش گاؤ بس اتنا ہی کہہ سکا۔

یعقوب بیگ نے ایک بار پھر بابر کی طرف بڑی نرم نگاہوں سے دیکھا اور دو ٹوٹے دانٹوں والے منہ کو کھول کے مسکرایا:

”حضور عالی! گاؤ آپ کے والد مرحوم کی عنایت ہی سے صدر میر آب بنا تھا..... آپ کے والد مرحوم کی عنایت ہی سے، میں ایک بار پھر کہتا چاہتا ہوں..... اور اب یہی شخص جھوٹی افواہیں پھیلا رہا ہے گویا کہ ہمارے شاہ مرحوم۔ خدا انہیں جنت نصیب کرے۔ شراب کے نشے میں کراڑے سے گر گئے تھے! حد ہو گئی گستاخی کی!“

”اس چھو کرے کو فریب نہ دیا تو اور کس کو دوں گا؟“ یعقوب بیگ نے بابر کی آنکھوں کو جن میں توہین کے احساس اور غصے سے شعلے بھڑک اٹھے تھے، پر امید نگاہوں سے دیکھتے ہوئے سوچا۔

”اور یہ تو جھوٹی افواہیں پھیلانے کا اعتراف خود ہی کر چکا ہے! اس نے کسی سے پوچھا یا کسی کو

بتایا اس سے فرق ہی کیا پڑتا ہے؟“ مزید بیگ نے حملہ کیا۔

”جو رنگے ہاتھوں پکڑا گیا اسے سزا ملتی ہی چاہئے!“ علی دوست بیگ نے بھی الزام کی حمایت کی۔

قاسم بیگ کو جانے کیوں بیگ کا سنایا ہوا اس عجیب و غریب کبوتر کا قصہ یاد آگیا جو بابر کے ماموں کے پاس شاہ کے انتقال کی خبر کا پرچہ لے کر پہنچا تھا۔

”اس معاملے کی کچھ اور تفتیش کر لی جائے تو کیا رہے؟“ قاسم بیگ نے دریافت کیا۔

مزید بیگ نے اس کی مخالفت کی:

”طویل تفتیش کے لئے ہماری پاس وقت ہی کہاں ہے؟ دشمن جیسا کہ پیر صاحب نے فرمایا، ہمارے دروازے تک پہنچنے کا ہے۔ اور خونیں معرکوں کے موقع پر جو شخص بھی ایک خبریں اڑا کر چاروں طرف دہشت پھیلاتا ہے، سربراہ مملکت کی شان میں بٹا لگاتا ہے وہ بھی دشمن ہی تصور کیا جاتا ہے۔ ایسے دشمن پر ترس کھانے کا بھلا کیا سوال!“

”دوسروں کی تنبیہ کے لئے اسے سر بازار سزا دی جائے! لوگ عبرت حاصل کر لیں!“ ازون حسن بیچ میں بول پڑا۔

”سر بازار سزا“ دینے کا مطلب تھا سر قلم کرنا۔

گاؤ کے چہرے پر موت کا سایہ منڈلانے لگا۔ وہ گھٹنوں کے بل ہی گھسٹتا ہوا بابر کے کچھ نزدیک تک پہنچ کر بندھے ہوئے گلے سے بولا:

”حضور والا، میں مجرم نہیں ہوں! میں تو مجرموں کی چال کا شکار ہو گیا ہوں! مجھ پر ترس کھائیے! میرے پانچ بچے ہیں! انہیں بے سہارا نہ کیجئے، حضور والا!“ گاؤ کی مشکلیں بندھی ہوئی تھیں اور داڑھی پر جو کچھ کچھ سفید ہو چلی تھی، ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔

بالغ مرد کے یوں رو پڑنے سے بابر کا غصہ بالکل ٹھنڈا پڑ گیا اور اس نے اپنے استاد خواجہ عبداللہ کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ اچانک اس کا جی یہ سننے کو تڑپ اٹھا: ”اس بچارے پر رحم کیجئے۔“

لیکن خواجہ عبداللہ کے ہونٹوں نے جنبش نہ کی۔ بیگ البتہ اپنی رٹ لگائے ہوئے تھے۔

”ارے جس شخص کے پانچ بچے ہوں اسے تو اپنی زبان کو قابو میں رکھنا چاہیے!“ یعقوب بیگ خباثت سے ہنس پڑا۔

”یہ گاؤ تو دراصل فسادوں میں بھی سب سے گیا گزرا ہے!“ ازون حسن نے ہاتھ جھٹک کر کہا۔ ”اسے تو چاہئے تھا کہ اس آدمی کے دانت توڑ دیتا جس نے ایسی بات کہی گویا کہ شاہ مرحوم نشے

میں رہے ہوں اور اپنی ہی غلطی سے لقمہ اجل بن گئے ہوں..... یا پھر اسے پکڑ کر ہمارے حوالے کر دیتا۔“

ان لوگوں کی چیخوں میں درویش گاؤ کی آواز دب کر رہ گئی جو گڑگڑا رہا تھا:
 ”انصاف کیجئے، شاہ معظم، انصاف! میں آپ کے والد مرحوم کا ہمیشہ وفادار رہا ہوں!.... صد افسوس، آپ ان بیگوں کی خوبیوں سے ابھی بخوبی واقف نہیں ہیں! یہ مجھ سے انتقام لے رہے ہیں! ان کی باتوں میں نہ آئیے، میرے حکمران! اوروں سے دریافت کر لیجئے! سارے کے سارے ایماندار لوگ مجھے جانتے ہیں!“

علی دوست بیگ نے اپنی جگہ سے کچھ اٹھتے ہوئے میر آب کی طرف انگلی سے اشارہ کیا:
 ”اور بیگ بے ایمان ہیں؟ سن لیا نا آپ نے، حکمران؟ دیکھ لیا نا آپ نے کہ کتنا سیاہ قلب ہے یہ درویش؟“

لیقوب بیگ باہر کے آگے سر جھکا کر بڑبڑایا:
 ”دراصل عالی جاہ، یہ گاؤ عوام کو بیگوں کے خلاف مشتعل کرنا چاہتا ہے!“
 ”اس کے ارادے بد ہیں! بد!“ ازون حسن چیخ اٹھا اور اس نے سپاہیوں کو حکم دیا: ہت ہو چکا،
 لے جاؤ اس کینت کو یہاں سے!“

سپاہی لپک کے گاؤ کے پاس پہنچے، اسے فرش سے اٹھا کر کھڑا کیا اور مارتے پیٹتے زبردستی دروازے کی طرف گھینٹنے لگے۔ گاؤ مسلسل چلائے جا رہا تھا:
 ”میں بے گناہ ہوں! ارے بیگو، میرے بچوں کی آہ تم پر پڑے گی! میرا معصوم خون تمہیں تباہ کر دے گا!“

یہ کونے باہر کے دل میں کانٹوں کی طرح چبھ گئے۔ اسے فوراً ہی بے لکری کی وہ صبح یاد آگئی جب وہ اپنے ہم عمروں کے ساتھ گھڑسواری کر رہا تھا۔ کچھ ایسا ہوا تھا، واقعی یہی ہوا تھا۔ وہ علی شیر نوائی کی تصویر دیکھ کر شیریں خوابوں میں کھو گیا تھا۔ اب تو لگ رہا تھا جیسے اس واقعے کو کئی سال بیت گئے ہوں..... آج صبح تک، نہیں آج دوپہر تک اس کی زندگی بے داغ تھی، آفتاب سے منور آسمان کی طرح بے داغ، آخر یہ سیاہ بادل کہاں سے آگئے؟..... خون کے پیاسے بیگ درویش گاؤ کو مزائے موت دینے کا مطالبہ کر رہے تھے، یہ سب کے سب گر جتے ہوئے سیاہ بادلوں کے جیسے تھے جنہوں نے آفتاب کو اس کی نگاہوں سے اوجھل کر دیا تھا۔ گولہ، تیز آندھی اور گولہ، باہر کا دم گھٹنے سا لگا، اس مہیب قیاس نے اس کے دل کو سخت اذیت میں مبتلا کر دیا کہ اقتدار اور تخت درویش گاؤ

کے جیسے افراد کے خون کے پیاسے ہوتے ہیں۔
اس کے کانوں میں چیخیں گونج رہی تھیں:
”ابھی ٹپاک کا سر قلم کر دیا جائے!“

”سزائے موت!..... سیاست کا مطالبہ ہے‘ سیاست کا!“

بابر کی دھندلی پڑ جانے والی آنکھوں کو گاؤ کی داڑھی پر لڑھکتے ہوئے قطرات انگہ اب بھی نظر آرہے تھے۔ اس نے سوچا: تو اس شخص کو ایسے زندہ و تندرست شخص کو کیا لاش میں تبدیل ہو جانا چاہئے؟ کیا خود اس کے لئے یہ اجازت دینی ضروری ہے کہ اس شخص کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے؟ آخر کیوں؟ محض اس لئے کہ یہ سب بیگ یکی چاہتے ہیں؟

یہ بھی تو ممکن ہے کہ یہ بیگ واقعی اسے فریب ہی دے رہے ہوں؟ کہیں ایسے ہی بیگوں نے تو والد صاحب کو آخسی میں کراڑے سے نیچے نہیں ڈھکیل دیا تھا؟ اور کل یا پرسوں کی لوگ خود اس کی بھی جان لینے کی کوشش تو نہ کریں گے؟

”استاد محترم!“ بابر نے کھوکھلی سی آواز سے خواجہ عبداللہ کو مخاطب کیا اور وہ بابر کے شانے کی طرف جھک گیا:

”آپ کو ثابت قدم رہنا چاہئے، حکمراں!“

”کیا کرنا چاہئے، بتائیے نا!“ بابر نے چپکے سے کہا۔

”سزا سنائیے۔ بیگ سزائے موت کا مطالبہ کر رہے ہیں۔“

”اور استاد، خود آپ؟“

ایسے میں جبکہ اندجان بلکہ ساری سلطنت فرغانہ کا مقدر داؤں پر لگا ہوا تھا، گاؤ جیسے افراد کی وقعت ہی کیا تھی۔

”حضور والا“ خواجہ عبداللہ نے بھی سرگوشی ہی میں جواب دیا۔ ”ایسے پر خطر لمحات میں بیگوں کی مرضی کے خلاف کچھ نہ کرنا چاہئے۔ حکم دیجئے..... سزائے موت دی جائے.....“

اور اگلے دن قلعے کے سامنے والے میدان میں نقاروں کی گونج کے ساتھ درویش گاؤ کا سرتن سے جدا کر دیا گیا۔

اسی دن اندھیرا ہوتے ہی احمد تبیل چپ چاپ آخسی روانہ ہو گیا۔

قوا

۱

فضل الدین اندجان گیا لیکن اسی روز وہاں سے سخت پریشانی کے عالم میں قوا واپس لوٹ آیا۔ وہ نئے شاہ فرغانہ بابر سے یہ التماس کرنے کے ارادے سے اندجان گیا تھا کہ اس کی حفاظت کا انتظام کر دیا جائے۔ اسے یقین تھا کہ یہ انتظام کر دیا جائے گا لیکن اس سلسلے میں کم سن حکمران سے براہ راست ملاقات ضروری تھی۔ میر عمارت بابر سے متعارف تھا، شہر کے باہر والی شاہی حویلی کی تعمیر کے دوران اس سے اکثر باتیں کرتا رہتا تھا اور جانتا تھا کہ بابر کو بے شمار اشعار یاد ہیں نیز یہ کہ وہ شعرو سخن کا بڑا دلدادہ ہے۔ فضل الدین کو مصوری سے بابر کے گھرے لگاؤ کا بھی علم ہوا تھا اسی لئے اس نے عظیم نوائی کی تصویر اسے نذر کر دی تھی اور بابر نے اسے زردوزی کے کام کا خلعت عطا کیا تھا۔ اب وہ بابر کو اس نا انصافی کے متعلق بتانا چاہتا تھا کہ اسے خود غرض بیگوں کے ہاتھوں شکار ہونا پڑا تھا اور اسے یقین تھا کہ بابر اس کی باتیں توجہ سے سن کر اس کی حفاظت کا انتظام کر دے گا.....

لیکن اسے تو بابر سے ملنے ہی نہ دیا گیا!

ازون حسن اور یعقوب بیگ نے نہ ملنے دیا۔

ازون حسن نے اسے یعقوب بیگ کے پاس بھیج دیا۔ اس دولت مند اور چالپوس بیگ نے اندجان کے دفاع کے لئے دوسروں کی بہ نسبت کہیں زیادہ بڑی رقم دی تھی، دوسروں سے کہیں زیادہ سپاہی بھی، کسی بھی طرح کے آڑے وقت کے لئے۔ نوکر رکھ چھوڑے تھے اور وہ ہر موقع پر بابر سے اپنی وفاداری کا مظاہرہ بھی دوسروں کی بہ نسبت زیادہ زوردار انداز اور زیادہ عیاری کے ساتھ

کیا کرتا تھا۔ یہ ساری باتیں ملحوظ رکھی گئیں اور یعقوب بیگ وزیر اعظم کے عہدے پر مامور ہو گیا،
 باہر کے نزدیک سب سے زیادہ معتبر بن گیا۔ یہی سبب تھا کہ اس سے فضل الدین نے ”سلطنت کے
 امور تعمیرات کے بارے میں“ کم سن حکمران سے ملاقات کی درخواست کی تو اس کی بات بچ ہی میں
 کاٹ دی گئی:

”اس وقت ہمارے نوجوان بادشاہ کو معماروں کی نہیں بلکہ سپاہیوں کی ضرورت ہے، جتنے زیادہ
 ممکن ہو سکیں اتنے ہی ہوشیار سپاہیوں کی! جنگ ختم ہو جائے تب آئیے گا!“
 پھر یعقوب بیگ نے تنظیماً ”سر جھکائے کھڑے ہوئے فضل الدین کے قریب سے گھوڑے پر
 گزرتے وقت ذرا طنزیہ لہجے میں کہا:

”وہاں سپاہی بھرتی کئے جا رہے ہیں۔ جا کے اپنا نام درج کرائیے اور سپاہی بن جائیے، ٹھیک ہے
 ؟“

”زندہ رہے تو وہ دن بھی دیکھنا نصیب ہی ہو گا جب ماہرین تعمیرات کی ضرورت ہوگی!“ فضل
 الدین نے بیگ کو جو آگے نکل چکا تھا، جواب دیا۔

قلعے میں جس کے روح رواں یعقوب بیگ اور ازون حسن تھے، قیام خطرے سے خالی نہ تھا۔
 اور پھر فضل الدین کو یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ گاؤ کا کام کیوں اور کیسے تمام کیا گیا تھا اس لئے وہ اپنی
 بہن کے گھر قوادپس آ گیا.....

اس کا بھانجا، بہن اور بہنوئی بھی تمام اہل قوا کی طرح پریشانی اور بدحواسی کے عالم میں خطرہ تھے
 کہ دشمن کا وہ لشکر جانے کب آن کے ٹوٹ پڑے جو اس وقت قوا سائے پر بنے ہوئے پل کے اس
 پار بس ایک ہی پڑاؤ کی دوری پر کرکی دان میں اشارے کرنے والے الاؤ جلا رہا تھا۔

فضل الدین نے اپنے صندوق کو ایک بار پھر چھپا دینے کا فیصلہ کیا۔

”آپ کے ہاں گیسوں رکھنے کا کوئی خالی گڑھا موجود ہے؟“ اس نے بہن بہنوئی سے پوچھا۔

”ہاں، خشک گھاس رکھنے کی کوٹھری میں ہے۔“

”اور طاہر کہاں ہیں؟“

حمود کے ساتھ کہیں گئے ہیں..... لیکن یہ کام تو ہم ان کے بغیر بھی کر سکتے ہیں۔“

آہنی صندوق کو ایک بار پھر پورے میں رکھا گیا، اسے گڑھے میں اتار کے اوپر سے تختے جڑ دیئے
 گئے اور تختوں کے اوپر خشک گھاس کی ٹال سی لگادی گئی۔

آسمان کو ایک بار پھر کالے کالے بادلوں نے ڈھک لیا۔ چھدری لیکن بڑی بڑی بوندیں پڑنے لگیں جو کہہ رہی تھیں کہ موسلا دھار بارش ہونے ہی کو ہے۔

تو اُپر ہو کا عالم طاری تھا۔ لوگ گھروں کے اندر دبکے دبکائے بیٹھے ہوئے تھے اور کسی کسی وقت کتوں کے بھونکنے کی آوازیں نہ ابھر رہی ہوتیں تو سوچا جاسکتا تھا کہ ساری کی ساری آبادی کہیں اور چلی گئی ہے۔

تو اسائے کے پل پر بھی ہو کا عالم طاری تھا، ایک بھی متنفس نہیں نظر آ رہا تھا۔ طاہر کی بات صحیح نکلی تھی۔ پیریدار بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔

نصف شب کو پل کی طرف جاتے ہوئے راستے پر چند سائے نمودار ہوئے۔ ان میں ایک اور سائے کا جو کچی دیوار کی آڑ سے نکل کر راستے پر آگیا تھا، اضافہ ہو گیا۔

”چتماق اور پچھیشاں لے لیں نا؟“ طاہر نے حتی الامکان دبی آواز سے پوچھا۔

”ہاں لے لیں“ ایک پستہ قد شخص نے بھی جو کندھے پر ٹھیلارکھے ہوئے تھا، دبی آواز ہی سے جواب دیا۔

اس شخص کے کپڑوں میں تل کے تیل کے بوبسی ہوئی تھی، وہ روغن گر تھا۔

طاہر کی پیشانی اور رخساروں پر بوندیں پڑیں تو اس نے سر اٹھا کے آسمان کی طرف دیکھا۔ کالے کالے بادل امنڈتے چلے آ رہے تھے، کہیں ایک ستارہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

”موسلا دھار بارش ہوگئی، تب تو آگ سلگ ہی نہ سکے گی“ طاہر نے سوچا۔ ”شاید پل کی لکڑی ویسے بھی گیلی ہو چکی ہوگی۔“

”ارے عمر زاق، میں ایک کلہاڑی تولے آیا ہوں لیکن ایک اور کلہاڑی اور دو دستوں والے ایک بڑے آرے کی بھی ضرورت ہے۔ تم تو نجار ہو، تمہارے ہاں یہ سب چیزیں ہوں گی۔“

”لیکن آرے کی کیا ضرورت پڑسکتی ہے؟“

”یہ سب نہ پوچھو، بیکار وقت ضائع ہو رہا ہے..... محمود، تم بھی ان کے ساتھ چلے جاؤ، جلدی کرو، بھائیو۔“

”دیکھتے ہی دیکھتے ساری تیاریاں مکمل ہو گئیں۔“

وہ رہا پل

پیریداروں کے اند جان بھاگ جانے کی بات ایک طاہر ہی کو تھوڑی معلوم تھی۔ دشمن کو بھی اس کا علم تھا اسی لئے فوری اقدام کی ضرورت تھی۔ اگلی صبح ہی کو تو دشمن کا لشکر پل پار کرنے والا

تھا۔

ظاہر نے اپنے احباب کو پل کے قریب ہی ایک اونچے درخت کے پاس روک دیا۔
 ”ہمیں کچھ کھونا نہیں ہے، برادران عزیز۔ بیگیوں اور سپاہیوں نے ہمیں بے سارا چھوڑ دیا ہے تاکہ دشمنوں کے گھوڑے ہمیں روند ڈالیں۔ میں اسی کہاوت کو دہرا رہا ہوں: ”ہمت مرداں، مدد خدا“ قسمت نے ہمارا ساتھ دیا تو ہم اپنے عزیزوں رشتے داروں سمیت بلائے عظیم سے بچ نکلیں گے کیونکہ نئے پل کی تعمیر اور وہ بھی ہمارے قواسائے جیسے دریا پر کوئی ہنسی ٹھٹھا نہیں ہے..... لیکن اتفاقاً اگر قسمت ساتھ نہ دے تو ہمیں اپنی زبانیں سی لینی چاہیں، ہم سب کو انجام خواہ کچھ بھی کیوں نہ ہو۔“

”ہم قسم کھاتے ہیں!“ محمود نے عزم و یقین کے ساتھ کہا۔ ”ہم میں سے اگر کوئی بھی یہ راز فاش کرے تو وہ اپنے باپ کا بیٹا نہیں!“
 یہ سب سے بری گالی تھی، سب سے زیادہ شرمناک بات۔

”آمین!“

”آمین!“

سب نے منہ پر ہاتھ پھیرے اور یکے بعد دیگرے پل پر چڑھ گئے۔
 ظاہر چالیس پچاس قدم چلنے کے بعد پل کے وسطی حصے میں آگ لگانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ وہ لوگ جیسے جیسے آگے بڑھتے جا رہے تھے ویسے ویسے ان کا خود کو غیر محفوظ تصور کرنے کا احساس بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ دونوں جانب کھلے پانی کی موجودگی کے باعث پل کے اوپر کنارے کی بہ نسبت زیادہ اجالا تھا۔ کوئی بھی انہیں دیکھ سکتا تھا۔ دشمن کے ہر اول دستے کے کسی بھی تیر انداز کے لئے وہ بہت اچھا نشانہ ثابت ہو سکتے تھے۔ یہ اور بھی برا ہوا کہ آرے سے جسے نجا رہا تھا، ہوائی ٹارگیٹوں کی لکرائی اور زور دار آواز سنائے میں گونج اٹھی۔ فوجوان گھبرا کر ٹھہر گئے اور کچھ دیر تک تاریکی میں ہمہ تن گوش کھڑے رہے۔ خیر ہوئی کہ بے شمار مینڈک مسلسل ٹرائے جا رہے تھے۔
 ”ظاہر، اب ہمیں آگے نہ بڑھنا چاہئے“ محمود نے چپکے سے کہا۔ ”تم نے یہ بھی سوچا ہے کہ ادھر سے وہ لوگ آگئے تو ہم کریں گے کیا؟“

”ہم میں سے کسی ایک کو پل کے دوسرے کنارے پر پہنچ جانا چاہئے۔ سنو عمر زاق، تم اس کنارے پر جا کے پہرا دو..... ارے ڈرو نہیں، وہ لوگ یہاں سے ابھی بہت دور ہیں۔“
 بوندا باندی تیز ہو گئی اور اس کی اوٹ میں دور چلتے ہوئے الاؤ او جھل ہو گئے۔ اب ان لوگوں کو

دشمن نہیں دیکھ سکتے تھے۔

یہ خاصا لمبا پل تین چوبی ستونوں پر ٹکا ہوا تھا۔ طاہر نے جنگلے پر سے جھک کر نیچے دیکھا: وہ رہا دریا کے دوسرے کنارے والا پہلا ستون۔ اس نے عمر زاق کے سوا جو آخر کار پل کے دوسرے سرے پر جا کر پہرا دینے کی جگہ پر کھڑا ہو گیا تھا، سب کو اسی جگہ روک لیا۔ طاہر نے ان لوگوں کو مختلف جگہوں پر تعینات کر کے ہدایت کی کہ کلباڑیوں سے لکڑیوں کی اوپری نم سطح کو چھیل کر خشک سطح پر فوراً "ٹھیلیا سے تیل چھڑک دیں۔ وہ خود بچھٹیوں کو بھیگنے سے بچانے کی کوشش کرتا ہوا چھماق سے چنگاریاں نکالنے لگا۔ کئی نام کو ششوں کے بعد آخر کار سوختے نے آگ پہنچی اور تلخ دھوئیں کی بو پھیل گئی۔ روغن گرنے جو زیادہ مستعد تھا، فوراً ہی بچھٹیاں جلا لیں۔ طاہر نے پرانے سن میں جسے وہ راستے بھرا اپنی بغل میں دبائے رہا تھا، آگ لگادی۔

ہلکی ہلکی آگ دھیرے دھیرے پل کے تختوں پر پھیلنے لگی لیکن انہیں میں ہوا کا جھونکا آیا اور بارش کے قطروں سے یہ آگ دھیمی سی چھن چھنا ہٹ پیدا کرتی ہوئی بجھ گئی۔

"تیل بالکل بیکار ہے، جلتا ہی نہیں!" محمود بڑبڑایا۔

"بارش جو ہو رہی ہے" روغن گرنے صفائی پیش کی۔ "یہی کیا کم ہے کہ ایسا تیل بھی مل گیا۔"

"خاموش!" طاہر نے چپکے سے کہا۔ "سوختے کو سلگنے دو۔" طاہر نے جلدی جلدی دو پٹکوں کو جوڑ کر رسی کی طرح بنا اور ایک سرے کو اپنی کمر میں باندھنے کے بعد دوسرے، کو جنگلے میں باندھ دیا۔ پھر وہ جنگلے سے نیچے لنک گیا اور پیروں سے پل کے ستون کو ٹٹول کر آڑے شہتیر پر کھڑا ہو گیا۔ اس نے شہتیر پر جہاں بارش کا پانی نہیں پہنچ رہا تھا، بچھٹیاں رکھیں، ان پر تیل چھڑکا اور آگ لگادی۔ لکڑی تیزی سے جل اٹھی لیکن اتنی ہی تیزی سے بجھ بھی گئی کیونکہ ہوا کے جھونکوں سے جلتی ہوئی بچھٹیاں آڑے نیچے پانی پر بکھر گئیں۔

طاہر اچھل کر دوبارہ پل کے اوپر اٹھیا اور جلدی سے کلباڑی تھام کر جنوبی کیفیت کے ساتھ جنگلے کو کاٹنے لگا۔

ارے ٹھہرو بھی، طاہر! اس سے آخر حاصل کیا ہو گا؟" محمود چیخ اٹھا۔ "بہن زہو گا کہ کلباڑی مجھے دے دو۔ ذرا دیکھو تو، یہ تختے کیلوں سے جڑے ہوئے ہیں۔ ہم انہیں اکھاڑ پھینکا میں گے۔"

شاید اسی طرح کام بن جائے؟ اندھیرے میں کیلیں نظر نہیں آرہی تھیں لیکن محمود ٹٹول ٹٹول کے تلاش کر لیتا تھا۔ ان دونوں نے مل کر جوں توں پل کے ایک بہت بڑے اور موٹے تختے کو جو آڑا جڑا ہوا تھا، اکھاڑ لیا لیکن دوسرے تختے کو اکھاڑنے کی طاقت نہ رہ گئی۔

”آرے سے کاٹو، بھائی“ محمود نے کہا۔

اور وہ لوگ آرے جڑے ہوئے تختوں کو کاٹنے لگے۔

”ایسی جلد بازی بھی کیا!“ طاہر نے کہا۔ ”اس سے کوئی فرق نہ پڑے گا۔۔۔ ہم پانچ چھ تختے نکال

لیں تب بھی جو شکاف بنے گا اس سے کوئی خاص فائدہ نہ ہوگا۔“

کیوں؟ ہم اتنا چوڑا شکاف بنادیں گے کہ پل پر سے گھوڑے اور ارا بے نہ گزر سکیں گے!“

”لیکن کوئی بھی نجار ذرا ہی دیر میں پل کی مرمت کر دے گا۔ تمہارے خیال میں دشمن کے پاس

نجار نہیں ہیں کیا؟“

”لگتا ہے ہم لاکھ کام میں الجھ بیٹھے!“ نو جوان روغن کرنے اداسی کے ساتھ اعتراف کیا۔

محمود جھلا اٹھا:

”تو پھر آؤ، شہتیروں ہی کو کاٹ ڈالیں!“

”یہ شہتیر کا ہے کو ہیں، پورے کے پورے تھے ہیں، تم مذاق کر رہے ہو کیا؟ کتنے موٹے ہیں،

انہیں کیسے کاٹا جاسکتا ہے!“

”کاٹ ڈالیں گے!“ طاہر کو بھی جوش آگیا۔

جوانوں کی دو جوڑیوں نے باری باری آرے سے پل کے آڑے شہتیروں کو کاٹنے کا سلسلہ

شروع کر دیا۔ تیز بارش نہیں ہوئی تھی لیکن گرم گرم سی پھوار اب بھی پڑ رہی تھی۔ پانی کے

قطرے کام کرنے والوں کے پسینے میں شامل ہوتے رہے اور ان کے کپڑے پوری طرح بھیگ گئے۔

آرا چلانے والے شہتیروں کو دو دو تین تین جگہوں پر کاٹ کے ان حصوں کو کمزور کر دینا چاہتے تھے

جہاں وہ ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے لیکن ان میں سے کسی کے بھی ذہن میں یہ خیال نہ آیا

کہ اگر وہ لوگ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں گے تو تختوں اور شہتیروں کے ساتھ ہی ساتھ خود

بھی تند و تیز قوا سائے میں جا گریں گے۔ بہر حال جیسی کہ انہیں امید تھی پل نہ گرا۔ وہ کچھ دوسری

بڑی بڑی کیلوں، شہتیریں اور ان پر لپٹے ہوئے رسوں کے سارے نکا ہوا تھا۔ طاہر اور محمود ایک

بار پھر کھڑیاں چلانے لگے۔ اتنے میں پل ایک جگہ پر اچانک چر مرایا، اس میں کچھ لرزش سی پیدا

ہوئی لیکن جوں کا توں کھڑا رہا۔

”بہت ہو چکا!“ محمود جو تھکن سے چور چور تھا، کہہ اٹھا۔ ”اے گرانہ ہمارے بس کی بات

نہیں۔“

”بھاڑ میں جائے کج بخت!“ طاہر نے کہا اور جنگلے کو پھر کاٹنے لگا۔ اسی لمحے پل کے دوسرے

کنارے سے عمرزاق بھاگا بھاگا ان لوگوں کے پاس آیا۔

”روک دو! اس طرح کھٹ کھٹ نہ کرو! لگتا ہے دشمن کا لشکر آگے بڑھ رہا ہے!“

”تم نے دیکھا ہے؟“

”مجھے آوازیں سنائی دی ہیں: ”سوار ہو جاؤ!“ ”صف بندی کرو!“ اس کا مطلب ہے کہ وہ لوگ یہاں پہنچنے ہی کو ہیں۔“

”جلدی نہ کرو“ آرے کو اٹھاؤ! یہاں کوئی چیز چھوٹنے نہ پائے!“ طاہر نے حکمانہ لہجے میں کہا اور تختوں کے ٹکڑوں اور بچی کچھی پتھریوں کو اٹھا کر پانی میں پھینک دیا۔

رات بھر کے تھکے ماندے پانچوں نوجوان اپنی کوششوں میں ناکامی کے احساس کے ساتھ اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے۔

مشرق میں سپیدہ سحر نمودار ہو رہا تھا۔

۳

دشمن کے لشکر نے سحری کا وقت گزر جانے کے بعد کوچ کیا۔ ہراول دستہ صبح کے جھپٹے اور کمرے میں ہی پل پر پہنچ گیا تھا۔ موسلا دھار بارش اس جگہ نہیں بلکہ پھاڑوں پر ہوئی تھی اس لئے قوا سائے کے پانی کی سطح کافی بلند ہو گئی تھی اور اس کے بہاؤ میں تیزی و تندید پیدا ہو چکی تھی۔ ہراول دستے کے گھڑسواروں نے جن کی تعداد زیادہ نہ تھی، ایک قطار کی شکل میں پل کو بہ آسانی پار کر لیا۔

بعد میں آنے والے دستے ایک دوسرے سے بالکل ٹٹی ہوئی قطاروں میں پل کی ساری چوڑائی کو گھیر کر اسے پار کرنے لگے۔ سپاہیوں نے اپنے مال غنیمت کو اونٹ گاڑیوں پر لا د رکھا تھا۔ گھڑسواروں، پیدل سپاہیوں، اراہوں اور اونٹوں کا یہ انبوه دھوئیں جیسے کمرے اور آفتاب کی بکھرتی ہوئی سرخی میں کسی سیل سیاہ کی طرح پل کے اوپر پھیل گیا۔

اتنے میں وہ پورا استون جس پر رات میں قوا کے نوجوانوں نے آرا چلایا تھا، چر مارتا ہوا گر گیا۔ ایک اور بات یہ ہوئی کہ تختوں کے درمیان والے شکاف میں کسی گھوڑے کا اگلا سم بھنس گیا جسے نکالنے کی کوشش میں وہ ہنہانے اور اچھلنے لگا۔ یہ صورت حال کچھ یوں اچانک پیش آئی تھی کہ سوار زین پر سنبھل نہ سکا، پیچھے سے آتے ہوئے گھوڑوں کے سموں تلے آگیا۔ پل کے اگلے حصے کے تختوں کی چر مراہٹ اور گر جانے والے سوار کی دل دوز چیخوں سے گھوڑے بھڑک اٹھے، پیچھے کی طرف بٹے اور افرا تفری میں صفیں درہم برہم ہو گئیں۔

اس اثنا میں پیچھے والوں کا دباؤ مسلسل بڑھتا جا رہا تھا۔ راستہ بند ہو جانے کی وجہ سے لوگوں کے آگے بڑھنے کا سلسلہ رک گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پل پر چڑھ آنے والوں کا وزن بہت زیادہ بڑھ گیا۔ آخر پل کا وہ حصہ صیب گٹر گھڑاٹ کے ساتھ ڈھے گیا۔ گھوڑے، انسان، ارابے اور تختے دریا کا شکار ہو گئے جس کے پانی کی سطح بلند ہو کر آڑے شہتیروں کو تقریباً ”چھوٹے لگی تھی۔

جو لوگ پل پر بیچ رہے انہوں نے واپس لوٹنے کی کوشش کی لیکن پیچھے سے وہ سپاہی دھکے دے رہے تھے جنہیں اس واقعے سے ابھی تک بے خبر سپہ سالار اپنے کنارے سے آگے روانہ کئے جا رہا تھا۔ اس دھکا پیل کے نتیجے میں لوگ دریا میں گرنے لگے۔ بدحواسی کی چیخیں نئی اموات کی داستان سنانے لگیں۔ پل کے زیادہ تر حصے میں جنگلے باقی نہ رہ جانے کی وجہ سے اور بھی زیادہ افراد دریا میں گر رہے تھے۔ لدے پھندے، ایک دوسرے سے بری طرح پھنسنے ہوئے ارابوں نے راستہ روک رکھا تھا، سپاہی اور گاڑیاں ان سے ٹکرا کر کناروں کی طرف لٹکتے اور جنگلے کے نیچے ہوئے حصوں کو زوردار آوازوں کے ساتھ توڑتے ہوئے نیچے جا گرتے تھے۔ کچھ سپاہیوں نے چابک مار مار کر اپنے لئے راہ بنانے کی کوشش کی، کچھ بیگیوں نے بھگدڑ کا سلسلہ ختم کرنے کے ارادے سے تلواریں بھی نکال کیں لیکن گرنے والوں کے ریلے نے اپنے ساتھ ہی ساتھ انہیں بھی دریا میں پہنچا دیا۔

پل پر بھڑبھڑا بڑھتی گئی، مرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ سمرقند کے حکمران سلطان احمد کو اس سانحے سے مطلع کیا گیا تو اس نے دریا میں بہتے ہوئے لوگوں کو بچانے کے لئے اپنے محافظ دستے کے سپاہی بھیجے۔ یہ غلط اقدام تھا۔ سپاہی سرکنڈوں میں گھستے گھساتے دریا کے نزدیک پہنچے تو دلدل میں پھنسنے لگے۔ اب خود ان کی جانیں بچانے کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔ کچھ کو تو کندیس پھینک کر باہر گھسیٹ لیا گیا لیکن زیادہ تر سپاہیوں کو دلدلی زمین نگل گئی۔

دلدلی زمین پل کے اوپر سے گرنے والے ان سپاہیوں کو بھی نگل گئی جو تیراک ہونے کی بدولت ہماؤ سے نکل کر پر فریب کنارے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ دریا کا دھارا اور کنارے کا دلدلی علاقہ پریوں کی کمانیوں کے دیوؤں کی طرح انسانوں، گھوڑوں اور اونٹنوں کو نگلتے جا رہے تھے۔ دریا میں ڈوبتے اور دلدل میں دھنستے ہوئے سپاہیوں کی چیخیں ایک دوسرے میں ضم ہوتی جا رہی تھیں۔ شکستہ پل کے اوپر بھی روندے، پکے ہوئے بہت سے افراد کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ دو تین گھنٹوں کے اندر ہی اندر شاہ سمرقند سلطان احمد اس سے کہیں زیادہ فوج گنوا بیٹھا جتنی

جنگ کے آغاز سے اب تک گنوا چکا تھا۔

اور پھر یہ کہ حادثے کا سبب بھی کسی کو معلوم نہ تھا۔ بعد میں بالکل فطری طور پر لوگ کہنے لگے کہ اللہ نے اپنا تعزیری ہاتھ فرغانہ کی حمایت میں اٹھایا تھا.....

۴

اہل قوا اپنے گھروں کی چھتوں اور دیواروں پر سے دشمن کے سپاہیوں کو لقمہ اجل بننے دیکھ رہے تھے جس کا سلسلہ صبح سے دوپہر تک جاری رہا۔ بہت سے لوگ دل ہی دل میں دعا مانگ رہے تھے کہ دشمنوں پر یہ قہر خدا اور کافی دیر تک نازل ہوتا رہے، کچھ لوگ افسوس بھی کر رہے تھے کہ کیسے کیسے ہانکے جوان دریا میں ڈوبتے، دلدل میں دھستے جا رہے ہیں!

طاہر نے گزشتہ شام کو پل سے متعلق اپنے منصوبے کا اپنے ماموں سے اشاروں اشاروں میں تذکرہ کیا اور علی الصباح یہ بھی بتا دیا تھا کہ منصوبے کو آخر تک عملی جامہ پہنانے میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ دن میں پل پر جو کچھ ہو رہا تھا اسے فضل الدین نے گھر کی چھت سے دیکھا تو سیڑھی سے جلدی جلدی نیچے اتر کر سب سے پہلے طاہر کو اشارے سے احاطے کے کونے میں بلایا:

”اپنے احباب سے کہہ دو۔ تم سب کو فوراً ہی رپوش ہو جانا چاہئے۔“

”کیوں، ماموں جان؟“

”پل اسی جگہ ٹوٹا ہے جہاں تم لوگوں نے آڑے شہتیروں کو کاٹا تھا۔ تم لوگ پل کو نذر آتش کر دیتے تو بھی دشمن کو اتنا نقصان نہ جھیلنا پڑتا۔ مرمت کے بعد لشکر اسے پار کر لیتا۔ لیکن دام میں پھنسانے کی اس کارروائی کے بعد یہ اندازہ لگانا ذرا بھی مشکل نہ ہو گا کہ یہ سوچی سمجھی سازش تھی اور سازش بھی کیسی مہارت کی۔ وہ لوگ پل کی مرمت کر کے یہاں پہنچیں گے اور تم سب کو قتل کر دیں گے! ساتھ میں ہمیں بھی!“

”تو کیا وہ لوگ اب بھی دریا کے کنارے پر موجود ہیں؟“

”ان کے گشتی دستے تو دریا کے اس کنارے پر بھی پہنچ چکے ہیں، میں نے خود دیکھا ہے..... باتوں میں وقت نہ ضائع کرو..... فوراً کارروائی کرو! جا کے سرکنڈوں میں چھپ جاؤ۔ غلت سے کام لو.....“

طاہر نے اپنے احباب کو ماموں کے مشورے سے باخبر کر دیا:

”اپنے ساتھ رسیاں اور درانتیاں لے لو۔ راستے میں کوئی پوچھے تو کہنا کہ لکڑی کاٹنے جا رہے

ہیں۔ دو تین دنوں کے لئے کھانا ساتھ لے لیتا۔“

اس طرح پانچ نوجوان یکے بعد دیگرے سب کی نظروں سے چھپتے چھپاتے گاؤں سے چلے گئے۔ ان کی ملاقات تقریباً ”ایک ناقابل گزر مقام پر“ کیس جا کر ہوئی۔

اس اثنا میں دشمن کے گشتی دستے نے ایک بلیک باشی کو ڈھونڈ نکالا اور اس کی مدد سے قوا کے تمام نجاروں اور بعض دقتانوں کو اکٹھا کر کے پل کی مرمت کے لئے پکڑ لے گیا۔ دریا کے دوسرے کنارے کے سپاہی شہتیر اور تختے گھسیٹ گھسیٹ کر لانے لگے۔

کام پر طلب کئے جانے والوں میں طاہر کا باپ بھی شامل تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کا بیٹا رات میں کہیں چلا گیا تھا اور علی الصباح واپس لوٹا تو تھکن سے چور تھا۔ ایک نجار نے طاہر کے باپ کو آرے کے نشانات دکھائے لیکن آخر الذکر نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کی تاکید کی:

”اس بارے میں ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکالنا! دشمنوں کو بھنک بھی لگ گئی تو قوا کو جلا کے خاک کر دیا جائے گا اور ہمارے سر بھی سلامت نہ رہیں گے!“

”آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں۔“

پل کی مرمت کے دوران پورے دودن کسی بھی نجار نے منہ نہ کھولا۔ دشمن کے لشکر نے بہ آسانی پل کو پار کر لیا، سب سے آخر میں سلطان احمد اپنے محافظ دستے کے ساتھ پل پر سے گزرا اور قوا میں قیام کئے بغیر ہی آگے بڑھ گیا۔

ارابوں پر لدے بھاری سامان، اونٹوں اور لشکر کے ایک حصے کو دریا کے دوسرے کنارے پر ہی چھوڑ دیا گیا مگر ششہ دودنوں میں دشمن نے اپنے منصوبے کو شاید کچھ بدل دیا تھا۔

طاہر کو جنگل میں ذرا بھی سکون نہ میسر ہوا، وہ رابعہ کی طرف سے مسلسل تشویش میں مبتلا رہا۔ وہ جانتا تھا کہ والدین اپنی بیٹی کو غیروں کی نگاہوں سے بہر حال چھپائے رکھیں گے لیکن وہ سوچتا کہ ایسے میں جبکہ دشمن کے سپاہی قدم قدم پر موجود ہیں، خبر توہ لیتے پھر رہے ہیں، کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ ان فکروں کے ساتھ ہی ساتھ تیسرے دن نوجوانوں کی غذائی اشیاء بھی ختم ہو گئیں۔ اب انہیں گھروں کو واپس جانے کا فیصلہ کرنا تھا۔ طاہر نے شام ہی کو خشک سرکنڈوں کا ایک گھسٹیا کر لیا تھا جسے لاد کے روانہ ہو گیا۔ گھر پہنچ کر اس نے دیکھا کہ پھانک اندر سے بند ہے تو اس نے ایک شکاف سے جس کا صرف اسی کو علم تھا، ہاتھ اندر ڈال کے زنجیر کھول لی۔ دھندلکے میں اس کی نظر فضل الدین پر پڑی جو سائبان کے پاس کھڑا اپنے ارابے کے پیوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس نے طاہر کو کندھے پر سرکنڈوں کا گھسٹا لادے اندر آتے دیکھا تو ہاتھ اٹھا کر اس کی طرف لپکا:

”امن، میرے بھانجے! امن قائم ہو گیا! مبارک ہو!“

”تو جنگ ختم ہو گئی؟“

”خدا کا شکر، ختم ہو گئی!“

طاہر نے گتھے کو زمین پر گرادیا۔ ماموں نے اسے گلے سے لگا کر گرجو شکی کے ساتھ چپکے چپکے کہا: ”تم لوگوں کی شجاعت رائیگاں نہیں گئی، طاہر جان! سنا ہے کہ شاہ سمرقند نے خود ہی جنگ بندی کی پیش کش کی۔ قواسائے میں اتنے زیادہ سپاہیوں سے ہاتھ دھو بیٹھنے کے بعد اس کا دماغ درست ہو گیا۔۔۔۔۔“ پھر اس نے طاہر کے قوی شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بات جاری رکھی: ”بہت اچھا ہوا، بہت ہی اچھا! یہ اتنے سارے عقل مند بیک جو ہیں نا وہ دشمن کا بال بھی بیک نہ کر سکے اور تم جیسے دلیروں نے کبجھوس کو پسپا کر دیا۔۔۔۔۔ دہقانوں، دستکاروں، نجاروں۔۔۔۔۔ اور کس نے؟۔۔۔۔۔“

”ہاں، روغن گر نے بھی!“ فضل الدین نے زوردار تقہ لگایا اور طاہر کو اپنے گرفت سے آزاد کر کے اس کے چہرے کو پر مسرت نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا: ”دہقانوں، دستکاروں۔۔۔۔۔ اور تم جیسوں کو متکبر بیک قلی کباڑی کہتے ہیں لیکن یہ ”قلی کباڑی“ نہ ہوتے تو ان بیگوں کو مصیبت سے بھلا کون نجات دلا سکتا تھا؟ کون؟“

”ارے ماموں جان، خود ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ایسا شاندار نتیجہ برآمد ہو گا۔ یہ بھی بہت اچھا ہوا کہ آپ یہاں آگئے تھے۔ اگر آپ نہ آئے ہوتے تو شاید یہ ترکیب مجھے بھی جی ہی نہ ہوتی۔۔۔۔۔“

”ارے واہ، تم نے بھی بات کا رخ کتنی خوبصورتی سے موڑ دیا، بھانجے۔ ساتھ ہی مجھے بھی آسمان پر چڑھا دیا!“

فضل الدین ہجانی انداز میں جلدی جلدی کبھی دھیمی تو کبھی بلند آواز سے باتیں کئے جا رہا تھا گویا اب بھی کوئی خطرہ لاحق ہو۔

”ماموں جان، تو کیا وہ لوگ اب بھی قوا میں موجود ہیں؟“ طاہر نے پوچھا۔

”ہاں۔ فوج کی آمد جاری ہے، گشت بھی نہیں ختم کیا گیا۔ ان کے حکمران نے اند جان سے سات فرسخ کی دوری پر ہی جنگ بندی کا معاہدہ کر لیا اور واپس لوٹ گیا۔ اس کے محافظ دستے کا ایک حصہ دریا کے دوسرے کنارے پر پہنچ چکا ہے، یہ تو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ باقی دستہ اس کے ساتھ ہے کہ نہیں، اس کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا پر وہ یہاں پہنچنے ہی والا ہے۔ ہمیں پہلے ہی کی طرح چوکس رہنا چاہیے۔ طاہر جان۔ دشمن پیچھے ہٹنے لگتا ہے تو خاص طور سے

خطرناک ہو جاتا ہے۔ تم اندر جاؤ اور لوگوں کی نظروں سے دور ہی رہنا!“
 طاہر نے اپنے کپڑوں میں چپکے ہوئے تنکے جھاڑ دئے اور اندر چلا گیا۔ پڑوس والے گھر سے
 لوریاں دینے کی آوازیں آرہی تھیں۔ طاہر کو فوراً ہی رابعہ یاد آئی اور دل کی دھڑکنیں تیز
 ہو گئیں۔ آہ، کتنا تڑپ رہا تھا وہ رابعہ کی یاد میں! بندشیں نہ ہوتیں تو وہ اسی لمحے دیوار پھاند کے
 پڑوس کے احاطے میں پہنچ جاتا، رابعہ کو بتاتا کہ لڑائی ختم ہو گئی۔ وہ تو اس وقت تک شاید اس بات
 سے بے خبر ہی رہی ہوگی۔ اور دیکھتا کہ اسے کتنی مسرت حاصل ہوتی اس خبر سے! لیکن نہیں، وہ ایسا
 نہیں کر سکتا تھا، اسے تو پہلے ہی کی طرح چوری چھپے رابعہ سے تنہائی میں ملاقات کی صورت نکالنی
 تھی۔

طاہر نے گھر کے اندر پہنچ کر والدین کو جنگ بندی کی مبارک باد دی ہی تھی کہ اچانک کتا زور
 زور سے بھونکنے لگا، گھوڑوں کی ٹانہیں اور پھر پھانک کے بھڑبھڑائے جانے کی آوازیں سنائی دیں۔
 اس کے لئے خشک گھاس رکھنے کی کوٹھری میں چھپ جانا ضروری تھا، فوراً ہی!
 اس نے کمر سے لٹکتے ہوئے خنجر کے دتے پر ہاتھ رکھ کر بجلی کی سی تیزی سے برآمدے کو پار کیا
 اور آن واحد میں خشک سرکنڈوں کے کٹھوں کی درمیان چھپنے کی جگہ تک پہنچ گیا۔

پھانک مسلسل زور زور سے بھڑبھڑایا جا رہا تھا، مجبوراً ”کھولنا ہی پڑا۔ گھڑسوار سپاہی جن کے
 سروں پر خود تھے، شلواروں کے چوڑے پائینچے جو توں سے رگڑ کھا رہے تھے اور کاٹھیوں سے کمانیں
 لٹک رہی تھیں، احاطے میں گھس آئے۔ ان میں سے دو ایک ہی گھوڑے پر سوار تھے۔ سپاہیوں
 نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں لیکن منہ سے کچھ بھی نہ کہا جیسے انہیں گھروالوں کی خاک بھی پروانہ
 رہی ہو۔

دستہ دار نے جس کے خود کی نوک پر سبز کپڑے کی ننھی سی جھنڈی لگی ہوئی تھی سائبان میں
 بندھے ہوئے گھوڑے کو دیکھ لیا جس پر کاٹھی نہیں کسی ہوئی تھی۔ اس نے مشکلی گھوڑے پر سوار
 دونوں سپاہیوں کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔

”یہ رہا تمہارے لئے گھوڑا۔“

جھٹی جیسا سیاہ فام گھٹی مونچھوں والا نوجوان گھوڑے سے نیچے کود کے سائبان کی طرف لپکا۔
 باقی سپاہی اپنے سردار کے اشارے پر گھر کے اندر گھس گئے اور بالکل نئے جیسے مندے، قالین اور
 گٹھریاں نکال نکال کر احاطے میں ڈھیر کرنے لگے۔

فضل الدین برآمدے کے کعبے سے نیک لگائے بت کی طرح کھڑا یہ سب دیکھ رہا تھا۔ پہلے وہ یہ

سوچ کر بری طرح سہم گیا تھا کہ سپاہی طاہر کی تلاش میں آئے ہیں۔ لیکن وہ تو عام لٹیرے نکلے، قابل نفرت اور ذلیل لٹیرے۔ طاہر کے والدین گھبرائے ہوئے خاموش کھڑے تھے۔ فضل الدین کے لئے ضبط کرنا ناممکن ہو گیا تو اس نے کہا:

”ارے دستہ دار صاحب“۔ دستہ دار اپنے گھوڑے پر سوار احاطے کے وسط میں کھڑا ہوا تھا۔
 ”آخر آپ کا ضمیر کہاں گیا؟ ہمارے حکمرانوں نے جنگ بندی کا اعلان کر دیا ہے جس کے بعد اس قسم کی قزاقی خلاف شرع ہے!“

سیاہ فام نوجوان نے جلدی جلدی فضل الدین کے گھوڑے پر کاٹھی کسی اور نہں پڑا:
 ”ہاں ہاں“ امن ہے۔۔۔۔۔ پھر اس نے دلتزہ لہجے میں اضافہ کیا: ”واقعی امن ہے اور ہمارے لئے خوشحالی!“

دوسرے سپاہی نے سامان کی ایک گٹھری کو ٹٹول کے اس میں سے کچھ اٹلس نکالی اور دستہ کی طرف بوجھادی۔

”مال امان“ اس نے کہا۔

دستہ دار نے فضل الدین کو گھورتے ہوئے اٹلس کو دھیرے دھیرے اپنی خرتی میں ٹھونس لیا اور رک رک کر سرقتی لہجے میں بولا:

”ہمارے ساٹھ گھوڑے ہلاک ہو گئے۔ مصیبت بہر حال مصیبت ہی ہوتی ہے۔ تم تو یہاں ٹھاٹھ سے گھوڑے کی سواری کرو اور میرے سپاہی کو کیا تمہارے خیال میں پیدل سرقت جانا چاہئے؟ دیکھا نہیں تم نے کہ ایک گھوڑے پر دو سپاہی سوار تھے۔“

”جی ہاں، دیکھا ہے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ یہ مرل گھوڑا جو سواری کے نہیں بلکہ ارابے میں جوتنے کے کام آتا ہے، آپ کے بہادر سپاہی کو سرقت تک پہنچا سکتا ہے تو لے لیجئے۔ لیکن عورتوں کے سامان کی گٹھریوں کو ٹٹولنا کیا آپ جیسے عالی نسب دستہ دار کو زیب دیتا ہے؟“

”ارے ہمارے بیویوں نے کہا تھا کہ فرغانہ کی اٹلس لیتے آئے گا۔ ہم اتنی دور سے تکالیف جھیلے ہوئے یہاں آئے تھے اور اب یوں ہی، خالی ہاتھ ہی لوٹ جائیں؟ تمہارے خیال میں کیا یہ ہمیں زیب دیتا ہے؟“

دستہ دار رکابوں پر پاؤں نکال کے کاٹھی سے کچھ اوپر اٹھ گیا اور صاف طاہر ہو رہا تھا کہ اسے غصہ آگیا ہے۔ وہ اس بات پر سخت بھنا گیا تھا کہ لڑائی فتح کے بغیر ہی ختم ہو گئی اور جس کثیر مال غنیمت کی خاطر اس کے جیسے لوگوں نے اپنا خون بہایا تھا، لشکر کشی کی سو طرح کی مشکلات برداشت کی تھیں، وہ

ہاتھ نہ لگا۔ اند جان اور آخشی کو تاراج نہ کیا جاسکا اور پھر قوا کے پل پر ہونے والے حادثے کے بعد جنگ بندی معاہدہ ہو گیا لیکن اس سے حاصل کیا ہوا؟ شاہ سمرقند کو سونا، چاندی، قیمتی کپڑے عمدہ گھوڑے اور اونٹ ملے۔ ساری چیزیں شاہ اور اس کے قریبی افراد یعنی بیگوں، مشیروں، درباری عہدیداروں کو یا پھر اس کے حفاظتی دستے کے سپاہیوں ہی کو نصیب ہوئیں۔ خود اس دستہ دار جیسے لشکریوں کو اگر راستے کے معمولی قریوں کی قزاقی کو شمار نہ کیا جاتا تو دراصل کوئی خاص مال ملا ہی نہیں تھا۔

دستے کے پانچ ایسے ہی لیرے راجہ کے گھر کے احاطے میں بھی گھس گئے۔ اس گھر کے سائبان اور طاہر کے سائبان کی جہاں وہ چھپا ہوا تھا، ایک دیوار مشترک تھی۔ طاہر بڑوسی کے ہاں مچ جانے والی افرا تفری کی آوازیں سن رہا تھا۔

راجہ زنان خانے میں چھپی رہتی تھی لیکن بد قسمتی سے اسی وقت گائے دوہنے کے لئے احاطے میں نکل آئی تھی۔ جنگ بندی کی خبر اسے بھی معلوم ہو چکی تھی۔ اس نے گائے کے پاس بچھڑے کو چھوڑ دیا تاکہ اس کے تھن میں دودھ اتر آئے۔ اس کام میں مصروفیت کی بنا پر اسے احاطے میں گھس آنے والے سپاہی کچھ دیر کے بعد ہی دکھائی دیئے تھے۔

اس کی ماں مویشی خانے کی طرف لپکی:

”ہائے، مجھے موت آجائے، تم ابھی تک یہیں ہو؟“

”کیا ہوا، امی جان؟“

”ارے دشمن! ٹھہرو! احاطے میں مت جاؤ!... اوپری کھڑکی کو پار کر کے خشک گھاس کی کوٹھری میں چلی جاؤ!“

اتنے میں دو سپاہی مویشی خانے کے در میں نمودار ہوئے: اپنے لئے گھوڑے ڈھونڈ رہے تھے۔ تنگ آنکھوں والے تپجاق ☆ نے نسوانی جسم کو کوٹھری کی طرف لپکتے ہوئے دیکھ لیا۔

”خوبصورت معلوم ہوتی ہے!“

”گھوڑے نہیں ہیں۔“ اس کے ساتھی نے افسوس کے ساتھ کہا۔

”حینہ کے سامنے گھوڑے کی کیا وقعت... ارے اے، ٹھہر جاؤ!“ اس نے راجہ کو آواز دی۔

”اسے پکڑ کے سمرقند لئے چلتے ہیں، فاضل بیگ کے ہاتھوں فروخت کر دیں گے۔“

ماں دوڑی دوڑی کوٹھری کے در پر پہنچی اور راستہ روک کے کھڑی ہو گئی۔

”اگر آپ لوگ مسلمان ہیں تو میری بیٹی کو ہاتھ نہ لگائیے! جی چاہے تو میری جان لے لیجئے! میری بیٹی کے نزدیک نہ جاییے! وہ مگتیر ہے! ایک شریف لڑکے سے اس کی نسبت ٹھہر چکی ہے!“

یہ سنتے ہی تنگ آنکھوں والا جوش میں آگیا۔ ”لوکی“ ”مگتیر“ اس کا مطلب تو یہ تھا کہ اس کی اور زیادہ قیمت ملے گی! اس نے ایک ہی زوردار ککے سے ماں کو درپر سے الگ ڈھکیل دیا۔ اس بے چاری کا سر گرتے وقت چارے کی مانند سے نکلایا اور وہ بے ہوش ہو گئی۔

تنگ آنکھوں والا اندر گھس گیا لیکن پھر تیلی رابعہ سائبان کے دوسری طرف سے بھاگ کے احاطے میں پہنچ گئی۔ پر وہاں اسے دوسرے بد معاش نے فوراً ہی دبوچ لیا۔ پہلا سپاہی بھی جلد ہی وہاں آگیا اور وہ دونوں رابعہ کے ہاتھوں کو مروڑنے لگے۔ تیسرے نے کاٹھی پر سے ایک کافی لمبا سا بورا اتارا اور اس کا منہ پھیلانے ہوئے رابعہ کی طرف جو گرفت سے آزاد ہونے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہی تھی نشانہ سالکا کر بڑھنے لگا۔ وہ سمجھ گئی کہ چند لمحوں ہی میں بورا اس کے سر پر ڈال دیا جائے گا اور مدد کے لئے پوری قوت کے ساتھ چیخنے چلانے لگی۔

طاہر اپنے احاطے کی لوٹ مار کو دانت بھینچے ہوئے خاموشی کے ساتھ برداشت کرتا رہا تھا لیکن رابعہ کی چیخیں سنتے ہی اس نے ساری احتیاط کو بالائے طاق رکھ دیا۔ وہ تیزی کے ساتھ سائبان سے نکلا اور اپنے اور پڑوسی کے گھر کے درمیان واقع دیوار کے اوپر چڑھ گیا۔ اب سارا سماں اس کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ ایک سپاہی نے مضبوطی کے ساتھ رابعہ کے پیروں کو پکڑ رکھا تھا دوسرا اس کے ہاتھوں کو پیٹھ کے پیچھے مروڑے کمر سے شائے ہوئے تھا اور تیسرا اس کے سر کے اوپر بورا ڈالنے کو تیار کھڑا تھا۔ طاہر زور سے چلایا اور نیچے کود گیا۔ وہ اکیلا تھا اور حریف پانچ۔ چوتھے نے گھوڑوں کی نگاہیں تھام رکھی تھیں اور بانچوں لمبا نیزہ لئے گھوڑے پر سوار تھا۔ لیکن طاہر نے اس کی ذرا بھی پروا نہ کی۔ اسے صرف ایک ہی فکر تھی اور وہ یہ کہ اس بد معاش پر وار کر کے رابعہ کو چھڑالے۔ اس نے ان کی طرف دوڑتے ہوئے ہی خنجر کو میان سے باہر نکال لیا۔

”ارے ٹھہر، میں کہتا ہوں، ٹھہر جا!“ نیزے والے سپاہی نے اپنے گھوڑے کو آگے بڑھایا۔

لیکن طاہر نے دو ہی چھلانگوں میں احاطے کو پار کر لیا۔ اس نے سائبان میں رابعہ سے الچھے ہوئے سپاہیوں کے پاس پہنچ کر تنگ آنکھوں والے کے جو رابعہ کے پیروں کو پکڑے ہوئے تھا، پہلو میں دستانے تک خنجر اتار دیا۔ اس نے خنجر کو کھینچ کے باہر نکالا ہی تھا کہ اتنے میں اسے اپنے شانے پر نیزے کے زوردار وار کا احساس ہوا نیزے کے کپڑوں کو چیرنے کی آواز بھی سنائی دی۔ طاہر لڑکھڑایا اور تنگ آنکھوں والے پر جسے اس کے خنجر نے لاش میں تبدیل کر دیا تھا، ڈھیر ہو گیا۔ گرتے وقت رابعہ کی چیمچی سی چیخ اس کے کانوں میں پڑی۔

”ہائے طاہر جان!“ اسے یہ چیخ کیس بہت دور سے آتی ہوئی معلوم ہوئی۔

وہ خون میں لت پت یوں ہی زمین پر پڑا رہا اور رابعہ کو وہ سپاہی باندھ کر اٹھالے گئے...

اوش

۱

اوش کے قرب و جوار میں جہاں اونچی پہاڑیاں اور سرسبز و شاداب ہموار میدان حیرت انگیز طور پر ایک دوسرے سے گلے ملتے تھے، کئی دنوں سے بڑی چل پھل تھی۔ اندر جان سے اونٹوں پر لا دکر لائے گئے شاندار خیمے بورا تاغ کے دامن میں نہر جنت اریق کے کنارے کنارے نصب کر دیئے گئے تھے۔ آق بورا سائے کے کنارے کنارے بھی سبزہ زاروں پر سینکڑوں خیمے، نظر آرہے تھے۔ کستانی علاقوں سے لائے گئے دنبے زنج کئے گئے تھے، پتے کی لکڑیوں کے کولے جو ذائقہ دار سیخ کبابوں کے لئے ضروری تصور کئے جاتے تھے، اگیٹھیوں میں دھک رہے تھے اور بڑی بڑی آہنی دیگوں میں گوشت پک رہا تھا۔

باہر کا انتظار کیا جا رہا تھا۔

منتظر سرکاری عہدیداروں میں فضل الدین بھی شامل تھا۔ آج اس کے مقدر کا فیصلہ ہونے والا تھا۔

اسے یعقوب بیگ نے جو عیاری کی بدولت وزیر اعظم کے عہدے پر مامور ہو گیا تھا عرصے تک باہر سے ملاقات نہیں کرنے دی تھی۔ پھر جب یعقوب بیگ نے جمائگیر کی طرف سے ایک اور سازش کرنے کی کوشش کی تو خود ہی پھنس گیا کیونکہ احمد تہل نے بھانڈا پھوڑ دیا۔ یعقوب بیگ انتقامی کارروائی کے خوف سے اند جان سے فرار ہو گیا لیکن قاسم بیگ کی سرکردگی میں سپاہیوں کے ایک دستے نے دن رات تعاقب کرتے ہوئے آخر کار اسے جالیا اور سروریا کے کنارے ہونے

والے تصادم میں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ قاسم بیگ وزیر اعظم بن گیا اور فضل الدین کو مرزا بابر سے ملاقات کا موقع ملا۔

وسیع پیمانے کی تعمیرات کے لئے جن میں مدرسوں کی وہ عمارتیں بھی شامل تھیں جن کے نقشے میر عمارت نے عمر شیخ مرحوم کے حکم سے تیار کئے تھے، حکومت فرغانہ کے پاس ابھی کافی وسائل موجود نہ تھے۔ بابر نے کہا کہ منحوس جنگ سب ہڑپ کر چکی ہے اور اس نے فضل الدین کو اوش میں اس بلند ترین پہاڑی پر جو شہر کے ایک سرے سے ٹٹی ہوئی سی معلوم ہوتی تھی، ایک حجرے اور برآمدے کی تعمیر کا کام سونپ دیا۔ وہاں سے قرب و جوار کے آنکھوں کو فرحت بخشنے والے خوبصورت مناظر دکھائی دیتے تھے۔ کئی مہینے بیت چکے تھے، حجرے کی تعمیر کب ہی کی مکمل ہو چکی تھی لیکن بابر بے حد مصروف رہنے کی بنا پر آج کیس جا کر پہلی بار وہاں آنے والا تھا۔ اسے حجرہ پسند آ جانے کی صورت میں فضل الدین کے لئے دوسرے، اس سے کہیں زیادہ وسیع پیمانے کے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کی راہ ہموار ہو جانا یقینی تھا اور نہ پسند آنے کی صورت میں۔۔۔ فضل الدین اس خیال سے بہت فکر مند تھا ضروری تھا کہ حجرہ بہترین آرائش کے ساتھ مرزا بابر کو ”نذر“ کیا جائے۔

میر عمارت نے کچھ شاہی خدمت گاروں کے ساتھ جنہیں پہلے ہی سے بھیج دیا گیا تھا، پہاڑی سے نیچے اتر کر خود ہی عمدہ قالینوں اور توشکوں کا انتخاب کیا۔ خدمت گار ایسی کھڑی چڑھائی طے کرنے کے عادی نہ تھے اور ان چیزوں کو لا دکر اوپر پہنچاتے پہنچاتے بری طرح بڑھال ہو گئے۔ مثلاً چوب دار (وزن کے نام پر وہ بس ایک چاندی کی پتلی گردن والی کاشغری صراحی ہی اٹھائے ہوئے تھا) تو ہر دس قدم پر سستانے کے لئے ٹھہر جاتا تھا۔ فضل الدین نے اس کی حالت پر ترس کھا کے صراحی خود لے لی اور چوب دار کی بغل میں ہاتھ ڈال کر سہارا دیتا ہوا اسے چوٹی تک لایا۔

چوب دار کی تجویز کے بموجب برآمدے کی سیڑھیوں پر رنگا رنگ قالیچے بچھادیئے گئے لیکن فضل الدین نے درخواست کی کہ انہیں ہٹا دیا جائے کیونکہ پتھروں پر پچی کاری سے بنے ہوئے گل بوٹے اپنی دلکشی سے بہترین قالینوں کو بھی مات کر رہے تھے۔ پہاڑی کی چوٹی پر سے شرادش اور اس کے گرد و نواح کے علاقے بالکل صاف نظر آرہے تھے۔ چوب دار نے جواب بھی ہانپ رہا تھا، جھک کر نیچے دیکھا اور فوراً ہی سیدھا کھڑا ہو گیا:

”وہ دیکھئے، تشریف لے آئے!“

فضل الدین لپک کر برآمدے کے کنارے پر پہنچا اور اس نے بھی نیچے جھانکا۔

سفید گھوڑے پر سوار بابر بیگلوں، خدمت گاروں اور اپنے محافظین کی معیت میں پہاڑی کے قریب پہنچ چکا تھا۔ دوسرے گروہ کے آگے آگے ایک سہاپسی گاڑی چلی آرہی تھی۔ اس میں کون ہو سکتا تھا؟ سارا جلوس کم سن حکمران کے لئے جنت اریق کے کنارے لگائے جانے والے شامیانوں کے سامنے ٹھہر گیا۔ خالص چاندی کے کھونٹوں والے یہ شامیانے جنہیں نفیس ریشم، بانٹ اور قالینوں سے آراستہ کیا گیا تھا خافضوں اور آرام کے لئے تانے گئے تھے۔ فضل الدین نے سوچا کہ شاید مرزا بابر آج انہی شامیانوں میں سے کسی میں آرام کریں اور حجرہ دیکھنے کے لئے کل آئیں۔ لیکن ایک گھنٹہ بھی نہیں گزرا تھا کہ قوری جی باشی ☆ چار سپاہیوں کے ساتھ ہانپتا ہوا چوٹی پر پہنچ گیا۔

”شاہ عالی ابھی یہاں تشریف لائیں گے۔ پالکی کہاں ہے؟“
میر خرم نے فضل الدین کی طرف مدد طلب نگاہوں سے دیکھا۔ فضل الدین نے اپنے بے قسم ☆ کپڑے کے چونے کو کس کر دونوں ہاتھ تنظیماً سینے پر رکھ لئے۔
”معاف کیجئے، بیگ صاحب۔“ اس نے کہا۔
”کیا؟“

”ہم آزمائش کر چکے ہیں، پالکی کو اس پہاڑی کے اوپر تک لانا ناممکن ہے۔ ہمیں تو اینٹیں تک ایک ایک کر کے مزدوروں کی قطار کے ذریعے یہاں لانی پڑی تھیں۔ پالکی کے لئے تو چار قلیوں کو ساتھ ساتھ چڑھنا چاہئے۔“

قوری جی باشی نے بڑے غور کے ساتھ موقع کا جائزہ لیا۔ تین جانب صرف چٹانیں ہی چٹانیں ابھری ہوئی تھیں، صرف ایک جانب کستانی پگڈنڈی واقع تھی جس پر سے ایک شخص کا گزرتا بھی دشوار تھا، چار افراد کے ساتھ ساتھ گزرنے کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔ اس نے میر خرم کی طرف مڑ کر کہا:

”خیر ٹھیک ہے لیکن یہاں ایک بھی فالتو آدمی نہ موجود رہے!“
پگڈنڈی حجرے کے عین سامنے آکر ختم ہو جاتی تھی جہاں سے بڑی بڑی چٹانوں کے بعد ایک چھوٹا سا ہموار میدان شروع ہوتا تھا۔ بابر کی آمد پر آفتابہ جی کو وہیں کھڑا کیا جانا تھا۔
”میر عمارت صاحب، آپ راستے سے بخوبی واقف ہیں اس لئے حکمران کا استقبال کرنے کے لئے آپ ہی چلے جائیے۔“ قوری جی باشی نے حکم دیا۔
ویسے تو خود قوری جی باشی ہی کو نیچے اتر کر مرزا بابر کے ساتھ واپس لوٹنا چاہئے تھا لیکن اتنی زیادہ

ڈھلواں پہاڑی پر دوبار چڑھنا اترنا اس فریہ اندام شخص کے بس کی بات نہ تھی۔ چنانچہ اس نے فضل الدین کو دو سپاہیوں کے ساتھ نیچے بھیج دیا اور خود تراش کر چکنے کر دیئے جانے والے ایک پتھر پر بیٹھ کر اپنی گردن کو جو پسینے پسینے ہوئی جارہی تھی، پونچھنے لگا۔

فضل الدین دن میں کئی کئی بار بورا تاغ سے اترتا اور چڑھ کر اوپر آیا کرتا تھا۔ ایک پتھر سے دوسرے پر میڑھیاں ملے کرنے کے انداز میں کودتے ہوئے چلنے کے لئے ہلکے اور چست جوتے جسم کا توازن برقرار رکھنے میں بہت معاون ثابت ہو رہے تھے۔

میر عمارت جو بابر سے ملاقات کا بے حد مشتاق بھی تھا اور اس ملاقات سے ڈر بھی رہا تھا، عادتاً ”بھاگا بھاگا نیچے پہنچ گیا۔

مرزا بابر اپنے مصاحبین کے ہمراہ پہاڑی کے مشرقی پہلو کو دیکھ کر جنوب سے اس کے قریب پہنچا اور گھوڑے سے اتر گیا۔ پہلے گروہ کے بعد دوسرا گروہ آیا جو خواتین پر مشتمل تھا اور بیگمیں سے الگ تھلک چل رہا تھا۔ بابر کی ماں قلوغ نگار خانم سفید کپڑوں میں ملبوس اور بہت سیدھے مشکی گھوڑے پر سوار تھی۔ خان زادہ بیگم کا بادیای ایال والا گھوڑا تیز اور شوخ تھا اور وہ سنہری قبائے پہنے ہوئے تھی۔ فضل الدین نے اس کے کاٹھی پر بیٹھنے کے پر سکون، پر اعتماد اور دلکش انداز سے اسے فوراً ہی پہچان لیا، اس کا دل تیزی سے دھڑک اٹھا اور اس کے اندیشوں میں ایک نئے، بالکل ہی مختلف نوعیت کے اندیشے کا اضافہ ہو گیا۔ میر عمارت پر درد سے معمور اضطراب حاوی ہو گیا جسے مرزا بابر اور اس کے ہم رکابوں کے قریب پہنچنے پر پھپھائے رکھنے کے لئے اسے کافی کوشش کرنی پڑی۔ اس نے بابر سے چند قدموں کے فاصلے پر ٹھہر کر سینے پر ہاتھ رکھے اور کورنش بجالایا۔

مرزا بابر کی بڑی بہن خان زادہ بیگم اپنے انوکھے طرز عمل سے فضل الدین کو کئی بار متحیر کر چکی تھی۔ چار سال قبل فضل الدین نے ہرات سے واپسی پر اندجان میں عمر شیخ کے لئے حویلی کی تعمیر سے متعلق ذمے داریاں سنبھالی تھیں تو خان زادہ بیگم سولہ سال کی تھی اور عالی نسب دو شیرزاؤں میں سب سے زیادہ حسین و جمیل۔ ایک بار وہ نوجوان کے بھیس میں اچھل کر گھوڑے پر سوار ہو گئی تھی اور بھائی کے نوجوان ہم رکابوں کے ساتھ چوگان کھیل کر میر عمارت کو حیرت زدہ کر دیا تھا۔ کتنے شاندار کھیل کا مظاہرہ کیا تھا اس نے! کچھ وقت گزر جانے کے بعد فضل الدین کو اندجان کے قلعے میں محل کی دیواروں کے بعض حصوں پر دوبارہ رنگ پھیرنے کے لئے بلایا گیا تھا۔ تب فضل الدین نے سترہ سالہ خان زادہ بیگم کو چنگ نواز دو شیرزاؤں کے جھرمٹ میں دیکھا تھا۔ چوگان میں مہارت رکھنے والی اب چنگ پر شیریں، دلربا اور پیچیدہ نغمہ چھیڑے ہوئے تھی اور خود اتنی نرم و نازک اور

حسین نظر آرہی تھی کہ فضل الدین ہر شے کو فراموش کر بیٹھا، اس کے حسن و جمال سے پوری طرح مسحور ہو گیا۔

ایک اور واقعے سے بھی فضل الدین دنگ رہ گیا تھا۔۔۔ وہ محل کی دیوار پر گل بوٹوں کے خاکے بنا رہا تھا کہ اتنے میں خان زادہ بیگم وہاں پہنچ کر اس کے کام کو گہری دلچسپی سے دیکھنے لگی۔ فضل الدین کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور پرکار زمین پر آن گرا۔

”آپ کے ان گل بوٹوں کا کتنا ہی کیا لیکن شاید میری نظر لگ گئی۔“ خان زادہ بیگم نے اس کی بوکھلاہٹ کے لئے خود کو قصور وار ٹھہراتے ہوئے کہا۔

فضل الدین نے پرکار کو فرش سے اٹھاتے ہوئے فوراً ہی ذہانت کے ساتھ جواب دیا۔
 ”نہیں، شہزادی، اس کے برعکس جس خاکے پر بھی آپ کی نظر پڑ جاتی ہے وہ خوبصورت ہو جاتا ہے۔“

”میں نے سنا ہے، میر عمارت صاحب کہ آپ مصور بھی ہیں، ہیں نا؟“

”میر عمارت کو مصوری بھی آتی ہی چاہئے، شہزادی۔“

”تب تو آپ میری تصویر بنا کر دیکھئے کہ کیسی بنتی ہے!“

کتنی غیر متوقع تجویز تھی یہ! فضل الدین نے مڑ کے دیکھا۔ محل کے اس حصے میں اس وقت ان دونوں کے سوا اور کوئی بھی نہ تھا پھر بھی اس نے دھیرے سے کہا۔

”میں تو بڑی خوشی سے بنا دوں۔۔۔ لیکن۔۔۔“

”آپ فکر نہ کیجئے، مجھے رازداری آتی ہے!“

”اور شہزادی، اگر تصویر بنانے کی پاداش میں مجھ سے دوسرے جہان میں میری روح طلب کی گئی تو۔۔۔ میں اسے کہاں سے لاؤں گا جبکہ یہیں کھوپکا ہوں گا؟۔۔۔ میں تو اسے کھو ہی رہا ہوں، شہزادی۔۔۔“

خان زادہ بیگم ضلع جگت کو سمجھ گئی اور دلکش تبسم کے ساتھ بولی۔

”اگر میری تصویر بنانے کی پاداش میں آپ کی روح طلب کی جائے تو مجھے بتائیے گا اپنی روح دے دوں گی!“

۔۔۔ آہنی صندوق میں رکھی ہوئی تصویر کو بنانے کی جرات فضل الدین نے انہی پر مذاق، شوخ اور خوبصورت الفاظ کو سننے کے بعد کی تھی۔۔۔

جنگ کے پر آشوب مہینوں کے دوران اور جنگ ختم ہونے کے فوراً بعد کے ایام میں اسے خان

زادہ بیگم سے ملاقات کا کوئی موقع نہیں میسر ہوا تھا۔

آخر کار گزشتہ موسم خزاں میں خود خان زادہ بیگم ہی اس سے ملنے کے لئے بورا تاغ آ پہنچی۔ بابر لشکر کشی کے سلسلے میں روانہ ہوئے وقت اپنی بہن اور والدہ سے اوش کے تعمیر کاموں پر نظر رکھنے کو کہہ گیا تھا۔ ماہ میزان ☆ میں خان زادہ بیگم مہمان کی حیثیت سے اوش آئی اور بورا تاغ پہاڑی شہر کے کنارے ہی پرواقع تھی۔

فضل الدین ان دنوں صرف اپنے ایک شاگرد کی مدد سے کام کر رہا تھا۔ نیچے سے ایک ایک اینٹ، ایک ایک تختے اور پانی کے ایک ایک گھڑے کو بڑی مشکل کے ساتھ پہاڑی کے اوپر لایا جا رہا تھا۔ نہ سنگ مرمر کے چوکے تراشنے کے لئے کوئی سنگ تراش تھا اور نہ ہی کاشییں ☆☆ خریدنے کے لئے پیسے۔ ان سب چیزوں کی قلت نے فضل الدین کو بری طرح پریشان کر رکھا تھا؟ ایک کیوں کا تذکرہ بھلا خان زادہ بیگم سے کیسے کیا جاسکتا تھا؟ ایک ایسے فرد سے اینٹوں کی بات بھلا کیسے کی جاسکتی تھی جو سر کی موتیوں سے آراستہ ریشمی طاویہ سے لے کر پیروں کی اوپر کو مڑی نوکوں والی سرخ کشتوں تک نزاکت اور نفاست کا پیکر ہو، نرم و نازک اور بھرپور آسمانی حسن کی زندہ مثال ہو؟ تصویر حیرت بنے ہوئے میر عمارت کی زبان ہی جواب دے گی۔

آخر خان زادہ بیگم نے خود ہی فضل الدین سے زیر تعمیر حجرے کا نقشہ مانگا۔ ”گنبد کے اوپر آپ چمکیلی کاشییں لگانا چاہتے ہیں؟ آپ کے پاس کافی کاشییں ہیں نا؟“ اس نے نقشے پر نظریں جمائے جمائے پوچھا۔

مجبوراً فضل الدین کو ان چیزوں کا ذکر کرنا پڑا جن کی اسے ضرورت تھی۔ اس نے سوچا: تو شہزادی فن تعمیر سے بھی واقف ہیں؟ کتنی کتابوں کا مطالعہ کر چکی ہیں آخر وہ؟

”مرزا بابر ظفریاب ہو کر داپس لوٹیں گے اور والد مرحوم کے خوابوں کو حقیقت میں بدل دیں گے۔“ خان زادہ بیگم نے عزم کے ساتھ کہا۔ ”ہم بہت سی عمارتیں تعمیر کرائیں گے اور ان کاموں کے رہنما اور نگران آپ ہی ہوں گے!“

فضل الدین کو دنیا میں اتنی زیادہ محبت بھری آواز سے اور کبھی بھی کسی نے مخاطب نہیں کیا تھا۔ خان زادہ بیگم! یہ بات کتنی خوش قسمتی کی آئینہ دار تھی کہ شاہی خاندان میں ایک ایسی شخصیت مل گئی جو فن تعمیر کے رموز سے اتنی زیادہ واقف اور اس کی اتنی قدرداں تھی۔ لیکن کیا بس یہی ایک بات تھی جو فضل الدین کے حوصلے بڑھا رہی تھی، اس کے دل میں شہزادی کی طرف شکرگزاری بھرے جھکاؤ کے لطیف جذبات بیدار کر رہی تھی؟

اچانک خان زادہ بیگم واپسی کے لئے غلت کرنے لگی۔

فضل الدین بخوبی جانتا تھا کہ پہاڑ سے نیچے اترنا اس پر چڑھنے سے زیادہ دشوار ہوتا ہے۔ یہی سبب تھا کہ اس نے واپسی میں خان زادہ بیگم کے ساتھ جانے کا فیصلہ کیا۔ ”پل صراط“ پر جیسا کہ لوگ اس پھسلن دار پہاڑی پگڈنڈی کو کہا کرتے تھے، خان زادہ بیگم کی چکنے تلوں والی کفنیس پھسل گئیں۔ اس کے جسم کا توازن بگڑ گیا اور اس نے اپنی کنیر کی طرف جو ڈھال سے آگے آگے اتر رہی تھی ہاتھ بڑھایا لیکن خود کنیر بھی کھڑکھڑائی اور ڈر کے مارے چیخ اٹھی۔ دونوں ہی کے گر جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ فضل الدین فوراً چپتے کی سی تیزی سے کود کر ان دونوں کے آگے پہنچا اور انہیں اپنی بانسوں میں سنبھال لیا۔ جوان کنیر نے تو سسم کر جلدی سے فضل الدین کو پکڑ لیا لیکن ہرن جیسی تیز اور پھرتیلی خان زادہ بیگم نے اپنی کمر کو جکڑتے ہوئے مرد کے بازو کا صرف ایک لمحے کے لئے سہارا لے کر اپنا توازن درست کیا اور سیدھی کھڑی ہو کے چپکے سے بولی: ”شکریہ“ فضل الدین نے خان زادہ بیگم کی گرم گرم سانسوں اور عطر کی خوشبو کو محسوس کیا۔ وہ خوشبو کیا صرف عطر ہی کی تھی؟ خان زادہ بیگم۔۔۔ اس نے خان زادہ بیگم کے سرد ہاتھ کو مضبوطی سے تھام لیا اور اس وقت تک تھامے رہا جب تک اسے ہموار جگہ سے بل کھاتی گزرتی ہوئی پگڈنڈی تک نہ پہنچا دیا۔

یہ ایک خواب تھا، شاندار اور طلسمی خواب لیکن اسے وہ نصف سے کچھ کم پگڈنڈی تک ہی دیکھ پایا۔

اگلے ہی روز خان زادہ بیگم نے دو طاقتور نوجوان بھیج دیئے جو نیچے سے پہاڑی کے اوپر فضل الدین کے پاس تک عمارتی سامان پہنچانے لگے۔ ہفتے بھر بعد چکیلی کاشینوں سے لدے ہوئے اونٹ بھی پہنچ گئے۔ فضل الدین کو ہر کاشین میں خان زادہ بیگم کا عکس نظر آتا تھا اور شام کو جب وہ تہوارہ جاتا تھا تو اپنے آہنی صندوق سے اس کی تصویر نکال لیا کرتا تھا۔

اس وقت خان زادہ بیگم کو اپنے قریب آتے دیکھ کر فضل الدین کے دل میں پہلے ہی کی طرح آتش شوق بھڑک اٹھی اور اس نے حتی الامکان کوشش کی کہ اس کی یہ اضطرابی کیفیت کسی پر ظاہر نہ ہونے پائے۔

.... مرزا بابر گھوڑے سے اتر ا۔ وہ خاصا بڑا ہو گیا تھا، دیکھنے میں نوجوان سا لگ رہا تھا۔ فضل الدین کی نگاہوں میں تو بابر کی چال تک اب بڑی پروقار ہو گئی تھی۔ آخر اسے تخت پر بیٹھے ہوئے تین سال ہو چکے تھے اور فکروں پریشانیوں سے بھرے ہوئے سال انسان کو جلد ہی چٹختی سے ہم کنار

کرتے ہیں کسی بھی عمر کا آدمی کیوں نہ ہو اس میں مردانگی آجاتی ہے۔ محض پتلی کر اور بے ڈول
شانے ہی کہہ رہے تھے کہ باہر پندرہ سال کا ہے۔

لیکن پہاڑ پر چڑھنے کے لئے پندرہ سال کی عمر بہت موزوں ہوتی ہے۔ باہر اوروں کو پیچھے چھوڑ کر
ایک چٹان سے دوسری پر پاؤں رکھتا ہے آسانی چڑھتا چلا جا رہا تھا کبھی والدہ کو اور کبھی بہن کو ہاتھ کا
سہارا دے کر چڑھائی کے دشوار حصوں کو طے کرنے میں ان کی مدد کرتا جا رہا تھا۔ اعلا عہدید اوروں
میں سے زیادہ تر افراد نیچے ہی ٹھہر گئے تھے۔ راستہ تنگ تھا حجرے میں گنجائش کم تھی اس لئے باہر
کے ساتھ اس کا متعبر ترین عہدیدار وزیر اعظم قاسم بیگ ہی پہاڑی پر چڑھ رہا تھا۔ جسے دربار میں
پیٹھ پیچھے ”تو چینی“ کہا جاتا تھا۔ قاسم بیگ اپنے مٹاپے کے باعث نصف راستہ طے کرنے کے بعد
ہی ہانپنے لگا۔ باہر ٹھہر گیا۔ قاسم بیگ نے مڑ کر فضل الدین سے جو سب سے پیچھے آ رہا تھا کہا:

”میر عمارت صاحب! آپ کو یہاں سیڑھیاں بنانے کا خیال کیوں نہ آیا؟“

فضل الدین نے ادب کے ساتھ جواب دیا:

”شاہ والا قدر کا حکم ہو تو۔۔۔“

باہر جو ایک ہوا ر پتھر پر کھڑا ہوا تھا مسکرا دیا اور اس نے کم سنوں کی سی نرمی اور دھیمی آواز میں
میر عمارت کو ٹوکے ہوئے کہا:

”عجب بات ہے! کیا پہاڑ کی چوٹی پر پہنچنے کے لئے بھی محل کی جیسی سیڑھیاں بنائی جانی چاہیں؟“

قاسم بیگ نے مجلسی آداب کی نزاکتوں کو ملحوظ رکھے بغیر سادہ لوحی سے شکایت کی:

”محترم حکمران! آپ کے اس خادم کو تو سیڑھیاں بھی پسینے سے محفوظ نہیں رکھ سکتیں۔“

قلوغ نگار خانم ہنس پڑی:

”قاسم بیگ صاحب! ایسی ڈھلوان چٹانوں پر تو سمی پیدل چلنے پر مجبور ہو جاتے ہیں شاہ بھی اور

خادم بھی!“

”حتیٰ کہ شہزادیاں بھی!“ باہر نے بہن کی طرف دیکھتے ہوئے مذاق کیا۔

وہ سب اسی طرح ہنسی مذاق کرتے ہوئے حجرے کے سامنے کے میدان تک پہنچ گئے۔ نیلے گنبد
والی چھوٹی سی عمارت فصل گل کے آفتاب کی شعاعوں میں کچھ اس طرح چمک رہی تھی کہ باہر کا
دل فوراً ہی نور اور حرارت سے معمور ہو گیا۔ قرب و جوار کے علاقے کا جو وہاں سے صاف صاف
دکھائی دے رہا تھا، سارا حسن اس کے دل میں سرایت کرنے لگا: دوری پر واقع پہاڑیاں، موسم بہار
کی ہوائیں اور بالکل پاس ہی برآمدے کے کھمبوں پر آنکھوں کو فرحت بخشے ہوئے گل بوٹے، گنبد

کی رنگ برنگی چمکیلی کاشینوں پر دھوپ اور چھاؤں کی اٹکھیلیاں....
 قاسم بیگ باہر اس کی ماں اور بہن کو عمارت میں داخل ہونے کے دروازے تک پہنچا آیا اور
 خود دروازے کے باہر سنگ مرمر کی سیڑھیوں کے قریب کھڑا ہو گیا۔ وہ باہر کی اجازت کے اشارے
 کے بغیر اس حصے میں نہ گیا جس میں شاہی خاندان کی خواتین داخل ہوئی تھیں۔
 فضل الدین بہن بھی برآمدے کے باہر ہی کھڑا رہا۔

حجرے کے دروازوں پر نسبت کاری کے ساتھ ہی ساتھ سنہرے رنگوں سے بھی گل بوٹے بنے
 ہوئے تھے۔ باہر نے دیواروں اور کٹنیوں کی خوبصورت آرائش کا غور سے جائزہ لیا پھر حجرے میں
 داخل ہونے کا دروازہ کھولا اور ماں اور بہن کے بعد خود بھی اندر چلا گیا۔

حجرے کے اندر اندھیرا نہ تھا لیکن رواج کے بموجب محراب میں شمع جل رہی تھی۔ کھڑکیوں
 سے اندر داخل ہوتے ہوئے دن کے اجالے کی بنا پر اس کی لو بمشکل ہی نظر آرہی تھی پھر بھی دیوار
 کے سنہرے تیل بوٹوں پر پڑتی ہوئی اس کی مرتعش روشنی ان کی خوبصورتی کو دوبالا کر رہی تھی۔
 باہر بہت زیادہ جوش و خروش میں آگیا، فرط انبساط سے بے خود سا ہو گیا۔ اسے شمع کی لو کے گرد
 طاق کے اندرونی حصوں پر سرخ نقش و نگار نظر آئے تو اس نے بہن سے دریافت کیا:
 ”اسلمی گل خن یہی ہے؟“

خان زادہ بیگم کے ہونٹوں پر شرارت آمیز مسکراہٹ بکھر گئی: ”جان بخشی جانے تو عرض
 کروں۔“

باہر بھی مسکرایا۔

”بخشی، بخش دی۔ اب فرمائیے۔“

خان زادہ بیگم نے مڑ کر داخلے کے دروازے کی نقاشی کی طرف اشارہ کیا:

”اسلمی گل خن تو وہاں ہے۔ آپ دراصل لالوں کی تصویر کو گل خن سمجھ بیٹھے، امیر۔“

اسلمی گل خن... خان زادہ بیگم نے جس نقش کی طرف اشارہ کیا تھا وہ واقعی شعلوں کی طرح دھبک
 رہا تھا۔ انسان حجرے کی دہلیز پر پہنچتا ہے تو اس کی بلائیں بھی ساتھ ہوتی ہیں اور وہ بھی بہ علت اندر
 داخل ہو جانا چاہتی ہیں لیکن.... دہلیز پر ٹھہر جانے کے لئے مجبور ہو جاتی ہیں، محافظ آگ انہیں
 اندر نہیں گھسنے دیتی.... جانے کیوں باہر کو خیال آیا کہ قدیم دستور کے بموجب دولہا دلہن سے بھی
 گل خن کا طواف کرایا جاتا ہے۔ اس نے ایسے معاملات کی واقفیت کے سلسلے میں بہن کی برتری کو
 تسلیم کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا:

”بجافرمایا آپ نے مجھ سے غلطی ہو گئی تھی۔“

”یہ غلطی قابل معافی ہے۔“ قلوغ نگار خانم بول اٹھی۔ ”کیونکہ حجرے میں بنی ہوئی لالوں کی تصویر کچھ اتنی آب و تاب سے دھک سی رہی ہے کہ گل خن معلوم ہوتی ہے!“

والدہ کی اس بات نے بابر کی مسرت میں اضافہ کر دیا۔ وہ سب حجرے سے نکل کر برآمدے میں آئے تو نیچے کھڑے ہوئے فضل الدین نے بابر کے چہرے کو دیکھتے ہی اس کے دلی اطمینان اور شادمانی کو بھانپ لیا۔ دوسرے ہی لمحے اسے بابر کی پرستائش آواز سنائی دی:

”حجرہ تو بورا تاغ پر بڑا شاندار لگتا ہے، ٹھیک ہے نا، بیگ صاحب؟“

بورا تاغ کو بابر بچپن ہی سے بہت پسند کرتا تھا۔ اس بلند پہاڑی کو قدرت نے ہموار وادی کے وسطی علاقے میں واقعی لوگوں کو متحیر کرنے کے لئے ہی اُستادہ کیا تھا۔ واقعی کسی غیر مرئی قوت نے ہی کہیں سے کسی عظیم و بے کراں کوہسار کے ایک حصے کو یہاں لا کر بیچ میدان میں چاروں طرف سے نظارے کے لئے انتہائی موزوں جگہ پر رکھ دیا تھا۔

ہاں بابر کی تخت نشینی کے بعد اس کے نام سے وابستہ یہ پہلی عمارت چھوٹی ہی تھی لیکن خود اسے بے حد عزیز تھی اور روشن مستقبل کی جس کے خوابوں میں وہ کھویا رہتا تھا۔ امید دلاری تھی۔ اس کے دل میں شدید خواہش پیدا ہوئی کہ یہ حجرہ پہاڑی کی رفعتوں پر طویل عرصے تک قائم رہے اور لوگوں کو اس کی یاد دلاتا رہے۔

بابر نے میر عمارت کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

”اس پہاڑی پر تو بہت بارشیں ہوتی ہیں، برف بہت گرتی ہے۔ ایسی جگہ پر حجرہ کافی عرصے تک کھڑا بھی رہ سکے گا؟“

قلوغ نگار خانم اور خان زادہ بیگم نے بھی میر عمارت کی طرف دلچسپی کے ساتھ دیکھا۔ فضل الدین کے گھٹنے اس کے کہنے میں نہ رہے اور گھبراہٹ کے مارے کانپ اٹھے۔ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر کورنش بجالایا۔

”انشاء اللہ تعالیٰ یہ حجرہ طویل عرصے تک قائم رہے گا۔“ قاسم بیگ نے اس کی تائید کی:

”جی ہاں، کوئی چالیس پچاس سال۔“

لیکن اسے فضل الدین کی نگاہوں سے فوراً ہی اندازہ ہو گیا کہ مدت کے اس تعین سے اس نے میر عمارت کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ فضل الدین نے اس کی سختی سے مخالفت کرنی چاہی لیکن عین اسی لمحے اسے اپنے چہرے پر کسی کی محبت بھری نگاہوں کا لمس محسوس ہوا۔ اس نے سر اٹھایا اور خان

زادہ بیگم کو اپنی طرف دیکھتے پایا، اسے یوں لگا جیسے شہزادی چہرے کو ڈھکتے ہوئے باریک ڈوپٹے کے پیچھے سے کہہ رہی ہو کہ مہر و احتیاط سے کام لیجئے۔ فضل الدین نے خود کو انگاروں پر گرتے محسوس کیا، چہرہ سرخ ہو گیا (اب تو راز قاش ہونے کو ہے!) اور خان زادہ بیگم کی طرف رخ کر کے بہت زیادہ جھک کر کورنش بجالایا۔

خان زادہ بیگم نے باہر سے کہا:

”ارے امیرزی شان، حجرے کی تعمیر تو استاد فن کے ہاتھوں ہوئی ہے، اسے کئی آئندہ نسلیں دیکھ سکیں گی! ملاحظہ فرمائیے ان ساری جگہوں کو جو برف و باراں سے متاثر ہو سکتی ہیں، چکٹائے ہوئے سنگ خارا سے ڈھک دیا گیا ہے اور حجرے کی بنیادیں چٹانوں کے اندر اتنی ٹھوس اور مضبوط ہیں کہ انہی کا جزو بن گئی ہیں۔ فضل الدین صاحب عظیم استعداد کے مالک ہیں۔ یہ ہرات اور سرقند کے بہترین معماروں سے کم تھوڑی ہیں۔“

باہر کو قطعاً ”نہیں معلوم ہونا چاہئے تھا کہ ایک عام میر عمارت کے دل میں مرحوم شاہ عالی نسب کی دختر کی محبت کے جذبات امنڈ رہے ہیں۔ ہرگز نہیں! معلوم ہو جاتا تو خطرناک تھا اور مایوس کن! خدا کا شکر کہ کورنش بجالانا لازمی تھا۔۔۔ اور فضل الدین، خان زادہ بیگم کے ہمدردی بھرے الفاظ کے جواب میں ایک بار پھر بہت زیادہ جھک کر کورنش بجالایا۔ لیکن محض اپنی آنکھوں کی مخصوص چمک کو چھپالیتا ہی کافی نہ تھا، زبان سے ادا ہونے والے الفاظ کا بھی اس احساس کے ساتھ خیال رکھنا تھا کہ قدم تلوار کی دھار پر پڑ رہے ہیں۔

”عالی جاہ، خادم یہ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہے کہ حجرے کی تعمیر میں ویسے ہی پتھر، ویسا ہی سنگ جراثیم اور ویسی ہی چمکیلی کاشییں استعمال ہوئی ہیں جیسی کہ سرقند کے الف بیک مدر سے میں کی گئی تھیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ“ فضل الدین نے اپنی بات چوکی کے ساتھ جاری رکھی۔ ”یہ حجرہ جو عظیم مرزا باہر کے شایان شان ہے، کئی صدیوں تک مضبوطی کے ساتھ کھڑا رہے گا۔

باہر کو یہ سن کر اور زیادہ جوش آگیا۔

”آمین! حجرہ ہماری توقعات سے زیادہ خوبصورت ثابت ہوا!“

”آفریں، فضل الدین صاحب!“ قاسم بیک نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

باہر نے بات سنبھال لی:

”صاحب کمال فضل الدین!“ اس نے آفتابہ چی کے قریب کھڑے ہوئے میر فہم کی طرف مرکز

بلند آواز سے کہا۔ ”صاحب کمال کو نلعت عطا کیا جائے!“

میر خدّم نے گھبرا کر آفتابہ جی کی طرف دیکھا۔ کیا کیا جائے؟ نلعت تو نیچے شامیانے ہی میں رہ گئی تھی۔ قاسم بیگ تاخیر ہوتے دیکھ کر اپنے زری کے چونے کے گریبان کا جس پر گل بوٹے کڑھے ہوئے تھے بند کھولنے لگا۔

”اجازت دیجئے حکمراں!“

بابر نے اس فیاضی کو درست تصور کرتے ہوئے مسکرا کر اثبات میں سر ہلادیا۔

قاسم بیگ نے اپنا چونغا تار کے فضل الدین کے شانوں پر ڈال دیا۔

”انہیں ہماری طرف سے ایک گھوڑا پورے ساز کے ساتھ پیش کیا جائے۔“ بابر نے بڑی فیاضی کے ساتھ کہا۔

اور بیگ وقت کئی آوازیں گونج اٹھیں:

”مبارک ہو! انعام و اکرام مبارک ہو!“

فضل الدین کو سب سے پہلے خان زادہ بیگم کی آواز سنائی دی، دوسری آوازوں کے لئے وہ جیسے بہرا سا ہو گیا تھا۔ وہ شہزادی کی طرف دیکھنے کی جرات نہ کر سکا اور کورنش میں سر کو جھکائے ہوئے کھڑا رہا، ساری باتوں کے باوجود خود کو خوش نصیب تصور کرتا رہا۔

۳

مرزا بابر سہ پہر کو بورا تاغ پر تنہا رہ گیا۔ قاسم بیگ نے عہدیداران سلطنت کو بتادیا تھا کہ ”حجرہ حکمراں کے لئے تھاوقت مگر انے کی جگہ بن گیا ہے اور ممکن ہے کہ وہ ساری رات وہیں کاٹ دیں“ محافظ دستے کے سپاہی بابر کو نظر نہ آنے کی کوشش کرتے ہوئے پہرا دینے لگے....

بابر کافی دیر تک برآمدے کی بلندی سے قرب و جوار کے خوبصورت مناظر سے محظوظ ہوتا رہا۔

فصل گل چاروں طرف سے اوش کی جانب خراماں تھی۔ فضائیں اتنی صاف و شفاف تھیں کہ نیچے وادی میں چلتے ہوئے الاؤں کا دھواں تک سیاہ نہیں بلکہ خاکستری نیلگوں ہو رہا تھا۔

دور دراز واقع برف پوش پہاڑیوں کے دامنوں تک ساری وادی ہریالی کے تجربے کراں کی سی لگ رہی تھی۔ بابر یہ اندازہ لگاتے ہوئے کہ اوزگنت، مرغیلان اور میماں سے بہت دوری پر واقع اسفرہ، خوجند اور اخی کماں کماں ہیں، تصور کرنے لگا کہ ان سب شہروں کے باغات اس وقت کیسے سفید جھاگ جیسے پھولوں میں ڈوبے ہوئے ہوں گے۔ بلند کوہستانی سلسلوں سے گھری ہوئی رشک جنگ وادی فرغانہ پھولوں اور خوشبوؤں سے معمور ہوگی۔ نوجوان حکمراں نے قدرے فخر کے ساتھ سوچا: ”وہاں امن و سکون کا دور دورہ ہے“ جنگ کے خاتمے کو دو سال سے زائد مدت ہو چکی تھی۔

وہ شاہ سمرقند کو امن برقرار رکھنے پر مجبور کر دینے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

ایسے لمحات میں کاغذ اور قلم بابر کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لیا کرتے تھے۔ خدمت گاروں نے حجرے کے اندر چھ پایوں والی چوکی بچھا دی تھی۔ وہ اس کے پاس بے قسم کا گدا بچھا کر بیٹھ گیا اور اپنے روزنامے کو کھولا جس پر عنوان کی حیثیت سے ”ترک“ درج تھا۔ اس میں گزشتہ بار اس نے کان یادام اور اسفرہ سے متعلق اپنے مشاہدات قلم بند کئے تھے۔ اس وقت اس نے صاف صاف حروف سے لکھا ”اوش کے باہر.... بورا تاغ پہاڑی کی چوٹی پر میں نے ۹۹۲ ہجری میں برآمدے والا ایک چھوٹا سا حجرہ تعمیر کرایا۔ یہ حجرہ بہت اچھی جگہ پر بنا ہوا ہے اور یہاں سے سارا شہر اور قرب و جوار کے علاقے صاف دکھائی دیتے ہیں....“

وہ بڑے جوش و خروش کے ساتھ لکھتا رہا اور ہنسنے اور لالے کے پھولوں کا جنہوں نے اسے متحیر کر دیا تھا اور اوش کے لال لال سے پتھروں کا تذکرہ کرنا نہ بھولا۔
اسنے میں قاسم بیگ دروازے میں نمودار ہوا:-

گستاخی معاف فرمائیں، عالی جاہ کہ آپ کے نیک کام میں مغل ہوا۔ لیکن... بخارا کے سلطان علی خان نے فوری اہمیت کی کوئی خبر بھیجی ہے۔“

بابر نے قدرے جھنجھلاہٹ کے ساتھ قلم رکھ کر قاسم بیگ کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔ قاسم بیگ نے گول لپٹا ہوا خط جس کے اوپر مرثاوی ثبت تھی، پیش کیا جسے پڑھ کر بابر نے سر اٹھایا:
”سلطان علی خان نے ہمیں سمرقند پر لشکر کشی کی دعوت دی ہے“ اس نے کچھ سوالیہ سے لہجے میں کہا۔

”سمرقند والوں سے ہمارے پر امن تعلقات قائم ہیں لیکن سلطان علی خان سے تو ہم نے جنگ میں ساتھ دینے کا معاہدہ کر رکھا ہے۔“

”حکمران عالی۔ میرے خیال میں لشکر کشی کو ٹالا نہیں جاسکتا۔“

”جنگ چھیڑنے میں غلت نہ کیجئے، وزیر اعظم ہمیں اس معاملے میں پہلے تو والدہ صاحبہ کی دعائے خیر حاصل کرنی ہوگی۔“

بابر کا ہر اہم معاملے میں کسی فیصلے پر پہنچنے سے قبل والدہ سے مشورہ قاسم بیگ کو ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ اس نے سوچا آخر اس کی ضرورت ہی کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ خواتین جنگ کو پسند نہیں کرتیں۔ مہمی حملے اور جنگیں تو بہادریوں کی شہرت میں چار چاند لگاتی ہیں اور یہ خود رائے اور جنگ جو بیگوں کو قابو میں رکھنے کا موثر ذریعہ ہیں۔ ان بیگوں کے پیٹ محض روٹی ہی سے نہ بھرے جاسکتے،

کم از کم ان کی تلواروں کو بھی تو میان سے نکالے جانے کا موقع ملنا چاہیے جن میں عرصے تک رکھے رہنے سے زنگ لگ سکتا ہے۔

قاسم بیگ باہر کے پیچھے پیچھے قتلوغ نگار خانم کے شامیانے میں داخل ہوا تو وہ غیر مطمئن سا تھا لیکن اس نے ایسا ظاہر کیا گویا کہ اس کی یہ کیفیت بورا تاغ کی کھڑی ڈھلان سے اترنے کا نتیجہ رہی ہو۔

ماں کے پاس خان زادہ بیگم بھی بیٹھی ہوئی تھی۔ خدمت گاروں نے باہر کے لئے دسترخوان لگایا اور طلائی قاب میں سج کباب لائے۔ سب لوگ خاموش تھے۔ کبابوں کے بعد قیزیہ کیا گیا۔ اب بھی شامیانے میں خاموشی ہی چھائی رہی۔ آخر کار قاسم بیگ نے اپنی لمبی داڑھی پر سے قیزیہ کے سفید قطرات کو جھاڑ کر گفتگو چھیڑی:

”ہمارے حکمران نے مرزا سلطان علی خان سے معاہدہ کر رکھا ہے۔ ہم نے وعدہ کیا ہے کہ موسم گرما میں اپنے لشکر سے ان کی مدد کریں گے۔ گرمیاں شروع ہونے ہی کو ہیں۔“

”اللہ تعالیٰ نے ہمیں امن چین سے زندگی گزارنے کی خوش سختی عطا کی ہے“ قتلوغ نگار خانم نے کہا۔ ”ہمیں اس نعمت کی قدر و قیمت کا احساس ہونا چاہیے، محترم قاسم بیگ..... سلطان علی خان اپنے برادر بائے سنقر مرزا کی تخت نشینی پر معترض ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمارے حکمران کا تخت اندجان میں موجود ہے۔“

قاسم بیگ خاموش رہا۔ خان زادہ بیگم بول اٹھی:

”میرے امیر، سمرقند پر حملہ کرنے میں تو کثیر رقوم صرف ہوں گی، اس کے بجائے کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ اندجان میں نئے نئے محل اور مدرسے تعمیر کرائے جائیں؟ اگر اندجان اپنی شان و شوکت اور خوبصورتی کے معاملے میں سمرقند سے ٹکر لینے لگے تو مرزا الغ بیگ ہی کی طرح آپ کو بھی شہرت حاصل ہو جائے گی۔ آپ کی ہشیرہ عرصے سے یہی خواب دیکھتی رہی ہے، خدا اسے حقیقت بنادینے میں مدد کرے!“

باہر مذاق کرنے کے انداز میں مسکرایا:

اندجان کو سمرقند کا ٹھانی بنانے کے لئے کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ آغاز سمرقند کی شان و شوکت کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھ کر کیا جائے؟ سمرقند سے واقفیت حاصل کر لینے کے بعد اندجان میں عمارات تعمیر کرائی جاسکتی ہیں۔“

باہر کی اس بات نے قاسم بیگ کے حوصلے بڑھا دیے:

”اس دانش مندی کا کتا ہی کیا، عالی جاہ!“

”تو کیا آپ نے اپنے بچپن میں سمرقند کو دیکھا نہیں تھا؟“ قتلوغ نگار خانم نے بیٹے سے بحث چھیڑنے کا فیصلہ کر لیا۔

”جی ہاں، دیکھا ضرور تھا..... لیکن پانچ سال کی عمر میں۔ اب تو کچھ بھی یاد نہیں رہا۔“

خان زادہ بیگم نے مذاق کے انداز میں یاد دلایا:

”اور گزشتہ سال؟ آپ سمرقند کی مہم پر چلے گئے اور ہمیں مجبور کر دیا کہ سات مہینوں تک آپ

کی یاد میں تڑپتے رہیں۔“

بابر بھوس سکوڑنے لگا:

”یہ سچ ہے کہ گزشتہ سال ہم نے چڑھائی کی تھی..... تین مہینوں تک سمرقند کے ارد گرد گھمات لگائے رہے۔ سلطان احمد ایک زمانے میں اندجان میں داخل نہیں ہو سکے تھے اور میرے لئے بھی میرے مورث اعلیٰ کے شہر کے دروازے بند ہی رہے!“

بابر نے یہ الفاظ جھنجھلاہٹ کے ساتھ کانپتی ہوئی آواز سے ادا کئے اور فوراً ”ہی سب پر واضح ہو گیا کہ وہ اب بھی ذہنی چتنگی کی منزل سے کتنا دور ہے۔ فوجی مہموں میں اسے بڑی کشش محسوس ہوتی تھی اور تیمور اور الگ بیگ کا عظیم شہر سمرقند اسے بلارہا تھا۔ سمرقند کے حکمران بدلتے رہے تھے۔ سلطان احمد کے بعد اس کا بھائی سلطان محمود تخت نشین ہوا اور اب عنان سلطنت سلطان محمود کے بیٹے مرزا بابائے سنقر کے ہاتھوں میں تھی۔ بابائے سنقر بھی آل تیمور میں تھا، وہ بھی جاہ طلب تھا، جنگ جو اور نوجوان (بابر سے صرف پانچ سال بڑا) تھا۔ اس کے والد نے تخت پر قبضہ کیا تھا اور خود اسے تخت و رتے میں ملا تھا یعنی یہ کہ وہ قانوناً ”تخت نشین ہوا تھا۔ اس کے باوجود اندجان کے بیگوں کو مرزا بابائے سنقر میں عیب ہی عیب نظر آتے تھے، یہ لوگ اس میں ہزاروں کیڑے ڈالتے اور مسلسل بابر کے کان بھرتے رہتے تھے کہ سمرقند پر حکمرانی کے اہل ایک بس آپ ہی ہیں۔ بابائے سنقر بابر کے دعووں سے باخبر تھا، اس سے خائف رہتا تھا اور بابر کو شہر میں داخ ہونے سے روکنے کے سلسلے میں تمام اقدامات کر چکا تھا۔ عیار بابائے سنقر نے بابر کو لشکر کے بغیر سمرقند آنے کی بھی دعوت دی لیکن بابر اس کی چال میں نہ آیا۔ اس واقعے کے بعد رقابت کی آگ اور بھی زیادہ بھڑک اٹھی جسے دونوں طرف کے جنگ جو بیگ بڑی ہوشیاری کی ساتھ ہوا دیتے رہے۔

قتلوغ نگار خانم چاہتی تھی کہ اس کا پندرہ سالہ بیٹا فریقین کے لئے تباہ کن جنگ میں نہ پھنسے اور امن و سکون کے ساتھ اپنی سلطنت پر حکمرانی کرے۔

ماں نے بابر کے چہرے پر جو دل کو نہیں لگنے سے سیاہ سا پڑ گیا تھا، بلائیں لینے کے سے انداز میں محبت بھری نظر ڈالی اور کہا:

”ارے بابر جان، یقین مائے یہ فانی دنیا اس لائق نہیں کہ آپ اس کا غم کریں!.....“ ماں نے بچپن کے نام سے مخاطب کر کے پل بھر کے لئے بابر کو بے فکری کے ان ایام میں پہنچا دیا جب وہ نہ مسموں کے بارے میں سوچا کرتا تھا نہ تخت و تاج کے بارے میں۔ لیکن بابر تو جانے کب ہی سے وہ بابر جان نہیں رہ گیا تھا، اس کی ماں نے اپنی بات دوسرے انداز سے جاری رکھی: ”وقت آنے پر آپ کا سرقند کو فتح کرنے کا خواب بھی پورا ہو جائے گا۔ ابھی تو سب لوگ امن و سکون سے زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کے پاس محترم قاسم بیگ جیسے دانش مند وزیر موجود ہیں۔ آپ کو لائق و قابل میر عمارت کی خدمات حاصل ہیں جنہوں نے اوش میں یہ حجرہ تعمیر کیا ہے۔ آپ کی ماں آپ سے التجا کرتی ہے کہ سرقند کا خیال کچھ دنوں کے لئے دل سے نکال دیجئے..... خان زادہ بیگم ٹھیک ہی کہتی ہیں۔ بہتر ہو گا کہ آپ وادی کی خوشحالی میں اضافہ کیجئے، اندجان، مرغیلان اور اوش میں عالی شان محلات اور مدرسے تعمیر کرائیے!“

قلعہ نگار خانم نے اپنے خیالات کا اظہار اتنی سختی اور عزم کے ساتھ عرصے سے نہیں کیا تھا۔ قاسم بیگ نے سر جھکا لیا۔ بابر نے اپنی نظریں تعمیر پر جمادیں جو پیالے کے کناروں کے عکس سے سنہرا ہو گیا تھا۔ ”یہ سب درست ہے..... لیکن بیگ کیا کہیں گے؟“

قاسم بیگ نے سوچا۔ ”..... اور سرقند کا کیا ہو گا؟ اور بیگوں سے کیا کہوں گا؟“ بابر کے دل میں خیال آیا۔ شامیانے میں چھائی ہوئی خاموشی کو خان زادہ بیگم کی واضح اور کھکتی ہوئی آواز نے توڑا: ”میرے امیر، آپ کو تو نوائی کا کلام زبانی یاد ہے۔ ذرا خیال تو کیجئے کہ فرہاد نے کتنی شاندار عمارتیں تعمیر کی تھیں۔ آپ کی ہمیشہ آپ کو عمارات تعمیر کرانے والے کی حیثیت سے دیکھنا چاہتی ہے جیسا کہ فرہاد تھا۔ دنیا میں اس سے بڑھ کر پاک اور نیک کام اور کوئی بھی نہیں!“

بابر کو مسرت کے وہ لمحات یاد آگئے جو اس نے حجرے کے اندر گزارے تھے۔ ”سرقند پر یلغار تو کبھی بھی کی جاسکتی ہے..... لیکن فرہاد کی شہرت، عظیم شہرت ہے۔ اور پھر والدہ محترمہ کی باتوں میں بھی کافی سچائی پائی جاتی ہے..... سوال صرف یہ ہے کہ بیگوں سے کیسے بچنا جائے؟“ یہ سوچتے ہوئے بابر نے قاسم بیگ کی طرف دیکھا۔

”تو کیا ہم ایسا کر سکتے ہیں؟“

قاسم بیگ سمجھ گیا کہ اب گفتگو کا مقصد سرقند پر یلغار کو ملتوی کرنا ہے۔ بہادر سپہ سالار کی

حیثیت سے وہ دل ہی دل میں طیش میں آ رہا تھا اور رکن حکومت کی حیثیت سے جانتا تھا کہ یا بروہ کرنا چاہتا ہے جو ناممکن ہے۔ سمرقند پر حملے کی حمایت سب سے زیادہ ممتاز اور طاقتور بیگ کر رہے تھے اور اس سلسلے میں کافی دنوں سے تیاریاں بھی کی جا رہی تھیں۔ رکاوٹ کو پھاندنے کے لئے سارے پٹھوں کو تانے تیار گھوڑے کو روکا نہیں جاسکتا اور اگر طاقت لگا کر کسی طرح روک بھی لیا جائے تو وہ یا تو خود اپنی ریڑھ کی ہڈی توڑ لے گا یا پھر سوار کو پٹنی دے دے گا۔ قاسم بیگ اس بات کو براہ راست صاف صاف کہنے کی جرات نہ کر سکا۔ اس نے اپنے ہاتھ سینے پر رکھ کر سر جھکا لیا:

”میرے حکمران، آپ کا یہ خادم اس صورت حال سے نکلنے کا راستہ نہیں تلاش کر پا رہا ہے۔“
 ”یعنی ہم ملکہ، عالیہ کی خواہش کا احترام نہ کریں؟“

”آخر یہ مجھ سے چاہتے کیا ہیں؟“ وزیر دل ہی دل میں بھنا گیا۔ ”آج اپنی والدہ اور ہمشیرہ کو خوش کرنے کو تیار ہیں جبکہ کل ہی بڑے جوش و خروش کے ساتھ کہہ رہے تھے کہ حملوں، جنگوں اور فوجی کارناموں کے لئے حد تڑپ رہے ہیں۔ کم سنی کی بنا پر ابھی متلون مزاج ہیں۔۔۔۔۔“ اس کے باوجود قاسم بیگ قلوغ نگار خانم کی مخالفت بھی نہیں کر سکتا تھا، وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا کہ کم سن بیٹا ماں کے کتنا زیادہ کئے میں ہے۔

”ملکہ، عالیہ کی خواہش میرے لئے فرمان کا درجہ رکھتی ہے۔“ قاسم بیگ نے کہا۔ ”آپ کا خادم بس اتنا ہی عرض کرنا چاہتا ہے کہ ہمیں سارے بااثر بیگوں کی منظوری حاصل کرنی چاہیے۔“

قاسم بیگ پر مخصوص شاہی الطاف و عنایات کے اظہار کے طور پر اس کے نام کے ساتھ اس کا خطاب ”امیر الامرا“ بھی جوڑا جاتا تھا۔ قلوغ نگار خانم اس بات کو نہ بھولی:

”جناب امیر الامرا“ وہ اس کی طرف دیکھ کر التفات سے مسکرائی۔ ”دوسرے بیگوں کی منظوری حاصل کرنے میں آپ مرزا باہر کی مدد کریں گے، ٹھیک ہے نا؟“

”ہسر و چشم، ملکہ، عالیہ! لیکن میں۔۔۔۔۔ بیگوں کی مرضی سے کچھ کچھ واقف ہوں۔ میرے الفاظ کو گستاخی پر نہ محمول کیا جائے تو عرض کروں کہ ان کا کہنا کس حد تک درست ہے۔۔۔۔۔“
 ”فرمائیے!“

قاسم بیگ نے پل بھر کے لئے آنکھیں بند کر کے گردن کچھ اس انداز سے تالی کہ اس کی سفیدی سے یکسر خالی سیاہ داڑھی کی نوک اونٹ کی کھال کے قیمتی چکمان کے گریبان میں تھس گئی۔ پھر اس نے سیدھے ہوتے ہوئے سراٹھایا اور باہر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا کہ دنیا کو ہلا دینے والے عظیم امیر

تیور اور مشہور عالم مرزا الغ بیگ سرقہ میں عالیشان عمارتیں اس لئے تعمیر کرا سکے کہ وہ وسیع و عریض سلطنت کی دولت اور طاقت کے مالک تھے جبکہ آج اس وسیع و عریض سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو چکے ہیں۔ خوبصورت فرغانہ خاصے بڑے علاقے پر مشتمل ہے پھر بھی یہ کسی زمانے کے متحد اور طاقتور دائرہ النہر کا ایک ٹکڑا ہی ہے۔

خان زادہ بیگم نے فوراً ہی اس کے اشارے کو بھانپ لیا اور پوچھا:

”تو جناب امیر الامرا، کیا آپ یہی کہنا چاہتے ہیں کہ وسیع پیمانے پر عمارتوں کی تعمیر کے لئے ہمارے وسائل ناکافی ہیں؟“

”عالی نسب شناردی، ابھی آپ نے فرمایا تھا کہ اندجان کو عظیم سرقہ سے بہتر بنادیا جانا چاہیے۔ بیگ کہہ سکتے ہیں کہ ایسا کارنامہ انجام دینے کے لئے سابق سلطنت کا بحال کیا جانا ضروری ہے۔ اس کے تمام حصوں کی جو آج آزاد ہیں، طاقت کو یکجا کر کے حملے کر سکنے والی طاقت میں بدلنے کی ضرورت ہے۔ اور یلغاروں کے بغیر یہ کیسے ممکن ہے، آخر کس کے پرچم تلے سب کو متحد کیا جاسکتا ہے؟ موجودہ نفاق آپ کے شاندار تعمیری منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کی راہ میں حائل ہے۔“

قاسم بیگ کی دلیلوں سے بابر پوری طرح قائل ہو گیا، اس نے بڑے جوش کے ساتھ یہ دیکھنے کے لئے ماں پر نظر ڈالی کہ وہ وزیر کی بات کی کاث کیسے کرتی ہے۔

”قاسم بیگ صاحب، عالیشان عمارتیں صرف امیر تیور اور مرزا الغ بیگ ہی نے نہیں تعمیر کرائیں۔ ہرات میں میر علی شیر نوائی نے تین مشہور عمارتیں کرائی ہیں: اخلاصیہ، خلاصیہ اور انیسہ۔ مرزا بابر کی طاقت میر علی شیر سے جو محض ایک تاجدار کے مشیر ہیں، ذرا بھی کم نہیں۔“

”درست ہے، والدہ صاحبہ، بالکل درست!“ قلوغ نگار خانم کے الفاظ سے بابر کے دل کی گھرائیوں میں چھپی ہوئی آرزوئیں بیدار ہواٹھیں۔ شباب کا آتش جذبہ۔ بام شہرت و ناموری پر پہنچنے کا جذبہ۔ کبھی اسے عظیم فوجی فتوحات کے تو کبھی خود اپنے تخلیق کردہ بلند پایہ اشعار اور داستانوں کے خواب دیکھنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اس وقت اس نے سوچا: لیکن کیا وہ اپنی فتوحات سے نوائی جیسے عظیم افراد کی نظروں میں قابل احترام بھی ہو سکتا ہے؟ اور پھر یہ سالار کی شہرت بھی تو کتنی پر تعمیر اور متلون ہوتی ہے؟ وہ سرقہ کے باہری علاقوں ہی میں سات مہینوں تک طرح طرح کی تکالیف برداشت کر کے ابھی ابھی واپس لوٹا ہے۔ زبردست معرکوں میں فتوحات سے متعلق خواب ادھورای رہ گیا۔ تو پھر کیا عظیم شاعر بننا چاہیے؟ لیکن عظیم شاعری کی مثال بھی تو بلندیوں پر محو پرواز طائر کی سی ہے اور وہ محسوس کر رہا ہے کہ اس کے اندر اس طائر کو اسیر کرنے کی قوت کم ہے،

نی الحال تو کم ہی ہے۔ والدہ صاحبہ البتہ ایک اور راستہ بھاری ہیں جو نسبتاً آسان ہے: اگر نوائی کی بنوائی ہوئی عمارتوں اخلاصیہ، خلاصیہ اور انبیہ کی شہرت پھیلتے پھیلتے وادیِ فرغانہ تک پہنچ سکتی ہے تو آخر خود اس کی میاں بنوائی ہوئی عمارتوں کی شہرت ہرات تک کیوں نہ پہنچ سکے گی؟ ضرور پہنچے گی۔ اس کی خبر نوائی کو بھی ہوگی۔ وہ یقیناً دریافت کریں گے کہ باہر کون ہے، اس سے تو جلد از جلد متعارف ہونا چاہیے۔ اس کے بعد بہت ممکن ہے کہ وہ خود ہرات جائے یا پھر خود نوائی ہی میاں تشریف لے آئیں۔ یہ انواہیں خود اس کے کانوں میں بھی پڑ چکی ہیں کہ علی شیر نوائی کو ہرات کے موجودہ حکمران حسین میرقا کا دربار پسند نہیں ہے۔ بہت ممکن ہے کہ عظیم شاعر نوائی اس کے استاد بھی بن جائیں!

اور تب باہر کی آنکھیں سرخ ہو گئیں، آوازیں تھکسانہ سختی پیدا ہو گئی:

”والدہ محترمہ نے درست فرمایا ہے! بیگم کو قائل کیا جانا چاہیے، جناب وزیر!“

یہ تو فرمان تھا۔ قتلوغ نگار خانم اور خان زادہ بیگم کے چہرے اس خیال سے کھل اٹھے کہ قاسم بیک ہار گیا ہے، اب ہتھیار ڈال دے گا۔

لیکن قاسم بیک اپنی بات پر سختی سے اڑا رہا، سارے ممتاز بیک اس کے پشت پناہ جو تھے۔

”عالی جاہ، آپ کے حکم کی تعمیل سے قبل آپ کا خادم بیگم کی ایک اور خواہش کے اظہار کی اجازت چاہتا ہے۔“

باہر نے بادل ناخواستہ اثبات میں سر ہلادیا۔ قاسم بیک نے اپنی گھنی گھنی سیاہ مونچھوں پر ہاتھ پھیر کر بڑی بے باکی کے ساتھ خان زادہ بیگم کی طرف دیکھا (ایسی گستاخانہ جسارت وہ شاذ و نادر ہی کرتا تھا)۔

”شہزادی صاحبہ، آپ نے بڑی خوبصورتی سے ہمارے حکمران کو فرادے سے شبہ دی ہے۔ بیگم کو آج کے فرادے کی خدمت بجالانے پر فخر ہے اور ہم ”وزیر مسکرایا“ فرادے کو شیریں سے ملانے کے خواب دیکھتے رہتے ہیں۔“ اچانک اس نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ اضافہ کیا: ”اور جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، ہماری شیریں سرقدش میں، پجاری قیدی کی طرح تڑپ رہی ہیں۔“

باہر کے رخساروں پر سرخی دوڑ گئی۔

مرزا باہر کی مٹگنی پانچ سال کی عمر ہی میں عائشہ بیگم سے کر دی گئی تھی جو شاہ سرقد سلطان احمد کی اسی سلطان احمد کی بیٹی تھی جس کے لشکر کو تو اسائے کے بل کو پار کرتے وقت زبردست نقصانات اٹھانے پڑے تھے۔ اب عائشہ چودہ سال کی ہو چکی تھی۔ مٹگنی کے بعد کے ان تمام برسوں میں باہر

نے تو عائشہ کو ایک بار بھی نہیں دیکھا تھا لیکن جو لوگ دیکھ چکے تھے کہ ان سب کی متفقہ رائے تھی کہ وہ مکمل نوکلفہ سے بھی حسین تر ہے۔ یہ کم سن حسینہ جس کا تذکرہ اب بابر کے خیر خواہ اس سے کرتے رہتے تھے، بابر کا اپنے نجات دہندہ کی حیثیت سے انتظار کر رہی تھی۔ جو شیلہ بابر اپنی شیریں کو جو کینے بائے ستور کے ہاتھوں سخت مصائب کا شکار تھی، آزاد کرانا اور سب کو دکھانا چاہتا تھا کہ وہ کتنا جری ہے۔ عائشہ بیگم چھوٹی لڑکی کی حیثیت سے کس شکل و صورت کی تھی یہ تو بابر کو یقیناً یاد نہ تھا لیکن عرصے سے، پانچ سال کی اس عمر ہی سے اسے ایک دوسری خوبصورت دوشیزہ، سلطان احمد کی نئی نوپلی دلہن ضرور یاد تھی اور جانے کیوں وہ سوچتا رہتا تھا کہ اب عائشہ بھی اسی دوشیزہ جیسی خوبصورت ہوگی۔

رواج کے بموجب دلہن کی نقاب کسی معصوم کم سن لڑکے ہی کو اٹھانی تھی۔ ان دنوں قتلوغ نگار خانم مہمان کی حیثیت سے سمرقند گئی ہوئی تھی۔ اسے سلطان احمد کی نئی شادی میں مدعو کیا گیا تھا اور پانچ سالہ بابر ماں کے ساتھ تھا۔ خود سلطان احمد کے بیٹوں کا انتقال ہو چکا تھا اس لئے اس حقیقت کے باوجود کہ شامی خاندان کے افراد قتلوغ نگار خانم سے جلتے اور بابر کو بھی ترجیحی نگاہوں سے دیکھتے تھے، دلہن کے چہرے سے نقاب ”عروس کو خدا شیر سا بیٹا عطا کرے!“ کی گونج کے درمیان بابر ہی کو اٹھانی پڑی تھی۔ اس واقعے کی بہت سی یادیں بابر کے ذہن سے مٹ چکی تھیں۔ لیکن دلہن کے نرم و نازک چہرے کو بے نقاب کرتے وقت اس کے دل پر جو ناقابل فہم جذباتی کیفیت طاری ہو گئی تھی وہ اب تک یاد تھی۔ اب وہ سمجھنے لگا تھا کہ وہ کیفیت دراصل حسن سے مخلوط و مسرور ہونے کی کیفیت تھی۔ اس واقعے کے بعد سے اب تک اسے خوبصورت اشعار کے مطالعے کے دوران، لطیف نعمات کی سماعت کے دوران، مناظر قدرت کے حسن سے لطف اندوز ہونے کے دوران جانے کتنی ہی بار اس کیفیت کا تجربہ ہو چکا تھا۔ مہ جیسنوں کے پیکر بابر کے تخیل کو سوتے جاگتے مضرب رکھتے تھے۔ پانچ سالہ لڑکا نسوانی حسن کی مخصوص کشش کو نہیں سمجھ سکا تھا پھر بھی اس حسن کے نظارے سے اپنی بے تابی اسے یاد تھی۔ اب جب بھی نوجوان بابر کے سامنے اس کی سمرقند کی مہمیت کی خوبصورتی کو سراہا جاتا تھا تو عائشہ اس کے تخیل میں نمودار ہو جاتی تھی۔۔۔۔۔ سلطان احمد کی دلہن اور کتابوں کی حسین و جمیل ہیروئنیں بھی یاد آ جاتی تھیں۔ بابر عائشہ کو دیکھے بغیر ہی اپنے نوجوان تخیل کے ساتھ، لطیف و پاک جذبات کے ساتھ محبت کرنے لگا تھا۔

اس صورت میں اب جبکہ خوبصورت عائشہ بابر کے دشمنوں کی قید میں گھٹ رہی تھی تو کیا وہ اندجان میں خاموش بیشارہ سکنا تھا؟

”قاسم بیگ صاحب“ قتلوغ نگار خانم نے کہا، ”مرزا بابر کی منکیت کے حالات کی طرف سے ہم بھی فکرمند ہیں۔ ہم نے عائشہ بیگم کو ان کی بڑی ہمشیرہ رضیہ کے پاس تاشقند بھیج دئے جانے کے سلسلے میں ان کی والدہ صاحبہ کو لکھا تھا۔ شاید ہماری یہ التجا پوری کر دی گئی ہوگی۔“

قاسم بیگ نے نفی میں سر ہلادیا۔

”صد افسوس، محترمہ بیگم صاحبہ، ایسا نہیں کیا گیا“ اس نے کہا۔ ”آپ کے اس خادم کو حال ہی میں سمرقند سے اپنے ایک وفادار شخص کا خط موصول ہوا ہے۔ اسے فوراً ہی حکراں کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے مجھے کچھ شرم سی محسوس ہوئی۔۔۔۔۔“

”کیسا خط؟ کیا ہوا؟ بابر کی ماں پریشان ہوا تھی۔“

”عائشہ بیگم نے اپنی والدہ صاحبہ اور ہمشیرہ کے ساتھ تاشقند جانے کی تیاریاں کر لی تھیں، روانہ ہونے ہی کو تھیں کہ مرزا بائے سنقور نے انہیں روک دیا، یہی نہیں ان کے گھر کے سامنے پہرا بھی بٹھادیا۔ کہتے ہیں کہ کسی کو بھی گھر سے باہر قدم نکالنے کی اجازت نہیں۔ یہ تو صحیح معنوں میں اسیری ہی ہوئی۔ اب قیدیوں کو اپنی نجات کے لئے جو بھی توقع ہے صرف اندجان ہی سے ہے!“

یہ سنتے ہی بابر آگ بگولا ہو گیا۔ یتیم لڑکی کے ساتھ ایسی کمینگی کا طرز عمل اپنانے والے بائے سنقور کو سزا ملنی ہی چاہیے تھی۔ لشکر کے ساتھ سمرقند کے لئے کوچ کرنے کی خواہش دوسری تمام خواہشات پر غالب آگئی۔

خان زادہ بیگم نے تاڑ لیا کہ بھائی کے دل کی کیفیت بدل گئی ہے۔

”میرے امیر، ان خواتین کو جلد از جلد آزاد کرانے میں خدا آپ کا حامی و ناصر ہو!“ اس نے کہا۔ ”لیکن یہ رہائی کیا محض جنگ، محض جھگڑے کے ذریعے ہی حاصل کی جاسکتی ہے؟ کیا لشکر کشی کے نتیجے میں دشمنی کچھ اور نہ بڑھ جائے گی؟ مرزا بائے سنقور کو آپ کی لشکر کشی کا علم ہوگا تو وہ عائشہ بیگم سے اور بھی زیادہ متفر ہو جائیں گے۔ میرے خیال میں تو ان لوگوں کی رہائی کے لئے کوئی امن کا راستہ تلاش کیا جانا چاہیے۔۔۔۔۔“

بابر ان الفاظ سے جھنجھلا اٹھا۔

”امن کا راستہ تلاش کروں؟ بے عزتی کرنے والے کے ساتھ امن؟“

قتلوغ نگار خانم نے بابر سے کہا:

”مرزا بائے سنقور کے پاس سفیر امن بھیجئے، میرے فرزند۔۔۔۔۔ آپ کے تنازعے کو سلجھایا جاسکتا

ہے۔“

جنگ جاری ہو تو امن کی بات کیسے کی جاسکتی ہے؟ باہر نے سوچا کہ امن کی بات میں پہل تو وہی فریق کرتا ہے جو خود کو کمزور محسوس کر رہا ہو۔ وہ بائے سنقر سے کمزور تھوڑی ہے۔

”بائے سنقر ظلم ڈھا رہے ہیں! میں اس صورت حال سے مرعوب ہو جاؤں اور صلح کی درخواست پیش کرنے کے لئے قاصد روانہ کروں؟ عائشہ سے شادی کرنے کی خاطر کھٹے ٹیک دوں؟ جی نہیں، اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جاتا ہے!“

”ملکہ عالیہ، آج کے زمانے میں خاموش رہ کر مظالم کا سد باب نہیں کیا جاسکتا!“ قاسم بیگ نے باہر کی طرف دیکھا۔ ”طاقتوروں کے درمیان ہمیں سب سے زیادہ طاقتور بننا ہوگا۔ اور پھر یہاں زیر بحث کوئی ایسی ویسی چیز نہیں بلکہ سرقدر ہے! سرقدر پر تو سبھی قبضہ کرنے کے خواہاں ہیں، کون ہے جو اسے ہتھیانے کا کوشاں نہ ہو! شمال سے شیبانی خان نے سرقدر پر دانت لگا رکھے ہیں۔ حصار کے حکمران خسرو کو سرقدر پر حملے کے لئے سازگار موقع کا انتظار ہے۔ مرزا بائے سنقر کمزور حکمران ہیں، اور انہر کے دار الحکومت میں تک نہ پائیں گے۔ اگر ہمارے بادشاہ نے سرقدر پر قبضہ نہ کیا تو ان کے اجداد کا پائے تخت دوسرے خاندانوں کے ہاتھوں میں چلا جائے گا۔ اور شیبانی خان یا خسرو نے سرقدر پر قبضہ کر لیا تو ان کی طاقت اتنی بڑھ جائے گی کہ..... اندجان کے لئے بھی اور ہمارے لئے بھی مشکلات میں بہت اضافہ ہو جائے گا۔ ہمیں یہ جو موقع ملا ہے اسے ہرگز ہرگز ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہیے!“

”میر تیمور کے خاندان کے سب حکمران کہیں اکٹھا ہو کر کوئی فوجی معاہدہ کیوں نہ کر لیں؟“ قتلوغ نگار خانم نے واضح مایوسی کے ساتھ اس جواب کے انتظار میں پوچھا جو اسے پہلے ہی سے معلوم تھا۔

”کس کی قیادت میں؟ کس کے پرچم تلے؟ وہ کون سی طاقت ہے جو انہیں متحد کر سکتی ہے؟ بائے سنقر نہ طاقتور ہیں نہ عقل مند۔ اور انہر کو تو ہماری حکمران مرزا باہر ہی بچا سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے اپنی زندگیاں اس مقصد کی تکمیل کے لئے، اپنے حکمران کی خدمت کے لئے وقف کر رکھی ہیں۔ اس سال ہم سرقدر پر قابض ہو جائیں تو انشاء اللہ تعالیٰ تمام خطرات کا فور ہو جائیں گے اور صحیح معنوں میں امن و سکون کا دور دورہ ہوگا۔ تب ہم جیسے بھی محل چاہیں گے، تعمیر کر سکیں گے۔“

خان زادہ بیگم نے حد سے آگے بڑھتے ہوئے وزیر سے بہ آواز بلند پوچھا:

”تو اس کا مطلب مختصراً یہ ہے کہ آپ بیگم کو قائل کرنے سے متعلق ہماری والدہ صاحبہ کی

خواہش کی تکمیل کے لئے تیار نہیں ہیں؟“

”اپنے اس نالائق خادم کو صاف گوئی کے لئے معاف کر دیجئے، شہزادی۔ میں نے تو اپنے حکمران کی اجازت سے بس اپنے دل کی بات بیان کر دی ہے۔“

اس طرح بابر چکی کے دوپاٹوں کے درمیان پھنس کر رہ گیا۔ ”صلح کر لو اور عمارتیں تعمیر کراؤ!“ اس کی ماں کہہ رہی تھی جس کا مطلب یہ تھا۔ ”ہرن کی طرح بے فکری کی زندگی گزارو۔“

لیکن قاسم بیگ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا کہ امن آج کل سکون سے بیٹھنے کے لئے نہیں ہوتا۔ خونخوار بھیڑیوں کے درمیان ہرن زیادہ دنوں تک زندہ نہیں بچ سکتا، بھیڑیوں کے غول میں تو شیریں کر رہنا چاہیے۔

آخر قاسم بیگ نے اس طویل اور ہلکان کر دینے والی بحث کو ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا:

”عالی جاہ، آپ نے فرمایا تھا کہ آج سیر کرنے کے لئے نکلیں گے۔ گھوڑے کب سے تیار کھڑے ہیں..... اور آج شام کو ملکہ صاحبہ کی تجویز کے متعلق سارے بیگوں سے مشورہ کیوں نہ کر لیا جائے؟ بیگوں کی مجلس مشاورت کر لیں گے.....“

خان زادہ بیگم نے جلدی سے ماں پر ایک نظر ڈالی۔ ایک وزیر ہی کو قائل نہ کر سکے تو سارے بیگوں کو کیسے قائل کیا جاسکے گا؟ قتلورغ نگار خانم سوچنے لگی کہ اس وقت بحث کا سلسلہ کس طرح جاری رکھا جائے لیکن بابر نوجوانوں کی سی پرتی سے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا:

”مجلس مشاورت کل طلب کیجئے گا، ہر بات کو اچھی طرح سوچ سمجھ لینا چاہیے۔ اور اس وقت۔ چلے، آئیے چلیں.....“

۴

اوش کے جنوب میں پھیلا ہوا ٹیلوں دار وسیع و عریض میدان شوخ جنگلی پھولوں سے ڈھکا ہوا تھا، مکروندوں کے گہرے زرد، جرسی پودوں کے نیلگوں اودے اور پوست کے سرخ پھول چاروں طرف ہمار دکھا رہے تھے۔ بابر جس کا گھوڑا عام پرسکون رفتار سے چل رہا تھا، دوری پر واقع برف پوش کوستان چوٹیوں پر سے نگاہیں نہیں ہٹا رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ یہ محسوس کرتا جا رہا تھا کہ اونچی اونچی گھاس کے اوپر گھوڑے کے قدم کتنی نرمی سے پڑ رہے ہیں۔ حسن بہاراں آنکھوں اور دل کو پیار سے سلالتا معلوم ہو رہا تھا لیکن دل کو دولت سکون میسر نہ تھی، دل تو ماں اور وزیر وانی اس تلخ بحث کو اپنے اندر ہی..... اپنے آپ ہی سے جاری رکھے ہوئے تھا۔ گتھی خود بخود ہی سلجھ نہیں سکتی تھی اور ایسا دانش مند کہاں مل سکتا تھا جو گتھی کو اس انداز سے سلجھا سکتا جیسے بابر چاہتا

تھا؟ پھر بھی کتنی خواہش تھی اس کی کہ کتنی سلجھ جائے! تو کیا پیر سے مشورے کی ضرورت تھی؟ صاحب فراش خواجہ عبداللہ اوش نہیں آسکا تھا لیکن بابر کو معلوم تھا کہ وہ سرقد پر یورش کا حامی ہے۔ اپنے استاد کے منہ سے وہ یہ الفاظ کتنی ہی بارسن چکا تھا کہ جب تک ماورالنہر کا اتحاد بحال نہ کر دیا جائے گا اس وقت تک بابر کا ہر اہم خواب محض خواب ہی رہے گا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ایک بار پھر جنگ چھیڑی جائے، عمارتوں کی تعمیر کا کام ملتوی کر دیا جائے..... غیر معین مدت کے لئے.....

گھڑسوار ڈھلان کے اوپر چڑھ گئے۔ وہاں سے چاروں طرف کے سارے علاقے صاف صاف نظر آرہے تھے۔ قاسم بیک بلند ٹیلوں کی طرف دیکھتے ہوئے حیرت سے کہہ اٹھا:

”کتنے زیادہ گلے ہیں!“

وہاں سے مغرب کی سمت واقعی دسیوں ٹیلوں سے نیچے اترتے ہوئے گلے نظر رہے تھے۔ پچیس سالہ بیک خواجہ کلاں نے پیشانی پر ہتھیلی کا چھبایا کر دوریوں پر نظر دوڑائی:

”آخاہ!“ وہ کہہ اٹھا۔ ”وہاں تو اور بھی زیادہ گھوڑے نظر آرہے ہیں!“

”گھوڑوں کے گلے مشرق میں بھی ہیں، دیکھئے، ذرا ادھر تو دیکھئے!“

بھیڑوں اور گھوڑوں کے گلے تیز رفتار سے آگے بڑھ رہے تھے جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ بھاگ نہیں رہے تھے بلکہ انہیں ہانکا جا رہا تھا۔ ادھر ڈھلان پر دو گلے دکھائی دیئے۔ اس کے بعد دو اور۔ دوری پر واقع ٹیلوں پر سرپٹ دوڑتے ہوئے گھوڑوں کے چار گلے یکے بعد دیگرے نمودار ہوئے اور سیل تند و تیز کی مانند ڈھلان سے اترتے ہوئے اس طرف آنے لگے جہاں بابر اور اس کے ہم رکاب کھڑے ہوئے تھے۔

بائیں جانب گھوڑوں کے مزید گلے دکھائی دیئے۔

یہ غول کے غول گھوڑے اور بھیزیں اوش کی جانب جا رہے تھے۔ ذرا ہی دیر بعد بلند ٹیلوں کے پس منظر میں کچھ گھڑسوار دستے نظر آنے لگے۔

تو یہ قلعہ ہے! یہ تو احمد تہل واپس لوٹ رہا ہے جو تین سو سپاہیوں کو اپنی کمان میں لے کر دھاوا بولنے گیا ہوا تھا۔ قاسم بیک خوشی سے کہہ اٹھا:

”واہ، کیسا مال غنیمت ہاتھ لگا!“

خواجہ کلاں بھی جوش میں آگیا:

”کتنا غیر معمولی، کیسا بہادرانہ کارنامہ ہے!“

سب کے سب مسرور ہو گئے۔ اور کیوں نہ ہوتے! ان گھوڑوں اور بھیڑوں کا پانچواں حصہ حکمران کو اور باقی بیگیوں اور درباری عمدیداروں کو ملنا تھا۔ خدا نے چھپر بھاڑ کر دیا تھا۔ بیگیوں سے اپنی خوشی چھپائی نہیں جا رہی تھی۔

بابر نے اپنے گھوڑے کا رخ آتے ہوئے گھرسواروں کی طرف موڑ دیا۔ لگام ڈھیلی ہوتے ہی اس کا گھوڑا ہوا ہو گیا۔ بیک بھی اس کے پیچھے پیچھے اپنے گھوڑوں کو سرپٹ دوڑاتے ہوئے ایک ٹیلے کے بعد دوسرے کو پار کرنے لگے۔ آخر کار بابر نے ایک ٹیلے پر اپنے گھوڑے کو روک لیا۔

زرہ پوش احمد تہل دستے کے آگے آگے تھا۔ سپر جس نے اس کے سینے اور بائیں شانے کو ڈھک رکھا تھا، آفتاب کی شعاعوں سے چمک رہی تھی۔ احمد تہل کی گردن میں تیر لگا تھا جس کے زخم پر سبز پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا اور رخساروں کی ہڈیاں کچھ اور زیادہ ابھری ہوئی سی لگ رہی تھیں۔ بابر سے پچاس قدموں کے فاصلے پر وہ گھوڑے سے اتر کر اس کے نزدیک آیا، گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور اپنے سامنے کی زمین کا بوسہ لیا۔

”عالی جاہ، ہم نے اپنے پکرک، دشمنوں کو محمول نہ ادا کرنے کے سلسلے میں کافی اچھا سبق سکھادیا۔ ان سے سولہ ہزار بھیڑیں اور ڈھائی ہزار گھوڑے چھین لئے۔“

”مم میں سب ٹھیک رہا نا؟“

”عالی جاہ، وہ کجنت چرواہے شاہی فرمان کو ماننا ہی نہیں چاہتے تھے، بغاوت پر اتر آئے اور ہمارے تین سپاہیوں کو ہلاک اور دس کو زخمی کر دیا..... لیکن ہم نے دشمنوں سے اس کا سو گنا بدلہ لے لیا!“

پھر احمد تہل نے دستے کی اگلی صف کے ایک لمبے ترنگے سپاہی کو اشارہ کیا۔ وہ کاٹھی پر لدے ہوئے بورے کو اٹھا کر نیچے کودا اور بابر کے نزدیک آگیا۔ موٹے کپڑے کے اس بورے کو جو خون سے تر تھا، اس نے الٹ کر رکھے ہوئے انسانی سر زمین پر ڈھیر کر دیئے۔ احمد تہل نے گنا شروع کیا: پندرہ مرتبے۔ بابر جانے کیوں سوچنے لگا: ”پکرک“ یہ تو ہمارے ہی لوگ ہیں، ترک ہیں..... اور ہم ان کو.....“ اس کے روٹکتے کھڑے ہو گئے۔

وہ خود کو قائل کرنا چاہتا تھا کہ اس کے حکم پر احمد تہل نے جو سزا دی تھی وہ جائز تھی: وہ بھی ترک ہیں، ایک ہی خاندان کے افراد ہیں پھر بھی انہیں محمول تو ادا ہی کرنا چاہیے تھا۔ ان پکرکوں نے حکم عدولی کی اور مصلوں پر تلوار اٹھائی اسی لئے انہیں یہ تیغ کر دیا گیا..... وہ خود کو قائل کرنا چاہتا تھا پر کرنے سکا۔ متولین میں سے ایک کے تو ابھی داڑھی بھی نہیں نکلی تھی، زرد چہرہ

چکنا چکنا سا تھا، اور میس بھیجی شروع ہی ہوئی تھیں وہ پکڑک لڑکا سترہ سے زیادہ کا نہیں تھا۔
 پجارے کا سرگردن کے اوپری حصے کے پاس ہی سے قلم کر دیا گیا تھا۔
 بابر کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ اس نے مڑ کر قاسم بیگ کی طرف دیکھا اور منہ سے
 ایک لفظ بھی ادا نہ کر سکا۔

احمد تہیل اور اس کے سپاہی ستائش کے، انعام و اکرام کے متوقع تھے۔ سولہ ہزار بھیڑیں اور
 ڈھائی ہزار گھوڑے۔ یہ کوئی چھوٹی موٹی دولت تھوڑی تھی! دسٹے کے تین سپاہی کام آگئے تھے تو
 کوئی خاص بات نہ تھی، ان کے بدلے میں پندرہ سر بھی تو گھاس پر پڑے ہوئے تھے۔ اور یہ سران
 سبوں کے نہ تھے جن کو سپاہیوں نے شجاعت کا مظاہرہ کرتے ہوئے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔
 اس شجاعت کی حوصلہ افزائی بہر حال ضروری تھی۔

یہی خیال قاسم بیگ کا بھی تھا جو بابر کا چہرہ فنی پڑ جانے سے فکر مند ہو رہا تھا۔ ہلاک کر دیئے جانے
 والوں کے سر کاٹ لینے کا تو عام رواج ہی تھا۔ گزشتہ سال خود کم سن حکمران بابر بھی سر قند کے
 باہری علاقوں میں کئے ہوئے بہت سے سروں کو دیکھ چکا تھا۔ جب کوئی سپاہی شجاعت کا مظاہرہ کرتا تھا کہ میں
 نے تو کشتوں کے پستے لگا دیئے اور ثبوت خاک بھی نہیں پیش کرتا تھا تو کسی کو بھی پوری طرح یقین
 نہیں آتا تھا۔ آخر ایسے لوگ بھی تو ہوتے ہی تھے جو کرتے تھوڑا اور بتاتے بہت تھے۔ کئے ہوئے
 سر موجود ہوتے تھے تو سپاہی کا کارنامہ آنکھوں کے سامنے آ جاتا تھا۔ اور اس طرح کئے ہوئے
 سروں کو گنوائے کا رواج چل نکلتا تھا۔

”حکمران“ قاسم بیگ نے دھیرے سے کہا، ”میں کچھ عرض کروں؟“

بابر نے اثبات میں سر ہلادیا۔ قاسم بیگ نے اس کے قریب پہنچ کر چیپے سے پوچھا:

”انعام کے طور پر تلوار دے دی جائے۔۔۔ آپ کو منظور ہے؟“

بابر کے اسلحہ بردار کے پاس اس کی سونے کے دستے والی بغدادی تلوار بھی موجود تھی۔ بابر نے
 اسے دو ایک بار کمر سے لٹکایا تھا لیکن پھر کھول کے رکھ دی تھی کیونکہ کچھ زیادہ ہی وزنی معلوم ہوئی
 تھی۔ اس بار وہ اس تلوار کو بھی ساتھ لایا تھا جو اسلحہ بردار کی کمر سے لٹک رہی تھی۔ بابر نے اس
 تلوار کی طرف دیکھا تو قاسم بیگ نے اس کے ارادے کو بھانپ لیا۔

”محترم بیگ“ وزیر نے احمد تہیل کو مخاطب کرتے ہوئے بہ آواز بلند کہا، ”دلیرانہ مہم سے سرخ
 رو ہو کر آپ کا واپس لوٹنا ہمارے حکمران کے لئے باعثِ مسرت ہے۔ آپ نے مرزا بابر سے اپنی
 دلی وفاداری کا ایک بار پھر ثبوت دیا ہے۔ عالی جاہ اور ان کے سب درباری دعا گو ہیں کہ آپ کی

نیک نامی میں اضافہ ہو۔ اوش میں فاتحین کے اعزاز میں ایک شاندار ضیافت منعقد کی جائے گی اور بہادر سپاہیوں کو انعام و اکرام سے نوازا جائے گا۔ اس وقت ہمارے حکمران آپ کو اپنی طلائی دستے کی تمکواری عطا کر رہے ہیں!“

قاسم بیگ نے اسلمہ بردار سے بغدادی تمکواری لے کر احمد تہل کی طرف بڑھائی۔ احمد تہل نے جواب بھی گھنٹوں کے بل بیٹھا ہوا تھا، تمکواری کو لے کر نیام سے چار انگل باہر نکالا، اس کا بوسہ لیا اور جذبات کی شدت سے مرتعش آواز میں کہا:

”عالی جاہ کی اس سخاوت کو میں مرتے دم تک یاد رکھوں گا۔ قسم کھاتا ہوں کہ تمام زندگی وفاداری کے ساتھ آپ کی خدمت کرتا رہوں گا!“

۵

اس روز شام کو اندھیرا ہوتے ہی شہر کے باہر نصب سینکڑوں خیموں اور شامیانوں کے سامنے قزاقوں اور نقاروں کی آوازیں گونجنے لگیں، مشعلیں روشن کی گئیں، الاؤ جلائے گئے اور شاندار ضیافت شروع ہو گئی۔ بیگ، عہدیداران سلطنت، لشکری اور شاہی خدمت گار سارے کے سارے لوگ جنہیں پیکروں کی بھیڑوں اور گھوڑوں سے کچھ نہ کچھ فائدہ پہنچا تھا، خوشیاں منا رہے تھے۔ ضیافت کے سلسلے میں تمام معزز و ممتاز افراد باہر کے عالیشان شامیانے کے نیچے اکٹھا تھے جہاں سازندے اپنی لطیف موسیقی سے اور مغنی اپنے بہترین نعمات سے ان کی تفریح کا سامان فراہم کر رہے تھے۔

باہر شامیانے کے اندر ایک بلند چبوترے پر بیٹھا ہوا تھا جس پر پہنچنے کے لئے چار سنہری سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ اس کے نیچے واہنی جانب احمد تہل معزز ترین بیگوں کے درمیان بیٹھا ہوا تھا۔ آج اس نے فوج لباس کے بجائے زری کا چونہ پہن رکھا تھا، سر پر روپہلی دستار بندھی تھی اور اسی رنگ کے پٹکے سے باہر کی عطا کی ہوئی طلائی دستے والی تمکواری لٹک رہی تھی۔ اسے مہم کی کامیابی اور شاہی انعام پر مبارک بادیں دی جا رہی تھیں۔ احمد تہل کو سب سے زیادہ مسرت قلعہ نگار خانم اور خان زادہ بیگم کی مبارک بادوں سے حاصل ہوئی تھی جو اس کے شامیانے میں داخل ہوتے ہی مبارک باد دینے والے اولین افراد میں شامل تھیں۔ باہر کی ماں اور بہن احمد تہل کی تظار ہی میں اس کی طرف کچھ مڑی ہوئی بیٹھی تھیں اور وہ وقتاً فوقتاً ”کن انکھوں سے انہیں دیکھ لیتا تھا۔ خان زادہ بیگم کا چہرہ ابدن اور اس کا قوس قزح کی طرح جھللاتا ہوا دلکش ست رنگی ریشمی لباس بیگ کو جھجھوکے دے رہے تھے، اس کی سب سے شیریں آرزوؤں کو تقویت پہنچا رہے تھے۔

نوجوان حکمران کی ضیافتوں میں سے نوشی کا چلن نہ تھا اور خود بابر نے بھی اس وقت تک جام کو کبھی ہونٹوں سے نہیں لگایا تھا۔ قاسم بیگ کو شراب پسند نہ تھی اور اس نے ضیافتوں میں بادہ نوشی کو ممنوع قرار دیا تھا لیکن دوسرے بیگوں نے مرحوم مرزا عرش کے عہد کی ریتیں محافل سے کی یاد میں ہوشیاری کے ساتھ بابر سے چھپا کر وزیر کے اس حکم کی خلاف ورزی کا فیصلہ کیا۔

علی دوست بیگ نے مڑ کر پیچھے کھڑے ہوئے شربت جی کو دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں احمد تہل کی طرف اشارہ کیا۔ شربت جی اشارے کا مفہوم سمجھ کر مسکرایا اور اس نے چاندی کی دوسری صراحی سے پیالہ بھر دیا۔ احمد تہل نے پیالہ ہاتھ میں لیا تو فوراً ہی اس کی ناک میں شراب کی بو ساگئی۔

”پیچھے نا، بیگ، دلی آرزو ہے کہ سرقد پر یلغار کے دوران آپ کو اور بھی زیادہ کامیابی نصیب ہو“ علی دوست بیگ نے دھیرے سے کہا۔

احمد تہل نے اظہار تشکر کے طور پر سر جھکایا اور پیالہ خالی کر کے دسترخوان پر رکھے ہوئے گوشت کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

”اب تو ہمارے پاس گوشت کا اتنا زیادہ ذخیرہ جمع ہو گیا ہے کہ ہمارے سرقد و بخارا پر قابض ہونے تک کے لئے کافی ہوگا“ مخمور علی دوست بیگ نے بلند آواز سے کہا تاکہ سب سن لیں۔

”ہمیں جلد از جلد حملہ کرنا چاہیے!“

بابر پر بخوبی واضح تھا کہ یہ دولت کی ہوس ہی ہے جو بیگوں کو سرقد پر چڑھائی کے لئے اکسار ہی ہے۔ اس ہوس کو قابو میں رکھنا پہلے بھی دشوار ثابت ہوتا تھا لیکن اب تو یہ کو بہتانی دریا کے تندو تیز دھارے جیسی ہو گئی تھی، اب تو اسے کوئی بھی طاقت روک نہیں سکتی تھی۔

۶

میر عمارت فضل الدین تیز بہاؤ والے بورا سائے کے کنارے جس سرسبز و شاداب علاقے میں عارضی طور پر مقیم تھا وہ جنت جیسا خوبصورت تھا۔ گھر کے آگے ایک چھوٹا سا احاطہ واقع تھا جس میں ناشپاتی اور بھی کے کچھ درخت لگے ہوئے تھے اور جہاں وہ اکثر کام کیا کرتا تھا۔ احاطے کے ایک گوشے میں سائبان تلے دو گھوڑے بندھے ہوئے تھے جن میں پیشانی پر ستارے والا سیاہی مائل سرخ گھوڑا بابر کا عطا کیا ہوا تھا۔

فضل الدین کو شاہی میر عمارت مقرر کر دیا گیا تھا، اسے بابر کی مخصوص عنایات بھی حاصل تھیں اور یہ ایسی باتیں تھیں جن پر وہ شروع میں قلبی مسرت محسوس کر سکتا تھا۔ حکمران نے میر عمارت

کے مشورے سے اند جان میں اگلے کئی برسوں کے دوران مدرسوں اور کتب خانوں کی تعمیر کا ایک منصوبہ مرتب کرایا تھا، اس سلسلے میں فضل الدین کی تجاویز منظور کر لی تھیں اور یہ بھی کہہ دیا تھا کہ جب وہ لشکر کشی کے سلسلے میں باہر جایا کرے گا تو تعمیری کاموں کی نگرانی خان زادہ بیگم کیا کرے گی اور میر عمارت کو عمارات کی تعمیر سے متعلق ساری تفصیلات شہزادی کے مشورے سے طے کرنی ہوں گی۔ فضل الدین مستقبل میں خان زادہ بیگم سے اپنی ملاقاتوں کا تصور کرتا تھا تو اس کے دل پر خوف سا طاری ہو جاتا تھا پر ساتھ ہی ساتھ مسرت و راحت کی ایک شیریں کیفیت بھی محسوس ہوتی تھی۔

لیکن اسے گزشتہ روز ہی معلوم ہوا تھا کہ باہر ایک بار پھر سمرقند پر حملہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے جس کے لئے سلطنت کی ساری قوت و دولت درکار ہوگی اور عمارتوں کی تعمیر سے متعلق کام غیر متعین مدت کے لئے ملتوی کردئے جائیں گے۔ اسے یہ فکر لاحق ہو گئی کہ اگر باہر سمرقند پر قابض نہ ہو سکے یا خدا نخواستہ انہیں شکست کا منہ دیکھنا پڑا تو کیا ہوگا؟ اس صورت میں تو خود اس کے سارے خوابوں کا چکنا چور ہو جانا یقینی ہے۔ اور حکمران کے سمرقند فتح کر لینے کا بھی تو مطلب یہ ہوگا کہ وہ ماور النہر کے فرماں روا بن کر وہیں ٹھہر جائیں۔ تب کیا وہ فرغانہ کا پہلے ہی کی طرح خیال بھی رکھ سکیں گے؟ پہلے تو دارالحکومت کے حسن کو دوبالا کرنے پر توجہ مبذول کی جاتی ہے اور تب بھلا اند جان دارالحکومت بن بھی سکے گا؟

اس فانی اور ناپائدار دنیا میں میر عمارت کے سارے کام اور منصوبے محض ریت کے تودوں کی سی حیثیت رکھتے تھے.....

فضل الدین علم ہندسہ کی ایک کتاب کے اوراق بے دلی کے ساتھ الٹ رہا تھا اور اس کی مزاجی کیفیت بری طرح چوہٹ ہو چکی تھی۔

اتنے میں گھر کے پھانک پر کسی نے دستک دی۔ سن رسیدہ ملازم جو سائبان کے نیچے چوبلی بیچنے سے لید ہٹا رہا تھا، پھانک کے پاس گیا اور وہاں سے برآمدے میں لوٹ کے کہا:

”کوئی آپ سے ملنے آیا ہے، آقا۔“

”آخر یہ ”کوئی“ ہے کون؟“

”چیتھڑوں میں ملبوس ہے پر دیکھنے میں تندرست بانٹا لگتا ہے۔ کہہ رہا ہے: ”میں ان کا بھانجا

ہوں.....“ میں نے کہا کہ میں پھانک کے پاس انتظار کرو۔“

”بھانجا؟ ارے سنو، سنو“ فضل الدین نے اٹھ کر چڑی پاتا بے پنے اور نیم وا پھانک کے قریب

گیا۔

پھنسا پرانا، غبار آلود چوغہ اور گھسے کٹے جوتے پہنے ہوئے ایک طویل قامت نوجوان بے حس و حرکت کھڑا ہوا تھا اور اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ فضل الدین کو اس کی آنکھیں اور مسکراہٹ بہت جانی پہچانی سی لگیں۔

”ماموں جان!“ نوجوان خود پر قابو نہ پاسکا اور فضل الدین کی طرف لپکا۔

”طاہر! طاہر جان!“ میر عمارت نے اسے گلے لگا کر بانہوں میں جکڑ لیا۔ ”زندہ ہے، ہر قسم کی موت کا منہ چڑھا رہا ہے، میرا بھانجا! اف، کتنی مشکل سے میں تمہیں پہچان سکا!۔۔۔ کتنے زیادہ بدل سے گئے ہو تم!“ لیکن یہ تمہارے کو کیا ہوا؟“

”یہ نہ پوچھئے، ماموں جان۔۔۔“

”خیر ٹھیک ہے، آؤ، اندر آؤ نا! بعد میں سب بتا دیتا۔۔۔“

اس ملاقات کے اولین لمحات ہی میں فضل الدین کو ساری باتیں یاد آئیں۔

نہیں، طاہر نے تین سال قبل دنیا سے کوچ نہیں کیا تھا، سلطان احمد کے حملے کو ناکام بنا دینے والا یہ دلیر نوجوان خدا کے فضل و کرم سے زندہ بچ گیا تھا۔۔۔ اور وہ شیطان۔ سمرقند کے سابق حکمران اور بدنام شیطان کا سپاہی۔ یہ سمجھ کر کہ اس نے اپنے نیزے سے طاہر کا کام تمام کر دیا ہے، گھر کے احاطے سے نکل گیا تھا۔۔۔ ”پجاری میری، ہشیرہ“ فضل الدین نے سوچا، ”لوہان طاہر کو اوندھے پڑے دیکھ کر یوں بے ہوش ہو گئی تھیں کہ پھر ہوش میں آنا نصیب نہ ہوا۔“ وہ خود میسوں کو بلالایا تھا جن کے علاج سے تین دن بعد طاہر کو ہوش آگیا تھا۔ نیزے کے وار سے اس کا ایک پھیپہڑا تو ضرور زخمی ہو گیا تھا لیکن دل اور جگر کو کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔ طاہر اپنی نوجوانی اور طاقت کی بدولت دھیرے دھیرے صحت یاب ہو گیا تھا۔ رشتے داروں اور ہم سایوں کا کہنا تھا کہ موت جو طاہر کو دنیا سے اٹھالے جانے کے لئے آئی تھی، اس کے بجائے اس کی ماں کو اٹھالے گئی۔ فضل الدین بہن کے فاتحہ چہلم کے بعد قوا سے چلا آیا تھا اور اس کے بعد سے اسے اپنے بھانجے کی کوئی خبر نہیں ملی تھی۔

”میرے محترم بردار نسبتی کا کیا حال ہے، تندرست ہیں نا؟“ فضل الدین نے طاہر کو برآمدے

میں چلنے کا اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”ابا جان نے آپ کو سلام کہا ہے۔۔۔ اور ہاں، ماموں جان، میں کوئی سال بھر سے قوا نہیں گیا ہوں۔۔۔ رشتے داروں نے ابا جان کی دیکھ بھال کے لئے کوئی بیوہ بڑھیا تلاش کر دی تھی لیکن مجھے

..... مجھے ہر وقت والدہ مرحومہ کی یاد ستاتی رہتی تھی اور وہاں رہنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔“
 لیکن جو یادیں اس کے قوا چھوڑنے کا باعث بنیں وہ یقیناً صرف ماں ہی سے متعلق نہ تھیں۔
 بد نصیب رابعہ کا خیال بھی اس کے دل و دماغ پر چھایا رہتا تھا، اس نے مدد کے لئے جو بیچ بلند کی تھی وہ طاہر کے کانوں میں برابر گونجتی رہتی تھی۔ تیورس سال تو وہ بالکل سمرقند تک پہنچ گیا تھا، راستے میں کبھی فصلیں کاٹنے والے مزدور کی حیثیت سے کام کیا تھا، کبھی کاروانوں کے ساتھ ادھر ادھر بھٹکتا رہا تھا، ہر جگہ رابعہ کی تلاش جاری رکھی تھی اور برابر پوچھتا رہتا تھا: ”کیس میری بہن کو تو نہیں دیکھا؟ اسے سلطان احمد کے سپاہی پکڑ لے گئے ہیں۔“ لیکن کیس بھی کچھ اتا پتا نہیں مل سکا تھا۔

زمانہ بڑا پر آشوب تھا۔ سلطان احمد نے جس سال فرغانہ پر حملہ کیا تھا اس سال وہ راہی عدم ہو گیا تھا۔ اس کا لشکر ٹوٹ کے بکھر چکا تھا۔ تخت پر پہلے اس کے بھائی سلطان محمود نے قبضہ کیا پھر سلطان محمود کے بیٹے بائے سنقور نے۔ بھائی بھائی کے خلاف ہتھیار اٹھا رہا تھا اور بیٹا باپ کے خلاف۔ کسی شخص نے طاہر کو بتایا کہ تاشقند میں بہت سی دشتائیں فروخت کی گئی ہیں تو اس نے تاشقند کا رخ کیا۔ گزشتہ سال وہ پیدل چلتا ہوا اس حال میں تاشقند پہنچ گیا تھا کہ پیٹ بھر کھانا میسر نہیں ہوتا تھا اور کپڑے بری طرح پھٹ چکے تھے۔ لیکن رابعہ وہاں بھی نہ ملی۔ زندگی گدلے دریا کی طرح بہتی ہوئی گزرتی جا رہی تھی۔ طاہر کو احساس تھا کہ اس کی تلاش لاحاصل ہے، گدلے دریا سے موتی ڈھونڈ نکالنا کسی کے بس کی بات نہیں پھر بھی اس کے پاؤں رکنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔

”میرے عزیز بھانجے، تم تین برسوں سے تھکن کی پروا کئے بغیر اس بد نصیب لڑکی کو تلاش کرتے پھر رہے ہو جس سے ثابت ہوتا ہے کہ تم بڑے نیک دل ہو۔ میں وفاداری کو سچے مرد کی صفت تصور کرتا ہوں لیکن یوں ہی در بدر بھٹکتے رہنے کا مطلب تو اپنی صحت سے ہاتھ دھو بیٹھنا ہے۔ پھر یہ بھی نہ بھولو کہ اس لڑکی کی خود اپنی قسمت بھی ہے اور قسمت کا لکھا پورا ہو کر رہتا ہے۔ اگر وہ زندہ ہے تو یقیناً کسی کی شریک حیات بن چکی ہوگی۔ اب تو شاید اس کے بچے بھی ہوں۔ آخر پورے تین برسوں تک اسے کنواری کون رہنے دے گا؟ تم خود ہی سوچو نا۔“

”سوچنے کو تو میں بھی جانے کب سے یہی سوچ رہا ہوں، ماموں جان لیکن میں تو اپنے دامن سے ایک بہت بڑی غلطی کا داغ دھونا چاہتا ہوں جو رابعہ کے سلسلے میں مجھ سے سرزد ہو گئی تھی اور کچھ بھی نہیں۔“

”کون سے غلطی؟“

”رابعہ کے والدین اسے اندجان بھیجنا چاہتے تھے لیکن میں نے اسے قوا میں ٹھہرے رہنے پر راضی کر لیا تھا۔“

”مگر ظاہر، آخر تمہیں کیسے علم ہو سکتا تھا کہ کیا اور کب ہونے والا ہے؟“

”یہ تو درست ہے کہ مجھے علم نہیں ہو سکتا تھا.... پھر بھی جب تک اسے تلاش نہ کر لوں، دیکھ نہ لوں تب تک مجھے سکون نہیں میسر ہو سکتا۔ جیسا کہ آپ فرما رہے ہیں، اگر رابعہ کی شادی ہو چکی ہے اور وہ اپنے نئے خاندان کے ساتھ زندگی بسر کر رہی ہے تو میں مقدر کے آگے سر تسلیم خم کر دوں گا۔ لیکن ایسا نہ ہوا ہو تو؟ اس کا کوئی اپنا گھریا نہ ہوا اور آج بھی نجات دلانے والے کا یعنی میرا انتظار کر رہی ہو تو؟! آخر میں تو اسے اب بھی فراموش نہیں کر پاتا ہوں نا؟ اگر وہ بھی مجھے فراموش نہ کر سکی ہو تو؟“

فضل الدین نے اداسی کے ساتھ اثبات میں سر ہلایا:

”تین سال بیت چکے ہیں، تین سال..... ہم میں سے، ہم سب میں سے ایک ایک فرد بدل چکا ہے لیکن لگتا ہے کہ درد دل لا دیا ہے۔“ پھر اس نے گفتگو کا رخ بدل دیا: ”سنو، ظاہر جان، تمہارا ماموں دولت مند ہو گیا ہے۔“ فضل الدین نے بغلی جیب میں ہاتھ ڈال کر پھندے دار سیاہ چرمی تھیلی نکالی، پہلے کچھ اشرفیاں دینے کا ارادہ کیا پھر پوری تھیلی ہی بھانجنے کی طرف بڑھادی۔ ”تم بازار چلے جاؤ، جمعے کا دن ہے، ڈھیروں چیزیں آئی ہوں گی۔ تمہیں جو کچھ چاہئے، خرید لو۔“

”ارے نہیں، ماموں جان، ایسا نہ کیجئے.... بس کچھ پیسے بطور قرض عنایت کر دیجئے۔“

”خیر ٹھیک ہے، بطور قرض ہی سہی! جتنی ضرورت ہو، لے لو، جب کبھی گنجائش نکلے واپس کر دینا۔“

”یہ دوسری بات ہوئی۔“

شام ہو رہی تھی تب کہیں جا کر ظاہر گھر لوٹا۔ اس نے اپنے لئے سپاہیوں والے عمدہ بوٹ، مغلی ٹوپی اور موٹے اونٹنی کپڑے کا چکمان خرید لئے تھے۔ وہ گھسے گھسائے نیام والی ایک تلوار بھی لئے ہوئے تھا جسے کوئی سپاہی غالباً ”کافی استعمال کر چکا تھا۔ فضل الدین دنگ رہ گیا:

”بھلا یہ تلوار کا ہے کے لئے؟“

”بھرتی افسر یا بر کے لشکر میں رضا کارانہ طور پر بھرتی ہونے والوں کے نام لکھ رہا ہے نا....“

میر عمارت اب سمجھا کہ اس کا بھانجا کس ارادے سے اوش آیا ہے اور اس کا دل دہل گیا:

”ارے طاہر، تم تو پاگل ہو گئے ہو! سب لوگ تو جنگ سے دور بھاگتے ہیں اور تمہیں خود ہی موت کے منہ میں جانے کی پڑی ہے۔ اس سرقتی نیزے کے وار سے جی نہیں بھرا تھا لیا؟“

”ماموں جان، اس نیزے کے بعد سے تو جانے کتنی ہی بار موت کے منہ میں جا چکا ہوں۔ تاشقند میں ایک بیک کسی غریب کی بیٹی کو زبردستی اٹھالے جانا چاہتا تھا جیسا کہ رابعہ کے ساتھ ہوا تھا۔ میں برداشت نہ کر سکا، معاملے میں پھاند پڑا اور یہ دیکھئے میرے چہرے پر اس بیک کے خنجر کے زخم کا نشان موجود ہے۔۔۔۔۔“

”تم ابھی تک یہ بھی نہیں سمجھ سکے کہ دنیا میں چلتی اس کی ہے جو طاقتور ہو؟“

”اسی لئے تو میں طاقتور فوج میں شامل ہونا چاہتا ہوں۔ دراصل ظالم وجابر صرف طاقت ہی سے ڈرتے ہیں۔۔۔۔۔ ماموں جان میں نے لوگوں کے درد و غم کو بہت دیکھا ہے، عام آدمیوں کے درد و غم میں شریک رہا ہوں۔ مجھے بہت سے لوگوں نے بتایا ہے کہ مرزا بابر کا دل صاف اور ارادے نیک ہیں۔۔۔۔۔ انصاف پسند بادشاہ بھی ہمارا حامی و ناصر نہ ہوا تو بھلا اور کون ہو گا؟“

فضل الدین نے کمری ٹھنڈی سانس لی:

”لیکن مرزا بابر تو ابھی کم سن ہیں۔ میں نے بھی ان سے بہت سی امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں، فرغانہ کے حسن کو دوبالا کرنا چاہتا تھا۔۔۔۔۔ پر ایک بار پھر جنگ چھڑنے کو ہے، ایک بار پھر خون کے دریا بہیں گے۔۔۔۔۔ ہم سب کی آنکھوں پر پردے پڑ چکے ہیں، ہم تو ظلمت شب کی آغوش میں جی رہے ہیں۔ کیسا خراب زمانہ لگا ہے، کیسی بے انصافی کا زمانہ! خیال رہے، کہیں تم بھی بیگوں کے آلہ کار بن کر نہ رہ جاؤ۔“

”میرا اعتبار کیجئے، ماموں جان، اس کی نوبت نہ آئے گی۔ میں بے انصافی کو تقویت نہ پہنچاؤں گا۔۔۔۔۔“

”خود بابر بھی تو بیگوں کی ہاں میں ہاں ہی ملاتے رہتے ہیں، بے انصافی ہی کو تقویت پہنچا رہے ہیں۔“

”تو شاید اس کا سبب یہ ہے نا، ماموں جان کہ مرزا بابر کے پاس وفادار سپاہیوں کی، مجھ جیسے وفاداروں کی کمی ہے؟ ان کا لشکر تو بس بیگوں کے دستوں ہی پر مشتمل ہے۔ عرصے سے یہی دستور چلا آ رہا ہے۔۔۔۔۔ بات یہ ہے کہ میں اپنے لئے کوئی اور راہ نہیں تلاش کر سکا۔ اور تنہا میں کچھ بھی تو نہ کر سکوں گا۔“

فضل الدین نے طاہر کا غور سے جائزہ لیا۔ نہیں، اس فوجوان کا ارادہ بدلا نہیں جاسکتا تھا، کسی

بھی طرح نہیں۔

”جی ہاں۔ وہ کہتا ہے: تمہارے پاس گھوڑا تو ہے نہیں، پیدل فوج میں بھرتی کریں گے۔“ دیے میں پیدل چلنے کا عادی بھی ہو چکا ہوں۔“

”اور یہ بھی سوچا کہ پیدل سپاہی ہی سب سے زیادہ لقمہ اجل بنتے ہیں؟“

”اس سے کیا ہوتا ہے۔۔۔ میں ایک جنگ میں حصہ لوں یا چالیس جنگوں میں، مرتا تو وہی ہے جس کی قسمت ہی میں مرنا لکھا ہو۔“

”اب رہنے دو، طاہر، یہ موت اور جنگ کی باتیں بہت ہو چکیں!“

صبح کو ناشتے کے بعد فضل الدین نے نوکر سے سائبان تلے بندھے دو نوں گھوڑوں پر زین کئے کو کہا۔

”تم اسے لے لو۔“ اس نے لمبی ٹانگوں والے پھڑے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے طاہر سے کہا۔ ”تم پیدل محاذ پر جاؤ، یہ میرے لئے بڑی بے عزتی کی بات ہے۔“

میر عمارت خود ماتھے پر ستارے والے اس گھوڑے پر سوار ہو گیا جو اسے باہر نے عطا کیا تھا۔ وہ دونوں شاہی محل کے لئے روانہ ہو گئے۔

فضل الدین نے قاسم بیگ سے طاہر کی سفارش کی۔

”میں حکمران سے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ وہ ازراہ عنایت میرے بھانجے طاہر کو اپنے محافظ دستے میں رکھ لیں۔ یہ نوجوان آخری دم تک مرزا باہر کا وفادار سپاہی رہے گا۔“

قاسم بیگ نے دیکھا کہ طاہر کتنا تندرست و توانا ہے۔

”ارے نوجوان، تم پہلے بھی فوج میں رہ چکے ہو کیا؟“ اس نے طاہر کے چہرے پر زخم کے نشان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں، کبھی نہیں۔“ طاہر نے رکھائی اور بے باکی سے جواب دیا۔

فضل الدین جلدی سے بول پڑا:

”جناب امیر الامرا، میرا بھانجا دیے تو پشتینی زراعت پیشہ ہے لیکن اس میں سپاہی کی تمام صفات، طاقت، جسارت، ذہانت پائی جاتی ہیں۔ آپ کو یاد ہے ناکہ قوا میں پل کو پار کرتے وقت سر قندی لشکر کو کتنا زبردست نقصان اٹھانا پڑا تھا؟ اس وقت ہمیں فتح سے ہم کنار کرنے والوں میں سے ایک ہی طاہر تھا!“

”فتح اس نے دلائی تھی؟“ قاسم بیگ نے یقین نہ کرتے ہوئے دریافت کیا۔ ”وہ کیسے؟“

میر عمارت نے مختصراً جو قصہ بیان کیا اس سے ظاہر ہو گیا کہ گاؤں کے نوجوانوں نے ایسا کارنامہ انجام دیا تھا جسے بیک اور سپاہی بھی نہیں انجام دے سکے تھے۔ قاسم بیک کو کسی طرح یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔

”فتح تو ہمیں پروردگار نے دلائی تھی، جناب میر عمارت!“

”بے شک، خود پروردگار نے ہی اس تنگ پل کو ڈھانے کا خیال ان نوجوانوں کے دلوں میں ڈالا تھا۔۔۔ اس موقع پر طاہر شدید زخمی ہوا اور مرتے مرتے بچا تھا، قاسم بیک صاحب!“

”اچھا!“ اور وزیر طاہر کو ذرا اگر مجبوشی کے ساتھ دیکھنے لگا۔ ”لگتا ہے تمہیں سرفردیوں سے انتقام لینا ہے، کیوں نوجوان؟“

”جی ہاں۔“

قاسم بیک نے بھرتی افسر کی طرف جو پیچھے ہی کھڑا ہوا تھا، مڑ کر کہا:

”اس نوجوان کا نام ان سپاہیوں میں شامل کر لیجئے جو کوہ چل محرم کے دامن میں زیر تربیت ہیں۔“ پھر اس نے فضل الدین سے مخاطب ہو کر اضافہ کیا: ”وہاں ہمارے بہترین سپاہیوں کو بھیجا گیا ہے جنہیں ہم حکمران کے محافظ دے کے لئے تربیت دلارہے ہیں۔“

۷

بگیوں کی مجلس مشاورت نے سرفرد پر جلد ہی حملہ کرنے اور تمام ضروری تیاریاں اوش ہی میں مکمل کر لینے کا فیصلہ کیا۔

بابر اپنی ماں قلوغ نگار خانم کا سامنا کرنے سے کتر رہا تھا۔ اسے کوچ سے قبل کی مصروفیات سے کچھ وقت ملتا بھی تھا تو اس کے دوران اپنے شامیانے میں تنہا کتابوں کا مطالعہ کرتا رہتا تھا۔

آج نماز مغرب کے بعد وہ اپنی ”تزرک“ میں والد کے انتقال کے متعلق لکھ رہا تھا تو میر خادم نے اندر داخل ہو کر اطلاع دی کہ قلوغ نگار خانم اور علی دوست بیک ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ بابر نے اپنا روزنامہ بند کر دیا، در تک جا کے ماں کا استقبال کیا اور اسے لاکر خواص کے لئے متعین جگہ پر بٹھایا۔

قلوغ نگار خانم کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ اس کی پیشانی سے ذرا ہی اوپر مانگ کے قریب بالوں کی ایک سفید لٹ صاف نظر آرہی تھی۔ یہ چالیس سالہ خاتون اب بوہیوں کے سے کپڑے پہنتی اور کر جھکا کر چلتی تھی۔ بابر کو ماں کی حالت دیکھ کر افسوس ہوا اور اس نے گہری اور دھیمی آواز سے وہ بات خود ہی چھیڑ دی جسے کہنے کا چند لمحات قبل تک قطعاً ارادہ نہیں رکھتا تھا:

”والدہ محترمہ“ آپ یہ نہ سوچیں کہ میں نے آپ کے مشورے کو فراموش کر دیا ہے۔ سمرقند سے واپس لوٹ کر انشا اللہ تعالیٰ وہ سارے کام انجام دوں گا جن کے متعلق آپ نے فرمایا ہے۔“

”اللہ قادر مطلق اور ہمہ داں ہے۔ ہم اس کے بندے ہیں، ہمیں کوئی شکایت نہ کرنی چاہئے۔ میری دعا ہے، فرزند ارجمند کہ خدا اپنے فضل و کرم سے آپ کے سارے نیک ارادوں کو پورا کرے!“

علی دوست بیگ نے اپنے طاقتور ہاتھوں کو دعا کے انداز میں اٹھایا:

”الہی آمین!“ اور اس نے اپنی بڑی بڑی، موٹی موٹی انگلیاں بے ریش چکنے چرے پر پھیر لیں۔ وہ بے ریش شخص بابر کی نانی ایمان دولت بیگ کا چچا زاد بھائی تھا اس لئے اپنے نام کے ساتھ لفظ ”نانائی“ کو خطاب کی طرح استعمال کرتا اور قلوغ نگار خانم سے بڑے سرپرستانہ انداز سے پیش آتا تھا۔ سب لوگ ریشی گدے پر بیٹھ گئے تو اس نے قلوغ نگار خانم کو حوصلہ افزائی کرنے والی سوالیہ نظروں سے دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو: بات چھیڑی جائے نا؟ قلوغ نگار خانم نے قدرے ہنسی کے ساتھ اثبات میں سر ہلادیا اور علی دوست بیگ نے کھانسی کر حلق صاف کیا، سر جھکا لیا اور کہا:

”حکمران عالی، آپ کی والدہ صاحبہ اور آپ کا یہ خادم ایک بہت نازک مسئلے پر آپ سے مشورہ کرنے کے لئے آئے ہیں۔ آپ کی ہمشیرہ محترمہ خان زادہ بیگم بیس سال کی ہو چکی ہیں۔ ان کی شادی کرنے کا وقت آچکا ہے۔ وہ اپنی خوبصورتی میں رشک ماہ و مریں، دانائی اور حیا کا پیکر ہیں۔! ابھی تک ان کی شادی کے لئے کوئی شایان شان شخص نہیں مل سکا۔ آپ کی والدہ صاحبہ کو بھی اور اس ناچیز کو بھی فکر لاحق ہے کہ شادی کی زندگی کا بہترین زمانہ گزرا جا رہا ہے۔“

”وہ دوایک سال اور یوں ہی بیٹھی رہیں تو مذاق اڑایا جانے لگے گا۔ لوگ کہیں گے: مرزا عمر شیخ مرحوم کی دختر تو کنواری بیٹھی ہے۔“ قلوغ نگار خانم بھی کہہ اٹھی۔

بابر اپنی بہن کے بارے میں اس قسم کی باتیں پہلے بھی سن چکا تھا لیکن آج علی دوست بیگ کے فیصلہ کن رویے سے اس نے اندازہ لگایا کہ غالباً ”کوئی موزوں نوجوان تلاش کر لیا گیا ہے۔ اس نے نوجوانوں کے سے تجسس کے ساتھ براہ راست دریافت کیا:

”ہماری بہن سے شادی کرنے کا خواہش مند ہے کون؟“

علی دوست بیگ نے ایسے ہی براہ راست انداز سے جواب دینا نہ چاہا۔

”یہ کہنے کی جرات بھلا کون کر سکتا ہے کہ وہ شاہ فرغانہ کا برادر نسبتی بننے کا اہل ہے؟“ سن رسیدہ

بیگ نے پرستائش انداز سے سوال کیا۔

”پھر بھی؟“ بابر نے اصرار کیا۔

اب علی دوست بیگ اپنا ”راز“ کھولنے پر مجبور ہو گیا۔

”عالی جاہ کے سپہ سالاروں میں سلطان احمد تبتل بھی شامل ہیں۔ عالی نسب، شجاع اور عمر اٹھائیس سال کی۔ آپ کو یاد ہے ناکہ انہوں نے گزشتہ سال یعقوب بیگ کی سازش کا پردہ فاش کرنے میں آپ کی کتنی مدد کی تھی؟ اور ہیکڑوں پران کا دھاوا کتنا کامیاب رہا تھا۔۔۔؟“

بابر نے اثبات میں سر ہلا دیا لیکن جب اس نے اپنے تصور میں خان زادہ بیگم کو احمد تبتل کے پہلو میں کھڑا کیا تو اس کا دل مضطرب ہو گیا: دونوں میں ظاہری یا باطنی کوئی مماثلت ہی نہ تھی۔

”آپ کو منظور ہے، والدہ محترمہ؟“ اس نے پوچھا۔

قلوغ نگار خانم نے گہری ٹھنڈی سانس لی۔

”اور چارہ ہی کیا ہے؟“ اس نے سوال کا جواب سوال ہی سے دیا۔ ”خان زادہ بیگم ویسے تو کسی شاہ کی ملکہ بننے کے لائق ہیں لیکن اس دور پر آشوب میں قابل اعتماد حکمران نہ ہی کون۔ میں نے اور علی دوست بیگ صاحب نے ساری چھان بین کر لی ہے۔ بیگ احمد تبتل بڑے عالی نسب ہیں، ان کے پردادا سلطان تھے اور خود چنگیز خان کے رشتے دار۔ ان کے بڑے بھائی تلبا بیگ ان دنوں تاشقند میں آپ کے ماموں جان خان محمود کے وزیر اعظم ہیں۔ اگر احمد تبتل بیگ ہمارے دادا دین جائیں گے تو وہ اپنے بڑے بھائی کی وساطت سے آپ کے اور آپ کے ماموں جان خان محمود کے درمیان قریبی روابط قائم کرا سکیں گے۔ ویسے بھی اتنے بااثر بیگ کا اپنے خاندان اور سپاہیوں سمیت آپ کے سامنے میں آجانا بہت بڑا سارا ہو گا۔“

”بالکل درست فرمایا آپ نے“ علی دوست بیگ نے مکمل خود اعتمادی کے ساتھ کہا۔

بابر کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کے اور اس نے شانے اچکا دیئے۔ وہ کچھ جھجک بھی محسوس کر رہا تھا: بہن اس سے پانچ سال بڑی تھی، ماں اور بزرگ بیگ آخر اسے ایسے دشوار مسئلے میں کیوں الجھانا چاہتے تھے؟

”یہ رشتہ تو خود شہزادی کے لئے بھی اچھا ثابت ہو گا۔“ علی دوست بیگ نے مزید کہا۔ ”ان کی شادی اگر کسی فرماں روا سے ہوگی تو وہ اپنی والدہ سے، اپنے برادر عزیز اور ہمارے حکمران کی حفاظت اور سرپرستی سے دور ہو جائیں گی۔۔۔“

”ان کا کہیں پاس ہی میں رہتا میرے لئے بھی بہت اچھا ہو گا۔“ قلوغ نگار خانم نے ایک بار پھر

مفتگو میں مداخلت کی۔ ”خان زادہ بیگم میری پہلو ٹھی دختر ہیں، میری مشیر ہیں، ان کی شادی اگر ہمیں ہو جاتی ہے تو وہ میری آنکھوں کے سامنے رہیں گی اور مجھے تنہائی محسوس نہ ہوگی۔“

بابر نے سوچا کہ بہت سی باتیں جن کا اسے خیال نہیں آتا، والدہ سمجھا دیتی ہیں اور اس نے عزم کے ساتھ کہا:

”یہ رشتہ والدہ محترمہ کو منظور ہو تو سمجھئے کہ بات طے رہی۔“

علی دوست بیگ کی باچھیں کھل اٹھیں۔

”بالکل درست فرمایا آپ نے، میرے حکمراں، بالکل درست۔ لوگ سچ ہی تو کہتے ہیں: ماں کو منظور تو خدا کو بھی منظور!“

لیکن قلوغ نگار خانم خوش نہ ہوئی۔ ”کیوں؟“ بابر نے پوچھا:

”خود ہمیشہ صاحبہ کا کیا خیال ہے؟“

قلوغ نگار خانم نے کشمکش بھری خاموشی کے بعد اپنے دل کے ملول ہونے کی وجہ بتادی:

”وہ تو راضی نہیں ہیں۔ انہیں معلوم ہوا تو دیر تک اٹکبار رہیں۔“

”ایسے موقعوں پر تو لڑکیاں ہمیشہ ہی رو پڑتی ہیں۔“ علی دوست بیگ کے ہونٹوں پر طنزیہ

مسکراہٹ پھیل گئی۔

”اب رہنے بھی دیجئے، بیگ صاحبہ!“ قلوغ نگار خانم نے اچانک جھلا کر کہا۔ ”رہنے بھی

دیجئے..... خان زادہ بیگم کے دل پر اس وقت جو کچھ بیت رہی ہے اس سے میں سخت پریشان ہوں۔

بابر جان، ماں نے اب اداس اور دھیمی آواز سے کہا۔ ”ان کے میب الفاظ اتفاقاً“ میں نے سن

لئے..... وہ تو خود کشی کرنے پر آمادہ ہیں.... کیا کروں، ہائے میں کیا کروں؟ میری تو جیسے عقل ہی

جواب دے گئی....“

”کیا؟!“ بابر کہہ اٹھا۔

سن رسیدہ بیگ اب بھی خاموش نہ ہوا۔

”شاہ معظم، دراصل آپ کی ہمیشہ آپ کو اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتی ہیں۔ وہ آپ کے

کے کو ٹال نہیں سکتیں۔ میں آپ کی والدہ صاحبہ کے ساتھ صرف یہ عرض کرنے کے لئے حاضر

ہوا ہوں کہ شہزادی کو بلا کر ان سے اس مسئلے پر گفتگو کر لیجئے۔ ریاست کے مفادات کے مد نظر انہیں

راضی ہونا ہی چاہئے۔ عالی نسب بیگ احمد تہل نے پیغام بھجوایا ہے۔ انہیں اور ان کے سارے

خاندان کو شاہی عیادت کا انتظار ہے۔ انکار کر دیا جائے گا تو وہ آپ کی دشمنی پر اتر آئیں گے۔ اور

پھر ملکہ عالیہ کا خیال بھی درست ہے۔ شہزادی اگر مزید تین چار سال ناکتھار میں تو آپ کے دشمن افواہیں اڑانے لگیں گے: لڑکی بوڑھی ہوئی جا رہی ہے، کوئی دولہا ہی نہیں ملتا۔ ایسی افواہیں شاہی خاندان کے لئے مضرت ثابت ہوں گی! خان زادہ بیگم اگر آپ کی خیر خواہ ہیں تو انہیں ضرور راضی ہو جانا چاہئے۔ ضرور.....“

بابر نے اپنا سر ہتھیلیوں سے دبا لیا اور خاموش بیٹھا رہا۔ وہ سخت الجھن میں مبتلا تھا۔ اس نوعیت کے مسئلے سے اسے زندگی میں پہلی بار سابقہ پڑا تھا۔ کسی غیر کا معاملہ ہو تا تو کوئی بات نہ ہوتی لیکن یہ تو سگی بن کا معاملہ تھا..... اسے تو بن سے اس مسئلے پر گفتگو چھیڑنا تک نامناسب معلوم ہو رہا تھا..... دوسری طرف ماں اس کی مدد کی منتظر تھی..... ماں مدد کی منتظر تھی اور بن اپنی جان لینے پر تلی ہوئی تھی۔ کتنا بڑا گناہ سرزد ہو سکتا تھا!

”اچھی بات ہے“ آخر کار بابر نے جو کسی فیصلے پر نہیں پہنچ پا رہا تھا، کہا، ”ہمشیرہ صاحبہ میرے پاس آئیں گی تو میں ان سے تنہائی میں بات کر لوں گا۔“

قلعہ نگار خانم جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی:

”ابھی..... ابھی بھیجتی ہوں میں انہیں آپ کے پاس۔“

علی دوست بیک مسکرایا اور اس کے چھدرے دانت نمایاں ہو گئے۔

”حکمران کا فیصلہ حرف آخر ہے۔ سب کے لئے!“ اور اس نے اپنے چہرے پر درشتی طاری کر لی گویا بابر کو سمجھا رہا ہو کہ بن سے سختی سے پیش آتا۔ اور اس طرح بھائی بن کی ملاقات تنہائی میں ہوئی۔

بابر شش پایہ چوکی کے پاس جس میں سیپیاں جڑی ہوئی تھیں، بیٹھا دھیرے دھیرے کتاب کے اوراق الٹ رہا تھا اور اسے یہ خیال بھی نہیں آ رہا تھا کہ دونوں شمع دانوں میں سے کسی کی بھی روشنی صفحات تک نہیں پہنچ رہی ہے۔ خان زادہ بیگم اپنے زرد لباس میں بیمار بیماری سی نظر آتی ہوئی گدے پر بیٹھی ہوئی تھی۔

طبیعت کچھ ناساز ہے کیا؟“ بابر نے بات شروع کی۔

”میں حکمران سے اپنی اعانت و حفاظت کی امید رکھتی ہوں!“

خان زادہ بیگم کے مغموں چہرے پر آنسوؤں کے قطرات لڑھک پڑے لیکن اس کی آواز سے عزم جھٹک رہا تھا۔ بابر کا دل ایک بار پھر مضطرب ہوا تھا: عورتوں کی انگلیبازی اس سے دیکھی نہیں جاتی تھی۔ وہ پیچیدہ مسائل کچھ کم تھے کیا جن سے پہ سالار کے مقدر نے، ماوراء النہر کے اتحاد کے

علمبردار کے مقدر نے اسے دوچار کر رکھا تھا؟ اس نے بڑے درد و غم کے ساتھ کہا:

”اعانت کی ضرورت تو مجھے خود ہی ہے، ہشیرہ صاحبہ۔ میں تو خود ہی ان الجھنوں سے نکلنے کا راستہ تلاش کر رہا ہوں جنہوں نے مجھے گھیر رکھا ہے۔ جانے کیسی کیسی دشوار ذمے داریاں میرے سر پر آن پڑی ہیں۔ آپ اپنے آنسوؤں سے مجھے لاچار کر دینا چاہتی ہیں کیا؟“

خان زادہ بیگم نے فوراً ہی آنسو پونچھ کر خود پر قابو پانے کی کوشش کی:

”محترم امیر! میں نے سنا ہے.... کہ احمد تیل نے پہاڑوں پر مارے جانے والے گلے بانوں کے سر کاٹ لئے تھے اور ان سے بھرا ہوا بورا لے کر واپس لوٹا تھا....“

بابر کو اس نوجوان کا جس کی ابھی میس ہی بیگم رہی تھیں، خون سے لت پت سر یاد آگیا اور وہ چونک پڑا۔

”محرموں میں سر تو کتنے ہی ہیں“ اس نے بہن سے زیادہ خود کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”آخر ہمارے سپاہیوں کو بھی تو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔“

”میں تو اپنی سیدھی سادی زندگی کسی تعلیم یافتہ شخص کے ساتھ گزارنے کے خواب دیکھ رہی تھی۔ احمد تیل کے ہاتھ تو خون میں رنگے ہوئے ہیں، وہ تو قاتل ہے قاتل! عالی جاہ کیا واقعی اس شخص کو میرے لائق تصور کرتے ہیں؟“

”آپ کی جیسی صفات والا خاوند تو شاید دنیا میں کہیں بھی نہ ملے گا.... پھر بھی.... غالباً“ والدہ محترمہ نے آپ کو اس تجویز سے متعلق اسباب بتائے دیئے ہوں گے.... اور میں بھی مجبوراً آپ سے یہی التماس کر رہا ہوں۔“

خان زادہ بیگم نے شمعوں کی دھندلی روشنی کی طرف تکتے ہوئے اچانک احمد تیل کا اس کے بے ڈول جسم اور بالوں سے خالی چہرے کا تصور کیا، سوچا کہ اسے ایک ہی بستر پر اس شخص کی ہم خواب ہونا پڑے گا اور کراہت کے مارے اس کے بدن میں جھرجھری اٹگی۔ ”مجھے اس بیگ سے سے ڈر لگتا ہے!“

”آپ کو کسی سے خائف ہونے کی ضرورت نہیں، ہشیرہ صاحبہ۔ میں کسی کو آپ کا بال بھی بیکا نہ کرنے دوں گا!“

”لیکن آپ کی ہشیرہ کی شادی زبردستی ایسے شخص سے اتنے کمزور شخص سے کی جا رہی ہے۔ اس سے بڑا اور قاتل مداوا ظلم اور کیا ہو سکتا ہے؟“

بابر کا غم جواب دے گیا۔

”ظلم.... ظلم تو خود مقدر ہی ہے! مجھے دن بھر ایسے لوگوں کے درمیان رہنا پڑتا ہے جو مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتے۔ مجھے ایسے کاموں میں گھسیٹا جاتا ہے جنہیں میں کرنا نہیں چاہتا۔ لیکن میں اپنی حکومت کے اپنے اور النہر کے مفادات کے متعلق سوچتا اور.... خود پر جبر کرتا ہوں۔“

دونوں کچھ یوں اپنی اپنی کے جارہے تھے جیسے دوسرے کی بات سن ہی نہ رہے ہوں حالانکہ خان زادہ بیگم بھائی کے خیالات کو بہتر طور پر سمجھ رہی تھی اور اسے بھائی کے حالات پر افسوس بھی زیادہ ہو رہا تھا۔ اسے اچانک یاد آگیا کہ بھائی جب چھوٹا سا تھا تو اسے کتنی محبت سے گود میں لے کر کھلایا کرتی تھی۔

”بابر جان، میرے واحد برادر، میرے تمہان، میں تو آپ کی خاطر اپنی جان تک قربان کرنے کو تیار ہوں! میں تو آپ کی خاطر احمد تہل سے بھی شادی کرنے کو راضی ہو سکتی ہوں۔ لیکن میں آپ کے ہمدرد دل سے بخوبی واقف ہوں۔ اگر میں تمام عمر نصیبوں ماری ہی رہی تو آپ کا دل میرے اپنے دل کی بہ نسبت کیس زیادہ پریشان رہے گا۔“

”لیکن میں خدا سے دعا کرتا اور یقین رکھتا ہوں کہ آپ نصیبوں ماری نہ رہیں گی!“

”میں نے اس شخص سے شادی کر لی تو میری ساری زندگی روتے روتے ہی کٹے گی، بابر جان، یقین مانئے! اور جہاں تک ماور النہر کے مفادات کا سوال ہے تو.... تاجدار بھی انسان ہی ہوتا ہے، اسے بھی جینے کو بس ایک ہی زندگی ملتی ہے.... ہمیں اپنے دل کی آواز پر کان لگانا چاہئے! صاف دل کبھی بھی دغا نہیں دیتا!“ خان زادہ بیگم نے یہ سب اتنی ایمانداری، مگر جوشی اور تندی و تیزی کی ساتھ کہا کہ اس کے دل کی آگ بابر کے دل تک بھی پہنچ گئی۔ بے رحم بیک، سلطنت سے متعلق فرائض، اقتدار کو مستحکم کرنے کی آرزوئیں۔ اف، کس بلا کی سردی کے موسم سرا جیسا تھا یہ سب! خان زادہ بیگم نے اس برف کو پکھلا دیا جس نے بابر کے دل کو جکڑ رکھا تھا۔ اس کے دل میں ایک بار پھر فصل بہاراں کی حرارت اور نوجوانی کی آزادی واپس آگئی اور سینے کا بار ہلکا ہو گیا۔

خان زادہ بیگم نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ کہا:

”آپ بڑے صاف دل، باصلاحیت اور صاحب ایثار نوجوان ہیں، بابر جان!.. اور ان بیگوں نے اپنے نئی مفادات کو مفادات سلطنت بتانا اپنا وتیرہ بنا لیا ہے۔ یہ لوگ دراصل آپ کی کم سنی سے ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ لیکن یہ آپ کو جب آپ کی مرضی کے خلاف کسی اقدام پر مجبور کیا کریں تو میں التجا کرتی ہوں کہ آپ اپنے دل کی آواز پر ضرور کان لگایا کیجئے۔ آپ کا یہ صاف دل بہترین مشیر ہے۔ یہ کبھی فریب نہ دے گا!“

اور اس نے اپنا ہاتھ بھائی کی طرف بڑھا دیا:

”میں آپ کے اس صاف دل سے انصاف کی متوقع ہوں، محترم امیر۔ آپ کا دل جو حکم آپ کو دے وہی آپ مجھے دیجئے۔ میں ایسے ہر حکم کی تعمیل کروں گی!“

بابر تیزی سے گدے پر سے اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے بہن کا ہاتھ تمام کر اسے بھی کھڑا کر دیا۔
 ”بہت رو چکیں، اب رہنے بھی دیجئے!“ اس نے چپکے سے کہا اور بمشکل اپنی سسکیوں کو ضبط کر سکا۔ ”میری واحد، میری سگی، ہمیشہ مجھے سارے بیگلوں سے کہیں زیادہ عزیز ہیں۔ انکار کرنے سے کیسی بھی مصیبت کیوں نہ نازل ہو، میں ساری ذمہ داری اپنے اوپر لے لوں گا۔ جب تک میں زندہ ہوں اس وقت تک اپنی ہمیشہ کی شادی کسی ایسے شخص سے ہرگز نہ ہونے دوں گا جسے وہ پسند نہیں کرتیں!“

سمرقند

1

بابر کے لشکر نے پورے موسم گرما اور پھر ساری خزاں میں سمرقند کا محاصرہ جاری رکھا۔ بائے ستور نے پورے سات مہینوں تک شہر کے پھانک نہ کھولے۔ آخر کار جب اہل سمرقند کی بھوک اور دوسری بہت سی تکالیف کے دردناک نظارے اس کے لیے ناقابل برداشت ہو گئے تو وہ موسم سرما کی ایک رات کو درالحکومت چھوڑ کر اپنے مٹھی بھرا عزا و مقرین کے ساتھ چوری چھپے خرو کے پاس شہر حصار بھاگ گیا۔

سمرقند کے بیگلوں کو جیسے ہی اپنے حکمران کے فرار ہو جانے کا علم ہوا ویسے ہی انہوں نے حکم دیا کہ شہر کے پھانک کھول دئے جائیں۔

بابر تین ہزار سے زائد پوری طرح مسلح فوجیوں کے ساتھ جو اس کے سمرقند لائے ہوئے لشکر جرار کا صرف ایک حصہ ہی تھے، نقاروں اور قرتاؤں کی گونج کے دو درمیان شہر میں داخل ہو گیا۔ اس نے دنیا کے اس عجوبے کو پہلی بار پانچ سال کی میں دیکھا تھا اور اب دوسری بار دیکھنے پر ٹھیک سے یاد نہیں آ رہا تھا کہ سمرقند میں کون سی چیز کہاں پر ہے۔ اسے اپنی نگاہوں کے سامنے شاندار گنبد برف کی نیگیوں چٹانوں کی طرح فضاؤں میں حیرتے ہوئے سے نظر آئے تو اس نے قاسم بیگ سے

دریافت کیا کہ ان میں سے کون سا گنبد الخ بیگ مدر سے کا ہے اور کون سا بی بی خانم مسجد کا۔ دستے قلعے کی فصیل کے قریب ٹھہر گئے اور بابر مسخور ہو کر گور امیرؒ کے حیرت انگیز طور پر خوبصورت گنبد کو اپنے ان عظیم آبا و اجداد کے مقبرے کو دیکھنے لگا جن کے کارناموں کی یادیں اس کے اندر شہرت کی بھوک کو بھڑکاتی رہتی تھیں۔ اس گنبد کو اس نے کسی کے بتائے بغیر خود ہی پہچان لیا۔ سلسلہ عمارات کے پردہ قارنظارے اور واضح بیردنی خطوط پر بابر کا دل عیش عیش کر اٹھا۔

نیلے پر سے جہاں شہر کا قلعہ واقع تھا، بابر کو برآمدے دار بے شمار مکانات، سڑکیں اور گلیاں صاف صاف نظر آرہے تھے۔ وہ دور تک پھیلی ہوئی اس انسانی رہائش گاہ پر نظریں جمائے ہوئے تھا کہ اتنے میں اچانک اس کے دل میں ٹیس سی اٹھی: انہی بے شمار مکانات میں سے کسی ایک کے جھروکے سے اس کی منگیتر عائشہ بھی اس کو فاتح کو دیکھ رہی ہوگی۔ پجاری اپنی قید کے تمام مصائب سے نجات پا چکی تھی، اب اس کی منتظر تھی لیکن کیا سپاہیوں کی اس بھیڑ بھاڑ میں اسے پہچان بھی سکتی تھی؟

”بابر اپنے گھوڑے پر قاسم بیگ کے نزدیک پہنچا اور دھیرے سے پوچھا:

”آپ نے کسی کو یہ معلوم کرنے کے لیے بھیجا کہ قیدی کس حال میں ہیں؟“

قاسم بیگ سوال کے خفیہ مفہوم کو فوری طور پر نہ سمجھ سکا۔

”عالی جاہ، یہ آپ کن قیدیوں کے متعلق فرما رہے ہیں؟“

بابر کو قاسم بیگ سے جو عمر کے اعتبار سے اس کے والد جیسا تھا۔ منگیتر کا تذکرہ کرتے جھینپ سی محسوس ہوئی۔ اس نے کچھ عجب ڈھنگ سے شرما کر نظریں جھکا لیں۔ بات قاسم بیگ کی سمجھ میں آگئی:

”جی ہاں، قیدی.....! قیدیں!“ اس نے وہ لفظ ادا کر دیا جسے بابر زبان پر نہیں لاسکا تھا۔ ”میں

نے آپ کو نوینان کو کھٹاش کو یہ معلوم کرنے کے لیے بھیجا ہے کہ سلطان احمد مرحوم کی صاحبزادیوں پر کیا ہوتی۔ حکمران کو شام تک تفصیلات کا علم ہو جائے گا۔“

وہ لوگ قلعے کے اندر داخل ہوئے جہاں سب سے وسیع اور عالی شان عمارت نیلگوں محل کوک سرائے کی تھی۔ کوک سرائے میں قیام کے دوران متعدد تاجدار موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے تھے، یہ عرصے سے حکمرانوں کے دلوں پر بیت سی طاری کرتا آ رہا تھا اسی لیے سر قند کے کئی سابق حکمرانوں نے اس میں رہائش نہیں اختیار کی تھی۔ وہ کوک تاشؒ پر چڑھتے اور محل سے باہر چلے آتے تھے۔ بابر نے بھی قلعے کے دائیں حصے والے محل میں قیام کا فیصلہ جو بستاں سرائے کہلاتا تھا۔

شام کو جب بستیاں سرائے میں شمعیں روشن کر دی گئیں تو نویان بابر کی خواب گاہ میں آیا۔ یہ کمرہ ہر جگہ گلٹ کا کام ہونے کے باوجود کافی سرد تھا۔ یہاں گدے تو شک و غیرہ کافی بچھے ہوئے تھے پھر بھی پوسٹین اور گرم کلاہیں اتارے بغیر ہی گفتگو کرنی پڑی۔

نویان کو کلتاش کے لہجے میں دھیرے دھیرے مگر جوشی پیدا ہوتی گئی اور وہ بے تصنع ہو گیا۔ بابر کے عثمان سلطنت سنبھالنے کے بعد سے اس کے نویان جیسے ہم عمر احباب کی اہمیت گھٹنے لگی تھی۔ بادشاہ احباب سے نہیں بیگوں سے گھرا رہتا تھا۔ دستور ہی کچھ ایسا تھا۔ لیکن آج بابر اور نویان دوبارہ ایک دوسرے کے قریب آگئے تھے جس سے دونوں ہی کو مسرت ہو رہی تھی۔

نویان نے بڑے جوش و خروش سے بتانا شروع کیا:

”حکمران کے طرف سے طلائی نکلن..... طرح طرح کے قیمتی ملبوسات، جی ہاں، اور خوبانیاں، بادام کی شیرینیاں، سب کچھ پیش کیا گیا۔ خود آپ کی بڑی خالہ جان مرنکار خانم صاحبہ نے استقبال کیا۔“

مرنکار خانم قلوغ نکار خانم کی بڑی بہن اور مرحوم سلطان احمد کی بڑی بیگم تھی۔ عائشہ بیگم کی ماں کا جوانی ہی میں انتقال ہو گیا تھا اور عائشہ کی پرورش مرنکار خانم نے ہی کی تھی جس کے اپنے بچے نہیں تھے۔ اب بھی وہ سگی ماں کی طرح عائشہ کا خیال رکھتی تھی۔ بابر یہ سوچ کر خوش ہو گیا کہ اس کی خالہ اس کی ساس بھی ہو جائے گی۔

”سو کہ کر کاٹنا ہو گئی ہیں“ نویان نے بتایا۔ ”ان کے ہاں تو ناقوں پر فالتے ہوتے تھے، بچاریوں نے روٹی تو جانے کب سے دیکھی تک نہیں تھی۔“ آٹا سونے کے عوض بھی نہیں میسر ہوتا تھا“ خانم نے مجھ سے کہا اور رو پڑیں پھوٹ پھوٹ کر روئیں۔ کسنے لگیں کہ پیٹ کی آگ چوکر کی روٹیوں سے بجھایا کرتی تھیں۔ ان کے ہاں لکڑیاں بھی نہیں ہیں، سردی کے مارے ٹھنڈ رہی ہیں۔“

”خواتین کے ساتھ بائے ستور نے واقعی اتنا بے رحمانہ سلوک کیا؟“

”خود مرزا بائے ستور کو بھی تو آخری دنوں میں پیٹ بھر کھانا نہیں نصیب ہوتا تھا.... پورے سات مہینوں تک محاصرے میں رہتا کوئی ہنسی ٹھنٹھا تھوڑی ہے! سڑکوں پر لاشیں پڑی رہتی تھیں۔ شر شدید غذائی قلت کا شکار تھا.... غریب لوگ تو کتوں تک کو کھنا گئے۔ ہمیں ان ساری باتوں کی پوری طرح خبر نہیں ہو سکی تھی.... میں نے ان لوگوں کے ہاں سے واپس لوٹنے ہی قاسم بیگ صاحب سے ملاقات کر کے مختصر ساری صورت حال بتادی ہے۔ ایک اراہہ آٹا، چاول، ایک اراہہ

لکڑیاں اور دس بھیریں۔ یہ سب میں نے اپنی نگرانی میں خانم صاحبہ کی ہاں پہنچادیا اس کے بعد ہی آپ کی خدمت میں حاضر ہو سکا ہوں۔“

نویان کو کلتاش چند لمحات تک خاموش رہا پھر پر اسرار انداز سے مسکرایا۔ اب وہ عائشہ بیگم کا تذکرہ کرنے جا رہا تھا۔ بابر نے بے مبری سے ہاتھ جھٹک دیا۔

”بتاؤ، نویان، بتاؤ، بھی۔۔۔۔“

”گھٹ کے کام کے دیوان خانے میں جو تقریباً ایسا ہی تھا“ نویان نے دیواروں پر نظریں دوڑاتے ہوئے کہا، ”سفید جالی دار برقعے میں ملبوس عائشہ بیگم نے ملاقات کی۔۔۔“ نویان ایک بار پھر خاموش ہو گیا۔ دراصل عائشہ بیگم اسے پسند نہیں آئی تھی۔ نقاب سے ڈھکے ہوئے چہرے کو تو وہ نہیں دیکھ سکا تھا پر قد بہت چھوٹا سا تھا اور دہلی سی نظر آئیں۔ ”خوش آمدید“ انہوں نے کہا اور ان کی آواز بڑی شیریں، نازک اور صاف تھی۔“

”کیسی بے انصافی ہے یہ!“ بابر نے سوچا۔ وہ عائشہ کی یاد میں تڑپا ہوا اندجان سے سر قند تک اُگیا تھا لیکن اس سے فوری طور پر ملاقات نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی اجازت ہی نہ تھی، دونوں کے درمیان رسم و رواج کی دیواریں حائل تھیں۔ وہ ملاقات کرنا تو چہ میگوئیاں ہونے لگتیں، اس کی بے مبری سے عائشہ کے رشتے داروں کو نہیں پہنچ سکتی تھی۔

لیکن نویان کو کلتاش کے چہرے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اس بے انصافی کا علاج اس کے پاس موجود ہے۔ اس نے اپنی بظلی جیب میں ہاتھ ڈال کر سفید ریشم کی ایک چھوٹی سی تھیلی نکالی۔

”عائشہ بیگم کی طرف سے آپ کو یہ تھیلی آپ کی خالہ جان نے بھیجی ہے۔“

بابر نے تھیلی لے کر ٹٹولی تو خالی سی لگی لیکن جب اس نے منہ پر بندھی ہوئی ڈوری کھول کر اسے الٹا تو اس کی تھیلی پر ننھے ننھے دو ہیرے گر پڑے۔ دونوں ہی قطرات شبنم سے ذرا ہی بڑے لیکن اپنی جسامت کو دیکھتے ہوئے خاصے وزن تھے۔ ان کی تابانی راحت و حرارت بخش رہی تھی۔

”ذرا اسے الٹ کر تو ملاحظہ فرمائیے“ نویان نے کہا۔

تھیلی کے اوپر چھوٹے چھوٹے دانے خوبصورتی سے ٹنکے ہوئے تھے اور اندر ریشم سے بڑی نفاست کے ساتھ دو ایک الفاظ کڑھے ہوئے تھے جنہیں بابر پہلی نظر میں نہ دیکھ سکا۔ بس دو ایک ہی لیکن کتنے شاندار الفاظ! ”نجات دہندہ کے لیے“ اور بابر کو یہ الفاظ عشقیہ اشعار سے بھی زیادہ لطیف و شیریں معلوم ہوئے صاف ظاہر تھا کہ عائشہ بیگم نے یہ الفاظ پہلے ہی سے کاڑھ رکھے تھے، نویان کی موجودگی میں اس کشیدہ کاری کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔ اس کا مطلب تو یہ تھا کہ بابر آکر

اسے نجات دلائے گا!

”اب ذرا ان ہیروں کا قصہ سنئے جو آپ کی ہتھیلی پر رکھے ہوئے ہیں“ نویان نے بے تکلفی سے بات جاری رکھی۔ ”آپ کو معلوم بھی ہے کہ یہ ہیرے کیسے ہیں؟ یہ وہی ہیرے ہیں جو سلطان احمد مرحوم کے تخت نشینی کے وقت ان کی دستار کی زینت دوایا کر رہے تھے! ان کی صاحبزادی کی آرزو تھی کہ یہ ہیرے آپ کے ساتھ ہی ایک بار پھر تخت سمرقند پر درخشندہ ہوں۔ خدا کرے یہ آپ کے سر پر مزید سو برسوں تک چمکتے رہیں!“

سلطان احمد کے اس تذکرے سے بابر اداس ہو گیا: ابھی کچھ عرصے قبل شاہ سمرقند زندہ تھا، اس نے بابر کے کچھ علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا اور بابر کو اس سے صلح کرنی پڑی تھی، فتح کے بغیر ہی صلح۔ لیکن ہیروں کی تابانی اتنی صاف و شفاف تھی کہ ان کی شعاعوں میں اسے اپنی منگیتری کی آنکھوں کا نور نظر آنے لگا۔ عائنہ اس کی منتظر تھی!.... اور اب۔ اب تو وہ بہر حال ظفریاب ہو چکا تھا؟

”عائنہ بیگم کی یہ آرزو ہے تو خدا کرے ایسا ہی ہو!“ بابر نے کہا۔ پھر اس نے تالی بجا کر دستار پہنچ کر طلب کیا۔

دستار پہنچنے نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ ان ہیروں کو بابر کی اس دستار میں جڑ دیا جسے وہ خاص تقریبات کے موقع پر استعمال کیا کرتا تھا۔

اسی شام کو بابر نے اپنی منگیتری سے ملاقات کے اشتیاق میں ایک غزل کہنے کی ابتدا کی:

حسن کا تیرے ہے چرچا ہر جگہ پر ماہ رو
وصل تیرا مجھ کو کب ہوگا میسر ماہ رو

۲

موسم سرما کی برفیلی ہوائیں ہڈیوں تک سرایت کرتی جا رہی تھیں۔ سمرقند کے خاص چوک ریگستان میں چھتروں میں لمبوس پاہ جولان قیدی جنہیں قاضی شمر کی دی ہوئی سزا سننے کے لیے تھیں لایا گیا تھا، کھڑے کھڑے ٹھہر رہے تھے۔

معتبر عہدیداروں نے ثابت کر دیا تھا کہ یہ لوگ فریب دی جیسے سنگین جرم کے مرتکب ہوئے ہیں۔ سمرقند کے محاصرے کے دوران انہوں نے ایک شخص کے ذریعے بابر کے پاس یہ پیغام بھیجا تھا کہ رات میں باب فیروز پر آئے، ہم اسے آپ کے لیے کھول دیں گے۔ لیکن دس بہادر سپاہیوں نے غار عاشقان کے قریب پہنچ کر جیسے ہی فسیل پر چڑھنا شروع کیا دیسے ہی ان لوگوں نے انہیں پکڑ کے بائے ستور کے سپاہیوں کے حوالے کر دیا تھا۔

”وہ ہم نہیں تھے، ہم نہیں تھے..... جن لوگوں نے غداری کی تھی، آپ کے سپاہیوں کو گرفتار کرادیا تھا، وہ تو بھاگ کھڑے ہوئے! جبراً“ لائے گئے ان لوگوں میں سے ایک نے خوف پر قابو پاتے ہوئے چلا کر کہا۔

لیکن اس کی اس بات پر کسی نے بھی کان نہ دھرے۔ جلاؤ شاہی فرمان اور دشمن کو سزا دینے سے متعلق اپنے آباؤ اجداد کی روایات پر مبنی قانون کے بموجب مجرموں کی مٹکلیں باندھ کر انہیں یکے بعد دیگرے اسی مقصد کے لیے خاص طور سے کھودے گئے گڑھے کے کنارے لا کر گھنٹوں کے بل بیٹھنے اور سر جھکانے پر مجبور کرنے لگا۔ گردن پر تلوار کا ایک وار پڑتا اور سزائے موت پانے والے کا گرم خون سرد ماحول میں گرم بھاپ سی چھوڑتا ہوا چوک کے پتھروں پر پھیل جاتا تھا۔ گڑھا پات دیا گیا اور تمام شب گرنے والی برف نے اپنی سفید چادر سے جو آنکھوں کو خیرہ کئے دے رہی تھی، سزائے موت کے سارے نشانات ڈھک دیئے۔

نماز ظہر کے بعد باہر گھوڑے پر سوار ہو کر سرفرد کے بازاروں کو دیکھنے کے لیے نکلا۔ قاسم بیک اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا اور کچھ فاصلے پر احمد تہل، ایک دوسرا بیک خان قلی اور کچھ سپاہی پیچھے پیچھے تھا۔ سن رسیدہ شاعر جو ہری بھی ان کا ہم رکاب تھا جو شہر کے کوچے کوچے سے بخوبی واقف تھا۔

وہ لوگ مسافروں اور سیاحوں کے قیام کے لئے الخ بیک کی تعمیر کرائی ہوئی عالی شان گنبد والی خانقاہ کے پاس سے گزرنے لگے تو جوہری نے مشرقی دروازے کی سمت جاتے ہوئے راستے کی طرف اشارہ کیا۔

”میر علی شیر جب سرفرد آئے تھے تو اس راستے سے کئی کئی بار گزرتے تھے۔ اس کے سرے پر وہ عمارت آج بھی موجود ہے جس میں میر علی شیر کے استاد عبداللیث کام کیا کرتے تھے۔“

”تو کیا آپ بھی علی شیر کے ساتھ گفتگو میں شریک رہ چکے ہیں؟“ باہر نے دریافت کیا۔

”جی ہاں۔ ویسے تو میں ان کا ہم عمر ہوں لیکن انہیں اپنا استاد تسلیم کرتا ہوں۔ میں انہیں اپنے اشعار سنا تا تھا اور وہ ہمیشہ ہی نیک مشورے دیتے تھے۔ پتا چلا کہ انہوں نے مجھے فراموش نہیں کیا، اپنے مشہور شاہکار ”مجالس النفاکس“ میں انہوں نے آپ کے اس خادم کا بھی تذکرہ کیا ہے۔“

باہر کو سفید ریش جوہری سے جس کی بھویں تک سفید ہو چکی تھیں، قدرے رشک کا احساس ہوا۔ اس نے سوچا کاش وہ بھی اس پائے کا شاعر ہوتا کہ اس پر نوائی توجہ مبذول کرتے! دراصل ابھی وہ اس میدان میں مشق سخن کی منزل سے آگے نہیں بڑھ سکا اور اپنے کئے ہوئے اشعار

دوسروں کو سناتے ہوئے شرماتا ہے..... ”یہ تو واقعی درست ہے لیکن مشہور و معروف شاعر بننے کے خوابوں کو میں کبھی بھی ترک نہ کروں گا۔ یہی تو سبب ہے کہ میں نے ”باہر مسکرایا“ اپنے ہم رکاب کی حیثیت سے سمرقند کے کسی ممتاز بیگ کو نہیں بلکہ اس سن رسیدہ شاعر کو مدعو کیا ہے جو علی شیر نوائی کا ہم عصر ہے اور ان سے باتیں کر چکا ہے۔“

جوہری ان لوگوں کو نانبائیوں کے محلے میں لے گیا۔ گلیاں سنسان پڑی ہوئی تھیں۔ ان کی برف کو ہٹانے کے لئے کسی نے ہاتھ تک نہیں لگایا تھا اور کہیں کہیں تو برف کے اتنے اونچے اونچے انبار لگے تھے کہ گھڑسواروں کے جوتوں کی نوکوں کو چھو رہے تھے۔ سائے میں ہوائیں چروں کو منجمد کئے دے رہی تھیں اور جہاں دھوپ پڑ رہی تھی وہاں کچی اور پکی دیواروں کے نیچے پکھلی ہوئی برف کے ڈبرے سے بن گئے تھے۔

باہر نے چھوٹے چھوٹے گھروں کی ہموار چھتوں پر نظریں دوڑائیں۔ وہاں سے بھی برف صاف نہیں کی گئی تھی۔ کہیں ایک بھی متنفس نظر نہیں آ رہا تھا۔ یہ لوگ نان فروشوں کے بازار میں گئے تو وہاں بھی یہی صورت حال نظر آئی: ساری کی ساری دکانیں بند پڑی تھیں۔ باہر حیرت میں پڑ گیا:

”جوہری صاحب، نانبائی کسی دوسرے شہر کو چلے گئے کیا؟“

جوہری نے ٹھنڈی سانس بھری۔

”عالم پناہ، نانیں تو بازار میں تین مہینوں سے نہیں لائی جا رہی ہیں۔ آٹا ہی نہیں۔ محاصرے کے دوران جانے کتنے ہی نانبائی بھوک سے تڑپ تڑپ کر چل بے۔ لوگ اتنے نحیف و لاغر ہو گئے ہیں کہ کسی میں اپنے گھر کی چھت پر چڑھ کر برف ہٹانے تک کی سکت باقی نہیں۔“

باہر کو ایسا لگا جیسے جوہری ان افسوس ناک حالات کے لئے اسے قصور وار تصور کر رہا ہو۔ اس نے اپنی حمایت یا پوچھے نہ جانے والے سوال کے جواب کی توقع میں عادتاً قاسم بیگ کی طرف دیکھا۔ قاسم بیگ نے شاعر سے سرزنش بھرے لہجے میں کہا:

”پھر بھی شاید کچھ نانبائی تو زندہ بچے ہی ہوں گے؟“

جی ہاں شاید کچھ بچ گئے ہیں۔ لیکن انہیں مدد کی ضرورت ہے۔ انہیں اس وقت آٹا ویئے جانے کا حکم جاری ہو جائے تو شاید یہ بازار دوبارہ کھل جائے اور لوگوں کو مشہور سمرقندی نانیں میسر ہونے لگیں.....“

”عالی جاہ، ہمارے پاس تو خود اپنے استعمال کے لئے بھی تھوڑا ہی سا غلہ رہ گیا ہے۔ لشکر کو رسد کی ضرورت ہے۔ فروخت کرنے کے لئے تو ہم آٹا نہیں دے سکتے۔ ممکن ہے بعد میں.....“

سن رسیدہ شاعر نے اپنی پر امید نگاہیں بابر کے چہرے پر جمادیں۔ جانے یہ بوڑھے، بے ڈول
 شانوں کو ڈھکتے ہوئے بانات کے سیاہ چونے کی وجہ سے ہوا یا پھر جوہری کی ترشی ترشائی چھوٹی سی
 واڑھی کی وجہ سے۔ بہر حال بابر کو شاعر میں نوائی کی اس تصویر سے کچھ کچھ مماثلت نظر آنے لگی جو
 محمود مذہب نے بنائی تھی۔ اس کے دل میں خیال آیا کہ جوہری کی توقعات پر پورے نہ اترنے کا
 مطلب یہ ہوگا کہ وہ نوائی کی توقعات پر پورا نہیں اترتا۔ اور اس نے رکابوں پر اپنے جسم کو کچھ بلند
 کر کے قاسم بیگ سے تحمانہ لہجے میں کہا:

”غلہ اور آٹا تاجروں کو نہیں بلکہ نانباٹیوں کو فراہم کیا جائے۔ کوئی معتبر شخص ان پر نگاہ رکھے،
 وہ نائیں پکائیں اور یہ روٹیاں ان افراد میں جو سب سے زیادہ بھوکے ہوں، ہماری طرف سے تقسیم
 کردی جائیں! پانچ چھ بورے آٹے سے لشکر کی رسد میں کوئی کمی واقع ہونے سے رہی۔ جرنل سے
 غلہ لانے والا کارواں توکل پرسوں تک یہاں پہنچ ہی جائے گا۔“

”پروردگار آپ پر برکتیں نازل کرے، عظیم فرماں روا!“ جوہری نے خوش ہو کے کہا۔

خوش بس ایک وہی ہوا۔ احمد تہل اپنے موٹے ٹکڑے گھوڑے کی لگام کھینچ کر کافی واضح طور پر

بدیادیا:

”اتنا زیادہ غلہ آئے گا کہاں سے جس سے بائے ستور کے چھوڑے ہوئے سارے مربھکوں کا
 پیٹ بھرا جاسکے؟ ہم یہاں انہیں شکم میر کرنے کے لئے تھوڑی آئے ہیں۔“

جب سے اوش میں پیغام لے کر جانے والے بابر کے ہاں سے خالی ہاتھ لوٹے تھے اور خان زادہ
 بیگم احمد تہل سے شادی کرنے پر راضی نہیں ہوئی تھی تب سے یہ بیگ بابر کے خلاف کچھ اور زیادہ
 نفرت کے ساتھ کارروائیاں کرنے لگا تھا لیکن چوری چھپے، ”میرے لاثانی حکراں“ جیسے فقروں کے
 ساتھ بابر بار کئے جانے والے اپنے سجدوں کی آڑ میں۔

”محترم بیگ“ بابر نے کچھ اور زیادہ فخر سے سینے کو تاتے ہوئے کہا، ”یہ توجہ ہے کہ ہم اہل سر
 قد کا پیٹ بھرنے کے لئے نہیں آئے لیکن انہیں لوٹنے کے ارادے سے بھی نہیں آئے ہیں!“

تہل اس اشارے سے سہم کر رہ گیا۔ گزشتہ روز اس کے سپاہی جوہریوں کی دکانیں لوٹ چکے
 تھے۔ اس کی آنکھیں سکر گئیں لیکن اس نے دوسرے ہی لمحے اپنے چہرے پر پرسکون ہونے کا تاثر
 پیدا کرنے کی کوشش کی۔

”بالکل بجا فرمایا آپ نے، میرے عظیم اور لاثانی حکراں“ اس نے کہا۔ ”میں صرف یہ
 دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ ہمیں کچھ مال غنیمت حاصل کرنے کا حق ہے کہ نہیں؟ فاتح کو مال غنیمت

پانے کا قانون ”حق حاصل ہوتا ہے“ یہ تو ہمارا قدیم دستور ہے!“

تبل کی بات سپاہیوں کے درمیان کھڑے ہوئے خان قلی بیگ کو بھی پسند آئی جس کا اظہار اس کے سر ہلانے اور مسکرانے سے ہو رہا تھا۔ زیادہ تر سپاہی بھی تبل سے متفق تھے: اگر سب بیگوں ہی کے ہاتھ اتنا مال نہ لگا جس سے وہ مطمئن ہو سکیں تو پھر سمرقند کو ”فتح“ کرنے والے معمولی سپاہیوں کو کیا ملے گا؟ یہ کوئی چھوٹا موٹا گاؤں تو ہے نہیں۔

باہر جاتا تھا کہ اس کے لشکر میں غیر مطمئن فوجی بھی شامل ہیں۔ لیکن بیگوں کو کھلی چھوٹ دے دینے کا مطلب یہ ہوتا کہ اہل سمرقند جو اب اس کی رعایا تھے، بھوک سے تڑپ تڑپ کے مرجاتے۔ دوسری طرف رعایا کو بھوکوں مرنے سے بچانے کی کوشش کرتے ہی بیگ اور سپاہی گلا چھاڑ پھاڑ کر چلانے لگتے:

”اے ہم سب! ہمارا حصہ آخر کیوں دیا جا رہا ہے؟“

باہر نے قاسم بیگ پر نظر ڈالی لیکن وزیر گویا کہ محض اتفاقی دوسری طرف دیکھنے لگا۔
 ”شدید غذائی قلت کا باعث صرف بائے سنتور ہی تو نہیں، ٹھیک ہے نا؟“ باہر نے نرمی سے کہا۔ ”اگر ہم سات مہینوں تک سمرقند کا محاصرہ نہ کئے رہتے.....“
 قاسم بیگ نہیں چاہتا تھا کہ باہر تبل جیسے قابل نفرت شخص کے سامنے اپنی صفائی پیش کرے۔ اس نے اس گفتگو کو واحد ممکن طریقے سے ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔

”شاہ والا شان کا ایک ایک لفظ ہمارے لئے فرمان ہے۔ بحث سے کوئی فائدہ نہیں! نانبائیوں کو کل ہی عمدہ آٹا دیا جائے گا اور غریبوں میں نانوں کی تقسیم کی نگرانی میں خود کروں گا!“
 باہر نے اپنے وزیر کو تشکر آمیز نگاہوں سے دیکھا۔

”چلے، یہ مسئلہ تو حل ہو گیا“ اس نے مطمئن ہو کر کہا اور پھر شاعری طرف مڑ کر اضافہ کیا:
 ”آئیے کتابوں کی دکانوں میں چلیں۔“

شاعر جو ہری ان لوگوں کو ٹیڑھی میزھی گلیوں سے لے گیا اور وہ اچانک ایک کشادہ چوک پر پہنچے جہاں کتابوں کی دکانیں اس طرح بند تھیں کہ دروازوں کے اوپر تختے جڑ دیئے گئے تھے۔ دفعتاً ”شور سنا دیا“ فضا میں کچھ واضح چیخیں بلند ہوئیں اور دکانوں کے عقب سے ایک برزنہ، برزنہ پاضیفہ نکل کر بھاگی۔ اس کی آنکھیں پاگلوں کی آنکھوں کی طرح پھٹی پھٹی سی تھیں اور کوئی ادھیڑ عمر کا آدمی اس کا تعاقب کر رہا تھا۔

”ہائے! ہائے! اللہ اسے عارت کرے جس نے میرے بچے کی جان لے لی! خدا کرے وہ بھی

بھوک سے تڑپ تڑپ کر مرے!“

گھڑسواروں پر نظر پڑتے ہی وہ دونوں بے حس و حرکت کھڑے ہو گئے۔ مرد تو حیران و ششدر نظر آنے لگا اور ضعیفہ نے چلا چلا کر کوسنا شروع کر دیا:

”یا اللہ! وہ خود غارت ہو جائے ایسے ہی محاصرے میں! میرے بچے ہی کی طرح بھوکوں مر جائے! گل سڑ جائے!“

”ارے قطب الدین کیا ہوا؟“ جوہری نے پکار کر مرد سے پوچھا۔

تب کہیں جا کر مرد کو جیسے ہوش آیا۔ اس نے لپک کر نحیف و لاغر عورت کا ہاتھ پکڑا اور اسے دکان کے پیچھے احاطے میں ٹھیسٹ لے گیا۔ اس کے بعد وہ دھنوں ہاتھ سینے پر رکھے، ہانپتا ہوا گھڑسواروں کے پاس واپس لوٹا۔

”معاف کر دیجئے، معاف کر دیجئے۔ یہ میری بھالی ہیں، بچاری بیٹے کے غم میں پاگل ہو گئیں۔ ہمارے ہاں ناقوں پر فاقے ہو رہے تھے۔ میرے بھتیجے نے کھلی کھالی، اس کا سارا جسم پھول گیا اور وہ چل بسا۔“

بڑی تکلیف دہ خاموشی چھا گئی۔

”اور لوگ ان بد نصیبوں کو اور بھی لوٹنا چاہتے ہیں، مال غنیمت کی باتیں کر رہے ہیں!“ بابر نے یہ کہتے ہوئے کسی پر نگاہ نہیں ڈالی تھی لیکن احمد تیل اور خان قلی نے جلدی سے نظریں چار کیں اور ان کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔

قطب الدین شہر کا مشہور کتب فروش تھا۔ جب اسے جوہری نے بتایا کہ اس کے پاس کون اور کس ارادے سے آیا ہے تو اس نے فوراً ہی دکان کھول دی اور بابر گھوڑے سے اتر کر شاعر کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ دکاندار نے کسی غلت کے بغیر طاقوں پر سے نادر قلمی نسخے اتار اتار کر ان پر کافی دنوں سے جمی ہوئی دھول پونجی۔ پھر وہ کتابیں بابر کو پیش کرنے اور ان کے متعلق مختصر اُبتانے لگا۔۔۔۔۔ یہ بیش قیمت سنہری جلدوں والی کتابیں محمود کا شغری اور عبدالرحمان جامی کی ہیں۔۔۔۔۔ اور یہ ربی عروض کے متعلق نوائی کی تصنیف ”میزان الادزان۔“ یہ وہ کتاب تھی جس کا بابر کافی دنوں سے تلاشی تھا اور دریافت کر تا رہتا تھا کہ کس سے خریدی جاسکتی ہے۔ دراصل دکان میں زیادہ تر نو کتابیں ایسی تھیں جو اس کے کتب خانے کی زینت بڑھا سکتی تھیں اور جن کی قیمت کا سونے میں تعین کرنا ممکن نہ تھا۔ بابر کو دھول سے اٹی ہوئی اس دکان میں ایسا لگ رہا تھا جیسے وہہریوں کی کمائیوں کے کسی خزانے والے غار میں پہنچ گیا ہو۔

”اور کیا ہے آپ کے ہاں؟ اور کیا ہے؟“ وہ بے صبری کے ساتھ بار بار پوچھے جا رہا تھا۔
 قطب الدین نے اسے تمام نئی ایک سے ایک پیش بیا کتابیں دکھائیں۔ قاسم بیگ جو شاعر
 جوہری کے پیچھے پیچھے ہی چپ چاپ دکان میں آگیا تھا، بخوبی جانتا تھا کہ مشہور و معروف خوش
 نویسوں کی نقل کی ہوئی اور چھیدہ گل بوٹوں سے آراستہ وہ کتابیں کتنی مہنگی ہوں گی۔ سرقہ کا خزانہ
 جیسا کہ اسے پہلے ہی سے اندازہ تھا، بالکل خالی تھا۔ اور اند جان سے لایا گیا سونا ایک تو بہت زیادہ نہ
 تھا اور دوسرے لشکر کشی کے وقت اسے اس خیال سے تھوڑی لایا گیا تھا کہ اس سے کتابیں خریدی
 جائیں گی۔ لیکن بابر اپنی منتخب کردہ کتابوں کا ڈھیر لگائے چلا جا رہا تھا، تعداد دس سے زیادہ ہو چکی
 تھی۔ آخر کار قاسم بیگ نے چپ کے سے کہا:

”عالی جاہ! اس وقت ہمارا خزانچی ساتھ نہیں ہے۔“

بابر ان الفاظ کا منہ موم نہ سمجھ سکا، وہ تو کتابوں کے سوا اور ہریات کو فراموش کر چکا تھا۔
 ”خزانچی؟ خزانچی کو بھیج دیا جائے گا۔“ اور اس نے کتب فروش سے کتابوں کے ڈھیر کی طرف
 اشارہ کرتے ہوئے کہا: ”کتابچی صاحب! آپ حساب لگا لیجئے، ہمارے خزانچی یہاں آئیں گے اور
 قیمت ادا کر کے انہیں لے جائیں گے۔“

قطب الدین نے شاہ سمرقند کی خدمت کا موقع ملنے پر سر جھکا کر اظہار مسرت کیا، کہا کہ حکمران
 اپنی فیاضی کے لئے شہرت رکھتا ہے اور ایسی ہی چند باتیں اور بھی کہیں لیکن بابر نے محسوس کیا کہ
 کتب فروش کچھ اور بھی کہنا چاہتا ہے پر ہمت نہیں پڑ رہی ہے۔

”آپ کیا چاہتے ہیں؟ بتائیے نا؟ شرایئے نہیں۔۔۔ آپ کی کتابیں بڑی قیمتی ہیں۔“

”عالم پناہ“ آخر کار کتب فروش نے ہمت کر کے کہا۔ ”ان دنوں پیسوں سے غذا خریدنا ناممکن
 ہے اور بچے بلک بلک کر روٹی مانگتے ہیں اور دل پاش پاش ہونے لگتا ہے۔ مناسب خیال فرمائیں تو
 تھوڑا سا آٹا۔۔۔۔۔“

”وہ ضعیف اور یہ عزت دار آدمی۔۔۔۔۔ یہ سب محاصرے میں پھنسے رہنے کے باعث بھوکوں مر
 رہے ہیں اور میں ہوں کہ محض پیسوں اور کتابوں ہی کی بات کر رہا ہوں۔“ بابر نے خود کو سروزنش کی
 لیکن نانہائیوں کے بازار میں قاسم بیگ نے جو مخالفت کی تھی اسے یاد کر کے اس نے کتب فروش کو
 کوئی جواب نہ دیا۔ (صرف دھیرے سے سر ہلا کر رہ گیا) اور ہوشیاری سے کام لینے کا فیصلہ کیا۔ بعد
 میں ان غیر مطمئن اور ناک بھوں چڑھانے والے بیگوں کی عدم موجودگی میں میر متغنی سے اس
 مسئلے کو چپ چاپ حل کرایا جاسکتا تھا۔

”خدا حافظ! آپ کسی بات کی فکر نہ کیجئے!“ بابر نے یوں لاپرواہی سے کہا گویا یہ بات محض اخلاقاً کہہ دی ہو اور دکان سے نکل کر چوک میں آگیا جہاں احمد تیل اپنے سپاہیوں کے درمیان گھوڑے پر بیٹھا تھا۔

لیکن اس روز شام کو کتب فروش کے ہاں ایک بورا آٹا، ایک دنبہ اور کچھ نقد رقوم پہنچادی گئی۔ یہ کام خفیہ طور پر انجام دیا گیا پھر بھی اگلی صبح کو اس کا پتا سب لوگوں کو اسی طرح چل گیا جیسے قاسم بیک کے سپاہیوں کے نانباؤں کے بازار میں ارا بے بھرا آٹا پہنچانے کا۔ نانباؤں نے تندوروں میں جو اس دن تک برف سے ڈھکے ہوئے تھے، آگ جلائی اور گرم گرم تازی نانوں کی سوندھی سوندھی خوشبوئیں سارے شہر میں پھیل گئیں۔ گھڑسوار سپاہیوں نے بابر کی طرف سے واقعی مفت کھانا تقسیم کیا۔

بابر کے اس اقدام سے بھوکے سمرقندیوں میں جس طرح خوشی کی لہر دوڑ گئی اسی طرح مال لوٹنے کو بے تاب بیگوں اور لشکریوں میں ناخوشی کی۔ ان بیگوں نے جو بھوکے اور تباہ حال سمرقند کو دیکھتے دیکھتے ادب چکے تھے، بابر سے پوچھے بغیر ہی گرم اور خوشحال فرغانہ لوٹ جانے کا فیصلہ کر لیا۔

تندوروں سے نکلتی ہوئی گرم گرم نانوں کو بوریوں میں ڈھونے اور بھوکے سمرقندیوں میں تقسیم کرنے والے سپاہیوں میں ظاہر بھی شامل تھا۔ پہلے تو اسے غصہ آیا اور اس فرمان سے متفق نہ ہو سکا: ”میں ان کبوتروں کی خدمت کرنے آیا ہوں کیا جنہوں نے رابعہ کو اغوا کر لیا تھا؟“ لیکن انسانی مصائب کو دیکھ دیکھ کر اس کا دل ہلج گیا۔ مفلوک الحال لوگوں، دھاگوں جیسی پتلی گردنوں والے بچوں اور بھوکے بالکل بے جان مسمر افراد کے دردناک نظاروں میں اس کی بے اطمینانی کا نور ہو گئی۔ یہی نہیں، اس کے ذہن میں تو اچانک یہ خیال بھی کوند گیا کہ انہی اہل سمرقند میں شاید اس کی رابعہ بھی شامل ہو اور انہی کی طرح وہ بھی تڑپ رہی ہو۔ یا شاید ایسے لوگ ہی موجود ہوں جنہوں نے اسے دیکھا ہو، جو اسے جانتے ہوں۔

ظاہر لومڑی کی کھال کی کلاہ اور بھیڑ کی کھال کے لبادے میں ملبوس تھا۔ گزشتہ کئی مہینوں کی مسلسل گھڑسواری کے باعث اس کی چال بھی بالکل بدل گئی تھی۔ رکابوں کے عادی پیر و پیچھے کے پیروں کی طرح زمین پر ترچھے ترچھے سے پڑ رہے تھے لیکن ہاتھ بڑی پھرتی کے ساتھ بوری سے نائیں نکال رہے تھے۔

بھوکے لوگوں کی پھٹی پھٹی سی آنکھیں ظاہر کو نہیں بلکہ اس کے ہاتھوں اور مطلوبہ روٹیوں کو دیکھ رہی تھیں۔ لوگ بوری کے نزدیک دھیرے دھیرے، چھوٹے چھوٹے قدموں سے یوں آرہے تھے

گویا پیروں سے زمین کو ٹٹول رہے ہوں۔ طاہرا بھی طرح دیکھ چکا تھا کہ نحیف و ناتواں افراد چھوٹی چھوٹی نالیوں کو بھی پھاندنے اور معمولی سی چڑھائیوں کو بھی طے کرنے کی سکت نہیں رکھتے، ٹھہر کے نسبتاً طاقتور افراد کے سہارے کا انتظار کرنے لگتے تھے۔

طاہر ہر شخص کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ کیا واقعی ان میں ایک فرد بھی ایسا نہ تھا جس نے رابعہ کو دیکھا ہو یا اس کے متعلق کچھ جانتا ہو؟

قریب ہی چوغے میں لپٹے ہوئی کوئی عورت ایک بڑھیا کو اور بڑھیا اس عورت کو سہارا دیئے کھڑی ہوئی تھیں۔

”خالہ جان، آپ لوگوں میں کوئی عورت اند جان یا قوا کی رہنے والی تو نہیں؟“

”نہیں بھائی، ایسی تو کوئی بھی نہیں“ عورت نے تاجیک زبان میں جواب دیا۔

طاہر نے اس سے بھی وہی بات کہی جواب تک جانے کتنی ہی بار کہہ چکا تھا:

”میں بہن کی تلاش میں ہوں۔ چار سال قبل سلطان احمد کے سپاہی اس قوا سے اغوا کر لے گئے تھے۔“

”ہائے پجاری!“ عورت نے کہا اور بڑھیا نے طاہر کے ہاتھ سے تان لیتے ہوئے اس کے سامنے احتراماً سر جھکا دیا۔

تھوڑی دوری پر کھڑا ہوا ایک شخص جس کی نگاہیں نانوں کی بوری پر جمی ہوئی تھیں، بے مبری سے رال پکا رہا تھا۔ مونچھیں چھدری، قد بلند اور عمر بھی کوئی پینتیس سال۔

”تم کبھی سپاہی تو نہیں رہ چکے ہو؟“

چہرے پر آس والے اس شخص نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد گہرا کر کہا:

”رہ تو چکا ہوں، کیا بات ہے؟“

”کب رہ چکے ہو؟“

”کئی سال قبل۔“

”اند جان گئے تھے؟“

”نہیں.... وہاں پہنچنے سے پہلے ہی لوٹ آیا تھا۔“

تپتاتی لہجے اور اس شخص کے چہرے نے طاہر کے ذہن میں ان لٹیروں کی یاد تازہ کر دی۔ وہ

چوکننا ہو گیا: کہیں یہ بھی تو ان ہی لٹیروں میں شامل نہیں تھا؟

طاہر نے اپنے ایک ساتھی کو جو نانباتی کی دکان کے دروازے پر کھڑا تھا، بلا کر نانوں کی بوری

تھمائی اور خود چھدری مونچھوں اور بھوک سے سوچے ہوئے چہرے والے آدمی کے پاس گیا۔ وہ شخص بری طرح سہم گیا۔

”ارے بھائی، تمہیں مجھ سے کیا چاہئے؟ میں غریب آدمی ہوں! مجھے جانے دو! میں تو روٹی لینے آیا ہوں۔۔۔۔۔ بس روٹی لینے!“

کیس اس شخص نے بھی اسے پہچان تو نہیں لیا تھا؟ ابھی ہوئی کتنی کا وہ سراجو اسے راجہ کے پاس تک پہنچا دے، کہیں اس شخص کے ہاتھوں میں تو نہیں؟ اس سے ذرا محبت بھرے لہجے میں بات کرنے کی ضرورت تھی۔

”روٹی تمہیں ضرور ملے گی۔ میں تمہیں کچھ زیادہ نانیں دے دوں گا۔ پر مجھے بتا دو۔ تو تم سلطان احمد کے سپاہی تھے نا؟“

”ہاں، بتا تو چکا ہوں۔۔۔۔۔“

”تم لوگوں نے قواسائے کاہل پار کیا تھا نا؟“

”کون ساہل؟ وہی جو ٹوٹ گیا تھا، جس نے ہمیں تباہ کر دیا تھا؟“

”ہاں، ہاں، وہی!“ طاہر نے اپنی مسرت اور غصے دونوں کو چھپا لیا: ”تو یہ وہی بد معاش ہے! خنجر کے وار سے کجنت کا کام تمام کر دوں! لیکن پھر راجہ کو کیسے تلاش کر سکوں گا؟“

طاہر نے چھدری مونچھوں والے کے چونچے کا گریبان تھام کے اسے زور سے جھنجھوڑ دیا:

”راجہ کہاں ہے؟ جلدی بتا!“

وہ بھوک سے بری طرح تڑحال شخص طاہر کے قدموں میں ڈھیر ہوتے ہوتے بچا، لگا جیسے اس کے انجر پنجر ابھی ابھی نکھر جائیں گے۔

”کو۔۔۔۔۔ کون سی راجہ؟“ اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

”راجہ، راجہ! تم لوگ قوا کی اس لڑکی کو کہاں لے گئے تھے؟ اب وہ کہاں ہے؟ سچ بچاؤ ورنہ سر قلم کر دوں گا! بتاؤ!“

”ارے بھائی، میرے بھائی! میری جان لینا چاہتے ہو تو لے لو پر میرے متعلق ایسی ویسی بات نہ سوچو۔ مجھے اس وقت لڑکیوں کے چکر میں پڑنے کی فرصت کہاں تھی۔۔۔۔۔ میرا سگا بھائی پل پر سے دریا میں گر گیا تھا۔ اسے تین دنوں تک سر کنڈوں میں ڈھونڈتا رہا لیکن نہ ملا۔۔۔۔۔ لاش تک نہ مل سکی۔ بچارے کو دلدل نکل گئی۔۔۔۔۔“

طاہر نے اجنبی کو دھکیل دیا لیکن پھر اس کے چونچے کی آستین پکڑ لی۔ اسے یاد آگیا کہ ان لٹیروں

میں سے ایک نے دوسرے کو جمان کہہ کر پکارا تھا۔
 ”تمہارا نام کیا ہے؟ طاہر نے ایک بار پھر چھدری مونچھوں والے کی آنکھوں کو گھورتے ہوئے

پوچھا۔

”نام؟ محمد ہے۔“

”جمان تو نہیں؟“

”میرے بھائی، کسی کو بھی بلا کر دریافت کر سکتے ہو۔ سارا محلہ جانتا ہے کہ میرا نام محمد ہے۔ میں کفش دوز ہوں۔“

طاہر نے سوچا: ”اگر اس کا بھائی تو اسائے میں ڈوب گیا ہے تب تو اسے بھی میرا گربان پکڑنے کا حق ہے!“ اور اس کا غصہ جس تیزی سے بھڑک اٹھا تھا اسی تیزی سے ٹھنڈا پڑ گیا۔

”اور تم جمان کو نہیں جانتے... بھائی؟“

محمد نے اچانک اپنا ماتھا پکڑ لیا:

”ٹھہرو، ذرا ٹھہرو... ہمارے ساتھ ایک جمان تھا جو ”میںماق“ یعنی ترچھے پیروں والا کہلاتا تھا۔ میں نے سنا تھا کہ وہ دو لڑکیوں کو اٹھالے گیا تھا، تمہارے ہی علاقے سے۔“

”انہیں وہ سر قتلے آیا تھا؟“

”لڑکیوں کو؟ یہ تو مجھے نہیں معلوم... میں تو بس آق سودر یا تک ہی پہنچ سکا تھا جو اورا تپسا سے کچھ ہی فاصلے پر واقع ہے۔ ہم آق سو ہی تک پہنچے تھے کہ ہمارے بادشاہ کا انتقال ہو گیا اور افرا تفری پھیل گئی۔ میں عاجز آ گیا اور سپاہ گری چھوڑ کر چل دیا۔“

”یہ جمان میںماق اب کہاں رہتا ہے؟“

”یہ تو مجھے نہیں معلوم۔ تین چار سال سے س سے ملاقات نہیں ہوئی۔ بڑا بد زبان تھا، یا تو اس کا بھی انتقال ہو گیا یا پھر کسی دوسرے بادشاہ کے ہاں نوکری کر لی۔ پاس پڑوس میں بادشاہوں کی کوئی کی تھوڑی ہے۔ تاشقند میں محمود خان ہے، ترکستان میں شیبانی خان اور حصار میں بھی کوئی ہے۔“

لحنت ہو ان کبخت جنگلوں اور جھگڑوں پر!“ طاہر نے جھلا کر کہا۔ ”تم کفش دوز ہو۔ میں وہقان تھا۔ بھلا یہ کیسا زمانہ لگا ہے کہ ہمیں ایک دوسرے سے برسرِ بیکار ہونا پڑ رہا ہے؟“

محمد نے طاہر کے چہرے کا غور سے جائزہ لیا اور زخم کا نشان دیکھ کر سر ہلایا:

”وہ لڑکی تمہاری کون ہوتی ہے؟ بہن؟“

طاہر نے گہری ٹھنڈی سانس لی اور اچانک تسلیم کر لیا:

”مجھے وہ ہر شے سے سوا عزیز تھی۔ آنکھ کی پتلی تھی۔“

ممد نے تلی دینے کی کوشش کی:

”اے بھائی! امید کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑو، مل جائے گی۔ یہاں میرے بہت سے احباب اور واقف کار رہتے ہیں۔ سب سے دریافت کروں گا۔ اپنی بیوی سے بھی تذکرہ کروں گا، وہ عورتوں سے پوچھ کچھ کریں گی۔“

طاہر نے محسوس کیا کہ ممد بچے دل سے اس کی مدد کرنا چاہتا ہے۔

”آؤ ممد۔“ اور نانبائی کی دکان میں پہنچ کر اس نے نئی پوری سے چارنائیں نکال کر ممد کی طرف بڑھائیں۔

ممد نے کانپتے ہاتھوں میں نانیں تمام کے انہیں بغل میں دبائے سے پہلے ان کی گرم اور سوندھی خوشبو کو سونگھا۔ اس کی آنتیں قل حوالہ پڑ رہی تھیں پھر بھی اس نے طاہر کے سامنے صبر سے کام لیا اور نانوں پر ندیدے پن سے ٹوٹ نہیں پڑا۔ صرف مہم سے انداز میں جیسے نانوں کی مہک نے اس پر نشہ سا طاری کر دیا ہو، کہا:

”نہیں بھائی، روٹی سے بڑھ کر اور کوئی چیز نہیں ہوتی۔ خدا تم پر ایسا وقت کبھی بھی نہ ڈالے۔۔۔۔۔ جیسا ہم پر پڑا تھا۔ میں انہیں کھاؤں گا، جسم میں کچھ جان پڑ جائے گی اور چل کے اپنے گاؤں تک پہنچ سکوں گا۔ وہ پہاڑی ہے نا اس کے عقب میں ہمارے بھائی رہتے ہیں۔ ہمارا تعلق قویان تلاق قبیلے سے ہے۔ گاؤں پہنچ کر کرواہان سے دو پوری غلہ لے آؤں گا۔۔۔۔۔ میرے پاس ایک گھوڑا تھا جسے خزاں کے موسم میں ذبح کر کے ہم لوگ کھا گئے۔ پیدل روانہ ہوتے ڈر رہا تھا کہ کہیں پہاڑی علاقے میں گر کر سردی سے ہلاک نہ ہو جاؤں۔ اب کا ہے کاؤر۔۔۔۔۔“

”تم سے پھر کہاں ملاقات ہو سکے گی؟“ طاہر نے اسے ٹوکا۔

”اوہ! محلہ کفش دوزان ہے نا۔۔۔۔۔ بس وہیں میرا گھر ہے۔ جس سے بھی پوچھو گے، بتا دے گا۔ ممد

پہلوان۔۔۔۔۔ ہاں بھائی، کبھی میں بہت طاقتور تھا۔ اب تو چلنے تک میں دشواری ہوتی ہے۔۔۔۔۔“

”بھولنا نہیں! اس کا نام رابعہ ہے۔۔۔۔۔ اور میں قاسم بیگ کا سپاہی ہوں۔ میرا نام طاہر ہے۔“

”ٹھیک ہے، طاہر بیگ، ٹھیک ہے، کچھ پتا چلے گا تو فوراً تمہیں تلاش کر لوں گا۔ ہمارے لوگوں نے تمہارے ساتھ بدی کی تھی پر تم نے ہمارے ساتھ نیکی کی۔ زندگی بھر یاد رکھوں گا، احسان کا بدلہ ضرور چکاؤں گا۔ خدا حافظ!“

طاہر اسے جاتے دیکھتا رہا۔ ”گر اسے پتا چل جائے کہ اس کا بھائی کس کی وجہ سے ہلاک ہوا

ہے تو۔۔۔۔۔

نانا بی کی دکان کافی پیچھے چھوٹ گئی تو مرنے فوراً ہی بٹل میں دبی ہوئی گرم نانوں میں سے جلدی سے ایک کھڑا توڑا اور چپکے سے منہ میں رکھ لیا۔

۴

”سر قند پر قبضہ ہوتے ہی ساری مشکلات ختم ہو جائیں گی“ اند جان کے بیگوں اور سپاہیوں نے یہی سوچا تھا۔ لیکن وہ بہت غلطی پر تھے۔ تین ہزار لشکریوں کے کوئی چھ ہزار تو گھوڑے ہی تھے۔ قیامت کی سردیوں کے دوران اور وہ بھی ایسے شہر میں جو پکان کر دینے والے محاصرے کو جھیل چکا تھا، بیک وقت تمام اہل سر قند کا پیٹ بھرنا اور لشکر کے لئے کافی غذائی سامان اور گھوڑوں کے لئے چارے کا انتظام کرنا کسی بھی طرح ممکن ہی نہ تھا۔ شہر کے دروازے کھول دیئے گئے، پرانے اور نئے محصلوں کی سختی کے ساتھ وصول۔ غلے اور صرف غلے کی شکل میں! کے لئے اورا تپنا اور قرشی کی طرف دستے روانہ کر دیئے گئے اور بازاروں کو کاروبار کے واسطے کھلوانے سے متعلق اقدامات کئے جانے لگے۔ اس سب کے باوجود ماوراء النہر کے دارالحکومت میں حالات زندگی کسی طرح معمول کے مطابق نہیں ہو پارہے تھے۔ سر قند سہا سہنا ہوا تھا، سر قند کنگال ہو چکا تھا۔ گزشتہ برسوں میں یہ شہر جلدی جلدی ایک کے بعد دوسرے کے قبضے میں جاتا رہا تھا۔ سب نے اپنی اپنی فکر کی تھی، شہر کا خیال کسی نے بھی نہیں کیا تھا۔

”ہمیں صبر سے کام لینا چاہئے!“ بابر کا استاد خواجہ عبداللہ بیگوں کے جلسوں میں تلقین کرتا تھا۔ ”موسم بہار آنے ہی کو ہے، پروردگار کی مدد اور عنایت سے ہم فصل کٹنے تک جوں توں گزر کر لیں پھر تو ساری بلائیں دور ہی ہو جائیں گی۔ یہ برا وقت گزر جائے گا اور قرشی سے شہر بڑا اور اوزگت تک ایک عظیم الشان سلطنت قائم ہو جائے گی۔ ہمیں خدا کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ اتنا وسیع و عریض ملک ہمیں مل رہا ہے، ایسا شاندار دارالحکومت ہمارے قبضے میں آگیا ہے! ہمارے حکمران مرزا بابر خواب دیکھ رہے ہیں کہ سارا ماوراء النہر دوبارہ اسی طرح متحد ہو جائے جیسے کہ الف بیک کے عہد میں تھا نیز یہ کہ اس کی شان ایک بار پھر پہلے ہی جیسی ہو جائے اور چاروں طرف خوشحالی کا دور دورہ ہو۔ ہمارے حکمران کے یہ خواب ہی ہم سب کے پاک مقاصد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پاک پروردگار، ہمیں ان مقاصد کی تکمیل کی قوت عطا کر!“

خان قلی بیک اور احمد تیل ناک بھوں سکوڑتے لیکن اپنی جھلاہٹ کو چھپا کر دوسرے بیگوں کی طرح وہ دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیتے تھے: ”اللہ آمین!“

یہ لوگ اپنی مجلس مشاورت سے گھروں کو واپس لوٹنے کے بعد دو دو تین تین کر کے ایک بار پھر مل بیٹھے اور نکتہ چینیوں کا سلسلہ جاری ہو جاتا:

”اس کا مطلب ہے کہ ہمارے حکمران الخ بیگ جیسے عظیم بادشاہ بننے کے خواب دیکھ رہے ہیں؟“ اور خان قلی طہریہ انداز سے مسکرایا۔

وہ عثمانی رضائی سے ڈھکی ہوئی صندلی ☆ کے پاس بیٹھے شام کا کھانا کھا رہے تھے۔ احمد تیل نے بھی جو چھری سے قری ☆ کے ٹکڑے کاٹ رہا تھا، طہریہ مسکراہٹ ہی کے ساتھ کہا:

”تو جوان حکمران کے عظیم بادشاہ بننے میں بس ایک معمولی سی بات ہی کی کسر رہ گئی ہے۔“
 ”کون سی بات کی؟“

”آج مجلس مشاورت میں یہ بات اٹھی تو تھی۔ سر قند کے دقتانوں نے بیچ کے لئے جو غلہ بچا رکھا تھا اسے کھا چکے ہیں۔ ہمیں چاہئے کہ اپنا سارا غلہ وہی جو قرشی سے کارواں لے کر آیا ہے دقتانوں کو بطور قرض دے دیں پھر جب وہ اپنی فصلیں کاٹیں گے تو اسے سود کے ساتھ لوٹا دیں گے۔“

”ہاں بس یہی کسر رہ گئی ہے۔ تباہی پر تباہی سمجھئے!“
 ارے خان قلی بیگ! آخر ہم یہ سب کب تک جھیلے رہیں گے؟ یہ کل کا لڑکا تو عظیم بادشاہ بننے کی فکر میں ہے، یہاں سے واپس جانے سے رہا! اس کے علاوہ سر قند کا داماد بھی ہے، یہاں اس کی متغیر رہتی ہے۔ اسی لئے تو ان مفلوک الحال شہریوں کی نظروں میں خود کو نیک اور اچھا ثابت کرنے پر تلا ہوا ہے۔ آنا بھی تقسیم کراتا ہے اور ہر ہفتے شاعروں کو بلا کر مشاعرے بھی منعقد کرتا رہتا ہے۔“

”اور کیا یہ بیچ ہے کہ وہ شاعر بھی بننا چاہتا ہے؟“
 ”ہاں صاحب، بیچ ہے! اسی وجہ سے تو کونے کونے سے شاعروں کو بلواتا ہے۔ ان لوگوں کی خاطر مدارات بھی کرنی ہوتی ہے اور اس پر سارا مال غنیمت اڑایا جا رہا ہے جو قانوناً ہمارا ہے۔ وہ تو خزانے کا سارا کا سارا سونا کتابیں خریدنے پر صرف کرنے کو تیار ہے۔ اور وہ بھی ہمارا ہی ہے!“
 خان قلی نے اپنی چھدری داڑھی سلائی۔

”میں تو اندجان جانا چاہتا ہوں لیکن حکمران اجازت ہی نہیں دے رہا ہے“ اس نے کہا۔ ”خدا ہی جانتا ہے کہ کتنا عاجز کر دیا ہے حکمران نے مجھے!“

احمد تیل گدے پر سے اٹھ کر دروازے کے پاس گیا اور زنجیر بند کر کے اپنی جگہ پر لوٹ آیا۔

”محرم خان قلی بیک! اور بیک یہاں نہ رکیں گے تو بادشاہ کیا کر لے گا؟۔۔۔ مجھے تو پورا یقین ہے، بخوبی جانتا ہوں کہ زیادہ تر سپاہی ہمارے ساتھ چلے جائیں گے۔ جنگ ہم نے جیتی۔ مصائب ہم نے جھیلے اور اب۔۔۔۔۔ اب ہمیں اس چھوکرے سے اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے؟“

”درست فرمایا آپ نے!“ خان قلی بیک نے چپکے چپکے کہا۔ ”ہم بیگوں میں سے ہر ایک بادشاہ ہے“ اپنا بادشاہ خود ہی ہے۔۔۔۔۔ وہ اجازت نہیں دیتا تو نہ دے، میں تو ہر حالت میں چلا جاؤں گا!“

”میں بھی اس چھوکرے سے اپنی پگڑی اچھلوانے کا قطعاً ارادہ نہیں رکھتا۔ زندہ رہا تو اپنے لئے کوئی اور بادشاہ ڈھونڈ لوں گا۔ آخسی میں مرزا جہانگیر ہے۔ بخارا میں سلطان علی مرزا ہے۔ ارے تاجداروں کی کوئی کمی تھوڑی ہے۔ اور ان میں کون ایسا ہے جسے ہم جنگجو بیگوں کی ضرورت نہ ہو۔۔۔۔۔ ہاں، میرا ایک مشورہ ہے۔ اندجان میں زیادہ دنوں تک قیام نہ کیجئے گا۔ وہاں تو آپ پر کوئی بھی مصیبت نازل ہو سکتی ہے۔“

”تو کیا آفسی جانا چاہئے؟“

”جی ہاں، آخسی۔ اور ازون حسن سے ملاقات کی کوشش کیجئے گا۔ وہ آپ کو جہانگیر کی ملازمت میں رکھوادے گا۔“

”واقعی رکھوادے گا؟ لیکن کیا جہانگیر اپنے بھائی کے خلاف ہتھیار اٹھانے کی جرات بھی کر سکے گا؟“

”کر سکے گا۔۔۔۔۔ اس کے ہاں ایسے بیگوں کی تعداد بڑھ جائے گی تو وہ اسے مشتعل کر دیں گے۔۔۔۔۔ میں جانتا ہوں کہ جہانگیر مرزا کو اندجان کے تخت پر قابض ہونے کا بڑا ارمان ہے۔۔۔۔۔ یقین مانئے!“

۔۔۔۔۔ اگلے روز شام کو جب کہ احمد تہل کے معتبر سپاہی پہرا دے رہے تھے، خان قلی بیک اپنے سپاہیوں کے ہمراہ فیروز دروازے سے چپ چاپ باہر نکل گیا۔ ہفتے بھر بعد ہی خود احمد تہل بھی چلا گیا۔ اسے زامین کو روانہ ہونے والے قافلے کی حفاظت کے لئے ساتھ جانے کا بڑا معقول بہانہ ہاتھ آگیا تھا۔ وہ گیا اور جا کر واپس نہ لوٹا۔ اس کے بعد ضروری کاموں سے شہر کے باہر جا کر کہیں غائب ہو جانے والے بیگوں اور سپاہیوں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہونے لگا۔ رات کو دروازے مضبوطی کے ساتھ بند کئے جانے لگے تو لوگوں نے قلعے کی تفصیل سے اتر کر بھاگنا شروع کر دیا۔ موسم سرما کے آخری ایام تک یہ حالت ہوئی کہ باہر کے ساتھ آنے والے بیگوں میں سے صرف نصف ہی سرقند میں باقی رہ گئے۔ باہر نے اپنے ایک معتبر شخص کو اندجان بھیجا کہ وہ بھاگ کھڑے ہونے والے بیگوں کو واپس بلا لائے۔ میں دن بعد ہی یہ خبر موصول ہوئی کہ احمد تہل اور

اس کے طرف داروں نے کھلی بغاوت کر کے اس قاصد کو اندجان اور آخی کے درمیان کسی جگہ روک کر موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔

تب بابر نے قاسم بیگ کے مشورے پر خواجہ عبداللہ کو اندجان روانہ کیا۔ لیکن ازون حسن اور دوسرے سازشیوں نے جو پہلے خواجہ عبداللہ کے مشوروں پر عمل کیا کرتے تھے اور جن میں سے کچھ تو اس کے مرید بھی تھے، اس بار اس کے مشوروں اور دلائل پر ذرا بھی کان نہ دھرے۔ یہی نہیں، ان لوگوں نے کھلم کھلا اندجان پر حملہ بھی کر دیا اور شہر کے دروازوں کو گھیر کر اپنے مرشد خواجہ عبداللہ اور بابر کے وفادار بیگیوں کو محاصرے میں پھنسنے رہنے پر مجبور کر دیا۔ وادی فرغانہ میں بغاوت پھیل گئی۔

۵

بغاوت کرنے والے بیگیوں کو بالکل اتفاقی ایک اور بات سے بھی مدد ملنے لگی۔ یہ تھی نوجوان حکمران کی سنگین علالت، اس پر مقدر کا خلاف توقع عتاب۔

بابر بستاں سرائے محل کی اوپری منزل کی خواب گاہ میں لیٹا ہوا تھا اور تیز بخار اس کے جسم کو ہلکان اور عذراں کئے دے رہا تھا۔

اندجان سے آئے ہوئے قاصد نے شاہی محافظ دستے کے سردار کو گول لپٹا اور مرگنا ہوا خط دکھایا لیکن اس کے ہاتھوں میں نہ دیا۔

”ملکہ عالیہ، حکمران کی والدہ محترمہ کا ارشاد ہے کہ یہ خط صرف حکمران ہی کو دیا جائے!“
بابر ہر روز دریافت کرتا تھا کہ اندجان سے قاصد آیا کہ نہیں اسی لئے دستے دار قاصد کو فوراً ہی اوپر لے آیا۔

”پہلے تو وزیر اعظم مطالعہ فرمائیں گے اور خبر اچھی ہوئی تو شاہ عالی کی خدمت میں پیش کر دیں گے“ معرطیب نے کہا۔

”حکمران کی والدہ محترمہ اور ان کے استاد خواجہ عبداللہ صاحب نے حکم دیا ہے کہ یہ خط صرف ان ہی کو.....“

”خبر بد سے شاہ معظم کا مزاج اور بھی نامساز ہو سکتا ہے“ طیب نے اس لیکن سخت لہجے میں اس کی بات کاٹ دی۔ ”چند روز قبل ان کی صحت بالکل ٹھیک ہو چلی تھی لیکن..... فکریں نکالیف میں اضافہ کر دیتی ہیں اور نکالیف اپنے ساتھ بیماریاں لے کر آتی ہیں۔ حکمران صحت کی بحالی سے پہلے ہی بستر سے اٹھ کھڑے ہوئے اور آج تیز بخار نے انہیں دوبارہ بستر سے لگا دیا۔“

”اندجان کو خطرہ لاحق ہو گیا ہے“ قاصد نے اپنی آخری دلیل پیش کی۔ ”اگر یہ خط فوراً ہی ان کی خدمت میں نہ پیش کیا گیا تو پھر تاخیر ہو جائے گی۔ اور حکمران ناراض ہو جائیں گے!“

”نہیں، میں یہ نہیں کر سکتا، معاف کیجئے۔“

”لیکن طیب صاحب۔۔۔“

”نہیں! نہیں!“

اس بحث کی آوازیں باہر کو بھی سنائی دیں اور اس نے کمنیوں کے سارے بیٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے پوری قوت کے ساتھ آواز دی:

”قاصد ہو تو اسے آنے دیجئے! یہ میرا حکم ہے!“

نرم پردں سے بھرا ہوا اس کا گدا خواب گاہ کے کافی اندر بچھا ہوا تھا۔ قاصد بستر سے کچھ فاصلے پر جھکا، گھٹنوں کے بل چلتا ہوا باہر کے پاس پہنچا اور خط کو دونوں ہتھیلیوں پر رکھ کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

باہر نے جس کا چہرہ بخار کی شدت سے تہمتایا ہوا تھا اور جسم لرزے کے دورے سے مرتعش، نیم دراز حالت میں ہو کر سر کو اونچے تکیوں پر نکال لیا۔ پھر اس نے مہر کو توڑ کر خط کھولا تو اس کے اندر ایک اور نسبتاً چھوٹا خط بھی ملا۔ بڑے خط پر خواجہ عبداللہ کے دستخط تھے اور چھوٹا قلوغ نگار خانم کا تھا۔ دونوں کا لب لباب ایک ہی تھا: ”اندجان کا محاصرہ کر لیا گیا ہے جس کی مزاحمت کرنا دشوار ہے اور باہر کے سوا اور کوئی بھی انہیں نجات نہیں دلا سکتا۔ دونوں ہی خطوط کے آخر میں جلد از جلد مدد کرنے کی درخواست کی گئی تھی۔“

تو اندجان کا محاصرہ کر لیا گیا! غدار بیگ اندجان کے تحت پر جمانگیر کو بٹھانا چاہتے ہیں! اس کا مطلب صرف یہ ہوا کہ یہ لوگ احمد تہیل کو سپہ سالار بنانا اور باہر کو اس کے آبائی گھر سے محروم کرنا چاہتے ہیں! اس نے تو سوچا تھا کہ یہ لوگ اپنی حرص و ہوس اور خود غرضی کے باوجود بہر حال اس کے وفادار ہیں، اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ بیگ اس حد تک بڑھ جائیں گے۔

باہر لرزے کے دورے پر قابو نہ پاسکا، تکیوں سے کھسک کر نیچے آ رہا اور سرفہاشت کے باعث پیچھے لڑھک گیا۔ سب کچھ جاتا رہا!

اندجان میں تہیل اور جمانگیر کو فتح حاصل ہو گئی تو زیادہ تر لوگ ان سے جا ملیں گے! یہاں خود اس کے ساتھ تب کون رہ جائے گا؟ کیا اس وقت بھی جب کہ وہ بستر پر پڑا ہوا ہے، اس کے آدی بھاگ بھاگ کر تہیل کے پاس جا رہے ہیں؟ لیکن قاسم بیگ؟..... باہر یہ سب سوچ کر بری طرح

خوف زدہ ہو گیا۔ اس نے اپنی ساری طاقت کو یکجا کر کے خود کو اٹھایا اور بستر پر بیٹھ گیا۔

”قاسم بیگ کہاں ہیں؟“

”وزیر اعظم بس آتے ہی ہوں گے، انہیں بلوایا گیا ہے“ طیب نے نرمی سے کہا۔ ”عالی جاہ“ آپ لیٹ جائیے، آپ کو سکون کی ضرورت ہے!“

باہر کی اذیت دہ تصور میں اچانک احمد تبیل ہاتھ میں تلوار لئے ہوئے نمودار ہوا۔ وہی تلوار لئے! اوش میں اسی تلوار کا بوسہ لے کر احمد تبیل نے قسم کھائی تھی کہ تمام زندگی وفاداری کے ساتھ اس کی خدمت کرتا رہے گا..... اور اب..... تبیل نے تلوار بلند کی اور اسے باہر کے سر کے اوپر گھمانے لگا..... تبیل..... کے قدموں میں بورے کے اندر سے انسانی سر نکل کر لڑھکنے لگے۔ ان میں ایک..... اے قادر مطلق..... اس کی والدہ کا سر!.....

باہر اس مہیب نظارے کی تاب نہ لا کر تیزی سے بستر سے نیچے اترا اور اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اسے اپنے برہنہ پیروں پر قالین کے نرم رویوں کا واضح لمس محسوس ہوا۔ اس نے خود کو مجبور کر دیا کہ کھڑا رہے، فرش پر ڈھیر نہ ہو جائے۔

”مجھے تلوار دیجئے!“ باہر چیخ اٹھا۔ ”فوراً! میری تلوار!“

طیب نے اس کے کانپتے ہوئے جسم کو اپنی ہانہوں میں جکڑ لیا۔ ”عالی جاہ“ آپ کو لیٹے رہنا چاہئے.....“

باہر کو لگا کہ طیب اسے احمد تبیل کی تلوار کے وار کے نیچے ڈھکیل رہا ہے، اس کے پیروں کو پھیرنے کی ٹانگوں کی طرح چھاند رہا ہے..... اس نے خود کو طیب کی گرفت سے آزاد کرا کے لڑکھڑاہٹ پر قابو پایا اور دروازے کی طرف لپکا:

”میرا گھوڑا لائیے! میں اندجان جا رہا ہوں! میری تلوار کہاں ہے؟! بیگلوں سے کہئے کہ فوراً تیار ہو جائیں!“

طیب باہر کے پیچھے لپکا اور مستعدی سے کام لیتے ہوئے اس کے شانوں پر پوشتین ڈال دیا۔ اس نے ادھیڑ بن کے ایک لمحے میں باہر کے پیروں کے پاس اس کے جوتے رکھ دیئے۔ باہر نے ایک جوتا تو پہن لیا لیکن دوسرا پہننے کی اس میں سکت باقی نہ رہی۔ اس کا سر چکرانے لگا اور ہانپنے سے دم گھٹنے گھٹتے بچا۔

”غدار!“ وہ احمد تبیل سے جواب بھی ننگی تلوار لئے اس کی نگاہوں کے سامنے گھوم رہا تھا، بس اتنا ہی کہہ سکا۔ ”خونی، قاتل!“

باہر اچانک ٹھوکر کھا کر گر پڑا اور بے ہوش ہو گیا۔

آدھی رات بیت چکی تھی تب کہیں جا کر اسے ہوش آیا۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ سرہانے کھڑا ہوا طبیب روئی کے ٹکڑے کو بھگو کر اس کے منہ میں اور چہرے پر پانی پکا رہا ہے۔ اسے لگا کہ منہ کے اندر زبان اتنی زیادہ سوج گئی ہے کہ اس کا وزن برداشت نہیں کر پا رہا ہے۔ سارے جسم کو جیسے کوئی بھاری سی چیز پچلے دے رہی تھی۔

قاسم بیک نے باہر کو آنکھیں کھولتے دیکھا تو اس کی پائنٹی میں جا کھڑا ہوا۔

”خدا کا ہزار ہزار شکر!.. عالی جاہ، آپ نے ابھی ہمیں کتنا ڈرا دیا تھا!“

باہر نے کچھ کتنا چاہا لیکن اپنی بہت زیادہ سوجی ہوئی زبان کو جنبش نہ دے سکا، اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

”اب آپ کی طبیعت کیسی ہے، میرے حکمران؟“

باہر اس بار بھی خاموش ہی رہا۔ وہ سب کچھ واضح طور پر دیکھ رہا تھا لیکن بول نہیں پا رہا تھا۔

قاسم بیک سمجھ گیا کہ باہر کی گویائی جاتی رہی۔

اس نے اپنا منہ موڑ لیا تاکہ سولہ سالہ نوجوان اپنے حامی، اپنے سپاہی اور اپنے وزیر کی آنکھوں میں امنڈ آنے والے آنسوؤں کو نہ دیکھ سکے۔

اند جان

1

رات ویسے بھی تیرہ و تار تھی لیکن کالے کالے بادل گھر آئے تب تو یہ حالت ہو گئی کہ ہاتھ کو ہاتھ نہیں بھائی دیتا تھا۔

قلعہ گہری تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ خطرے کے باعث اند جان کی سڑکوں پر، گلیوں کوچوں میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ چاروں طرف خاموشی کی حکمرانی تھی، کہیں ایک شخص بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔۔۔ اتنے میں قلعے کا پھانک دھیمی چر مراہٹ کے ساتھ کھلا اور پھیرا دوں کے جبرے کی کھڑکی سے نکلتی ہوئی مدہم روشنی میں گھڑ سوار دستے لمبے بھر کے لئے چمک اٹھا۔

دستے کی قیادت خان زادہ بیگم کر رہی تھی۔ جسم پر مردانہ چوغہ، سر پر کلاہ، کمر پر چوڑی سی پٹی اور اس سے لٹکتا ہوا خنجر۔ اس کے سپاہوں کے درمیان میر عمارت فضل الدین بھی موجود تھا جس کی کمر

سے تلوار لٹک رہی تھی۔

قاصد کے سرقد سے بابر کی سنگین علالت اور اس کے زندگی اور موت کی کنکاش میں جٹلا ہونے کی خبر لاتے ہی قلعے کے محافظین کا ایک حصہ بھاگ کر سازشوں سے جا ملتا تھا۔ ہر موکھے پر تعینات کئے جانے کے لئے سپاہیوں کی کمی محسوس کی جانے لگی تھی۔ شب کے سائے میں دشمن کے فضیل پر سیڑھیاں لگا کر چپ چاپ قلعے میں داخل ہو جانے کا خطرہ بڑھ گیا تھا۔ خان زادہ بیگم حفاظتی اقدامات کی خود ہی نگرانی کر رہی تھی۔ اس نے مردانہ لباس چوگان کھیلنے کے لئے تھوڑی پہنا تھا۔

سڑک پر جڑے ہوئے پتھروں سے گھوڑوں کے نعل گھپ اندھیرے میں چنگاریاں نکال رہے تھے۔ فضاؤں میں بارش کی مکھ بسی ہوئی تھی، گرم گرم سی ہوائیں چل رہی تھیں۔ فضل الدین نے سوچا کہ فصل بہار آنے کو ہے، قلعے کے اندرونی باغات میں خوبانی اور بادام کے درختوں پر پھول آرہے ہیں۔ بہار میں چاروں طرف دھوپ پھیلی رہتی ہے لیکن اس وقت۔ اس نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ رات ہے اور تاریکی، کس بھی روشنی نہیں ہے۔ قدرتی مناظر، شہر، ہر شے کے اوپر سیاہ چادر پھیلی ہوئی ہے۔

فضل الدین کو وہ منور دن یاد آگئے جب اس نے خان زادہ بیگم کو مستقبل کے مدرسوں اور محلوں کے نقشے دکھائے اور اس کے منہ سے ستائشی کلمات سنے تھے۔ بابر کے سرقد پر قبضہ کرتے ہی میر عمارت کو پوری طرح یقین ہو گیا تھا کہ عالیشان تعمیرات سے متعلق اس کے خواب اب حقیقت میں بدل جائیں گے۔ اس کو مسرور دیکھ کر خان زادہ بیگم بھی خوش ہوا مٹی تھی۔ اسے خان زادہ بیگم نے متعدد بار اپنے ہاں بلایا تھا۔ ان موقعوں پر وہ فضل الدین سے دیر تک باتیں کرتی رہتی تھی، پوچھا کرتی تھی کہ محلوں اور مدرسوں کی تعمیر کے لئے کون سے جگہیں بہتر رہیں گے نیز یہ کہ ان کی تعمیر سے متعلق کس طرح تیاریاں کی جانی چاہئیں۔۔۔

خان زادہ بیگم اپنے چھ کمرؤں والے پراسرار مکان کے جہاں دکنیزوں کے ساتھ رہتی تھی، اگلے حصے والے دیوان خانے میں فضل الدین سے ملاقات کیا کرتی تھی۔ شہزادی عموماً ”رہنمائی کپڑے کی قات کی آڑ میں بیٹھ کر باتیں کیا کرتی تھی لیکن بعض اوقات تجسس کے مارے اس قات کو ہٹا بھی دیتی تھی۔

”ذرا دکھائیے تو، گنبد والی عمارت اور میناروں کے بیچ کی جگہ میں آپ کیا بنانا چاہتے ہیں؟“

مثال کے طور پر وہ پوچھتی۔

وہ دونوں ایک دوسرے کے آنے سامنے نقشے کے اوپر جھکتے اور ان کی سانسیں آپس میں

نکرانے لگتیں۔ خان زادہ بیگم کی آنکھیں چمک اٹھیں اور میر عمارت کے ہونٹوں پر بالکل اسی طرح جیسے کہ پہلی بار اوش میں بورا تاغ پر ہوا تھا، مہر سکت لگ جاتی، ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکل پاتا اور اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتیں۔ وہ کوئی بھی بات جو اس کے کاموں سے غیر متعلق ہو، کرتے ہوئے ڈرتا تھا، اپنے نوکروں اور خود خان زادہ بیگم سے بھی اپنی بے قراری کا تذکرہ کرتے ہوئے ڈرتا تھا۔ سب سے زیادہ ڈرا سے قتلوغ نگار خانم کی تیز فہمی سے لگتا تھا جو ان دونوں کی گفتگو کے دوران کئی بار موجود رہی تھی۔ ایسے موقعوں پر وہ قتلوغ نگار خانم کی طرف رخ کر کے بچی نظروں کے ساتھ بار بار احتراماً ”اپنے سر کو خم کرتا رہا تھا۔

گزشتہ ملاقاتوں میں سے ایک کے دوران خان زادہ بیگم اچانک یوں ہی پوچھ بیٹھی:

”اچھا یہ تو بتائیے کہ آپ نے ابھی تک شادی کیوں نہیں کی؟“

درا صل میں کنوارا ہی مرنا چاہتا ہوں۔“

”ارے واہ، یہی تو میں بھی چاہتی ہوں۔“

”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ آپ جیسی کوئی عالی نسب خاتون ناکھدا کیسے رہ سکتی

ہے۔“

”کیوں۔“

”دیکھئے نا اس دنیا میں کیسے کیسے والا شان، کیسے کیسے نامور تاجدار موجود ہیں جو خود کو خوش قسمت تصور کریں گے“

”ممکن ہے کہ ایسے تاجدار موجود ہوں لیکن میر عمارت صاحب، آپ ان میں سے کس کو میرے لئے منتخب کریں گے؟“

”اگر مجھ سے پوچھا جائے تو صرف فرہادی آپ کے لائق ہوتا۔“

”لیکن فرہادی کیوں؟“

فضل الدین بری طرح بوکھلا گیا اور خان زادہ بیگم نے فوراً ہی دوسرا، پر معنی سوال پوچھ لیا:

”فرہاد میر عمارت تھا۔ آپ ہی کی طرح۔ شاید اسی لئے؟“

”شہزادی ایسا کہنے کا مجھے کوئی حق نہیں“ فضل الدین نے اداسی اور سنجیدگی سے کہا۔

خان زادہ بیگم بھی سنجیدہ اور اداس ہو گئی اور اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔

”آخر پروردگار نے مجھے تاجدار کی دختر کیوں بنایا؟“ اس نے صدق دل سے کہا۔ ”اگر میں کوئی

معمولی لڑکی ہوتی تو میرے لئے حصول مسرت آسان ہوتا“

یہ اعتراف کتنا ہی دردناک کیوں نہ رہا ہو، اس سے فضل الدین کو خوشی ہی ہوئی۔ اس کے دل میں خیال آیا۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ خان زادہ بیگم نے میری محبت کو بھانپ لیا؟ وہ نہ صرف یہ کہ میری محبت سے واقف ہیں بلکہ میں ”تاجدار کی دختر“ میں جو بے پایاں کشش محسوس کرتا ہوں اس سے شاید ہمدردی بھی رکھتی ہیں؟ انھوں نے یہ بات کہیں اسی لئے تو نہیں کہی ہے کہ ان کی اور میری حیثیت میں پایا جانے والا فرق خود ان کے لئے بھی باعث پریشانی ہے؟ ویسے تو یہ ناممکن ہے لیکن اگر خان زادہ بیگم کو بھی مجھ سے محبت ہو گئی تو میں ان کی اور اپنی حیثیتوں کے اس فرق سے پیدا ہونے والی مشکلات پر کیسے، آخر کیسے قابو پاسکوں گا؟ میں نے اوش میں جو چھوٹا سا حجرہ تعمیر کیا تھا اس کی بنا پر مرزا بابر نے مجھے عزت دی ہے۔ اگر میں ایسی شاندار عمارتیں تعمیر کروں جن سے دنیا میں میری شہرت پھیل جائے تب کیا ہوگا؟ کیا تب بھی میں ممتاز اور عالی نسب افراد کے مقابلے میں حقیر ہی تصور کیا جاؤں گا؟ مرزا بابر اپنی ہمشیرہ کو بہت عزیز رکھتے ہیں۔ وہ نیک دل ہیں۔ شاید وہ ہم دونوں پر مہربان ہی ہو جائیں؟

فضل الدین کو اس کے خوابوں نے کہاں سے کہاں پہنچا دیا لیکن خوابوں میں رکھا ہی کیا تھا؟ خان زادہ بیگم جس سے وہ محبت کرتا تھا، اس پر عنایت کرتی رہتی تھی، اس سے بار بار ملاقات کرنے کی خواہاں رہتی تھی اور فضل الدین کے لئے تو یہ صورت حال بھی بہت بڑی خوش قسمتی تھی۔۔۔

اس وقت اندجان محاصرے میں تھا۔ باغی بیگم نے سارے ماورالنہر میں بغاوت کی آگ بھڑکادی تھی۔ میر عمارت کے سارے خوابوں اور ساری مسرتوں کو ظلمت، آج کی تاریک رات کی جیسی ظلمت نکل گئی تھی۔ عمارتوں کے نقشے رومی کاغذات میں تبدیل ہو گئے تھے۔ وہ جنگ اور بھاڑے کے سپاہیوں سے سخت نفرت کرتا تھا لیکن آج اس نے قلعے میں سمرقند سے موصول ہونے والی خبر بد سنی اور خان زادہ بیگم کو پوری طرح مسلح دیکھا تو وہ خود کو اس سب سے بے تعلق نہ رکھ سکا۔ اس نے سوچا کہ لرزہ بر اندام ہو کر مقدر کی مار کا انتظار کرنے سے خان زادہ بیگم کا سپاہی بن کر، ہتھیار اٹھا کر لڑنا کیس زیادہ بہتر ہوگا۔

پریشان اور مہیب تیرگی میں ڈوبے ہوئے شہر میں اس نے سپاہی کی حیثیت سے سپاہیوں کے درمیان چلتے ہوئے اپنے آپ سے کچھ قدموں ہی کے فاصلے پر خان زادہ بیگم کو دیکھا، سوچا کہ وہ اس کی حفاظت کر سکے گا اور اس خیال سے اسے کچھ سکون میسر ہو گیا۔

ان لوگوں کو مرزا دردازے کے قریب فیصل کے باہر سے قربانوں کی لکارتی ہوئی آوازیں، نثاروں کی گونج اور سینکڑوں سپاہیوں کا شور سنائی دیا۔

”دشمن دروازے کھول کر شہر میں داخل ہو جانے کی کوشش کر رہا ہے!“ خان زادہ بیگم نے چلا کر کہا اور گھوڑے کی لگام ڈھیلی چھوڑ دی۔

سپاہی اپنے گھوڑوں کو سرپٹ دوڑاتے ہوئے اس سے آگے نکل کر پھانک کے پاس پہنچ گئے۔ لیکن مرزا دروازے کے باہر چپتا ہوا شور، یلغار کے لئے لگائی جانے والی سیڑھیاں اور فصیل کی دوسری جانب سے اڑاڑ کر اندر آتے ہوئے تیر۔ یہ سب کچھ محض فریب دینے کے لئے تھا۔ عین اس وقت دشمن فصیل کے گھیرے کی دوسری جانب اپنی زیادہ تر سیڑھیاں کھڑی کر رہا تھا۔ اور اس جگہ خواجہ عبداللہ کے پاس سپاہی کم تھے۔

خان زادہ بیگم اپنے سپاہیوں کے ساتھ پیرداروں کے حجرے میں گئی۔ ایک سپاہی نے مشعل جلائی اور اوپر جانے والے زینے کی سیڑھیاں طے کر کے سب سے پہلے فصیل کے اوپر پہنچ گئی اور اس نے دوسروں سے آگے نکل کر زینے پر قدم رکھ دیا۔

منڈیر پر سپاہی کھڑے ہوئے تھے۔ خان زادہ بیگم بھی مشعل ہاتھ میں لئے ہوئے وہاں پہنچ گئی۔ فضل الدین نے فوراً ”ہی مشعل اس کے ہاتھ سے لے لی۔

”ہوشیار رہئے، شہزادی، ایسا نہ ہو کہ روشنی میں دشمنوں کی نظر آپ پر پڑ جائے۔“

محافظین کو ان چوڑی سیڑھیوں کے اوپری حصے نظر آنے لگے جو باہر فصیل سے نکلا کر لگائی گئی تھیں۔ مکھ پہنچ جانے سے پہلے دار کا حوصلہ بڑھ گیا، اس نے جھک کر اپنے دونوں ہاتھوں سے ایک سیڑھی کے اوپری حصے کو پکڑا اور اسے نیچے گرا دینے کی کوشش کرنے لگا لیکن عین اسی لمحے دشمن کا ایک تیر آکر اس کے سینے میں اتر گیا۔ پجارا نوجوان سیڑھی سمیت فصیل سے نیچے جا گرا۔

منڈیر کے قریب ہی پتھر ڈھیر تھے۔ خان زادہ بیگم نے ایک بڑے پتھر کو بمشکل اٹھا کر نیچے پھینک دیا۔ اس کے بعد سپاہی بھی پتھر پھینکنے لگے اور فصیل کے باہر نیچے سے ابھرتی ہوئی گالیوں اور کراہنے کی آوازوں نے واضح کر دیا کہ پتھر نثانے پر لگ رہے ہیں۔

اس اثنا میں فصیل کے گھیرے کے ایک دوسرے حصے میں جہاں خاقان دروازہ واقع تھا، نقاروں اور قرناؤں کی آوازیں اور فتح کے نعرے فضا میں گونج اٹھے۔ یہ آوازیں تیز ہوتی جا رہی تھیں، قریب آتی جا رہی تھیں، شہر کے بالکل پاس ہی سے ابھر رہی تھیں۔

”شہزادی، ذرا غور سے سنئے!“ فضل الدین گہرا کر چیخ اٹھا۔ ”دشمن شہر میں داخل ہو گیا!“

نویان کو کھٹاش مایوسی سے چیخ اٹھا:

”ارے شہزادی، غداروں نے خاقان دروازہ کھول دیا۔ فوراً قلعے کو واپس چلے۔ قلعے کو، قلعے

”کو!“

خان زادہ بیگم تیزی کے ساتھ زینے سے اترنے لگی اور میر عمارت فضل الدین اور چند سپاہی مشعلوں سے راستہ دکھاتے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے لپکے۔ نیچے پہنچ کر سب لوگ جلدی سے اپنے گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔

”مشعل کو پھینک دیجئے!“ خان زادہ بیگم چلائی۔

مشعل فضل الدین کو واقعی تاریکی میں نظر آتا ہوا بہت اچھا نشانہ بنا دیتی۔ وہ لوگ گھوڑوں کو اندھیرے میں سرپٹ دوڑاتے ہوئے قلب شہر میں واقع قلعے کی طرف چل دیے۔

لیکن قلعہ تھوڑی ہی دور رہ گیا تھا تو نیزے اور مشعلیں لئے کثیر تعداد گھڑسواروں نے ان کا راستہ روک لیا۔ تب انہوں نے مشعلوں کی روشنی میں احمد تہل کو دیکھا، کمر میں کار جوئی کا پٹکا تھا اور سر پر چھما تا ہوا خود۔ فضل الدین کو لگا جیسے اچانک اس کے دل کو سرد آہنی زنجیروں نے جکڑ لیا۔ دشمن کے ان سواروں نے خان زادہ بیگم اور اس کے سپاہیوں کو گھیر لیا۔ احمد تہل نے مذاقہ لہجے میں اپنے ایک سپاہی کو حکم دیا:

”ارے ذرا مشعل تو دیتا..... اناہ، خان زادہ بیگم؟ آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا ہے۔ آخر اس کا مطلب ہے؟ آپ نے یہ ایسا لباس کیوں زیب تن کر رکھا ہے جیسے کوئی بہادر مرد ہو؟“

”بچے، وفادار اور بہادر مرد دنیا میں رہے ہی کہاں!“

”اند جان میں اگر بچے مرد نہیں بنے تو لیجئے، ہم حاضر ہیں، شہزادی!“

ازون حسن جو احمد تہل کے پیچھے کھڑا ہوا تھا، ہنس پڑا۔ اتنے میں کچھ اور گھڑسوار آں پہنچے اور مشعل کی روشنی بے ریش علی دوست بیگ پر پڑی جو آنکھیں بھیچتے ہوئے قابل رحم انداز سے مسکرا رہا تھا۔ باہر اپنی روانگی کے وقت شہر اس شخص کو سوئپ گیا تھا۔ باہر کے بستر مرگ پر پڑے ہونے کی خبر سننے کے بعد علی دوست بیگ کو اس سے کوئی امید نہیں رہ گئی تھی اور اسی نے احمد تہل سے ساز باز کر کے محاصرین کے لئے خاقان دروازہ کھول دیا تھا۔

خان زادہ بیگم نفرت کے ساتھ چیخ اٹھی:

”آپ خود کو سچا مرد تصور کرتے ہیں کیا؟ آپ لوگوں کے لئے تو شجاعت اور غداری میں کوئی فرق نہیں! ابھی کل ہی کی بات ہے کہ آپ نے مرزا باہر سے وفاداری کی قسم کھائی تھی اور آج..... مجھے معلوم ہے کہ کل آپ مرزا جہانگیر کے ساتھ بھی غداری کر بیٹھیں گے!“

تہل نے اپنی تلوار کے دسے پر ہاتھ رکھ دیا۔

”ذرا سوچ سمجھ کر بات کیجئے، شہزادی!“ اس نے کہا۔

”بے وفائی تو مرزا باہر نے کی۔ ان کے سرِ قد پر قابض ہو جانے کے بعد اندجان مرزا جہانگیر کو مل جانا چاہئے تھا۔ لیکن باہر اس پر راضی نہ ہوئے۔ ہمیں انصاف کی خاطر تلوار اٹھانی پڑی اور آج ہم ظفر اب ہوئے! ... اور آپ ... آپ ...“ بیک اچانک غصے سے آگ بگولا ہو گیا، ”آخر آپ شرم و حیا کو بالائے طاق رکھ کے ہماری بے عزتی کیوں کر رہی ہیں؟ آپ کو یہ طرزِ عمل سیکھایا کس نے جو ایک دختر تاجدار کے قطعاً ”شایانِ شان“ نہیں؟ کہیں اسی میرِ عمارت نے تو نہیں جو آپ کے سامنے کھڑا ہوا ہے؟“

اور انگاروں کی طرح دھکتی ہوئی آنکھیں فضل الدین کو گھورنے لگیں۔ فضل الدین نے بھی اپنی نظریں نہ جھکائیں۔

”شہزادی نے ہم مردوں کو تہذیب کا سبق سکھایا ہے۔ ان کے الفاظ کو دوسرے معنی کوئی دعا باز ہی پہنا سکتا ہے!“

”کون ہے دعا باز؟“ تہل نے تلوار کو نیام سے کھینچ کر فضل الدین کی طرف گھوڑا بڑھایا۔ اس لمحے خان زادہ بیگم نے بھی اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور تہل کو وار کرنے سے روک دیا۔

”کسی میرِ عمارت پر تلوار اٹھاتے ہوئے شرم آنی چاہئے!“

تہل اور خان زادہ بیگم کے گھوڑے ایک دوسرے سے ٹکرا کر کانپ اٹھے اور الف ہو گئے۔ تہل خان زادہ بیگم کے سر کے اوپر تلوار گھمانے لگا۔

”آپ اس کی حفاظت کر رہی ہیں ... اس نقشے سازی؟ او چھہ خاندان کے اس زنا کار ہراتی کی؟ شرم نہیں آتی؟ ارے ہاں، مجھے باخبر لوگوں نے بتایا تھا کہ یہ استاد شہزادی کو گمراہ کر رہا ہے لیکن مجھے یقین نہیں ہوا تھا۔ اب ہو گیا!“

”ارے غدار! تو تو مجھ پر ہمت نہیں لگا سکتا!“ خان زادہ بیگم نے غصے سے کہا اور خنجر نکال لیا۔ خنجر تہل کی زہ سے جسے وہ پھونکے، بچے پنے ہوئے تھا، ٹکرایا اور خان زادہ بیگم کے ہاتھ سے چھوٹ کر جھنجھناہٹ کے ساتھ پتھروں پر جا گرا۔ تہل نے فوراً ہی وار کیا لیکن تلوار صرف شہزادی کی دستار کے ایک کونے ہی سے لگی جو سر سے لڑھک کر خنجر کے پاس جا گری اور خان زادہ بیگم کے لمبے لمبے بالِ شانوں پر لہر گئے۔

اتنے میں مرزا جہانگیر اپنے محافظ دستے کے ساتھ وہاں آ پہنچا۔ اسے دیکھتے ہی علی دوست بیک نے تہل کو آگاہ کر دیا۔

خان زادہ بیگم مرزا جہانگیر کی سوتیلی بہن تھی پھر بھی بہر حال بہن تو تھی ہی اور وہ سب کے سامنے اس کی بے عزتی کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ احمد تبیل نے اپنے گھوڑے کو جہانگیر کی طرف موڑ کر اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی:

”آپ نے دیکھا، دیکھ لیا تا حکمران عالی؟ آپ کی ہمیشہ ہاتھوں میں ہتھیار لئے ہم پر حملہ کر رہی ہیں۔ ان کے قریب یہ ادنیٰ خاندان کا مکار کھڑا ہوا ہے، یہ معمار۔ یہی شخص تو انہیں گمراہ کر رہا ہے!“

”میر عمارت فضل الدین تم جیسے غدار بیگ سے زیادہ پاکباز ہیں، ہزار گنا زیادہ!“ خان زادہ بیگم چیخ اٹھی۔ ”ان کے فن پر اندجان ناز کر سکتا تھا۔ اور آپ، آپ.... سب کے سب قاتل ہیں، غدار ہیں!.... آپ سب پر ہمارے خوابوں کو پاش پاش کر دینے کے لئے پروردگار کا قہر نازل ہوا!.... ہمارے خوابوں کو چکنا چور کرنے کے لئے!“

خان زادہ بیگم کے ان الفاظ کے ساتھ ہی ساتھ ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ وہ گھوڑے کو چابک مار کے قلعے کے پھانک کی طرف جانا چاہتی تھی لیکن سپاہیوں کی دیوار کے سامنے رکنے پر مجبور ہو گئی۔ تب اس نے یہ معلوم کرنے کے لئے کہ فضل الدین کا کیا حشر ہوا، مڑ کے پیچھے دیکھا۔ فضل الدین نے کمر پر تلوار ٹٹول کے اناڑی پن کے ساتھ اسے میان سے نکالا اور خان زادہ بیگم کا راستہ روک لینے والے سپاہیوں کی طرف جھپٹا۔ لیکن گھڑسوار فوجیوں نے اس کے گھوڑے کو دونوں طرف سے دبوچ کر اس کے بائیں ہاتھ سے لگام چھین لی اور دائیں ہاتھ پر موٹا ڈنڈا مار کر تلوار نیچے گرا دی۔

چند لمحات کے بعد جب جہانگیر کے اشارے پر سپاہیوں نے خان زادہ بیگم کو جانے کا راستہ دیا اور وہ قلعے کے پھانک میں داخل ہوئی تو اس نے مڑ کر دیکھا کہ تبیل کے سپاہیوں نے فضل الدین کو زین پر سے نیچے گھسیٹ کر آٹا ”فانا“ اس کی مٹکیں کس کر باندھ دیں اور سینے سے نیزوں کی نوکیں شاکر اسے اپنے ساتھ لے گئے۔

2

فضل الدین کو ہاتھ میں تیز درد کا احساس اس وقت ہوا جب وہ زنداں کی تاریکی میں تھراہ گیا۔ اسے اندجان کے سرے پر واقع پتھروں سے بنے ہوئے اس زنداں کی سزائے موت پانے والوں کے لئے مخصوص کوٹھری میں دھکیل کر کوٹھری مقفل کر دی گئی تھی اور بارہود پسریدار بھی تعینات کر دیئے گئے تھے۔ وہ قلعے کے پھانک پر مرزا جہانگیر اور احمد تبیل کے درمیان ہونے والی مختصر بات چیت

سے سمجھ گیا تھا کہ اس پر شہزادی کی عصمت خاک میں ملانے کی کوشش کرنے کا الزام لگایا جائے گا جس کے لئے مجرم کو سنگ سار کر دیا جاتا تھا۔ اور یہ سزا اگلے روز دی جانے والی تھی فضل الدین سمجھ رہا تھا کہ خان زادہ بیگم کو بدنام کر کے احمد تہل کو کتنی خوشی ہو رہی ہوگی۔ بیک انتقام لے رہا تھا اور جہانگیر اس کی ہاں میں ہاں ملا رہا تھا کیونکہ اسے اور اس کی ماں فاطمہ سلطان بیگم کو یہ ثابت کر دکھانے کی بڑی فکر تھی کہ جو لوگ باہر کے ساتھ ہیں وہ نہایت ہی بد رکروار ہیں جب کہ اند جان کے تحت پر قانوناً قابض ہونے والے خود وہ لوگ نہایت ہی پارسا۔

فضل الدین نے سلین اور گھٹن بھری کو ٹھری کی دیواروں سے اپنے ہاتھ جو پیٹھ کے پیچھے بندھے ہوئے تھے، کئی بار سٹائے کہ شاید اس طرح کلائی کا درد کم ہو سکے۔ لیکن درد کے کم ہونے کے بجائے برابر بڑھتا ہی جا رہا تھا..... یہ تو ڈنڈے کے صرف ایک ہی وار کا نتیجہ تھا جبکہ اگلے روز..... اس پر جانے کتنے ہی پتھر برسنے کو تھے.... اس نے تصور کیا کہ یہ سب کیسے ہو گا تو اس کا سر چکرا گیا اور لگا جیسے وہ زنداں کی کوٹھری میں نہیں بلکہ دو مرتش کوہ ساروں کے درمیان کھڑا ہوا ہے جن کی ڈھلانون سے بڑے بڑے پتھر لڑھکتے چلے آ رہے ہیں اور اسے بس کچل دینے ہی کو ہیں۔ اس نظارے سے خائف ہو کر وہ دروازے کی طرف لپکا، اس پر پیٹھ سے زوردار گمرامی اور چیخ اٹھا:

”کھولو! کھولو! میں کہتا ہوں، کھولو!“

اس غیر متوقع چیخ سے دونوں پریدار گھبرا اٹھے اور جب حواس درست ہوئے تو ان میں سے ایک نے غصے سے کہا:

”پاگل ہو گیا ہے کیا؟ بات کیا ہے؟“

”میرے ہاتھوں کو کھول دیجئے۔ کل جان لے لیجئے گا، لیکن میرا ہاتھ زخمی ہو گیا ہے۔ کھول دیجئے!“

پریدار بری طرح بھنائے ہوئے تھے اور بھناتے کیوں نہ، وہ وہاں کھڑے قیدی کی گمرانی کر رہے تھے جب کہ ان کے دوسرے ساتھی باہر کے طرفداروں کے ہاں مال لوٹ رہے تھے۔ رات کا وقت تھا پھر بھی اند جان کے کوچوں اور احاطوں میں شور قیامت برپا تھا۔ گھوڑوں کی ٹاپوں، کتوں کے بھونکنے، عورتوں کے رونے چلانے، گایوں کے رہمہانے اور بھیڑیوں کے میانے کی آوازیں زنداں تک سنائی دے رہی تھیں۔ پریداروں کو وہاں کھڑے کھڑے کافی مال غنیمت سے محروم ہونا پڑ رہا تھا۔ یہی نہیں، کبجنت قیدی بھی بالکل نکما اور گلا پھاڑ کر چلانے والا تھا۔ ایک پریدار نے جو عمر میں دوسرے سے کچھ بڑا تھا، بھرائی ہوئی آواز سے کہا:

”تو کہہ رہا ہے کہ ہاتھ میں چوٹ لگی ہے!۔۔۔ ارے بد معاش، کل تو دوسری دنیا میں پہنچ جائے گا، آخر آج یہ ہاتھ کا روٹنا کاہے کے لئے رو رہا ہے؟“
 ”جلا دیکھیں کے!“

”چپ وہ، زندہ لاش، خاموش ہو جاوے اندر آ کے ایک زخم کے دس کردوں گا!“
 ”ایسے میں جب کہ موت سر پر کھڑی ہے، مجھے یہ سب سننا پڑ رہا ہے“ فضل الدین نے دل ہی دل میں کہا۔ ”لوگ آخر اتنے بے رحم کیسے ہو جاتے ہیں؟ کیسی واہیات بات ہے کہ دنیا سے کوچ کر رہا ہوں! موت کو ٹالنا ممکن ہی نہ تھا تو کیا احمد تبیل سے لڑ کر تلوار ہاتھ میں لئے لئے جان دینا بہتر نہ ہوتا؟۔۔۔ اس وقت مجھے ان حیوانوں کی گالیاں سننی پڑ رہی ہیں اور کل سنگ سار کر دیا جائے گا۔۔۔ یہ تو ممکن ہی تھا کہ میں خان زادہ بیگم کے سامنے تبیل پر ٹوٹ پڑتا۔ ہائے قسمت، تو نے مجھے ایسا کیوں نہ کرنے دیا؟“

اتنے میں گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دیں، پہلے یکی سڑک پر اور پھر زنداں کے احاطے میں جہاں فرش پر پتھر، بڑے ہوئے تھے۔
 ”کون ہے؟ ٹھہر جاؤ!“

احاطے میں داخل ہو جانے والے تین گھڑسواروں میں سے ایک نے پیریدار کو جواب دیا:
 ”محترم قاضی شہر، مولانا خواجہ عبداللہ شاہی فرمان کے ساتھ تشریف لائے ہیں!“
 تینوں ایک ایک کر کے گھوڑوں سے اترے اور پیریداروں کے ترچھے رکھے ہوئے نیزوں کی نوکوں کے عین سامنے تک آگئے۔

فرمان تو ہمارے وہ باشی کو دکھانا چاہئے!“ بڑی عمر اور بھرائی ہوئی آواز والے پیریدار نے کہا۔
 احاطے میں کھلنے والے دروازے کے اوپر ایک چراغ ٹمٹما رہا تھا۔
 ہلکے زرد چوٹے میں لمبوس خواجہ عبداللہ نے نیزوں کی طرف سیدھے بڑھتے ہوئے پرسکون اور پراعتماد لہجے میں کہا:

”آپ کے وہ باشی کو تو ہم تلاش نہیں کر سکے۔ آپ دونوں کے سوا یہاں آس پاس اور کوئی بھی موجود نہیں ہے۔ ایسا کیوں؟“

عمر میں چھوٹے سپاہی نے اپنی جھلاہٹ چھپائے بغیر جواب دیا:

”اور سب لوگ تو مال لوٹنے گئے ہیں!“

خواجہ عبداللہ نے گول لیٹا ہوا کانڈا ان دونوں کو دکھایا۔

”تب تو فرمان کی قہیل آپ ہی کو کرنی ہوگی“ اس نے بڑے پرسکون انداز سے کہا۔ ”لیجئے، پڑھ لیجئے!“

اس کے پیچھے رک جانے والے دونوں سپاہی گھوڑوں کو دیوار کے قریب ایک لمبی میں باندھ کر قریب آگئے۔

”آپ لوگ وہیں کھڑے رہئے!“ بھرائی ہوئی آواز والا چلایا۔

سپاہی ٹھہر گئے۔ پیریدار نے نیزے ہٹا کر خواجہ عبداللہ کے لئے راستہ ہٹا دیا اور کانڈ کو لے کر اس پر نظریں دوڑائیں۔ قیمتی کانڈ پر مختصر سی عبارت درج تھی اور اس کے نیچے بڑی سی مرگلی ہوئی تھی۔ اس نے کانڈ کو روشنی کے قریب لے جا کر مر کو غور سے دیکھا (پڑھنا اسے ٹھیک سے نہیں آتا تھا)۔

”لو، ذرا پڑھو تو۔“

لیکن دوسرا بالکل ہی ناخواندہ تھا۔ خواجہ عبداللہ ہی پڑھ سکتا ہے۔ پیریدار نے کانڈ کو کئی بار الٹ پلٹ کر خواجہ عبداللہ کی طرف دیکھا:

”پیر صاحب، یہ فرمان ہے کاہے کے بارے میں؟“

”اس میں کہا گیا ہے کہ یہاں بندی قیدی انتہائی خطرناک اور غدار ہے۔ اور یہ کہ ہمیں اسے قلعے کے زندان میں لے جانا ہے۔“

کچھ فاصلے پر کھڑے ہوئے سپاہی نے بلند آواز سے کہا:

”محترم قاضی صاحب کو قلعے میں اس بد معاش سے اچھی طرح پوچھ گچھ کرنی ہے!“

خواجہ عبداللہ اندجان کا قاضی تھا، اس بات سے تو سمجھی واقف تھے۔ خود بڑی عمروالا پیریدار بھی اسے دیکھتے ہی پہچان گیا تھا۔ پھر بھی اسے ہچکچاہٹ محسوس ہو رہی تھی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ قاضی ابھی کچھ ہی دنوں قبل تک بابر کا حمایتی تھا۔

”یہ فرمان خود مرزا جہانگیر ہی کا ہے نا؟“ بھرائی ہوئی آواز والے پیریدار نے نیزے کو مضبوطی سے تھام لیا۔

”شک ہو تو پڑھ کیوں نہیں لیتے!“

”ہمیں اس بد معاش پر سختی سے پھرا دینے کا حکم دیا گیا ہے، بہت سختی سے، پیر صاحب!“

”آپ لوگ اسے سختی سے پھرا دینا کہتے ہیں؟ صد باشی کہاں ہیں؟ وہ باشی کہاں ہیں؟ صرف آپ دو ہی سپاہی یہاں کیوں تعینات ہیں؟ اور اگر مجرم کے حمایتی زیادہ تعداد میں آجائیں تو؟ نہیں، اس

قیدی کو فوراً ہی قلعے میں لے جانا ہو گا! دروازہ کھولے!“

جوان پریدار نے خود سے بڑی عمروالے ساتھی کی طرف دیکھا: ”کیا دیکھ نہیں رہے ہو؟ یہ قاضی صاحب بھی مرزا جانیگر کے طرفدار ہو گئے ہیں۔“ لیکن دوسرا پریدار اب بھی تذبذب میں مبتلا تھا۔

”لیکن ہم وہ باشی کو کیا جواب دیں گے؟“

”آپ دونوں کو بھی ہمارے ساتھ چلنا ہو گا!“ خواجہ عبداللہ نے کہا۔ ”اس کی نگرانی تو ہم سب کو کرنی ہوگی، دو سپاہی ناکافی ہوں گے!“

بھرائی ہوئی آواز والا اس دلیل سے شاید مطمئن ہو گیا اور اس نے نیزے کو دیوار سے نکال کر دروازے کا قفل کھول دیا۔ لیکن وہ اندر قدم رکھ بھی نہیں پایا تھا کہ خواجہ عبداللہ کے ایک ساتھی نے اس کے خود پر زور دار وار کر کے کوٹھری کے اندر ڈھکیلتے ہوئے اسے اپنے قدموں میں گرا لیا۔ ان لوگوں نے دوسرے سپاہی کو بھی جو ہکا بکا رہ گیا تھا، ٹنکڑی مار کر فرش پر گرا دیا اور اس کے سر پر تنگ بوری چڑھا دی۔

خواجہ عبداللہ نے اپنے ساتھیوں سے صاف آواز سے کہا:

”انہیں ہلاک نہ کیجئے۔ ہم کسی کا خون اپنی گردن پر نہیں لیتا چاہتے۔“

”لیکن یہ لوگ بعد میں ہمارے نام بتا دیں گے۔“

جوان پریدار سیاہ بوری سے اپنے سر کو نکالنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے رونی آواز میں منت سماجت کرنے لگا:

”پیر صاحب رحم کیجئے، میرے پیر! میں کبھی بھی آپ کا برا نہ چاہوں گا! میری جان نہ لیجئے!“

”خاموش ہو جاؤ، نہ انجام برا ہو گا“ سپاہی چلایا اور فضل الدین نے اپنے بھانجے کی آواز پہچان

لی۔

”ٹھہرو!“ خواجہ عبداللہ نے طاہر کو حکم دیا۔ ”ہاتھ پیریا بندھ دو“ اس کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔

اور دوسرا والا تو بے ہوش ہی ہو چکا ہے۔“

”میں دیکھتا ہوں!“

فضل الدین طاہر اور خواجہ عبداللہ کی طرف لپکا!

”محترم استاد!..... میرے بھانجے! طاہر جان!..... میرے نجات دہندہ.....!“

خواجہ عبداللہ میر عمارت کو محبت بھرے انداز میں لیکن مضبوطی کے ساتھ سارا دیتا ہوا محکمیں

کھولے بغیر ہی احاطے میں لے آیا۔ یہاں اس نے دروازے کے اوپر رکھے ہوئے چراغ کی روشنی میں فضل الدین کے ہاتھوں پر بندھی ہوئی رسی خنجر سے کاٹ دی۔
طاہر اور اس کا ساتھی دوسرے پیریدار کو بھی گھسیٹ کر کوٹھری میں لے گئے اور باہر سے دروازہ بند کر دیا۔

”میرے عزیز بھانجے، خدا نے تمہیں یہاں کیسے بھیج دیا؟“

”میں سرقہ سے آیا ہوں، قاصد بن کر۔“

”مرزا بابر کی صحت کیسی ہے؟“

”وہ صحت یاب ہو چکے ہیں۔ مدد کے لئے جلد ہی یہاں پہنچنے کو ہیں!“

”انہیں معلوم ہے کہ اند جان پر دشمنوں نے قبضہ کر لیا؟“

”ابھی تک تو نہیں، یہی تو مصیبت ہے۔۔۔“

خواجہ عبداللہ نے چپکے سے کہا:

”آہستہ آہستہ بولے، مہربانی کر کے آہستہ آہستہ۔“

طاہر نے ماموں کو اپنے گھوڑے پر بٹھالیا اور وہ لوگ دھیرے دھیرے، بڑی چوکی کے ساتھ شہر سے باہر نکلنے لگے۔ خوش قسمتی سے راستے میں انہیں کوئی بھی نہ ملا۔ فاقین تو گھروں کو لوٹنے میں مصروف تھے۔

تین گھوڑوں پر سواریہ چاروں افراد فیصل کے پاس پہنچ گئے۔ وہاں بھی کوئی موجود نہ تھا۔

”باہر اترنے کے لئے موزوں ترین جگہ یہی ہے“ خواجہ عبداللہ نے کہا جس نے ایک بار بھی

اپنی آواز اونچی نہیں ہوئے دی تھی۔ طاہر کے ساتھی نے لپٹی ہوئی رسی کا ایک بڑا سا گولا خرمی سے

نکالا۔ طاہر نے رسی فیصل پر بھیگی اور اس کے سہارے وہ چاروں فیصل کے اوپر چڑھ گئے۔ خواجہ

عبداللہ فضل الدین کے پاس ہی کھڑا ہوا تھا (دروازے سے ہو کر باہر نکلتا خطرناک ہے۔)

”میں سمجھ رہا ہوں، پیر صاحب، شکریہ، استاد محترم!“ اس نے اپنی بگلی جیب سے کچھ نکال کر

میر عمارت کو تھما دیا۔ یہ تھی اشرفیوں سے بھری چڑی تھیلی۔

حکمران کی والدہ صاحبہ، ملکہ عالیہ نے دی ہے۔“

”اوہ، انہیں بھی معلوم ہو گیا کہ میرے ساتھ کیسا سلوک کیا گیا ہے؟“

”خانم نے ایشکبار ہو کر مجھ سے فرمایا کہ آپ کی جان بچائی جانی چاہئے۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ

تبل خان زادہ بیگم کو بدنام کرنا چاہتا ہے لیکن جب تک ہم زندہ ہیں، مرزا بابر کے خاندان کی عزت

میں ہرگز ہرگز نہ کٹنے دیں گے۔ سچ ہے نا؟“

”بالکل درست فرمایا آپ نے!“ فضل الدین نے تھیلی کو اندرونی جیب میں رکھتے ہوئے عزم کے ساتھ کہا۔ ”میں یہاں سے سیدھا جا کر مرزا بابر کی خدمت میں حاضر ہوں گا!“

”سنئے“ خواجہ عبداللہ نے کچھ اور بھی چپکے سے کہا۔ ”ہم اور عالی نسب خانم آپ کو ایک اور ہی مشورہ دینا چاہتے ہیں“ اور اس نے عربی میں بات شروع کر دی۔ فضل الدین کو اس نے کبھی عربی پڑھائی تھی اسی لئے میر عمارت اسے استاد کہا کرتا تھا۔ ”سنئے! سرفرد تو طاہریک جائیں گے جو قاصد ہیں۔ ممکن ہے مرزا بابر سرفرد سے روانہ ہو چکے ہوں اور راستے میں ہوں۔ طاہریک اس سے ملاقات کر لیں گے۔ جہاں تک آپ کا تعلق ہے، آپ نادر صلاحیتوں کے مالک ہیں، آپ کو تو اپنا پورا خیال رکھنا چاہئے۔ ماوراء النہر میں خوف اور بغاوت کی یہ لہر جلد ہی ختم ہونے والی نہیں.... آپ نے کبھی ہرات جانے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ اب اس خواہش کی تکمیل کا وقت آگیا ہے۔“ فضل الدین کی جو پہلے ہرات میں رہ چکا تھا، آنکھوں میں اس شہر تک کا طویل، بہت ہی طویل راستہ پھر گیا۔ اس راستے میں جانے کتنے ہی خطرناک مقامات آتے تھے اور اسے طے کرنے کے لئے کئی مہینے درکار تھے۔ میر عمارت کا دل مغموم ہو گیا: میں اس سب کو چھوڑ دوں لیکن کس کی خاطر؟ اس کے زخمی ہاتھ کا درد جسے وہ تقریباً فراموش کر چکا تھا، دوبارہ زور پکڑ گیا اور اس نے اپنی دائیں کلائی سہلائی۔

”میں کیسے..... اپنے وطن کو آخر کیسے چھوڑ دوں، محترم استاد؟“

”ابھی تو آپ خراسان جاییے جہاں علی شیر نوائی رہتے ہیں؟ وہیں آپ کا وطن ہو گا۔“

”بے شک.... لیکن وطن.... میں شاید واپس نہ ہو سکوں اور گھر میں میری کتابیں نقشے رکھے

ہوئے ہیں۔ طاہر!“

”میں آپ کے گھر جا کر ساری چیزیں اچھی طرح چھپا دوں گا، آپ فکر نہ کیجئے، ماموں جان!“ یادیں فضل الدین کے دل کو تڑپانے لگیں۔ یادیں خان زادہ بیگم کی جس کا اسے ایسا لگ رہا تھا کہ اب کبھی بھی دیدار میسر نہ ہو گا۔ ہاں، وہ سمجھتا تھا کہ خواجہ عبداللہ اور قلوغ نگار خانم کے اسے ہرات بھیجنے کے فیصلے کا ایک سبب یقیناً ”اس کے اور خان زادہ بیگم کی محبت بھرے اور پیچیدہ تعلقات بھی تھے“ اس کے لئے بیک وقت باعث راحت اور باعث اذیت تعلقات۔

طویل خاموشی کے بعد آخر کار اس نے خواجہ عبداللہ سے کہا:

”استاد محترم، مرزا بابر کے نام پر حرف نہ آنے دینے کے سلسلے میں آپ کی مدد کرنے کے لئے

میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔ لیکن آپ سے میری ایک ہی التجا ہے: ملکہ صاحبہ سے کہہ دیجئے گا کہ وہ الٹی سیدھی انواہوں پر یقین نہ کریں۔ خان زادہ بیگم پر شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے، وہ اپنی پاک دامنہ کے اعتبار سے لاثانی ہیں!“

”اور میں جانتا ہوں کہ آپ بھی اتنے ہی پاک یاز ہیں۔ اگر ہم آپ کی ایمانداری پر اعتبار نہ کرتے تو بھلا خطرے میں ڈال کر پیرداروں کو دھوکا دے سکتے تھے؟ میرے وہم و گماں میں بھی نہ تھا کہ کبھی مجھے ایسا کام کرنا پڑے گا، میرا حوصلہ تو طاہر بیگ نے بڑھایا۔ لوگ کہتے ہیں تاکہ دشمنوں کی سازشوں کے جواب میں خود بھی چالاکی سے کام لیتا چاہئے۔“

”آپ نے تو مجھے دوسری زندگی عطا کر دی، محترم استاد! لیکن آپ سے گزارش ہے کہ خود بھی ہوشیار رہنے لگا۔ اور میرے بھانجے، تم بھی!“

مشرق میں افق کا ایک حصہ زرد ہو چلا تھا۔ فضل الدین اسی کا سرا اپنے جسم میں باندھنے لگا۔

”پھر ملاقات ہوگی، ماموں جان!“

”انشاء اللہ تعالیٰ.... ظاہر، میرے نقشوں کو.... دوسرے تمام کاغذات کو.... کہیں کھونہ دیتا۔ تم سپاہی ہو، تمہارے لئے انہیں حفاظت سے رکھنا مشکل ہو گا اس لئے موقع نکال کر انہیں خان زادہ بیگم کے حوالے کر دیتا.... سب کے سب، صرف نقشے ہی نہیں، سمجھ گئے نا؟“

”ضرور!“

”آپ کی اس خواہش سے میں خود ہی شہزادی کو مطلع کر دوں گا!“ خواجہ عبداللہ نے کہا۔

فضل الدین ہر ایک سے گلے مل کر رخصت ہوا اور گیارہ رووں والی فسیل سے نیچے اتر گیا۔

3

فضل الدین علی الصباح ہی تو جانے والی سڑک پر گامزن ہو گیا۔

اور اگلے ہی روز احمد تبیل کے سپاہی خواجہ عبداللہ کے ایک شاگرد کے گھر میں جہاں وہ خود چھپا ہوا تھا، زبردستی گھس گئے۔ دراصل زنداں کی کوٹھری میں بند پائے جانے والے پیرداروں نے تبیل کو بتا دیا تھا کہ فضل الدین کو کس نے اور کیسے آزاد کرایا تھا۔

احمد تبیل خوشی سے پھولانہ سلایا اور گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا ہوا اس مقام پر پہنچا جہاں خواجہ عبداللہ زیر حراست تھا۔ خاقان دروازے کی طرف جانے والی سڑک پر کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ خواجہ عبداللہ مسلح سپاہیوں کے حلقے میں دھیرے دھیرے چل رہا تھا پیرایوں تک لمبا کرتا، ہاتھ پیٹھ کے پیچھے بندھے ہوئے اور چہرہ اترا ہوا۔ عمامے اور کرتے کی سفیدی کالی کالی، کھنی کھنی

داڑھی سے ڈھکے ہوئے چہرے کی سیاہی کو کچھ اور زیادہ نمایاں کر رہی تھی۔
تبل کو راستہ دینے کے لئے لوگ پیچھے ہٹ گئے۔ خواجہ عبداللہ کو لانے والے سپاہی ٹھہر گئے
اور تبل نے لگام کھینچ کر اپنے گھوڑے کو روک لیا:

”ارے جھوٹے پیر! بابر کے کاسہ لیس! ہمارے خلاف سازشیں کر کے تیرا جی نہیں بھرا اور اب
ہمیں داؤں دے کر اس حرامی کو بھی قانوناً ”سزا پانے سے چھڑا کر بھگا دیا!“

”میں نے تو صرف ایک بے قصور کو نا انصافی کی موت سے بچایا ہے!“

”ہو نہ! بے قصور! جعلی فرمان اور مہر۔ یہ بے قصوروں کے کام تھوڑی ہیں!“

خواجہ عبداللہ پر سینکڑوں نگاہیں جمی ہوئی تھیں۔ اس کے دل میں خیال آیا: اگر اس وقت تبل
سے ڈر جاتا ہوں، اگر بوکھلا اٹھتا ہوں تو لوگ سوچیں گے کہ واقعی مجرم ہوں۔

اور اس نے پراعتقاد اور پرسکون نظر آنے کی کوشش کی:

”پہریداروں کو تو میں نے مرزا بابر کی مہر دکھائی تھی۔ میں تو بس انہی کو اندجان کا حکمراں تسلیم
کرتا ہوں!“

”ارے بے ایمان! تو اب بھی اپنے مریدوں کو فریب دینے کی کوشش کر رہا ہے! اور کون سی

مہریں ہو سکتی ہیں؟ مرزا بابر کا سمرقند میں انتقال ہو چکا ہے۔ تخت کے حق دار مرزا جمالتگیر ہیں!“

”مسلمانو! اس جھوٹ پر یقین نہ کیجئے! خدا کے فضل و کرم سے مرزا بابر زندہ و سلامت ہیں! وہ
اندجان آرہے ہیں!“

”جھوٹ تو خود ہی بول رہا ہے! لوگو! یہ شخص اپنے مریدوں کو فریب دے رہا ہے، اپنے جرم پر

پردہ ڈالنے کی کوشش کر رہا ہے! اس نے ایک مجرم کی، اپنے ایک یار کی فرار ہو جانے میں اعانت کی

ہے! بے ایمان کو سزائے موت ملنی چاہئے! لوگو! سنگ سار کر دیجئے اسے! آپ کوئی نیک کام کرنا

چاہتے ہوں تو سنگ سار کیجئے اسے!“

تبل نے کاٹھی سے یوں نیچے لٹک کر جیسے گھڑسواروں کے مذبح بکرے کو زمین سے اٹھانے کے

کھیل میں حصہ لے رہا ہو، گھوڑے کے سم کے قریب سے پھرتی کے ساتھ مٹھی کے برابر ایک پتھر

اٹھایا اور دوبارہ کاٹھی پر بیٹھ کر خواجہ عبداللہ پر مار دیا۔ پتھر خواجہ کے کشادہ سینے پر لگا اور سفید کرتے

پر غبار کی لکیر بناتا ہوا لڑھک کر زمین پر گر گیا۔ اچانک اٹھنے والے درد سے خواجہ عبداللہ کی

آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

سپاہی جھک کر موزوں پتھر تلاش کرنے لگے۔ خواجہ عبداللہ پوری قوت کے ساتھ چلایا:

”ارے مسلمانوں! آپ یہ کیا کر رہے ہیں!... ہوش میں آئیے!“

اتنے میں اسے ہجوم میں ایک بیس سالہ نوجوان دکھائی دیا اور اس کے ذہن میں اس واقعے کی یاد واضح طور پر تازہ ہو گئی جب ایک روز میر آب گاؤ کو سزائے موت دی گئی تھی۔ یہ نوجوان درویش گاؤ کا بیٹا تھا، اپنے باپ کی ہو ہو تصویر۔ خواجہ عبداللہ نے سوچا کاش اس موقع پر اس نے باہر سے کہا ہوتا: ”اس شخص کو سزائے موت نہ دیجئے!...“ کاش اس نے یہی کیا ہوتا! لیکن اس نے تو دوسرا ہی مشورہ دیا تھا: احمد تہل جیسے بیگوں کی مرضی کے خلاف قدم نہ اٹھائیے۔ وہ ایک بے قصور شخص کی حفاظت نہیں کر سکا تھا۔ اور اب وہ خود ہی اس حالت کو پہنچ گیا تھا کہ اسے بلا کسی جرم کے سزائے موت دی جانے والی تھی۔ اور اب درویش گاؤ کا بیٹا اپنے باپ کی موت کا بدلہ لینے کے لئے اس پر پتھر اڑ کرے گا۔ ضرور کرے گا اور کیا بیٹے کا یہ اقدام جائز نہ ہو گا؟ لیکن ابھی کوئی خواجہ عبداللہ کو پتھر نہیں مار رہا تھا۔ اس نے تو ایک آدمی کی جان بچائی تھی، سزائے موت آخر کیوں؟

”مسلمانو!“ خواجہ عبداللہ ایک بار پھر زور سے چلایا۔ ”میں انصاف کی راہ میں اپنی جان قربان کرنے سے نہیں ڈرتا! لیکن حق و انصاف پر ہے کون؟ ذرا یہ بھی سوچئے۔ چھوٹے بھائی کو بڑے بھائی کا دشمن کون بنا رہا ہے؟ نیک آدمیوں سے خار کون کھاتا ہے، کون ہے جو انہیں پتھروں، تلواروں یا بہتان تراشی کے ذریعے موت کے گھاٹ اتارنے کی کوشش کر رہا ہے؟ ہمارے لئے مصائب کے یہ ایام آخر لایا کون ہے؟“

”تو خود ہی لایا ہے.....“ احمد تہل برس پڑا۔

”میں نے تو مرزا بابر کو بچپن ہی سے علم حاصل کرنا سکھایا، انہیں انصاف پسند بادشاہ بننے اور ماورالنہر کو متحد کرنے کا شعور دیا تاکہ اقربا کش جنگیں ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائیں۔ مرزا بابر نے ایک عظیم کام ہاتھ میں لیا، سمرقند اور اندجان کو متحد کرنا شروع کیا۔ میں صدق دل سے مسرور ہوا لیکن آپ..... آپ لوگوں نے کیا کیا، باغی بیگو؟ آپ نے تو ایک بار پھر سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے..... مسلمانو، میری موت سے اگر آپ کی بد نصیبی ختم ہوتی ہو تو ضرور میری جان لے لیجئے، میں تیار ہوں!“

”اٹھاؤ پتھر، جلدی کرو، جلدی!“ تہل نے ہجوم کو حکم دیا۔ کسی شخص نے ہچکچاتے ہوئے روٹی سی آواز میں مخالفت کی:

”شیخ الاسلام کے فتوے کے بغیر ہم ایسا کیسے کر سکتے ہیں؟“

کسی بوڑھے نے اعتراف کیا:

”ہم پیر کے قبر سے ڈرتے ہیں!“

سپاہی تک پتھر مارنے کی جرات نہ کر سکے اور انہیں ہاتھوں میں لئے ہوئے تیل کی طرف مڑے۔ اس نے غصے سے پاگل ہوتے ہوئے حکم دیا:

”ارے صد باشی! تلوار کھینچ کر اس کا سر تن سے جدا کر دو!“

حبشی جیسے سیاہ فام صد باشی نے چاندی کی دستے والی تلوار نیام سے نکال لی۔ خواجہ عبداللہ نے اس سے آنکھیں ملا کر دھیرے سے انتباہ دیا:

”دیکھو، میریدل بیک، کہیں میرا معصوم خون تمہاری سات پشتوں کو تباہ نہ کر ڈالے۔“

ہجوم میں سہمی سہمی سرگوشیاں سنائی دیں:

”پیر صاحب کا خون ہماری گردنوں پر ہو گا!“

صد باشی کی تلوار اوپر نہ اٹھ سکی۔ اس نے اپنے آقا سے التجا کی:

”محترم بیک، مجھے اس کا ربد سے معاف فرمائیے!“

تیل نے اس کی پیٹھ پر زور سے چابک رسید کر دیا۔

”میں نے تجھے صد باشی کے عمدے سے بر طرف کر دیا، بزدل کیس کا!..... خیر ٹھیک ہے! سپاہیو!

اس بے ایمان کو دروازے کے پاس والی حوالات میں لے چلو! اور آپ“ اس نے ہجوم کی طرف قہر آلود نگاہوں سے دیکھا۔ ”آپ لوگ یسیں رہئے! کسی نے ہمارے پیچھے پیچھے آنے کی جرات کی تو سر قلم کر دیا جائے گا! ذرا بھی رحم نہیں کروں گا! ذرا بھی!“

کوئی گھٹنے بھر بعد احمد تیل اپنے سپاہیوں کے ہمراہ حوالات سے قلعے میں آگیا۔ بعد میں اہل اندجان حوالات کے نزدیک پہنچے تو انہوں نے خواجہ عبداللہ کو خاقان دروازے کے شہتیر سے لٹکتے دیکھا۔ پیر کا عمامہ زمین پر اس کے پیروں کے پاس پڑا ہوا تھا اور میت سیدھی ہو کر اکڑ گئی تھی۔ لوگوں نے میت کو احتیاط کے ساتھ پھانسی کے پھندے سے نکالا اور بے گناہ ہلاک کئے جانے والے شہید کی طرح سپرد خاک کر دیا۔

فصل بہاراں کی مسلسل بارشوں نے راستوں کو دلدل میں تبدیل کر دیا تھا۔ طاہر اڑتے ہوئے چھینٹوں کے درمیان کچڑ کے اوپر اپنے گھوڑے کو ذرا بھی دم لینے کا موقع دیئے بغیر سرپٹ دوڑائے جا رہا تھا۔ اسے جلد از جلد سر قند پہنچ کر اندجان کے واقعات کی تفصیلات بیان کرنی تھیں۔ اگر مرزا

بابر صحت یاب ہو کر اہل اندجان کی وفاداری پر اعتبار کرتے ہوئے سمرقند سے روانہ ہو جاتا، اگر اسے بروقت انتباہ نہ دیا جاتا تو برا ہوتا بہت برا! اور اسی لئے طاہر گھوڑے کو مسلسل دوڑائے جا رہا تھا۔ اس کا گھوڑا کافی طاقتور تھا لیکن کچھڑ میں ٹانگیں بری طرح دھنس دھنس جاتی تھیں اور دوڑنے میں بہت زور لگانا پڑ رہا تھا۔ آخر کار وہ مڑ حال ہو کر گر پڑا اور اس کے تنقنوں سے جھاگ کے ساتھ ہی ساتھ خون بھی بننے لگا۔ یہ واقعہ قوا کے نزدیک پیش آیا۔ طاہر نے کاٹھی کھول کر اپنے ساتھ لی، پیدل چلتا ہوا قوا پہنچا اور وہاں سے دوسرا گھوڑا لیا۔ پر یہ گھوڑا تو چوبیس گھنٹوں کی دوڑ بھی برداشت نہ کر سکا۔ اور ابھی قوتد، خوجند اور جزخ آنے باقی تھے، کوئی دس دنوں کا سفر اور باقی تھا..... طاہر اپنے اوپر سے اڑ کر جاتے ہوئے طائروں کو رشک بھری نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

ویسے طاہر اگر طائرین کر پر داڑ کرتا تو بھی سمرقند میں بابر سے ملاقات نہ کر پاتا۔ بابر اپنی ماں اور استاد کی مدد کے لئے بہ غلبت نکل کھڑا ہوا تھا۔ سفر میں اتنی تیز رفتاری نہ تھی جتنی کہ وہ چاہتا تھا لیکن اسے یہ امید بھی تو تھی کہ اندجان کافی دنوں تک محاصرے کو جھیل سکے گا۔ اندجان میں سال بھر کے لئے رسد اور خواجه عبداللہ جیسے دلیر شخص کی قیادت میں ہزاروں افراد موجود تھے۔ سمرقند نے تو ان دونوں سہولیات سے محروم ہونے کے باوجود سات مہینوں تک محاصرے کو برداشت کر لیا تھا۔

سمرقند سے روانہ ہو کر بابر بلنغور گاؤں اور غلیہ قلعے کے پاس سے گزرتا ہوا دریائے سنگ زار کے کنارے پہنچ گیا۔

بابر کو جو طویل علالت کے بعد حال ہی میں صحت یاب ہوا تھا، سہ اپنی گاڑی میں سفر کرنے کے لئے راضی کر لیا گیا تھا۔ گاڑی میں نرم گدے بچے اور دونوں پہلوؤں پر اور پیچھے کی طرف پردے لگے ہوئے تھے۔ گزروں میں پئے دھچکا کھاتے تھے تو یہ سرخ پردے آگ کی لپٹوں کی طرح لہرانے لگتے تھے۔ بابر پر بھرے گدوں سے نیچے کھسک کر عقبی پردے کو ہٹاتا اور پیچھے چھوٹے ہوئے راستے کو اشتیاق کے ساتھ دیر تک دیکھتا رہتا تھا۔

لشکر سے کوئی فرسنگ بھر پیچھے ایک اور گھوڑا گاڑی بھی جو نسبتاً زیادہ خوبصورتی کے ساتھ آراستہ کی گئی تھی، چلی آ رہی تھی۔ اس گاڑی پر جس کی حفاظت کے لئے کافی گھڑسوار موجود تھے، بابر کی خالہ مرنگار خانم اور منگیتیر عائشہ سوار تھیں۔ بخارا کے حکمران سلطان علی نے یہ خبر پاتے ہی کہ بابر سمرقند کو چھوڑ کر جانے کا ارادہ رکھتا ہے، شہر سبز کے قریب اپنی فوج جمع کر دی تھی جو دار لگومت پر حملہ کرنے کے لئے تیار تھی۔ بابر کو پہلے ہی سے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کے سمرقند کو

چھوڑ دینے سے کیا نتائج برآمد ہوں گے اسی لئے اس نے اپنی منگیت کے سرقد ہی میں ٹھہرے رہنے کو مناسب نہیں خیال کیا تھا۔ سلطان علی سے اسے کبھی بھی کسی نیک بات کی توقع نہیں رہی تھی۔ خود مرنگار خانم اور عائشہ بیگم بھی ہر قسم کے خطرات سے جلد از جلد دور نکل جانے کی خواہاں تھیں۔ ان کی لئے تو وہی بہت تھا جو بائے سنقر کے عہد میں جھیل چکی تھیں۔ اس وقت ان لوگوں کے لئے تاشقند محفوظ ترین مقام تھا جہاں مرنگار خانم کا بڑا بھائی اور بابر کا ماموں محمود خان برسر اقتدار تھا۔ عائشہ بیگم کی بہن رضیہ سلطان بھی جو محمود خان کی بیگم تھی، تاشقند ہی میں تھی۔ تاشقند اور اندجان کا راستہ بھی جزخ تک ایک ہی تھا اس لئے بابر اپنی خالہ، منگیت اور ان کے متعلقین کو جو مال اسباب کے ساتھ سفر کر رہے تھے، راستے میں حفاظت کے خیال سے اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ اس خیال سے کہ رسم و رواج کی خلاف ورزی نہ ہونے پائے، مستقبل کے دولہا دلہن کے درمیان فرسنگ بھر کا فاصلہ برابر برقرار رکھا جا رہا تھا اور وہ الگ الگ فوجی دستوں کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔ شام کو لشکر نے دریائے سنگ زار کو عبور کر کے سرسبز و شاداب ٹیلوں پر پڑاؤ ڈالا تب بھی یہ دوری برقرار رہی اور خیمے الگ الگ ہی نصب کئے گئے۔

ٹیلوں کی ڈھلانوں پر لالے کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ فضا صاف و شفاف تھی اور ہلکی ہلکی ہوائیں چل رہی تھیں۔ بابر نرم نرم گھاس پر ٹپکتے ہوئے خود کو مسرور اور بے فکر سا محسوس کر رہا تھا۔

سرقد سے کوچ کرتے وقت اسے جن اداسیوں اور فکروں نے مغلوب کر رکھا تھا وہ دھیرے دھیرے غائب ہوتی جا رہی تھیں۔

پھر بھی کچھ باتیں اس کے حوصلے پست کر رہی تھیں۔

جانے کتنی مشکلات جھیل کر سرقد پر قبضہ کیا اور پھر خود اپنی مرضی ہی سے اسے چھوڑ دیا تھا! اسے لگتا تھا جیسے اس کے سارے اقدامات پر ساری کوششوں پر پانی پھیر دیا گیا ہو اسی لئے گزشتہ کچھ دنوں سے اس کی ذہنی کیفیت ناخوشگوار سی رہتی تھی۔ لیکن اس وقت ان ہرے بھرے ٹیلوں پر تازی ہوا میں مسرت کے ساتھ سانس لیتے ہوئے وہ سرقد یا اپنے اولوالعزمانہ منصوبوں کے بارے میں نہیں بلکہ اس بارے میں سوچ رہا تھا کہ وہ اپنی ماں اور اپنے استاد کی حفاظت کرنے کے لئے جا رہا ہے جو دل کی آواز پر کان دھرنے سے متعلق خان زادہ بیگم کے مشورے کے بموجب اطمینان بخش نیکی اور شرافت کی بات تھی۔ اس کی حفاظت میں اس کی منگیت بھی سفر کر رہی تھی، یہ بھی ایک نیک کام تھا اور اس نے سوچا کہ اسے ایسے ہی بہادرانہ کارنامے انجام دینے چاہئیں۔

باہر دھیرے دھیرے ویسا ہی ہوتا جا رہا تھا جیسا کہ درحقیقت تھا۔ لشکر نے تنگ پہاڑی درے ”باب تیمور“ کو پار کر لیا تو اس نے گھوڑا گاڑی کا دروازہ کھولا اور سائیں کو بلا کر حکم دیا:

”ے..... میرا بھو..... راگھو..... ڈال..... لاؤ!“

باہر پوری طرح صحت یاب ہو جانے کے باوجود اب بھی ہکلا رہا تھا جو طویل علالت کا نتیجہ تھا۔ قاسم بیگ نے اس کی یہ بات سنی تو اپنے گھوڑے کو اس کی گاڑی کے پہلو میں لے آیا۔

”عالی جاہ! آپ کو اس وقت گھوڑے کی کیا ضرورت پڑ گئی؟“

باہر نے اس اندیشے سے کہ وہ دوبارہ ہکلانے لگے گا، صرف اثبات میں سر ہلایا اور سائیں کو سخت نگاہوں سے دیکھا گویا کہہ رہا ہو: ”میرے حکم کی تعمیل کرو!“

قاسم بیگ نے اسے سمجھانے بھجانے کی کوشش کی۔ چھوٹی داڑھی اور سفید بالوں والے پستہ قد طبیب نے کھلے دروازے کے قریب چلتے ہوئے اسے سمجھانے بھجانے کی کوشش کی، منت سماجت کے انداز میں کہا کہ وہ گھوڑے کی سواری کم از کم تین چار دن اور نہ کرے لیکن باہر نے پریشان ہو کر جواب دیا:

”کو..... کچھ گھر سو..... ا..... ری کرنا چ..... ج..... چاہتا ہوں!“

سائیں گھوڑے کو جس کی پیٹھ پر نندا پڑا ہوا تھا اور کاٹھی دھوپ میں چمک رہی تھی، لے آیا۔

”اے واپس لے جاؤ!“ قاسم بیگ نے چلا کر کہا لیکن باہر نے اسے گھوڑے کو واپس لے جانے سے روکتے ہوئے حکم دیا:

”نہیں، گھو..... ڈالے آؤ!“ اور مسکراتے ہوئے اضافہ کیا:

”آپ پرے..... شان نہ ہو..... س..... بیگ!“

گھوڑا گاڑی روک دی گئی۔ باہر اندر سے نیچے کی گئی سیڑھیوں سے اتر کر گھوڑے کے پاس گیا، زرا دیر کھڑا رہا اور پھر اگلی قاش زین کو پکڑ کر اچھلا اور پہلی ہی کوشش میں سوار ہو گیا۔ سائیں نے خوشی سے مسکراتے ہوئے لگام باہر کو تھما دی۔

قاسم بیگ اپنے گھوڑے پر باہر کے بالکل پیچھے پیچھے چلنے لگا تاکہ ضرورت پڑنے پر فوراً ہی مدد کر سکے۔

لیکن وہ لوگ جزخ تک آرام کے ساتھ پہنچ گئے۔

باہر گھڑ سواری کے لئے جس کا وہ بچپن ہی سے عادی تھا، بہت ترس رہا تھا۔ گاڑی کے اندر بیچھے ہوئے پردوں کے نرم نرم گدے اسے بستر علالت کی یاد دلارہے تھے۔ لیکن بھورے گھوڑے کی

شوخی اور پھرتیلی چال نے اس کے جسم کے اندر جیسے شباب کی ان توانائیوں کو بیدار کر دیا جو علالت کے دوران پڑی گھٹ رہی تھیں۔ وہ گھوڑے پر جتنا زیادہ فاصلہ طے کرتا جا رہا تھا اتنا ہی زیادہ خود کو تندرست اور توانا محسوس کرتا جا رہا تھا۔

جس سے آگے بڑھ کر رات کے لئے ایک بار پھر ہرے بھرے ٹیلوں پر پڑاؤ ڈالا گیا۔ باہر اور اس کی منگیتر کے خیمے یہاں بھی ایک دوسرے سے خاصی دوری پر نصب کئے گئے۔ لیکن باہر کے اس روز گھڑسواری کرنے کی، خود کو پوری طرح تندرست محسوس کرنے کی خبر اس کی منگیتر اور خالہ تک بھی پہنچ گئی۔

مرنگار خانم باہر کی خالہ ہونے کے ساتھ ہی ساتھ اس کی منگیتر کے لئے ماں کا درجہ بھی رکھتی تھی اس لئے اس موقع کو تحائف کے تبادلے کے لئے بہت مناسب تصور کیا گیا۔ وزیر نماز مغرب کے بعد باہر کے لئے مرنگار خانم کے دیئے ہوئے تحفے لے کر آیا۔ سنہرا چوغہ، زرد روزی کے کام کا پنکا اور چاندی کے دستے کا چابک۔ چوغہ باہر کی صحت یابی پر اظہار مسرت کی علامت تھا۔ پنکا اس خواہش کا آئینہ دار تھا کہ باہر کی قوت اور عظمت میں اضافہ ہو۔ لیکن چابک.... چابک شاید اس لئے بھیجا گیا تھا کہ وہ آج دن بھر گھڑسواری کرتا رہا تھا؟ یا شاید اس کا کوئی اور مفہوم تھا، شاید یہ کہ وہ تیزی سے گھوڑا دوڑاتا ہوا اند جان پہنچے اور دشمنوں کو نیست و نابود کر دے؟

ان تحائف سے باہر کا دل باغ باغ ہوا تھا۔ اگلے روز ان دونوں کو ایک دوسرے سے جدا ہونا تھا، وہ اس مقام پر پہنچنے والے تھے جہاں سے تاشقند کا راستہ شمال کی جانب مڑ جاتا تھا۔

خالہ کے واسطے بھی جواباً ”کچھ تحائف کا بھیجا جانا ضروری تھا لیکن سوال یہ تھا کہ کون سی چیزیں بھیجی جائیں؟ راستے میں ایسے تحائف کہاں مل سکتے تھے جو خواتین کو پسند آتے؟ چاروں طرف بے کراں صحرا پھیلا ہوا تھا.... قاسم بیک نے ہمیشہ کی طرح اس موقع پر بھی ذہانت سے کام لیا اور اشرفیوں سے بھری ہوئی چاندی کی طشتری بیچنے کی تجویز پیش کی۔ باہر نے اس تجویز کو کچھ اور بھی وسعت دے دی۔ اشرفیوں سے بھری ہوئی طشتری اس گھوڑا گاڑی میں رکھ کر بھیجی جائے جس پر وہ سفر کرتا رہا تھا۔

”تاکہ گاڑی بھی تحفہ ہی تصور کی جائے؟ لیکن حکمران، کل آپ کو گاڑی کی ضرورت پڑ گئی تو؟“

”مجھے پاک پروردگار پر بھروسہ ہے، ض.... ض.... ضرورت نہیں پڑے گی۔ اس گاڑی میں خواتین سفر کریں!“

قاسم بیک نے اس بات کو حکم تصور کرتے ہوئے مزید مخالفت نہ کی۔

اگلے روز صبح ہی صبح دو شاندار گاڑیوں، اراہوں اور اونٹوں پر مشتمل قافلہ مرزا چول ہوتے ہوئے تاشقند جانے کے لئے شمال کی سمت مڑ گیا۔ اس کے ساتھ پہلے سے سفر کرتے ہوئے محافظ دستے کے علاوہ باہر کے لشکر سے منتخب کئے ہوئے سوسپاہی بھی روانہ کئے گئے۔

جلد ہی یہ قافلہ نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ لشکر بھی اپنے راستے پر روانہ ہو گیا پھر بھی باہر ایک ٹیلے پر کھڑا دیر تک اپنے لشکر کو نہیں بلکہ شمال کی سمت جاتی ہوئی گاڑیوں کو دیکھتا رہا جو بے کراں صحرا میں غائب ہو گئیں۔ وہ یوں کھڑا ہوا تھا جیسے اپنی منگیتر کو رخصت کر رہا ہو، سفر بخیر کہہ رہا ہو اور اس کے سلسلے میں اپنے قلبی لگاؤ اور احترام کا اظہار کر رہا ہو۔

باہر نے سمرقند میں سون گز ارے تھے لیکن عائشہ بیگم سے ایک بار بھی ملاقات نہیں کی تھی۔ ملاقات میں رسم و رواج کی دیواریں بھی حاصل تھیں اور نوجوانی کا شرمیلا پن بھی۔ اس وقت ٹیلے پر کھڑے کھڑے اسے اپنی اس غزل کا خیال آگیا جسے اس نے بتاں سرائے محل میں کہنا شروع کیا تھا:

حسن کا تیرے ہے چرچا ہر جگہ پر ماہ رو

وصل تیرا مجھ کو کب ہوگا میسر ماہ رو

پھر وہ گھوڑے پر سفر کرتے ہوئے اس غزل کے مزید اشعار کہنے کی کوشش کرتا رہا:

سرنہ پہنچا تیرے زانو تک تو جاؤں گا چلا

جائے گا لے کر جہاں مجھ کو مقدر ماہ رو

قوش تیگمان مقام پر جہاں رات بسر کرنے کے لئے لشکر نے اگلا پڑاؤ ڈالا، باہر نے اس شعر کو

جس نے اسے تڑپا دیا تھا، کانڈ پر لکھ لیا اور طے کیا کہ غزل کا آخری شعر یہی ہوگا۔ بیچ کے تین چار

اشعار کو اس نے بعد میں، نسبتاً ”پر سکون لمحات میں تخلیق کرنے کا فیصلہ کیا.....“

ہاں، اندجان کے مسیب واقعات باہر سے قریب سے قریب تر آتے جا رہے تھے۔ طاہران کی

خبریں لے ہوئے چلا آ رہا تھا۔

باہر کے لشکر نے جب دریائے نو کو پار کیا تو طاہر قوتد سے آگے بڑھ کر ہا درویش ریگستان میں

داخل ہو رہا تھا۔ لشکر کے چھ راتوں کے پڑاؤ کے بعد ساتویں دن خوجند کے قریب اس کے سامنے

کے رخ سے مشقی گھوڑے پر سوار طاہر آتا دکھائی دیا جو غبار سے بالکل سیاہ اور تھکن کے مارے

اپنی پرچھائیں ہو کر رہ گیا تھا۔

”آپ سمرقند سے کیوں روانہ ہو گئے، عالم پناہ؟!“ قاصد نے روتے چلاتے ہوئے کہا۔

اندجان پر دشمن کے قبضے اور شہر کے دفاعی انتظامات کے ذمے داروں کی غداری کی خبر سے بابر کو سخت صدمہ پہنچا۔ اسے لگا جیسے دنیا کی بنیادیں ہل اٹھیں، زمین و آسمان یوں کانپ اٹھے جیسے زلزلہ آگیا اور بائیں جانب بہتا ہوا سرد دریا اپنے کناروں کو توڑ کر دور دور تک طغیانی لے آیا۔

دریا کے اس پار خوجند پہاڑیاں نظر آرہی تھیں۔ کتنی دور تھا اندجان وہاں سے، آہ، کتنی دور! اور سمرقند بھی کتنی دور پیچھے چھوٹ گیا تھا! ظالم قسمت بابر کو فریب دے کر یہاں لے آئی تھی اور اس نے اپنے ایک ہی وار سے اسے اندجان سے بھی محروم کر دیا تھا اور سمرقند سے بھی! اسے زمین اور آسمان کے درمیان معلق دیکھ کر اندجان میں اس پر غدار تبیل ہنس رہا تھا، سمرقند میں خوش قسمت سلطان علی ہنس رہا تھا اور ترکستان میں اپنے لشکر کو اکٹھا کرتا ہوا شیبانی خان۔ وہ سب ہنس کر اس کا مذاق اڑا رہے تھے۔ ہونہ، بھولا بچہ کہیں کا! یہ ان ہی کے زور دار قہقہے تھے جو چاروں طرف نضاؤں میں گونج رہے تھے!

طاہر نے علی دوست بیگ کی غداری اور خواجہ عبداللہ کو بابر سے وفاداری کی بنا پر خاقان دروازے کے شہتیرے لٹکا کر پھانسی دیئے جانے کی تفصیلات بھی بتائیں۔ بابر اس سب کو برداشت نہ کر سکا اور اپنے گھوڑے کو چابک رسید کر کے سرپٹ دوڑانے لگا۔ اسے خود بھی نہیں معلوم تھا کہ جا کہاں رہا ہے۔ گھوڑا جو صبح سے پیاسا تھا، تیزی سے دوڑتا ہوا اسے دریا کے کھڑے کراڑے تک لے آیا۔ اچانک بابر کو یاد آگیا کہ اس کے والد کا انتقال کراڑے کے کٹ کر دریا میں گر جانے ہی سے ہوا تھا اور اسے لگا کہ وہ بلند کنارہ بھی جس پر وہ کھڑا ہوا تھا، دفعتاً کٹ کر بہاؤ میں گرنے لگا۔ بابر نے گھبرا کر تند و تیز دریا کے کنارے سے گھوڑے کو پیچھے ہٹایا لیکن اتنے میں پہاڑیاں اس کی نگاہوں کے سامنے کانپنے اور اپنی جگہ سے کھٹکنے سی لگیں، وہ بھی یکے بعد دیگرے کسی غار میں گرنے سی لگیں۔

بابر گھوڑے کی گردن سے لپٹ کر رونے لگا، پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور اس کے شانے ہلنے لگے۔

کچھ دیر تک وہ تنہا ہی رہا پھر قاسم بیگ سن رسیدہ طبیب کو ساتھ لئے اس کے پاس پہنچ گیا۔ قاسم بیگ نے آنسو بہائے بغیر لیکن بڑے مغموں و طول لمبے میں کہا:

”شاہ عالی، ہم سب پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑے..... میرے گھر میں جو کچھ بھی تھا، لوٹ لیا گیا۔ میرے تخت جگر کو بری طرح زخمی کر دیا گیا۔“

بابر نے سراغھایا، چہرہ اب بھی آنسوؤں سے تر تھا۔ طبیب اس کی پیٹھ سہلانے لگا۔

”آپ اتنے غم زدہ نہ ہوں، حکمراں۔ قاصد نے ہمیں بتایا ہے کہ خدا کے فضل و کرم سے آپ کی والدہ صاحبہ اور ہمشیرہ صحیح سلامت ہیں۔۔۔ آپ زندہ و تندرست رہیں گے تو دوبارہ سب کچھ حاصل کر لیں گے۔ آپ کو اپنا خیال کرنا چاہئے، خدا نخواستہ دوبارہ طبیعت ناساز نہ ہو جائے!“

باہر جیسے کچھ سن ہی نہیں رہا تھا۔ اسے لگا جیسے وہ اپنے محبوب استاد کو پھانسی پر لٹکا ہوا دیکھ رہا ہو اور ایک بار پھر اس کی آنکھوں سے اشک جاری ہو گئے:

”ہائے میرے محترم پیر، مجھے اس دنیا میں کس کے سہارے چھوڑ کر آپ چل بے؟ ایسے فرشتہ صفت انسان کو ان لوگوں نے پھانسی پر لٹکا دیا! مجھے ان سے اپنے استاد کا انتقام لینا ہو گا! انتقام لینا ہو گا!“

اب کہیں جا کر طبیب کو خیال آیا کہ باہر کتنی صفائی سے بول رہا ہے، ذرا بھی تو نہیں ہٹکا رہا ہے۔

”قسم کھاتا ہوں کہ آخری دم تک لڑتا رہوں گا!“

اس کے چرے پر کبھی زردی چھا جاتی تھی کبھی سرخی لیکن اس کے منہ سے ہر لفظ بہت واضح طور پر نکل رہا تھا۔

”انتقام لوں گا! ہم لوگ لڑیں گے! دستوں کو اکٹھا کر کے انہیں بتا دیجئے! ہم کوچ کر رہے ہیں۔۔۔ اندجان چلو!“

اور باہر اپنے گھوڑے کا سرخ تیزی کے ساتھ موڑ کر لشکر کے پاس چلا گیا۔

۵

باہر نے مرغیلان اور اوش پر قبضہ کر لیا، احمد تہل اندجان کے نزدیک اپنی شکست فاش کے بعد بچے کچھ لشکریوں کے ساتھ شہر کے قلعے میں جا چھپا۔

لیکن ان فتوحات کے نشے میں باہر کے بیگوں نے احتیاط اور چوکسی کو بالائے طاق رکھ دیا۔ ایک بار باہر کے کچھ دستوں نے خاقان نالے کے قریب پڑاؤ ڈالا اور اپنی حفاظت کے لئے پہرے کا خیال نہ رکھا۔ علی الصبح دشمن اس پڑاؤ پر ٹوٹ پڑا۔ سوتے ہوئے لوگ بوکھلا کر اٹھے اور جس کا پاؤں جدھر پڑا دھر بھاگ کھڑا ہوا۔ بھاگ کھڑے ہونے والوں میں گشت کے لئے جوابدہ بیک بھی شامل تھا۔ باہر کو یہ لوگ محافظین کے بغیر ہی چھوڑ گئے، اس کے پاس بمشکل دس ہی سپاہی رہ گئے۔ باہر اچھل کر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ اس وقت تہل کی آگے بڑھتی ہوئی فوج کے ہراول کے تیر انداز باہر کے بھاگتے ہوئے لشکریوں پر تیر برسا رہے تھے۔ باہر نے یہ اندازہ لگا کر کہ اس کے مقابلے پر آئے

ہوئے دشمنوں کی تعداد کم ہے، گھوڑے کو ایڑھ لگائی اور اپنے دسوں سپاہیوں کے ساتھ تیر اندازوں پر دھاوا بول دیا۔ تیر انداز مغلوب ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ بابر ان کا تعاقب کرتا ہوا دور تک نکل گیا اور تب اچانک اس کی نظر دشمنوں کے ایک کافی بڑے دستے پر پڑی۔ گھڑسوار درختوں کے جھنڈے نکل کر اس کے راستے کو کاٹتے ہوئے، گھوڑوں کو سرپٹ دوڑاتے ہوئے بڑھتے چلے آ رہے تھے۔ احمد تیل جو آفتاب سحر کی شعاعوں میں واضح طور پر نظر آ رہا تھا، آگے آگے تھا۔ جسم پر زرہ تھی اور ہاتھ میں سپر۔ بابر نے لگام کھینچ کر اپنے گھوڑے کو روکا اور مڑ کر دیکھا کہ خود اس کی ساتھ کون کون ہے۔ طاہر سمیت صرف تین سپاہی رہ گئے تھے، باقی لوگ دشمن کے تنگ ہوتے ہوئے ٹکنتے سے بھاگ نکلنے کے لئے پیچھے کی طرف مڑ گئے تھے۔ بابر غلت سے کام لیتا تو شاید وہ بھی دشمنوں کے گھیرے سے نکل جاتا۔

لیکن پیٹھ دکھا کر بھاگ کھڑے ہونا اس کے لئے ممکن نہ تھا، وہ تو اس عیار غدار احمد تیل کا سامنا کرنا چاہتا تھا جس نے اس کو اتنے مصائب سے دوچار کر دیا تھا۔ اس نے لگام چھوڑ کر تیزی اور مستعدی سے مقابلے کے لئے کمان تیار کی اور تیر کو تانت پر رکھا۔ اس اثنا میں احمد تیل نے گھوڑا دوڑاتے دوڑاتے ہی تلوار نیام سے نکال لی۔ بابر نے تیل کے بیجان سے سرخ چہرے پر بھیگی آنکھوں کے درمیان ناک کے بانے کا نشانہ لگا کر تیز چلایا جو جا کر اس کے خود کے چہجھے پر لگا۔ نشانہ بالکل درست تھا لیکن خود کی دھات تیر کی نوک سے زیادہ مضبوط ثابت ہوئی۔ بابر کو دوسرا تیر چلانے کا بھی موقع مل گیا۔ اس بار اس نے تیل کے گردن کا نشانہ لگایا تھا کیوں کہ زرہ اور خود پہنے ہوئے فوجی کا چہرہ اور گردن ہی کچھ کچھ کھلے رہتے تھے۔ تیل سپر سے دفاع کرنے میں کامیاب ہو گیا، تیز سپر سے کرا کر الگ جا کر ا۔

اتنے میں تیل کے گھوڑے دوڑاتے ہوئے سپاہی اس پر تیر چلانے لگے اور ایک تیر اس کی لاٹک بوٹ کے اوپری حصے کو چیرتا ہوا گھٹنے سے ذرا نیچے چنڈی میں آن لگا۔ تیل بابر کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا اور اس کی دائیں ہاتھ میں تلوار چمک رہی تھی، وہی تلوار ہے، بابر نے پیر میں پھلتے تیز درد کو محسوس کرتے ہوئے سوچا، وہی اوش میں اس کی دی ہوئی طلائی دستے والی بغدادی تلوار۔ تو اب تیل اسی تلوار سے اسے ہلاک کر دے گا۔ جس کا کبھی اس کبھت نے وفاداری کے اظہار کے طور پر بوسہ لیا تھا؟ بابر کا ہاتھ کمان کو جواب بے مصرف ہو چکی تھی، دبائے جا رہا تھا۔ اس پر عجب بے حسی سی طاری ہو گئی اور جانے مظلوم کرتے ہوئے درد کی بنا پر یا موقع نہ مل سکنے کے باعث اسے اپنی تلوار نیام سے نکالنے کا خیال ہی نہ آیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ طلائی دستے والی تلوار اس

کے خود پر پڑی۔ بابر کی آنکھوں تلے چنگاریاں سی ناچنے لگیں، سر میں زوردار بھن بھناہٹ سی ہوئی اور خود کے اس وار کو برداشت کر لینے کے باوجود اس کے پیچھے سے خون بہہ کر گردن تک آگیا۔ ”گلتا ہے جوتے میں بھی خون بھر گیا ہے“ بابر نے گھوڑے پر جھکتے ہوئے کچھ ایسی بیگانگی کے ساتھ سوچا گویا اس بات کا اس سے تعلق ہی نہ ہو۔ تیل نے اپنی فتح پر مسرور ہو کے چیختے ہوئے دوبارہ تلوار بلند کی۔ عین اسی لمحے پیچھے سے طاہر نے بڑھ کر بھورے گھوڑے کی لگام کو پکڑ کے جھٹکا اور بابر کو پیچھے سے دھکا دے دیا۔ بابر کا گھوڑا اپنی جگہ سے کچھ آگے بڑھ گیا، تیل کی تلوار کا زوردار وار بابر کے ترکش پر پڑا جس سے تیر اور ترکش کے تے پوری طرح کٹ گئے۔

”سکمران! لگام تھامئے! لگام تھامئے!“ طاہر بابر کے گھوڑے کو چابک مارتے ہوئے چلایا۔ عمدہ نسل کے اس گھوڑے سے ایسا سخت برتاؤ شاذ و نادر ہی کیا جاتا تھا۔ وہ آگ بگولا ہو کر ہوا سے باتیں کرتا ہوا سوار کو اس مصیبت سے نکال لے گیا۔

بابر اوش واپس لوٹا تو لنگڑا رہا تھا اور اس کی سر پر ہونے والی بھن بھناہٹ جلد ہی دور نہ ہو سکی۔ لیکن زخم سے زیادہ اسے وہ بے انصافی اذیت پہنچا رہی تھی جو قسمت نے اس کے ساتھ کی تھی۔ وہ سوچتا کہ جو تلوار اس نے احمد تیل کو تحفہ ”دی تھی اسی سے اس پر وار کیا گیا۔ کیسی ستم ظریفی ہے یہ بھی! اس کے باوجود لوگ اصرار کرتے ہیں کہ دنیا میں سب کچھ پہلے ہی سے طے ہوتا ہے، ایمان دار کو انصاف نصیب ہوتا ہے اور بے ایمان کو اپنے کئے کی سزا۔ تو پھر قسمت احمد تیل کو جس نے ایک اسی پر نہیں بلکہ دوسروں پر بھی اتنے مظالم ڈھائے ہیں، آخر سزا کیوں نہیں دیتی؟ میدان جنگ میں اس کا مقابلہ اتنے ذلیل شخص سے ہوا تو آخر اس بے ایمان کا ہاتھ ہی کیوں طاقتور اور خوش نصیب ثابت ہوا؟

قلعہ نگار خانم نے بابر کو تسلی دینے کی کوشش کی:

”خدا کا شکر کہ میرے بیٹے کی جان بچ گئی!.... فرزند عزیز، ابھی آپ صرف سولہ ہی سال کے تو ہوئے ہیں۔ احمد تیل کی عمر تک پہنچنے پہنچتے آپ جانے کتنی ہی فتوحات حاصل کر لیں گے.... اس وقت ہمارا ملک ان اقربا کش جنگوں سے بری طرح تباہ و برباد ہو چکا ہے۔ آپ کے ماموں جان محمود خان کی آپ میں اور مرزا جہانگیر میں صلح کرانے کی خواہش قابل ستائش ہے۔ آخری جہانگیر کو مل جانا چاہئے اور اند جان آپ کو۔“

”اتنی چھوٹی سی فرغانہ سلطنت کے کیا واقعی دو ٹکڑے کر دیئے جانے چاہئیں؟ یہ تو ساری ماوراء النہر کو ملا کر ایک کئے جانے کے برعکس ہوگا، والدہ صاحبہ....“

”اس وقت اور چارہ ہی کیا ہے، بابر جان!۔۔۔ اور ہمیں محض امور سلطنت ہی کی فکر تو نہیں کرنی ہے۔ تاشقند میں آپ کی منگیتراوب رہی ہے۔۔۔ مجھے ہمیشہ صاحبہ کا خط موصول ہوا ہے جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ اگر جلد از جلد دِلن کو رخصت کرا لے جائیے۔“

بابر ماں کی اس تجویز کی مخالفت کے طور پر کہنا چاہتا تھا کہ ان دونوں کو ایسی کوئی غلت تو ہے نہیں، اس ”ماہ رو“ نے اپنی زندگی کی چند دھویں بہار میں ابھی ابھی قدم رکھا ہے اور وہ خود بھی کم سن ہی ہے لیکن کہنے کی ہمت نہ کر سکا۔ دراصل اسے خود بھی تو اپنی دِلن سے جس کے خواب وہ جانے کب سے دیکھتا رہا تھا، جلد از جلد ملاقات کا اشتیاق تھا۔۔۔

۶

ماہ جوزا☆ کی ایک گرم شام کو اند جان قلعے کے حرم میں کنیزیں شاندار کھانے تیار کر رہی تھیں۔ بادشاہ آخر کار عائشہ بیگم سے اپنی کم سن ملکہ سے ملنے آ رہا تھا جو پورے ہفتے بھر سے اس شام کی منظر رہی تھی۔ سونے اور چاندی کی مختلف چیزوں اور ریٹھی پردوں سے آراستہ حرم میں پھول دار عانیچے بچھادیئے گئے تھے۔ عائشہ بیگم کی بھوؤں پر لگایا جانے والا دسمہ ابھی خشک بھی نہ ہو پایا تھا کہ کسی کنیز نے گہرا کرچکے سے کہا:

”تشریف لے آئے! تشریف لے آئے! شام عالی۔۔۔“

زری کا لباس پہنے ہوئے بابر درآمدے میں نظر آیا۔ گزشتہ دو برسوں کی مسلسل آزمائش نے اسے کافی بدل دیا تھا، شانے چوڑے چکے ہو گئے تھے جیسے کہ اٹھارہ سالہ طاقتور نوجوان کے ہونے چاہئیں۔

عائشہ بیگم جس نے کورنش کے ذریعے اس کا استقبال کیا، اس کے سامنے خاصی پستہ قد اور دھان پان سی لگ رہی تھی۔ اس کے سر پر اونچی طاقی اور کانوں میں موتیوں کے آویزے پہنی سی گردن کی بنا پر بہت بڑے بڑے سے لگ رہے تھے۔

کنیزیں کورنش بجالاتی ہوئی اٹلے قدم دروازے کی طرف ہٹنے لگیں۔ بابر کو ان میں سے کچھ کی آنکھوں میں شرارت آمیز چمک نظر آئی اور اسے کچھ عجب بھوٹا پٹن سامعوس ہوا۔ یہ توجہ تھا کہ حرم میں حکمران کے رات بسر کرنے کے ارادے سے کنیزوں اور خادماؤں کو پہلے ہی مطلع کر دیا جاتا تھا تاکہ وہ اس سلسلے میں ضروری تیاریاں کر سکیں پھر بھی بابر کو ایسے لمحات میں وہاں اتنے زیادہ افراد کی موجودگی غیر ضروری معلوم ہوئی۔

”تشریف رکھئے، حکمران“ اس نے بمشکل ہی سنی جاسکے والی کانپتی ہوئی آواز میں بابر سے شایان

شان جگہ پر بیٹھنے کی درخواست کی۔

اندرونی کمرے میں باریک پردے کے پیچھے سچ بچھی ہوئی تھی۔ باہر اس جانب دیکھے بغیر نہ رہ سکا حالانکہ اسے اپنی خواہش پر شرم محسوس ہوئی۔ دسترخوان کے پاس آکر وہ گدے پر اس طرح بیٹھا کہ پنگ اسے دکھائی نہ دے پھر بھی دکھائی دے رہا تھا۔ آخر اس نے اپنی نظریں دسترخوان پر جمادیں اور دھیرے سے پوچھا:

”کہئے بیگم، آپ کی صحت تو ٹھیک ہے نا؟“

”خدا کے فضل سے ٹھیک ہوں..... آپ کا بہت بہت شکریہ۔“

عائشہ بیگم شرماتی لپاتی باہر سے دور دسترخوان کے بالکل کنارے پر بیٹھ گئی۔
تکلیف دہ خاموشی چھا گئی۔

نئی نویلی میں نئی نویلیوں کی ساری صفات موجود تھیں پر دل اب بھی لڑکیوں کا سا ہی تھا۔ اور شکل صورت..... عائشہ بیگم اکثر بیمار رہتی تھی، مصائب بھی بہت جھیلے تھے اسی لئے اس کا سوکھا سکھٹا جسم بے جان سا لگتا تھا۔ باہر جس ماہ روپری کے خواب دیکھتا رہا تھا وہ صرف اس کے تصور کی دنیا ہی تک محدود رہی، حقیقت نے اس کی آرزوؤں پر پانی پھیر دیا۔ دراصل وہ اپنی کم سن بیگم سے صحیح معنوں میں واقف ہی نہیں ہو سکا تھا، جتنا کہ شادی کے بعد اس وقت واقف ہوا تھا جب انہوں نے ایک دوسرے کو پہلی بار دیکھا تھا (رواج ہی یہی تھا)۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ روحانی قربت کے بغیر جسمانی قرب دیال جان ہوتی ہے، گناہ جیسی معلوم ہوتی ہے۔ عائشہ بیگم نہ اس کی روح کو بیدار کر سکی تھی نہ جنسی ہجانات کو۔ یہی سبب تھا کہ وہ ”امور سلطنت میں مصروفیت“ کے بہانے اپنی زیادہ تر راتیں خود اپنی خواب گاہ ہی میں گزارتا تھا۔ ویسے بھی رواج اور اب شاہی محل کے رواج کے بموجب بادشاہ کو مخصوص دنوں پر ہی حرم میں رات بسر کرنے کا موقع ملتا تھا۔ باہر کے والد مرزا عمر شیخ نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ جہاں تک عائشہ بیگم کا تعلق تھا وہ خود بھی باہمی تعلقات کی پریشانیوں اور بار کو سمجھتی اور اس احساس سے تڑپتی رہتی تھی کہ وہ ویسی شریک زندگی نہیں ہے جیسی باہر کو درکار ہے اور جس سے باہر محبت کر سکے۔

عائشہ بیگم نے قرمزی چائے دانی سے سونے کے پیالے میں چائے انڈیل کر باہر کو پیش کی۔
”بالکل بچیوں کے سے ہاتھ ہیں اور خوف سے کانپ رہے ہیں۔ میرے خوف سے کیا؟“ باہر نے سوچا۔

”شکریہ“ وہ قصور وار شخص کے سے انداز میں بس اتنا ہی کہہ سکا۔ دراصل وہ خود کو قصور وار

تصور بھی کر رہا تھا کیوں کہ وہ خاتون جس کے خوابوں میں کبھی کھویا رہتا تھا، جس کے زانو پر سر رکھنے کا آرزو مند تھا، اس وقت اس کے سامنے شرم کے مارے کچھ یوں سکڑی کٹی ہوئی بیٹی تھی جیسے کسی غیر کے سامنے بیٹھی ہو۔ یہ اس کے خوابوں والی حسینہ تو نہ تھی پھر بھی.....

اتنے میں ایک باورچن طلائی قاب میں کباب لے کر آئی اور زیرے کی سوندھی سوندھی خوشبو فضا میں پھیل گئی۔

باورچن نے قاب پر سے ڈھکن اٹھایا اور ہرن کے نرم گوشت کے سج کبابوں کی خوشبو زیرے کی خوشبو میں کھل مل گئی۔ پھر باورچن باہر چلی گئی۔

”چکھے، بیگم، ذرا چکھے تو سی!“ بابر نے قاب کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن خنجر رہا کہ پہلے عائشہ بیگم کباب اٹھالے۔

”نہیں نہیں، آپ بھی کیا..... پہلے آپ“ اس نے دھیرے سے کہا۔

”خیر، میں اٹھائے لیتا ہوں۔ اب تو لیجئے.....“ سج کباب بھی ان کے دلوں کو مسرور نہ کر سکے۔ وہ دوبارہ چائے پینے لگے۔

”اچھا بیگم، کہیں آپ کو اپنے شمر کی یاد تو نہیں ستا رہی ہے؟“

عائشہ بیگم نے اب ذرا اہت کر کے بابر کے چہرے کی طرف دیکھا:

”سمرقند کی یاد؟ ستاتی تو ہے۔“

”انشاء اللہ تعالیٰ آپ گرمیوں میں سمرقند جاسکیں گی۔“

”یہ تو بہت خوب ہو گا..... لیکن کیسے..... میں اکیلی جاؤں گی کیا؟“

”نہیں، خدا کے فضل و کرم سے سمرقند پر قبضہ کر لیں گے اور ہم سب وہاں چلیں گے۔“

”وہاں چلیں گے؟ اور اندجان کس کے قبضے میں رہے گا؟“

”فی الحال مرزا جہانگیر کے قبضے میں“ بابر نے جواب دیا اور فوراً ہی اداس ہو گیا۔

عائشہ بیگم کچھ بھی نہ سمجھ سکی اور اس نے حیرت سے نظریں اٹھائیں۔ اندجان کو فتح کرنے تک

مرزا بابر نے کچھ کم مصائب برداشت کئے تھے کیا؟ اور اب وہ عائشہ نے سوچا، خود اپنی مرضی ہی سے اندجان کو چھوڑ دینا چاہتے ہیں۔

”سمرقند کی یاد تو مجھے ضرور ستاتی ہے“ وہ بولی، ”لیکن میں یہاں آپ کی والدہ محترمہ کے ساتھ

رہنا بہتر تصور کرتی ہوں۔“

وہ اس طرح صاف صاف باتیں کرنے لگی تو بابر کو اس کا چہرہ دلکش معلوم ہونے لگا۔

”جی ہاں“ اور میں آپ سے بھی یہی التجا کر رہی ہوں، میرے سر تاج“ عائشہ بیگم نے دھیرے دھیرے جوش میں آتے ہوئے بات جاری رکھی۔ ”جائے کتنی ہی پریشانیاں تو آپ جھیل چکے ہیں اور جنگ کے بغیر سر قند کے درد اڑے کھلنے سے رہے۔ آپ اپنا خیال کیجئے۔ اب اور جنگ چھیڑنے نہ جائیے، التجا کر رہی ہوں!“

”ہم آج جن حالات میں جی رہے ہیں وہ میرے اور آپ کے لائق ہیں کیا؟“
 ”یہ آپ کیوں فرما رہے ہیں؟ آخر آپ اپنے ملک میں مقیم اور یہاں کے حکمران ہیں۔“
 بابر طنزیہ انداز میں مسکرایا۔

”حکمران تو میں بس برائے نام ہی رہ گیا ہوں“ اس نے کہا اور اپنی بظنی جیب سے چار تہہ کیا ہوا کاغذ نکال کر عائشہ بیگم کی طرف بڑھا دیا۔

وہ گزشتہ کئی مہینوں سے اپنے دل کے درد کو کاغذ پر منتقل کرنے کی ضرورت محسوس کرتا رہا تھا اور تقریباً ہر شام کو اشعار کہتا تھا۔ اس ورق پر ایک چار ہفتی درج تھی۔
 عائشہ بیگم نے کاغذ کو کھول کر مصرعوں پر نظر ڈالی:

تخت سے چٹے ہیں، ان کا آسرا کچھ بھی نہیں
 ہائے دنیا! اب تو قانون وفا کچھ بھی نہیں
 بن جا مفلس بیگ تو بابر کہ بتر ہو گا یہ
 ایک تاج اور شاہ دو اس سے برا کچھ بھی نہیں
 ”اتنی شاندار بیتوں کی تخلیق پر مبارک باد قبول فرمائیے، حکمران!“

”شکریہ۔۔۔ لیکن آپ پر میری بات واضح ہو گئی نا؟“

”جی ہاں۔ آپ کو آخسی میں مرزا جاتگیر کے دوسری سلطنت قائم کرنے کا غم ستا رہا ہے نا؟ پہلے جو ایک تھی اب اس کے دو ٹکڑے ہو گئے۔“

”اس میں جاتگیر کا قصور نہیں ہے، بیگم۔ جاتگیر تو ابھی کل کے لڑکے ہیں۔ دراصل احمد تہل، علی دوست بیگ، باغی اور طاقتور بیگ میری مخالفت پر کمر بستہ ہیں۔“

بابر، علی دوست بیگ سے اپنے الجھے ہوئے تعلقات پر روشنی ڈالنے لگا۔ وہ جانتی تھی کہ گزشتہ سال بابر اپنا سب کچھ کھو بیٹھا تھا اور جنوبی علاقے میں، ترکستان سلسلہ کوہ کے دامن میں واقع اور اتپا میں مقیم تھا۔ ایک روز خلاف توقع علی دوست بیگ (ان دنوں وہ مرغیلان کا حکمران تھا اور احمد تہل سے اس کا جھگڑا ہو چکا تھا) کا قصد اس کے پاس پہنچا۔ ”اگر مرزا بابر میرا قصور معاف کر دیں“

میری اس غلطی کو معاف کر دیں کہ میں نے اس کتے احمد تبیل کے لئے اند جان کا دروازہ کھول دیا تھا تو وہ مرغیلان آجائیں۔ میں ان کے لئے مرغیلان کی دروازے کھول دوں گا۔ ”یہ تھا علی دوست بیک کا پیغام جو قاصد لے کر آیا تھا۔ علی دوست بیک نے اپنا وعدہ پورا کیا تھا جس سے باہر کے حوصلے بڑھ گئے تھے اور اس نے جلد ہی علی دوست بیک کی مدد سے اند جان پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔

فیاضی کا جواب فیاضی ہی سے دیا جانا تھا لیکن باہر اپنی دریا دلی میں بہت آگے بڑھ گیا۔ اس نے علی دوست بیک کو قاسم بیک کے عہدے پر فائز کر دیا! ایک کو بلندیوں پر پہنچا دیا اور دوسرے کو بلا سبب پستیوں میں گرادیا۔

پھر کیا ہوا؟ علی دوست بیک نے زیادہ تر بیگیوں کو لالچ دے کر اپنا طرف دار بنالیا اور جلد ہی باہر کے ہاتھوں میں اقتدار بس برائے نام ہی رہ گیا۔ اس دوران قاسم بیک نے باہر سے اپنی وفاداری برقرار رکھی اور ایک بار تو اس نے احمد تبیل سے علی دوست بیک کی نئی سازش کا ثبوت بھی پیش کر دیا۔ علی دوست بیک کے حامیوں نے قاسم بیک پر اس معاملے میں جھوٹی شکایت کرنے کا الزام لگایا اور دھمکی دے دی کہ علی دوست بیک پر کوئی آج آئی تو باہر پر بھی آکر رہے گی..... اور احمد تبیل کہیں قریب ہی تلوار سنبھالے، گھات لگائے بیٹھا تھا اند جان میں کھس آنے کے بہانے ہی کی تلاش میں تھا۔ ہمانہ ہاتھ آجانے کی صورت میں اندرونی اور باہری دشمن متحد ہو جاتے تو کیا ہوتا؟ اسی لئے باہر دانت پیس پیس کر علی دوست بیک کی سازشوں کو مجبوراً برداشت کئے جا رہا تھا۔ اب اس کے پاس دشمنوں کو شکست دینے کے لئے طاقت بہت ہی ناکافی تھی۔

”علی دوست بیک اور احمد تبیل مکڑیوں کی طرح مجھے اپنے جالوں میں الجھاتے جا رہے ہیں“ باہر نے عائشہ بیگم سے کہا۔ ”میں ان جالوں کو توڑ کر نکل جانا چاہتا ہوں ورنہ..... ورنہ ہم مکڑیوں کی غذا بن جائیں گے۔“

”لیکن عالی جاہ، سمرقند میں بھی تو آپ کے بے شمار دشمن موجود ہیں۔ اگر ایک بار پھر جنگ چھڑی تو.....“

”سمرقند میں ہمارے احباب بھی کچھ کم نہیں ہیں۔“

”قاصد نے آپ کو دار الحکومت پہنچنے کی دعوت دی ہے کیا؟“

سمرقند کے قاصد سے ہونے والی گفتگو کو بہت زیادہ راز میں رکھے جانے کی ضرورت تھی۔

سمرقند کے بیگیوں اور سلطان علی کے اختلافات بہت زیادہ بڑھ گئے تھے اور وہ مزید ترخان کی قیادت میں اپنے سپاہیوں سمیت شہر کو چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ ایک ہزار سپاہی ارگوت میں بڑی بے

چینی کے ساتھ بابر کے منتظر تھے۔ ایک ہزار سپاہی اور سب کچھ کر گزرنے پر آمادہ بیگ۔ یہ کوئی معمولی طاقت تھوڑی تھی! دوسری طرف حال ہی میں بخارا پر قابض ہو جانے والا شیبانی خان اب سمرقند پر دانت لگائے ہوئے تھا۔ بابر کے وہاں بہ غلبت نہ پہنچنے کی صورت میں سلطان علی دار حکومت کو شیبانی خان کے سپرد کر سکتا تھا۔ شیبانی خان کے قتل و غارتگری سے متعلق قصے سن سن کر اہل سمرقند بدحواس ہو رہے تھے اور اب وہ بابر کے لئے شہر کے دروازے کھول دینے کو تیار تھے۔

قسمت نے اسے یہ جو مناسب موقع فراہم کر دیا تھا اس سے فائدہ اٹھایا جانا چاہئے تھا یا نہیں؟ ”قاصد نے ہمیں واقعی سمرقند آنے کی دعوت دی ہے“ بابر نے عائشہ بیگم کو کچھ زیادہ نہ ظاہر کرنے والے لفظوں میں بتایا۔ ”لیکن ظاہر ہے کہ سلطان علی تخت سے یوں ہی دست بردار ہونے سے رہا۔“

”یعنی پھر جنگ! پھر خطرات!....“

”ارے بیگم، کوہستانی چوٹیاں برف سے اور سچے جواں مرد کی زندگی خطرات سے خالی رہ ہی نہیں سکتیں۔“

”حکمران ابھی مکڑی کے جالوں کے متعلق فرما رہے تھے۔ وہ تو سمرقند تشریف لے جائیں گے اور ہم؟ ہم کیا..... جالوں ہی میں پھنسے رہ جائیں گے؟“

”آپ چاہیں تو آپ کو اپنے ساتھ لے جاسکتا ہوں!“

”میدان جنگ میں؟“

بابر کا چہرہ تہمتا اٹھایوں کہ مخفی طنز کا تیر ٹھیک نشانے پر لگا تھا۔

”آپ جنگ ختم ہونے تک والدہ صاحبہ اور خان زادہ بیگم کے ساتھ اور اتپا میں قیام کر سکتی ہیں۔ وہاں کے حکمران کی بیگم صاحبہ میری سگی خالہ ہیں۔ وہاں سے بہ آسانی سمرقند پہنچا جاسکتا ہے۔“

”اور اتپا میں؟ اس کوہستانی مقام کا راستہ تو شاید بے حد خراب ہے۔ مجھے گھڑسواری نہیں آتی۔“

”آپ گھوڑا گاڑی میں سفر کر سکتی ہیں۔“

عائشہ بیگم کو ایک جگہ پر آرام و سکون سے رہنا پسند تھا، سفر اسے وبال جان معلوم ہوتے تھے۔

”ہائے، مجھے تو ڈر لگتا ہے..... گاڑیوں سے بھی اور راستوں سے بھی۔“

”بے وفا قسمت نے اس معاملے میں بھی مجھے خوب چوٹ دی ہے“ بابر نے سوچا۔ ”مجھے جیسے ایک جگہ بیٹھ نہ سکنے والے شخص کو اتنی نازک اور ایک ہی جگہ کی ہو کر رہ جانے والی شریک زندگی دے دی! لیکن آخر اس وقت ان سب باتوں کا تک ہی کیا ہے؟ کمزور خاتون کو حفاظت کی ضرورت ہے اور حفاظت میں کروں گا۔“

بابر نے چھیڑ خانی کے انداز میں کہا:

”اگر آپ گاڑی میں سفر کرتے ڈرتی ہیں اور گھڑ سواری آتی نہیں تو بیگم، آپ کو میں.... گود میں اٹھا کر لے چلوں گا!“

”میرا مذاق نہ اڑائیے! میں بھلا اس لائق کہاں....“

بابر کو یہ الفاظ ایک دوسرے ہی مفہوم سے، محبت اور ترغیب سے معمور معلوم ہوئے۔ اس کی رگوں میں خون جوش مارنے لگا اور وہ دسترخوان سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”ارے نہیں، آپ یقیناً اس لائق ہیں!“

”میرا مذاق نہ اڑائیے، التجا کر رہی ہوں....“

”میں ثابت کر دکھاؤں گا، کروں ثابت؟“ بابر نے اسے نوجوانوں کے سے شرارتی انداز سے دھمکایا۔

عائشہ بیگم غزالہ جیسی پھرتی سے اچھل کے انٹھی اور بھاگی لیکن بابر نے جھپٹ کر اسے پکڑ لیا اور فوراً ہی یاد آگیا کہ جب وہ شب زفاف کو بھی ہوئی گاڑی سے عائشہ کو گود میں اٹھا کر اندر لایا تھا تو وہ کتنی پھول سی معلوم ہوئی تھی۔ اس وقت بھی اس نے اتنی ہی آسانی کے ساتھ عائشہ بیگم کو اٹھا لیا۔ سچ کے قریب پہنچ کر اس نے پردے کو پیر سے ہٹایا اور سرہانے جلتی ہوئی شمع کو پھونک مار کے بجھا دیا۔

عائشہ بیگم اس رات اس سے جتنی محبت اور گرمجوشی سے پیش آئی اس سے پہلے کبھی بھی نہیں پیش آئی تھی۔ کتنی حیرت کی بات تھی کہ اسی خواب گاہ میں پہلے سب کچھ بالکل مختلف ہی ہوتا تھا۔ ”اب میں ہر رات یہیں گزارا کروں گا!“ بابر نے بوس و کنار کی منزلوں سے گزرنے کے بعد نیند کی آغوش میں جاتے ہوئے سوچا لیکن دوسرے لمحے اسے افسوس بھی ہوا: ”ابھی تو سر قند جاؤں گا اور تب.... جانے کتنے ہفتوں یا مہینوں کی جدائی کے دوران ان مسرتوں سے محروم رہنا پڑے گا۔ تو کیا اندجان میں رہنا ہی بہتر نہ ہو گا؟“

اور جانے کیوں ایک بار پھر اسے عائشہ بیگم سے ملاقات کی اولین شام اور شب زفاف یاد

آگئیں وہ بوس و کنار کے دوران جواباً "عائشہ بیگم کے گمرے لگاؤ کے مظاہرے کے لئے مخصوص الفاظ اور طرز عمل کے لئے تربت رہا تھا۔ وہ اس کے دل کو جیتنا اور اپنے دل کو ہارنا چاہتا تھا لیکن عائشہ بیگم تو جبر پر بے حس و حرکت سی پڑی رہی تھی، اس کے بھجائی پیار کا جواب بھی بڑے محتاط اور منہب انداز سے دیتی رہی تھی جو صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ ماں اور بڑی بوڑھیوں کی تربیت کا نتیجہ ہے۔ اسے یہ بھی یاد آیا کہ عائشہ بیگم کے کپڑے اتارتے وقت اس کی پتلی سی کلائی سے سونے کا وزنی کنگن جس میں یا قوت رمانی جڑے ہوئے تھے گر کر کیس لڑھک گیا تھا۔ اسے کلائی سے کنگن کے غائب ہونے کا احساس کچھ دیر بعد انتہائی ناموزوں لمحات میں ہوا تھا اور وہ اچانک بوکھلا سی اٹھی تھی۔

"ہائے، میرا کنگن کیا ہوا؟ کتنے قیمتی یا قوت جڑے ہوئے ہیں اس میں! شاہ معظم، ازراہ نوازش ذرا ٹھہر جائیے، میں اسے تلاش کر لوں۔۔۔"

اور وہ اس کی بانوں سے نکل گئی تھی۔

باہر اس وقت یہ سب یاد کر کے دفعتاً "مضطرب ہو گیا۔ پھر اسے جلد ہی نیند نہ آئی، وہ دیر تک محو خواب عائشہ کے تھکے تھکے سے مسرور چہرے کو تکتا رہا۔

منور سحر نمودار ہوئی اور نجوم شب کے ساتھ ہی ساتھ باہر کی وہ ذہنی کیفیت بھی کافور ہو گئی جو گزشتہ شام کو اس کے منصوبوں میں تبدیلی کرنے کی اہل معلوم ہو رہی تھی۔ زن و خاوند ناشتہ کرنے کے لئے بیٹھے۔ باہر کے خیالات ایک بار پھر مکڑیوں کے اسی جالے میں الجھ گئے جسے اس کے ارد گرد احمد تہل اور علی دوست بیگ بننے میں مصروف تھے۔ اس نے گزشتہ روز دوپہر کو قاصد سے کہا تھا کہ وہ ضرور سرفرد آئے گا نیز یہ کہ وہ قاسم بیگ اور اپنے دوسرے وفاداروں کے ساتھ مل کر کوچ کے سلسلے میں پہلے ہی سے خفیہ طور پر تیاریاں کرتا رہا ہے۔ آج صبح کو اس پر یہ بات اور بھی زیادہ واضح ہو گئی کہ اس کے اپنے قول سے پیچھے ہٹنے کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔

عائشہ بیگم نے بھانپ لیا کہ خاوند کی ذہنی کیفیت بدل چکی ہے اور وہ خاموش بیٹھی رہی۔ باہر نے محض اتفاقاً ہی یہ دیکھنے کے بعد سے کہ سونے کا وہ وزنی کنگن جس میں یا قوت رمانی جڑے ہوئے تھے اس وقت بھی اس کی پتلی سی کلائی میں لٹکا ہوا ہے، اس کے چہرے کی طرف ایک بار بھی نہیں دیکھا تھا۔

"اچھا، بیگم تو آپ نے اورا تپا جانے کا فیصلہ کر لیا نا؟" عائشہ بیگم سمجھ گئی کہ باہر کی سرفرد جانے کی خواہش نہ صرف یہ کہ ختم نہیں ہوئی بلکہ کچھ اور بھی مستحکم ہو گئی ہے۔ اس نے سوچا کہ

اب اسے کئی مہینوں کی جدائی جھیلنی پڑے گی اور کیا یہ اس بات کی علامت نہیں کہ بابر اس سے صحیح معنوں میں محبت نہیں کرتا؟ آخر اس نے اس انداز سے جیسے دل کو نہیں لگی ہو، جواب دیا:

”محترم حکمراں، پہلے آپ سمرقند پر دوبارہ قبضہ کر لیجئے اس کے بعد میں اپنے شہر ہی کو چلی جاؤں گی۔ اور اسیا تو میں نہیں جانا چاہتی۔“

اس بات کے لمحے سے بابر کو احساس ہوا کہ اس کے سمرقند پر دوبارہ قابض ہو سکنے کا اس کی شریک زندگی کو یقین نہیں ہے۔ تاہم اس نے عائشہ بیگم کو کچھ اور سمجھانے بجھانے کی کوشش نہ کی اور حرم سے باہر نکلتے وقت بے اتفاقی کے ساتھ کہا:

”اچھا تو بیگم! انشاء اللہ ہماری مزید گفتگو سمرقند ہی میں ہوگی۔“

سمرقند

۱

سلطان علی کی جو سمرقند کے تخت پر بیٹھا تھا اور جسے بابر غیر خاندان کے شیبانی خان کے ہاتھوں تخت سے ہٹائے جانے سے قبل ہی ہٹا دینا چاہتا تھا، کوئی بھی تو عزت نہیں کرتا تھا۔ اس کے متعلق بستان سرائے محل کے گوشوں میں ”نکما“ کہہ کر چپکے چپکے باتیں کی جاتی تھیں۔ سلطان علی کا معتبر اور بہت ہی قریبی بیگ ابو یوسف ارغون جو اس کے حرم کے لئے نئی نئی خوبصورت کنیرس فراہم کیا کرتا تھا اب اس سے پوری طرح مایوس ہو چکا تھا۔ اب تو سلطان علی امور سلطنت اور اپنے خاندان کے مستقبل کے بارے میں اس چھوٹے سے کمرے میں بیٹھ کر ہی باتیں کرنا پسند کرتا تھا جو سنگ مرمر کے کھلے ہوئے حوض والے حمام کے پاس بنا ہوا تھا اور جس کی ایک دیوار میں باہر سے نظرنہ آنے والی خفیہ کھڑکی واقع تھی (یہ کھڑکی سلطان محمود کے عہد ہی میں بن گئی تھی) اس اٹھارہ سالہ عیاش کا محبوب مشغلہ تھا اس کمرے میں بیٹھے بیٹھے حوض میں نہاتی ہوئی برہنہ حسناؤں کو نکٹنا، جام پر جام چڑھانا، مزے لوٹنا اور صرف نظارہ بازی یا حصول مسرت کی خاطر ہی نہیں۔۔۔

اس بار بھی زہرہ بیگم نے اپنے بیٹے کو راہ راست پر لانے کی کوشش کی جو ناکام ثابت ہوئی کیونکہ شراب اور عیاشی کے باعث وہ عقل و ہوش گنوا بیٹھا تھا۔ سلطان علی بڑبڑانے لگا:

”کیا کہا؟۔۔۔ ایک بار پھر ہمارا محاصرہ کر لیا گیا؟ ہونہ، ابھی نہیں۔۔۔ سازش کرنے والے سمرقند کے دروازے بابر کے لئے کھول دینا چاہتے ہیں؟ اور میرے پیر خواجہ یحییٰ سازشیوں کے سرغنہ ہیں؟ کوئی بات نہیں، سرغنہ ہیں تو رہیں۔۔۔ بابر کو ہم شہر اور قلعے کے اندر داخل ہو جانے دیں گے پھر

اسے گرفتار کر کے اس کی آنکھیں... دھکتی ہوئی سلاخوں سے پھوڑ دیں گے۔ ہا۔۔۔ ہا۔۔۔ ہا۔۔۔

زہرہ بیگم اُگ بگولا ہو کے بیٹے کے پاس سے چلی آئی۔

دراصل زہرہ بیگم ہی بابر کے سرقدر قابض ہونے کے راستے میں نسب سے بڑی رکاوٹ تھی۔ اسی کے اشتعال دلانے پر سازشیوں کو، بابر کے حامیوں کو کچھ کر سکنے سے قبل ہی گرفتار کر لیا گیا تھا۔ اسی کے حکم پر بابر کے ہراول دستے کو فریب دے کر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔ لیکن بابر کے خاص لشکر کا مقابلہ کرنا، بابر کے نام کو بٹالگانا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ سرقدر کی جہاں یقینی تھی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اس کے تختے بیٹے سلطان علی کی بھی۔

اس نے سوچا: ”کس کا سارا لوں میں اب، پروردگار!“

اپنے رہائشی حصے میں واپس لوٹ کر زہرہ بیگم کمر میں جہاں شمعیں پوری آب و تاب سے جل رہی تھیں، پریشان اور مضطرب شعلی رہی۔ صبح تک وہ پلک بھی نہ جھپکا سکی۔

وہ سوچ رہی تھی کہ حالات میں آنے والے خطرناک موڑ کو دور رکھنے میں ابھی تک تو وہ کامیاب رہی ہے۔ وہ سازشی جن کا جھکاؤ گزشتہ سال کے محاصرے کے وقت ہی سے بابر کی طرف تھا، گرفتار کئے جا چکے ہیں۔ اس اقدام کی اجازت اس نے مدہوش سلطان علی سے جوں توں لے لی تھی۔ اس کے باوجود شہر کے اندر اس کے اپنے وفاداروں کی تعداد کم ہی ہوتی جا رہی ہے۔ سازشی بیگوں کو سخت سزائیں دی جائیں گی ان کی املاک کو کھلے عام لٹنے دیا جائے گا پھر بھی... سلطان علی اور خود اس سے بھی ناراض لوگوں کی تعداد کچھ بڑھ ہی جائے گی اور خواجہ یحییٰ اتنا زیادہ با اثر ہے کہ اس کے ساتھ سختی سے پیش آنے کا سوال ہی نہیں اٹھتا، اسے تو سارے کے سارے علما کی حمایت حاصل ہے اور کیوں نہ ہو، مشہور و معروف خواجہ احرار کا بیٹا جو ہے۔ ایسے شخص کے اشارے پر تو علما و شیوخ کی قیادت میں سارے جاہل لوگ اٹھ کھڑے ہوں گے اور تب ایسے ایام کا آغاز ہو سکتا ہے جو ان ایام سے بھی بدتر ثابت ہوں جن کے دوران خود الخ بیگ کا سرتن سے جدا کر دیا گیا تھا۔

زہرہ بیگم کو رہ رہ کر شیبانی خان یاد آنے لگا۔ اس نے سوچا کہ شیبانی خان کی کامرانی اور خوش نصیبی کا کہنا ہی کیا! وہ موقع کی ناک میں رہا طاقتور لشکر تیار کر کے حال ہی میں بخارا پر یوں قابض ہو گیا جیسے یہ اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل رہا ہو اور اب کسی بھی وقت سرقدر پر حملہ آور ہو سکتا ہے۔ اس نے خود کو مذہبی رہنما بھی ثابت کر دکھایا اور سچا سپاہی اور ایسا مرد بھی جو نسوانی حسن کا قدر داں ہے۔ تین روز قبل ایک نقش بندی درویش شیبانی خان کا ایک خط لے کر خفیہ طور پر زہرہ بیگم کے پاس آیا تھا۔

زہرہ بیگم نے چھوٹی سی کنبی سے سونے کی مسند دھکی کا جسے وہ پردے کے پیچھے دیوار میں بنے ہوئے خفیہ طاق میں چھپا کر رکھا کرتی تھی قفل کھول کر اس کے اندر سے خط کو نکالا اور شمع کی روشنی میں دوبارہ پڑھنے لگی۔

خانہ بدوش خان نے شہد کے رنگ کے باریک کر کرے کاغذ پر بڑی خوش خط تحریر اور بڑے لطیف اور نفیس انداز بیان میں زہرہ بیگم کی ذہانت و فراست اور حسن و جمال کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے اس بات کا مخصوص احترام کے ساتھ تذکرہ کیا تھا کہ جوان خاتون نے اپنی دوسری شادی کا جو بہ آسانی ممکن تھی خیال ترک کر کے اپنی زندگی نہایت ہی بے لوث طور پر اپنے بیٹے کے لئے وقف کر دی ہے۔ لیکن خط کا دلکش ترین پہلو تھا خان کا زہرہ بیگم کو دیکھے بغیر ہی اس سے اظہار محبت یہ اشارہ کہ وہ اسے اپنی شریک زندگی بنانے کا متمنی ہے۔ اس بیت کا دوسرا مفہوم ہو ہی کیا سکتا تھا:

آپ کا بیٹا ہو میرا بیٹا بھی، خود یار ہوں

ہم نفس میری ہوں، دلبر میری ہوں، دلدار ہوں

زہرہ بیگم کو اپنے چہرے پر طاقتور مرد کی گرم گرم سانسیں محسوس ہونے لگیں۔ وہ چہ برسوں سے بیوگی کی زندگی بسر کر رہی تھی، طویل چہ برسوں سے! خوبصورت پھول پڑمرہ ہوا جا رہا تھا۔ وہ شادی کرنا چاہتی تو یقیناً ”ہمت سے امیدوار سامنے آسکتے تھے۔ نامی گرامی، دولت مند، ظاہری اور باطنی دونوں اعتبار سے دولت مند افراد اور ایسا کیوں نہ ہوتا، آخر وہ سلطان محمود کی چیتی بیگم رہ چکی تھی جو خود بھی اپنی بے مثال وجاہت کے لئے شہرت رکھتا تھا لیکن وہ اب تک محض اس لئے شادی نہیں کر سکی تھی کہ خود ملکہ تھی، شوہر بھی تاجدار تھا بیٹا بھی اور رواج کے بموجب دوبارہ وہ کسی صاحب تخت و تاج ہی سے شادی کر سکتی تھی۔

اور خفیہ طور پر پیغام بھیجنے والا شیبانی خان کیا صاحب تخت و تاج نہ تھا؟ ”ہم نفس میری ہوں، دلبر میری ہوں، دلدار ہوں“ زہرہ بیگم نے دل ہی دل میں دہرایا اور اسے اپنے جسم میں ایسی تپش محسوس ہوئی جیسے واقعی کسی نے اسے اپنی بانہوں میں بھینچ کر سرگوشی کی ہو: ”میری انتہائی حسین و جمیل ملکہ!“

زہرہ بیگم اٹھ کر آئینہ کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ تمام شب کی بیداری نے آنکھوں کے نیچے نیلی نیلی جھائیاں سی ڈال دی تھیں لیکن اب وہ ابابیل کے بازوؤں جیسے تھے، کالی کالی آنکھیں چمک رہی تھیں، گوری گوری، چکنی چکنی گردن سنگ مرمر سے تراشی ہوئی سی معلوم ہو رہی تھی اور لب

بوسوں کے لئے مضطرب اور مرتش تھے۔

شیبانی تقریباً پچاس سال کا ہو چکا تھا، اس کے بیگمات بھی تھیں اور بچے بھی۔ یہ سب بچ تھا اور زہرہ بیگم اس سے واقف تھی لیکن اس نے سوچا: ”وہ صحراؤں کی رہنے والیاں میرا مقابلہ کیا خاک کریں گی! خان کو میں کچھ اس طرح مسحور کر دوں گی کہ وہ عورتیں بھی میری مٹھی میں آجائیں گی“ مٹھی میں!“

اگلے روز وہ نقش ہندی درویش جواب کے لئے دوبارہ اس سے ملاقات کرنے والا تھا۔
زہرہ بیگم نے کاغذ اور قلم اٹھائے۔

شیخ دانوں کی موسم بتیاں کبھی کی پھل چکی تھیں۔ کرے میں۔ اب کیس جا کر اسے خیال آیا۔ سپیدہ صبح پھیلتا جا رہا تھا۔ زہرہ بیگم نے نیلگوں پردے کو ہٹا کر اپنا چہرہ برآمدے سے آتی ہوئی ٹھنڈک کے سامنے کر دیا۔

دفعۃً ”اسے کسی مرد کی دل دوز چھ سٹائی دی جو شہر کے قلعے کی طرف آتے ہوئے کسی راستے پر بلند ہوئی تھی اور پھر دوسرے ہی لمحے کسی عورت کی آہ دیا۔

اس کے بیٹے کے آدمی جن میں ابو یوسف بھی شامل تھا، سازشی بیگوں کو تلاش کرنے اور ان کے گھروں کو لوٹنے میں مصروف تھے۔ زہرہ بیگم نے تصور کیا کہ اس وقت تلواریں اور نیزے کس طرح اہل سرقت کا کام تمام کر رہے ہوں گے، ان چالاک اور باغی اہل سرقت کا جنہیں بابر چاہئے تھا اور خود اسے شیبانی خان لیکن اگر شیبانی خان اس سے محبت جتاتے ہوئے کوئی غدارانہ منصوبہ بنا رہا ہو تو؟ شیبانی خان کے سرقت پر قابض ہو جانے کے بعد کیا وہ خود بھی اسی عورت کی سی حالت کو نہ پہنچ جائے گی جو علی الصباح کہیں گریہ و زاری کر رہی ہے؟

وہ شدت خوف سے لرز اٹھی۔ اس نے خط کو دوبارہ اٹھالیا جس کے آخر میں شیبانی خان نے جیسے جان بوجھ کر، جیسے زہرہ بیگم کے اندیشوں کو دور کرنے ہی کے لئے ایک اور بیت لکھ دی تھی:

تمہارے بنا ہے سرقت کس کام کا میرے، جاننا

بنا روح یہ جسم فانی سلامت رہے کیسے، جاننا

اور اس نے سوچا کہ ایسے شوہر کے بنا جو حقیقی بادشاہ ہو، سرقت اس کے کس کام کا، آخر کس کام کا؟ اگر عظیم اور طاقتور شیبانی خان یہاں آکر اس بیوہ کے جسم اور روح میں آتش محبت نہیں بھڑکاتا تو سرقت کی حیثیت محض ”جسم فانی“ کی سی محض لاش کی سی رہ جائے گی۔

زہرہ بیگم چونک اٹھی، اسے اپنے سینے میں اس خواہش کی لہر ایک بار پھر اٹھتی محسوس ہوئی جو ہر

شخص کی زندگی میں بہت ضروری ہوتی ہے، تاجداروں کا تو خیر ذکر ہی کیا۔ وہ قلم لے کر خط لکھنے بیٹھی اور شیبانی خان کو آسمان پر چڑھا دیا:

”حضرت امام زمان، خلیفہ رحمان.....۔“

سمرقند کی فیصل کے پہلے گھرے کے آگے وسیع باغات میں، الخ بیگ کی رصد گاہ کے قریب واقع ٹیلوں پر اور دریائے آب رحمت کے کنارے کنارے۔ ہر جگہ اور چاروں طرف لشکر جبار کے دستے پھیلے ہوئے تھے۔ چوپان آتا پھاڑی کے، دامن میں اور اس کے آگے دریائے زرافشاں کے کناروں پر مزید سینکڑوں خیمے اور شامیانے نصب تھے۔

اس لشکر کے سالار شیبانی خان نے جو خود کو ”امام زمان، خلیفہ رحمان“ کہتا تھا، مشہور اور خوبصورت باغ میدان میں الخ بیگ کے تعمیر کرائے ہوئے مشہور ”چمل ستون“ محل پر قبضہ کر لیا تھا۔ محل کی اوپری منزل بہت کشادہ تھی اور اس کے چاروں طرف برآمدے بنے ہوئے تھے۔ وہیں شجاع اور میب شیبانی خان نماز ظہر ادا کرنے کے بعد آراستہ شاہ نشیں پر بڑی شان سے بیٹھا ہوا تھا۔

اتنے میں خبر آئی کہ سلطان علی اپنے درباری عمدیداروں کے ساتھ شجاع اور میب خان سے ملنے آیا ہے۔

دیکھنے میں ذرا بھی میب نہ لگنے والے خان کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔

”پہلے ہمارے سلطانوں کو یہاں بلا لیجئے اس کے بعد سمرقند کے حکمران کو لائیے۔“

”لیکن حکمران، آپ کا تخت تو چلی منزل پر ہے۔۔۔۔“

”میری جان نماز کسی بھی تخت سے زیادہ اونچی ہے!“

”بجا فرمایا آپ نے، عظیم خان!“

شیبانی خان اونٹ کے بچے کے نرم اون سے بنی ہوئی بھوری جانماز کے بالکل کنارے پر جان بوجھ کر بیٹھا ہوا تھا۔

سلطان علی کو اندر آنے کی اجازت ملی تو سب سے پہلے جس بات کی طرف اس کی توجہ مبذول ہوئی وہ تھی میب خان کے چہرے کی پرسکون کیفیت۔ وہ کافی اونچی شاہ نشیں پر بیٹھا ہوا تھا اور نیچے کوئی دس سلطان پالتی مارے آرام کے ساتھ بیٹھے تھے جن کے لباس اتنے سادے نہ تھے جتنا کہ خود ان کے بادشاہ کا تھا۔ شیبانی خان کے لباس میں نام کی بھی سجاوٹ نہ تھی جبکہ سلطان علی کی دستار

اور چونے پر قیمتی کار چوبی اور موتیوں کا کام چمک رہا تھا۔

اٹھارہ سالہ سلطان علی اس بری طرح بوکھلایا ہوا تھا کہ اس کی نگاہیں کسی چیز پر ٹک ہی نہیں پارہی تھیں اور اس کا عمر کے اعتبار سے کہیں زیادہ پھولا پھولا سا گول مٹول جسم نرمی اور بے طاقتی کا آئینہ دار تھا۔ اپنی ماں اور ابو یوسف ارغون کے مشورے پر وہ اپنے فوجیوں کو قلعے ہی میں چھوڑ آیا تھا۔ اسے یقین ہو چکا تھا کہ خان نے ایک لشکر جرار کے ساتھ سمرقند پر یلغار کی ہے اسی لئے اس وقت بے حد خائف تھا۔

اسے بھلا کیسے معلوم ہو سکتا تھا کہ ابو یوسف تو بہت پہلے ہی شیبانی خان سے سازش کر چکا تھا اور اس نے خان کے حکم ہی پر سلطان علی کو خان کی خدمت میں حاضر ہونے کا مشورہ دیا ہے۔ ابو یوسف نے آج دوپہر کے کھانے پر نکتے حکمران کو تیزے ناب اتنی زیادہ پلا دی تھی کہ اس وقت وہ خان کو کورنش بجاللانے کے لئے جھکا تو قالین اس کی آنکھوں تلے تیرنے سا لگا۔ اس کا تھل تھل کر ہنگول مٹول جسم ڈگر گیا اور اگر ابو یوسف نے سارا نہ دیا ہوتا تو سیدھا قالین پر ڈھیر ہو گیا ہوتا۔ سلطان علی کے استقبال کے لئے شیبانی خان اٹھ کھڑا ہوا اور تب اس سے ناب کے بھیکوں کا احساس ہوا۔ ہونہ، تو یہ شیر خوارے نوشی کر رہا تھا! اس نے نشے میں میاں آنے کی جرات کی! اور شیبانی خان نے حکم دیا کہ سلطان علی کو اس کے بیٹے تیمور سلطان اور داماد جانی بیگ سے کم اہم جگہ پر بیٹھایا جائے۔

سلطان علی کے دل میں خان کو دیکھ کر احترام کے جذبات بیدار ہو گئے۔

شیبانی خان کی سرخ مخملی ٹوپی پر سفید دستار بندھی تھی، بانات کے چھوٹی آستینوں والے نیلگوں ہلکے چونے کے سونے کے بٹن بند تھے اور چونے کے نیچے کے کپڑے سبز رنگ کے، اسلامی پرچم کے رنگ کے تھے اور جامنا ز۔ ”بڑا خدا ترس ہے صحراؤں کا یہ باشندہ“ سلطان علی نے سوچا۔ لیکن یہ کیا؟ سمرقند کے حکمران سلطان علی کو دوسروں سے کم اہم جگہ پر، جو لوگ اس جیسے عالی نسب نہیں ہیں ان کے پاس بٹھانے کا اشارہ کیا گیا ہے!..... تو یہ ہے قصہ! اور سلطان علی جان بوجھ کر لاپرواہی کے ساتھ سلطانوں کے سامنے پالتی مار کے بیٹھ گیا۔ شیبانی خان کے بیٹے تیمور سلطان نے اپنے ہم پہلو کو جھنجھلاہٹ کے ساتھ دیکھا۔

”تو مرزا، آپ ہم سے فرزند جیسے قریبی تعلقات قائم کرنا چاہتے ہیں؟“ شیبانی خان نے سمرقند کے حکمران سے محبت بھرے لہجے میں پوچھا۔

”مجاہد خلیفہ، آپ نے تو ہم کو صلح کرنے کے لئے مدعو کیا ہے۔۔۔“

”لیکن آپ کی والدہ محترمہ آپ کے ساتھ نہیں آئی ہیں کیا؟“
 ”والدہ صاحبہ نے مجھے بھیجا ہے۔“ سلطان علی نے واضح طور پر کہا اور پوری طرح ظاہر کر دیا کہ
 اس کا اقتدار کس نوعیت کا ہے۔

”لیکن وہ خود بھی تو تشریف لانے والی تھیں۔۔۔“
 ”ارے خواتین۔۔۔ جنگ و امن کے معاملات سے خواتین کو کیا سروکار“ سلطان علی نے
 بھونٹے پن سے اپنی غلطی درست کی۔

”نہیں، آپ کسی کو بھیجئے جو انہیں یہاں لے آئے۔“ خان نے محبت سے لیکن اس طرح کہا گویا
 یہ حکم ہو جس کی خلاف ورزی نہ کی جاسکتی ہو۔

سلطان علی نے اپنے قریب ہی گھٹنوں کے بل بیٹھے ہوئے ابو یوسف کی طرف دیکھا جو فوراً ہی
 اٹھ کر شیبانی خان کو کورنش بجالایا:

”مجاہد اعظم، اجازت دیجئے کہ میں فوراً ہی جا کر زہرہ بیگم کو بلا لاؤں۔“

شیبانی خان نے ابو یوسف کو بھی محبت بھری نظروں سے دیکھا:

”میرے بہترین مبارقار گھوڑوں میں سے ایک آپ کا ہو گیا، یک۔“

”حکمران کی عنایت کا بہت بہت شکریہ۔“

”بیگ، آپ شہر جائیے۔“ دفعتاً سلطان علی کہہ اٹھا ”اور خواجہ یحییٰ کو ہماری خواہش سے مطلع
 کر دیجئے۔ اگر وہ یہاں جہاں کہ میں اس وقت موجود ہوں، نہ آئے تو ہمارے درمیان صلح کا سوال
 ہی نہ اٹھے گا۔“

”بجا فرمایا آپ نے، محترم امیر“ ابو یوسف نے قدرے سر پرستانہ انداز میں کہا اور تاجدار کا حکم
 بجالانے کے لئے فوراً ہی وہاں سے چل دیا۔ شیبانی خان نے اپنے سلطانوں کو معنی خیز نگاہوں سے
 دیکھا۔

”آپ لوگ ذرا مرزا سلطان علی سے باتیں کیجئے۔“ اس نے کہا اور مرکز عقبی دروازے سے
 نیچے اتر گیا۔

سمرقند کے حکمران نے سلطانوں کے چہروں پر نظریں دوڑائیں ان سے نفرت اور صرف نفرت ہی
 جھلک رہی تھی۔ اس کا جی ان لوگوں کے درمیان ٹھہرنے کو نہ چاہا اور وہ اٹھ کر بغل والے
 دروازے کی طرف بڑھا لیکن عین اسی لمحے ترکستان کے ایک سلطان نے کھڑے ہو کر اس کا راستہ
 روک لیا:

”مرزا سلطان علی، اب آپ ہمارے یہاں سے کہیں بھی نہ جائیں گے، ہمیں یہی حکم دیا گیا ہے!“

اور ایک لمبا ترنگا سپاہی جس کی کشادہ ہتھیلی خنجر کے دسے پر رکھی ہوئی تھی، دروازے کے پاس آن کھڑا ہوا۔ سلطان علی پر واضح ہو گیا کہ وہ جال میں پھنس چکا ہے، اس کا سارا نشہ پلک جھپکتے میں ہرن ہو گیا اور وہ اترے ہوئے چہرے کے ساتھ اپنی جگہ پر لوٹ آیا۔

چند گھنٹوں کے بعد زہرہ بیگم چار کنیزوں کے ہمراہ باغ میدان میں آئی۔ سر پر مخصوص انداز سے بندھے ہوئے سفید ریشی رومال اور پیشانی پر نیم دائرے کی شکل کے طلائی زیور کی بنا پر وہ بالکل دلہن جیسی لگ رہی تھی۔ ملکات کی سی لمبی آستینوں والی پھول دار قباس کی موٹی لیکن چمکیلی کمر پر کسی ہوئی تھی اور اس کے نیچے سے سفید املی لباس کے فرش تک آتے ہوئے دامنوں کو دونوں جانب سے کنیزیں اٹھائے ہوئے تھیں۔

زہرہ بیگم کو محل کے دیوان خاص میں لے جایا گیا جسے اس موقع کے لئے خاص طور پر آراستہ کیا گیا تھا۔ مہمان کو شیبانی خان کی بوی بیگم نے بھی دیکھا جس کی عمر پچاس کے قریب ہو چکی تھی۔ ”توبہ، کیسی بے حیا ہے!“ اس نے اپنے پاس کھڑی ہوئی جوان عورت سے کہا ”آخر یہ ہے کیسی؟ مرد کے لئے تڑپ رہی ہے، ذرا بھی تو تمیز نہیں، دلہن کی طرح سجا رکھا ہے خود کو!۔۔۔ کم از کم شادی کے پیغام اور ضروری رسمیں ادا کئے جانے تک تو انتظار کر رہی لیتی۔ خدا ہمیں ایسی ذلت سے بچائے!“

زہرہ بیگم دیوان خاص میں داخل ہوئی تو شیبانی خان اپنے چند معتبر سرداروں کے ساتھ وہاں موجود تھا۔ وہ اس امید کے ساتھ کورنش بجالائی کہ خان تخت سے اتر کر اس کا خیر مقدم کرنے کے لئے راستے پر پہنچی ہوئی قاتلین کی پٹی تک آئے گا لیکن خان اپنے تخت زریں سے چپکا ہوا بیٹھا رہا اور تخت کی بلندی پر سے ہی سردمہری سے بولا:

”خوش آمدید، خانم۔“

”حکمران، خلیفہ، میں خود کو آپ پر قربان کرنے کے لئے حاضر ہوئی ہوں! میں اپنا تخت جگہ، اپنی عزت اور آن سب کچھ آپ کو نذر کر چکی ہوں۔۔۔ میں آپ کی شرافت پر، آپ کے خط پر پوری طرح یقین کرتی ہوں۔۔۔“

زہرہ بیگم کے چہرے کو جو دہیز سفید ریشی نقاب سے ڈھکا ہوا تھا، دیکھنا مشکل تھا۔ خان نے اس کے ہاتھوں پر، قیمتی ہیروں والی انگوٹھیوں سے لدی انگلیوں، مرتش انگلیوں پر ابھری ہوئی رگوں

دل پر نظریں دوڑائیں۔ زہرہ بیگم کی عمر ڈھل چلی تھی، اس میں ذرا بھی شک نہ تھا۔ وہ ریس سالہ چھوٹی بیگم جیسی قطعاً نہ تھی جس سے خان نے حال ہی میں بخارا میں شادی کی تھی۔

شیبانی کو یاد آگیا کہ زہرہ بیگم کا بیٹا جسے اس وقت محل کے دوسرے حصے میں اس کے سلطان ڈرا دھمکا رہے تھے، اٹھارہ سال کا ہو چکا ہے۔

”آپ گھبرائیے نہیں، خانم“ شیبانی نے پرسکون لہجے میں کہا، ”ہمیں آپ کی دلی آرزوؤں کا علم ہے۔ خدا نے چاہا تو آپ کی خواہشات ادھوری نہ رہیں گی!“

زہرہ بیگم خان کے منہ سے بس اتنا ہی سن سکی اس کے بعد اسے اور اس کی کینڑوں کو ایک چھوٹے سے کمرے میں لے جا کر باہر سے قفل لگا دیا گیا۔

۳

قلعی طور پر تو کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ شیبانی خان اہل سرقند کے ساتھ کیا سلوک کرنے کا ارادہ رکھتا ہے لیکن فوجی دستوں کے سالار اور درباری عہدیدار سبھی محسوس کر رہے تھے کہ کچھ اہم واقعات رونما ہونے والے ہیں یہ لوگ چھوٹے چھوٹے گردہوں میں چل ستنوں محل کے ارد گرد ٹھل رہے تھے۔

ان میں ایک شاعر محمد صالح بھی شامل تھا۔ سرپرست دارشاند ار ریشمی دستار تھی اور جسم پر چھوٹی آستینوں والی ریشمی عبا بھی خوب جنج رہی تھی۔ محمد صالح کو صحرائی علاقوں کے سلطان جو سردیاں ہوں یا گرمیاں ہمیشہ تپلیک ☆ پہنتے تھے اور جن میں مسلسل جنگوں میں حصہ لیتے لیتے اکٹھن پیدا ہو گیا تھا، کتابی آدمی سمجھتے اور اس کے شاندار لباس کی بنا پر ذرا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ یہی سبب تھا کہ یہ لوگ موقع پاتے ہی چھتے ہوئے طنز کے ذریعے یہ یاد دلانے سے باز نہیں رہتے تھے کہ یہ بانکا چھیلا شاعر سرقند کے حکمرانوں کی خدمت کر چکا ہے جو اپنے زمانے کے خونخوار تیور لنگ کی بد قسمت آل اولاد میں سے تھے۔

اس وقت بھی نینان قبیلے کے سردار تبر بے نے محمد صالح پر چوٹ کی:

”کئے شاعر صاحب“ ہمارے وفادار دوست! سرقند سے آپ کی مہمان رشتے دار بن سنور کے اپنے صاحبزادے کے ساتھ ہمارے ہاں تشریف لائی ہیں۔ سرقند کی اپنی ان رشتے دار کو دیکھ کر آپ تو خوشی سے پھولے نہ سارے ہوں گے؟“

”محترم تبر بے“ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ زہرہ بیگم نینان قبیلے کی ہیں اس لئے اوروں سے پہلے

تو وہ آپ کی رشتے دار ہیں!“

یہ جواب سن کر منیت، قو خرات اور قو شچی قبیلوں کے سلطانوں نے زوردار قہقہے بلند کئے۔
نہان تہماقوں کا یہ سردار دوسروں کے سامنے خوب دون کی لیتا اور صرف اپنے تہماقوں ہی کو
ازبیک مانتا تھا۔

قبر بے کو غصہ آگیا:

”بہتر ہو گا کہ آپ رشتے داری کی بات زبان ہی پر نہ لائیں۔۔۔ خود آپ برلاس ترک نہیں ہیں
کیا؟“

برلاس قبیلہ جس سے تیمور تعلق رکھتا تھا، شیبانی خان کے لئے سب سے زیادہ قابل نفرت تھا۔
محمد صالح پہلے حسین بے قرا کے دربار سے وابستہ رہا تھا پھر سلطان علی کا مقرب بن گیا تھا اور آخر
میں شیبانی خان کے پاس بھاگ آیا تھا۔ اس نے شیبانی خان کو کچھ راز بتائے تھے، بخارا اور دیوسہ ☆
کے قلعوں پر شیبانی خان کے قبضہ کرنے میں معاون ثابت ہوا تھا اور اس طرح وہ خان کا منظور نظر
ہو گیا تھا۔ قبر بے محمد صالح کو نامعتبر اور غداری کرنے کا اہل بلا سبب ہی نہیں سمجھتا تھا، بلا سبب ہی
اس سے نفرت نہیں کرتا تھا۔

شاعر نے مذاق میں بات ٹالنے کی کوشش کی:

”میرے عزیز تجربے، اب تو میں بھی ازبیک ترکوں میں شامل ہوں!“

”ارے شاعر صاحب، زیادہ چالاکی نہ دکھائیے! ازبیک الگ ہوتے ہیں اور ترک بالکل الگ۔“

”کیوں؟ مادہ النہر کے ترکوں میں تو تمام ازبیک قبائل شامل ہیں۔“

”لیکن ہم لوگ تو عظیم ازبیک خان ☆ کی نسل کے ہیں اور آپ، شاعر صاحب سارت ☆ ہیں،
انہی شہری لوگوں کی آل اولاد ہیں۔ یہ نہ بھولے!“

”قبر بے صاحب، میرے آباؤ اجداد شہر ترکستان میں رہتے تھے اور ازبیکوں میں عام طور پر کہا
جاتا ہے: ”ہمارا وطن ترکستان“

”لیکن اس سے کیا؟“

”آپ کا وطن ترکستان ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کے اور میرے آباؤ اجداد کی جڑ ایک
ہی ہے۔ قبر بے صاحب آپ گنتی کسی ایک شاخ سے نہیں بلکہ جڑ سے درخت کے موٹے سے
شروع کیجئے۔ تب آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ازبیک خان دو سو سال قبل گزرا تھا جبکہ ہمارا
ترکستان ازبیک خان سے بھی ہزار سال قبل وجود رکھتا تھا۔ اور ہمارے عوام میں ”ازبیک“ نام

ازبیک خان سے بہت پہلے ہی سے استعمال ہوتا رہا ہے۔
 ”ارے واہ کیا کہنا!“ تبر بے کو یقین نہ آیا۔

”میری بات پر یقین کیجئے! میں خوارزم میں بڑا ہوا ہوں، وہاں میں نے قدیم کتابوں کا... جو آپ کو ایک آنکھ نہیں بھاتیں، مطالعہ کیا ہے... اور آپ کو معلوم ہے کہ خوارزم کے شاہ محمد نے اسی حکمران نے جو چنگیز خان کے خلاف برسرِ پیکار ہوا تھا اپنے ایک بیٹے کا نام ازبیک رکھا تھا؟ اس نے خود اپنے بیٹے کا یہ نام رکھا تھا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ نام عرصے سے قابلِ احترام تصور کیا جاتا تھا اور آپ کو معلوم بھی ہے کہ اس کا مفہوم کیا ہے؟ ازبیک کے معنی ہیں ((اپنا مالک آپ))، ((آزاد)) جو قبائل ہمارے حکمران، مجاہد، خلیفہ شیبانی خان کے تابع ہیں انہوں نے خود کو ازبیک کہنا

اس لئے نہیں شروع کیا کہ یہ نام ازبیک خان کا یا اس سے بھی قبل خوارزم کے شاہ کے بیٹے کا تھا انہوں نے تو یہ خوبصورت نام ترکوں سے لیا ہے...
 ”بہت ہو چکا! یہ شاعر صاحب تو ایک بار پھر ترکوں کی طرف جھکنے لگے!“ تبر بے نے جھلا کر سلطانوں سے کہا جو اس بحث کو بڑی توجہ سے سن رہے تھے۔
 ”اور نہیں تو کیا! ابھی ابھی آپ خود ہی تسلیم کر چکے ہیں کہ آپ کا وطن ترکستان ہے اور ترکستان کے معنی ہیں: ((ترکوں کا ملک))“

”خدا نہ کرے، کہیں یہ شاعر صاحب ہمیں باز نیشی ترکوں کی اولاد نہ ثابت کر دیں۔“
 ”محترم تبر بے، محترم سلطانوں، میں ایسا کرنے کا قطعاً ارادہ نہیں رکھتا۔ باز نیشی ترکوں کی تو اپنی ایک الگ تاریخ ہے۔ ماورالنہر کے ترک تو باز نیشین کے وجود میں آنے سے کافی عرصہ قبل ہی سے ان وادیوں میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ اگر آپ نے شاہنامہ پڑھا ہو... شاعر فردوسی نے لکھا ہے: ہزاروں سال قبل خراسان کے جنوب کی سرزمین کو ایران کہا جاتا تھا اور خراسان کی اس طرف کی، شمالی کی سرزمین کو ایران کہا جاتا تھا اور خراسان کی اس طرف کی، شمال کی سرزمین کو توازن... ہمارے حکمران شیبانی خان تاریخ سے اچھی طرح واقف ہیں۔ ہمارے امام صاحب بخارا کے مدرسے میں تعلیم کے دوران ہی نوائی اور لطفی کے بہت سے اشعار یاد تھے اور خود بچہ ترکی زبان میں غزلیں لکھتے تھے۔ سماعت فرمائیں گے؟

اور یہ سیدھے سادے سلطان چالاک شاعر سے اشعار سننے پر مجبور ہو گئے:
 گرا میں اسپِ فرقت سے، تلی اس نے دی آگر

مداوا کر دیا شیبانی میرے غم کا جاناں نے
 ”لیکن ہمارے خان کی یہ غزل ترکی میں کب ہے، یہ تو ازبیک زبان میں ہم!“ قبر بے کسی طرح
 نکست تسلیم کرنے کو تیار نہ تھا۔

”سارے کے سارے ترک شعرا بس اسی ایک زبان میں شاعری کرتے رہے ہیں۔ نوائی کی ترکی
 زبان اور شیبانی خان کی ازبیک زبان دونوں دراصل ایک ہی ہیں اور اب ہمیں روحانی طور پر بھی
 ایک ہو جانا چاہئے محترم سلطانو، خاندان تیمور کے ناخلف حکمران کما کرتے تھے: ((یہ ترک ہیں اور
 وہ ازبیک)) اور قبیلوں کو ایک دوسرے سے الگ کرتے تھے، لوگوں کے درمیان نفاق ڈالتے تھے۔
 اب ہمارے امام، مجاہد، خلیفہ اور سکندر ثانی ایک بار پھر ہمیں متحد کر دیں گے۔ خدا کرے کہ اس
 مقدس مقصد کی تکمیل میں کامرانیوں ہمارے عظیم خان کے قدم چومیں!“

اس طرح یہ لفظی زور آزمائی ختم ہو گئی اور شاعر شان سے سرواںچا کئے ہوئے چلا گیا۔
 اور تب تو چٹی قبیلے کے سردار کو پک بے نے قبر بے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:
 ”دیکھا، کیسی ہوتی ہے سار توں کی اولاد؟ انہیں باتوں سے مات نہیں دی جاسکتی!“
 ”باتوں سے نہ سہی، تلوار سے مات دیں گے۔“ قبر بے نے جان بوجھ کر زور دے کہا۔
 اور سلطانوں نے قہقہے لگائے۔

۴

شام ہوتے ہوتے وہ آخری شخص، خواجہ یحییٰ بھی جس کا شیبانی خان اپنے منصوبے کی تکمیل کے
 سلسلے میں منتظر تھا، سر قند سے اپنے پانچ چھ مریلوں کے ساتھ آ پہنچا۔

خواجہ یحییٰ نے گھوڑے سے اترنے میں کچھ اتنی جلد سے کام لیا کہ اس کے پیر کا بون کے
 تسموں میں الجھ گئے اور مریلوں نے سہارا دے کر اپنے پیر کو نیچے اتارا۔

شاندار سفید عمامے اور بانٹ کے ویسے ہی شاندار ہلکے سترلات ☆ میں ملبوس خواجہ یحییٰ پیکر
 وقار بنا ہوا تخت کے قریب پہنچا جس پر شیبانی خان سر کو کچھ جھکائے ہوئے بیٹھا تھا۔ اس نے لہجہ
 سے قرآن خوانی کی عادی اپنی نکلتی ہوئی رعب دار آواز سے کہا:

”السلام علیکم، بہادر خان! سر قند کے دروازے آپ کے لئے کھلے ہوئے ہیں۔۔۔“

”شیبانی خان نے اس کی بات کاٹتے ہوئے طنز کیا:

”سر قند کے دروازے آپ نے کھولے ہیں کیا؟“

”ہر کام صرف اللہ تعالیٰ کی مرضی ہی سے ہوتا ہے۔“

”ہم تو صرف اللہ تعالیٰ کے حکم ہی کی تعمیل کر رہے ہیں لیکن کچھ لوگ خود اپنی مرضی سے سرفرد کو بار کے حوالے کر دینے کو تیار تھے۔“

پیر کی ساری اکڑفوں فوراً ہی کافور ہو گئی۔ وہ سمجھ گیا کہ جیتے ہوئے طنزیہ فقروں کا مزید تبادلہ خطرناک ثابت ہوگا۔

”انسان کمزور ہوتا ہے، محترم حکمران... ہم سے کوئی غلطی سرزد ہو گئی ہو تو معاف فرمائیے۔ میں آپ کی خدمت میں سر جھکائے ہوئے حاضر ہوا ہوں۔“

”حاضر ہوئے ہیں یا حاضر کئے گئے ہیں؟“
خواجه بچی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

”خواجه کو اوپری منزل پر لے جایئے۔“ خان نے حکم دیا ”اور انہیں ان کے جیتے مرزا سلطان علی کے پاس بٹھا دیجئے۔“

”خواجه بچی کے وہاں سے لے جائے جانے کے فوراً ہی بعد شیبانی خان نے اپنے سب سے مقرب ساٹھ سالہ مشیر عبدالرحیم کو طلب کیا۔

دونوں نے تنہائی میں جو باتیں کیں ان کا سرداروں میں سے کسی کو بھی علم نہ ہو سکا۔ زیادہ تر سلطانوں کو حیرت تھی کہ دروازے کھلے ہونے کے باوجود شیبانی خان سرفرد میں داخل ہوئے میں جلدی کیوں نہیں کر رہا ہے۔ وہ سوچ رہے تھے: آخر ہم دیر کیوں کر رہے ہیں، برق رفتاری سے اندر داخل ہو کر اور النہر کے اس محبوب و مطلوب مرکز پر قابض کیوں نہیں ہو جاتے جہاں پہنچنے کے لئے شیبانی کے ازبیک اتنے طویل عرصے سے اتنے عزم کے ساتھ تیاری کر رہے تھے۔

تو کیا دربار خاص اسی مسئلے پر کوئی فیصلہ کرنے کے لئے طلب کیا گیا تھا؟ بہر حال جب شیبانی خان صدر دروازے سے اندر داخل ہوا تو حاضرین کا تجسس نقطہ عروج پر پہنچ چکا تھا۔ وہ اسے دیکھتے ہی اچھل کے اپنی اپنی جگہوں پر کھڑے ہو گئے اور کورنش بجالائے۔ شیبانی خان دھیرے دھیرے شاہ نشیں پر چڑھا اور زری کے گدے پر پالتی مار کے اطمینان کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اس کے دائیں جانب عبدالرحیم کے بیٹھ جانے کے بعد چند لمحوں تک خاموشی چھائی رہی پھر عبدالرحیم نے قرآن کی ایک سورت پڑھ کر دعا کی کہ پروردگار مجاہد اسلام شیبانی خان کو کامیابیاں عطا فرمائے اور مقدس مقاصد کی تکمیل ہو سکے۔ ایک بار پھر خاموشی چھا گئی جسے کچھ دیر کے بعد ایک بار پھر عبدالرحیم نے ہی توڑا اور آخر کار اصل مسئلے پر آگیا:

”ہمارے عظیم امام، مجاہد خلیفہ، پیکر تقدس شیبانی خان صرف یہی ارادہ نہیں رکھتے کہ گناہوں

میں ڈوبے ہوئے اس شہر پر قبضہ کر لیں۔ ہمارے حکمران تو دشمنانِ دین کو سزا دیتا اور ہمیں خود پیغمبر خدا کے دکھائے ہوئے پاک راستے پر چلانا چاہتے ہیں اگر ہمارے حکمران ان لوگوں میں سے ہوتے جنہیں صرف دولت ہی کی فکر رہتی ہے تو سمرقند کو اپنا خزانہ خالی کر دیتا پڑتا لیکن ہمارے عظیم شیبانی خان جو اپنی دانتائی میں سکندر ثانی ہیں، دین و ایمان کی فتح کو مقدم تصور کرتے ہیں۔“

”بجا فرمایا آپ نے!“ محمد صالح نے جو عبدالرحیم سے ذرا کم اہم جگہ پر بیٹھا ہوا تھا، دھیرے سے لیکن واضح طور پر کہا۔

”خاندانِ تیموریہ کے بادشاہوں کے طرزِ عمل سے ہم پر واضح ہوتا ہے۔“ عبدالرحیم نے شاعر کی طرف متوجہ ہوئے بغیر اپنی بات جاری رکھی۔ ”کہ جب تاجدارِ انصاف اور ایمان کو بھول بیٹھتے ہیں تو کتنی زیادہ بد اخلاقی پھیل سکتی ہے، ملک کتنا بد حال ہو سکتا ہے۔ عبداللطیف کے حکم سے الغ بیک کو قتل کیا گیا حالانکہ وہ عبداللطیف کا سگا باپ تھا۔ ہرات میں حسین بترانے اپنے سگے پوتے مومن مرزا کی جان لے لی۔ سلطان علی۔ دیکھئے وہ میراں ہمارے پاس بیٹھا ہوا ہے، اپنے بڑے بھائی بائے سنقور کو پکڑوا کر قتل کر دیتا چاہتا تھا لیکن وہ بھاگ کر جان بچانے میں کامیاب ہو گیا اور بعد میں بائے سنقور نے اپنے چھوٹے....“ وہ طنزاً مسکرایا، ”بھائی کو پکڑ لیا اور اس کی آنکھیں نکلوا لیتا چاہتا تھا پر ہمارا یہ مہمانِ سلطان علی جلاد کو رشوت دے کر بچ نکلا۔ دراصل سمرقند کے تاجداروں کا دربار غداری، مکرو فریب اور عیاشی کا اڈا بن گیا تھا۔ قرآن نے مسلمانوں کے لئے عے نوشی کو سختی کے ساتھ ممنوع قرار دیا ہے لیکن یہ کم سن مرزا سلطان علی.... آپ دیکھ رہے ہیں نا ابے؟ ذرا غور سے دیکھ لیجئے۔ یہ سمجھتا ہے کہ اسے ہمارے مقدس امام اور مجاہدِ اسلام کی خدمت میں ممنوع شے کے نشے میں دھت ہو کر حاضر ہونے کا حق ہے! ہمارے مقدس امام کو تو خیر پہلے ہی سے علم تھا کہ.... یہ نکما حکمران کم سنی ہی سے جاہ گناہ پر گامزن ہے اور معزز سلطانوں، آپ لوگوں کو بھی اس بات کا یقین ہو گیا....“

تہجاق قبیلے کا سردار کوپک بے اپنی جگہ سے چلایا:

”اس زنا کار اور شرابی کو دار پر چڑھا دیا جائے!“

”تو جوان حکمران یقیناً تصور دار ہے“ محمد صالح نے کہا اور مذمت کے انداز میں سر ہلایا۔ ”لیکن اس کا باپ سلطان محمود تو اس سے بھی زیادہ گنہگار تھا۔ توبہ توبہ، کتنا عیاش تھا وہ شخص! وہ تو دین و ایمان کو پامال کیا کرتا تھا۔ عورتوں اور کم سن بچوں کو اپنی ہوس کا شکار بناتا رہتا تھا۔ بد نصیب اہل سمرقند تو ڈر کے مارے اپنے کم عمر بیٹوں کو گھر سے باہر نہیں جانے دیتے تھے، انہیں بھی بیٹیوں ہی کی

طرح زنان خانوں میں چھپائے رہتے تھے۔۔۔۔۔“
 ”اور میرا خیال ہے کہ بیٹا اپنے زانی باپ سے بھی زیادہ آگے بڑھ چکا ہے!“ قبر بے نے نکوار کے وار کی سی تیزی سے کہا۔

”باپ کا تو خیر کتنا ہی کیا، ذرا ماں کو تو دیکھئے، سلطان علی کی ماں کیسی ہے؟“
 کوپک بے نے یہ کہہ کر سنگین خطرہ مول لے لیا تھا۔ لوگوں نے دم سادھ لئے، سناٹا چھا گیا۔ یہ خبر کہ شیبانی خان زہرہ بیگم سے شادی کرنے کا ارادہ رکھتا ہے، بہتوں کے کانوں تک پہنچ چکی تھی۔ شیبانی جانتا تھا کہ وہ زہرہ سے شادی کرے گا تو سلطانوں کی نظروں سے گر جائے گا اور ویسے بھی وہ زہرہ بیگم کے پھولی پھولی نسوں والے ہاتھوں کو فراموش نہیں کر پارہا تھا۔ عبدالرحیم نے جو خان کے ارادوں سے واقف تھا، فوراً ہی افواہوں کا خاتمہ کرنے کی ٹھانی اور تہجاتی سلطان کے غصے اور طنز سے بھرے ہوئے تبرے کی تائید کر دی:

”دراصل بدکار تاجداروں کی بیگمات بھی انہی کے نقش قدم پر چلتی ہیں۔ لگتا ہے کہ سلطان علی کی ماں اپنی ہوس کی آگ بجھانے کے لئے سب کچھ کرنے کو تیار ہے۔ کہیں اسی مقصد کے تحت تو اس نے اپنے بیٹے کو ہمارے حوالے نہیں کیا؟“
 ایک سلطان نے اطمینان کی سانس لے کر فوراً ہی کہا:

”ایسی کمینی عورت کو گھوڑے کی دم میں باندھ کر اس وقت تک گھسیٹا جانا چاہئے جب تک مر نہ جائے!“

کسی دوسرے نے ایک اور ہی سزا تجویز کی:
 ”اسے تو پورے میں بند کر کے بلند ترین مینار کے اوپر سے ڈھکیل دیا جانا چاہئے!“
 شیبانی خان ان مہیب سے مہیب تر تجاویز کو خاموشی سے سنتا رہا۔ آخر کار اس نے عبدالرحیم کی طرف دیکھا جس کے اشارے پر سارے کے سارے سلطان خاموش ہو گئے۔

اور تب خان نے سنجیدہ، پر رعب اور پر اعتماد انداز سے بولنا شروع کیا۔ اس کے سامعین بالکل بے حس و حرکت اور مصور سے ہو کر رہ گئے خاص طور سے اس وقت جب وہ تیمور خاندان کے حکمرانوں کی جنموں نے عظیم الشان سلطنت کو تباہ و برباد کر دیا تھا، اخلاقی پستی، بدکرداری اور بے دینی کو نئی نئی مثالوں کے ذریعے ثابت کرنے لگا۔ اچانک شیبانی خان نے خواجہ یحییٰ کی طرف رخ کیا:

”اور پیر صاحب، ان عیاشوں کے مرشد، آپ تو خواجہ احرار کے فرزند ارجمند ہیں جو خود کو ”ولی“ کہا کرتے تھے۔ ان کی روحانی طاقت سے تاجداروں کو سہارا ملا کرتا تھا۔ لیکن آپ کے والد

محترم نے وہ جو بے حساب دولت جمع کی تھی وہ کیا ایمانداری سے کمائی ہوئی دولت تھی؟ ہمیں معلوم ہے کہ آپ کو درٹے میں ڈھیروں سونا ملا تھا۔ اسی سونے کے ٹل بوتے پر آپ پورے گیارہ برسوں سے سرقہ کو اپنی مٹھی میں کئے ہوئے ہیں۔ مچھلی کے سڑنے کی ابتدا اس کے سر سے ہوتی ہے۔ جیسا پیر دیے مرید۔ یہ نوجوان زنا کار مرزا سلطان علی۔ یہ آپ ہی کا مرید ہے، آپ نے خدا کے سامنے اس کی ذمہ داری اپنے اوپر لی ہے، اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھاما ہے!“

پھر شیبانی نے اپنی انگلی سے پہلے سلطان علی اور بعد میں خواجہ یحییٰ کی طرف اشارہ کر کے اس کا رخ فرش کی طرف کر دیا:

”اور وہاں نیچے ایک اور بدکارہ بیٹھی ہوئی ہے..... وہ شرم و حیا کو بالائے طاق رکھ کر یہاں شوہر کی تلاش میں آئی ہے..... تو ایسے پیر ہیں آپ! آپ نے اپنے مرید سلطان علی کے ساتھ غدار کی، آپ تو چاہتے تھے کہ سرقہ بابر کے حوالے کر دیں۔ اور یہ مرید اپنے پیر سے غدار کی کر کے میرے پاس آگیا۔ واہ رے شہر! ہر طرف غدار ہی غدار، عیار ہی عیار! ایک ادھر کھینچتا ہے تو دوسرا ادھر۔ ایک دوسرے کو کچا کھا جانے کو تیار ہے! ہمارے پیغمبر حضرت محمد دینی رہنما بھی تھے، بادشاہ بھی تھے اور سپہ سالار بھی۔ جو رسول خدا کے دکھائے ہوئے راستے پر نہیں چلتا وہ اسی پیر اور اسی مرزا کی طرح کفر کے قعر میں جا کرے گا!“

شیبانی خان نے یہ بات اپنے کچھ ضدی مقررین کو مد نظر رکھتے ہوئے کہی تھی جو چوری چھپے بڑبڑاتے رہتے تھے: ”ہمارے خان صرف تخت و تاج ہی سے مطمئن نہیں ہوئے، انہوں نے تو اپنے امام اور خلیفہ ہونے کا بھی اعلان کر دیا۔“ شیبانی ماورالنہر کے حالات کا عرصہ سے مسلسل مشاہدہ کرتا رہا تھا اور بخوبی جانتا تھا کہ خواجہ اترار جیسے لوگوں کی طاقت بڑھنے سے حکومت کمزور ہو جاتی ہے۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اپنی سلطنت میں اس قسم کی صورت حال ہرگز ہرگز نہ پیدا ہونے دے گا۔ بخارا کے مدرسے میں حصول تعلیم کے دوران وہ شریعت و طریقت سے بخوبی واقفیت حاصل کر چکا تھا اور اب اس کے مقررین میں ایک بھی شخص ایسا نہ تھا جو احادیث سے خان کی یہ نسبت بہتر واقفیت رکھتا ہو۔ اور جو خان سے زیادہ متاثر کن انداز سے قرآن کی تلاوت کر سکتا ہو۔ وہ سوچتا تھا: مذہب کے بغیر جو قبائلی سرداروں اور عام قبائلیوں کو متحد اور اس کے ارد گرد اکٹھا کرنے والی قوت ہے، خان اور سپہ سالار کی حیثیت سے اس کی وقعت ہی کیا؟ لیکن اس کے حکم بردار اور طاقتور لشکر کے بغیر امام اور خلیفہ کی حیثیت سے اسے کیا اہمیت حاصل ہو سکتی ہے؟ اسی لئے سپہ سالار اور خلیفہ ایک ہی شخص کو ہونا چاہئے!

”سرقند میں ہمارے دشمن ہفت سرائے کی طرح طاقتور ہیں۔ کیسے کیسے سوراؤں کو شکست دے چکا ہے یہ اژدھا لیکن ہمارے منصوبے اور ارادے پاک اور نیک ہیں۔ اس اژدھے کو خود اللہ تعالیٰ نے اس ارشاد کے ساتھ ہمارے ہاتھوں میں دے دیا ہے: ”جو مرضی ہو، کرو!“ اللہ تعالیٰ کے حکم سے عظیم سرقند کے دروازے جنگ کے بغیر ہی ہمارے لئے کھل گئے ہیں!“

خان کے مقربین پر اب کہیں جا کر روشن ہوا کہ انہوں نے کتنی بڑی فتح حاصل کی ہے: واقعی سرقند، عظیم سرقند جنگ کے بغیر ہی ہتھیار ڈال رہا ہے، خود شر کا حکمران اور دینی رہنما دونوں کے دونوں سر جھکائے ہوئے شیبانی خان کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں۔ مقربین کے دلوں میں خیال آیا: اللہ بے شک قادر مطلق ہے اور شیبانی خان سچا مجاہد اور اللہ کا محبوب بندہ۔ جیسی تو وہ اتنے دشوار کام کو ایسی دانش مندی اور کامیابی کے ساتھ انجام دے سکا۔

عبدالرحیم نے نعرہ بلند کیا:

”ہمارے مقدس امام کو عمر ہزار سالہ نصیب ہو!“

دوسرے لوگ بھی فوراً ہی اٹھ کھڑے ہوئے:

”سکندر ثانی زندہ باد!“

”خليفة کا ہزار بار شکریہ!“

”مجاہد خلیفہ تا ابد زندہ و سلامت رہیں!“

سلطان علی اور خواجہ یحییٰ بھی کھڑے ہو گئے۔ دونوں کے چہرے مارے خوف کے نفی ہو گئے تھے اور کھڑے رہنا سخت دشوار ثابت ہو رہا تھا۔ خوف کی وجہ بھی تھی۔ شیبانی خان کے بس زبان ہلانے کی دیر تھی اور اس کے رفقا ان سرقندیوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتے۔

خان کے اشارے پر تحسین و ستائش کا یہ طوفان ختم گیا اور سب لوگ دوبارہ اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے۔ تب شیبانی نے سلطان علی اور خواجہ یحییٰ کی طرف انگلی اٹھائی:

”انہیں اگر تڑپا تڑپا کر ہلاک کر دیا جائے تو یہ کوئی گناہ کی بات نہ ہوگی۔ لیکن ہم ایک بار پھر دنیا کو دکھا دیں گے کہ دین و انصاف کی راہ پر چلنے والوں کی طاقت کیسی ہونی چاہئے۔ یہ طاقت ہے ہمدردی کی مہمانوں کا خون نہ بہایا جائے گا، ان کی جان بخشی جاتی ہے!“

یہ سنتے ہی سلطان علی اور خواجہ یحییٰ جو زندہ رہنے کی آس پوری طرح کھوپکے تھے، غلامانہ انداز میں جھک کر کورنش بجالائے۔ اب نہ سلطان علی کا تکبر باقی رہ گیا تھا نہ ہی خواجہ یحییٰ کا وقار! پیر کی تو آنکھیں بھی غمناک ہو گئیں:

”خدا آپ کی عمر دراز کرے، عالی جاہ!“

”ارے ذرا ٹھہر تو!“ شیبانی خان نے بلند آواز سے کہا۔ ”خواجہ بیگی، خود غرض، ایمان کو فراموش کر بیٹھے والے! تجھے تزکیہ نفس کے لئے حج کرنے جانا ہو گا۔۔۔ ضروری سامان لے کر اپنے دونوں بیٹوں کے ساتھ روانہ ہو جا۔ کوپک بے، تمہیں اس بات کا خیال رکھنا ہو گا کہ یہ شخص کل صبح سے قبل ہی روانہ ہو جائے!“

”جو حکم، عظیم خان!“

”ہاں، اور یہ نوجوان مرزا“ شیبانی خان نے سلطان علی پر نگاہیں مرکوز کرتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی، ”ہمارے فرزند کی طرح رہنا چاہتا ہے۔ ٹھیک ہے، گمراہ ہو جانے والے کو صراطِ مستقیم پر واپس لانا کارِ ثواب ہے۔ تیمور خان، تم اسے اپنے مقربین میں شامل کر لو۔“

خان کے گٹھے ہوئے جسم والے بیٹے نے سلطان علی پر حقارت بھری نظر ڈالی لیکن باپ کا حکم بہر حال پتھری لکیر تھا اور اس نے تعظیماً ”سر جھکا لیا۔“

”یہ نیک ثابت ہوا تو انعام پائے گا“ شیبانی نے مزید کہا، ”اور بد ثابت ہوا تو اپنا سر گنوا بیٹھے گا۔“

سمجھنے والے سمجھ گئے کہ اب سلطان علی کی آخری گھڑی دور نہیں۔

اور اب زہرہ بیگم کی قسمت کا فیصلہ ہونا تھا جو چلی منزل پر مقید تھی۔

شیبانی خان زہرہ بیگم کے حسن و جمال کی تعریفیں عرصے سے سنتا آرہا تھا اور ایک بار تو یہ فیصلہ بھی کر لیا تھا کہ اس سے نکاح کر کے کچھ دنوں کے بعد طلاق دے دے گا۔ لیکن اس نے زہرہ بیگم کو چند اشعار سمیت جو خط بھیجا تھا اس میں اس بات کا ذرا بھی اشارہ نہیں دیا تھا کہ صرف کچھ دنوں کے لئے ہی اسے اپنی بیگم بنانا چاہتا ہے۔ شیبانی خان چاہتا تھا کہ اپنی خوبصورتی پر نازاں ہے سرفردی بیوہ اس خیال میں کھوئی رہے کہ وہ درحقیقت خان کے دل کی ملکہ اور شریکِ زندگی بنے گی۔ آج زہرہ بیگم کو دیکھ کر شیبانی کو مایوسی ہوئی تھی لیکن دراصل یہ مایوسی ہی اسکے دل کی واحد کیفیت نہ تھی۔ خان کے دل کو مذمت سے ملتی جلتی ایک کیفیت بھی پریشان کئے ہوئے تھی کیوں کہ اس نے اپنے اشعار اور خط کے ذریعے زہرہ بیگم کو بہکایا تھا، دوسرے لفظوں میں اسے فریب دیا تھا، وناکی تھی۔ اس کے لئے یہ بڑی اہم بات تھی کہ اس وقت دیوان خاص میں سلطانوں نے زہرہ بیگم کا تذکرہ نفرت و حقارت کے ساتھ کیا تھا گویا کہ وہ اپنے خان کو زہرہ بیگم کی بدکرداری اور آلودہ دامن کی یقین دلانا چاہتے ہوں۔ اس کا دل پر سکون ہو گیا۔ ”زہرہ بیگم خود ہی گری ہوئی عورت نکلی، وہ تو ہے

ہی دعا کی مستحق ”خان نے سوچا“ بے شک میں سلطانوں کو یہ موقع نہ دوں گا کہ اسے سزائے موت دے دیں، ہرگز نہیں۔ لیکن سلطانوں کے ساتھ میرا اتحاد مجھے ہر شے سے، حتیٰ کہ ایسی عورت سے بھی زیادہ عزیز ہے جو صحیح معنوں میں پیکر حسن ہو۔ زہرہ بیگم دوبارہ شادی کرنا چاہتی تھی۔ میں اس معاملے میں اپنے قول پر پورا اتروں گا، اس کے لئے خاوند تلاش کروں گا۔“

شیبانی خان کی نظر ایک فریہ اندام چمپک رو شخص پر جا ٹھہری جو معزز شاہی مقربین کی جگہوں سے کافی ہٹ کر بیٹھا ہوا تھا۔ ہاں، منصور بخش ہی زہرہ بیگم کے لئے موزوں خاوند تھا۔ وہ کوئی دولت مند سلطان نہ تھا لیکن فوجی مسموں میں حصہ لینے کے ساتھ ہی ساتھ جادو ٹونے سے علاج بھی کیا کرتا تھا۔ وہ زور زور سے دف بجا بجا کر مریضوں پر سے بھوتوں کا سایہ اتارنا بھی جانتا تھا اور گالیاں دے دے کر انہیں خائف کرنا بھی۔ اسی لئے اس کا نام ”ہوا“ پڑ گیا تھا۔ اس کے علاوہ وہ اپنی غیر معمولی حد تک جارحانہ مردانگی کے لئے بھی بدنام تھا جسے اس کی کوئی بھی بیوی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس کی بیویاں سال دو سال بعد یا تو اس کے گھر سے بھاگ کھڑی ہوتی تھیں یا پھر دنیا ہی سے سدھار گئی تھیں۔

”ارے منصور بخش، بیوی کے معاملے میں ایک بار پھر آپ کی قسمت پھوٹی نکلی، سچ ہے نا؟“ شیبانی نے ہوا سلطان سے پوچھا۔ ”نیچے وہ جو عورت بیٹھی ہوئی ہے نا وہ جیسا کہ آپ دیکھ ہی چکے ہیں، عروسی لباس میں آئی ہے۔ ہم آپ کا عقد اسی سے کیوں نہ کرا دیں؟“ ہوا کی باچھیں کھل اٹھیں۔ وہ اچھل کے اپنی جگہ پر کھڑا ہوا اور سر کو بہت زیادہ خم کر کے کورنش بجالایا۔

”محترم حکمران، میرے بھائی خواہ، میری جان آپ پر قربان۔ مجھے منظور ہے، منظور ہے!“ دیوان خانے کی فضا سب کے تہمتوں سے گونج اٹھی۔ سارے کے سارے سلطان خوش ہو گئے کہ شیبانی خان نے یہ ہتھی بھی بڑی دانش مندی سے سلجھا دی۔

”ہمارے امام نے بڑے دانش مندی سے کام لیا، آفرین، اس عقل و فراست کا کہنا ہے کیا.....“

اودہ، کتنا جکڑے گا منصور ہوا زہرہ بیگم کو اپنی بانہوں میں!.....

”دونوں کی جوڑی اچھی رہے گی، بہت اچھی.....“

شیبانی کے ہونٹوں نے جنبش کی اور دوسرے ہی لمحے ہنسی مذاق کا سلسلہ ختم ہو گیا:

”عقد سمرقند میں ہو گا۔ ہم شہر میں باقاعدگی سے داخل ہوں گے.....“

خان جو کئی بار سمرقند جا چکا تھا، شہر سے بخوبی واقف تھا۔ اس نے بہت پہلے ہی سوچ لیا تھا کہ اس

کے دستے شہر میں کیسے داخل اور کہاں کہاں تعینات ہوں گے۔ دستہ سالاروں کو واضح احکام دیئے گئے، لشکر کو تیار کیا گیا اور شیبانی خان کے پانچ ہزار سپاہیوں نے چار راہ دروازے سے بڑی تیزی کے ساتھ شہر میں داخل ہونا شروع کیا۔ عین اسی وقت اس دروازے سے بالکل مخالف سمت میں واقع سوزن گران دروازے سے سینکڑوں لوگ شہر کو چھوڑ کر بھاگے جا رہے تھے۔ باہر شہر سبز میں تھا اور اس کے حمایتی تیزی سے شہر سبز کی طرف بڑھ رہے تھے۔

بھاگ کھڑے ہونے میں کامیابی کبھی کو نہ نصیب ہوئی، بہتوں کو صبار نثار گھوڑوں پر سوار شیبانی کے لشکریوں نے جالیا، جی بھر کے لوٹا اور جس نے ذرا بھی مزاحمت کی اسے وہیں موت کے گھاٹ اتار دیا۔

رات ہوتے ہی غارت گری میں خاص طور سے شدت پیدا ہو گئی جس سے شاید صرف خواجہ یحییٰ کی شاندار حویلی ہی محفوظ رہی۔ اس پر تمام شب کو پک بے کے سپاہی پہرا دیتے رہے۔ حفاظتی دستہ جس کی قیادت یہ تیمجاتی سلطان خود ہی کر رہا تھا، دیکھتا رہا کہ خواجہ یحییٰ نے دونوں بیٹوں اور معتبر آدمیوں کی مدد سے سونے سے بھرے ہوئے صندوقوں کو الگ الگ جگہوں سے نکال نکال کر دوسرے سامان کے ساتھ ایک جگہ ڈھیر کر رہا ہے۔ صبح کو خواجہ کے نوکروں نے پانچ ڈھکے ہوئے اراہوں اور کوئی دس اونٹوں پر یہ سارا سامان لا دیا۔ خواجہ یحییٰ کی بیٹیوں بیویاں کچھا کچھ بھری انہی گھوڑا گاڑیوں پر سوار ہو گئیں، نوکروں نے اونٹوں کی نکلیں سنبھال لیں، محافظین، خواجہ یحییٰ اور اس کے دونوں بیٹوں نے گھڑ سواروں کے ایک گروہ کی سی شکل اختیار کر لی اور اس طرح یہ پیر جس کا کل تک طوطی بولتا تھا، سر قند کو اداسی کے ساتھ الوداع کہہ کے جنوب کی سمت روانہ ہو گیا۔ لیکن یہ کارواں تنگ کوہستانی درے سے آگے نہ بڑھ سکا۔ کوپک بے نے شام کے جھپٹے میں، دریا کے کنارے رات کا پڑاؤ ڈالنے سے قبل ہی پیر، اس کے بیٹوں اور نجی محافظوں کا، ان سبھی ”عازمین حج“ کا کام تمام کر دیا۔ صرف عورتوں، نوکروں اور سامان کو اس نے اپنے سرداروں اور سپاہیوں میں تقسیم کیا۔ خاص دولت جو اس کے ہاتھ لگی تھی اس کا نصف حصہ اس نے اسی رات شیبانی کے خزانے میں پہنچا دیا جس نے خواجہ یحییٰ کو لوگوں کی نظروں سے دور لے جا کر قتل کر دینے کا حکم دیا تھا۔ سلطان علی کو اس قتل و غارت گری کا علم ہوا تو وہ سمجھ گیا کہ اس کا شہر بھی یہی ہو گا اور اس نے ہر قیمت پر بھاگ نکلنے کا فیصلہ کر لیا۔ اور ایک روز اسے خزاں کے دبیز گہرے سے فائدہ اٹھا کر اپنے دو محافظین کے ساتھ سر قند قلعے کے مشرقی دروازے سے چپ چاپ فرار ہو جانے میں کامیابی بھی حاصل ہو گئی۔ وہ تیز گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا ہوا بیچ گینت کی سمت بھاگ کھڑا ہوا۔

لیکن وہ بھی زیادہ دور تک نہ جاسکا۔ سرقد سے کوئی دس فرسنگ کے فاصلے پر دریائے سہ آب کے کنارے تیمور خان نے مفروز کو جا بوجھا اور بعد میں ”نکلتے“ کا سر مجاہد خلیفہ شیبانی کی خدمت میں پیش کر دیا گیا۔

زہرہ بیگم کے پاس جو اس وقت تک منصور بخشی سے اپنی شادی کی اولین ٹھوکروں کا ذائقہ چکھ چکی تھی، بیٹے کی بے سرمیت لائی گئی تو اس نے بڑی دل زور چیخ ماری، اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے، سر کو بار بار بیٹتی رہی اور چہرے کو نوچ نوچ کر لہلہا کر لیا۔
فاتحین دیکھ دیکھ کر ہستے رہے کیوں کہ جیتنے والوں کے لئے ہارے ہوئے دشمن کے درد و غم کا نظارہ ہر شے سے زیادہ باعث مسرت ہوتا ہے۔

۵

خزاں کی ہواؤں کے زور سے دریا کا پانی اپنے اوپر گرمی ہوئی پتیوں کی چادر کو اپنے ساتھ ہی لئے جا رہا تھا۔

تقریباً ڈھائی سو مسلح گھڑسواروں نے سرقد کے جنوب مشرق میں کوئی بیس فرسنگ کے فاصلے پر پتیوں سے ڈھکے، زرد زرد سے نظر آتے ہوئے دریائے زرا افشان کو پار کر لیا۔ وہ تیزی اور چوکی کے ساتھ، اس بات کی ہر ممکن کوشش کرتے ہوئے کہ شور غل نہ پیدا ہو، سہ آب کی طرف بڑھ رہے تھے۔ راستے میں کوئی گاؤں پڑتا تھا تو وہ یا تو کترا کر یا پھر خاموشی کے ساتھ گاؤں سے ہو کر ہی نکل جاتے تھے۔ جو دیہی باشندے راستے میں ملتے تھے وہ خود ہی ان کی نظروں سے دور چھپ جاتے تھے کیوں کہ وہ ان گھڑسواروں کو شیبانی خان کے سپاہی سمجھ بیٹھتے تھے جنہوں نے سارے علاقے میں دہشت پھیلا رکھی تھی۔

لیکن صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ خود ان گھڑسواروں پر بھی شیبانی کے لشکر کی دہشت طاری ہے۔ جب یہ لوگ تاریکی میں سہ آب کو پار کر رہے تھے تو ان کے کچھ گھوڑے دلدلی زمین میں پھنس گئے۔ سپاہیوں نے دبی دبی ٹٹکاریوں سے ان گھوڑوں کو آگے بڑھانے کی انہیں قدرے ٹھوس زمین پر کھینچ لانے کی کوشش کی اور خود ہی دلدل میں پھنس گئے۔ سرکنڈوں کی رگڑ سے ان کے ہاتھوں اور چروں پر خراشیں پڑ گئیں۔ ایک سپاہی کے لئے یہ دشوار صورت حال ناقابل برداشت ہو گئی اور اس کے منہ سے بلند آواز سے گالی نکل گئی۔ دوسرے ہی لمحے کسی رعب دار آواز نے سرزنش کی:

”ارے چیخ کیوں رہا ہے؟ سب کے سروں پر مصیبت نازل کرنا چاہتا ہے کیا؟“

یہ آواز بابر کی تھی۔ سپاہی گونگڑانے لگا:

”معاف فرمائیے، حکمران۔ کبخت گھوڑا کسی طرح ٹس سے مس ہی نہیں ہوتا!“

دریا میں گرم چشموں کا پانی آکے مل جاتا تھا جس کی وجہ سے سردرات میں بھی اس سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ اس بھاپ اور تاریکی کی بنا پر دلدلی اور ٹھوس زمین میں امتیاز کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ بابر تاخیر نہیں کر سکتا تھا، اس لئے پر عزم لہجے میں کہا:

”بہت ہو چکا، ان گھوڑوں کو یہیں چھوڑ دینا پڑے گا!“

قاسم بیگ نے تائید کی:

”جن کے پاس گھوڑے نہ رہ جائیں گے انہیں میں اپنے فالتو گھوڑے دے دوں گا۔“

”دروں کو پار کرتے وقت کتنے ہی گھوڑے اور اونٹ کام آگئے تھے لیکن میرے گھوڑے نے ان سب کو پار کر لیا۔ اب، بچارے کو یہاں جان دینی پڑے گی؟“ طاہر نے افسوس ظاہر کیا (وہ بھی اسی دستے میں شامل تھا)۔

”اس وقت تو ہمارے سر پر موت کھیل رہی ہے!“ بابر نے جواب دیا۔

طاہر ان گھوڑوں میں سے ایک پر سوار ہو گیا جن کی لگامیں قاسم بیگ کا اسلحہ بردار تھا۔ وہ چل رہا تھا۔ دوسرے دو سپاہی خوش قسمت ثابت ہوئے، انہیں بابر کے قدم بازوں پر سواری کرنے کا موقع مل گیا جو اس کے گھوڑا بدلنے کے لئے دستے کے ساتھ تھے۔

اس جگہ کے بعد پھر کہیں بھی گھوڑوں پر ترس کھانے کی نوبت نہ آئی۔ سر قند کا فاصلہ بہت کم رہ گیا تھا۔ شہر کے پاس تک بہت تیزی سے پہنچنا ضروری تھا لیکن چپ چاپ کیونکہ شیبانی خان کے آدمی ان لوگوں کو پہچان لیتے تو تہلکہ مچ جاتا، دشمن کا سارا لشکر صف آراء ہو جاتا اور اس لشکر سے بابر کے ٹکڑے لے سکتے کا ابھی کوئی سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔

بابر نے سارا موسم گرما کو ہستانی علاقوں میں سفر کرتے گزار دیا تھا۔ وہ شہر سبز سے حصار گیا تھا، وہاں سے ذرا افشان کے منبع تک اور پھر دریائے فغان کے کنارے کنارے چلتا رہا تھا سر قند کے بیگ اپنے سپاہیوں کے ساتھ حصار کے فرماں روا خسرو شاہ سے جا ملے تھے۔ اند جان سے جو لوگ بابر کے ساتھ آئے تھے ان میں سے زیادہ تر قیام کی جگہوں میں جلدی جلدی کی جانے والی ان تبدیلیوں سے جو بظاہر کسی قسم کی کامیابی کی امید بھی نہیں دلا رہی تھیں، تنگ آکر وادی فرغانہ کو واپس لوٹ گئے تھے۔ یہ بات بھی قابل توجہ تھی کہ شیبانی خان کے تجربوں نے اسے مطلع کر دیا تھا کہ بابر کے فوجیوں کی تعداد روز بہ روز گھٹتی جا رہی ہے۔ شیبانی کو یقین ہو گیا کہ بابر (اب اس کے پاس سپاہی ہی کتنے رہ

گئے تھے، کوئی ایک ہزار تا؟) کوستانی علاقوں کے دشوار حالات کو نہ جھیل سکے گا اور یا تو اند جان لوٹ آئے گا یا پھر اپنے چچا الچہ خان کے ہاں پناہ لینے کی کوشش کرے گا جو اسیت کول جھیل کے اس پار کسی علاقے کا حکمران تھا۔ خان نے سوچا کہ باہر بہر حال اس پر حملہ کرنے سے رہا کیوں کہ اس کے پاس بابر کی فوج سے پانچ گنا بڑا لشکر موجود ہے جو جلد ہی بڑھ کر اور بھی بڑا ہو سکتا ہے۔ اس نے لئے ہوئے سمرقند میں اپنے پانچ سو لشکری چھوڑ دیئے اور خود باقی تمام فوج کے ساتھ سمرقند کے مغرب میں کچھ فاصلے پر واقع مقام خواجہ دیدار جا کرو ہیں پڑاؤ ڈال دیا۔

بابر نے بڑے پر خطر کام کا بیڑا اٹھایا تھا، طے کیا تھا کہ وہ ایسی صورت میں جب کہ شیبانی کو حملے کا ذرا بھی اندیشہ نہیں، سمرقند پر اچانک ٹوٹ پڑے گا اور شیبانی کے سر پر موجود ہونے کے باوجود شہر پر قابض ہو جائے گا۔ شیبانی کو کسی بھی لمحے اس بات کی اطلاع مل سکتی تھی۔ صورتحال انتہائی مایوس کن ہو سکتی تھی اگر شیبانی خان اپنے مخبروں کی فراہم کردہ اطلاع کے بعد یہ چال چلتے ہوئے گویا کہ اسے کچھ معلوم ہی نہیں، بابر کو اس کے مٹھی بھر لشکریوں کے ساتھ شہر تک آجانے دیتا اور تب اپنی پوری طاقت سے حملہ آور ہو جاتا۔ پھر خود شہر کے اندر بھی بابر کے دشمنوں کی طاقت بابر کی اپنی طاقت سے زیادہ ہی تھی۔ اور اگر بابر شیبانی خان کے ہاتھ لگ جاتا تو قطعاً ”زندہ نہیں بچ سکتا تھا۔“ زندہ تو بس وہی سپاہی اور بیگ بچ سکتے تھے جو خان کی چاکری بجالانے کو تیار ہو جاتے کیوں کہ یہ بھی کو معلوم تھا کہ سلطان علی کے زیادہ تر بیگوں کو اس نے اپنے لشکر میں شامل کر لیا ہے۔ اور ماورا النہر میں ایک نئے شاہی خاندان کی داغ بیل ڈالنے کے متنی اس مجاہد خلیفہ نے آل تیمور کو نیست و نابود کر دینے کی قسم بھی کھا رکھی تھی۔ بابر پر یہ سب واضح تھا اسی لئے اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ زندگی کے آخری لمحات تک جنگ کرتا رہے گا، کچھ بھی ہو جائے خود کو زندہ خان کے ہاتھ نہ لگنے دے گا۔

اس کے دستے نے تاریکی میں کئی ندیوں، چشموں اور پانی سے بھری ہوئی خندقوں کو پار کیا، موسم خزاں کے سنسان باغات سے گزرا اور بالاخر پل مغاک تک پہنچ گیا جو سمرقند کی فہیل سے بالکل قریب ہی واقع تھا۔ بابر نے دو روز قبل اپنے کچھ معتبر سپاہیوں کو یہاں بھیج دیا تھا جنہوں نے فہیل پر چڑھنے کے لئے لمبی لمبی میڑھیاں تیار کر لی تھیں۔ اس وقت کوئی اسی سپاہیوں نے اپنے گھوڑوں سے اتر کر ان میڑھیوں کو اٹھالیا اور دبے پاؤں پیدل چلتے ہوئے کراڑے کی طرف چلے گئے۔ باقی سپاہی اور خود بابر چھپتے چھپاتے فیروزہ دروازے تک پہنچے اور اس کے سامنے والے نیلے پر کھڑے ہوئے درختوں کے سایے میں چھپ گئے۔

چاروں طرف گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اچانک دور سے آتی ہوئی مرغوں کی اولین بانگیں سنائی دیں۔ رات کے گھنے، کالے کالے بادل فصیل شہر کے عین اوپر معلق تھے جس کی وجہ سے فصیل صاف نظر نہیں آ رہی تھی اور کہیں اوپر کی طرف جاتی ہوئی لگتی تھی۔

قاسم بیک جو ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی باہر کے ساتھ تھا، تیزی کے ساتھ سانس لے رہا تھا۔ خود باہر کو بھی اپنے جسم میں جھرجھری محسوس ہو رہی تھی۔

سرمقہ کی فصیل! چار ماہ قبل ایسی ہی ایک تیرہ دتار رات تھی جب باہر فصیل کے قریب پہنچ کر خواجہ یحییٰ کے پھانک کھول دینے کا انتظار کرتا رہا تھا۔ ان لوگوں کو دیکھ لیا گیا تھا، ان پر تیرہ برسائے گئے تھے اور انہیں اپنے زخموں کی آہ بکا اور دشمنوں کی طنزیہ چیخوں کے درمیان مجبوراً لوٹ جانا پڑا تھا۔ قریب، دغا، گھات، چھپ کر حملہ..... موت، اپنوں اور غیروں کی موت..... اس کی زندگی، ایسے سپہ سالار اور سیاست دان کی زندگی جس نے ماورائے نہر کو دوبارہ متحد کرنے کا عزم کر رکھا تھا، اسی سب پر تو مشتمل تھی۔

باہر نہیں چاہتا تھا کہ ایک بار پھر دشمنوں کے جال میں پھنس جائے اور شہر کے اندر موجود اس کے حامیوں کو مایوسی کا شکار ہونا پڑے اس لئے اس نے فصیل کے پاس اپنی آمد کی کسی کو بھی خبر نہیں ہونے دی تھی۔ اس نے خود اپنے اور اپنے دلیر سپاہیوں کے اوپر ہی بھروسہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اب یہ سپاہی جن کی تعداد باہر کو بالکل ٹھیک ٹھیک معلوم تھی، دو سو چالیس تھے جبکہ فصیل کی دوسری جانب پانچ سو سپاہی موجود تھے اور ان سے کچھ ہی فاصلے پر۔ پانچ ہزار!

یہاں کس نے کس کے لئے جال بچھایا تھا؟ باہر نے شیبانی کے لئے یا شیبانی نے خود باہر کے لئے؟ باہر کے بیگوں نے جانے کتنی ہی بار اسے سمجھایا تھا کہ ایسے غیر معمولی بہادرانہ اقدام سے باز رہے، یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ واپس لوٹ جانا ہی عین دانش مندی ہو گا۔

لیکن اپنے منصوبے کو ترک کر دینے کا مطلب ہوتا سر نیچا کر کے اندجان لوٹنا، احمد تہیل کی مرضی کے بموجب زندگی گزارنا۔ یہ بھی کوئی بہتر صورت حال نہ تھی کہ وہ خزاں کے بوند باندی کے موسم میں، کڑا کے کی سردیوں میں خود اپنی سلطنت کے اندر ہی در بدر مارا مارا پھرتا رہتا۔ وہ کوئی خانہ بدوش تھوڑی تھا! اسی لئے وہ ایسی جنگ کو ترجیح دے رہا تھا جس میں یا تو خود ہی لقمہ اجل بن جائے یا پھر شیر کی طرح لڑکے شیبانی خان کو شکست دے دے۔

شیر کی طرح بھی اور چالاک لومڑی کی طرح بھی جو جالوں سے کترا کر نکلنا اور دشمن پر اچانک ٹوٹ پڑنا جانتی ہے۔ اس کی ساری امیدیں اب اسی طریقہ عمل سے وابستہ تھیں۔

بابرہہ تن گوش بن کر سننے لگا۔

رات۔ سنا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ یہ اس کے اسپر مقدر کے سموں کی آوازیں تھیں.....

۶

طاہر کو میٹر می کا وزن اس وقت تک نہ محسوس ہوا جب تک کہ سپاہی قدیم قبرستان چکر دیزہ کے کنارے کنارے چلتے ہوئے قدرے ہموار جگہ سے گزرتے رہے لیکن اس کے بعد وزن تیزی سے بڑھنے لگا جس کے باعث وہ لوگ شور نہ کرنے کی کوششوں کے ساتھ گہری خندق کے اندر اترتے وقت بار بار ٹھوکریں کھانے اور دبی زبان سے گالیاں بکنے پر مجبور ہو گئے۔ وہ تو ہم پر ستانہ خوف کے باعث غار کے دھانے کے پاس سے بچ کر نکلے وہاں تو کوئی دن میں بھی نہیں جھانکتا تھا لیکن انہیں جھانکنا پڑا، رات کے وقت غار کے پاس سے گزرتا پڑا..... اور اس کے بعد کانٹوں کو پکڑ پکڑ کر دوبارہ اوپر چڑھنا پڑا۔ فصیل شہر کا ایک حصہ خندق کے اندر سے بھی دکھائی دے رہا تھا اور وہاں سے وہ اپنی حقیقی بلندی سے کہیں زیادہ بلند معلوم ہو رہا تھا۔

پسینے سے شرابور سپاہیوں نے آخر کار میٹر میوں کو فصیل کے عین نیچے تک پہنچا دیا۔ ان کا سردار نویان کو کلتاش کچھ غور و خوض کرنے اور اپنے ساتھیوں کو زور دم لینے کا موقع دینے کے لئے بے حس و حرکت سا کھڑا ہو گیا..... اینٹوں کی فصیل پا پل کے اچھے خاصے درخت جتنی بلند تھی اور اس کا اوپری حصہ جیسا کہ نویان بخوبی جانتا تھا، اتنا چوڑا تھا کہ اس پر دو افراد پہلو بہ پہلو چل سکتے تھے۔ وہ سوچنے لگا: وہاں بلندی پر اس وقت کیا ہو رہا ہے؟ کون ہے وہاں؟ بظاہر تو سناٹا چھایا ہوا ہے۔ نہ کہیں مشعلیں نظر آرہی ہیں نہ قدیلیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ رات بھر سردی سے ٹھہرتے ہوئے پیریدار نیچے اتر کر اپنے حجرے میں جا چکے ہیں۔

اس صورت میں تو کارروائی شروع کر دینی چاہیے! دلوں نے میڑھیاں کھڑی کر کے ان کے اوپری سرے دھیرے سے فصیل کے کناروں پر ٹکا دیئے۔

”چلو، اوپر چڑھو“ نویان کو کلتاش نے چپکے سے سپاہیوں کو حکم دیا۔ پاس کھڑے ہوئے سپاہی سناٹے میں آگئے۔ کوئی مذاق تھوڑی تھا، فصیل تیس ہاتھ سے بھی زیادہ بلند تھی، پیر زرا بھی لغزش کرتے تو ہڈیاں تک ڈھونڈے نہ ملتیں۔ اور اگر پیریداروں کو ہتا چل جاتا تو؟ میٹر می کو نیچے ڈھکیل دینا ایسا کون سا مشکل کام تھا۔

نویان کو کلتاش نے سب سے پہلے ہی میڑھی پر قدم رکھ دیا۔
 ”مرنا تو کبھی نہ کبھی پڑے گا ہی! تو پھر بہادری کی طرح ہی کیوں نہ مر!“
 طاہر دوسری میڑھی پر چڑھنے لگا، وہ بھی مضبوط تھی اور کئی افراد کا وزن برداشت کر سکتی تھی۔
 پہل کرنے والوں کے پیچھے پیچھے باقی سپاہی بھی فیل کے اوپر چڑھنے لگے۔ نویان کو کلتاش بڑی
 تیزی سے اوپر پہنچ گیا۔ اس نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ کس کوئی بھی نہ تھا۔ اور فیل
 واقعی اتنی چوڑی تھی کہ اس پر کوئی گھڑسوار تک گزر سکتا تھا۔
 طاہر ایک کنگورے کے سائے میں چھپ گیا۔ اس نے ایک اور سپاہی کو سہارا دے کر اوپر
 چڑھایا اور چپکے سے پوچھا:

”کلباڑی کہاں ہے؟ تمہارے پاس ہے نا؟“

سپاہی نے اپنے پکے میں ٹھنی ہوئی کلباڑی نکال کر طاہر کو تھمادی۔
 ”کنگوروں کے قریب آنکے چھپ جاؤ!“ نویان نے حکم دیا۔ اگر فیل میں کنگورے نہ ہوتی تو وہ
 لوگ نیچے سے اُحاطے سے بہ آسانی دیکھے جاسکتے تھے۔ بڑے بڑے کنگوروں کے سایوں کے باعث
 گہری ہوجانے والی تاریکی میں اس سارے چھوٹے سے دستے کا کیجا ہونا اور پھر سپاہیوں کا فیل پر
 تیزی سے دوڑتے ہوئے نیچے اتر کر شہر کے دروازے تک پہنچنا ممکن ہو گیا تھا۔ نیچے اترنے کے
 راستے پر، تھوڑے تھوڑے فاصلے پر پیریداروں کی چوکیاں البتہ بنی ہوئی تھیں اور جب وہ لوگ ان
 میں سے ایک کے پاس پہنچے تو اندر سے کسی نے قیقاتی لہجے میں کالمی کے ساتھ پوچھا:
 ”ارے ارس بائے، یہ تم ہو کیا؟ اتنی تاخیر کیوں کردی؟ تمہارا انتظار کرتے کرتے ادب
 گئے.....“

سب سپاہی بے حس و حرکت کھڑے ہو گئے۔ طاہر نے کلباڑی کو دونوں ہاتھوں سے مضبوطی کے
 ساتھ پکڑ کر جواب دیا:

”ہاں، میں ہوں..... ابھی آیا.....“

پیریدار کو شاید کچھ شک ہو گیا اور اس نے گھبرا کر دوبارہ پوچھا:

”کون ہو تم؟!“

نویان کو کلتاش پیریداروں کی چوکی کے دروازے کی طرف لپکا اور جیسے ہی دروازہ کھلا اور
 پیریدار سامنے نظر آیا دیسے ہی اس پر خنجر سے وار کر دیا۔ دم توڑتے ہوئے اس پیریدار کی چیخ سن کر
 نیچے کے پیریدار بیدار ہو سکتے تھے۔

”طاہر، پھانگ کی طرف لپکو! جلدی کرو!“ نویان کو کلتاش نے کہا۔ وہ خود تو کوئی دس سپاہیوں کے ساتھ پھریداروں کی اگلی چوکیوں کی طرف لپکا جبکہ طاہر دو اور چوکیوں (ان کے دروازے نیم دانتے) کے پاس سے گزر کر آنا ”فانا“ نیچے اترا اور شہر کے بلند فیروزہ دروازے کے قریب پہنچ گیا۔

اس دروازے کا پہرا فاضل ترخان کے ذمے تھا۔ اس کے ڈیڑھ سو سپاہیوں میں سے زیادہ تر سپاہی اپنے گھروں کو واپس جا چکے تھے۔ اوپر کی چوکیوں پر اور دروازے کے پاس کل ملا کر کوئی بیس سپاہی باقی رہ گئے تھے لیکن وہ بھی اونگھ رہے تھے۔ ان میں سے بس چند ہی کو ہوش میں آنے اور اسلحہ سنبھالنے کا موقع مل سکا کیونکہ نویان کو کلتاش اور اس کے سپاہی برق کی طرح ان پر ٹوٹ پڑے۔ اس اثنا میں طاہر جھپٹ کر دروازے کے پاس پہنچا اور اس کے قتل کو جو گھوڑے کے سر جتنا بڑا تھا، توڑنے لگا۔ کھڑکی کی اولین ضربیں خاک بھی کارگر نہ ہوئیں۔ اتنے میں فاضل ترخان جو قریب ہی رہتا تھا، اور اس کے سپاہی شطیں اٹھائے ہوئے نظر آئے۔ اس کے دو سپاہیوں نے قتل توڑنے میں مصروف آدمی کو دیکھ لیا۔ دوسرے ہی لمحے ایک تیرا کر طاہر کے سر سے ذرا ہی اوپر دروازے میں دھنس گیا اور دوسرا اس سے کچھ دائیں جانب۔ فیروزہ دروازے کے پاس تصادم شروع ہو گیا۔ خنجر، تلواریں اور نیزے ہی نہیں بلکہ کتے تک استعمال کئے جانے لگے۔ لیکن نویان کو کلتاش نے کہیں زیادہ پھرتی اور مہارت کا ثبوت دیتے ہوئے فاضل ترخان کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

اس دوران طاہر دیوانہ وار کھڑکی چلائے جا رہا تھا، کبھی قتل پر، کبھی زنجیروں پر اور کبھی خندق کے پل کو اٹھانے گرانے والی زنجیروں کے کڑوں پر۔ کڑے اور زنجیریں تیز جھنکار کے ساتھ زمین پر آن کرے اور پھر آخر کار قتل بھی۔

فصیل کے عقب میں کشادہ خندق واقع تھی جس میں پانی بھرا رہتا تھا۔ طاہر نے جتنی دیر میں دروازے کو کھولا اتنی ہی دیر میں دلیر سپاہیوں نے پل کی لپٹی ہوئی زنجیروں کو کھول دیا اور وہ خندق کے اوپر پھیل گیا۔

بابر اور قاسم بیگ سپاہیوں کے ساتھ خندق کے اس پار تیار کھڑے تھے۔ جیسے ہی دروازہ کھلا اور خندق کے اوپر پل پھیل گیا ویسے ہی یہ لوگ نیام سے تلواریں نکالے گھوڑے دوڑاتے ہوئے شہر میں داخل ہو گئے۔ انہیں دیکھتے ہی فاضل ترخان کے بچے کچے سپاہی بھاگ کھڑے ہوئے اور قاسم بیگ نے تھوڑے سے سپاہیوں کو ساتھ لے کر ان کا تعاقب شروع کر دیا۔

اس کے بعد کے واقعات بڑی تیزی کے ساتھ رونما ہوئے۔ نویان کو کلتاش نے شہر کے اندر

سے چار راہ دروازے کے پیچھے پہنچ کر اس پر حملہ کر دیا۔ سپاہیوں کا ایک دوسرا چھوٹا دستہ جس کی قیادت خود بابر کر رہا تھا، سوزن گران دروازے کے پسیداروں پر پگھلی کی طرح ٹوٹ پڑا۔ دراصل چاروں دروازوں پر قابض ہونا ضروری تھا کیونکہ شیبانی خان اپنی فوج کے ساتھ کسی بھی وقت حملہ آور ہو سکتا تھا۔

لڑائی کا غلطہ آن کی آن میں سارے شہر میں پھیل گیا۔ داروغہ شرجان وفا شیخ زادہ دروازے سے کچھ ہی فاصلے پر واقع اس حویلی کے جو کبھی خواجہ یحییٰ کی ملکیت تھی، ایک شاندار کمرے میں محو خواب تھا۔ شور و غل سے بیدار ہونے پر وہ فوراً ”ہی اپنے حواس درست نہ کر سکا، دوڑتا ہوا باہر نکلا تو اسے دروازے پر پسرا دینے والے بچے کچے سپاہی نظر آئے جو شہر پر قابض ہو جانے والے دشمن کے سپاہیوں کے تعاقب کرنے کی بنا پر اب منتشر ہو کر ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ داروغہ کے لئے یہ سمجھنا دشوار ثابت ہو رہا تھا کہ دشمن کہاں ہیں، خود اس کے اپنے آدمی کہاں ہیں: ”بھی چیخ چلا رہے تھے، گالی گلوچ کر رہے تھے، جان بچا کر بھاگ رہے تھے۔

داروغہ جان وفانے بہ غلت فیصلہ کر لیا۔ وہ گھوڑے پر سوار ہوا اور اس کا رخ شیخ زادہ دروازے کی طرف موڑ دیا جو واحد دروازہ تھا جہاں ابھی تک بابر کے سپاہی نہیں پہنچ سکے تھے۔ داروغہ کے حکم پر فوراً ”ہی دروازہ کھول دیا گیا۔ اور وہ حیران و ششدر رہ جانے والے سو سپاہیوں کے ساتھ جن کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا، گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا ہوا شیبانی خان کو یہ خبر دینے کے لئے اس کے پڑاؤ کی طرف روانہ ہو گیا کہ بابر کے کئی ہزار لشکریوں نے سمرقند پر قبضہ کر لیا ہے۔

رات رہے سے ہی اہل سمرقند گھروں میں بتیاں جلائے بغیر شدت خوف سے کانپتے رہے تھے، نہ کسی کو کھڑکی سے باہر جھانکنے کی ہمت پڑ رہی تھی اور نہ ہی کوئی یہ سمجھ پا رہا تھا کہ شہر میں ہو کیا رہا ہے۔ صبح نمودار ہوئی تب کہیں جا کر اہل سمرقند کو منادی گروں اور چند لمحات کے اندر ہی پھیل جانے والی افواہوں سے پتا چلا کہ انہیں بابر نے ظالم خان سے نجات دلادی ہے۔ شیبانی خان سے جانے کتنے ہی لوگوں کو شکایات تھیں۔ نوواردوں نے دستکاروں کے گھروں کو پوری طرح لوٹ لیا تھا، ان خانہ بدوشوں کے گھوڑوں کے گلوں نے دقتانوں کی فصلیں روند ڈالی تھیں۔ کوہستانی علاقے میں اپنے دونوں بیٹوں کے ساتھ بہیمانہ انداز سے قتل کئے جانے والے خواجہ یحییٰ کے حامی علمائے دستکاروں اور دقتانوں کو انتقام کے سیاہ پرچم تلے اکٹھا کر لیا تھا۔ سابق حکمرانوں کے عمدہ دار بھی جنہیں شیبانی کی فتح کے بعد طاقت اور مراعات سے محروم کر دیا گیا تھا، انتقام لینے کے لئے تڑپ

رہے تھے۔ اس طرح کئی ہزار افراد بابر کے دو سو چالیس سپاہیوں کے ساتھ ہو گئے۔ اور قتل و غارت گری کا بازار گرم ہو گیا۔ لوگوں کے گروہ سارے شہر میں منڈلانے لگے۔ عجب بھیانک ساں تھا۔ شیبانی خان کے چھپے ہوئے لوگوں کو گھسیٹ گھسیٹ کر سڑکوں پر لایا جا رہا تھا، کچھ لوگوں کو بھاگتے وقت ہی پکڑ لیا گیا تھا، چھروں، کلہاڑیوں، لاثیموں اور پتھروں کو آزادانہ طور پر استعمال کیا جا رہا تھا، کشتوں کے پٹے لگتے جا رہے تھے۔ عوام کے جائز غصے میں جو اپنی بے عزتی اور اپنے اوپر دس سال قبل ڈھائی جانے والے مظالم کا بدلہ لے رہے تھے، ان لوگوں کے انتقام اور سنگدلی کے جذبات بھی شامل ہو گئے تھے جو کئی سالوں سے اپنی بے عزتی اور تکالیف کا بدلہ لینے میں ناکام رہے تھے۔

شیبانی خان کا سارا لشکر تمام فوجی تیاریوں کے ساتھ فصیل شہر کے باہر اس وقت نظر آیا جب آفتاب طلوع ہو رہا تھا۔ خندق کے اوپر سے پل اٹھائے گئے اور شہر کے سارے دروازوں کو بند کر کے ان کی حفاظت کا معقول انتظام کر دیا گیا۔

شہر کے اندر قتل و غارت گری کا بازار اب بھی گرم تھا.....

۷

ظاہر شہر کے مختلف علاقوں میں بھاگ دوڑ کرتا رہا تھا لیکن فتحی سرت میں اسے ذرا بھی تھکن نہیں محسوس ہو رہی تھی۔ صرف کسی کسی وقت آنتیں البتہ قل ہوا اللہ پڑھنے لگتی تھیں۔ آخر کار جب بھوک نا قابل برداشت ہو گئی تو وہ قاسم بیگ سے اجازت لے کر ناباؤں کی دکانوں کی طرف گیا۔ صبح ہو چکی تھی لیکن کہیں کھانا ملنے کی امید نہ تھی کیونکہ راستوں اور چوراہوں پر اب بھی بد امنی پھیلی ہوئی تھی۔

بازار کے چوک میں ایک بہت بڑا ہجوم شیبانی خان کے کچھ سپاہیوں کو گھیرے ہوئے ان پر پتھراؤ کر رہا تھا۔ چار سپاہی جن کا کام تمام ہو چکا تھا، خون میں لت پت پڑے ہوئے تھے جبکہ کچھ دوسرے اپنے چروں کو ہاتھوں سے ڈھکے ہوئے کراہ رہے تھے۔ ان میں ایک بیس سالہ لڑکا بھی شامل تھا۔ اس کا کرتا تار تار ہو چکا تھا، زخموں اور خراشوں سے خون بہہ رہا تھا اور وہ گھٹنوں کے بل بیٹھا کانپ کانپ کر اپنی زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا۔ ظاہر ہجوم کو ہٹاتا ہوا اپنے گھوڑے پر آگے بڑھ کر چلا آیا:

”لوگو، میری بات سنئے! مرزا بابر نے حکم دیا ہے! جو ہتھیار ڈال دے اسے قید کر لیجئے۔ بیکار خون نہ بہائیے! آخر یہ نوجوان بھی تو مسلمان ہی ہے.....! بہت ہو چکا بس کیجئے لوگو!... ہم بھی تو سپاہی

ہیں! قصور کیا سپاہیوں کا ہے؟ قصور تو ان سپاہیوں کے خان کا ہے.....! میں کہتا ہوں، بند کیجئے یہ سلسلہ! مرزا بابر کے حکم کی تعمیل کیجئے!“

اتنے میں کچھ دوسرے گھڑسوار سپاہی بھی بھیڑ کو چیرتے ہوئے وہاں پہنچ گئے۔ طاہر نے ان کی مدد سے دھیرے دھیرے ہجوم کا غصہ ٹھنڈا کر دیا۔

اس واقعے کو دیکھ کر وہ اتنا آگ بگولا ہو گیا تھا کہ اسے یہ بھی نہ یاد رہا کہ وہاں آیا کس لئے تھا اور شیبانی کے جو سپاہی زندہ بچ رہے تھے اور بمشکل سانس لے پارہے تھے انہیں گرفتار کر کے لے جانے لگا۔ جیسی ہجوم سے ایک طویل قامت آدمی نے چلا کر کہا:

”ذرا ٹھہرو تو نوجوان... تم طاہر تو نہیں ہو؟“

طاہر نے اس شخص کی طرف دیکھا۔ یہ توانا و تندرست طویل قامت شخص جس کی مونچھیں زرد پڑ گئی تھیں، ہاتھوں میں موٹا سا ڈنڈا پکڑے ہوئے تھا۔ طاہر کو تین سال قبل کا وہ واقعہ یاد آ گیا جب اس نے بھوک سے تڑپتے ہوئے سرقندیوں میں روٹیاں تقسیم کی تھیں۔

”ممد! یہ تم ڈنڈا کیوں لئے ہوئے ہو؟ خود بھی تپماق نہیں ہو کیا؟“

”ارے بھائی، شیبانی کے پٹھوؤں نے تو سارے ہی قبیلوں پر جانے کتنے مظالم ڈھائے ہیں۔ انہی کے ہاتھوں میری بد نصیب بیوی کی جان گئی!“

طاہر نے اس شخص سے رابعہ کے بارے میں جو باتیں کی تھیں وہ اسے یاد آ گئیں اور اس کے دل میں درد نے ایک بار پھر کوٹ لی۔ اس نے قیدیوں کو بابر کے محافظ دستے کے دوسرے گھڑسواروں کے ساتھ روانہ کر دیا اور خود گھوڑے سے اتر کر ممد کو ایک طرف لے گیا۔

”ممد بھائی، تمہیں یاد ہے میں نے کیا کہا تھا؟“

”ہاں بھئی، مجھے معلوم تھا کہ تم پوچھو گے... اسی لئے تو میں نے تمہیں آواز دی تھی... بات یہ ہے کہ میری بچاری بیوی نے کہیں کچھ سنا تھا... اسی لڑکی کے بارے میں جس کا تم نے ذکر کیا تھا۔ وہ اند جان کی رہنے والی تھی نا؟“

”نہیں، قواکی۔“

”کننے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اند جان علاقے ہی کی تھی۔ اسے اغوا کر کے یہاں لایا گیا تھا۔ بعد میں ترکستان کا کوئی سوداگر اسے خرید کر لے گیا۔“

”اور پھر، پھر کیا ہوا؟“

”پھر وہ سوداگر شیبانی خان کے ساتھ سرقند آ پہنچا۔“

”اسی لڑکی کے ساتھ؟ وہ زندہ ہے؟“
 ”زندہ ہے!“

ظاہر نے مد کا ہاتھ کس کے دبایا اور ہانپتے ہوئے پوچھا:
 ”اس کا نام رابعہ ہے نا، رابعہ؟“

”میری مرحومہ بیوی کو لڑکی کا نام نہیں معلوم ہو سکا تھا۔“

”تم نے اسے دیکھا ہے؟“ اور جب مد نے اثبات میں سر ہلایا تو ظاہر نے اسے جھنجھوڑ ڈالا۔ ”کہاں ہے وہ؟ کہاں ہے؟ جلدی سے بتاؤ!“

”فاضل ترخان کے گھر میں..... جسے تمہارے ساتھیوں نے گزشتہ رات.....“ اور مد نے اپنے ڈنڈے کو گلے پر پھیرا۔

”اس کا گھر کہاں ہے؟ کہاں؟“

”چلو، میں دکھائے دیتا ہوں!“

ظاہر اچھل کر گھوڑے پر سوار ہو گیا اور اس نے مد کو اپنے پیچھے بٹھالیا۔ مد نے اپنے ڈنڈے کو پھینک کر ظاہر کا جوئے پکڑ لیا اور اسے ٹیڑھی میڑھی گلیوں اور کوچوں میں راستہ دکھانے لگا۔
 ”اے پروردگار، میری مدد کر، مجھے سکون قلب سے محروم نہ کر! بس وہ زندہ مل جائے! تجھ سے التجا کرتا ہوں، پروردگار!“

ظاہر رابعہ کو چھ برسوں سے لاحق طور پر تلاش کرتا رہا تھا، خود کو یقین دلا چکا تھا کہ رابعہ کو ڈھونڈ نکالنا اس کی قسمت ہی میں نہیں ہے، اس خیال کا عادی بھی ہو چلا تھا لیکن اچانک پورے چھ برسوں سے دبی ہوئی امید بجلی کی طرح کو ندا اٹھی۔ امید اسے سرور کرنے کے ساتھ ہی ساتھ اذیت میں بھی مبتلا کر رہی تھی کیونکہ وہ بجلی ہی کی طرح اچانک غائب بھی ہو سکتی تھی اور اس امکان کے تصور ہی سے اس کے دل میں ٹیسس اٹھنے لگتی تھیں۔

”یہ رہا وہ مکان!“ مد نے اینٹوں کی دو منزلہ عمارت کی طرف اشارہ کیا جس کے عقب میں پھلوں کا بڑا سا باغ نظر آ رہا تھا۔

مکان، احاطے اور باغ کے دروازے پوری طرح کھلے ہوئے تھے۔ بابر کے مسلح سپاہی منقش آہنی صندوق، رنگ برنگے بیل بوٹے دار قالین، سامان کی بڑی چھوٹی گٹھریاں اور برتن باہر نکال رہے تھے۔ فاضل ترخان بہت بڑا دولت مند سوداگر اور شیبانی خان کا مقرب تھا۔ اس کی املاک کو بابر کے حق میں ضبط کر لینے کا حکم دیا گیا تھا۔

طاہر گھر کے پھانک کے قریب تیزی کے ساتھ گھوڑے سے اترا اور مد کا شکریہ ادا کئے بغیر ہی جان پہچان والے سپاہیوں کی جنہوں نے اسے پکارا تھا، بات سنے بغیر ہی سیدھا زنان خانے کی طرف لپکا۔ برآمدے میں فاضل ترخان کی سفید کفن میں لپٹی ہوئی لاش رکھی تھی۔ اوپری منزل سے عورتوں کے رونے کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ فاضل ترخان کی بیوائیں بظاہر تو اس کا سوگ منا رہی تھیں لیکن دراصل ان میں سے کچھ اس بات پر رو رہی تھیں کہ مرنے والے کی دولت کو غیر اٹھائے لئے جارہے ہیں اور کچھ محض اس اندیشے سے کہ اب ان پر جانے کیا گزرے گی۔۔۔

طاہر نے ٹہلی منزل کے کمروں میں جن کے دروازے کھلے ہوئے تھے، جھانکا۔ کہیں کوئی بھی نظر نہ آیا۔ جا بجا زنانے کپڑے اور زیور بکھرے ہوئے تھے۔ وہ دنگ رہ گیا: آخر اس ترخان کے کتنی بیویاں تھیں؟ کہیں اس نے راجہ کو بھی حاصل کرنے کے بعد اپنی بیوی تو نہیں بتالیا تھا؟ یا پھر وہ محض گھر کی نوکرائی ہی تھی؟

طاہر برآمدے سے نیچے کود کے احاطے کے وسط میں پہنچا اور وہاں سے اوپری منزل کی طرف جہاں سے رونے کی آوازیں آرہی تھیں، سر اٹھا کے آواز دی:

”ارے وہاں راجہ ہے کیا؟ راجہ؟ تو اکی راجہ ہے کیا؟“ رونے کی آوازیں دفعتاً ”ختم گئیں۔ کوئی عورت جس کے سر پر سبز رومال بندھا تھا، دوڑتی ہوئی اوپری برآمدے کے جھنگلے کے قریب آکھڑی ہوئی۔ طاہر کو لگا کہ وہ اس عورت کی آنکھوں اور بھوؤں کو بہت پہلے سے پہچانتا ہے۔“

”راجہ! راجہ!“ میں طاہر ہی ہوں!“

سبز رومال والی عورت طاہر کو دیکھ کر فوراً ہی جھنگلے کے پاس سے ہٹ گئی لیکن دوسرے ہی لمحے پھر آکر کھڑی ہو گئی۔ طاہر کی نظر اب اس عورت کی غمگین صدری اور گلے کے موتیوں کے ہار پر پڑی۔ یہ راجہ تھی، یہ وہی تھی! لیکن عورت جھنگلے کے ساتھ دوبارہ پیچھے ہٹ گئی: اسے اس مچھندر طویل قامت سپاہی کو جس کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی اور چہرے پر زخم کا نشان تھا دیکھ کر ڈر لگا لیکن آواز۔۔۔ آواز تو طاہر ہی کی تھی، اسی کی تھی اور یہ آواز اسے بلارہی تھی، یقین دلارہی تھی:

”راجہ! راجہ! میں طاہر ہی ہوں!“

عورت چیخ اٹھی: ”طاہر آکاؑ!“ اور زینے کی طرف لپکی۔ طاہر دیکھ رہا تھا کہ سیڑھیوں پر عورت کے پاؤں کتنی جلدی جلدی پڑ رہے ہیں، سن رہا تھا کہ اس کی چوٹیوں میں بندھے زنجیروں والے زیور کیسی ہلکی ہلکی سی جھنکار پیدا کر رہے ہیں۔ عورت کا چہرہ بھی اسی پہلے والی راجہ ہی کا جیسا تھا اور آنکھیں بھی لیکن لباس کچھ اور ہی طرح کا تھا جس کے باعث وہ کچھ اجنبی اجنبی سی بھی لگ رہی

تھی۔

رابعہ دوڑتی ہوئی نیچے اتر کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے طاہر کے چہرے سے جو خود بھی بت بن کے رہ گیا تھا، نظریں ہٹانے کی ہمت نہ کیا تے ہوئے ڈرتے ڈرتے چپکے سے کہا:

”آپ جن تو نہیں ہیں، طاہر آکا؟“

رابعہ کو تو عرصے سے یقین تھا کہ نیزے کے وارنے طاہر کی جان لے لی ہے اور وہ دعا مانگتی رہتی تھی کہ خدا اسے غریقِ رحمت کرے۔ کبھی کبھی وہ اپنی دعاؤں میں یہ بھی کہا کرتی تھی: ”پاک پروردگار، میں طاہر کو اب زندہ نہ دیکھ سکوں گی تو خوابوں ہی میں ان کی صورت دکھا دے!“ اور اب خدا نے اس کی یہ دعا قبول کر لی تھی کیا؟

”میں زندہ ہوں، رابعہ! چھ برسوں سے تمہیں تلاش کر رہا ہوں!“

”آپ زندہ و سلامت ہیں؟“ رابعہ طاہر کے قریب آگئی اور اس کے چوٹے، تلوار اور ہاتھوں کو چھو کر دیکھا۔ لیکن جب طاہر نے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر گلے لگا لیا تب ہی کہیں جا کر وہ یقین کر سکی کہ اس کے سامنے بھوت نہیں بلکہ جیتا جاگتا طاہر کھڑا ہوا ہے۔۔۔؟ زندہ ہیں! زندہ ہیں! ہائے اللہ، آپ زندہ و سلامت ہیں!“

طاہر رابعہ کے اٹلی لباس سے ڈھکے ہوئے شانوں کو سہلا سہلا کر بولنے لگا اس کے فقرے بے ربط سے تھے لیکن رابعہ کے دل کے لئے پوری طرح واضح

”رابعہ، میری جان! اور تم، تم بھی زندہ ہو! میں نے چھ برسوں تک تمہیں تلاش کیا! آخر تم کہاں تھیں؟ چھ برس... میں تمہاری جدائی میں...“

اچانک رابعہ کو یاد آگیا کہ وہ اب کون ہے۔ ہائے اللہ دولت مند تاجر کی ساتویں بیوی! وہ تیزی کے ساتھ طاہر کی بانہوں سے نکل گئی۔

”مجھے گلے نہ لگائیے، طاہر آکا! میں آپ کے لائق نہیں رہی!“

رابعہ کو فاضل ترخان نے انہی لٹیرے سپاہیوں سے اشرافیوں کی تھیلی ان کے آگے پھینک کر خرید لیا تھا۔ اسے اس بوڑھے سے سخت کمین محسوس ہوتی تھی۔ فاضل ترخان نے ترکستان کے دور دراز واقع شہر یامی میں رابعہ سے نکاح کر لیا تھا لیکن دس دنوں کے بعد ہی اسے فراموش کر بیٹھا تھا اور اپنے کاروبار کے سلسلے میں بخارا چلا گیا تھا۔ وہاں سے وہ ایک اور جوان اور خوبصورت بیوی کے ساتھ واپس لوٹا تھا۔ یہ بخارا والی ہی اس کے لئے اصلی بیوی کی حیثیت رکھتی تھی اور باقی سب... حرم میں بیواؤں کی سی زندگی گزارتی تھیں۔ ان میں بوڑھیاں بھی شامل تھیں اور جوان

رابعہ بھی۔ فاضل ترخان کبھی کبھار بس بھولے بھٹکے ہی رات کو رابعہ کے پاس آیا کرتا تھا، کچھ یوں جیسے کسی کینیریا داشتہ کے پاس آیا ہو۔ رابعہ مزاحمت کرتی تھی اور بوڑھا واپس لوٹ جایا کرتا تھا۔ لیکن بے عزتی کے داغوں کو بھلا وہ کیسے دھو سکتی تھی۔ کبھی طاہر کے ساتھ منگنی ہوئی تھی، پھر اس کی شادی ہو گئی تھی اس کے باوجود وہ کنواری جیسی ہی رہی۔ اس بات کو بھلا کون سمجھ سکتا تھا۔ رابعہ نے چہرے کو ہاتھوں سے ڈھک لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ گلے میں موتیوں کا ہار، بالوں کی چوٹیوں میں گندھے خوبصورت نفرتی زیور اور جسم پر لباس اطلس۔ یہ سب کچھ اسی تاجر کے پیسوں ہی سے تو خریدا گیا تھا۔ حقیقت بہر حال حقیقت تھی: اس نے پھٹے پرانے کپڑے تھوڑی پہن رکھے تھے۔

”رابعہ، سچ بتاؤ تمہیں اپنے شوہر سے محبت ہو گئی تھی کیا؟ کیا تم اس لئے رورہی ہو؟“
 ”مجھے تو اس کے ہاتھوں فروخت کر دیا گیا تھا! زبردستی، زبردستی! میں تو اس سے نفرت کرتی تھی اور اب بھی کرتی ہوں!“
 ”تو پھر رو کیوں رہی ہو؟“

”رونا تو اس لئے آ رہا ہے کہ اب میں آپ کی نظروں میں پاک دامن نہیں رہ گئی لیکن میں نے آپ کو فراموش نہیں کیا ہے، طاہر جان! خدا گواہ ہے۔۔۔ وہ تاجر۔۔۔ وہ تو مجھے کسی کینیر کی طرح رکھنا چاہتا تھا۔“

اتنے میں وہ بات جو طاہر کے دل کو بے رحمی کے ساتھ پاش پاش کئے دے رہی تھی آخر کار اس کے ہونٹوں پر آگئی:

”تمہارے۔۔۔ اس سے کوئی بچہ بھی ہے؟“

رابعہ نے پہلے ہی کی طرح روتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا:

”بیوی تو میں بس نام ہی کی تھی۔۔۔ میری حیثیت تو بیوہ کی سی تھی، کینیر کی سی تھی۔۔۔“

طاہر کا دل ہمدردی اور ترس کے جذبات سے معمور ہو گیا۔ اس کے ذہن میں بے شک یہ خیال پہلے ہی آچکا تھا کہ ظالموں نے مجبور و بے بس رابعہ کے ساتھ بدسلوکی کی ہوگی لیکن وہ اس کی تلاش کے دوران یہی سوچتا رہتا تھا ”بس وہ زندہ مل جائے!“ اور اس وقت وہ جیتی جاگتی سامنے کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے پہلے جیسی گل بدن حسینہ ہونے کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔ اب تو وہ قسمت کی ماری ہوئی عورت تھی، نہ بچے تھے نہ کوئی خاندان۔ اب تو وہ کسی بد معاش کے ہاتھوں توڑ دیا جانے والا کھلونا تھی، قیمتی اطلس پہننے والی حرم کی بیوہ تھی۔۔۔ گہرے زخم بھر جاتے ہیں تب بھی زندگی بھر کے

لئے اپنے داغ چھوڑ جاتے ہیں۔ طاہر نے سوچا کہ رابعہ پر جو کچھ جیتی ہے اس کے داغوں کو اپنے دل پر سے مٹا دینا پجاری کے لئے آسان نہ ہوگا اور خود وہ بھی رابعہ کی تلاش میں اپنے در بدر بھٹکتے پھرنے کو، اس وقت سنی ہوئی بات کو شاید ہی کبھی فراموش کر سکے۔

اس سب کے باوجود ان کی یہ ملاقات محض آنسو بہانے ہی کی نہیں بلکہ اس سے کہیں بڑھ کر مسرت کی گھڑی تھی!

”رابعہ، چھوڑو بھی یہ رونا دھونا! ہمیں تو اپنے مقدر کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ زندہ بچ نکلے اور آخر کار ملاقات نصیب ہوئی!... آؤ، چلو؟“

”لیکن کہاں؟“

”تو کیا تم میری منگیتر نہیں ہو؟“

”مگر میں... میں... اپنا سامان تو لے لوں!“

”یہاں کی ایک چیز بھی نہ لو۔ لعنت بھیجو سامان پر اور یہاں جو کچھ جیتی ہے اس سب پر! مجھے دوبارہ یاد نہ دلاؤ!“

رابعہ کی نظر ان سپاہیوں پر پڑی جو مقتول تاجر کا سامان اٹھا کر لئے جا رہے تھے تو اس نے شرارتے ہوئے کہا:

”مجھے برقعے کے بغیر... باہر نکلتے... شرم آتی ہے۔“

طاہر نے اپنا چوغہ اتاراجے رابعہ نے سر پر ڈال لیا اور اس چمکتے ہوئے چوغے سے اس کی ایڑیاں تک تقریباً ڈھک گئیں پھر طاہر نے اسے گھوڑے پر اپنے پیچھے بٹھالیا۔
رابعہ کی عدت کی مدت پوری ہوتے ہی دونوں کی شادی ہو گئی۔

دوبارہ سمرقند میں

۱

سمرقند کے مکانات کی چھتوں، کچی دیواروں، درختوں اور گنبدوں پر برف کی نرم و سفید چادر بچھی ہوئی تھی۔

بابر ہستان سرائے محل کی بالائی منزل پر کھڑا ہوا شہر کے نظارے میں محو تھا۔ شفاف برف کے پس منظر میں درختوں کی ایک دوسرے سے الجھی ہوئی کالی کالی شاخوں نے اسے سفید کاغذ پر نستعلیق

تحریر کی، علی شیر نوائی کے ہرات سے بھیجے ہوئے اس خط کی یاد دلا دی جو اسے آج ہی موصول ہوا تھا۔ اس کو ایک بار پھر اپنے سینے میں فخر اور مسرت کے جذبات امنڈتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔

بابر نے ایک ہی دھاوے میں شیبانی سے سمرقند کو چھین لیا تو شعرا نے اس موقع پر اس کی شجاعت کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے بڑے شاندار قطعات تاریخ قلم بند کئے۔ لیکن ان کی بہ نسبت علی شیر نوائی کی مبارک باد نے بابر کو کہیں زیادہ مسرت سے ہم کنار کر دیا حالانکہ وہ نثر میں تھی۔ اس نے سوچا کہ ہرات سمرقند سے کتنے زیادہ فاصلے پر واقع ہے، کتنے زیادہ مشہور و معروف لوگ وہاں رہتے ہیں، کیسے کیسے اہم امور ہیں جن پر نوائی کو توجہ مبذول کرنی پڑتی ہے! پھر بھی ایسا لگتا ہے کہ وہ عظیم شاعر بابر سے بخوبی واقف ہے اور اتنی دور سے بھی اس پر نظر رکھے ہوئے ہے۔

”اس بار آپ نے سمرقند کو جس بہادری سے فتح کیا وہ آپ کے نام کے شایان شان ہے۔“ نوائی نے یہ واضح کرتے ہوئے لکھا تھا کہ وہ اس شہر پر بابر کی پہلی فتح کی تفصیلات بھی جانتا ہے۔ نوائی کے ان الفاظ میں شاید ایک اور اشارہ بھی مضمر تھا: نوائی کی انسان دوستی دور دور تک مشہور تھی اور اس نے سمرقند پر بابر کی پہلی فتح کو شاید ہی سراہا ہو کیونکہ یہ فتح سات ماہ کے تکلیف دہ محاصرے کے بعد حاصل ہوئی تھی اور نتیجتاً ”اہل سمرقند کو جانے کتنے ہی مصائب جھیلنے پڑے تھے۔ نہیں، سمرقند پر اس کی پہلی فتح کا اندازہ بر شیر کی چھلانگ جیسا قطعی نہ تھا!

بابر دیوان خانے کے اندر چلا گیا جہاں ماہر دستکاروں کے بنائے ہوئے نقشیں دروازوں والی الماریوں میں قلمی کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک الماری کے قریب صندوق کی خوشبودار چھ پایوں والی چوکی پر سنہری ڈوری سے بندھا اور گول لپٹا ہوا ایک کانڈ رکھا تھا۔ یہ نوائی کا خط تھا۔ بابر نے چوکی کے پاس زری کے گدے پر بیٹھ کر دوبارہ خط پڑھنا شروع کیا اور اب اسے بعض جملوں کا مفہوم کچھ اور ہی معلوم ہوا جس کی طرف پہلی بار مطالعے کے دوران اس نے کوئی خاص توجہ نہیں مبذول کی تھی۔ نوائی کو اند جان کے ایک میر عمارت سے بابر کی شاعرانہ صلاحیتوں کا علم ہوا تھا اور اس نے اپنے خط کے ان جملوں میں اشارتاً ”کہا تھا کہ بابر کو اپنی صلاحیتوں سے میدان جنگ ہی میں نہیں بلکہ میدان سخن میں بھی کام لینا چاہئے۔ بابر سمجھ گیا کہ وہ میر عمارت غالباً ”فضل الدین ہی ہے۔ ایسا لگتا تھا کہ فضل الدین نے ہرات پہنچ کر نوائی سے ملاقات کی تھی اور اس سے بابر کی شاعرانہ صلاحیتوں اور بہت سی دیگر باتوں کا تذکرہ کیا تھا۔۔۔ اس خیال کے ساتھ ہی بابر کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ ہرات روانہ کرنے کے لئے جو جواب وہ لکھ رہا تھا اس میں کچھ اشعار کا بھی اضافہ کر دے۔ یقیناً ”بہترین اشعار ہی منتخب کئے جانے تھے لیکن سوال یہ تھا کہ وہ کون سے اشعار

ہوں۔

وہ اس فکر میں اپنی ضخیم بیاض کے اوراق دیر تک التما پلٹتا رہا۔

اس نے سوچا کیا وہ غزل مناسب رہے گی احساس تنہائی کی اذیتوں سے متعلق وہ غزل جو اس نے کافی دن قبل شروع کی تھی اور جس کا خیال اس زمانے میں اس کے ساتھ یکے بعد دیگرے کی جانے والی غدار یوں کی بنا پر اس کے ذہن میں آیا تھا؟ ان دنوں اسے دنیا میں اپنی روح نظر انداز کی ہوئی، کھوئی ہوئی سی معلوم ہو رہی تھی۔ باہر نے سن رکھا تھا کہ عظیم میر علی شیر کو بھی متعدد بار اپنے مقبرہ کی غداری کا تجربہ ہو چکا ہے نیز یہ کہ شاعر کا قریب ترین دوست حسین بیگمرا تک اسے سہارا نہیں دے سکا تھا، لوگوں کے ساتھ نیکی کرنے کی اس کی پیاس کو نہیں بجھا سکا تھا۔ کاش وہ نوائی کے انہی جذبات و احساسات کی اپنے اشعار میں ترجمانی کر سکتا!

تو کیا اسے اس نامکمل غزل میں اشعار کے اضافے کی کوشش کرنی چاہئے تھی جو اس دن کے بعد سے اب تک کسی طرح مکمل ہی نہیں ہو سکی تھی؟ لیکن اس وقت ایک تو اس کی ذہنی کیفیت احساس تنہائی سے پیدا ہونے والی ذہنی کیفیت سے کافی مختلف تھی (شیبانی سمرقند کو دوبارہ اس سے چھین لینے کی تیاریاں کر رہا تھا، شہر کے باہر قرب و جوار کے علاقوں میں منڈلا رہا تھا اس کے باوجود باہر کا دل اب بھی فتح کے جوش و خروش اور عوام کے اسے حکمران تسلیم کر لینے کی مسرتوں سے سرشار تھا) دوسرے میر خدیم نے اندر داخل ہو کر فکر خن سے اس کی توجہ ہٹا دی۔

”عالی جاہ! یہ خادم معافی کا خواستگار ہے لیکن۔۔“

”کیا بات ہے؟“

”آپ کی والدہ محترمہ، عالی نسب خانم آپ سے ملاقات کی منتظر ہیں۔“

”واقعی؟“ باہر تیزی سے اٹھ کے کھڑا ہو گیا۔ ”آگئیں؟“

”جی ہاں، عالی جاہ۔ اور ملکہ عالیہ بھی۔“

”خوب! بہت خوب!“ باہر کہہ اٹھا اور قلم اور کاغذ کو الگ رکھ دیا۔

۲

ان لوگوں کی ایک دوسرے سے ملاقات کوئی نصف سال سے نہیں ہوئی تھی۔ قلعہ نگار خانم، عائشہ بیگم اور خان زادہ بیگم اور اچھا میں منتظر تھیں کہ باہر کے بھیجے ہوئے معتبر افراد آکر انہیں اپنے ساتھ سمرقند لے جائیں۔

باہر نے ان خواتین سے چلی منزل کے کشادہ دیوان خانے میں ملاقات کی۔ ماں نے باہر کو گلے

لگایا تو اسے محسوس ہوا کہ وہ کتنی دلی ہو گئی ہے، ہاتھ کتنے ہلکے سے ہو گئے ہیں۔ بہن کے رخسار غالباً قیامت کی سردی میں سفر کے باعث تہمتائے ہوئے تھے، آنکھیں شرارت سے چمک رہی تھیں اور لگ رہا تھا کہ طویل سفر سے وہ ذرا بھی نہیں تھکی۔ وہ پہلے کی بہ نسبت زیادہ خوش و خرم اور زیادہ حسین و جمیل نظر آ رہی تھی۔ خان زادہ بیگم نے مرد رشتے داروں کے خیر مقدم کے مروجہ انداز سے بابر کے دائیں شانے پر اپنے ہاتھ رکھے تو اس کی ہتھیلیوں کا لمس بابر کو بے حد راحت بخش معلوم ہوا۔ عائشہ بیگم سر سے گرم ادنیٰ رومال ہٹائے بغیر ذرا فاصلے پر خاموش کھڑی ہوئی تھی۔

”آپ لوگوں نے اتنی دیر کیوں لگا دی؟ ہمیں تو آپ کا انتظار کرتے کئی ہفتے ہو گئے!“

”اس کا ایک سبب تھا، برادر عزیز، بہت ہی قابلِ معافی سبب۔ جلدی کرنا ممکن ہی نہ تھا۔“ خان زادہ بیگم نے پراسرار مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور عائشہ کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔

دراصل بابر کو اپنی شریک حیات کی یادوں نے زیادہ نہیں ستایا تھا حالانکہ کبھی اس نے اپنے ایک شعر میں اس کے زانو پر سر رکھنے کی آرزو ظاہر کی تھی اس کے آغاز شباب کے خواب کا فور ہو چکے تھے پھر بھی وہ عائشہ سے کسی بے اتفاقی کا مظاہرہ نہ کر سکتا تھا اور نہ ہی کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنی سترہ سالہ دھان پان ملکہ کے قریب جاکے اپنے دائیں شانے کو اس کی ہتھیلی کے تلے لاتے ہوئے کہا:

”خوش آمدید، بیگم!“

”عائشہ نے اپنا سوکھا سککھا ہاتھ خاوند کے شانے پر رکھ دیا۔

”شاہ عالی، فتح آپ کو مبارک ہو؟“

”اور آپ کو اپنے شہر میں واپس لوٹنا مبارک ہو، بیگم!“

”میں آپ کی شکر گزار ہوں۔۔۔“ اور عائشہ بیگم نے سر جھکا لیا۔

”اف، کتنی پریشانی ہوئی سفر میں پجاری عائشہ بیگم کو!“

خان زادہ بیگم نے کہا۔ ”اب تو ان کے لئے سفر کرنا اور بھی دشوار ہو گیا ہے۔“

بابر نے سوچا: اچھا تو یہ بات ہے! بیگم دلی تو ہو گئی ہیں پر ساتھ ہی ساتھ کچھ موٹی سی بھی لگ رہی ہیں۔ پیٹ خاصا ابھرا ابھرا سا ہے۔ دبلے پتلے چہرے پر زرد زرد جھائیاں بھی نکل آئی ہیں۔ یعنی یہ کہ میں باپ بنے جا رہا ہوں؟ حمل کوئی چھ مہینے کا لگتا ہے۔

عائشہ پہلے بھی گھوڑے پر یا بند گاڑی میں سواری برداشت نہیں کر پاتی تھی، اس کا سر چکرا نے لگتا تھا۔ بابر نے سفر کی مشکلات کا خاص طور پر اس حالت میں جبکہ عائشہ حاملہ بھی تھی، تصور کیا

اور اسے ترس آگیا: بیچاری عائشہ بیگم!

”خیر، اب آپ کو ساری مشکلات سے نجات مل گئی۔“ اس نے کہا۔ ”آپ کے لئے آرام وہ کمرے تیار کر دیئے گئے ہیں۔ آپ کو کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو حکم دیجئے، بستاں سرائے میں ہم سب آپ کی خدمت کے لئے حاضر ہیں!“

خان زادہ بیگم خوشی سے مسکرانے لگی:

”شکریہ..... بہت بہت شکریہ..... آپ کو دیکھ کر ہمیں جو مسرت حاصل ہوئی ہے اس کی گونج آسمان تک پہنچ رہی ہے۔“

”آپ کا وفادار بھائی بھی آپ سے باتیں کرنے کے لئے جانے کب سے ترس رہا تھا، ہمیشہ محترمہ..... اچھا اب آپ لوگ آرام کریں، میں دسترخوان لگائے جانے کا حکم دیتا ہوں..... وہاں آسمان کی بلند یوں پر۔“ بابر نے چھت کی طرف انگلی اٹھائی اور تہقہ مار کر ہنس پڑا جیسے کہ بچپن میں ہنسا کرتا تھا۔ باقی افراد بھی ہنس پڑے، عائشہ تک کو ہنس آگئی۔

اود خدا، کتنا پر مسرت دن ہے، بابر نے سوچا۔ اسے اپنے دل کی دھڑکنوں کو غور سے سنتے ہوئے لگا کہ اس کے وجود کے اندر نے کے نغمہ شیریں جیسا کوئی نغمہ۔ باپ بننے کا اس کے لئے بالکل نیا احساس۔ گونج رہا ہے۔ اسے بھوری جھائیوں دار زرد چہرے والی عائشہ بیگم بھی بہت عزیز و قریب معلوم ہوئی۔

رات کو شمعیں گل کر کے وہ دونوں بستر پر لیٹے تو عائشہ بیگم نے پردوں کی رضائی سے سینہ ڈھک لیا، پیر پھیلا دیئے اور دیر تک بالکل بے حس و حرکت لیٹی ہوئی چھت کی طرف ہنسی رہی۔ شاید وہ تھکن سے بالکل نڈھال ہو گئی تھی۔ پھر اچانک وہ کہہ اٹھی:

”مجھے آپ پر فخر ہے، میرے تاجدار۔“

بابر اس حسن اتفاق پر چونک اٹھا کہ جو بات اسے یاد آگئی تھی اسی کے متعلق اس کی بیگم بھی سوچ رہی تھی۔ اس نے عائشہ بیگم سے کبھی کہا تھا: اب سمرقند میں ملاقات ہوگی۔“ اور اپنا وعدہ پورا کر دیا تھا۔

عائشہ یہ بھی کہنا چاہتی تھی کہ وہ جلد ہی اس کے بچے کی ماں بنے گی جو اس کے لئے باعث فخر و مسرت ہو گا۔ یہ بات بابر پر واضح ہو گئی اسی لئے اس نے دریافت کیا:

”اچھا تو بیگم، کب.... کب منائیں گے ہم جشن مسرت؟“

”تین مہینوں سے بھی کم وقت رہ گیا ہے..... جیسے جیسے وہ گھڑی قریب آتی جا رہی ہے ویسے

دیے میرا خوف بڑھتا جا رہا ہے۔“

خوف کیسا، جان من..... ابھی ابھی تو آپ نے کہا تھا ”مجھے فخر ہے۔“
 ”جی ہاں، کہا تو تھا..... خدا نے اگر ہمیں فرزند عطا کیا تو اس کا نام فخر الدین رکھیں گے، ٹھیک ہے نا؟“

بابر نے سوچا کتنی ذہین ہیں عائشہ بیگم! والد کا نام ظہیر الدین ہے اور اسی سے ملتا جلتا نام بیٹے کا رکھنا چاہتی ہیں۔

”فخر الدین۔ نام تو اچھا ہے۔ واقعی۔ اور اگر دختر تولد ہوئی تو اس کا نام فخر النساء رکھیں گے، ٹھیک ہے نا، بیگم؟“

عائشہ بیگم بیٹے کی وارث تخت و تاج کی ماں بننے کی متنی تھی۔ اس نے بابر کو جواب دیا:
 ”منظور ہے..... لیکن میں تو خدا سے دعا کرتی ہوں کہ بیٹا ہی عطا کرے۔“
 ”آمین!“

فخر الدین، فخر النساء خوبصورت نام ہیں، بابر کے دل میں خیال آیا۔ پہلایا دوسرا نام جس کا رکھا جائے اسے پروردگار خوش نصیب کرے۔

۳

مصیبت ہی کی طرح مسرت بھی تنہا نہیں آیا کرتی۔

کامرائیاں یکے بعد دیگرے بابر کے قدم چوم رہی تھیں۔ فتح سمرقند کے بعد مشرق میں ارگوت اور مغرب میں سفد اور دوسرے شیبانی خان کی محکومی سے آزاد ہو کر بابر کے تابع ہو گئے تھے۔ شیبانی آنے والے معرکوں کی تیاریوں میں مصروف تھا لیکن اس نے سمرقند کا محاصرہ اٹھالیا تھا۔ وہ اپنے خاص لشکر کے ساتھ پیچھے ہٹ گیا تھا اور اب چھوٹے چھوٹے دستوں کو لے کر دھاوے بوتنا اور پریشان کرتا رہتا تھا۔

آج قرشی اور غزار سے خوشخبری موصول ہوئی تھی۔ ان شہروں سے بابر کے لشکر نے شیبانی کے مقرر کردہ حکام کو مار بھگایا تھا اور نئی حکومتوں نے بابر کے لئے تحائف اور اس کی فوج میں شامل کئے جانے کے لئے سینکڑوں نئے سپاہی بھیجے تھے۔ ان سپاہیوں کو جو بیگ اپنے ساتھ لائے تھے انہیں بابر نے اپنی طرف سے خلعت اور شاندار مکان دیئے اور بڑے بڑے مشاہرے مقرر کئے.....

بابر نے میر علی شیر کے نام گزشتہ روز جو خط لکھنا شروع کیا تھا اسے آج آگے نہ بڑھاسکا کیونکہ کتاب والے کرے کو جا رہا تھا تو سنگ مرمر کی سیڑھیوں پر اسے بسن نے روک لیا۔

”برادر عزیز! کیا یہ سچ ہے کہ آپ کو ہرات سے کوئی خط موصول ہوا ہے؟“
بابر ٹھہر گیا۔

”ہاں سچ ہے، عالی وقار میر علی شیر کا خط ہے۔“

”خان زادہ بیگم نے اظہار مسرت کیا لیکن وہ بھائی سے اپنے لئے کوئی اہم خبر سننے کی توقع معلوم ہو رہی تھی۔ وہ اداس اداس سی تھی اور اس کی نگاہیں بھائی سے کچھ مانگ رہی تھیں۔ بابر کو ابھی تک علم نہ تھا کہ بہن کس غم میں مبتلا ہے لیکن اسے لگا کہ کوئی نہ کوئی غم ہے ضرور۔ وہ پل بھر شش و پنج میں مبتلا رہا پھر اس نے پرسکون انداز میں کہا:

”ادھر چلئے، میں آپ کو وہ خط دکھاؤں۔“

علی شیر نوائی کا خط پڑھتے وقت خان زادہ بیگم جب اس جگہ تک پہنچی جہاں اند جان کے میر عمارت کا ذکر تھا تو اچانک اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

”ارے یہ آپ کی آنکھوں میں آنسو کیوں؟ میں تو اپنی ہمیشہ کو خوش کرنا چاہتا تھا.....۔“

”یہ آنسو..... خوشی ہی کے ہیں..... میں مسرور ہوں کہ میرے برادر عزیز کی شہرت دور دور تک پھیل رہی ہے۔“

”میں بھی اپنی پیاری بہن کو مسرور ہی دیکھنا چاہتا تھا۔“

”محبوری ہے، بہن ٹھہری بد نصیب.....“

”لیکن بھائی کے اختیار میں تو سب کچھ ہے، بھائی تو کامیاب و کامراں ہے۔“ بابر گفتگو کو ہنسی مذاق کا رخ دیئے جا رہا تھا۔ ”بھائی کیا آپ کی مدد نہیں کر سکتا؟“

”آپ تو میری وجہ سے دیے ہی کتنے مصائب جھیل چکے ہیں۔ اگر میں اس سال..... اگر میں ان

دنوں اوش میں احمد تہل سے شادی کرنے پر راضی ہو گئی ہوتی تو شاید وہ آپ کا دشمن نہ بنتا۔“

خان زادہ بیگم کے اس دلی اعتراف نے بابر کو پوری طرح بے دلیل کر دیا۔ اسے اپنے سینے میں بہن کے لئے کچھ اور بھی زیادہ محبت امنڈتی محسوس ہوئی، جی چاہا کہ اور بھی زیادہ فیاضی سے کام لے اور بہن کو مسرتوں سے ہم کنار کر دے۔ اس نے سوچا کہ ایسے الا و ارفع احساسات و خیالات کا حامل ہوتے ہوئے بھی اگر وہ اپنی سگی بہن کو جس سے زیادہ عزیز و قریب اس کے لئے اور کوئی بھی نہیں، خوش نہ رکھ سکا تو اور کون رکھے گا؟

بہن، والدہ اور شریک حیات۔ تینوں خواتین جن سے وہ محبت کرتا تھا، اب سرقد کے عالیشان محل میں آچکی تھیں۔ اس محل میں کتنے تاجدار اور ان کے کتنے تاجدار اور ٹا زندگی بسر کر چکے تھے!

لیکن ان میں بس چند ہی ایسے تھے جو اپنے پیچھے عوام کے حافظے پر اپنی نیکیوں کے نقوش چھوڑ گئے تھے۔ اس کے برعکس عمارت سازی کے ماہرین نے اپنی صلاحیتوں سے جن شاہکاروں کی تخلیق کی تھی وہ آج تک لوگوں کی نگاہوں کو خیرہ کر رہی تھیں، ان کے دیدہ و دل کو فرحت بخش رہی تھیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ایک ماہر میر عمارت سینکڑوں کاہل اور کتے تاجداروں سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔

”ہشیرہ محترمہ! تیل صرف آپ کی بنا پر ہی میری دشمنی پر کمر بستہ نہیں ہوا۔۔۔ آپ اطمینان رکھئے۔ سانپ بہر حال سانپ ہی ہوتا ہے، ڈسنے کی عادت سے باز نہیں آتا، کسی بھی حالت میں۔“

”میں آپ کی شکر گزار ہوں، بابر جان“ خان زادہ نے اس کی ماں کی جیسی آواز میں کہا۔

”عظیم میر علی شیر نے اپنے خط میں امید ظاہر کی ہے کہ ہم اپنے شایان شان کام انجام دیں گے۔“ بابر کا لہجہ ایک بار پھر قدرے مزاحیہ اور پر تضح ہو گیا۔ ”کیا کریں، اب تو ہم ایسے محلات تعمیر ہی کرائیں گے جن کا رنگ روپ صدیوں تک ماند نہ پڑے گا۔۔۔ تاکہ ماورائے نہر خراسان سے پیچھے نہ رہ جائے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے اضافہ کیا۔ ”میری عزیز بہن، میں بہترین معماروں کو یہاں بلوانا چاہتا ہوں۔ میر علی شیر کے خط کا جواب میں کسی عقل مند قاصد کے ذریعے بھیجوں گا۔۔۔ انہوں نے خط میں جس میر عمارت کا ذکر کیا ہے اگر وہ ہمارے اند جان کے فضل الدین ہی ہوئے تو قاصد انہیں سرفرد آنے کی دعوت دے گا۔“

خان زادہ بیگم کی آنکھیں جو ابھی تک نم ہی تھیں، خوشی سے کھل اٹھیں۔ وہ مبہوت سی ہو گئی پھر شرماتے ہوئے بدبالی:

”آپ آسمان اور النہر پر میری امیدوں کے واحد تابندہ ستارے ہیں، برادر عزیز۔“

”آپا جان، آپ پرور و گار سے دعا کیجئے کہ وہ اس خطیلی شیبانی خان کو ہمارے راستے سے ہٹا دے۔ خدا کرے جلد از جلد مستحکم امن و سکون کا دور دورہ ہو! تب ہم سب اطمینان کی سانس لیں گے، میں اپنی نامکمل غزلوں کو مکمل کر سکوں گا، اپنی پسند کے مدرسے اور محل تعمیر کر سکوں گا۔ آپ کو یاد ہے نا، ہم نے اوش میں یہ کام کتنی لگن کے ساتھ شروع کیا تھا؟“

یاد کیوں نہ ہوتا! خان زادہ بیگم میر عمارت فضل الدین کے بنائے ہوئے ان نقشوں کو جو اسے ظاہر نے دیئے تھے، ابھی تک سنبھال کر رکھے ہوئے تھی۔ بھائی سے اس بات کا تذکرہ اسے نامناسب معلوم ہوا اور اس نے بس اتنا ہی کہا:

”خدا ہمارے خوابوں کی تکمیل میں حامی و ناصر ہو، حکمران۔ ہمارے سارے خوابوں کی تکمیل

میں! میں اس کے لئے روز و شب دعا کرتی رہوں گی!“

بابر نے بہن سے ہونے والی اس بات چیت کے بعد ادھوری غزلوں کے مسودوں کو سامنے رکھ کر دیر تک فکر سخن کا ارادہ کیا۔ اسے اپنی موجودہ دلی کیفیت کے اظہار کے لئے یہ شعر موزوں معلوم ہوا:

جو وفا کرتا ہے وہ خود بھی وفا پاتا ہے
اور غم دیتا ہے جو غم ہی سدا پاتا ہے
علی شیر نوائی کو کیا یہ غزل بھیجی جاسکتی تھی؟ اس نے ایک مصرعہ اور لکھا:
نیک شاداں رہے حلقے میں وفاداروں کے

نہیں، اس نے سوچا، یہ تو بالکل عام الفاظ ہیں اور انداز بیان براہ راست (اس نے مصرعے کو قلم زد کر دیا)۔ وہ ایک بار پھر غور و فکر کرنے لگا۔ دراصل وہ اس خیال کا اظہار کرنا چاہتا تھا کہ اس عاصی دنیا میں نوائی جیسے یکتا و یگانہ افراد کو ایسے افراد کو جو دوسروں کی فلاح و بہبود کے لئے بہت کچھ کرتے ہیں، اس کا صلہ بعد از مرگ نہیں، عوام کی یادوں میں نہیں بلکہ یہاں، اسی دھرتی پر اور ان کی زندگی ہی میں ملنا چاہئے۔ ان افراد کو دوسرے تمام لوگوں سے زیادہ سرتیس حاصل ہونی چاہئیں اور یہ سرتیس فراہم کرنے کا فرض ان کے ماحول کے لوگوں کی نیکی اور عقیدت پر عائد ہوتا ہے۔ مگر جانے کیوں وہ اپنے اس خیال کو اشعار کے قالب میں ڈھال ہی نہیں پا رہا تھا۔ ”لیکن کیا زندگی میں ایسا ہوتا بھی ہے؟ بابر نے اپنے آپ سے سوال کیا اور مصرعے کو ایک بار پھر کاٹ کر اس کے اوپر لکھا:

نیک غداری، بدی، مکر سے محفوظ رہے

قلم پھر رک گیا۔ نہیں، بات اب بھی نہیں بنی تھی!

بابر بیاض بند کر کے چوکی کے پاس سے اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر وہ دیر تک کمرے میں ٹھٹھا رہا۔ اتنے میں جب اسے یہ بتایا گیا کہ شہر سبز سے قاسم بیگ شاعر کمال الدین بینائی کو لے کر آیا ہے اور ملاقات کے لئے وقت متعین کئے جانے کی درخواست کر رہا ہے تو بابر خوش ہو گیا کہ اس کی توجہ اداس خیالات کی طرف سے ہٹا دی گئی۔

”انتظار کا ہے؟ ابھی ملاقات کئے لیتے ہیں“ بابر نے فیصلہ کیا اور پھلی منزل پر اترتے ہوئے بینائی سے اپنی پہلی ملاقات کی تفصیلات یاد کرنے لگا۔

بابر ہرات کے مشہور شاعر کمال الدین بینائی سے تین سال قبل متعارف ہوا تھا جب کہ سمرقند پہلی بار اس کے قبضے میں آیا تھا۔ بینائی کے پاس کسی مانے ہوئے خوش نویس کا نقل کیا ہوا ایک نادر کتاب کا نسخہ موجود تھا۔ بینائی کو کتابوں سے بابر کی بے پایاں محبت کا علم ہوا تو اس نے یہ قلمی نسخہ بابر کو نذر کرنے کا ارادہ کیا۔ بابر کو پتا چلا کہ بینائی مفلسی کی زندگی گزار رہا ہے، سمرقند میں اس کا کوئی گھر تک نہیں اور جہاں سرچھپانے کی جگہ ملتی ہے پڑھتا ہے تو اس نے کتاب کی قیمت ادا کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے نادر کتابوں کے تاجروں کو بلوا کر ان سے دریافت کیا کہ اس کتاب کی قیمت کیا ہو سکتی ہے اور اسے جواب ملا۔ ”زیادہ سے زیادہ پانچ ہزار درہم۔“

افسوس کہ بابر بینائی کو یہ رقم نہ بچھو اسکا کیونکہ جیسا کہ ہم جانتے ہیں، وہ بیمار پڑ گیا اور اس فانی دنیا سے اٹھتے اٹھتے بچا۔

صحت یاب ہونے کے بعد جب وہ اند جان جانے کی تیاریاں کرنے لگا اور اس کی نظر اس قلمی کتاب پر پڑی تو اسے یاد آیا کہ اس کی قیمت بینائی کو ابھی تک ادا نہیں کی گئی۔ بابر نے فوراً ہی خزانچی کو بلوایا، پانچ ہزار طلائی درہم اسی وقت گئے اور ایک معتبر شخص کے ہاتھ شاعر کے پاس بھیجے گئے۔ لیکن یہ رقم فوری طور پر بینائی تک نہ پہنچ سکی۔ وہ معتبر شخص اسے تلاش ہی نہ کر سکا: بے خانماں شاعر لا پتا سا ہو گیا تھا، جانے کہاں مقیم تھا۔ اس اثنا میں بابر کے لئے اپنے استاد اور ماں کو محاصرے سے نجات دلانے کے لئے اند جان روانہ ہونا ضروری ہو گیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ بینائی کو تلاش کرنے کی کسی کو فرصت ہی نہیں لیکن بابر اپنی بات پر سختی سے اڑا رہا:

”اس قرض کو ادا کئے بغیر میں سمرقند سے روانہ نہ ہوں گا!“

اس کے بعد ہر کارے اور سپاہی گھوڑوں پر سوار ہو کر شہر کے کونے کونے میں گئے، انہوں نے بینائی کو تلاش کر لیا اور کہا کہ اسے کتاب کی قیمت لینے سے انکار نہ کرنا چاہئے کیونکہ تاخیر کی صورت میں مہم ناکام ہو جائے گی۔ آخر کار بینائی نے وہ پانچ ہزار درہم لے لیے۔

بینائی اپنی زندگی میں کئی غاصب حکمرانوں کو دیکھ چکا تھا اس لئے سولہ سالہ مرزا بابر کی اس دیانت داری سے بے حد متاثر ہوا اور اس نے اس شاندار واقعے کے سلسلے میں ایک قصیدہ قلم بند کیا۔ وہ قصیدے کو عمدہ خوش نویس سے نقل کرا کے بابر کو اس کے سمرقند سے روانہ ہونے سے قبل واقعے کی یادگار کے طور پر پیش کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

بائیں اشعار کے اس قصیدے میں عام رواج کے بموجب خاصے مبالغے سے کام لیا گیا تھا:

جہاں میں نیک نامی تجھ کو حاصل
ظہیر الدین بابر شاہ عادل

بابر نیک دلی سے ہنس پڑا: ہونہ ”جہاں میں نیک نامی!“ بہر حال یہ تو کہا ہی جاسکتا تھا کہ وقت پر کی جانے والی ذرا سی نیکی سے شاید بے خانماں شاعر کی نگاہوں میں ساری دنیا انصاف کا پیکر بن گئی! اس کے بعد سمرقند پر شیبانی خان نے قبضہ کر لیا۔

خان نے ایک مشاعرہ منعقد کیا جس میں بینائی کو بھی مدعو کیا گیا۔ اس بزم سخن میں شیبانی نے بینائی کے کلام کو بہت پسند کیا اور اسے ملک الشعراء کے خطاب اور مال دولت سے نوازا۔ اس نے زمانے کے عام رواج کے بموجب بینائی کو اپنی فتوحات کی تاریخ لکھنے پر مامور کر دیا۔ بینائی نے ”شیبانی نامہ“ لکھنا شروع ہی کیا تھا کہ سمرقند پر بابر نے دوبارہ قبضہ کر لیا۔ انہی دنوں جب کہ شیبانی خان اپنے سارے دستوں کو دھیرے دھیرے سمرقند کے گرد و نواح سے ہٹاتا ہوا ایک نئے محلے کے لئے اپنی طاقت مجتمع کرنے کے ارادے سے بخارا جا رہا تھا بینائی خان کے پڑاؤ سے فرار کر کے سمرقند آ گیا۔ وہ بابر سے ملنے کی کوشش کرنے لگا لیکن قاسم بیگ نے اسے شیبانی خان کا حامی تصور کرتے ہوئے بابر کے پاس پھنکنے بھی نہ دیا اور شہر سبز بھیج دیا۔ بابر کو اس واقعے کا علم فوری طور پر نہیں ہوسکا تھا اور پتا چلنے پر حال ہی میں قاسم بیگ کی سرزنش بھی کی تھی:

”آپ نے بلاوجہ یہی قدم اٹھایا۔ بینائی عظیم شاعر ہیں اور وہ اپنی مرضی سے یہاں آگئے تھے تو انہیں مجھ سے ملاقات کی اجازت دے دینی چاہئے تھی۔“

ایماندار قاسم بیگ نے وضاحت کی:

”لیکن عالی جاہ“ اس عظیم شاعر نے تو سمرقند پر قابض ہو جانے والے شیبانی خان کی شان میں قصائد بھی لکھے تھے۔“

بابر مسکرا دیا:

”آپ کو نہیں معلوم کیا، قصیدہ تو انہوں نے میری شان میں بھی لکھا تھا..... بھیجی جب بادشاہوں کو اپنی مدح و ستائش کرانے کا اتنا زیادہ شوق ہے تو شاعر کیا کریں؟“

قاسم بیگ کی سنجیدگی برقرار رہی:

”عالی جاہ“ یہ شخص شیبانی خان کا مخبر بھی تو ہو سکتا ہے۔“

”بابر نے کچھ سوچتے ہوئے کہا:

”نہیں۔ وہ ہرات میں بھی حسین بیقرار کے مخبر نہیں تھے۔ اور شیبانی کی خدمت تو انہوں نے

صرف شاعری کے ذریعے کی تھی..... وہ بھی تھوڑے ہی دن۔“

”لیکن بینائی خواجہ یحییٰ کے ہاں رہتے تھے، ان کے نمک خوار تھے پھر بھی بعد میں کھلے عام شیبانی خان کی طرف ذاری کرنے لگے جس نے خواجہ یحییٰ کو قتل کرا دیا تھا۔ اگر وہ خبر نہیں تھے تب بھی ان کا طرز عمل مستحسن تھا کیا؟“

”مجھے تسلیم ہے کہ مستحسن نہ تھا لیکن ان کو ہمیں یہ بھی دکھانا چاہیے کہ مستحسن کیا ہوتا ہے..... کسی کو شہر سبز روانہ کر دیجئے، محترم بیگ، بینائی کو صحیح سلامت یہاں بلوا لیجئے۔“

یہ حکم تھا اور قاسم بیگ نے آج اس کی تعمیل کر دی تھی۔

..... بابر نیچے اتر کر خاص دروازے سے دیوان خانے میں داخل ہوا۔ سامنے والے عام دروازے سے جلد ہی قاسم بیگ اور بینائی اندر آئے۔ بینائی تین سال قبل بہت ہٹا کٹا اور رعب دار نظر آتا تھا لیکن اب تو وہ کافی دلا پتلا اور سکڑا سکڑا سا لگ رہا تھا۔ چونکہ اور دستار بھی پھٹے پرانے ہی سے تھے۔ تاہم اس کی بڑی بڑی آنکھیں ضبط نفس اور کردار کے باکپن کی آئینہ دار تھیں۔

بابر نے دیوان خانے کے وسط میں جا کر شاعر کا استقبال کیا اور اسے شہ نشیں کے پاس تک لایا۔ اس نے قاسم بیگ کو اپنے دائیں، بینائی کو بائیں پہلو میں بٹھایا اور پھر بینائی سے مخاطب ہو کر اس کی خیریت دریافت کی۔ بینائی نے وجواب تاجیک زبان میں ایک شعرے دیا:

نی غلہ مراکز تو انم نوشید
نی مہمل غلہ تا تو انم پوشید

بابر نے انگلیاں پیشانی سے نکادیں اور کسی سوچ میں ڈوب گیا۔ اچھا، تو بادشاہ سلامت شعر کا جواب شعر ہی سے دینا چاہتے ہیں، قاسم بیگ نے سوچا اور بینائی کو اشارہ کیا: ٹھہر جائیے! بابر نے ذرا ہی دیر بعد پیشانی سے ہاتھ کو ہٹا کر اسے ہلاتے ہوئے کہا:

بلا تاخیر اپنا حق ہم استعمال کرتے ہیں
کھلایا جائے کھانا آپ کو، کپڑے دیئے جائیں
بینائی کو حیرت ہوئی، اتنی جلدی جواب کی توقع کب تھی۔ اس نے تاجیک میں (بابر کا شعر ترکی میں تھا) کہا:

”مکرار شاد، عالی جاہ، میں بحر کو ذرا بہتر طور پر سمجھ لوں۔“

”بابر نے لفظی رد و بدل کے ساتھ شعر پڑھا:

ہم اپنے حق کا استعمال کرتے، حکم دیتے ہیں

کھلایا جائے کھانا آپ کو، کپڑے دیئے جائیں
 ”یہ خادم حکمران کی شاعرانہ ملاجیتوں کو خراج تحسین پیش کرتا ہے“ بینائی نے کہا اور داڑھی
 کی جس پر ہلکی ہلکی سفیدی نمایاں ہو چلی تھی، نوک کو انگلیوں سے کھینچتے ہوئے خاموشی سے جواب
 سوچنے لگا۔ آخر کار چند لمحات میں اسے خاطر خواہ بات سوجھ گئی تو اس نے نگاہیں اٹھائیں اور سینے کو
 ذرا تان کر اب کے ترکی میں شعر پڑھا:

بڑا انعام ہے، لائق نہیں میں ایسی نعت کے
 یقین کیجئے، نہیں پھٹکا کبھی نزدیک دولت کے
 بابر کو بھی حیرت ہوئی، اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ بینائی فارسی ہی میں نہیں بلکہ ترکی
 میں بھی شعر گوئی پر ایسی زبردست قدرت رکھتا ہے۔ یہ تو سچ تھا کہ بینائی نے اپنے معاملے میں بہت
 انکساری سے کام لیا تھا اور خود کو ”عظیم شاعر“ نہیں کہا تھا۔ لیکن صاف ظاہر تھا کہ یہ محض عام
 شاعرانہ انداز ہی تھا۔ اوہ، شاعری، شاعری، بابر نے سوچا، سچائی پر خوبصورت الفاظ کے پردے
 ڈالنے اور ساتھ ہی ساتھ اس پر سے پردے اٹھانے میں تیرا بھی کوئی جواب نہیں!
 بابر نے میرٹش کو طلب کر کے بینائی کی ترکی بیت کو کاغذ پر لکھ لینے کا حکم دیا۔

بینائی اور بابر کی منظوم گفتگو سے قاسم بیگ بھی بہت متاثر ہوا۔ اس نے بینائی کے قیام کے لئے
 اسی دن آرام دہ احاطے والے عمدہ مکان کا انتظام کر دیا اور بابر کے حکم کے بموجب آٹا، چاول، بھیڑ
 اور پوتین بھی بھجوا دیئے۔ بینائی کے لئے دوسرے عمدہ داروں کا جیسا معقول مشاہرہ بھی مقرر کر دیا
 گیا۔

اس ملاقات کے بعد بابر نے ہر اقامتی شاعر کو متعدد بار اپنی اوپری منزل کی خلوت گاہ میں کھانے پر
 مدعو کر کے بات چیت کی۔ پہلے بینائی نے سوچا تھا کہ اسے شیبانی خان سے اپنی وابستگی کی تفصیلات
 بیان کرنی ہوں گی۔ اس نے یہ تیاری بھی کر لی تھی کہ اس معاملے کا تذکرہ کرتے ہوئے کس طرح
 اپنے اوپر طنز کرے گا، اپنی غلطی کی کن الفاظ میں مذمت کرے گا۔ لیکن بابر نے بالکل ہی مختلف
 موضوع چھیڑا، وہ ہرات کے بارے میں، نوائی کے بارے میں دریافت کرتا رہا۔

دوران گفتگو پتا چلا کہ بینائی نے میر علی شیر نوائی کی شان میں ایک قصیدہ بھی لکھا ہے۔ بابر نے
 اس قصیدے کو سنا اور جی کھول کر داد دی۔

بینائی کی دلی خواہش تھی کہ میر علی شیر کو اس قصیدے کے بارے میں معلوم ہو جائے۔ بابر نے
 بڑی خوش اخلاقی کے ساتھ تجویز پیش کی کہ اس کا خط لے کر جو قاصد ہرات جانے کی تیاری کر رہا

ہے اسی کے ہاتھ قصیدہ بھی بھیج دے گا۔

پینائی سے گفتگو کرتے ہوئے بابر کو بار بار اپنے اشعار کا جنہیں وہ خط کے ساتھ نوائی کے پاس بھیجنا چاہتا تھا، خیال آتا رہا۔ لیکن جب اس نے اپنے اشعار کا پینائی کے اشعار سے جنہیں خود نوائی نے ایک بار ”بے مثال“ قرار دیا تھا، موازنہ کیا تو وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ ابھی وہ اس دہلیز پر قدم تک نہیں رکھ سکا ہے جسے پار کر کے ہرات کے اس عظیم شاعر سے روحانی ملاقات کر سکے۔ اس نے اپنی مختلف غزلوں اور ان کی ترمیم شدہ شکلوں کو یکے بعد دیگرے مسترد کر دیا۔ اس نے محسوس کیا کہ پہلے جو کچھ آسان اور قابل فہم معلوم ہو رہا تھا وہ زیادہ سے زیادہ پیچیدہ ہوتا جا رہا ہے حتیٰ کہ لوگ اسے غلط معنی بھی پہنا سکتے ہیں۔ جس شاعری کا وہ عادی ہو چکا تھا وہ دنیا کی پیچیدگیوں کی ترجمانی و عکاسی نہیں کرتی تھی اور زیادہ تر اشعار تو اصل مسائل سے ذرا بھی تعلق نہیں رکھتے تھے۔ مثال کے طور پر اسی مسئلے سے کہ نیک ارادوں والے کسی شخص پر جسے مقدر نے بلندیوں تک پہنچا دیا ہو، اس کا ماحول۔ خود غرض، عیار اور نمک حرام درباریوں کی غل غلاہ کرتی ہوئی بھیڑ جس کے درمیان اسے زندگی گزارنی پڑتی تھی، کتنا دباؤ ڈالتی تھی۔ بابر نے سوچا کیا اس کی شاعری بادشاہوں کے مقربین کی پھیلائی ہوئی برائیوں کو بے نقاب کرتی ہے؟ لوگ کسی نہ کسی طرح برسر اقتدار آجائے ہیں اور پھر صرف اپنے آپ کو دیکھتے ہیں، صرف اپنی ہی فکر کرتے ہیں، حتیٰ کہ شاعروں اور معماروں کی سرپرستی کرتے ہیں تب بھی محض اپنے ہی مفاد میں، محض اپنے ہی نام و نمود کے لئے..... علی شیر نوائی اور پینائی درباریوں کی بھیڑ بھاڑ اور دنیا کے شہ زوروں سے، ڈھائی دنوں کے بادشاہوں سے بیزار ہیں تو ان دونوں کے پاس اس کے محسوس اسباب بھی موجود ہیں جن سے متعلق قصے زیادہ سے زیادہ افسوس ناک ہوتے جا رہے ہیں۔

کس سے نیکی کی انہوں نے جو ہیں دنیا کے غلام؟

یہ مصرعہ دل سے نکلنے والی آہ کی طرح موثر تھا اور اس میں ایک خاص قسم کی قوت اور طاقت موجود تھی۔ بابر پر بہت ساری باتیں عیاں ہو گئیں۔ اس وقت اس کی ذہنی صلاحیت اور قوت پینائی ہرات میں مقیم علی شیر نوائی کی آنکھوں کی طرح تیز تھیں۔ اس وقت بابر کے پاس ایسی بہت سی باتیں تھیں جو وہ اس عظیم شاعر سے کہہ سکتا تھا۔ وہ شخص ضرور دھوکا کھائے گا جسے خود غرض لوگوں سے نیکی کی توقع ہو، چاہے یہ لوگ اعلا و ارفع خیالات کے حامل ہی کیوں نہ ہوں۔

اس نے سوچا کہ علی شیر نوائی اس لئے لوگوں کی بے لوث خدمت کرتے رہتے ہیں کہ ان کا رتبہ تاجداروں اور خود نوائی کی خوشامد کرنے والے چاہلوں سے کہیں زیادہ بلند ہے (در اصل تاجدار

اور ان کے خوشامدی دونوں اس دنیائے فانی کے عارضی بندے ہی تو ہیں!۔۔۔ اس نے اپنے دل کی اس بات کا اظہار کر دیا کہ انسان کی زندگی کا مقصد بلند ہونا چاہیے۔ صرف اسی صورت میں وہ اپنے آپ سے کہہ سکتا ہے کہ ہاں، تمہاری زندگی رائیگاں نہیں گئی!

کس سے نیکی کی انہوں نے جو ہیں دنیا کے غلام؟
جو بھروسا ان پہ کرتا ہے وہ دھوکا کھائے گا
جتنی نیکی تجھ سے ممکن ہو سکے کر اور تجھے
بعد مرنے کے بھی نیک انسان سمجھا جائے گا

..... اس طرح اس نے ایک رات کو نوائی کے نام اپنے خط اور اشعار کو مکمل کر لیا اور دونوں کے بعد ایک مخصوص قاصد خط اور قیمتی تحائف لے کر ہرات روانہ ہو گیا۔ باہر کو توقع تھی کہ نوائی کا جواب موسم سرما کے آخر تک موصول ہو جائے گا لیکن گل چاندنی کے اولین پھول کھلنے لگے تو ہرات سے جواب کے بجائے بڑی افسوس ناک خبر موصول ہوئی۔ کڑا کے کے جاڑے میں نوائی کا انتقال ہو گیا تھا۔ قاصد ابھی راہ ہی میں تھا کہ نوائی نے دنیا کو خیر یاد کہا۔ باہر کتنے ہی برسوں سے خواب دیکھ رہا تھا کہ اسے کسی دن اس عظیم شاعر سے شرف تلمذ حاصل ہو گا لیکن بد بختی نے اس خواب کو خاک میں ملا دیا.....

اس اثنا میں شیبانی خان سے نئی جنگ کا خطرہ سر پر منڈلانے لگا۔

۵

لالے کی کلی زمیں سے ابھر کر کھلنے ہی والی تھی کہ گھوڑے کے سم نے اسے روند ڈالا۔
شیبانی خان تیزی سے پہاڑی کی چوٹی پر پہنچا اور زین پر بالکل بے حس و حرکت ہو کر نیچے گھائی میں اپنے گھڑسوار لشکر کو جنگی مشقیں کرتے ہوئے دیکھنے لگا۔
نظارہ واقعی قابل دید تھا حالانکہ کچھ ہی دن قبل.....

سمرقند اور بخارا کے وسط میں واقع دوسرے قلعہ موسم بہار کے نیلگوں آسمان تلے خان کو اس وقت انسان کا بنایا ہوا پہاڑ سا لگا۔ لیکن گزشتہ خزاں کے آخری ایام میں جب یہ قلعہ باہر کے قبضے سے میں چلا گیا تھا تو شیبانی کو خوبصورت تشبیہات سوچنے کی فرصت ہی نہیں تھی۔ وہ سنگین حالات سے دوچار ہو گیا تھا۔ کیونکہ اب اس کے قبضے میں صرف بخارا ہی باقی رہ گیا تھا۔ لہذا وہ حق محرا بھی یقیناً اس کے پاس تھا جو بے کراں تو تھا لیکن لوگوں اور سپاہیوں کی وہاں بہر حال کمی تھی۔ کچھ سلطانوں نے تو اس سے یہ بھی کہنا شروع کر دیا تھا: ”ابھی سویرا ہے، ترکستان صحرا کو واپس لوٹ جانا

چاہیے۔ لیکن شیبانی اپنے ان سلطانوں کے دباؤ میں نہیں آیا تھا۔ اس کو اپنی خوش بختی اور اپنے صحرا پر پورا اعتماد تھا۔ اسے سمرقند سے اپنے خبروں کی لائی ہوئی اطلاعات کی بنا پر یہ بھی معلوم تھا کہ باہر شعر و شاعری اور صاحبان علم سے تبادلہ خیالات سے اپنی گہری دلچسپی کے باعث آئندہ جنگوں کی تیاریاں کسی جوش و خروش کے ساتھ نہیں کر رہا ہے۔ اس کے علاوہ گزشتہ برسوں میں بار بار ایک کے قبضے سے دوسرے کے قبضے میں جانے والے اور تباہی اور لوٹ مار کے شکار سمرقند میں موسم بہار کے دوران دبا بھی پھیل گئی تھی اور حکمرانی کا سلسلہ شروع ہونے ہی کو تھا۔

شیبانی بڑے ہٹیلے پن کے ساتھ اپنے لشکر کو بڑھاتا اور تربیت دیتا رہا۔ اور جب اس نے اچانک بخارا سے دوسرے قلعے کے لئے کوچ کیا تو اس کے سپاہی قلعے پر یلغار کرنے کے لئے پوری طرح تیار تھے۔ ان پر تیروں اور پتھروں کی بارش ہو رہی تھی، کھوتا ہوا تیل پھینکا جا رہا تھا لیکن وہ اپنے نقصانات کی ذرا بھی پروا کئے بغیر، قلعے کی فسیل پر چڑھتے جا رہے تھے۔ ان کے حملے کا زور کچھ گھٹ گیا اور سپاہی آگے بڑھنے سے ہچکچانے لگے تو خان نے فوراً ”ہی جانناز لشکریوں پر مشتمل نئے دستے میدان میں اتار دیئے جن کی سالاری اس کا سکا بھائی محمود اور چیتا بیٹا تیمور کر رہے تھے۔ سپاہیوں نے جب یہ دیکھا کہ خان اپنے بھائی اور بیٹے تک کو قریان کر دینے سے نہیں ڈر رہا ہے تو انہوں نے اور بھی زیادہ غضبناکی کے ساتھ حملہ شروع کر دیا۔ مرنے والے س طرح نیچے گرنے لگے جیسے شہتوت کے درختوں سے شہتوت جھڑ رہے ہوں اور فسیل پر چڑھنے کے لئے لگائی جانے والی میڑھیاں خالی ہونے لگیں۔ پھر خود فسیل کے اوپری حصے پر دست بدست مقابلہ، نہایت ہی بے رحمانہ مقابلہ شروع ہو گیا جس میں کام آنے والے حملہ آوروں کی مدد کرنے لگے کیونکہ ان کی لاشوں سے کنگوروں کی درمیانی جگہیں بھرتی جا رہی تھیں اور قلعے کے محافظین کے لئے نیچے کی طرف تیر چلانا دشوار تر ہوتا جا رہا تھا۔

شیبانی خان کا لشکر تعداد اور طاقت دونوں اعتبار سے قلعے کی حفاظت کرنے والی فوج سے کہیں زیادہ بڑا تھا۔ قلعے پر شیبانی کا قبضہ ہو گیا اور جو محافظین زندہ بچ رہے تھے انہیں خان کے حکم پر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

دوسرے سے کمک کے لئے بھیجا جانے والا پیغام باہر کے پاس اس وقت پہنچا تھا جب شیبانی خان اپنی فتح کا جشن منا رہا تھا۔ خزاں اور موسم سرما کے دوران شیبانی کو یکے بعد دیگرے کئی شکستیں اٹھانی پڑی تھیں جن کے بعد یہ پہلی فتح تھی۔ اس قسم کی کامیابی انسان کو ہمیشہ ہی نئی امنگوں سے ہم کنار کر دیتی ہے۔ شیبانی نے دوسرے کو اپنا گڑھ بنالیا تھا اور وہاں سے سمرقند پر چھلانگ لگانے کی

تیاریاں کرنے لگا تھا.....

اس وقت کھائی میں ہونے والی گھڑ دوڑ جسے پہاڑی کے اوپر سے شیبانی خان دیکھ رہا تھا، اس کی تفریح کے لئے نہ تھی۔ یہ ایک دشوار جنگی مشق تھی۔ شیبانی کو جلد ہی بابر کے خلاف جنگ کے لئے انتہائی تیز، طاقتور اور دلیر سپاہیوں اور گھوڑوں کی ضرورت تھی۔

گزشتہ روز ہی سمرقند سے درویش کے بھیس میں آنے والے اس کے ایک مخبر نے بتایا تھا کہ بابر کے ہاں ایک دختر تولد ہوئی ہے جس کا نام فخر النساء رکھا گیا ہے۔

شیبانی خان اپنے عقاب صفت گھڑ سواروں کو بڑے جوش و خروش کے ساتھ ناقدانہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے سوچنے لگا:

”بابر کو فخر ہے۔ خیر کوئی بات نہیں، اپنی موسم خزاں والی فتح کے نشے میں ڈوبا رہے، شاعری کرتا رہے اور اس کی فخر النساء صحیح معنوں میں فخر النساء ثابت ہو۔ اس دوران میرے عقاب اڑنا اور دشمن پر جھننا سیکھ رہے ہیں۔ ان عقابوں کی گرفت میں آنے والا ایک بھی فرد زندہ نہ بچ سکے گا!“

شیبانی خان پر فوجی تیاریوں کا ایسا جنون اس سے قبل کسی بھی جنگ کے سلسلے میں نہیں طاری ہوا تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ بابر پر فتح پانا کوئی کھیل نہیں ہے۔ بابر کم سنی کے باوجود عقل مند ہے، نصیبے والا، نڈر اور بہادر ہے۔ اس نے کچھ ایسی فہم و فراست سے کام لیا ہے کہ مادر النہر کے زیادہ تر شہر اور گاؤں اس کی حمایت پر کمر بستہ ہو گئے ہیں۔ رہے بیک..... تو وہ اپنی اصلیت پر قائم ہیں، سارے کے سارے بیک آج بھی بھاڑے کے ٹٹوی ہیں، جو زیادہ طاقتور ہے اسی کو سجدے کر رہے ہیں۔ سلطان علی کے زیادہ تر بیک گزشتہ سال مجھ سے آن ملے تھے لیکن سمرقند پر بابر کے قبضے (بڑی پھرتی سے کام لیا تھا اس نے، اس میں ذرا بھی شک نہیں!) کے بعد ہی وہ بابر کے پاس بھاگ گئے تھے جس کا لشکر روز بروز بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ احمد تہل تک نے اپنے چھوٹے بھائی سلطان خلیل کو دو سو سپاہیوں کے ساتھ بابر کی خدمت میں بھیج دیا ہے۔ وہ بابر سے ڈرتا ہے، اس سے ”دائمی وفاداری“ کی قسم کھائی تھی۔ آئندہ بھی یوں ہی ہوتا رہا تو بابر کو کبھی بھی شکست نہ دی جاسکے گی..... خیر یہ موسم ہمارے، موسم گرما نہیں۔ گزشتہ سال کی خزاں میں جو کچھ ہوا تھا وہ دوبارہ نہ ہوگا۔ بابر کی طاقت میں اضافہ نہ ہونے دینا چاہیے، اسے فوجی تیاریوں کے معاملے میں پیچھے چھوڑ دینا چاہیے!.....

اور پھر شیبانی خان بخارا اور دیوسہ میں حفاظتی فوج اور معتبر ناظم مامور کر کے آندھی کی طرح سمرقند کی طرف بڑھنے لگا۔ چوری چھپے نہیں، کھلم کھلا۔ صرف یہی نہیں، اس نے تو بابر کو پہلے سے

ایک خط بھی بھیج دیا جس میں نوجوان سپہ سالار کے شجاعت کے جذبات بھڑکانے کی چال چلتے ہوئے ایمانداری سے کھلے میدان میں جنگ کرنے کے لئے لکارا گیا تھا۔ خان نے لکھا تھا: ”بہادر ایک دوسرے کی طاقت میدان کارزار میں آزماتے ہیں، بند قلعے کے اندر تو کوئی چھو کر ابھی پناہ لے سکتا ہے!“

بابر سمرقند سے نکل کر شیبانی خان کے لشکر کا سامنا کرنے کے لئے بڑھا لیکن ایک تاش ☆ ”فاصلہ طے کرنے کے بعد سربل میں ٹھہر کر دریائے زرافشان کے کنارے پڑاؤ ڈال دیا، لشکر کے چاروں طرف گہری خندقیں کھدوائیں اور درختوں کی شاخوں کی دیوار سی کھڑی کرادی تاکہ تیر انداز نہ داخل ہو سکیں۔

نہیں، وہ فوری طور پر جنگ چھیڑنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ وہ غنی فوج کی آمد کا انتظار کرنا چاہتا تھا جس میں وہ دستے بھی شامل تھے جنہیں شیبانی خان کے لشکر پر پیچھے سے حملہ کرنا تھا۔ دور دراز واقع ترکستان سے نئے دستوں کی آمد متوقع نہ تھی۔ دوسری طرف شیبانی کو یہ معلوم تھا کہ بابر کے پاس ملک پہنچنے والی ہے۔ شہر سبز سے موصول ہونے والی ایک خفیہ اطلاع نے جس سے خان کو تشویش پیدا ہو گئی تھی، اس بات کی تصدیق کر دی تھی کہ وہاں باقی ترخان بیگ دو ہزار سپاہی اکٹھا کر چکا ہے، مزید ایک ہزار سپاہی بھرتی کر رہا ہے اور جلد ہی بابر کی مدد کے لئے روانہ ہونے کا ارادہ رکھتا ہے۔

شیبانی سمجھ رہا تھا کہ اسے لڑائی جلد از جلد، بہر قیمت جلد از جلد چھیڑنی چاہیے اور دن رات سوچتا رہتا تھا کہ اس کے لئے کیا تدبیر اختیار کرے۔

ایک رات اچانک جنگی نقادوں اور تربیوں کی آوازیں کانوں کے پردے پھاڑنے لگیں اور ان کے ساتھ ہی ساتھ بابر کی لشکر گاہ پر تیرہ رتنے لگے حالانکہ ان سے کوئی خاص نقصان نہ ہوا۔ شیبانی کے گھڑسوار دستے خندق کو پار نہ کر سکے لیکن یہ ان کا خاص مقصد بھی نہ تھا۔ تاہم انہوں نے بابر کے پڑاؤ میں سخت کھلبلی مچادی اور ان کے ہنگامہ آوازے فضاؤں میں گونجنے لگے:

”منہ چھپائے کیوں بیٹھے ہو؟ کھلے میدان میں نہیں لڑنا چاہتے؟“

”بزدل کہیں کے!“

”بابر لرزہ برانداز ہے، ہمارے خان کے سامنے آنے کی جرات نہیں!“

”جو ڈرتا نہیں وہ ڈرا اپنی ناک تو باہر نکالے!“

شیبانی خان جانتا تھا کہ شب کی تیرگی میں اس نوعیت کے ہنگامے سے لوگ بدحواس ہو جاتے

ہیں۔ سینکڑوں ہزاروں گھڑسوار بابر کے پڑاؤ کی مورچہ بندی کے باہر منڈلا رہے تھے، گھوڑوں کی ٹاپوں اور بھیاک چیتکوں سے زمین کانپ رہی تھی، چلتے ہوئے تیر آ کر شہتیروں اور شاخوں سے بنی ہوئی چار دیواری میں دھنس رہے تھے اور اس ہلڑ ہنگامے میں چھوٹی چھوٹی پٹیس بھی زبردست آتش زدگی معلوم ہو سکتی تھیں۔ اور بابر کے محافظ دستے کے گھوڑوں کے لئے رکھی ہوئی خشک گھاس کے انبار میں واقعی آگ بھڑک اٹھی، خندق سے قریب ہی نصب خیموں کے مندرے جلنے لگے۔

رات کو کیا جانے والا یہ طوفانی حملہ پسپا تو کر دیا گیا لیکن اس سے حوصلے دفاع کرنے والوں کے نہیں بلکہ حملہ آوروں ہی کے بڑھے۔ خاص بات یہ تھی کہ حملہ نجومی کے لئے اشارہ تھا: کارروائی کرو، جلدی کرنے پر اصرار کرو۔

قاسم بیگ نے بابر سے بار بار کہا کہ شہر سبز سے ملک آجانے کا انتظار کیا جانیے لیکن اب بابر اس کی بات سننے کو تیار نہ تھا۔ اسے تو ستاروں کی ترتیب یقین دلادی تھی کہ فوری فتح صرف اسی کو حاصل ہوگی۔

”ذرا ان آٹھ ستاروں کو تو ملاحظہ فرمائیے، عالی جاہ!“

شہاب الدین نے دبی دبی سی پر اسرار آواز میں بابر کو سمجھانا شروع کیا۔ ”ایسا تو شاذ و نادر ہی ہوتا ہے، آٹھوں ستارے ایک ہی قطار میں ہیں! یہ تو پروردگار کے فضل و کرم کی علامت ہے! ستارے آپ کو ظفریاب کرنے کا وعدہ کر رہے ہیں! صرف آپ کو!..... تاخیر مناسب نہ ہوگی۔ کہیں دو تین دن بھی گزر گئے تو ان آٹھویں میں سے کچھ ستارے آسمان میں دوسری طرف چلے جائیں گے جہاں شاہ کا دشمن موجود ہے.....“

اور بابر نے اسی رات اپنے سپہ سالاروں کو طلب کر کے فوراً ”لڑائی کی تیاری کا حکم دے دیا۔ نجومی شہاب الدین شیبانی کے لئے بہت مفید ثابت ہوا۔ سرقد کا یہ مشہور فال گو پہلے خانہ ہی کے دربار سے وابستہ تھا۔ بعد میں جب خان کو پتا چلا کہ بابر اس کے ہاں سے بھاگ کھڑے ہونے والے شاعرینائی پر بہت زیادہ اعتماد کرنے لگا ہے تو اس نے شہاب الدین کو اپنے پڑاؤ سے ”فرار“ ہونے کا موقع دے دیا۔ اسے بری طرح زد و کوب کر کے لو لہان کر دیا گیا اور کپڑے پھاڑ ڈالے گئے کیونکہ سبھی کو معلوم تھا کہ اعتماد اور ہمدردی بابر کے کردار کی خصوصیات ہیں۔ اور ہوا بھی یہی۔ شیبانی خان کے اس جاسوس کو بابر نے اپنے معتبر درباریوں میں شامل کر لیا۔ تاروں بھری راتوں کو وہ دونوں آسمان کا غور سے جائزہ لیتے پھر شہاب الدین کی زبان قینچی کی طرح چلنے لگتی اور وہ بابر کی شاندار فتح کی پیش گوئی کرنے لگتا۔

خان نے درویش کے ذریعے اس نجومی کو حکم دیا تھا کہ وہ بابر کو اسی ہفتے کے دوران جنگ چھیڑنے پر ضرور راضی کر لے۔ اگلی ہی صبح کو اسے جواب بھی مل گیا تھا: عظیم خان کا حکم سر آنکھوں پر لیکن شرط یہ ہے کہ جلد ہی کسی رات خان کے دستے بابر کے پڑاؤ پر حملہ کریں۔ یہ تصادم حقیقی نہیں لیکن ایسا بہر حال ہونا چاہیے کہ اس سے نوجوان سپہ سالار بابر کے غرور کو ٹھیس لگ جائے۔

راتیں تیرہ و تار ہوتی تھیں، چاندنی سے یکسر خالی۔

ایسی ہی ایک رات کو بہت بڑی گھڑسوار فوج بابر کے پڑاؤ پر آندھی کی طرح ٹوٹ پڑی تھی۔ چیخ پکار سے معمور اس رات کو شیبانی خان نے آنکھوں میں کاٹ دیا اور صرف پچھلے پہری ایک آدھ گھنٹے کے لئے پلک جھپکائی۔ اجالا ہوتے ہی وہ ایک بار پھر گھوڑے پر سوار ہو گیا، بلندی پر اس کا خیمہ ایک بار پھر سب کو نظر آنے لگا۔ اس بلندی سے بابر کا پڑاؤ اور پڑاؤ کو جانے والے راستے صاف دکھائی دیتے تھے۔ تصادم سے کچھ قبل انہی راستوں میں سے ایک راستے سے تین چار سو مغل سپاہیوں کا ایک دستہ بابر کے پڑاؤ پر پہنچا تھا جسے تاشقند کے حکمران محمود خان نے اپنے بھانجے کی مدد کی لئے بھیجا تھا۔ شیبانی خان نے اسے دیکھ کر خدا کا شکر ادا کیا تھا کہ یہ شہر سبز والی فوج نہیں ہے۔ شیبانی خان کو اس دستے کو ڈیڑھ نہیں محسوس ہوا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ مغلوں کے مراسم اہل سمرقند سے خوشگوار نہیں ہیں نیز یہ کہ الگ الگ جگہوں سے بھرتی کئے گئے مغلوں میں بھی آپس میں پھوٹ پائی جاتی ہے۔

اس شبینہ تصادم کے بعد شیبانی خان اپنی تمام صلاحیتوں اور تجربات سے کام لیتے ہوئے دن رات جنگ کی تیاریوں میں مصروف رہنے لگا۔ دن کے وقت وہ ہونے والی جنگ کے میدان کے ہر نیلے اور ہر نشیب کا اس بات کو مد نظر رکھتے ہوئے کہ آفتاب کس سمت ہوگا، ہوا کا رخ کیا ہوگا، غور سے جائزہ لیتا تھا۔

اور جب شیبانی خان نے دیکھا کہ بابر اپنے لشکر کو اکٹھا کر رہا ہے، ہلائی پر چم لرا رہا ہے تو وہ خود جنگ کی ساری تیاریاں مکمل کر چکا تھا۔

خان جو اپنے پسندیدہ چٹکبرے خسی گھوڑے پر سوار تھا، اپنی فوج کی صفوں کا معائنہ کرنے لگا۔ ”میرے عقابو!“ اس کی آواز تلوار کی جیسی جھنکار کے ساتھ گونج اٹھی۔ ”ہمارا اور آپ کا خدا کے سوا اور کوئی بھی حامی و ناصر نہیں ہے۔ ہماری آباؤ اجداد کی سرزمین یہاں سے بہت دور ہے اور اگر دشمن نے ہمیں شکست دے دی تو وہاں واپس نہ پہنچ سکیں گے۔ ہمیں دشمن کو شکست دینی ہوگی! میں نے پروردگار سے بہت آس لگا رکھی ہے۔ ہمارا لشکر اسی کا لشکر ہے..... مجھے آج خواب

میں بشارت دی گئی ہے کہ فتح ہماری ہی ہوگی!“

”انشاء اللہ! اللہ قادر مطلق ہے!“ سینکڑوں لشکریوں کی آوازیں بیک وقت گونج اٹھیں۔

فوج قدم سے قدم ملاتی ہوئی تیزی کے ساتھ دشمن کی طرف بڑھنے لگی۔ وہ ایک جسم کی طرح کارروائی کر رہی تھی، تانت سے تتی ہوئی، وسطی حصے میں گول خم پیدا کرتی کمان کی یاد دلاری تھی۔ دریا بائیں جانب واقع تھا۔ شیبانی خان فوج کی پیش قدمی کو کچھ تو چھارکتے ہوئے مینہ کو میسرہ کی بہ نسبت تیزی سے آگے بڑھایا۔ اس جگہ میدان ڈھالو تھا اور ہوا سپاہیوں کی پیٹھ کی طرف سے چل رہی تھی۔ گھڑسوار دستے تیزی سے، بہت تیزی سے آگے بڑھ سکتے تھے۔ محاصرہ کر لینے کی چال ”تلغم“ کے لئے جسے شیبانی اپناتا چاہتا تھا، تیزی سے کارروائی کرنے کی ضرورت تھی۔ مینہ دراصل انتہائی دلیر سواروں والے صبار قار گھوڑوں ہی پر مشتمل تھا۔

بابر نے دشمن کی ”کمان“ کے دائیں نصف حصے کو جو اس کے لئے بایاں حصہ تھا، مڑتے ہوئے دیکھا تو آنے سامنے کے تصادم سے بچنے کے لئے اپنے میسرہ کو ہٹا کر اس طرح آگے بڑھایا کہ اس کی پیٹھ دریا کی جانب ہو گئی۔

خان کے دستے نزدیک آتے جا رہے تھے۔ خود خان اپنے منتخب محافظین اور علم برداروں کے ساتھ پہاڑی پر کھڑا ہوا تھا۔ کوئی ڈیڑھ میل کی دوری پر واقع ایسی ہی ایک پہاڑی پر بابر کھڑا ہوا تھا۔ اس کے عقب میں دریائے زرافشان آفتاب سحر کی شعاعوں سے جگمگا رہا تھا۔

شیبانی خان کے پاس گھڑسوار فوج زیادہ تھی جبکہ بابر کے لشکریوں کی اکثریت اونچی ڈھالوں، لمبے نیزوں اور لمبے دستوں والے تمبروں سے لیس پیادوں پر مشتمل تھی۔ گھوڑوں کو سرپٹ دوڑاتے ہوئے فوجیوں کے لئے ایسی ڈھالوں، نیزوں اور تمبروں کی دیوار کو توڑنا آسان نہ تھا لیکن تیز رفتاری کے باعث انہیں بہر حال برتری حاصل تھی۔ تلغم کا مطلب ہی تھا بازوؤں سے جکڑ لینا، سرسراتی ہوئی ٹکوار کی جیسی تیزی سے اچانک وار کرنا، تتی ہوئی کمان کی تانت سے نکلنے والے نکیلے تیر کی طرح دشمن کے قلب کے نسبتاً ”کم محفوظ مقامات پر ضرب لگانا۔

بابر کی پیدل فوج تک کا فاصلہ کوئی نصف میل رہ گیا تو محمود سلطان، جانی بیک سلطان اور تیمور سلطان نے شیبانی خان کے حکم پر اپنے گھڑسوار دستوں کو دشمن کی قلب اور میسرہ سے دور رکھتے ہوئے اچانک دائیں جانب، کچھ اور زیادہ دائیں جانب موڑ دیا۔ پھر تجربہ کار حمزہ سلطان اور ممدی سلطان نے بھی جو شیبانی کی ”کمان“ کے بائیں حصے میں مامور تھے، ایسی ہی کارروائی نسبتاً ”کم رفتار“ کے ساتھ کی۔ یہ دونوں اپنے گھڑسواروں کے ساتھ بابر کے لشکر کے وسطی حصے سے دور رہتے اور

میسرہ سے کتراتے ہوئے اس کے عقبی حصے کی طرف بڑھنے لگے۔

بابر نے اپنے لشکر کے سب سے زیادہ طاقتور دستوں کو قلب میں مامور کیا تھا لیکن اب ان میں سے کچھ دستوں کو بڑی غلٹ کے ساتھ مہنہ اور میسرہ کی طرف منتقل کرنے پر مجبور ہو گیا۔ تغمہ میں کمزور جنگیں بھی ہوتی تھیں۔ ”کمان“ کے دونوں نصف حصے ایک دوسرے سے کافی دور ہٹ سکتے تھے، اس کا قلب ٹوٹ سکتا تھا۔ تیزی سے حملہ کر کے قلب کو توڑا جاسکتا تھا جس کے بعد ”کمان“ کمان نہ رہ جاتی، اس کے صرف دو الگ الگ ٹکڑے ہی باقی بچتے۔ بابر کے لشکریوں نے آگے بڑھ کر شیبانی کی فوج کے کمزور پڑ جانے والے حصے پر وار کیا۔ اب سب کچھ محض تیزی سے کارروائی کرنے ہی پر منحصر تھا۔

خان سبقت لے گیا۔ بابر کے گھڑسوار دستے دشمن کا راستہ نہ دائیں طرف روک سکے اور نہ ہی بائیں طرف۔ محمود سلطان اور اس کے سوار گھوڑوں کو سرپٹ دوڑاتے ہوئے سپاہ بابر کے پیچھے پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ پھر حمزہ سلطان کے گھڑسوار بابر کی فوج کے دونوں بازوؤں سے کتر کر نکلے اور محمود سلطان کے گھڑسوار دستے سے جا ملے۔ پیچھے سے کئے جانے والے غیر متوقع حملوں کے باعث بابر کے لشکر کے عقبی حصے میں بھگدڑ مچ گئی۔ درمیانی حصے میں مامور پیدل فوج دشمن کے گھڑسوار دستوں کے دباؤ کی وجہ سے خود اپنے ہی گھڑسوار دستوں کو آگے ڈھکیلنے لگی۔

اتنے میں بابر نے خود اپنے گھڑسوار دستے کے چند سو بہترین سپاہیوں کو اکٹھا کر لیا۔ یہ دستہ آگ کی لپٹوں کی طرح افرا تفری کی جنگ سے تیزی کے ساتھ نکلا اور صحرا والوں کی فوج کے کمزور قلب کو چیرتا ہوا سیدھا اس پہاڑی کی طرف بڑھنے لگا جس کے اوپر شیبانی خان کھڑا ہوا تھا۔ ان چند سو گھڑسواروں کی یلغار بڑی تباہ کن تھی۔ کوپک بے کا اپنے گھڑسواروں کے ساتھ ان کے پیچھے لپکا لیکن لڑائی میں بھٹس گیا۔ کوپک بے دستہ جب تک بابر کے گھڑسواروں تک پہنچتا تب تک بابر کا ”کھنجر“ شیبانی خان کے چاروں طرف موجود سپاہیوں کو جکڑ کر تباہ و برباد کر سکتا تھا۔ پہاڑی پر کھلبلی مچ گئی۔ عبدالرحیم مارے خوف کے تھر تھر کانپنے لگا، اس نے اپنی پرسکون گھوڑی کی ایال تھام لی اور منت ساجت کرنے لگا:

”ہمارے حکمران، ہمارے مقدس امام، ہمیں پیچھے ہٹ کر ایسی جگہ پہنچ جانا چاہیے جو خطرات سے خالی ہو کیسے موقع ہاتھ سے نکل نہ جائے۔۔۔“

شیبانی کے چہرے پر مردنی چھا گئی۔ وہ خود بھی چاہتا تھا کہ کسی محفوظ جگہ کو چلا جائے لیکن پہاڑی پر تو اس کے علم لہرا رہے تھے۔ وہ نیچے اتر کر پیچھے ہٹ جاتا تو لشکر کو نہ خلیفہ نظر آتا نہ ہی اس کے

صورت میں سپاہیوں میں خوف و ہراس کی لہر دوڑ جاتی جو شکست کا پیش خیمہ ثابت ہوتی۔
 کرشیانی چیخ اٹھا:

”جان دے دیں گے لیکن پیچھے نہ ہٹیں گے!“

اور اس نے سودیر سپاہیوں پر مشتمل اپنے محافظ دستے کو بڑی بے رحمی کے ساتھ حکم دیا:
 ”تم سب جاؤ! ان لوگوں کو آگے بڑھنے سے روک دو، چاہے خود کام آجاؤ لیکن انہیں روک دو!“

تب خان کا آخری سہارا، محافظ دستہ جسے شکست ہونے کی صورت میں دیوار بن کر شیبانی کو بچا لیتا تھا، جو ابی حملے کے لئے آگے جھپٹا۔ ان میں سے بہت ہی کم سپاہی زندہ بچ سکے لیکن بابر کے ”ٹھکنے“ کی گرفت بہر حال ڈھیلی پڑ گئی، ختم ہو گئی۔ اس اثنا میں کوپک بے بھی وہاں پہنچ گیا جس کے چار سو گھڑسواروں نے بابر کے دستے کو گھیر لیا۔ لیکن بابر کے سب سے تیز اور بہادر کوئی بیس سپاہی کوپک بے کے محاصرے کو توڑنے میں کامیاب ہو گئے اور پہلی سمت جو ان کے سامنے تھی ادھر، اسی پہاڑی کی طرف جھپٹے جس پر شیبانی کھڑا ہوا تھا۔ یہ دیکھ کر خان کے پاس موجود سپاہیوں میں سے کچھ لوگ گھبرا کر پیچھے ڈھلان کی طرف بھاگے لیکن خود خان اپنی جگہ پر ڈٹا رہا۔ اس نے ایک تیر چلایا جو کسی کے لگا تو نہیں تاہم اس کے نتیجے میں کوپک بے کے سپاہیوں میں جوش و خروش پیدا ہو گیا، انہوں نے دور سے نعرہ بلند کیا اور بابر کے گھڑسواروں کا تعاقب کر کے ایک ایک کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

دوسری طرف جنگ کے خاص میدان کی افراط فری میں تلغہ کے فوائد نمایاں ہونے لگے۔ بابر کی پیدل فوج اس کے احکام کی تعمیل کرنے کے قابل نہ رہ گئی۔ تاشقند سے چند روز قبل ہی آئے ہوئے مغلوں نے بابر کو ہارتے دیکھا تو وہ ہلاک ہو جانے والوں کے خالی گھوڑوں کو مال غنیمت کے طور پر پکڑ پکڑ کر بھاگنے لگے۔ کچھ مغل گھڑسواروں نے تو لڑائی کے عام انتشار سے فائدہ اٹھا کر اپنے ہی دستے کے اندجانی اور سمرقندی سپاہیوں کو کاٹھیوں سے نیچے گرا کر شروع کر دیا تاکہ ان کے گھوڑوں پر ہاتھ صاف کر سکیں۔

اس دوران محمود سلطان کے اگلے دستے اس ٹیلے کے قریب پہنچتے جا رہے تھے جس پر بابر کھڑا ہوا تھا۔

آخر کار بابر اپنے محافظین کے حلقے میں ٹیلے کی ڈھلان کو طے کرتا ہوا دریا کی طرف اترنے لگا۔ شیبانی نے اس سپاہی کو دیکھا تاہم اس نے اپنے لشکریوں کو جاکر بابر سے متصادم ہونے کا حکم نہ دیا۔

ڈر گیا کہ دام میں نہ پھنس جائے۔ لیکن یہ کوئی دام نہ تھا۔ بابر نے اپنے گھوڑے کو دریا کے دھارے میں اتار دیا اور اس کے چند سو دیہ گھڑسوار حملہ آوروں کا راستہ روکنے کے لئے دیوار بن کر دریا کے کنارے کھڑے ہو گئے۔

شیبانی خان نے اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھادیئے:

”شکر، صد شکر، رب العالمین!“

پھر اس نے شدید استعجاب کی مفلوج کر دینے والی کیفیت سے جو بابر کو دریا میں اترتے دیکھ کر طاری ہو گئی تھی، خود کو نجات دلاتے ہوئے اپنے خیر کو حکم دیا:

”گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا ہوا جا اور میرے عقابوں سے کہہ دے کہ بابر کا سر لائے والے کو اسی سر کے وزن کے برابر سونا عطا کیا جائے گا!“

خبر نے گھوڑے کو ایڑھ لگائی ہی تھی کہ خان نے اسے روک دیا:

”نہیں نہیں، میرے عقابوں سے کہنا کہ بابر کو زندہ پکڑ لائیں۔ جو بھی یہ کارنامہ انجام دے گا اسے بابر کے قد جتنا اونچا سونے کا انبار عطا کیا جائے گا! جا، ہوا جا! میں بابر کو اپنے قدموں میں دیکھنا چاہتا ہوں، زندہ ہو یا مردہ!“

شیبانی خان نے ایک بار پھر اپنے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے اور بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ اسے اپنی پکوں پر نمی کا احساس ہوا، فتح کی مسرت سے آنسو نکل آئے تھے۔ اس نے زیر لب مسکراتے ہوئے اپنے ہاتھوں کو نیچے کیا اور ہتھیلیوں سے جلدی جلدی آنسو پونچھ لئے۔

۶

قیامت کی گرمی کا مہینہ سرطان ☆ ”بیت گیا، ماہ اسد“ ☆ شروع ہوا۔

فصیل شہر کے باہر یاغات میں درختوں کی شاخیں پھلوں کے بار سے مادر گیتی کی طرف جھکی جا رہی تھیں لیکن خود شہر کے اندر باغ اور انگور کے چمن کبھی کے صاف ہو چکے تھے۔

اور نہ ہی انگور کا کوئی گچھا، اہل سرقد کو بھوک کی ازیتیں جھیلتے ہوئے پانچ مہینے ہو چکے تھے۔ شہر کا محاصرہ روز بہ روز زیادہ سے زیادہ مضبوط، سخت اور بے رحم ہوتا جا رہا تھا۔ شہر کے تمام دروازے بند تھے اور شیبانی خان کا لشکر بہت قریب ہی، پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ نہ کوئی شہر سے باہر نکل سکتا تھا اور نہ ہی اندر داخل۔

بابر کا خیمہ الف بیک مدرسے کی کشادہ اور ہموار چھت کے اوپر لگا ہوا تھا۔ وہاں سے شہر کی فصیل، اس کے دروازے اور قرب و جوار کے علاقے صاف نظر آرہے تھے۔ اتفاقاً ”بابر کی نگاہیں بھوک

سے بے حال شہریوں پر جم کر رہ گئیں اور اس نے سوچا: اے قادر مطلق، کیا زمانہ ہے کہ لوگ کنگنیوں کے نیچے گھونسلے بنانے والی فاختاؤں تک کو پکڑنے کی کوشش کر رہے ہیں! ویسے چڑیاں بھی اب چوکس رہنے لگی تھیں، جس شہر کی گلیوں میں روٹی کے ٹکڑے یا جھوٹے نہ پڑی ہو وہاں پرندوں کے لئے پیٹ بھرنا کچھ آسان توڑی تھا۔ پرندے تو اڑ کر فیصل کو پار کر سکتے تھے لیکن انسان؟ کوئی شخص بلی تک کو پکڑنے میں کامیاب ہو جاتا تھا تو فوراً ”ہی جھکڑے کی نوبت آجاتی تھی“ لوگ ایسے خوش بختوں سے ان کے شکار کو چھین لینے کی کوشش کرنے لگتے تھے۔

مدرسے کے عقب میں بہت بڑا اصطبل واقع تھا جہاں کبھی سینکڑوں شاہی گھوڑے بندھے رہتے تھے لیکن اب ان میں سے بس دس ہی باقی بچے تھے۔ بہت سے گھوڑے سربل کے نزدیک ہونے والی لڑائی میں کام آگئے تھے اور ان سے بھی زیادہ شدید غذائی قلت کی نذر ہو گئے تھے کیونکہ محل میں رہنے والوں کے لئے گھوڑے ہی ذبح کئے جاتے تھے۔ ان دس گھوڑوں کے لئے بھی دانہ کوئی مہینے بھر سے میسر نہ تھا۔ پہلے یہ گھاس کھایا کرتے تھے جو اب عنقا ہو چکی تھی۔ اب تو گھوڑوں اور اونٹوں کو درختوں کی بتیاں اور اندرونی گیلی چھال کھلائی جا رہی تھی۔

بابر نے مدرسے کی چھت پر سے دیکھا کہ اصطبل کے احاطے میں طاہر اور زرد موچھوں والا محمد اس قسم کا ”چارا“ تیار کرنے میں مصروف ہیں۔ اس نے سوچا کہ طاہر بھی کتنا بہادر جوان ہے۔ اس نے سربل کی لڑائی میں بہت ہی دلیر سپاہیوں سے بھی زیادہ شجاعت کا مظاہرہ کیا تھا اور ان گھڑسواروں میں شامل تھا جنہوں نے لڑائی کے آخر میں اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر بابر کو دریائے زرافشان کو پار کرنے کا موقع فراہم کیا تھا۔ بابر نے طاہر کی شادی کا قصہ ابھی حال ہی میں سنا تھا۔ طاہر کی بیوی رابعہ کو جسے وہ اتنی زیادہ پریشانیاں جھیلنے کے بعد تلاش کر سکا تھا، اس خیال سے بابر کی والدہ قلوغ نگار خاںم کے ہاں کینہ کی حیثیت سے رکھ دیا گیا تھا کہ بچاری کہیں حکمرانی کا شکار نہ ہو جائے۔

محمد بھی بابر کا سپاہی بن گیا تھا۔ گزشتہ ہفتے وہ باغوں کے پھلوں سے پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے نابدان میں گھس کر شہر سے باہر نکل گیا تھا لیکن شیبانی خان کے سپاہیوں نے جو گھات میں رہتے تھے، اسے پکڑ لیا تھا۔ اس کے خود کو بھوکا کارگیر بنانے پر سپاہیوں نے رحم کھایا تھا لیکن ”سبق“ سکھانے کے طور پر اس کا ایک کان کاٹ لیا تھا۔ اب کوئی نہیں جانتا تھا کہ قسمت کب اس کا ساتھ دے گی کب نہیں۔ کوپک بے کے سپاہیوں نے شہر سے باہر نکلنے کی جرات کرنے والے دوسرے افراد کی تو ناک ہی کاٹ لی تھی۔

مداب ٹوپی اس طرح پہنتا تھا کہ اس سے کان ڈھک جاتے تھے۔ کبھی کبھی وہ خود کو تسلی دینے کے لئے کہا کرتا تھا:

”کانوں کو کم از کم چھپانا تو ممکن ہے لیکن ناک نہ ہوتی تو میں کیسے چھپاتا؟“

اودہ خدا، بابر نے سوچا، خود میں نے اپنے ساتھ مہینوں کے محاصرے کے دوران مد جیسے سیدھے سادے سرقدیوں پر کیسے کیسے مصائب ڈھائے تھے! بابر اس بڑھیا کو جو کتابوں کے بازار میں ملی تھی، بھول نہیں سکا تھا۔ اس کے بیٹے کا پیٹ کھلی کھالینے کے باعث پھول گیا تھا، پجارہ مر گیا تھا اور خود بڑھیا اس مدے سے پاگل ہو گئی تھی۔ اس وقت بابر کے کانوں میں اس بڑھیا کے الفاظ بدلہ لینے والی قسمت کی سنائی ہوئی سزا کی طرح گونجنے لگے: ”خدا تم کو بھی ایسے ہی دن دکھائے!“

بھوک کے منخوس سائے دھیرے دھیرے غریبوں کے جھونپڑوں سے سپاہیوں اور بیگلوں کی رہائش گاہوں تک پہنچے تھے اور اب شاہی محل پر بھی منڈلانے لگے تھے۔ بارے گزشتہ دس دنوں سے روٹی دیکھی تک نہیں تھی۔ آٹا ختم ہو چکا تھا۔ صبح کو اس کے آگے طلائی رکابیوں میں کشمش اور شربت رکھ دیئے جاتے تھے اور شام کو اونٹ کے شوربے دار سخت اور خشک گوشت کا ایک پیالہ۔ روٹی ہی نہ ہو تو شاندار طلائی برتن کس کام کے؟ شعور کی گہرائیوں سے سونے کی جھوٹی ضرورت کے بارے میں تلخ مصرعے ابھرنے لگے لیکن بابر کو فکر خن کی فرصت کہاں تھی۔

چھ مہینوں کی فخرالسا زور زور سے روتے روتے بے ہوش ہو جایا کرتی تھی۔ عانشہ بیگم کے جو سوکھ کر کاٹنا ہو گئی تھی، دودھ بننا بند ہو گیا تھا۔ بچی کے لئے ایک دودھ پلائی کا انتظام کیا گیا جس نے آفت ہی و عادی۔ وہ عورت پیسے سے متاثر خاندان کی تھی اور فخرالسا دوسری دنوں میں چل بسی۔

بابر بچی کی کھنائی ہوئی میت کو خود اپنے ہاتھوں پر اٹھائے ہوئے قبر تک لے گیا۔ وہ انگلبار تھی اور دل ہی دل میں سوچ رہا تھا: ”کاش ہیضہ میری جان بھی لے لے تاکہ تمام مصائب سے فوراً ہی نجات پا جاؤں!“ اسی اذیت وہ آرزو کے ساتھ اس نے بچی کے سرد ہونٹوں کو چوم لیا۔ اس کے فخر اور فتح کی علامت فخرالسا کو سپرد خاک کیا جانے لگا تو بابر کو بڑی شدت کے ساتھ ایسا محسوس ہوا گویا کہ اس کی زندگی کے ایک جزو کو اس کی اولین فتوحات کے فخر کو دفن کیا جا رہا ہو۔

غم و آلام جیسے جنے زیر محاصرہ شہر کا گلا دوپتے جارہے تھے ویسے ویسے دشمن کی مسرتوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ سرقد پانچ مہینوں سے منتظر تھا کہ ہرات سے بابر کے چچا، طاقتور حکمران حسین یقرا اور تاشقند سے اس کے ماموں محمود خان کمک بھیج دیں گے۔ بابر نے ان دونوں کو منت ساجت بھرے خطوط ارسال کئے تھے لیکن کوئی نتیجہ نہیں برآمد ہوا تھا۔ اب اسے خود اپنے اوپر

بھروسا کرنا تھا۔ مکمل نہ آئی تھی۔ اور نہ ہی آنے کی کوئی امید تھی۔ اس حقیقت سے شیبانی خان بھی بخوبی واقف ہو چکا تھا۔ وہ راتوں کو فنادوں اور قربانوں کے شور سے اہل سرقت کو بیدار کرتا تھا۔ اس کے ڈھونڈورچی فیصل کے قریب بلند جگہوں پر چڑھ کر شہریوں سے کہتے تھے کہ وہ آکر خان سے مل جائیں۔ انہیں پیٹ بھر کھانا کھلانے کا اور بیگوں اور سپاہیوں کو اچھی اچھی نوکریوں کا لالچ دیتے تھے۔ اور بہت سے بیگ باہر کا ساتھ چھوڑنے بھی لگے تھے۔ وہ چوری چھپے فیصل سے پھاند کر یا تابانوں میں گھس کر شہر سے باہر نکل جاتے تھے۔

ایک دن تو باہر کے محافظ دستے کا سردار بھی چوری چھپے بھاگ کھڑا ہوا۔ اب وہ کس پر اعتبار کر سکتا تھا؟۔۔۔ باہر نے ایک بار رات کو طاہر کو اپنے پاس بلایا۔

”طاہر بیگ! گورامیر مقبرے پر عربی میں یہ عبارت درج ہے: ”اس سے پہلے کہ دنیا تجھ سے منہ موڑے، تو خدا دنیا کو چھوڑ کر چل دے۔“ ایسا کرنے کا وقت آگیا ہے۔۔۔ کاش پیٹنے نے میری جان لے لی ہوتی اور سب کو مصائب سے نجات مل جاتی۔ لیکن پیٹنے نے مجھے جھوٹا تک نہیں۔۔۔“

”خدا آپ کو زندہ و سلامت رکھے! عالی جاہ! ہماری واحد امید، واحد سہارا آپ ہی تو ہیں!“ طاہر ایسا لاغر ہو گیا تھا کہ لگتا تھا شانوں کی ہڈیاں چونے کو چیر کر باہر نکل آئیں گی۔ چہرے پر زخم کا داغ سوچ گیا تھا، آنکھیں اندر دھنس گئی تھیں لیکن ان کی چمک اب بھی باقی تھی۔

”سہارا! اب سہارا کہاں رہ گیا، طاہر بیگ! کل میں نے ایک بیت کہی تھی:

نہ کر ملامت جو فکر دنیا میں باہر الجھا رہا ہے، اے دل
یہ سوچ دنیا میں اور تکلیف کے سوا کیا بچا ہے، اے دل

طاہر نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا:

”محترم حکمران! یہ بالکل سچ ہے، آج ہماری زندگی میں مصائب اور تکالیف کے سوا اور کچھ بھی نہیں لیکن مہینے میں پندرہ تاریخ راتیں ہوتی ہیں تو پندرہ چاندنی راتیں۔ ابھی ہمارے ہاتھ طاقتور ہیں اور کمرے تلوار لٹک رہی ہے۔۔۔“

”تو پھر کیا کرنا چاہئے؟“

دونوں نے ایک دوسرے سے آنکھیں چار کیں، بادشاہ نے سپاہی سے اور سورما نے سورما سے۔

پھر باہر نے دونوں کی طرف سے کہا:

”ہمیں آخری حربے کو آزمانا چاہئے۔۔۔ ساری طاقت کو یکجا کر کے کسی مناسب موقع پر محاصرے کو توڑ کر نکل بھاگنے کی کوشش کرنی چاہئے اگر ہماری زندگی کی آخری گھڑی نہیں آئی ہے تو

کامیابی ہمارے قدم چومے گی اور اگر آخری گھڑی آن پہنچی ہے تو ہاتھوں میں تلوار تھامے ہوئے
جان دے دیں گے!۔۔۔“

”انشاء اللہ ہم محاصرے کو توڑ کر نکل جائیں گے، بادشاہ سلامت!“

”ہمارے اس خفیہ منصوبے کا ابھی تک صرف قاسم بیک ہی کو علم ہے۔ تم بھی اسے راز ہی
رکھنا۔۔۔ تیاری کرو، دوستو، تیاری!“

طاہر نے اسی رات قاسم بیک سے ملاقات کی۔ دونوں نے فحیل کے اوپر سے کافی دیر تک
شیبانی خان کے پڑاؤ کی روشنیوں کا غور سے جائزہ لیا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ دشمن کی زیادہ تر فوج
فیروزہ اور چارہا دروازدوں کے سامنے والے علاقے میں موجود ہے اور شیخ زادہ دروازے کے
سامنے روشنیاں منتشر اور کم ہیں۔ سپاہیوں اور تیز رفتار گھوڑوں کو اکٹھا کر کے تیار کی جانی چاہئے
تھی۔۔۔

۷

لیکن بابر کی قسمت میں تلوار ہاتھ میں لئے ہوئے اپنی کشتوں کے پتے پر گر کر جان دینا نہیں لکھا
تھا۔ محاصرے کو توڑ کر نکل جانے کی تیاریاں زوروں پر تھیں تو ایک روز اس کی ماں اور نانی کسی
اطلاع کے بغیر اچانک اس کی خلوت گاہ میں آگئیں۔ ان دونوں کے پیچھے پیچھے قاسم بیک بھی گھبرایا
ہوا اندر داخل ہوا۔

”میرے نواسے، میرے حکمران، ایساں دولت بیگم کی کمر گزشتہ مہینوں میں بری طرح جھک گئی
تھی اور بابر کو لگا جیسے اس کی یہ آواز کہیں نیچے سے آرہی ہو،“ شیبانی خان نے صلح کی پیش کش کی
ہے!“

بابر کو لفظ ”صلح“ نجات دہندہ سا لگا لیکن فوراً ہی اسے خیال آیا: بھلا شیبانی خان بھی نجات
دہندہ اور امن حامی ہو سکتا ہے؟ اس نے یقین نہ کرنے کے انداز میں پہلے نانی اور پھر ماں کی طرف
دیکھا۔ قتلوغ نگار خانم لگتا تھا کہ دیر تک آنسو بہاتی رہی تھی، چہرہ تصویر غم بنا ہوا تھا لیکن ایساں
دولت بیگم اپنے ہاتھوں میں گول لپٹا ہوا کاغذ لئے ہوئے تھی جس پر بندھی ہوئی ڈوری کا سنہرا پھندنا
لٹک رہا تھا۔

”یہ رہا خان کا خط، نانی نے اپنے ہاتھ کے کاغذ کو کچھ عجیب سی نگاہوں سے دیکھا۔

خان کا خط آخر ایساں دولت بیگم کے پاس کیسے پہنچا؟ بابر نے پوچھا:

”اے لایا کون؟“

”ایک قابل احترام درویش۔ ایک نقش بندی بزرگ جو خواجہ سخی مرحوم کے مریدوں میں سے ہیں۔“

بابر نے ماں کی طرف دیکھا:

”آپ کو دیا تھا؟“

”نہیں“ قتلوغ نگار خانم نے اداسی سے نفی میں سر ہلایا۔

ایمان دولت بیگم نے خط بابر کی طرف بڑھایا اور ہچکچاتے ہوئے اعتراف کیا:

”یہ خط تو خان زادہ بیگم کے نام ہے۔“

”عجیب بات ہے!“ بابر نے گول لپٹا ہوا کاغذ کو احتیاط کے ساتھ لے لیا اور اسے کھولے بغیر ہی قدرے برہمی سے دیکھنے لگا۔

”میں جو کچھ کہنا چاہتی ہوں اسے کہنے میں سخت دشواری محسوس ہو رہی ہے“ ایمان دولت بیگم پل بھر کے لئے خاموش ہو گئی۔ ”لیکن کہنا ضروری ہے۔۔۔ شیبانی خان نے ہماری خان زادہ بیگم کی خوبصورتی کی بڑی تعریفیں کی ہیں۔ پتا چلا کہ خان تو ان کی یاد میں ترپتا رہتا ہے۔ اس کے متعلق اپنے خط میں اس نے کچھ شعر بھی لکھ بھیجے ہیں۔“

شیبانی خان کی عمر پچاس سے تجاوز کر چکی تھی، اس کے بیٹوں کی شادیاں جانے کب کی ہو چکی تھیں اور ب تودہ پوتوں پوتیوں والا بھی تھا۔ بابر نے خط کو کھولا تو اس کی نگاہ اس شعر پر پڑی:

کیا ہے تو نے جادو، یاد میں جان نکلی جاتی ہے

مچا ہے دل میں طوفاں، آتش الفت جلاتی ہے

اور اس نے خط کو قالین پر پھینک دیا۔

”کیا آپ بھول گئیں کہ خان نے گزشتہ سال ایسی ہی وایات سے مرزا سلطان علی کی والدہ زہود بیگم کو کس طرح ہرکایا تھا؟ شیبانی کے پیغام پر آخر کیسے یقین کیا جاسکتا ہے؟“

قتلوغ نگار خانم نے گہری ٹھنڈی سانس لی لیکن ایمان دولت بیگم نے واضح سکون و اطمینان کے ساتھ کہا:

”کوئی اور وقت ہوتا تو ہم بھی دشمن کے ایسے خط پر تھوک دیتے، اسے پڑھتے تک نہیں لیکن اس وقت تو سب کے سروں پر موت، منڈلا رہی ہے۔ مجھ بڑھیا کا کیا، میں تو اپنی زندگی کاٹ چکی ہوں، اپنے جھے کا دانہ پانی کھا پانی چکی ہوں۔ اب میں اس فانی دنیا سے پانچ دن پہلے اٹھ جاتی ہوں یا بعد، اس سے فرق ہی کیا پڑتا ہے۔ لیکن آپ نوجوان افراد، آپ میرے حکمران، میری دختر کے تحت

جگر، میری آنکھوں کے نور....“

بابر نے کبھی پر سکون اور کبھی غصے سے بھرے سخت لہجے میں مخالفت کی لیکن ایساں دوست بیگم اپنی بات پر اڑی رہی، کہتی رہی کہ نوجوان افراد کے یہاں خود کو مت کے منہ میں جھونک دینے کا کوئی تک نہیں نیز یہ کہ خان زادہ بیگم جو سب سے زیادہ قیمتی و نیک ہے، سب کچھ جھگڑائی ہے، راضی ہو گئی ہے۔

”مجھے یقین نہیں ہے! میری ہمشیرہ عزیزہ جو حسن و دلربائی کا پیکر ہیں کسی گندے اور اجڑے صحرائی کے حرم میں پہنچ جائیں!... نہیں، ہرگز نہیں! یہ بڑی شرمناک بات ہے۔ ایسا کبھی بھی نہ ہوگا!“ باہر چیخ اٹھا۔

اچانک قاسم بیگم نے کہا:

”عالی جاہ، ہم حاصرہ توڑنے جا رہے ہیں، اسی میں کامیاب ہوں گے... یا کام آجائیں گے۔ لیکن سر قند پر توشیبانی خان کا قبضہ ہو ہی جائے گا۔ تب تو بونو کچھ وہ چاہتا ہے، زبردستی لرلے گا۔“ قتلوغ نگار خانم جو ابھی تک خود کو بہ دقت قابو میں رکھے ہوئے تھی، بابر کی سوالیہ نگاہ کے جواب میں پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی:

”آپ لوگ آخر جائیں گے کہاں؟ سیدھے موت کے منہ میں؟ پروردگار، بہتر ہو کہ مجھے اس صدمے کو دیکھنے سے پہلے ہی اٹھا لے! خان زادہ بیگم میری پہلی، میری عزیز اولاد ہیں، میرے دل کی رازدار ہیں، مجھے بیوگی کے احساس تنہائی میں تسلی دیتی رہتی ہیں! ان کے بغیر میں کیسے جی سکوں گی؟ خدا یا؟! اپنی عزیز دختر کو دشمن کے پنجے میں کیسے دے سکوں گی؟!“

اس کے بعد دیر تک ایساں دولت بیگم دلیلیں پیش کرتی رہیں، قتلوغ نگار خانم روتی رہیں اور وفادار قاسم بیگم طرح طرح کے اندیشوں سے پریشان ہوتا رہا۔

”بس بہت ہو چکا“ آخر کار بابر نے کہا۔ ”میں خود خان زادہ بیگم سے بات کرنا چاہتا ہوں!“ وہ بے صبری اور بے قراری کے ساتھ بہن کا انتظار کرنے لگا اور آخر کار جب وہ آئی تو بابر نے اس کے چہرے کے تاثرات سے فوراً ہی بھانپ لیا کہ وہ کوئی غمین فیصلہ کر چکی ہے...

اس نے خان زادہ بیگم کو اپنے سامنے بٹھایا اور بڑے غور سے اس کے چہرے کو نکتے لگا۔ رخسار چمک گئے تھے، لبوں پر پڑمردگی چھا چکی تھی لیکن پہلے ہی جتنی خوب صورت بڑی بڑی آنکھیں چمک رہی تھیں، یہ آنکھیں عزم و استقلال کی آئینہ دار تھیں۔

”اپا جان، شیبانی خان نے شادی کی جو تجویز پیش کی ہے اسے آپ نے منظور کر لیا کیا؟ ثانی جان،

نے مجھے جو کچھ بتایا ہے وہ سچ ہے کیا؟“
 ”منظور نہ کرتی تو اور کیا کرتی؟“

”میں جانتا ہوں، جانتا ہوں... میری شکست نے آپ سب کو بری طرح مایوس کر دیا ہے۔ لیکن آپ کا بھائی ابھی زندہ ہے۔ میں ہتھیار ڈالنے کا قید ہو جانے کا قطعاً ارادہ نہیں رکھتا اور آدمی کی موت بس ایک ہی بار آتی ہے، اس سے بچنے کا سوال ہی نہیں اٹھتا... اگر ہم محاصرے کو توڑنے میں کامیاب ہو گئے اور زندہ رہے تو آپ کو یہاں سے لے جانے کے لئے واپس آئیں گے لیکن اگر میری زندگی میں محض چند ہی دن باقی رہ گئے ہیں تو تلوار ہاتھ میں تھامے ہوئے جان دے دوں گا... تب آپ اس تجویز کو قبول کر سکتی ہیں... تب کوئی نہ کہے گا:

”زادہ ری بابر کی شجاعت، جان بچانے کی فکر میں اپنی بہن کو قربان کر دیا۔“ اس قسم کی بدنامی سے میرے نزدیک موت بہتر ہے!... آپ اس تجویز کو قبول نہ کیجئے، آپا جان!“

خان زادہ بیگم کی آنکھیں دھندلی پڑ گئیں، ان میں آنسو بھر آئے۔ وہ جانتی تھی کہ بابر اپنی ساری دلیری کے باوجود محاصرے کو توڑنے میں کامیاب نہ ہو سکے گا کیونکہ اس کی فوجی طاقت اس کام کے لئے بہت ہی ناکافی تھی۔ خود بابر بھی اس حقیقت سے واقف تھا اور اس کا عزم صرف مرثیے ہی کا عزم تھا۔ اسی بناء پر تو وہ خان زادہ بیگم سے زہر پہن کر محاصرہ توڑنے کی کوشش کرنے والے دستے میں شامل ہونے کو نہیں کہہ رہا تھا... وہ اپنے شجاع اور نیک دل بھائی کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتی تھی اور اسی لئے اس نے خود کو دشمن کے حوالے کر کے اپنے بھائی کو موت سے بچانے کا فیصلہ کیا تھا۔

لیکن جو کچھ اس کے ذہن میں تھا اس کا صاف گوئی کے ساتھ بھائی سے اظہار کرنا ممکن بھی تھا؟ خان زادہ بیگم نے سوچا: اگر بابر کو معلوم ہو جائے گا کہ ان کے لڑتے ہوئے جان دے دینے اور اس طرح اپنی تمام نجی ذمہ داریوں کے بارے سے نجات حاصل کر لینے کے فیصلے کو جس کا اعتراف ان کا نیک دل کبھی بھی نہیں کر سکتا، میں نے بھانپ لیا ہے تو وہ مجھے اپنی قربانی پیش کرنے سے باز رکھنے میں کوئی بھی کسر اٹھانہ رکھیں گے۔ اس صورت میں تو سب کا اپنی جانوں سے ہاتھ دھونا یقین ہو جائے گا اور اگر خدا انخواستہ وہ ہلاک ہو گئے تو پھر میرے لئے خنجر یا زہر کے سوا اور رہ ہی کیا جائے گا۔

”بابر جان، آپ میری خاطر ناوقت موت کو دعوت نہ دیجئے۔ یہی کافی ہے کہ میری وجہ سے آپ کو احمد تہل کی گھٹیا سازشوں کو جھیلنا پڑا۔“ خان زادہ بیگم نے تھیلی سے آنسو پونچھ لئے اور ذرا

جلدی جلدی، جوش و خروش کے ساتھ کہنے لگی: ”مجھے آپ کے شاندار مستقبل پر پورا اعتماد ہے،
برادر عزیز۔ کوئی دوسرا تو نہیں جانتا لیکن میں بخوبی جانتی ہوں کہ آپ جیسے باصلاحیت افراد شاز
و نادر ہی دنیا میں پیدا ہوتے ہیں۔ اپنا خیال رکھئے، عظیم کارناموں کی خاطر، عظیم شاعری کی خاطر!
اپنے مقدر کا بد قسمت بہن کے مقدر سے موازنہ نہ کیجئے!“

”آپ یہ کیوں کہہ رہی ہیں، ہمشیرہ محترمہ؟ ہم سب مہمان ہیں... سب“ بابر پل بھر کے لئے
خاموش ہو گیا، ”اس بے وفا“ اس بدلتی ہوئی دنیا میں صرف چند دنوں کے مہمان ہیں! اور آپ کو اور
مجھے ایک ہی ماں نے پیدا کیا ہے۔“

”لیکن میں لڑکی بن کر پیدا ہوئی تھی!... اور پھر میں پچیس برس کی ہو چکنے کے باوجود آج بھی
کنواری ہی ہوں۔ جس سے محبت کرتی ہوں اس کے ساتھ زندگی بسر کرنا میری قسمت میں نہیں۔
میرنی ساری امیدیں خاک میں مل چکی ہیں۔ میرے لئے کوئی بھی بات باعث مسرت نہیں۔ آخر
میں بن بیاہی بڑھیا کی طرح آپ کے ساتھ کب تک رہ سکتی ہوں، حکمران؟ بہت ہو چکا، مجھے بھی تو
عورت کی زندگی کو آزمانا چاہئے۔“

”واقعی... کیا آپ واقعی سمجھتی ہیں کہ آپ کے لئے اس پوتوں پوتیوں والے بوڑھے کی زوجہ
بن کر رہنا ممکن ہو سکے گا؟“

”ارے بابر جان، میں تلاش کرتے کرتے مایوس ہو چکی ہوں۔ بوڑھا ہو یا جوان، اب میرے
لئے اس سے فرق ہی کیا پڑتا ہے۔“

”اور آپ نے اوش میں مجھ سے جو کچھ کہا تھا وہ بھی یاد ہے؟“ اپنے دل پر یقین کیجئے!“ کیا اپنے
آپ کو، اپنے دل کو بھی فریب دیا جاسکتا ہے؟ کیا دل ان تمام مصائب کو فراموش کر سکتا ہے جو اس
بے رحم اور چال باز شیبانی خان کے ہاتھوں ہمیں جھیلنے پڑے ہیں؟ کیا اس کینٹکی اور مکاری کو
فراموش کیا جاسکتا ہے جو خان نے زہرہ بیگم کے ساتھ کی تھی؟!“

خان زادہ بیگم زور زور سے سسکیاں بھرنے لگی۔ بابر نے اپنی بات جاری رکھی:

”ہم ایک ہی ماں کے بطن سے پیدا ہوئے تھے اور ہمارے مقدر بھی ایک ہی جیسے ہونے
چاہئیں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ ہم نے رات کو محاصرہ توڑ کر نکل بھاگنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔
آپ ہمارے ساتھ چلنے کی تیاری کیجئے۔ شاید ہم کامیاب ہی ہو جائیں۔“

”آہ، کتنی شدید خواہش پیدا ہوئی خان زادہ بیگم کے دل میں کہ وہ ایک بار پھر مردا۔ نے کپڑے
زیب تن کرے، خود اور ہلکی زرہ پہنے اور اپنے بھائی کے ساتھ نکل کھڑی ہو۔ اس نے سوچا کہ

بوڑھے عیاش کے حرم میں ترپتے رہنے کی یہ نسبت لڑتے ہوئے جان دے دینا کیا واقعی بہتر نہ ہوگا؟ اس نے اس شدید خواہش سے اچانک مغلوب ہو کر پوچھا:

”کب، کب چلنا ہے؟“

”آج رات کو!“ بابر نے پرسکون لیکن پر عزم لہجے میں جواب دیا۔

”دفتنا“ خان زادہ بیگم کا دل اس اندیشے سے کہ آج رات ہی اس کا بھائی ہلاک کر دیا جائے گا، آج رات ہی اس کی شاعری، اس کی گفتگو اور ان سب سے اس کی محبت کا سلسلہ ختم ہو جائے گا، لرزہ اٹھا اور وہ چیخ پڑی:

”آج نہیں! نہیں! نہیں!“

بابر اٹھ کھڑا ہوا۔

”ہشیرہ محترمہ، اگر آپ اپنے بھائی کے کفن پر عمل کرنے کو تیار نہیں تو پھر اپنے بادشاہ کے حکم کی تعمیل کیجئے! آپ کو ہمارے ساتھ چلنا ہوگا! ابھی کافی دقت ہے، اپنے کمرے میں جا کر تیاری کیجئے۔“

خان زادہ بیگم گدے سے اٹھی، خاموشی کے ساتھ بابر کے پاس مٹی اور اس کے سینے سے اپنا چہرہ سٹا دیا اور اس طرح وہ بھائی سے رخصت ہوئی۔

نصف شب کو بابر، قلوغ نگار خانم، قاسم بیگ، عائشہ بیگم، طاہر اور اس کی بیوی رابعہ شیخ دروازے کے پاس پہنچے۔ قلوغ نگار خانم، عائشہ بیگم اور بعض دوسری خواتین ایک گاڑی پر جس میں سب سے تیز رفتار گھوڑے بٹتے ہوئے تھے، سوار ہو گئیں اور اسے دستے کے وسطی حصے میں کر دیا گیا۔ خان زادہ بیگم نہ گاڑی کے اندر تھیں اور نہ ہی گھڑ سوار سپاہی کے درمیان۔

خان زادہ بیگم کو دریافت کیا گیا تو پتا چلا کہ وہ تو ان لوگوں کے اس جگہ اکٹھا ہونے سے کوئی گھنٹہ بھر قبل ہی اپنی ثانی ایسان دولت بیگم کے ساتھ چار راہ دروازے کی طرف جا چکی ہے جو فصیل کے مخالف سمت والے حصے میں واقع تھا۔ اب کیسے جا کر قلوغ نگار خانم نے مسلسل روتے ہوئے ذرا اونچی آواز سے بابر کو بتایا کہ اس نے خان زادہ بیگم کو کتنا سمجھایا تھا کہ وہ ایسا نہ کرے جب کہ ایسان دولت بیگم اس کے برعکس نواسی سے اصرار کرتی رہی تھی کہ وہ اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنائے۔

بابر سپاہیوں کی طرف مڑا اور اس کی نگاہوں نے طاہر کو تلاش کر لیا:

”فورا چار راہ دروازے پر جاؤ اور خان زادہ بیگم کو تلاش کر کے میرا حکم سنا دو وہ فوراً ایساں

آہائیں! کہہ دینا کہ جب تک وہ نہ آئیں گی ہم کہیں نہ جائیں گے!“
 ”میرے فرماں روا...“ قاسم بیگ نے کہنا شروع کیا لیکن بابر نے اس کی بات نہ سنتے ہوئے چیخ کر حکم دیا:

”طاہر! فوراً گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتے ہوئے جاؤ!“

طاہر کا گھوڑا ہوا سے باتیں کرتا ہوا شہر کو پار کرنے لگا اور اس کے سموں کی ضربوں سے سڑکوں پر جڑے ہوئے پتھروں سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔ وہ چار راہداروں پر پہنچا تو اس نے ایک بچی سجائی شاندار گاڑی کو جس پر خان زادہ بیگم سوار تھی، مشعل بردار گھڑسواروں کے حلقے میں خندق پر گرا دیئے جانے والے پل کو پار کرتے دیکھا۔

کئی مہینوں کے اس محاصرے سے خود شیبانی خان کا لشکر بھی اوب چکا تھا۔ وہاں بھی بھی کو بے چینی کے ساتھ امن بحال ہونے کا انتظار کرنا تھا اور زیادہ تر لشکریوں کو معلوم تھا کہ بابر کی بہن خان کی بیگم بننے پر راضی ہو جائے گی تو فوراً ہی جنگ بندی کا معاہدہ ہو جائے گا۔ شیبانی بھی جانتا تھا کہ اس بار وہ اس طرح نہ پیش آئے گا جس طرح زہرہ بیگم کے ساتھ پیش آیا تھا نیز یہ کہ اس بار گھوڑا گاڑی میں بالکل ہی مختلف قسم کی عورت اس کے پاس آرہی ہے۔ خون کی ندیاں بہانے سے یہ کہیں بہتر تھا کہ ماورائے نہر کے ساتھ ہی ساتھ ایک عصمت و عفت والی عورت بھی ہاتھ آجائے اور امن بھی جس کا عرصے سے انتظار تھا... اس کے علاوہ اس نے یہ بھی سن رکھا تھا کہ خان زادہ بیگم صحیح معنوں میں پری پیکر ہے۔

شیبانی نے حکم دیا اور حسینہ کے اعزاز میں جو امن کا پیام لے کر آرہی تھی، سارا ماحول نقاروں اور قرناؤں کی آوازوں سے گونجنے لگا۔ شیبانی کے بے شمار لشکریوں نے خان زادہ بیگم کا بہت ہی شاندار دھنک سے استقبال کیا۔

طاہر نے اس نظارے کو پہلے شہر کے کھلے ہوئے دروازے سے دیکھا اور پھر تفصیل کے اوپر سے۔ اس کے بعد وہ دوبارہ گھوڑے پر سوار ہوا اور پورے شہر کو پار کر کے شیخ زادہ دروازے پر واپس لوٹا۔

شیبانی کے پڑاؤ پر منائی جانے والی خوشیوں کا شور یہاں بھی سنائی دے رہا تھا۔ اس واقعے سے بابر کو صرف مایوسی ہی نہ ہوئی بلکہ اس کے دل کو گہری ٹھیس بھی لگی۔ ایک لمحے کے لئے تو اسے یہ بھی یقین ہو گیا کہ خان زادہ بیگم بڑھاپے تک کنواری بیٹھی رہنے کے اندیشے سے اور بھائی کی مسلسل ناکامیوں سے عاجز آکر خود اپنی مرضی سے شیبانی خان کے پاس چلی گئی ہے۔ آرام دہ اور

شاید پر مسرت زندگی گزارنے کی خاطر۔

”دنیا میں وفاداری وجود ہی نہیں رکھتی“ بابر نے بڑی تلخی کے ساتھ چپکے سے اپنے آپ سے کہا اور گھوڑے کو موڑ کر حکم دیا: ”دروازہ کھولو!“

دروازہ بہت احتیاط کے ساتھ کھولا گیا اور اس کے سامنے کی خندق پر شب کی تاریکی میں اٹھا ہوا پل کو دھیرے سے گرا دیا گیا۔ گھرسواروں، پیدل سپاہیوں اور ان کے درمیان چلتی ہوئی گھوڑا گاڑی نے خندق کو پار کر لیا۔ چاروں طرف خطرہ منڈلا رہا تھا، لگتا تھا جیسے موت ہر درخت کی آڑ میں گھات لگائے بیٹھی ہو۔ لیکن قاسم بیگ تو پہلے ہی خان کے گشتی دستوں کا بہت غور کے ساتھ جائزہ لے چکا تھا۔ وہ اس دستے کو ناہموار راستے سے گزھوں اور نالوں کو پار کرتا ہوا، گاڑی کو تقریباً ہاتھوں پر اٹھواتا ہوا آگے بڑھانے لگا، پر خطر علاقے سے باہر نکالنے لگا۔

جانے کوئی معجزہ رونما ہوا جیسا کہ جاہل لوگ بعد میں کہنے لگے تھے یا پھر علمائے سرقت نے شیبانی خان سے اپنی خفیہ بات چیت میں ایسا ن دولت بیگم کی طرف سے یہ شرط رکھی تھی کہ خان زادہ بیگم کے بدلے میں بابر کو نکل جانے کا موقع دینا ہوگا اور چالاک خان نے اپنی گشتی دستوں کو خفیہ حکم دے دیا تھا کہ بابر کو چلے جانے دیں، کوئی رکاوٹ نہ پیدا کریں۔ کچھ بھی ہوا ہو، بابر کا یہ دستہ صحیح سلامت محاصرے سے باہر نکل گیا۔

خان زادہ بیگم نے درد و غم سے بھری ہوئی زندگی کو اپنا لیا تھا تاکہ بھائی اور والدہ کو ذلت آمیز اسیری سے بچا سکے۔ یہ بات بابر کو نہیں معلوم تھی لیکن قتلوغ نگار خانم جانتی تھی اور شیبانی خان کی لشکر گاہ میں فتح اور شادی کے جشن کا اعلان کرتی ہوئی قرناؤں کی آوازیں جیسے جیسے بلند ہوتی گئیں، نقاروں کا شور جیسے جیسے بڑھتا گیا ویسے ویسے قتلوغ نگار خانم کی آنکھوں سے بتے ہوئے غم کے آنسوؤں میں تیزی آتی گئی۔

تاشقند اور ایتھیا اور اسفرہ

تاشقند... یہ وہ شہر تھا جسے پندرہ برسوں سے جنگ و جدل کی آفتوں سے کوئی سابقہ نہیں پڑا تھا۔ شہر کے بارہ کے بارہ دروازے کھلے رہتے تھے، جس کا جب جی چاہتا آرام سے یہاں آسکتا تھا، باہر جاسکتا تھا۔

خزاں کا، خوبصورت اور پرسکون خزاں کا موسم تھا۔ پوز سوار اور سالار نالوں کے کنارے کنارے

لگے ہوئے باغات ابھی گرم گرم سی بارشوں سے نمائے ہوئے تھے۔ خوبانی اور آلوچے کے درختوں کی پتیاں اپنی شاخوں کو خیر یاد کرنے سے قبل ارغوانی ہو چکی تھیں۔ دوریوں پر واقع چشمال پہاڑوں کی برف پوش چوٹیوں کا نظارہ آنکھوں کو فرحت بخش رہا تھا۔

تاشقند کی پہلوں کی افراط والی خزاں، یہاں کی دھرتی کی فیاضی، وادیوں کے خوبصورت مناظر اور کوساروں سے آتی ہوئی ہواؤں کی نرمی نے بابر کو اس کے آغاز شباب کے ایام کی یاد دلادی وہ یہاں پہلی بار سولہ سال کی عمر میں آیا تھا، حدرا کے نشیب میں پیر عکاشہ جیشے سے پانی پیا تھا اور اوچتی محلے کے نامی استادوں سے کمان، تیر اور تانت بنوائے تھے۔ انہی دنوں وہ اپنے نانا یونس خان کے مزار پر بھی گیا تھا جو شیخان ظہور میں دفن کئے گئے تھے۔

بابر کو لگا جیسے وہ پرسکون ایام کیس بہت پیچھے چھوٹ گئے ہوں۔ اس کے کپڑے غبار آلود تھے، جسم تھکن سے چور تھا، دل میں درد تھا جو اب مسئلہ ”کاننے کی طرح چھتا رہتا تھا اور ہم رکاب تھے صرف چالیس بیک اور سپاہی (باتیوں کو اس نے اورا تپا میں یہ کہہ کر چھوڑ دیا تھا کہ وہیں اس کا انتظار کریں) اس حالت میں وہ بیش آغاچ دروازے سے شہر میں داخل ہوا اور قارا تاش محلے سے گزرتے ہوئے اپنے ماموں محمود خان کے محل کی راہ لی۔ ماموں بھانجے ایک دوسرے سے کوئی خاص محبت نہیں کرتے تھے پھر بھی گزشتہ بار جب بابر تاشقند آیا تھا تو خان نے داروغہ کو حکم دیا تھا کہ وہ شہر کے دروازے پر بابر کا خیر مقدم کرے۔

آج قاسم بیک نے جھلاہٹ اور تشویش کے ساتھ اسے بتایا کہ داروغہ نہیں آیا۔
بابر بڑی تنخی کے ساتھ مسکرایا:

”محترم قاسم بیک، اس بار تو ہم اپنا سب کچھ کھو کر بھیک مانگنے والے فقیر کی طرح آئے ہیں! کسی خاص عزت و احترام اور مہمان نوازی کی توقع نہ رکھئے۔“

اور واقعی محل میں بھی محمود خان نے بابر کا استقبال بڑی سرد مری کے ساتھ کیا۔ اس کے سپاہیوں کے محل میں نہ داخل ہونے دیا گیا۔ قاسم بیک کچھ اور بھی زیادہ ادا اس ہو گیا۔ بابر نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا:

”سرمقہ میں ہم لوگ یقینی موت کی تیاری کر چکے تھے، طے کر لیا تھا کہ موت ہی تمام مصائب سے نجات دلانے والی ہے۔ اس وقت کے خوف کے مقابلے میں ٹھیس پہنچانے والی ان چھوٹی چھوٹی باتوں کی اہمیت ہی کیا، ان سے ہمارا وقار مجروح کیوں ہو؟ یہ تو بہت ہی معمولی باتیں ہیں، میرے دوست۔ کل راستے میں ایک بیت میرے ذہن میں آئی تھی، سنئے:

تو پریشاں نہ ہو دھوکے کی حکومت کے لئے
خود کو یوں رسوا نہ کر شک بھری عزت کے لئے
”بجا فرمایا آپ نے، عالی جاہ۔ یہ فانی دنیا اس لائق نہیں کہ ہمیں اس کا غم ہو۔“

خان کے دیوان خانے میں بابر کو انتظار کرنا پڑا۔ زری کے چونے میں ملبوس فریہ اندام میں بریار
نے اس سے بڑے تکبر کے ساتھ کہا:

”شاہ معظم، اعلیٰ حضرت محمود خان اس وقت غازی خلیفہ اعلیٰ حضرت شیبانی خان کے سفیر سے
گفتگو فرما رہے ہیں۔“ بابر گھبرا اٹھا: سر قند کو گنوا بیٹھنے کے بعد اور اتپا میں اپنی خالہ کے ہاں دو
مینے کے قیام کے دوران اس نے جو افواہیں سنی تھیں وہ واقعی سچ ہیں کیا؟ وہاں اسے معلوم ہوا تھا
کہ شیبانی خان نے اس کے ماموں کے پاس ایک سفیر قیمتی تحائف اور ماورالنہر کو آپس میں تقسیم
کر لینے کی تجویز کے ساتھ روانہ کیا ہے۔ وہ وادی فرغانہ محمود خان کے حوالے کر کے بدلے میں اور
اتپا لیتا چاہتا تھا۔ اس افواہ کے سچ نکلنے کا مطلب یہ ہوتا کہ بابر کے پاس رہنی کے لئے کوئی جگہ نہ
رہ جاتی، اسے ماورالنہر کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دینا پڑتا۔

اور بابر یہ آس لگائے بیٹھا تھا کہ محمود خان کو شیبانی خان کی اقتدار کی بے رحمانہ ہوس کا یقین
دلانے کا اسے اس غیر خاندان کے حملہ آور کے خلاف متحدہ جدوجہد پر آمادہ کرے گا!۔۔۔

آخر کار میر یار کو خان نے (ماموں نے!) حکم دیا کہ بابر کو اس کمرے میں بھیج دیا جائے جہاں
شیبانی کا سفیر ابھی تک بیٹھا ہوا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی بابر کی نظر طویل قامت اور نحیم خیم جانی
بیگ سلطان پر پڑی جو شطرنج کی چوکی کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ چست کپڑوں میں ملبوس، سلیقے سے
تراشی ہوئی داڑھی موٹھوں والا محمود خان اطمینان کے ساتھ مسکرا رہا تھا اور جانی بیگ مایوسی اور
اداسی کے ساتھ سر ہلا رہا تھا: تاشقند کے حکمران نے بازی جیت لی تھی۔ بابر کا چہرہ اس احساس سے
کچھ اور زیادہ تھمتا اٹھا کہ اسے محمود خان کا بھانجا ہونے کے باوجود دیوان خانے میں اتنی دیر تک
انتظار کرنا پڑا۔ دونوں کی ملاقات چار برسوں سے نہیں ہوئی تھی، بابر اپنی مصیبت اور ذلت کی گھڑی
میں اپنے قریبی عزیز کے ہاں آیا تھا اور وہ عزیز اس وقت دشمن کے قاصد کے ساتھ شطرنج کھیل رہا
تھا! جو کچھ ہو رہا تھا اس کا خفیہ منہ موم بابر پر واضح ہو گیا اور واضح کیوں نہ ہوتا؟ ”اعلیٰ حضرت“ محمود
خان نے سفیر کو دکھا دیا کہ وہ فاتح کو، ”اعلیٰ حضرت“ شیبانی خان کو اپنے گئے لیکن بد بخت بھانجے کی بہ
نسبت کہیں زیادہ قابل احترام تصور کرتا ہے۔

بابر پر یہ سب واضح ہو گیا لیکن اس نے خود پر قابو پالیا اور ایسا ظاہر کیا جیسے اس نے اپنے لئے

کوئی توہین آمیز طرز عمل دیکھا ہی نہ ہو۔ سفیر کی طرف اس نے یوں نظر ڈالی جیسے خالی جگہ کو دیکھ رہا ہو۔

”اعلا حضرت خان، محترم مامون جان! میں آپ کو تانا و تندرست دیکھ کر دلی مسرت محسوس کر رہا ہوں۔ خدا کرے کہ آپ کی صحت و سلامتی پر آپ کے دشمنوں کی چال بازیوں سے ذرا بھی آنچ نہ آئے!“

بابر خاموش ہو گیا اور جانی بیگ سلطان کے چلے جانے کا انتظار کرنے لگا۔ محمود خان سفیر کے سلسلے میں مخصوص اعزاز و احترام کر مظاہرہ کرتے ہوئے اسے رخصت کرنے کے لئے دروازے کے پاس تک گیا۔ اس کے بعد اس نے بابر کو اپنے دائیں طرف زری کے گدے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”خوش آمدید، مرزا!... اپنے موجودہ نامساعد حالات کو اپنے اوپر حاوی نہ ہونے دیجئے۔ آپ پر یہ جو برا وقت پڑا ہے یہ تو گزر رہی جائے گا۔ آپ ابھی نوجوان ہیں، میرے عزیز بھانجے، آپ کے باغ حیات کے دس پھولوں میں سے ابھی تو ایک بھی نہیں کھلا ہے۔“

”محترم مامون جان، میرے باغ حیات کے بہت سے پھول کھلنے سے پہلے ہی مرجھا گئے۔ میرا ایک بازو تو احمد تہل کی بھڑکائی ہوئی آگ میں جل گیا اور دوسرے کو شیبانی نے جھلس دیا۔ خدا نخواستہ کیس آپ بھی ان دونوں تباہ کن آتش زدگیوں میں نہ پھنس جائیں۔“

محمود خان نے اس بات کو اپنے ہی ڈھنگ سے سمجھا:

”آپ کا خیال بالکل درست ہے، بیک وقت دو بادشاہوں سے دشمنی مول لینا خطرناک ہوتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہم نے تہل کا نہیں، شیبانی کے سفیر کا خیر مقدم کیا۔“

”لیکن شیبانی تو آپ کے لئے تہل کی بہ نسبت سو گنا خطرناک ہے! تہل تو معمولی درندہ ہے۔ وہ وادی فرغانہ کو دانتوں میں دبا کر لے بھاگا ہے اور اتنے ہی پرست خوش ہے۔ لیکن شیبانی تو سارے ماوراء النہر کا شکار کرنا چاہتا ہے۔ یہی نہیں، وہ تو خراسان اور پورے ایران کو بھی ہڑپ کر جانے کے لئے بے تاب ہے۔ آپ نے اس کے خطابات ”امام زمان، خلیفہ رحمان“ پر توجہ نہیں مبذول کی؟ وہ خود کو سکندر ثانی کہلوانا بھی بہت پسند کرتا ہے اور سکندر ذوالقرنین کی طرح ساری دنیا پر اپنے تسلط کے خواب دیکھ رہا ہے۔ وہ سارے مسلمانوں کے دلوں پر بھی اپنی حکمرانی چاہتا ہے، کیوں نہ چاہے، خلیفہ اور مذہبی رہنما جو ٹھہرا!“

تاشقند کا حکمران اپنے بھانجے کے جوش و خروش سے بھی متاثر ہوا اور دلائل کی معقولیت سے بھی لیکن اس نے اس بات کو ظاہر نہ ہونے دیا، صرف ایسا تاثر دیا جیسے خیالوں میں ڈوب گیا ہو۔۔۔

خان کو شیبانی کے سفیر کی کمی ہوئی باتیں یاد آ گئیں۔

”ہم تو سمجھتے ہیں کہ شیبانی خان ہمارے اوپر حملہ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ بہت سی باتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ اس نے حصار پر دانت لگا رکھے ہیں جس کے بعد خراسان و ایران کی باری ہے۔“

”محترم حکمران، عزیز ماموں جان، شیبانی کے سفیر کی چکنی چڑی باتوں کا مقصد صرف یہ ہے کہ آپ اپنی احتیاط اور جو کسی کو بالائے طاق رکھ دیں! ذرا تاریخ پر نظر ڈالئے، ذرا سوچئے تو سہی، کون حملہ آور ایسا تھا جس نے تاشقند اور فرغانہ پر قبضہ کئے بغیر خراسان و ایران کا رخ کیا ہو؟ چنگیز خان؟ جی نہیں! امیر تیمور؟ جی نہیں! پہلے سمرقند، تاشقند اور اند جان پر قبضہ کیا گیا اور اس کے بعد ہی کہیں جا کر خراسان اور ایران پر حملہ کئے گئے۔ کیا واقعی شیبانی اتنی سی بات کو بھی نہیں سمجھتا؟“

دراصل شیبانی خان کے تاشقند پر حملے کے امکانات سے محمود خان بھی خائف تھا۔ یہی سبب تھا کہ اس نے اپنے چھوٹے بھائی الاچہ خان کو جو اس وقت کول پار کے علاقے پر حکمرانی کر رہا تھا، اپنے پاس بلا لیا تھا۔ الاچہ خان اپنے پندرہ ہزار سپاہیوں پر مشتمل لشکر کے ساتھ راستے میں تھا اور مینے بھر میں تاشقند پہنچنے والا تھا۔ دونوں بھائیوں کی اس سانٹھ گانٹھ کی شیبانی خان کو یقیناً بھک لگ گئی تھی۔ یہی سبب تھا کہ اس نے اپنے سفیر کو تاشقند بھیجا تھا اور جیسا کہ صاف ظاہر تھا، ابھی وہ پر امن طریقوں سے کام نکالنے کا کوشاں تھا۔ محمود خان بخوبی جانتا تھا کہ شیبانی سپہ سالار کی حیثیت سے زبردست مہارت و صلاحیت کا حامل ہے اور وہ شیبانی سے جنگ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس وقت اس نے اپنے بھانجے کی باتوں کے پس منظر میں سوچا کہ بابر جنگ کو ناگزیر تصور کر رہا ہے تو آخر کیوں؟ کہیں اس لئے تو نہیں کہ شیبانی اسے شکست دے چکا ہے اور بابر اس سے بدلہ لینا چاہتا ہے؟

اس نے بھانجے کے ارادوں کو بہتر طور پر سمجھنے کے لئے دریافت کیا:

”خیر ٹھیک ہے، مرزا، مانے لیتے ہیں کہ شیبانی خان یقیناً ہم پر حملہ کرے گا۔ تو اب ہمیں کیا کرنا چاہئے؟“

”ہم سب کو جو شیبانی کے ان ناپاک منصوبوں کے مخالف ہیں، باہمی معاہدہ کر لینا چاہئے! اس لئے تاکہ اسے ایک ہی دار سے مار بھگائیں!“

محمود خان نے اپنی بھوری بھوری عیار آنکھیں جائزہ لینے کے انداز میں بابر پر جمادیں:

”تو پھر ہمیں آپ کے ساتھ معاہدہ کر لینا چاہئے کیا؟“

”صرف مجھی سے نہیں بلکہ الاچہ خان ماموں جان سے بھی!“

”اس طرح میں اپنی فوج کو الاچہ خان کی فوج سے ملا دوں گا تو ہمارے پاس تیس ہزار سپاہی ہو جائیں گے پھر آپ کی فوج کو بھی شامل کر لیں گے تب۔ تب کہتے سپاہی ہو جائیں گے؟“

بابر کے پاس اب صرف دھائی سو فوجی باقی رہ گئے تھے اور یہ بات محمود خان کو معلوم تھی۔ اسی لئے اس نے اپنے بھانجے کے جنگ چھیڑنے کے جوش کو ٹھنڈا کرنے اور اس پر یہ واضح کر دینے کا فیصلہ کیا تھا کہ بڑے بڑے خانوں کے درمیان بابر کی حیثیت کیا ہے۔

ماموں کا یہ طنز کارگر ثابت ہوا اور بابر کے چہرے پر ایک بار پھر سرخی چھا گئی لیکن بابر نے اپنی خودداری کو مجروح نہ ہونے دیا۔

”محترم حکمران! بدبختی نے مجھے مصائب سے ہمکنار کر دیا ہے لیکن یہ نہ فراموش کیجئے کہ شکست کا ذہر پینے سے قبل میں فتح کا ثمرت بھی پی چکا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے بڑی صاف دلی کے ساتھ آپ سے معاہدے کی تجویز پیش کرنے کی جرات کی ہے۔“

”یہ صاف دلی یقیناً اچھی بات ہے۔ اچھا یہ بتائیے، عزیز بھانجے کہ اگر آپ کو شیبانی خان سے ایک بار پھر کشتی لڑنے کا موقع مل جائے تو کیا لڑیں گے؟“

محمود خان کے اس سوال کا مقصد بابر کو آزمانا بھی تھا اور اس کمادت کے بموجب اس کا مذاق اڑانا بھی کہ ”کشتی میں ہارنے والا ہی ہمیشہ لڑنے کو تیار رہتا ہے۔“

”میں اس سے دوبارہ طاقت آزمائی کرنا چاہتا ہوں تو اس کی ایک وجہ بھی ہے“ بابر نے عزم کے ساتھ جواب دیا۔ ”اور جہاں تک کشتی کا سوال ہے... تو کہتے ہیں ناکہ کسی نے ایک بار تمہیں چت کر دیا تو دوسری بار تم بھی اسے چت کر سکتے ہو۔“

”درست، بالکل درست!“ محمود خان نے مطمئن ہو کر کہا۔

پھر خان نے دل ہی دل میں سوچا: ”بابر کو ہم اپنے تیس ہزار فوجیوں کا سپہ سالار بنادیں تو کیسا رہے؟ اس کے تجربات کی بدولت شیبانی خان کے خلاف جنگ میں ہمیں یقیناً فتح حاصل ہوگی لیکن یہ بھی توجہ ہے کہ اگر بابر نے شیبانی خان کو شکست دے دی تو بعد میں لوگ میری نہیں بلکہ بابر ہی کی تعریف کے پل باندھیں گے اور تب بابر کیا تاشقند پر بھی قابض ہونے کی کوشش نہ کرے گا؟ کوں نہیں جانتا کہ جس کے ہاتھوں میں فوج ہوتی ہے اسی کو شہرت حاصل ہوتی ہے اور جسے شہرت حاصل ہوتی ہے وہی صاحب اقتدار بھی ہوتا ہے۔“

اور یہ سب سوچ کر محمود خان نے بابر کو اپنا سپہ سالار بنانے کا خیال دل سے نکال دیا۔

”آہ ہماری بد قسمت خان زادہ بیگم... کتنی مصیبت کے دن آگئے ان کے لئے!“ محمود خان نے

مفتنگو کا رخ خاندانی مسائل کی طرف موڑ دیا۔ ”یہ شیبانی خان بھی کیسا لومڑی جیسا چالاک ہے، ہے نا، میرے عزیز بھانجے؟ خان زادہ بیگم والدہ کی طرف سے ہمارے خاندان سے اور والد کی طرف سے تیموری خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ شیبانی خان جانتا تھا کہ وہ خان زادہ بیگم سے باقاعدہ شادی کر لے گا تو کتنے زیادہ افراد اس کے رشتے دار بن جائیں گے... سنا ہے کہ اس نے سارے رسم و رواج کے مطابق شادی اور سمرقند میں بڑی شاندار ضیافت کی۔“

بابر وضاحت کرنا چاہتا تھا کہ یہ واقعہ کیسے پیش آیا تھا لیکن محمود خان نے جو بابر کو خاک بھی اہمیت نہیں دینا چاہتا تھا، اس پر فوراً ہی دوسری سخت چوٹ کی:

”بڑی شرمناک بات ہوئی، ہم سب کی ناک کٹ گئی!“

پھر محمود خان اپنے اس طنز کے اثر کو کم کرنے کے ارادے سے یقین دلانے لگا کہ بابر، اس کی والدہ اور کمزور ہو جانے والی بیوی عائشہ (یہ دونوں کچھ پہلے ہی تاشقند پہنچ چکی تھیں)

”ہمارے بہت عزیز مہمان“ ہیں کہ ان سب کو اتنی مصیبتیں جھیلنے کے بعد اب آرام کرنا چاہئے اور دل بسلانے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ کل شیبانی خان کے سفیر کی دعوت ہے، آپ بھی آئیے گا، عزیز بھانجے...

بابر کی کوئی بھی دلیل کارگر نہ ہوئی۔ صاف ظاہر تھا کہ محمود خان شیبانی سے ڈرتا ہے، اس کی خوشامد کرتا اور ”خلیفہ رحمان“ کی ہاں میں ہاں ملا کر اس کے بدلے میں امن حاصل کرنا چاہتا ہے۔ ماموں جان ٹھوکر کھائیں گے!... تاشقند میں ان دونوں امن کی فضا دراصل تباہ کن طوفان سے قبل کے سنائے کی جیسی تھی۔ والدہ اور شریک زندگی کو اس ماحول سے دور نکال کر لے جانا ضروری تھا۔ دور لیکن کہاں؟

۲

عائشہ بیگم کو تاشقند میں رہتے ہوئے دو مہینے بیت چکے تھے۔ وہ اپنی بچی کے انتقال کے صدمے اور سمرقند کے محاصرے کے دوران تکالیف جھیلنے کے باعث سخت علیل ہو گئی تھی۔ عائشہ کی بہن رضیہ سلطان نے جو محمود خان کی چینی بیگم تھی، اسے محل میں رکھ لیا تھا۔ ممتاز طبیبوں نے بہترین دواؤں سے اس کا علاج کیا تھا اور آخر کار وہ پوری طرح صحت یاب ہو گئی تھی۔

رضیہ سلطان کے ان احسانات کا شکریہ ادا کرنے کے لئے بابر اپنی بیگم سے ملاقات کرنے سے قبل ہی اس کے پاس گیا۔ بات چیت کے دوران اس نے رضیہ سلطان کو بتایا کہ وہ عائشہ کو اور اتنا پیسا لے جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ رضیہ نے اپنی کالی کالی سرخ آنکھوں کو یوں مٹکاتے ہوئے گویا اپنے

لقب ”قارا کو زینگم“ کو موزوں ثابت کر رہی ہو، ہاتھ ہلا کر کہا:
 ”ارے نہیں، مرزا، عائشہ بیگم بے شمار تکالیف اٹھا چکی ہیں۔ اب ہمیں انہیں کہیں سرحد کی
 طرف نہ جانے دیں گے۔“

”لیکن محترمہ بیگم صاحبہ، ہماری قسمت میں یہی لکھا ہے تو ہم کر ہی کیا سکتے ہیں؟“
 ”معاف کیجئے گا، ہر شخص کی قسمت تو اس کی پیشانی پر لکھی ہوتی ہے۔“
 ”پھر بھی ایک ہی کشتی پر سوار افراد کی قسمت بھی ایک ہی ہوتی ہے۔ کیا یہ درست نہیں؟“
 ”یہ ”ایک سی قسمت“ کی بات بھی خوب رہی... میری بد نصیب بہن جانے کتنی تکالیف جھیل
 چکی ہیں... اور یہ ”ایک سی قسمت“ انہیں آپ کی عطا کی ہوئی ہے۔ یہ کافی نہیں ہے کیا؟ وہ شدید
 غذائی قلت کے شکار سمرقند سے ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر لوٹی تھیں۔ صحت سنبھلتے ہی دوبارہ مصائب
 جھیلیں، آخر اس کی کیا تک ہے؟“
 باہر اپنی خودداری کو نہیں پہچانے والے طنزیہ جملے سننے کو تیار ہو کر آیا تھا لیکن محمود خان کے
 کچھ دیر قبل کے طنز آمیز اشاروں کے بعد اب اس کی سالی بھی پرتپاک شائستگی سے اچانک جلی کٹی
 سنانے پر اتر آئی تو وہ قابو میں نہ رہ سکا۔

”بیگم صاحب، صاف صاف فرمائیے نا، آپ اپنی ہمشیرہ کو مجھ سے طلاق دلوانا چاہتی ہیں کیا؟“
 ”میں نے یہ کب کہا! لیکن... میرا خیال ہے کہ اب آپ کو بھی مصائب کو دعوت نہ دینی چاہئے،
 مرزا۔ آپ ہمارے ہاں تاشقند میں قیام کیجئے۔ مستقل طور پر امن و آرام کے ساتھ۔“
 ”یعنی یہ کہ طفیلی بن کر رہو، طفیلی جیسا طرز عمل اپناؤ اور اپنی اوقات کو نہ بھولو،“ باہر نے سوچا۔
 ”اس عنایت کا بہت بہت شکریہ! لیکن مہربانی کر کے مجھے اپنی اور اپنی بیگم کی کفالت خود ہی کرنے
 دیجئے۔“

بعد میں باہر نے عائشہ بیگم سے تنہائی میں شکایت کی:
 ”کہتے ہیں کہ چوغے کا مالک بہتر طور پر جانتا ہے کہ اسے کہاں رکھنا چاہئے۔ رضیہ سلطان بیگم
 ظاہر ہے کہ ہمارے متعلق ہم سے زیادہ نہیں جانتیں اور بہتر ہوتا کہ وہ ہماری زندگی میں دخل
 اندازی نہ کرتیں۔“

”اپنی ساری تکالیف کا تذکرہ تو ان سے میں نے کیا تھا، مرزا۔“
 ”تو زن دشوہر کے اپنے کوئی راز نہیں ہوتے کیا؟“
 عائشہ بیگم کا وہ پہلے والا شرمیلا پن کافور ہو چکا تھا۔ اس نے رضیہ ہی کی طرح غیر متوقع تندی

سے جواب دیا:

”مجھے بھلا سکی بہن سے کیا چھپانا! اس کا کوئی سبب بھی نہیں!“

بابر کو یاد آگیا کہ پہلے اس کی بیگم اسے مخاطب کرتے وقت کیسے پر محبت اور پرستائش انداز سے کہا کرتی تھی: ”میرے عظیم شاہ۔“ اب وہ بھی محمود خان ہی کی طرح فخر آمیز خوش خلقی سے اس صرف ”مرزا“ کہہ رہی تھی۔ وقت کتنی تیزی سے گزر گیا تھا لوگ کتنی تیزی سے بدل گئے تھے!

”اچھا تو آپ بہن کو زیادہ اہمیت دیتی ہیں کہ خاوند کو؟“

بابر کوئی جھجھتا ہوا مذاق کرنا چاہتا تھا لیکن اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔

”ارے مرزا، میں نے تو آپ سے شادی کی ہے!“

”یہ بات ہے تو..... میں آپ کو یہاں سے لے جا رہا ہوں۔ سفر کی تیاریاں کیجئے۔“

عائشہ بیگم اچانک بھناٹھی:

”تو کیا پھر اور اتنا جانے کی ٹھانی ہے؟ وہاں کے راستے کا تصور کر کے ہی میری جان لرزا ٹھتی ہے۔ اس طرح آئے دن در بدر مارے مارے پھرنے سے میری صحت جواب دے چکی ہے۔ آپ اس بات سے واقف ہیں، میرے سر تاج۔ واقف ہیں پھر بھی من مانی کئے جا رہے ہیں! کاش میں توانا و تندرست رہتے ہوئے سر قد میں زندگی گزار سکتی، کاش یہ در بدری اور بھاگ دوڑ کی پریشانیاں نہ جھیلنی پڑتیں..... ایسا ہوتا تو میری لاڈلی بیٹی مجھے داغ مفارقت نہ دے جاتی۔ آج وہ سال بھر کی ہو گئی ہوتی، پاؤں پاؤں چلتی ہوتی!“

ماں کا غم مستقل اور مقدس ہوتا ہے۔ لیکن عائشہ بیگم جھوٹ بول رہی تھی۔ بابر کے تصور میں بچی سے جدائی کے وہ بھیانک لمحات ابھر آئے اور اس نے موت کی سرد سرد سانسون کے لمس کو اپنے چہرے پر محسوس کیا۔ اس نے سوچا کہ کیا وہ بحث کرے، ثابت کر دے کہ عائشہ جھوٹ بول رہی ہے؟

”موت تو لا علاج ہوتی ہے، بیگم“ بابر نے سخت لہجے میں کہا۔ ”انسان موت کی گرفت میں آنے سے پہلے نہ جانے کتنی ہی بار مسرتوں سے ہم کنار ہوتا ہے اور کتنی ہی بار غموں سے۔ ہم ابھی نوجوان ہیں لیکن مسرت اور غم دونوں سے ہمارا سابقہ پڑ چکا ہے۔“ پھر اس کے لہجے میں نرمی پیدا ہو گئی: ”ہم اپنے درخشاں مستقبل کو دیکھنے تک زندہ رہیں گے، بیگم، دیکھ لیجئے گا، ضرور زندہ رہیں گے اور خدا ہمیں بچے بھی عطا کرے گا..... لیکن مصیبت کی اس گھڑی میں ہمیں ایک دوسرے سے جدا نہ ہونا چاہئے۔ آپ ہمارے ساتھ چلیے، التجا کر رہا ہوں.....“

”میں آپ کے ساتھ ساتھ بھٹکتی رہی ہوں، آج یہاں تو کل وہاں لیکن فائدہ کیا ہوا؟ کیا ان دنوں آپ کو میرا خیال بھی آتا تھا، میری طرف بھی متوجہ ہوتے تھے، میرے مرزا؟ نہیں! آپ تو سلطنت کی، حملوں اور جنگ ہی کی فکروں میں الجھے رہتے تھے۔ آپ تو مینوں تک نہ مجھ سے ملاقات کرتے اور نہ ہی میری یاد میں تڑپتے تھے..... جہاں تک میرا تعلق ہے تو میں نے آپ کی خاطر کیا کچھ نہیں جھٹلایا..... شاید میں آپ کے لائق ہی نہیں ہوں! لیکن ایسی بیوی کس کام کی جس کا شوہر اس سے محبت نہ کرتا ہو؟“

اے خدائے کریم و رحیم! بار نے سوچا، بجا فرمایا ہے تو نے کہ ”سورتمیں اپنے لباسوں کی فکروں اور فضول بحثوں میں الجھتی ہوئی بڑی ہوتی ہیں.....۔“ بے شک میں نے اپنی بیگم کا خیال نہیں رکھا لیکن عائشہ نے بھی کیا کبھی میری فکروں سے کوئی واسطہ رکھا ہے؟ وہ جانتی بھی تھیں کہ میری فکریں کیا ہیں؟ شاید اس وقت بھی میں ان کو یہاں سے لے جانے کی جو کوشش کر رہا ہوں اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ میں ان سے بہت زیادہ محبت کرتا ہوں اور ان کے بغیر جی نہ سکوں گا۔ پھر بھی بیوی کا شوہر سے دور رہنا اچھا لگتا ہے کیا؟

بار نے دل ہی دل میں ایک اور دلیل یہ دی کہ عائشہ بیگم کو ایک ایسے شہر میں جس پر اسے اپنے جانی دشمن شیبانی کے جلد ہی قابض ہو جانے کا پورا یقین تھا، چھوڑ کر چل دینا بڑی گھٹیا حرکت ہوگی۔

”ہماری قسمت بڑی بے رحم ثابت ہوئی ہے۔ ہم خان زادہ بیگم کی حفاظت نہ کر سکے۔ ان کی قربانی میرے تڑپتے ہوئے ضمیر پر ہمیشہ بار رہے گی، بیگم..... مجھے آپ کو آنے والی مصیبت سے، شیبانی سے دور لے جانا ہی ہوگا!“

”میرے لئے تو سب سے زیادہ امن و سکون کی جگہ تاشقند ہے۔“

”یہ امن و سکون چند روزہ ہے، بیگم، چند روزہ! یقین مانئے، شیبانی یہاں بھی آدھکے گا!“

”میں اپنی بہن کے سائے میں ہوں اور کسی سے نہیں ڈرتی! آپ کے ہاں سے ادھ مری ہو کے آئی تھی، یہاں مجھ میں دوبارہ جان پڑ گئی ہے۔“

”افسوس کہ یہ سچ ہے۔ لیکن..... ہماری زندگی میں اچھے دن بھی تو آئے تھے۔ یاد ہے؟“

اچھے دن عائشہ کو اب کہاں یاد رہ گئے تھے۔

”اچھے دن؟ اور آپ کی زندگی میں، مرزا.....؟ جنگیں، خطرات، تکالیف۔ آپ کی زندگی میں

ان چیزوں کے سوا اور کچھ بھی نہیں رہا۔ ہاں ایک چیز اور رہی ہے: میرے ساتھ سنگدل!“

کتنی ہنگ آمیز تھی یہ بہتان تراشی.....! جب اس نے سر قند کو پہلی بار فتح کیا تھا تو کیا یہ عائشہ بیگم ہی نہ تھی جس نے ہیروں کی تھیلی کے اوپر یہ الفاظ کاڑھے تھے: ”نجات دہندہ کے لئے؟“ جب اسے دوسری بار فتح حاصل ہوئی تھی تو کیا یہ عائشہ بیگم ہی نہ تھی جس نے سرگوشی کی تھی: ”مجھے آپ پر فخر ہے، میرے عظیم شاہ.....“ یہ باتیں یاد دلائی جانی چاہئے تھیں؟ نہیں، ایسا کرنا تو اپنی خود داری کو داغدار کرنے کے مترادف ہوتا۔

”کیا آپ نے سب کچھ فراموش کر دیا، بیگم؟“

”نہیں، تکالیف اور مصائب کو فراموش کر دینے کا کیا سوال!“

”آپ کو ہمارے ہاں صرف تکالیف اور مصائب ہی ملے تھے؟“

”اور کیا ملا تھا؟..... ارے ہاں، کچھ اور بھی ملا تھا: میرا پھوٹ کر رونا، آپ کا میری التجاؤں کو بار بار ٹھکرانا! اب میں زندہ ہوں اور دعاؤں کے ساتھ اپنی بن کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔ بہت ہو چکیں اذیتیں اور زلتیں! آخر میں بھی تو دختر شاہ ہوں!“

بابر نے کانپتے ہاتھوں سے کمر میں بندھی ہوئی چرمی تھیلی کو کھول کر اس میں کچھ تلاش کیا جس کے نہ ملنے پر خاموشی سے باہر چلا آیا۔ اس نے دیکھا کہ خدمت گاروں کے کمرے میں دستار چبچ مندوق سے شاندار کپڑے نکالنے، بھاڑنے اور استری کرنے میں مصروف ہے۔ زردوزی کے کام والے، قیمتی پتھروں اور موتیوں سے آراستہ ریشمی لباس۔ بابر سمجھ گیا کہ یہ اگلے دن ہونے والی ضیافت کی تیاریاں ہیں، اگلے دن اسے شیبانی کے اس مٹلے سفیر کے ساتھ دعوت میں شرکت کرنی ہوگی اور دل موس کر تو ہیں آمیز، تکلیف دہ اور کوئی جواز نہ رکھنے والے طغریہ فقرے سننے ہوں گے جیسے کہ وہ اپنی بیگم اور سالی کے منہ سے سن چکا تھا۔

”کل کی ضیافت میں“ اسے اپنے وفادار قاسم بیگ کی آواز سنائی دی، ”یہ لوگ صحرا کمینوں کے اس سفیر جانی بیگ سلطان کو آپ کی بہ نسبت زیادہ نمایاں اور اہم جگہ پر بٹھانا چاہتے ہیں۔ آخر انہیں اس کی جرات کیسے ہوئی، عالی جاہ؟“

ہونہ، عزت ماب قاسم بیگ! بابر نے سوچا کہ قاسم بیگ اب بھی خود کو بادشاہ بابر کی سلطنت کا وزیر اعظم تصور کر رہا ہے اور وزیر اعظم کی حیثیت سے خود کو ممتاز ترین مشیر ہی نہیں بلکہ ظہیر الدین محمد بابر کے نام نامی کے اولین محافظ ہونے کے حق دار بھی سمجھتا ہے۔ لیکن..... لیکن ظہیر الدین محمد بابر کے تو اب کوئی سلطنت ہی نہیں رہ گئی۔ کوئی وزیر بھی نہیں رہ گیا!

اب نہ طفیلی بابر رہے گا اور نہ ہی بادشاہ بابر!

”بہت ہو چکا! واقعی حد ہو گئی!“ اچانک بابر چیخ اٹھا۔ ”میں کچھ چھوڑ رہا ہوں! قاسم بیک صاحب! میں آج سے بادشاہ نہیں رہا! یہ سب..... دفان ہو جائیں یہ ساری چیزیں میری نگاہوں کے سامنے سے.....!“

اس نے دستار چھج کے ہاتھوں سے زردوزی کے کام والا چونہ چھین کر پھینک دیا، چوکی پر سے شاندار دستار اٹھا کر اس میں جڑے ہوئے ہیرے جو کبھی عائشہ بیگم نے نذر کئے تھے، نوچ لئے اور دستار دروازے کے باہر اچھال دی۔ دستار کھل گئی اور اس کا ایک سرا سفید سانپ کی طرح الجھا ہوا دلہیز پر پڑا رہ گیا۔

قاسم بیک نے گھبرا کر بابر کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

”میرے فرماں روا! یہ آپ کو کیا ہو گیا؟.... پر سکون ہو جائیے، میرے فرماں روا!“

بابر جس کا چہرہ فق ہو گیا تھا ہانپ ہانپ کر چلائے لگا:

”سب کچھ ختم ہو گیا! ہمیشہ ہمیشہ کے لئے! میں درویش بن کر جینا چاہتا ہوں! قاسم بیک صاحب! میرے اس فیصلے سے والدہ محترمہ کو مطلع کر دیجئے گا! میں اسی لمحے یہاں سے جا رہا ہوں! اب میں تخت و تاج کا دعویٰ دار نہیں رہا! جو مجھ سے متفق ہوں وہ فوراً میرے ساتھ چلیں۔ باقی سب آزاد ہیں!“

اس نے دستار سے نوچے ہوئے دونوں ہیروں کو مٹھی میں دبائے دبائے قلعے کے احاطے کو تقریباً دوڑتے ہوئے پار کیا۔ اس کے کانوں میں یہ الفاظ ہتھوڑے کی ضربوں کی طرح گونج رہے تھے:

”ایسی بیوی کس کام کی جس سے اس کا شوہر محبت ہی نہ کرتا ہو؟“ اور وہ سوچ رہا تھا کہ ہاں! یہ سچ ہے! نہ وہ عائشہ سے محبت کرتا ہے نہ عائشہ اس سے، دونوں کے ستارے ہی الگ الگ ہیں۔ اس عورت کی خباثت بھری نا انصافی سے، اس بات سے کہ وہ اپنی صرف اپنی ہی فکر رکھتی تھی، بابر کے دل کو گہری بھیس لگی تھی اور وہ ناقابل برداشت درد و کرب میں مبتلا ہو گیا تھا۔ وہ تیزی کے ساتھ مڑ کر اسی طرح دوڑتا ہوا اپنے کمرے میں داخل ہوا اور اپنی بیاضوں کے صندوقے سے تھیلی نکالی جس پر کبھی سمرقند کی اس ناقص حافظے والی عورت نے کشیدہ کاری کی تھی۔ کئی برس گزر جانے کی بنا پر یہ سفید تھیلی زرد سی پڑ گئی تھی، لگتا تھا کہ میلی ہو گئی ہے لیکن اس پر کڑھے ہوئے الفاظ ”نجات دہندہ کے لئے!“ پہلے ہی کی طرح نمایاں تھے۔

بابر وہاں سے عائشہ بیگم کے پاس گیا تو اس کا غصہ تقریباً ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔

”کبھی آپ نے مجھے اپنا نجات دہندہ تصور کیا تھا اور مجھے تحفے میں ہیرے دیئے تھے۔ اس وقت

آپ نے اپنی اس آرزو کا بھی اظہار کیا تھا کہ میں تخت نشین ہوں اور یہ میرے تاج میں
 جڑے جائیں۔ اب میں تخت و تاج سے محروم ہو چکا ہوں..... اپنے میرے واپس لے
 لیجئے..... انہیں آپ اپنے کسی دوسرے نجات دہندہ کو نذر کر سکتی ہیں!“
 عائشہ بیگم ذرا بھی نہ گھبرائی۔ اس نے فوراً ہی میرے لے لئے اور پرسکون لیکن خباثت بھرے
 انداز سے چوٹ کی:

”میں دیکھ رہی ہوں کہ آپ مجھے ایک بار پھر چھوڑ کر چل دیئے کا ارادہ کر رہے ہیں۔ بستر ہو گا کہ
 مجھے پوری طرح آزاد کر دیں!“

”اچھا؟ آپ طلاق چاہتی ہیں؟ تو پھر..... آج سے آپ کی پشت میرے لئے پشت اور جیسی
 ہو گئی۔ میں آپ کو چھوڑ رہا ہوں! آج سے آپ میری زوجہ نہیں رہیں! طلاق! طلاق! طلاق!“
 اور اسیا کے جنوب میں واقع پہاڑیوں کے دامن میں بارہا کا موسم دیر سے آتا ہے۔ اس علاقے
 میں بیلوں نے کھیتوں کی جتنی ماہ حمل کے آخری ایام میں شروع کی جاتی تھی۔ دو کات گاؤں میں
 جسے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے پہاڑیاں ہواؤں سے محفوظ رکھتی تھیں، خوبانی کے درختوں پر
 پھول ماہ ثور میں نمودار ہوتے تھے دائرے کی شکل کے کوہستانی سلسلے پر رفیع و عظیم پہاڑ پیرخ
 چھایا ہوا سا معلوم ہوتا تھا اور اس کی چوٹیاں ہمیشہ برف سے ڈھکی رہتی تھیں۔

گاؤں کے مغربی سرے سے کھڑی چڑھائی شروع ہو جاتی تھی جس کے بلند ترین مقام سے دیکھنے
 پر لگتا تھا کہ گاؤں کسی گہرے غار کی تہ میں واقع ہے۔

اس کھڑی چڑھائی کے دوسری طرف والی ڈھلانوں پر بھی جتنی کی جارہی تھی۔ وہاں طاہر جو
 دوسرے دہانوں کی طرح برہنہ پا تھا، اہل میں جتنے بیلوں کو بانک رہا تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے مدد جو بار
 کا سپاہی بن جانے کے بعد ہمیشہ طاہر کے ساتھ ہی رہتا تھا، پائینچوں کو اوپر تک چڑھائے، دائیں ہاتھ
 کو زور زور سے جھٹکتا ہوا کھیت میں بیج بو رہا تھا۔ ان دونوں سے کچھ فاصلے پر وہ کات کے تاجیک
 کا شکار کھیتوں کی بوائی میں مصروف تھے۔ مٹی نرم تھی، موسم خوشگوار تھا اور کام آسان۔ سبھی
 مسرور نظر آ رہے تھے۔ طاہر گزشتہ برسوں میں صرف جنگوں اور یلغاروں میں الجھے رہنے کے باعث
 کاشتکاری کے لئے ترستا رہا تھا اور اب جو موقع ملا تھا تو وہ جتنی کرتے ہوئے کوئی گیت گنگٹائے جا رہا
 تھا۔

باہر بھی کھڑی چڑھائی کو طے کر کے بلندی پر پہنچا اور وہاں سے موٹی چراتے، کھیتوں کو جوتے
 ہوئے برہنہ پانچوانوں کو دیکھنے لگا۔ اس علاقے کے مفلس و نادار افراد جوتوں کو سنبھال کر رکھتے تھے

کیونکہ پتھر لے راستوں پر جوتے ذرا ہی دیر میں پھٹ جاتے تھے۔ یہ لوگ مفلسی کے باوجود بڑے ہنس مکھ تھے اور جب پیٹ بھر کھانا میسر ہو جاتا تھا تب تو ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانا ہی نہیں رہتا تھا۔

بابر ان افراد سے اپنا موازنہ کرنے لگا: آخر میں بھی تو تندرست و توانا ہوں، بیس سال کا نوجوان ہوں۔ آخر مجھ میں کیا نہیں جو ان دیکی نوجوانوں میں ہے؟ دراصل مجھے سکون قلب میسر نہیں ہے اور اسی لئے عظیم الشان کوہساروں کے درمیان زندگی کی مسرتوں سے قدرت کے ایک جاندار جزو کی طرح مفلوظ نہیں ہو پارہا ہوں۔

کاش اس سب کا انحصار ننگے پیر گھومنے پھرنے پر ہی ہوتا!

بابر نے جوتے اتار کر مینڈر پر رکھ دیئے اور سوتے ہوئے کھیتوں میں لمبے لمبے ڈگ بھرنے لگا۔ مٹی مٹل جیسی نرم تھی اور اس سے بہار و شباب کی خوشبوئیں پھوٹ رہی تھیں۔ بابر نے سوچا کہ شاید پروردگار نے آدم کو فصل گل کی ایسی ہی نرم، آدی کا انتظار کرنے والی ایسی ہی خاک سے بنایا تھا۔

دہقان اور سپاہی بادشاہ کے نرم مٹی پر ننگے پاؤں چلنے کو مذاق سمجھ کر خوش ہو گئے اور اس کی طرف دیکھنے لگے۔ لیکن پھر بابر اسی طرح برہنہ پا پتھر لی پگڈنڈی سے گزرتا ہوا ڈھلان سے نیچے اترنے لگا اور نیلے پتھر اس کے ٹکڑوں میں چبھنے لگے۔ وہ بیچ بیچ میں راستے کو مختصر کرنے کی خاطر چھلانگ بھی لگاتا جا رہا تھا جس سے ٹکڑے لہو لہان ہو گئے تھے۔ دہقان حیرت میں پڑ گئے۔ ”آخر وہ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟“ لیکن بابر دانت بھینچے ہوئے آگے بڑھتا رہا۔ آخر طاہر سے نہ رہا گیا، وہ جوتے اٹھا کر بابر کی طرف لپکا اور اسے ڈھلان کے وسط میں جالیا۔

”جوتے پن لیجئے، حکمران!“ طاہر نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ”ٹھہر جائیئے۔ یہ پتھر آپ کے پیروں کو زخمی کر دیں گے۔“

بابر ٹھہر گیا اور اس نے طاہر کے پیروں کو جو مٹی لگنے سے سیاہ پڑ گئے تھے، دیکھتے ہوئے کہا:

”لیکن تمہارے پیروں میں تو نہ کوئی خراش ہے نہ کوئی زخم۔“

”محترم حکمران، ہم اس کے عادی جو ٹھہرے۔“

”میں بھی عادی ہونا چاہتا ہوں۔“

”آخر کیوں؟“

”تاکہ تم لوگوں سے رشک نہ کر سکوں۔“ بابر نے کہا اور آگے بڑھنے لگا۔ طاہر اس کے پیچھے

پیچھے پتھروں پر بہ آسانی چلتے ہوئے مسکرا دیا:

”بادشاہ معمولی وہ قانونوں سے رشک نہیں کیا کرتے۔“

بابر نے قدرے برا مانتے ہوئے اعتراض کیا:

”تو کیا تم نے بھی مجھ پر یقین نہیں کیا؟ میں نے تو سب لوگوں سے کہہ دیا تھا کہ اب بادشاہ نہیں ہوں، پہلے جو کچھ بھی میرا تھا اس سے کنارہ کشی اختیار کر چکا ہوں۔“ بابر بخوبی جانتا تھا کہ قاسم بیگ اس کے ساتھ رک جانے والے بیگوں اور سپاہیوں کا خیال ہے کہ تاشقند میں اس نے یہ بات محض غصے میں کہہ دی تھی اور ڈھائی سو کے ڈھائی سو فوجی اور اس کی والدہ قلعہ نگار خانم وہ کات میں اب بھی اس کے ساتھ موجود ہیں۔ لیکن اس نے سوچا کہ وہ اس بات کو ان پر ثابت کر دے گا۔ ..

طاہر نے ٹھنڈے سانس بھر کے کہا:

”آپ پر تو میں خود اپنی ذات سے بھی زیادہ یقین کرتا ہوں۔ لیکن آپ کے لئے تخت و تاج کی

فکروں سے نجات ممکن نہیں۔“

”کیوں؟ کیا ایسے لوگ نہیں گزرے جو پیدا نشی طور پر تاجدار تھے لیکن ساری زندگی تاج کے بغیر

ہی کاٹی؟ کیا ایسے بادشاہ نہیں گزرے جنہوں نے تخت و تاج کو ٹھکرا دیا؟“

”میں نہیں جانتا شاید گزرے ہوں.... لیکن آپ تو ان میں سے نہیں ہیں۔“

”میں ان افراد میں سے ہوں جن پر واضح ہو چکا ہے کہ حکومت کی ہوس بڑی پر فریب اور

تاجدار کی زندگی کی بھاگ دوڑ بالکل فضول ہوتی ہے.... اگر جمشید اور سکندر ذوالقرنین جیسے بادشاہ

بھی چند روزہ بادشاہ ثابت ہوئے، اگر انہیں بھی اپنی بے حساب دولت کو چھوڑنا، محض کفن اوڑھ کر

قبر میں جانا پڑا اور صرف....“ بابر ٹھوکر کھا کر لڑکھڑایا، طاہر نے اسے سہارا دینے کی کوشش کی لیکن

وہ خود ہی سنبھل کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔

بابر وہ کات کو گھیرے ہوئے سلسلہ کوہ کو پار کر کے حال ہی میں دوسری طرف واقع گاؤں آب

بردان گیا تھا۔ اس موقع پر بھی اس نے جمشید کا تذکرہ کیا تھا اور شاہ جمشید کی طرف سے خود اپنا

تاجیک زبان کا ایک شعر چشے کے قریب ایک پتھر پر کندہ کرا دیا تھا۔ طاہر کو وہ شعر یاد تھا:

مگر فہم عالم یہ مردی و زور

ولیکن نیردیم با خود بہ گور

بابر دم لینے کے لئے زرا دیر اسی جگہ کھڑا رہا اور اس نے اپنی بات جاری رکھی لیکن کچھ اس

انداز سے جیسے وہ طاہر سے نہیں بلکہ خود اپنے آپ سے مخاطب ہو:

”سب کچھ فانی ہے، بڑی بڑی سلطنتیں تک اپنے بانیوں کے دنیا سے اٹھتے ہی ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہیں۔ لیکن شعرا کا کلام صدیوں تک زندہ رہتا ہے۔“

”میں آپ کی دلیل کو سمجھ رہا ہوں، عالی جاہ، لیکن یک بھی تو ہمارے ساتھ ہیں....“

”ہم بیگنوں کو رخصت کر دیں گے، وہ اپنے فائدے کے لئے لڑنے چلے جائیں گے....“

بابر یہ ثابت کرنے کے لئے کہ وہ اپنے اس نوعیت کے فیصلے کو بھی عملی جامہ پہنانے کی قوت رکھتا ہے، کسی بہتر پگڈنڈی کا انتخاب کئے بغیر نوکیلے پتھروں والے اسی راستے پر گامزن ہو گیا۔ اسے تکلیف ہو رہی تھی جس کا اندازہ اس کی چال اور چرے پر نمایاں تاؤ سے ہو رہا تھا۔ طاہر اس کے قریب پہنچ کر جوتے پہن لینے کی ایک بار پھر اصرار کے ساتھ درخواست کی۔

”شاہ عالی، برہنہ پا افراد پر بھلا آپ کو رشک کیوں آئے۔ ان کے جیسے حالات سے خدا کرے آپ کو کبھی بھی سابقہ نہ پڑے۔“

”ان کے حالات میرے حالات سے بہتر نہیں ہیں کیا؟“

”میں ایک بار پھر عرض کرنا چاہتا ہوں کہ خدا نہ کرے کبھی آپ کو ان مفلوک الحال افراد کی جیسی زندگی گزارنی پڑے۔“

”ہونہ، عجب مشورہ ہے! جنگے پیر رہنے والے افراد انسان نہیں ہوتے کیا؟“

”ہوتے کیوں نہیں۔ لیکن آپ تو پیدا انٹی تاجدار ہیں....“

”میں دوبارہ پوچھتا ہوں: کیا پیدا انٹی تاجدار انسان نہیں ہوتا؟“

طاہر نہیں جانتا تھا کہ وہ اس قسم کی بات چیت کو کیسے جاری رکھے۔ اسے تو صرف یہ معلوم تھا کہ وہ تان یا معمولی سپاہی اور بادشاہ کو ایک دوسرے سے الگ کرنے والی دیوار سامنے نظر آتے ہوئے کوہساروں سے بھی کیسے زیادہ بلند ہوتی ہے۔ اس نے سوچا کہ بابر اس دیوار کو ایک ہی چھلانگ میں پار کرنا چاہتے ہیں جو ناممکن ہے۔ آخر ان کے دل میں اچانک ایسی خواہش کیسے کروٹیں لینے لگی؟ یقیناً محض اس لئے کہ اب انہیں ماورالنہر کا بادشاہ بن سکنے کی ذرا بھی امید نہیں رہ گئی۔ کوئی اور سبب طاہر کو قابل قبول نہ معلوم ہوا۔

تاہم بابر بہت سی باتوں میں عام حکمرانوں سے مختلف تھا۔

”عالی جاہ۔“ طاہر نے کہا، ”اگر آپ شاعری کو تخت و تاج پر واقعی ترجیح دیتے ہیں تو پھر مجھے

بھلا سپہ گری سے سروکار کیوں ہو.....؟ میں اپنے خاندان کے ساتھ کاشکار کرنا، زندگی بھر آپ

کا وفادار رہتا اور آپ کو دعائیں دیتا.... لیکن کیا یہ ممکن ہے؟“

آخر کار بابر نے طاہر سے اپنے جوتے لے لئے۔

”ممکن ہے..... تم بھی دوبارہ کھیتی کرنے لگو گے۔“ ذرا دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا: ہم اپنے منصوبوں کو عملی جامہ کیسے پہنائیں گے؟ یہ میں بعد میں بتاؤں گا۔ اس وقت تو تم جا کے بیلوں کو سنبھالو، مجھے یہیں چھوڑ دو۔“

طاہر ترچھی ڈھلان سے تیزی کے ساتھ اوپر چڑھنے لگا۔ اسے خیال آیا کہ بابر نے اسے اپنا قریبی آدمی سمجھ کر یہ بات کہی ہے حالانکہ یہ بڑی عجیب سی بات ہے۔ نہیں بادشاہ کسان نہیں بن سکتا۔ ہاں وہ شاعر البتہ بن سکتا ہے لیکن اس کا امکان بھی کم ہی رہتا ہے۔ بابر بھلا ان منکسر مزاج افراد جیسے کہاں ہیں جو گوشہ نشینی اختیار کر لیتے ہیں..... رہی برہنہ پانچلنے کی بات تو وہ بادشاہ کے لئے محض ہنسی مذاق کی حیثیت رکھتی ہے۔ شاعروں کو ہنسی مذاق کا شوق جو ہوتا ہے۔

طاہر نے مرکز نیچے کی طرف دیکھا۔

بابر اب بھی جوتے ہاتھ میں لئے ننگے پاؤں ہی چلا جا رہا تھا۔ طاہر نے سوچا ”کتنے ضدی ہیں؟ جو کچھ ٹھان لیتے ہیں، کر کے رہتے ہیں!“

بابر اپنے ٹکڑوں کے بڑھتے ہوئے درد کو برداشت کرتا، اسی طرح ننگے پاؤں چلتا ہوا چشمے تک پہنچ گیا۔ اس جگہ سے نرم مٹی پر شروع ہونے والی گِلڈنڈی سیدھے گاؤں تک جاتی تھی۔

اس نے جوتے پہن لئے اچانک اسے احساس ہو گیا تھا کہ لوگ اس کی سنک کو ایسے معنی پہنا سکتے ہیں جو اس کے مفاد میں نہ ہوں گے۔ گاؤں کا مقدم جس نے اس کے رہنے کے لئے اپنا گھر دے دیا تھا بیگ اور سپاہی جو اسے ”حکمران“ یا ”اعلا حضرت مرزا“ کہہ کے کورٹش بجالاتے۔ یہ سارے کے سارے لوگ اسے اپنا ہم سر نہیں بلکہ کہیں زیادہ عالی مرتبہ فرد تصور کرتے تھے۔ یہ لوگ اس کا احترام محض اس کی سادگی پسندی کی بنا ہی پر تھوڑی کرتے تھے۔

بابر نے سوچا کہ جیسا کہ طاہر نے اشارتاً ”کہا تھا“ اچھا حکمران بننا معمولی کا شکار بننے کی بد نسبت کہیں زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اگر وہ مفلوک الحال افراد کی طرح برہنہ پانچ رہنے لگے گا تو سارے بیگ سوچیں گے کہ کسی غریب شخص کو کورٹش بجالاتے ہیں۔ تب انہیں اس کے سامنے سر جھکانے کی ضرورت ہی کیا رہ جائے گی؟ اس کی اس سادگی پسندی سے تو ان سارے لوگوں کے وقار اور خود داری کو ٹھیس ہی لگتی ہے۔

بابر کے خیالات ایک دوسرے کی تردید کرتے ہوئے آپس میں گِلڈنڈ ہو گئے۔ پیروں کا شدید درد عائب سا ہو گیا۔

دن گزرتے گئے۔ بابر ڈھلانون پر برہنہ پا چلتا رہا اور بتدریج اس کے تلوے نوکیلے پتھروں اور سرد پتھریلی پگڈنڈیوں کے عادی ہو گئے۔

۳

وہ کات سے کوئی فرسنگ بھر کے فاصلے پر بلند کراڑے تلے جو سیاہ کراڑا کھلاتا تھا، آپ سولینی سفید دریا بہتا تھا۔ اس میں پانی کی فراوانی اور دھارے کی تیزی کا یہ عالم تھا کہ پانی میں اترنے والا شخص اگر بہت محتاط نہیں رہتا تھا تو فوراً ہی چکر کھا کر بہہ جاتا تھا۔ دریا دائیں جانب مڑ جاتا تھا جہاں اس کا پاٹ نسبتاً زیادہ وسیع ہو گیا تھا اور اسے ذرا کم تیز بہاؤ والی ایک جگہ پر پایاب پار کیا جاسکتا تھا۔ بابر پہاڑی ڈھلان پر واقع ارچہ کے درختوں کے جنگل کے بیچ سے ترجھی گزرتی ہوئی پگڈنڈی پر چلتا ہوا دوسرے قریب دریا کے اسی گھاٹ پر پہنچا۔ وہاں اسے کوئی بیس گھڑ سوار دریا کو پار کرتے ہوئے دکھائی دیئے۔ اس نے سرخ سمور کی ٹوپی پہنے ہوئے گھڑ سوار کو جو آگے آگے آ رہا تھا، دیکھتے ہی اپنے وفادار بیگ کو پہچان لیا۔

بابر نہیں چاہتا تھا کہ قاسم بیگ اور سپاہی اسے برہنہ پا دیکھ لیں اس لئے پگڈنڈی سے ہٹ کر ڈھلان سے کچھ فاصلے پر ارچہ کے ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔

لیکن اس اثناء میں قاسم بیگ نے اسے دیکھ لیا تھا۔ اس نے اپنے گھوڑے کو جو دریا پار کرتے وقت پیٹ تک بھیگ گیا تھا روکا اور پھرتی سے نیچے اتر آیا۔ سپاہی بھی یکے بعد دیگرے گھوڑوں سے اتر گئے۔ قاسم بیگ نے اپنے گھوڑے کی لگام قریب ترین سپاہی کو تھادی، ارچہ کے درخت تک گیا، بابر کو کورٹش بجالایا اور اسے سوگوار نگاہوں سے دیکھتے ہوئے دھیرے سے کہا:

”معاف فرمائیے، عالی جاہ، آپ کا یہ غلام تاشقند سے بری خبریں لے کر آیا ہے۔“

بابر کو مختلف واقعات یاد آگئے جو اس کے تاشقند چھوڑنے کے بعد رونما ہوئے تھے۔ اس کے ماموں محمود خان نے شیبانی خان کے سنیر کے اعزاز میں بار بار ضیافیں منعقد کر کے آخر کار اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کر لی تھی۔ ”غازی خلیفہ“ سے معاہدہ ہو گیا تھا۔ شیبانی نے اورا تپار پر محمود خان کے اختیار و اقتدار کو تسلیم کر لیا تھا اور خود اپنے لشکر کے ساتھ حصار روانہ ہو گیا تھا۔ اس کے بعد بھی محمود خان نے اورا تپار پر حملہ نہیں کیا تھا (اورا تپار اس کی رشتہ دار کے زیر حکومت جو تھا) اور ایسا ظاہر کیا تھا کہ یہ علاقہ تو ویسے بھی اس کا یا اس کے خاندان کا ہے۔ اس نے اپنے بھائی الاچہ خان کو ساتھ لے کر احمد تیل کے خلاف لڑائی چھیڑ دی تھی۔ دونوں بھائی تیل سے وادی فرغانہ کو، اس ”بخت ارضی“ کو چھین لینا چاہتے تھے۔ تاشقند سلطنت میں توسیع کے اس منصوبے کو

شیبانی نے بھی شروع میں منظور کر لیا تھا۔

قاسم بیگ تازہ ترین صورت حال معلوم کرنے کے لیے بابر کے پڑاؤ سے چلا گیا تھا اور اب تقریباً تین ماہ بعد واپس لوٹا تھا۔
”کیا ہوا، بتائیے نا، بیگ!“

”شیبانی خان نے غداری کی اپنے قول سے پھر گیا، عالی جاہ! آپ کے ماموں تقریباً نصف سال تک فرغانہ میں احمد تہل سے جنگ کرتے رہنے کے باوجود اسے شکست نہ دے سکے انہیں کافی جانی اور مالی نقصانات برداشت کرنے پڑے اور ان کی طاقت گھٹ گئی۔ تب شیبانی خان نے اچانک ان کی پیٹھ میں چھرا بھونک دیا۔ دراصل شیبانی خان نے احمد تہل سے خفیہ معاہدہ کر رکھا تھا! ان دونوں بلاؤں کا آپ کے ماموں بھلا کیسے مقابلہ کر سکتے تھے؟ ان کا لشکر تباہ ہو گیا اور انہیں شیبانی خان نے قید کر لیا۔“

بابر غیر ارادی طور پر اچھل کے کھڑا ہو گیا:

”یا خدا! تاشقند بھی جا تا رہا؟“

”بس کچھ نہ پوچھئے، حکمران! تاشقند میں دو ہزار سپاہی اور اسلحہ تھے، کم از کم چھ مہینوں کے لئے کافی رسد موجود تھی۔ وہاں تو شہر کے دفاع کے لئے مستحکم مورچہ بندی کی جانی چاہئے تھی۔ لیکن محمود خان نے شرمناک سودا کر لیا، اپنی جان بچانے کی خاطر خان کی ساری شرمیں مان لیں۔ محمود خان نے تاشقند کے محافظین کو خط لکھ کر ہدایت کی کہ قلعے سے کسی لڑائی کے بغیر ہی دست بردار ہو جائیں اور خزانے اور حرم کو فاقہ بین کے لئے وہیں چھوڑ دیں۔“

”اور ساری خواتین شیبانی کے ہاتھ لگ گئیں؟“

”جی ہاں، حکمران! شیبانی کے لشکریوں نے تین دنوں تک شہر کو جی بھر کر لوٹا۔ آپ کے ماموں کی خوبصورت چھوٹی بہن دولت بیگم شیبانی خان کے بیٹھے تیور سلطان کی شاید تیسری بیوی بن کر اس کے حرم میں داخل ہو گئیں۔ محمود خان کی سولہ سالہ دختر مغل خانم کو شیبانی نے خود اپنے لئے منتخب کر لیا۔ یہ حرکت اس نے تین سال کی عمر میں کی ہے۔ اور رضیہ سلطان بیگم اس بڑے سفیر جانی بیگ سلطان کے حصے میں آ گئیں!“

ادہ خدا! بابر نے سوچا۔ اس عیار نے، خود اپنے آپ کو فریب دینے والے اس شخص نے گزشتہ سال میری بہن کا نصیب پھوٹ جانے پر مجھے طعنے دیئے تھے اور اب کسی کے پہلی بار مانگتے ہی اپنی بیگم، دختر اور ہمشیرہ کو اس کے حوالے کر دیا۔ اور اپنے شہر کو بھی، عظیم شاش کو بھی اسے سونپ

دیا۔ ”محمود خان نے اپنی عزت اور آن کو خاک میں ملا دیا جس کے لئے سارا تاشقند ان پر لعنت بھیج رہا ہے۔“ بابر کو قاسم بیگ کے الفاظ سنائی دیئے۔

اس نے سوچا کہ آخر قاسم بیگ نے ابھی تک عائشہ بیگم کا تذکرہ کیوں نہیں کیا؟ عائشہ بیگم کو وہ طلاق دے چکا تھا، اس سے کوئی لگاؤ نہیں رہ گیا تھا، اس سب کے باوجود عائشہ بیگم اس کے شباب کی اولین محبت کا مرکز رہ چکی تھی، اس کی شریک حیات رہ چکی تھی، جس کی یاد میں کبھی وہ تڑپتا رہتا تھا۔ خان زادہ بیگم کے بعد اب اگر عائشہ بیگم بھی شیبانی کے حرم میں جا پھنسی تھی تو یہ کتنی بھیانک بات تھی!

اور بابر نے خوف سے معمور آنکھوں سے قاسم بیگ کو نکتے ہوئے پوچھا:

”کیا تو واقعی میری بیگم عائشہ بھی..... میری ہمشیرہ کے پاس پہنچ چکی ہیں؟“

”نہیں، محترم حکمراں!“ قاسم بیگ سمجھ گیا کہ بابر کو کاہے کی فکر پریشان کئے ہوئے ہے۔

”نہیں..... لیکن جو کچھ ہوا ہے اس کے اظہار کی جرات نہیں کر پارہا ہوں۔ عائشہ بیگم کا نکاح شیبانی کے بچپن سالہ چچا کوچ کچنی سے کر دیا گیا ہے، وہ اس کی چھوٹی بیگم بن گئی ہیں۔“

بابر نے اپنا چہرہ ہاتھوں سے ڈھک لیا:

”اف کتنی غلیظ بات ہے!“

اسے پرانی مصیبت پر مسرت کا احساس نہ ہوا۔ وہ تو صرف عائشہ بیگم ہی کے نہیں بلکہ اس حکمران ”قارا کوڑ“ کے انجام پر بھی جسے مٹا جانی بیگ ذلیل کر رہا تھا، مغموم ہو گیا۔ اس نے سوچا بہت ممکن ہے محمود خان کی چیتنی بیگم پر اس کیم خیم دیو کی نظر اسی وقت پڑ گئی ہو جب وہ اپنے میزبان سے شطرنج کی بازی ہار رہا تھا اور دوسرے طریقے سے حساب برابر کرنے کی قسم کھالی ہو۔

قاسم بیگ نے مایوس و غمگین لہجے میں اپنی بات جاری رکھی:

”محمود خان نے ایسا شرمناک فیصلہ قیدی کی دایہات زندگی کے لئے کیا تھا..... لیکن جان سے

ہاتھ بہر حال دھونا پڑا!“

”تو کیا ماموں ہلاک کر دیئے گئے؟“

”جی نہیں، پہلی بار جب وہ قید کئے گئے تو شیبانی خان نے انہیں موت کے گھاٹ نہ اتارا۔ پر

ایسی بے عزتی کی جو موت سے بھی بدتر تھی اور پھر اپنی نظروں سے بہت دور، ماوراء النہر کی سرحد سے

باہر مشرقی علاقوں کو بھیج دیا۔ محمود خان نے وہاں اپنے حامیوں کی چھوٹی سی فوج تیار کی اور اسے لے

کر سردریا کے کنارے پر پہنچ گئے۔ جو چند کے نزدیک دوسری لڑائی ہوئی، محمود خان کو دوبارہ شکست کا

منہ دیکھتا پڑا اور وہ اپنے دو بیٹوں سمیت قید کر لئے گئے۔ اب کے شیبانی خان نے نہ بیٹوں پر رحم کھایا اور نہ ہی ان کے بد قسمت والد پر۔
”یا خدا.....!“

اس بار بھی بابر اوروں کے حشر پر مسرور نہ ہوا حالانکہ وہ سوچ سکتا تھا کہ اس پر تہر ڈھانے والی قسمت نے ان لوگوں پر بھی تہر ڈھایا جو اس کے ساتھ بے رحمی سے پیش آئے تھے۔ اس نے جو کچھ سنا اسے سخت و مہیب شیطانی کروتوت تصور کیا۔ نہیں، وہ کبھی بھی نہیں چاہتا تھا کہ اس کے بدخواہوں میں سے ایک کا بھی حشر ایسا ہو۔

قاسم بیگ نے بابر کے بہت قریب آکر تقریباً سرگوشی کے انداز میں کہا:
”شیبانی خان، اس کے بیٹے اور سپہ سالار اپنی ایک فتح کو سارے ماورالنہر کی فتح میں تبدیل کر دینے کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ اب ان کی نظریں اند جان پر جمی ہوئی ہیں۔ اور اسی پر بھی یہ لوگ آج نہیں توکل دھاوا بول دیں گے۔ ایسی جگہوں پر ہمارا قیام بہت پر خطر ہے، عالی جاہ، ہمیں ہاڑ کو پار کر کے حصار چلے جانا چاہئے۔“

حصار کے حکمران خسرو شاہ نے کبھی بابر کے چچی بھائی بائے ستور مرزا سے سخت چھین لیا تھا اور خاندان تیموری کے ایک دوسرے نوجوان رکن کی آنکھیں نیزے کی تپتی ہوئی نوک سے پھوڑ کر اندھا کر دیا تھا تاکہ وہ کبھی سخت کو نہ دیکھ سکے۔ بابر کو یہ سب یاد تھا۔

”لیکن قاسم بیگ صاحب، یہ تو ایسا ہی ہو گا کہ ایک آفت سے بچنے کے لئے دوسری مول لے لی۔“

”محترم حکمران، میں خسرو کے ہاں پناہ مانگنے کی بات تھوڑی کر رہا ہوں۔ آپ کا یہ وفادار خادم گزشتہ سال سے حصار کے بیگوں سے خفیہ رابطہ قائم کئے ہوئے ہے۔ زیادہ تر بیگ خسرو سے سخت بیزار ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ خسرو حقیر خاندان کا رکن اور کسی مکار سپاہی کا بیٹا ہے، حصار پر حکومت کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ ہمارے وہاں پہنچتے ہی یہ سارے بیگ ہمارے ساتھ ہو جائیں گے۔“

”تخت و تاج کے لئے پھر وہی جھینا جھپٹی؟ ارے نہیں، قاسم بیگ۔ اس سب سے میں بری طرح ادب چکا ہوں۔ مجھے تو اب گوشہ تنہائی درکار ہے جہاں سب سے الگ تھلگ رہوں اور فکر خن کروں۔ اس کے سوا کچھ بھی نہ چاہئے!“

قاسم بیگ ملاقات کے اولین لمحے ہی سے کوشاں تھا کہ بابر کے ننگے پیروں پر اس کی نظر نہ پڑے۔ حکمران جس کے سامنے وہ سر جھکاتا تھا، برہنہ پا گھوڑے پھرے۔ کیسی عجیب و غریب کستی

واہیات بات تھی!

عالی جاہ، آپ نے کبھی ہم لوگوں کے مقدر کے بارے میں بھی سوچا؟ آپ کے ڈھائی سو سپاہی اور بیک آپ کے یہ قابل اعتماد حامی جو آپ کی کامیابی کے خواہاں ہیں، پروردگار سے دعائیں مانگتے اور امید رکھتے ہیں کہ کامیابی ایک بار پھر آپ کے قدم چومے گی اور آپ کو پہلے سے بھی زیادہ عروج حاصل ہوگا۔ یہ سب لوگ مفلسی کی حالت میں آپ کے ساتھ ساتھ کوہساروں اور صحراؤں میں مارے مارے پھر رہے ہیں۔ کیا یہ سب لا حاصل ہے؟“

ایماندار قاسم بیک نے باہر پر واضح کر دیا کہ اگر وہ واقعی درویشی اختیار کر لینے کا فیصلہ کر چکا ہے تو پھر اسے اتنے بیگوں اور سپاہیوں کو اپنے ساتھ رکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ آخر وہ ان لوگوں کو جانے کیوں نہیں دیتا؟

باہر نے سر جھکا لیا، خاموش ہو گیا اور دیر تک خاموش رہا۔

”میں اپنی اس بے رحمانہ گستاخی کے لئے معافی چاہتا ہوں، عالی جاہ لیکن یہ بات مجبوراً عرض کرنی پڑی۔“

”آپ نے ٹھیک ہی کہا۔ مجھے اپنے وفاداروں کو فراموش نہ کرنا چاہئے۔ اچھا یہ بتائیے، محترم بیک کہ کیا خسرو شاہ نے کبھی آپ کو اپنے ہاں خدمات انجام دینے کی پیش کش کی تھی؟“

”جی ہاں۔ دو بار۔“

باہر نے قاسم بیک کے مردانگی کے آئینہ دار چہرے پر اپنی اداس نگاہیں جمادیں۔ اس کے وزیر اعظم کی جو اس کا واحد سہارا تھا، چھوٹی سی داڑھی پر سفیدی جھلکنے لگی تھی حالانکہ عمر ابھی چالیس کی بھی نہیں ہو پائی تھی۔

”آپ جانتے ہیں، قاسم بیک، آپ سے جدا ہونا میرے لئے کتنا تکلیف دہ ہے! والد مرحوم کا سایہ جس دن میرے سر سے اٹھ گیا تھا اسی دن سے آپ نے والد کی طرح میرا خیال رکھا ہے۔ میرے مقربین میں سب سے زیادہ معتبر و مقرب آپ ہی تو ہیں۔“

”بہت بہت شکریہ، میرے حکمران!“

”اور میں آپ کا احترام کرتے ہوئے آپ کو جانے کی اجازت دے رہا ہوں.... ہم میں سے ہر ایک اپنے راستے پر گامزن ہو سکتا ہے۔ آپ کا راستہ حصار کو جاتا ہے!“

”مجھے یہ سن کر دلی افسوس ہوا.... آپ کو چھوڑ کر جاتے ہوئے بے حد افسوس ہو رہا ہے، حکمران۔ آئیے، ساتھ ساتھ چلیں۔“

”نہیں قاسم بیک، نہیں۔ میں نے اس وقت کوئی اقدام نہ کیا تو کبھی بھی نہ کر سکوں گا۔ میں ان زنجیروں کو توڑ کر آزاد ہو جانا چاہتا ہوں جو تاجداروں کی زندگیوں کو جکڑے رہتی ہیں۔ میں ایک متحد اور عظیم الشان ماورالنہر میں ایک حقیقی تاجدار کی، ایسے تاجدار کی زندگی گزارنا چاہتا تھا جو میرے خوابوں پر پورا اترتا ہو۔ میں اس طرح کی زندگی کی تعمیر و تشکیل میں ناکام رہا اور دوسری طرح کی زندگی جس میں لوگ ایک دوسرے کو ازیتیں دیتے ہیں ذلیل و پامال کرتے ہیں۔ مجھے نہیں چاہئے۔ مجھے وہ حقیر زندگی نہیں چاہئے قاسم بیک! میں جانتا ہوں کہ زنجیر کا ایک سرا میرے ماتحتوں سے بندھا ہے اور دوسرا مجھ سے، میری پرانی عادتوں اور خود پسندی سے۔ اپنے ماتحتوں کو زنجیروں سے آزاد نہ کروں گا تو خود بھی زنجیروں میں جکڑا ہی رہوں گا۔ لیکن خود اپنے آپ سے کیسے آزاد ہو سکوں گا، یہ مجھے نہیں معلوم۔ اب تو میری دلی خواہش ہے، قاسم بیک کہ زنجیروں کے بغیر ہی آغوش فطرت میں جاؤں۔“

بابر کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا، قدم ڈگمگائے۔ قاسم بیک نے اسے سنبھال لیا اور رخصت ہوتے وقت بغل گیر ہو کر رو پڑا۔
بابر نے پہلی بار دیکھا کہ قاسم بیک رو بھی سکتا ہے.....

۴

کاش وہ ان بلند کوساروں پر مسلسل چلتے چلتے ان تمام افکار و خیالات کو جو صبح سے شام تک اس کے دل کو ازیت میں مبتلا رکھتے تھے، نیچے پھینک سکتا، بے کراں آسمان میں بکھیر سکتا! لیکن وہ نہ دل کے درد و غم کو اپنے وجود سے الگ کر سکتا تھا اور نہ ہی جیسا کہ ایک بار اس نے خود ہی کہا تھا، زنجیروں کو۔ درد و غم کو بکھیر دینا، پھینک دینا ممکن نہ تھا۔ اسے تو صرف اشعار ہی میں ڈھالا جاسکتا تھا۔ اشعار اس کے دل کا بار ہلکا کر کے اسے بچا سکتے تھے، صرف اشعار ہی اسے اس کے وجود سے جدا اور دور کرنے پر قادر تھے تاکہ وہ دوسرے اپنی روح کی مسلسل چیخوں کو سن سکے۔

پوچھ مت اے دوست، کس حالت میں جان زار ہے
روح بھی بیمار میری، جسم بھی بیمار ہے
درد و غم کے اتنے قصبے ہیں، سناؤں کس طرح
مجھ پہ یہ محکوم دنیا کوہ جیسا بار ہے

غزلوں کے بعد رباعیاں۔ ایک کے بعد دوسری محبوب تخلیق نمودار ہوتی رہی۔

لاؤ، شراب لاؤ، اب رند میں بنوں گا
 بننا نہیں زاہد منبر کو کیا کروں گا
 لیکن نہیں ہے رندی اب بات میرے بس کی
 اور پارسائی کو بھی اپنا نہیں سکوں گا

اسے کتنی ہی بار اس بات پر شک ہوا تھا کہ وہ صحیح معنوں میں درویش بن سکے گا، اس فانی دنیا کی آسائشوں، احساس حسن اور عزت و شہرت سے متعلق بھاگ ڈور کو باعث کشش بنانے والی تحریکات پر صرف لباس و طعام جیسی ظاہری چیزوں کے معاملے میں ہی نہیں بلکہ باطنی طور پر بھی غلبہ پاکے گا۔

گوشہ نشیں ہوں، اب میں درویش بن گیا ہوں
 ارمانوں کے، ہوس کے در بند دیکھتا ہوں
 جاؤں کہاں، کروں کیا، پاؤں پناہ کس جا؟
 بھولا ہوں اپنا رستہ، در در بھٹک رہا ہوں

اسے تیزی کے ساتھ یکے بعد دیگرے نازل ہوتے ہوئے مصرعوں میں جوش خن کا احساس ہو رہا تھا، لگ رہا تھا اگر اس پر دنیا کے سارے دروازے بند ہو جائیں تو بھی ایک آخری دروازہ، حسن و لطافت اور عزت و شہرت کی دنیا کا، دیئے شاعری کا دروازہ کھلا رہے گا۔ خواہشات کو دبانے کی کوشش میں اسے گھبراہٹ لیکن مسرت کے ساتھ اپنے اندر کی ایسی قوتوں کا احساس ہوا جنہیں بروئے کار نہیں لایا گیا تھا اور تب اسے خان زادہ بیگم کے الفاظ یاد آگئے جو اس نے بت رخصت کے تھے: ”مجھے یقین ہے کہ آپ کا مستقبل بہت عظیم ہوگا۔ دوسروں کو نہیں لیکن مجھے معلوم ہے کہ آپ کی جیسی غیر معمولی صلاحیت کے افراد دنیا میں شاذ و نادر ہی پیدا ہوتے ہیں!“

گزشتہ روز آق سوکے کنارے آباد گاؤں میں سے ایک میں طوی ہو رہی تھی۔ بابر عام راہ گیر کی طرح گلی سے گزر رہا تھا تو اس نے اچانک کسی نوجوان مغنی کو بڑے مسرور کن انداز سے اپنی غزل گاتے سنا تھا: ”نہ ملا دل کے سوا یار و نادار کوئی.....“ بابر کے سینے میں دل جیسے سرکنے سا لگا تھا، ایسا محسوس ہوا تھا جیسے ان قوتوں کے جو اس کے لئے مہیب بھی تھیں اور مسرور کن بھی، باہر نکل پڑنے کی کوشش سے دل پھٹ جائے گا۔

اس وقت بابر کو طاقتور چشمے کا نظارہ بہت محظوظ کر رہا تھا جو وہ کات سے کچھ فاصلے پر واقع پہاڑ آسمان یا لے لاؤ کی چوٹی پر اتنی تیزی سے ابل رہا تھا کہ اس کی دھار کو روکا نہیں جاسکتا تھا۔ پہاڑ کے

دامن میں زمین سے پھوٹنے والے کئی چشمے موجود تھے لیکن باہر نے اس علاقے میں ایسا چشمہ پہلی بار دیکھا تھا جو عین چوٹی پر عقاب کی سی چبھ کے ساتھ ابل رہا تھا.....

اس جگہ سے جنوب میں عظیم الشان پہاڑ پیرنچ پر جی ہوئی دائمی برف چمک رہی تھی۔ اس پہاڑ اور آسمان یائے لاؤ کے درمیان کمری گھاٹیاں اور پہاڑیاں واقعی تھیں۔ باہر نے سوچا کہ اس چشمے میں پانی پیرنچ کلیشیر سے آتا ہوگا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ پانی کو پیرنچ سے نیچے آنے اور پھر آسمان یائے لاؤ کی چوٹی تک چڑھنے کے لئے دونوں پہاڑوں کے درمیان واقع گھاٹیوں کی گہرائیوں سے کہیں زیادہ گہرائی تک جانا پڑتا تھا۔ پانی کے چشمے کو اس کے لئے اتنی قوت آخر کہاں سے مل رہی تھی؟ پانی کو نیچے کی طرف تو اس کا وزن اور پہاڑ کی ڈھلان لے جاتے تھے لیکن اسے پتھروں اور چٹانوں کو توڑتے ہوئے اتنی بلندی پر جا کر پھوٹ نکلنے کے لئے آخر کیا چیز مجبور کر رہی تھی؟ کہیں کسی زلزلے میں ٹوٹ کر نیچے گرنے والی چٹانوں نے اس کے منبع کو بند کر دیا ہو؟ یہی سبب تھا کہ وہ نئی توانائی کے ساتھ.....

باہر کو ایسے چشمے سے خود اپنی زندگی کا موزانہ بہت موزوں اور اچھا لگا۔ وہ خود بھی تو ٹوٹ کر گرنے والی چٹان کے نیچے آگیا تھا۔ چٹان گرنے کا یہ واقعہ ایسا ہی تھا جیسا آخسی میں پیش آیا تھا اور جس سے چشمہ بند ہو گیا ہے۔ خانہ بدوش سلطانوں کی فتح بھی چٹانیں ٹوٹ کر گرنے ہی کی جیسی تھی۔ اس طرح کے اور بھی جانے کتنے ہی واقعات ہو چکے تھے! لیکن چشمے کی اندرونی قوت ختم نہیں ہوئی تھی، وہ پتھروں کو توڑ کر ایک بار پھر ابلنے لگا۔ وہ اپنے خالق عناصر کے اندر بلبلے اٹھاتا، مسلسل جدوجہد کرتا رہا تھا تاکہ دوبارہ منور دنیا میں نمودار ہو سکے۔

باہر نے سوچا کہ اگر یہ چشمہ آسمان یائے لاؤ کی چوٹی کو توڑ کر باہر نکل آیا تھا تو مجھے بھی ہمت نہ ہارنی چاہئے، امید کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑنا چاہئے۔ میری زندگی بھی، میری قوتیں بھی اسی چشمے کی طرح پھوٹ نکلیں گی۔ شاید مجھے بھی شعرو خن کی معراج مل جائے؟ شاید صرف شعرو خن ہی کی نہیں؟

وہ چشمے کے کنارے بیٹھا اسی طرح کے خیالات میں ڈوبا ہوا تھا کہ اتنے میں ایک نوجوان چرواہا اپنے دو بڑے بڑے شکاری کتوں کے ساتھ اس کے پاس آیا۔ وہ پیروں میں چاربتی ☆ پہنے ہوئے تھا اور سر پر سفید مندے کی سرخ کنارے والی مخروطی ٹوپی۔ کمر کی پٹی سے بڑا سا خنجر لٹک رہا تھا اور ہاتھ میں لاشی لئے ہوئے تھا۔ اس نے خاموشی سے باہر کی طرف دیکھا اور چشمے کے کنارے بیٹھ کر جلو سے پانی پیا۔ پھر اس نے سیدھے کھڑے ہو کر موٹے کپڑے کے بغیر استروالے چوٹے کی بظلوں

میں ہاتھ پونچھے۔

”ارے یار، تیرا بادشاہ اتنا تجھ سے کہ تجھے پہاڑوں پر بھی ننگے پاؤں چلنا پڑتا ہے؟“
یہ گستاخانہ طرز خطاب بابر کو بہت برا لگا لیکن اس نے ضبط کرتے ہوئے پوچھا:
”کون سا بادشاہ؟“

”ارے سنا ہے کہ بابر آج کل وہ کات میں رہتا ہے۔ تو اسی کے آدمیوں میں سے ہے کیا؟“
بابر پرانے کپڑوں میں ملبوس پہاڑوں اور گھاٹیوں میں بھٹکتا رہا تھا، چہرہ دھوپ سے بری طرح
سوٹا گیا تھا لیکن ناک نقتے اور ہاتھوں سے اس کی عالی نشی عیاں تھیں۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ منہ سے
کوئی ایسی ویسی بات نکل جائے اس لئے مختصر جواب دیا:
”ہاں بس یہی سمجھ لو۔“

چرواہے نے جو اپنے کشادہ سینے کو لاشی پر نکائے بابر کا غور سے جائزہ لئے جا رہا تھا، سوالات کا
سلسلہ جاری رکھا:

”لگتا ہے کہ تو اپنے بادشاہ کا بڑا وفادار ہے، ہے نا؟“

بابر مسکرا دیا:

”یہی بہت ہے کہ میں اپنا وفادار ہوں۔“

”لیکن تیرے بادشاہ نے تجھے اتنا کنگال کر رکھا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اسے تیری خاک
بھی فکر نہیں۔“

اب بابر نے بھی چرواہے کو ذرا غور سے دیکھا۔ کوئی بیس سال کا عام نوجوان تھا جس کے گال
ابھی تک استرے سے نا آشنا تھے۔ لیکن اندر کو دھنسی ہوئی سی آنکھیں ان افراد کی آنکھوں کی
طرح درد و غم سے معمور تھیں جو زمانے کی بہت سی سختیاں جھیل چکے ہوں۔

”یہ تم بادشاہ کے بارے میں اتنی باتیں کیوں پوچھ رہے ہو؟ اس سے کوئی کام ہے کیا؟“

”میں اس سے ان پہاڑوں پر کہیں ملاقات کرنا چاہتا ہوں.....“

”اور اگر ملاقات ہو جائے تو..... اس سے پوچھو گے کیا؟“ نوجوان چرواہے نے غصے سے
آنکھیں سکوڑ لیں:

”پوچھوں گا کہ اس نے میرے بڑے بھائی اور والد کے سروں کو کیا کیا تھا۔“

”سروں کو؟ بابر؟ تم..... کس قبیلے کے ہو؟“

”چکرک قبیلے کا۔“

بابر کو اندجان کے کوساروں پر موٹی پالنے والے چکر یاد آگئے۔ اس نے حیرت سے پوچھا:
”تو کیا یہاں بھی چکر قبیلے کے لوگ آباد ہیں؟“

”تم لوگ اوش کے علاقے سے بھاگ کر یہاں آجے تھے۔ ان دنوں تو میں چودہ سال کا بھی نہیں ہوا تھا۔ وہاں بابر ہم لوگوں سے بھیڑوں اور گھوڑوں کے گلے چھیننے کے لئے آدھکا تھا۔ چرواہوں نے انکار کر دیا تھا جس کے بعد بابر نے سب چرواہوں کو قتل کرا دیا تھا اور ان کے سر کٹوا کر اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ میں اپنی والدہ کے ساتھ وہاں پہنچا تو بیس لاشیں پڑی نظر آئیں۔ سر غائب ہو تو میت کی شناخت بہت دشوار ثابت ہوتی ہے۔ والدہ کبھی ایک لاش سے تو کبھی دوسری سے، کسی اجنبی کی لاش سے لپٹ کر بین کرتی رہیں.....“

وہ بھینک ساں جو کبھی بابر کا پیچھا کرتا رہا تھا، خوابوں میں پریشان کرتا رہا تھا، اس وقت ایک بار پھر اس کی نگاہوں کے سامنے آگیا۔ احمد تیل کے ہاتھوں میں خون آلود بورا، لالے کے سرخ پھولوں پر لڑھکتے ہوئے انسانی سر..... ایک نوجوان کا جس کی ابھی میس بھی نہیں بیگی تھیں مٹنا ہوا سر..... گردن پر مٹا ہوا خون۔ بابر لرز اٹھا: اس نوجوان کا چہرہ ہو ہو اس کے سامنے کھڑے ہونے چرواہے کے چہرے جیسا تھا!

بابر شاید مدے کے زیر اثر پتھر پر سے اچھل کر کھڑا ہو گیا اور جلدی سے کہا:

”تمہارے قبیلے کے لوگوں کو تو احمد تیل نے قتل کیا تھا! احمد تیل نے!“

”تجھے..... کیسے معلوم ہوا؟..... تو نے سر دیکھے تھے؟“

”ہاں، چراگاہ میں..... احمد تیل نے کوستانی چراگاہ میں دکھائے تھے۔ اس واقعے کو پورے چھ سال ہو چکے ہیں..... چکر کوں نے بغاوت کر دی تھی، تین چار سپاہیوں کو ہلاک کر دیا تھا۔ احمد تیل نے ان کے قتل کا بدلہ لیا تھا۔“

”تیل نے نہیں! دیکھنے والوں نے مجھے بتایا تھا۔ میرے والد کے سر کو بابر کاٹ کر لے گیا تھا!“

”لوگوں نے تمہیں غلط بتایا تھا۔ میں..... بخوبی جانتا ہوں۔ ان دنوں میں بھی کم سن ہی تھا۔ پہاڑوں پر دراصل احمد تیل گیا تھا، میں تو اوش ہی میں رہ گیا تھا“ بابر نے کچھ ایسی گھبراہٹ کے ساتھ کہا جیسے اپنی بے گناہی کا ثبوت دے رہا ہو۔ اس کی یہ بوکھلاہٹ یقیناً شک پیدا کرنے والی تھی۔

چرواہے نے غصے سے پوچھا:

”آخر تو بے کون؟ کہیں بابر ہی تو نہیں؟“

کوتوں نے اپنے مالک کی آواز سے اندازہ لگالیا کہ یہ اجنبی کوئی خطرناک آدمی ہے اور وہ بابر پر ٹوٹ پڑنے کے لئے تیار ہو کر زور زور سے غرانے لگے بابر کا ہاتھ غیر ارادی طور سے اپنی کمر پر گیا لیکن اب وہاں تلوار لٹک رہی تھی نہ ہی خنجر۔ وہ تو نستا گھوم رہا تھا۔

اسے لگا کہ کتے اس کے ننگے پیروں میں دانت گاڑنے ہی کو ہیں۔ خوف کے مارے اس کا سارا جسم کانپ اٹھا لیکن اس نے چرواہے سے آنکھیں ملا کر بڑے فخریہ انداز میں کہا:

”میں بابر ہوں؟“

چرواہے نے بابر کے ننگے پیروں کی طرف دیکھا اور اسے بات کا یقین نہ ہوا۔

”تو؟ بابر ہے؟ بادشاہ کیسے ایسے بھی ہوتے ہیں.....“

”ہاں اب تو میں تاجدار نہیں ہوں۔ اب تو سب ختم ہو چکا ہے۔ اب میں صرف شاعر ہوں۔“

گزشتہ روز گاؤں کی طوی میں چرواہا بابر کی غزل سن کر بہت محظوظ ہوا تھا جس کے مقلعے میں شاعر کا نام بھی استعمال ہوا تھا:

یکھ لوں اب تو بنا یار کے جینا بابر
خوب کی سیر جہاں پر نہ ملا یار کوئی

چرواہے نے سوچا ٹھیک ہی تو ہے، پچارا پہاڑوں پر تن تنہا گھوم رہا ہے، واقعی اسے کوئی یار نہیں ملا۔ اور اس نے اپنے کتوں کو ڈانٹ دیا:

”بیٹھ جاؤ! بوئے ناق، تورت کوز، بیٹھ جاؤ!“

کتوں کو خاموش کر کے اس نے بابر سے کہا:

”اگر تو واقعی شاعر بابر ہی ہے تو اپنی کوئی غزل سنا..... مجھے بہت سی غزلیں یاد ہیں، تصدیق کر لوں گا۔“

بابر زمین پر نظریں جما کر پل بھر سوچتا رہا پھر اس نے سراٹھایا:

”اچھا تمہیں یہ غزل بھی یاد ہے؟ لو سنو:

مہربان مجھ پہ نہ اپنا ہے نہ ہے بیگانہ
خوش نہیں کوئی بھی وہ غیر ہو یا جانانہ
نیکیاں لاکھ کیں لوگوں سے کہ قاتل ہو جائیں
پھر بھی بدنام ہوا، بن گیا میں افسانہ

اشعار اور بابر کی آواز کے سوز و گداز سے چرواہا بہت متاثر ہوا اور اس کی آنکھوں سے غم

جھلکنے لگا۔

”ہاں.... صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ تجھے بھی سکون نصیب نہیں ہے، شاعر.... خیر.... اگر توجہ کہہ رہا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ میرے والد کو باہر نے نہیں بلکہ تیل نے قتل کیا تھا۔“

”تیل.... لیکن نوجوان، اپنے سابق بیگیوں کے اعمال کے لئے میں بھی ذمے دار تھا۔ دیکھو نا.... اب اسی کا نتیجہ تو بھگت رہا ہوں۔“

چرواہے نے ایک بار پھر باہر کے ننگے پیروں پر نظر ڈالی۔

”میں تیری اس بات پر یقین کرنا چاہتا ہوں۔ یقین نہ کرتا تو اپنے والد اور بھائی کے خون کا بدلہ لینے کے لئے ان کتوں کو تجھ پر چھوڑ دیتا اور یہ تیری دھجیاں اڑا دیتے! اچھا، اللو!.... شاعر باہر!....“

باہر کو کچھ یاد نہ رہا کہ اس روز وہ آسمان یا لے لاؤ کی چوٹی سے کیسے اتر کر وہ کات تک پہنچا۔ ماضی، تاجدار کا منحوس ماضی اپنی ناگزیر بے انصافیوں کے ساتھ، خون اور غلاظت کے ساتھ اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ لوگ بیگیوں کے کئے ہوئے مظالم کو اس کے ماتھے مڑھ رہے تھے۔ باہر کا ضمیر چرواہے کے میب کتوں کی طرح اس پر غرا رہا تھا، دل پر نشتر لگائے جا رہا تھا۔ کتوں کی طرح اس پر غرا رہا تھا، دل پر نشتر لگائے جا رہا تھا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر وہ اپنے ضمیر کو کیسے مطمئن کرے۔

لیکن وہ کات میں تو اس سے بھی زیادہ بھیانک واقعات اس کے فطرت سے۔

شیبانی کے دستے اور اتیا پہنچ چکے تھے۔ وہ کات کا مقدم خریداری کرنے کے لئے شر کے بازار گیا تھا جہاں اسے صحرائی علاقوں کے رہنے والے ان سپاہیوں نے پکڑ کر یہ معلوم کرنے کے لئے کہ باہر کہاں چھپا ہوا ہے، خوب زد و کوب کیا تھا۔

بوڑھے تاجیک نے جس کے چہرے پر چابک کی ضربوں کے نشانات پر خون جما ہوا تھا، باہر سے کہا:

”کمینہ تھوڑی ہوں جو اپنے مہمان کے ساتھ غداری کروں! میں آپ کے دشمنوں کو آق تنگی گھاٹی میں لے گیا اور وہاں خود جھاڑیوں میں چھپ رہا۔ ان کنبھنوں کو گھاٹی سے نکلنے میں سخت دشواری ہوگی لیکن میں بلند کو مستانی پگڈنڈیوں سے گاؤں لوٹ آیا۔“

آق تنگی گھاٹی وہ کات سے سربق میں صرف پانچ فرسنگ کے فاصلے پر واقع تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ شیبانی خان کے کھوجی کتے آج نہیں تو کل وہ کات آپہنچیں گے، خاص طور سے اس لئے اور بھی

کہ خان نے اس کے سر کے بدلے انعام کے طور پر کافی سونا دینے کا وعدہ کر رکھا تھا..... اسے اب یہاں سے چل دینا چاہئے تھا۔

بابر کی والدہ قتلوغ نگار خانم نے بھی اسی بات پر زور دیا:

”بابر جان، ہم سب کی تمام امیدیں آپ ہی سے وابستہ ہیں۔ یہ درویش بن جانے کے خواب دیکھنے کا وقت نہیں ہے، پسر عزیز..... سب لوگ آپ کو جلا وطن بادشاہ تسلیم کر لیتے ہیں، کسی اور بات پر کوئی بھی یقین نہیں کرتا۔ حصار میں بلکہ ہر جگہ بڑے بڑے بیگ آپ کے منتظر ہیں۔ خود شیبانی خان کے لوگ بھی آپ کو تخت کا حق دار بادشاہ ہونے کی بنا پر تلاش کر رہے ہیں..... ہم نے اتنے دنوں تک وہ کات کا نمک کھایا ہے، آپ کا فرض ہے کہ گاؤں پر جو مصیبت نازل ہونے والی ہے اس سے اسے بچائیں۔“

یہ بالکل درست بات تھی، اس کے لئے ضروری ہو گیا تھا کہ وہ ایک بار پھر ان لوگوں کی قیادت سنبھال لے جو اس پر اعتماد رکھتے تھے، اس کی حمایت میں ہتھیار اٹھانے کو تیار تھے۔

برہنہ پارہ کر بھی وہ اپنے مقدر سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا تھا.....

”محترم شیرم بیگ! میں آپ کو اپنا وزیر اعظم مقرر کرتا ہوں.....“ (یہ شیرم بابر کا وہی سن رسیدہ ماموں تھا جو ایک زمانے میں اندجان سے بابر کے ساتھ الٹا بھاگ جانے کو تیار تھا۔ وہ اتنے برسوں تک وفاداری کے ساتھ خدمت کرنے کے بعد وزیر کے عہدے کے لائق تصور کئے جانے پر اظہارِ مومنیت کے لئے درباری مراسم کے بموجب کورنش بجالایا۔) ”آپ ہماری اس خواہش سے سارے بیگوں اور سپاہیوں کو مطلع کر دیجئے۔ فوراً کوچ کی تیاریاں کی جائیں! ہم آج رات ہی وہ کات سے روانہ ہو جائیں گے!.....“

اور بابر ایک بار پھر زرد پوش اور مسلح ہو گیا۔ اس کا دستہ اسی رات اسفرہ کی سمت، آفتابِ ظلوع ہونے کی سمت روانہ ہو گیا۔

نشیب میں دریائے اسفرہ پتھروں سے ٹکراتا، چنٹا چھٹکا ڈٹا بہہ رہا تھا۔

۵

بابر بلند چٹان پر بیٹھا تھا اور اس کی نگاہیں دوریوں پر جمی ہوئی تھیں۔ خوجند کے اس پار کہیں۔۔۔ نضاؤں میں تیرتے ہوئے اجلے اجلے ابر پاروں کی پرچھائیاں کوہستانی ڈھلانون اور چوٹیوں پر مرتفع تھیں۔ برپنوش چوٹیوں کی طرف سے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں آرہی تھیں۔ وادیاں موسمِ بہار کی گرم و سبز چادروں میں لپٹی ہوئی تھیں۔

انق پر پھیلے ہوئے ریٹھی پردے کے پیچھے کہیں دور، بے حد دور چھتال پہاڑ واقع تھے اور ان کے آگے کبھی چل پھل اور شور و غل سے معمور لیکن اب لٹا ہوا، ویران و خاموش تاشقند۔ بابر نے تصور ہی تصور میں جرن اور سمرقند کو، مرغیلان اور اندجان کو دیکھا۔ کبھی وہ ان سب علاقوں میں آزادانہ گھومتا پھرتا رہتا تھا۔

لیکن اب سارے ماورالنہر میں اسے سکون کے ساتھ زندگی گزارنے کے لئے سرچھپانے کی جگہ تک میسر نہ تھی۔ تمام علاقے یا تو احمد تہل کے قبضے میں جا چکے تھے یا شیبانی خان کے۔ شیرنم بیک کے بابر سے خراسان چلنے پر مصر ہونے کا سبب یہی تو تھا۔

بابر اس تجویز سے متفق نہیں تھا۔ اسے جیسے پہلے ہی سے معلوم ہو گیا تھا کہ اگر وہ ماورالنہر کو چھوڑ کر چلا گیا تو اپنے وطن سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو جائے گا، کبھی بھی واپس نہ لوٹ سکے گا۔ وطن سے محبت جس کا ماضی میں جب وہ وطن کے کسی بھی علاقے میں رہنے یا نہ رہنے کے لئے آزاد تھا، کوئی خاص احساس نہیں ہوتا تھا، اب بہت شدت اختیار کر چکی تھی اور اس کے اقدامات اور جذبات پر قوی اثرات ڈال رہی تھی۔

”میرے محبوب ماورالنہر! میں تیرے کونے کونے میں جا چکا ہوں، تیرے تمام راستوں پر اپنی روح کا نور بکھیرا ہے۔ اپنے خوابوں کے بیج بوئے ہیں۔ میرے وطن، تیری دھرتی میں میری جڑیں بہت گہرائی تک پھیلی ہوئی ہیں۔ میں انہیں اکھاڑ لینے کی طاقت کہاں سے لاؤں؟ میرے عزیز وطن، تجھ سے جدائی کا غم کیا میں کبھی برداشت بھی کر سکوں گا؟“

نام نہاد احباب احمد تہل اور شیبانی خان اب ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کے کوشاں تھے اور النہر ایک بار پھر دواپسے حکمرانوں کی جنگ سے مصائب میں مبتلا تھا جن کے لئے جگہ کم پڑ رہی تھی اور جو امن کے ساتھ ایک دوسرے سے نباہ نہیں کر سکتے تھے۔ یہ دونوں حریف کتے آپس میں لڑ مرتے تو بابر کے لئے راستہ صاف ہو جاتا....

بابر نے اس امید میں کہ شاید ماورالنہر میں مقیم رہنے کی کوئی صورت نکل ہی آئے، اپنے دو مخبروں کو جنگ کی صورت حال کا جائزہ لینے کے لئے اندجان بھیجا تھا اور ان کی واپسی کا بڑی بے چینی سے منتظر تھا۔

ڈیڑھ مہینے کا عرصہ بیت چکا تھا لیکن ابھی تک یہ مخبر اندجان سے واپس نہیں لوٹے تھے۔ بابر سے وقت کسی طرح کاٹے ہی نہیں کٹ رہا تھا۔ وہ مسلسل پہاڑوں پر بھٹکتا رہتا، سوچتا رہتا تھا کہ کیا کرے، کیا قدم اٹھائے.... ذہن و فہم قاسم بیک موجود ہوتا تو کوئی تدبیر سمجھتا لیکن قاسم بیک تو

اسے چھوڑ کر جا چکا تھا۔ اس کا دلیر رفیق نویان کو کھٹاش بھی موجود نہ تھا، اسے تو زشتہ سال ہی آہن گران میں تیل کے سپاہیوں نے گھائی میں پھینک کر ہلاک کر دیا تھا۔

جانے کتنے ہی لوگ اس کا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ ان میں سے کچھ ہلاک کر دیئے گئے تھے اور کچھ اپنی کمزوریوں کا شکار ہو کر دشمن سے جا ملے تھے۔ کچھ کے لئے اسے افسوس ہوتا تھا لیکن اوروں پر غصہ آتا تھا۔

اسے رہ کر خیال آتا تھا کہ کہیں شعر گوئی کی قوت بھی اس کا ساتھ نہ چھوڑ دے۔ وچہ شعر کہنے کی کوشش کرتا تھا لیکن کوئی خاص کامیابی نہیں ہوتی تھی، مصرعے موثر طور پر ہم قافیہ ہی نہیں ہو پاتے تھے۔

شام ہوتے ہوتے پہاڑ پر کھرا چھا گیا۔ ارچہ کے درختوں کے جنگ کی کھرے سے ڈھکی ہوئی پگڈنڈیوں پر چلتا ہوا گھائی میں اتر کر دریا کے کنارے گیا۔ اس جگہ ٹھٹھن اور سردی محسوس ہو رہی تھی، اندھیرا چھایا ہوا تھا، کھرے کی ایسی دبیز دیوار سی کھڑی ہوئی تھی کہ دریا کا پانی نظر نہیں آ رہا تھا۔ صرف چیخ چگھاڑ ہی سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ اسفرہ دریا کہیں غائب نہیں ہوا، پتھروں کو مسلسل لڑھکاتا ہوا بہتا جا رہا ہے۔

باہر نے اسی دریا کے کنارے ایک کشادہ میدان میں پڑاؤ ڈالا تھا۔ وسط میں ایک ٹیلے کے اوپر خود اس کا نفیس بانات کا سرخ خیمہ نصب تھا اور پاس ہی قلعو غ نگار خانم کا آٹھ کونوں والا سفید خیمہ۔ باقی سب خیمے کچھ فاصلے پر گڑے ہوئے تھے۔

باہر کو لگا جیسے سب خیمے مختلف سستوں میں ایک دوسرے سے بالکل الگ الگ نصب ہوں۔ خیموں کے اوپر کھرا پھچھوند کی طرح پھیلا ہوا تھا۔

راستے میں ملنے والے افراد تاجداروں کو کورنش بجالانے کے انداز میں اسے سلام کرتے رہے اور وہ اپنے سر کو قدرے خم کر کے جواب دیتا رہا۔ درباری آداب کے بموجب وہ اپنے سر کو زیادہ خم نہیں کر سکتا تھا۔

دو محمد علی کے خیمے کی طرف مڑ گیا جو اس کی کتابوں کی دیکھ بھال کیا کرتا تھا۔ یہ ڈھیروں نادر قلمی کتابیں جنہیں اٹھانے کے لئے پانچ چھ اونٹ درکار ہوتے تھے، مخصوص صندوقوں میں جن پر چڑا مڑھا تھا، رکھی رہتی تھیں۔ ان صندوقوں میں نمی نہیں جاسکتی تھی اور یہ ہمیشہ باہر کے ساتھ رہتے تھے۔ بیمار سا نظر آنے والا زرد محمد علی باہر کی ہر فوجی مہم میں ساتھ جاتا تھا۔ بوڑھا کتابوں کی دیکھ بھال اسی طرح کرتا تھا جس طرح ماں اپنے بچے کی کرتی ہے۔

اس وقت بابر کیا پڑھنا چاہتا تھا؟ تاریخی کتابیں۔

محمد علی کو کتابیں چھونے سے قبل ہاتھ دھونے کی عادت تھی۔

”آپ کا یہ خادم ان کتابوں کو فوراً ہی آپ کے خیمے میں پہنچا دے گا، حکمران۔“

کچھ ہی دیر بعد بابر اپنے خیمے میں مشہور سپہ سالاروں اور تاجداروں کی زندگیوں کے تذکروں کا مطالعہ کرنے لگا۔ وہ ستائشی اور مرصع فقروں اور تشبیہات پر ناک بھوں چڑھانے لگتا تھا اور واقعات کی صداقت کو حقیقت سے کوئی نسبت نہ رکھنے والے عوامی قصوں سے الگ کر کے دیکھنے کی کوشش کرتا تھا۔

ہر جگہ فتوحات ہی کو، صرف کامیاب و کامران فاتحین کی فتوحات کو نہایت ہی ثقیل زبان میں آسمان پر چڑھایا گیا تھا۔

صاف ظاہر تھا کہ اس وقت شیبانی خان کے متعلق بھی ایسے ہی ثقیل اور مبالغہ آمیز انداز سے ستائشی کتابیں لکھی جا رہی ہیں۔ بابر کو معلوم ہو چکا تھا کہ بیٹائی اور محمد صالح اپنا اپنا ”شیبانی نامہ“ لکھ رہے ہیں۔ اس نے سوچا کہ یہ دونوں خود اس کی اور شیبانی کی جنگوں پر کس انداز سے روشنی ڈالیں گے؟ ظاہر ہے کہ یہ لوگ فاتح کی تعریفوں کے پل باندھیں گے اور ماضی کے تمام بے بنیاد گناہوں کو خود اس کے سر مڑھ دیں گے۔

تب آخر لوگوں کو سچائی کا علم کیسے ہوگا؟

بابر نے فاتحین کی شاندار فتوحات کے تذکروں سے بھری ہوئی ان کتابوں کو الگ رکھ کے ان کی قریب ہی اس ریٹھی رومال کو مروڑ کے پھینک دیا جس میں انہیں محمد علی نے احتیاط سے لپیٹ دیا تھا۔ وہ چوکی کے پاس سے اٹھ کر اپنے کاغذات کے صندوقے کے قریب گیا، ذرا دیر تک سوچ میں ڈوبا ہوا کھڑا رہا اور پھر اپنی ترک صندوقے سے نکال لی۔

اس نے ترک میں شیبانی خان سے سرقہ کو چھین لینے کی تفصیلات لکھنے کے بعد سے اب تک اسے چھوا تک نہیں تھا۔ اس کا مطلب اس خواہش کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا کہ بعد کی نکتوں اور مصائب کا حال کسی کو بھی، حتیٰ کہ اسے خود بھی معلوم نہ ہو سکے۔ لیکن ان نکتوں کی حقیقت سے فرار ممکن نہ تھا، ان کی تفصیلات کہیں لکھی نہیں گئی تھیں اس کے باوجود اس کے حافظے میں اسے سخت اذیت دینے والی پکی کے پانوں کی طرح گردش کرتی جا رہی تھیں۔ اسے یہ کمادت یاد آئی کہ ”مرض کو چھپانے کی کوشش بیکار ہے، بخار چڑھے گا تو راز بہر حال فاش ہو ہی جائے گا“ اور اس نے سوچا: کیا تمام واقعات کو تفصیل کے ساتھ اس ترک میں من و عن قلم کر دینا بہتر نہ ہوگا؟ درد

باہر آجانے سے دل کو شاید کچھ سکون ہی نصیب ہو جائے؟ اور باہر نے سربل کی جنگ کے بارے میں اپنی شکست کے بعد کی ذلتوں کے بارے میں تیزی سے لکھنا شروع کر دیا۔

وہ اپنے لئے، اپنے ضمیر پر سب کچھ واضح کرنے کے لئے لکھ رہا تھا۔ ایمانداری سے، سیدھی سادی زبان میں اس بات کو بخوبی سمجھتے ہوئے لکھ رہا تھا کہ جن قلمی کتابوں کو اس نے ابھی ابھی الگ رکھ دیا تھا ان کا نقل و مرصع طرز تحریر اس کے مقاصد کی خاک بھی تحلیل نہیں کر سکتا۔ وہ ایک ایسے شخص کی طرح لکھ رہا تھا جو اپنے ظاہری اور دل میں پوشیدہ خیالات سے اتفاق رائے کرنے والے کسی قریبی فرد کو اپنے بارے میں سچی باتیں بتا رہا ہو۔ اس دوسرے فرد کی جسے وہ اپنے راز بتا رہا تھا، حیثیت اس وقت اسی تزک کو حاصل ہو گئی تھی، یعنی خود اس کی ذات کو۔ اس نے اپنی غزل میں جو نئے کی حیثیت سے عوامی مقبولیت حاصل کر چکی تھی، یوں ہی تھوڑی کہا تھا:

نہ ملا دل کے سوا یا ر وفادار کوئی

باہر خود کو ذلیل کئے بغیر بڑی صاف گوئی کے ساتھ خود اپنے سامنے ساری باتوں کا اعتراف کر رہا تھا۔

اس نے لکھا کہ کس طرح اس نے تہل کو کموار عطا کی تھی..... کس طرح بچک گلے بانوں کے سر قلم کئے گئے تھے..... کس طرح وہ کوہستانی پگڈنڈیوں کے ٹکیلی پتھروں پر برہنہ پا چلنے کا عادی ہو گیا تھا..... اس تزک میں سب کچھ تھا اور اب اس کے سلسلے کو آگے بڑھاتے، بعد کے واقعات کی تفصیلات قلم بند کرتے ہوئے اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے الہام ہو رہا ہو، جیسے وہ اشعار کہہ رہا ہو۔

شاہی خاندان میں پیدا ہونے کی بنا پر وہ تاجداروں کے مقدر سے بچھا نہیں چھڑا سکا تھا اس لئے اسے اس زندگی کی ناگزیر ذمہ داریوں اور آزمائشوں کے بارے میں صاف گوئی کے ساتھ لکھنا ہی تھا۔ وہ جتنے بھی یاد شاہوں سے واقف تھا ان میں سے کسی نے بھی اپنے تجربات کا تذکرہ ایمانداری سے نہیں کیا تھا۔ لیکن اس نے سوچا کہ لوگ تو ہمیشہ ہی صداقت سے واقف ہونے کی شدید خواہش رکھتے ہیں۔ اگر وہ عوام کی اس پیاس کو بجھانے میں ذرا بھی کامیاب ہو جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ پروردگار نے اسے جن صلاحیتوں سے نوازا ہے وہ رائیگاں نہیں گئیں اور لوگ اس کی ناکام زندگی سے عبرت حاصل کر سکیں گے۔

عوام، دوسرے افراد..... یعنی یہ کہ وہ اپنی یہ سرگزشت صرف اپنے ہی لئے نہیں صرف اپنے دل کو سکون دینے ہی کے لئے نہیں لکھ رہا ہے تو یہ بات ہے اس سرگزشت کی مثال بھی شاعری ہی کی جیسی ہے۔ اشعار اپنے دل کی تشنگی بجھانے کے لئے کہے جاتے ہیں لیکن وہ دوسروں کے دلوں کو بھی

مسخر کرتے اور عوام کے لئے نغموں گیتوں کی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں کیا اسی کا نام مسرت ہے؟ شمشیر کے زور سے جو کچھ حاصل کیا جاتا ہے وہ کسی شمشیر کے زور سے چھین بھی لیا جاتا ہے۔ لیکن شاعر کی تخلیقات یا ایماندار مورخ کی تحریروں کو کسی بھی طرح چھینا نہیں جاسکتا.....

بابر کو کچھ پتا ہی نہ چلا کہ خدام نے چراغ کب روشن کئے، کھانا کب لاکر دسترخوان پر لگایا۔ وہ کچھ کھائے پئے بغیر ہی تمام رات لکھتا رہا.....

۶

پوچھنے سے قبل ہی طاہر اپنے گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا ہوا پڑاؤ پر آ پہنچا۔
 بابر نے گھنٹے بھر بھی آرام کے بغیر فوراً اسے طلب کیا تاکہ اند جان کی خبریں معلوم کر سکے۔ تقریباً ڈیڑھ مہینے تک سارے واقعات سے بالکل بے خبر رہنا کوئی مذاق تھوڑی تھا۔

طاہر بابر کے خیمے میں جہاں چراغ ابھی تک روشن تھے، دیر تک اند جان کے حالات بیان کرتا رہا۔ خاص بات اس نے سب سے پہلے ہی بتادی تھی۔ اند جان پر شیبانی کا قبضہ ہو گیا تھا، اسے خوب لوٹا گیا تھا اور بہت سے شہری تہہ تیغ کر دیئے گئے تھے۔ ہلاک ہونے والوں میں بابر کا دوسرا مخبر بھی شامل تھا جو طاہر کے ہمراہ گیا تھا۔

طاہر تحکمن سے بری طرح بڑھال ہونے کے باعث بڑی مشکل سے خود کو اپنے پیروں پر سنبھال پارہا تھا۔ بابر گدے پر بیٹھ گیا اور اس نے طاہر سے بھی بیٹھ جانے کو کہا۔

طاہر کو واقعات کی تفصیلات کیسے معلوم ہوئی تھیں؟ اس نے اند جان کے قریب ہی واقع ایک گاؤں میں کسی امیر کے ہاں گاڑی بان کی حیثیت سے ملازمت کر لی تھی۔ امیر کو ذرا بھی اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ اس کا یہ نیا گاڑی بان دراصل ہے کون۔ طاہر گاؤں میں لوگوں کی باتیں غور سے سنتا رہتا تھا اور ان سے محتاط انداز میں سوالات کر کے بھی بہت کچھ معلوم کر لیا کرتا تھا۔ پھر وہ امیر کا مال گاڑی پر لاد کر اس کی دکان پر پہنچانے کے لئے شہر گیا تھا تو وہاں اپنی آنکھوں سے بہت کچھ دیکھ لیا تھا۔

ہوا یہ تھا کہ احمد تہل اند جان کے قریب کھلے میدان کی جنگ میں اپنی شکست کے بعد قلعے کو واپس لوٹ گیا اور دروازے بند کر لئے گئے۔ شیبانی خان نے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ شہر میں لوگ بھوکوں مرنے لگے، بیماریاں پھیلنے لگیں اور جگہ جگہ جھگڑے ہونے لگے ”یہی سب تو سر قد میں بھی ہوا تھا“ بابر نے یہ سن کر سوچا جو بیگ کبھی بابر کو چھوڑ کر تہل سے جا ملے تھے وہ اب تہل سے منہ موڑ کر شیبانی خان کے پاس جانے لگے۔ آخر کار خان کے لشکر کی شہر میں داخل ہونے میں کامیاب

ہو گئے۔ احمد تبیل اپنے بھائیوں، دیگر عزیزوں اور مقربین کے ساتھ شاہی محل میں جا چھا۔ اندجان کا محل شہر کی عمارتوں سے بہت زیادہ الگ تھلک نہ تھا۔ محل کے قریب واقع مکانات کے اوپر سے اس پر بہ آسانی دھاوا بولا جاسکتا تھا۔ اس حقیقت سے شبانی ہی کی طرح احمد تبیل بھی بخوبی واقف تھا۔ چنانچہ اس نے خان سے معافی مانگ لینے کا فیصلہ کیا اور اس کے پاس ایک سن رسیدہ شخص کے ذریعے یہ پیغام بھیجا: ”میں اپنی ساری دولت، اپنا حرم غازی خلیفہ اور مقدس امام کو نذر کر دوں گا، قسم کھاتا ہوں کہ وفاداری کے ساتھ ان کی خدمت کرتا رہوں گا۔ بس وہ میری جان بخش دیں!“

پچارے بوڑھے کو واپس لوٹنا بھی نہ نصیب ہوا۔ حملہ شروع ہو گیا..... احمد تبیل اور اس کے بھائیوں پر دہشت طاری ہو گئی، انہوں نے محل کے پھانک کے پاس پہنچ کر اسے کھول دیا اور اپنی مرضی سے ہتھیار ڈال دینے کی علامت کے طور پر اپنی تلواروں کو گردنوں میں لٹکائے، فاقہین سے نیک سلوک کی آس لگائے باہر نکل آئے۔ تیمور سلطان نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا: ”قیمت کرو، یہ اس لائق ہی نہیں۔ قتل کرو!“ تبیل اور اس کے بھائیوں کے کٹڑے کٹڑے کر کے ان کے سر بورے میں بھر لئے گئے۔

”شاید ان لوگوں نے سروں کو شبانی کے سامنے پیش کر کے خوب ڈینگ ماری ہوگی“ طاہر نے آخر میں کہا۔

”یا خدا!“ بابر کہہ اٹھا۔

یہ رہا انتقام! بابر نے سوچا۔ اس پر غدار تبیل نے تلوار اٹھائی تھی اور خود بھی تلوار کا شکار ہو گیا..... بے رحم تبیل نے جس دروازے پر لٹکا کر خواجہ عبداللہ کو پھانسی دے تھی اسی کے قریب خود بھی بے دردی کے ساتھ مارا گیا۔ تبیل نے پچارے ہلکوں کے سر کاٹ کر بورے میں بھر لئے تھے اور اب خود اس کے اور اس کے بھائیوں کے سر بوری سے باہر لڑھکے..... اور بابر نے تصور کیا کہ شبانی نے ان لوگوں کے سروں کو کراہت سے چھوا ہوگا، انہیں پیر سے الٹا پلٹا ہوگا، پوچھا ہوگا کہ ان میں اس مکروہ احمد تبیل کا سر کون سا ہے جس نے ہمیں اتنا پریشان کر رکھا تھا، ذرا دکھائیے تو، میں اس کے چہرے کو نہیں پہچانتا، کبھی ملاقات ہی نہیں ہوئی تھی..... لیکن شبانی کو چھدری داڑھی اور رخساروں کی ابھری ہوئی ہڈیوں والے سر سے سخت گھن محسوس ہوئی ہوگی، اسے ہاتھوں میں نہ لیا ہوگا۔

بابر کو اپنے تصور کے پردے پر ابھرنے والے اس منظر سے جھرجھری سی آگئی اور اس نے کئی بار کہا:

”یا خدا! یا خدا! اوہ، خدا یا.....“ اور وہ خیالوں میں کھو گیا۔ کیا یہ بے رحمانہ انصاف ہے؟ کیا یہ کئے کی سزا ہے؟ لیکن شیبانی نے تو بے رحمی اور سنگدلی کے معاملے میں خود احمد تہل کے بھی کان کاٹ لئے! اور پھر پروردگار نے سزا کی تلوار اتنے خون کے پیاسے خان کو کیوں سوئپ دی؟ لیکن اس معاملے کو اگر دوسرے انداز سے دیکھا جائے تو ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے والے ماورالنہر کو متحد کرنے کے عظیم مقاصد کو، ماورالنہر کی، میرے اپنے ماورالنہر کی متحد اور طاقتور سلطنت کے قیام کے عظیم مقصد کو جس کے حصول کے لئے میں اتنا زیادہ کوشاں تھا، کیا شیبانی خان نے واقعی پورا نہیں کر دیا؟ تو پھر آخر خود مجھے اس مقصد کی تکمیل میں کامیابی کیوں نہ ہو سکی؟ آخر شیبانی خان کی معاملات میں مجھ سے زیادہ طاقتور ثابت ہوا؟ عیاری، سنگدلی اور کھلے ہوئے وحشیانہ ارادوں میں۔ ایک اور بات یعنی مذہبی تعصب میں بھی جو شیبانی کے لشکریوں کو زندگی کی کشش، انصاف اور خود موت تک سے نفرت کرنے پر مجبور کر رہا ہے۔

ہاں، اس فانی دنیا میں فاتح بننے کے لئے شیبانی خان جیسا بن جانا ضروری ہے۔ اور میں خود روشن خیال بادشاہ بننا چاہتا تھا، اپنا بہت سادقت اور قوت شاعر، فنون اور عمارات کی تعمیر کی نذر کر دیتا تھا، مجھے تو انسانیت کی فکر دامن گیر رہتی تھی اور انہی باتوں کی بنا پر میں شیبانی سے مات کھا گیا۔ لیکن اہمیت کا ہے، متحد ماورالنہر میں بھی اہمیت کا ہے کی ہے، انسانیت کی یا اقتدار کی؟ یہ واضح نہیں ہے کیا؟

”میرے حکمران“ اچانک طاہر کی آواز نے باہر کی توجہ اقتدار اور انسانیت کے خیالات سے ہٹا دی، ”آپ کے اس خادم نے سنا ہے کہ خان کے آدمی آپ کو بڑی سرگرمی کے ساتھ تلاش کر رہے ہیں۔ شاید اس کے خبر اسفرہ میں پہنچ بھی چکے ہوں!“

واقعی اب جان کی حفاظت کی فکر کرنی تھی، جدوجہد کو جاری رکھنے کی فکر! تہل کی شکست اس کے عزیز ترین چشمے پر پھوٹ پڑنے والی ایک اور چٹان کی جیسی تھی۔ یہاں اپنے وطن میں چشمے کے پوٹ کر باہر نکلنے کے سارے راستے بند ہو چکے تھے..... جلد از جلد ہماڑ کو پار کر کے خراسان نہ چلے جانے کا مطلب یہ ہوتا کہ اس کے یہاں سے بچ نکلنے کے واحد ممکن راستے کو بھی شیبانی بند کر دیتا۔

باہر یہ بھی بھول کر کہ اس کے سامنے ایک عام سپاہی بیٹھا ہوا ہے، دبی ہوئی آواز سے تقریباً چیخ اٹھا، ”مجھ پر کچھ کم مصائب ٹوٹے ہیں کیا؟ اپنے وطن سے بھی محروم ہو جاؤں کیا؟“

طاہر نے دیکھا کہ باہر آبدیدہ ہو گیا ہے اور اس نے اپنے آنسوؤں کو بمشکل روکتے ہوئے مرتعش ہونٹوں سے کہا:

”جہاں پناہ، وطن سے دور زندگی گزارنا ہر شخص کے لئے دشوار ہوتا ہے، چاہے وہ بادشاہ ہو چاہے سپاہی یا کسان..... میں قوا کو، اپنے وطن کو واپس نہ جاؤں گا۔ اس لئے واپس نہ جاؤں گا کہ مجھ سے آپ کی خدمت میں رہنے کا بدلہ لیا جائے گا۔ اور اس لئے بھی کہ میں.... آپ سے بچھڑ نہیں سکتا..... اندجان سے یہاں تک کے سفر میں میرے بہت سے ارادے بدل گئے ہیں۔ اب میں آپ کے ساتھ ہی رہوں گا۔ ہمیشہ اور ہر جگہ۔“

بابر عرصے سے جانتا تھا کہ طاہر بہادر سپاہی اور دوسروں پر اعتماد کرنے والا سیدھا سادا کسان ہے، ان دہقانوں میں سے ہے جنہیں یقین ہوتا ہے کہ ہر قسم کی بدی اور بے انصافی سے صرف حکمران کے ہاتھوں ہی نجات مل سکتی ہے۔

”لیکن آپ سب لوگ جیسا بادشاہ چاہتے تھے ویسا میں کہاں بن سکا!“ اچانک بابرنے کچھ یوں کہا جیسے خود اپنے خیالات کو جواب دے رہا ہو۔ ”اور کوئی بھی نہیں جانتا کہ مستقبل میں بھی ویسا بادشاہ بن سکوں گا کہ نہیں.....“

طاہر خاموش ہو گیا۔ بابرنے بھی اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔ ایک جلا وطن بادشاہ، ایک سپاہی۔ دونوں خاموش آنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے اور دبیز بات کے خیمے کے باہر ماحول کے سنائے سے انتہائی برہم ہو کر دریائے اسفرہ گرج رہا تھا۔

ایک دوسرے سے اتنے زیادہ مختلف دو افراد کو یکساں مصائب نے ایک دوسرے سے بہت قریب کر دیا تھا۔ وہ دونوں جو فوجیوں کی حیثیت سے اتنے برسوں سے شانہ بہ شانہ برسرِ بیکار رہ چکے تھے، اس وقت پہلی بار کھل کر باتیں کر رہے تھے۔ طاہرنے شاہی خیمے کی دھندلی دھندلی روشنی میں وہ باتیں بھی کہہ دیں جنہیں کسی اور وقت ہونٹوں پر لانے کی جرات نہیں کر سکتا تھا۔

”محترم حکمران، میں ایک معمولی سپاہی ہوں لیکن آپ سے اپنے حقیقی عزیزوں کی طرح گہرا لگاؤ رکھتا ہوں۔ آپ کی شاعری، آپ کی شجاعت اور دریا دلی کی بنا پر..... مجھے پورا یقین ہے کہ شاندار مستقبل آپ کا انتظار کر رہا ہے۔ آپ کے بدخواہوں میں سے بہتوں کا خاتمہ ہو چکا ہے..... کتنے ہی جان لیوا خطرات سے آپ بال بال بچ نکلے ہیں۔ اس سب سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ مقدر کے سکندر ہیں۔“

طاہر اس وقت ایسے ہمدرد بڑے بھائی جیسا لگ رہا تھا جو چھوٹے بھائی کی مصیبت کی گھڑی میں اس کا حوصلہ بڑھانے کی کوشش کر رہا ہو۔ دراصل وہ بابر سے سات سال بڑا تھا بھی۔ بابر بھی اس وقت اسے اپنا بڑا بھائی ہی تصور کر رہا تھا۔

”قسمت نے آپ کے ساتھ ایسا سلوک کیا ہے جیسے سوتیلی ماں ہو۔ ظالموں اور سنگدلوں کا پلہ بھاری رہا ہے لیکن ان کا دور ختم ہو جائے گا، جلد ہی وہ زمانہ آئے گا جب لوگ آپ کی اہلیت اور لیاقت کے قائل ہو جائیں گے۔ مگر فی الحال“ طاہر تن کر بیٹھ گیا، ”فی الحال تو ہمیں اسفرو سے جلد از جلد چل دینا چاہئے۔ ہرات بھی آخر آپ کے لئے کوئی غیر جگہ نہیں ہے۔ حسین بیترا آپ کے رشتے دار ہیں۔ میرے ماموں فضل الدین بھی یقیناً ہرات ہی میں رہتے ہوں گے۔ ہمیں ایسے کوہساروں کو پار کرنا ہے جن کی نیلگوں آسمان کے پس منظر میں چمکتی ہوئی برف پوش چوٹیوں کا نظارہ انسان کو مسحور کر دیتا ہے۔ یہ پہاڑ خطرات سے خالی میدانی علاقوں کی دوریوں سے دیکھنے والوں کو اتنے مہیب اور پر خطر کہاں معلوم ہوتے ہیں جتنے ان افراد کو معلوم ہوتے ہیں جو کھڑی چٹانوں پر رینگتے ہوئے، غاروں کو پھاند کر پار کرتے ہوئے ان کے اوپر چڑھتے ہیں۔ بلند یوں پر چڑھتے ہوئے افراد کو تو چوٹیوں کی سفید برف کفن جیسی معلوم ہوتی ہے اور برف کے تودوں کے انبار خود موت کا دائمی مسکن۔“

”پر خطر راستوں پر میں اپنی زندگی پہلے اللہ کے ہاتھوں میں سونپتا ہوں اس کے بعد آپ کے ہاتھوں میں، طاہر بیگ.....“

بابر نے تلوار جیسی تیز دھار والی برف سے ڈھکے ہوئے عظیم الشان کوہساروں پر نظر ڈالی تو اسے ایک بار پھر گری ہوئی چٹانوں کے نیچے دب جانے والا اپنا چشمہ یاد آگیا۔ اس نے سوچا کہ کیا وہ چشمہ سلسلہ کوہ کی دوسری جانب دوبارہ پھوٹ نکلے گا؟ صرف ایک ہی سے نہیں بلکہ دوسری چوٹیوں سے بھی پھوٹ نکلے گا؟ ان کوہساروں سے آگے عظیم پامیر تھا اور پامیر سے آگے ہمالیہ اور ہندوکش.....

ہرات اور مرد

ہرات کے باغات کی سنبھالی کرنے والی شفاف ندیوں انجیل اور ہری رود کی سطحیں اور کنارے پیلی پیلی پتیوں سے ڈھکے ہوتے تھے۔ مضافات شہر میں واقع انگور کے مشہور جمنوں اور انار کے باغوں پر اداسی چھائی ہوئی تھی، برہنہ بیلوں اور شاخوں پر موسم گرما کی ہریالی کے بچے کچے آثار عجب دردناک سا پیش کر رہے تھے۔

لیکن شہر میں سب کچھ خزاں رسیدہ ہی نہ تھا۔ قندھار سے ہرات آنے والی شاہراہ سے نکلتے ہوئے راستوں کے کنارے کنارے لگے ہوئے صنوبر کے ہزاروں آسمانی لقرئی درختوں کی موسم بہار کی تازگی اور تابانی جوں کی توں برقرار تھی۔

وسیع پختہ ذخیرہ آب کے جو حسین بیترا کا حوض کہلاتا تھا، چاروں طرف لگے ہوئے لسان الطائر کے سڈول درختوں کا بھی خزاں کچھ نہیں لگاڑ سکی تھی۔

طاہر نے سنا تھا کہ لسان الطائر کی پتیاں پھوڑوں بھینسوں اور زخموں کے علاج میں بہت موثر ثابت ہوتی ہیں اس نے حوض کے قریب ہی گھوڑے کو روک کر لگام سپاہی کو تھادی اور ان شفا بخش پتیوں کو توڑنے کے ارادے سے حوض کے کنارے کنارے چلنے لگا۔ اتنے میں آگے سے کسی نے آواز دی:

”ارے بیگ، ذرا ٹھہر جائیے!“

ایک درخت کے موٹے تنے کے پاس کوئی شخص کھڑا ہوا تھا۔

طاہر نے غور سے دیکھا اور فوراً اس کے دل میں خیال آیا کہ کہیں فضل الدین ماموں تو نہیں

ہیں؟ لیکن اس شخص کی داڑھی اس کے ماموں کی داڑھی سے لمبی تھی اور چہرے سے بھی سن رسیدگی چمکتی تھی۔

”فرمائیے۔“ طاہر نے ٹھہر کر ادب سے کہا۔

وہ شخص پل بھر تک طاہر کے زخم کے نشان والے چہرے کو تنکٹا رہا اور پھر طاہر کی آواز بھی پہچان لی۔

”طاہر، میرے عزیز بھانجے!“

طاہر اپنے ہاتھوں کو پوری طرح پھیلا کر فضل الدین کی طرف لپکا اور حوض کے شفاف پانی میں ان دونوں کے عکس ایک ہو گئے۔

”ارے بھانجے، تم اپنے ساتھ وطن کی خوشبو کو مجھ تک لے آئے! خدا کا ہزار ہزار شکر کہ تم زندہ و تندرست ہو۔“

فضل الدین طاہر سے الگ ہو گیا لیکن اس کا ایک ہاتھ تھامے رہا اور اپنے دوسرے ہاتھ سے مسرت کے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے اس کے سڈول اور قوی جسم کا بغور جائزہ لینے لگا۔ نفرتی بیٹی، بیگم کا جیسا قیمتی خنجر اور شاندار چونغ۔ طاہر نے خود پر بیگم کی طرح روپہلی کلفتی بھی لگا رکھی تھی۔ ارے واہ رے طاہر!

”بہت خوب بھانجے، لگتا ہے کہ اب تو تم صحیح معنوں میں بیک بن گئے ہو، بڑے لوگوں میں شامل ہو گئے ہو۔۔۔۔۔“

”جی ہاں، میں تو رچی بیک بن گیا ہوں، بابر کے نجی محافظین کا سردار۔“

”مبارک ہو، مبارک ہو۔۔۔۔۔ خدا تمہیں بڑے لوگوں کے اثر سے ہمیشہ محفوظ رکھے۔“

بادشاہ کا اپنے بہت سے پرانے بیگوں پر سے اعتبار اٹھ گیا ہے اسی لئے انہوں نے یہ خدمت مجھے سونپ دی ہے۔۔۔۔۔ خیر بھائیے بھی ان باتوں کو۔ یہ بتائیے ماموں جان کہ آپ کا مزاج کیسا ہے؟ زندگی کیسے کٹ رہی ہے؟ میں آپ کو برابر تلاش کرتا رہا لوگوں سے آپ کے متعلق پوچھتا، پتا لگانے کی کوشش کرتا لیکن یہاں کسی سے جان پہچان ہی نہیں ہے۔“

فضل الدین نے جس کی عمر چالیس سے کچھ ہی زیادہ ہونے کے باوجود چہرے پر جھریاں نمودار ہو گئی تھیں، اپنی ہلکی سی سفیدی والی داڑھی کو سہلاتے ہوئے مغموم لہجے میں کہا:

”بس جی رہا ہوں۔۔۔۔۔ موت نے ابھی تک دروازے پر دستک نہیں دی۔ کیا کہوں طاہر پروردگار نے مجھے کامیابیوں سے محروم رکھا۔ میں عظیم نوابی کی عنایات کی آس لگائے ہوئے ہرات آیا تھا۔“

لیکن وہ تو خود ہی اس دنیائے فانی سے اٹھ گئے۔ ویسے ان کے بعد بھی کچھ عمارات تعمیر کی گئیں لیکن اس سال حسین بیکرا بھی ہمیں داغ مفارقت دے گئے۔ تعمیرات سے متعلق سارے کام بند کر دیئے گئے ہیں۔ سارے معمار دوبارہ بے روزگار ہو گئے ہیں۔ میں تو اب جلد سازی کرنے لگا ہوں۔۔۔۔۔“

”آپ مرزا بابر سے ملاقات کرنا چاہیں گے؟“

”مرزا بابر تو یہاں مہمان کی حیثیت سے آئے ہیں۔۔۔۔۔ اور وہ مجھے شرف ملاقات بخشیں گے بھی؟ ہم دونوں کے درمیان کچھ غلط فہمیاں ہو گئی تھیں۔“

فضل الدین اور خان زادہ بیگم کے بارے میں کچھ افواہیں طاہر کے کانوں میں بھی پڑ چکی تھیں۔

”اچھا ماموں جان، میں اگر تمہائی میں ان سے آپ کا تذکرہ کروں تو؟ فن تعمیر کے ماہروں پر وہ بہت مہربان رہتے ہیں۔“

”خیر ہوگا، اس کے متعلق بعد میں صلاح کریں گے۔۔۔۔۔ اوہ، میرے عزیز بھانجے! مرزا بابر کی ہرات میں آمد کا جب مجھے علم ہوا تھا تبھی سے برابر سوچتا رہتا تھا کہ شاید ان کے سپاہیوں میں تم بھی شامل ہو۔ بابر کا جو بھی سپاہی کیس راستے میں نظر آتا تھا اسے میں غور سے دیکھنے لگتا تھا۔ آؤ، اب میرے گھر چلو! تمہیں یہ شفا بخش چٹیاں چاہئیں نا؟ میرے گھر کے باغ میں مل جائیں گی۔ وہاں لسان الطائر کا درخت لگا ہے۔“

”باغ میں؟ آپ کنوارے ہیں یا شادی کر لی تھی، ماموں جان؟“

”شادی کر لی تھی، طاہر۔ عظیم نوائی کے مشورے سے کی تھی۔ ان کے ہاں ایک بہت ہی قابل و لائق باغبان تھے اور ان کے ایک بیٹی تھی۔۔۔“

”مبارک ہو۔۔۔۔۔! اور بچے بھی ہیں؟“

”ہاں، ایک بیٹا اور ایک بیٹی۔“

”کتنی اچھی بات ہے! تب تو مجھے آپ کے ہاں خالی ہاتھ نہیں، تحائف کے ساتھ چلنا چاہئے۔“

”ارے طاہر جان، تم سے ملاقات ہو گئی، میرے لئے اس سے اچھا تحفہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ آؤ، میرے ہاں چلو۔“

طاہر نے آسمان کی طرف دیکھا۔ آفتاب غروب ہونے کو تھا۔

”تو کیا آپ کیس نزدیک ہی رہتے ہیں؟“

”نہیں، گھر تو دور ہے، شہر کے سرے پر نظر گاہ محلے میں۔ چلو گے؟“

”معاف کیجئے گا، ماموں جان..... مجھے مرزا بابر کی خدمت میں جلد ہی حاضر ہونا ہے۔ انہوں نے یہی فرمایا تھا۔“

”یہ واقعی بڑے افسوس کی بات ہے۔ خیر کچھ دیر یہیں بیٹھ جاتے ہیں۔ تمہیں کم از کم جی بھر کے دیکھ ہی لوں..... خود تمہارے حال کیسے ہیں؟ شادی کر لی؟“

دونوں حوض کے کنارے پتھر کی بیچ پر بیٹھ گئے۔ طاہر نے رابعہ کو تلاش کرنے کا سارا قصہ کہہ سنایا اور آخر میں بتایا:

”کابل میں قسمت ہم پر مسکرائی، بیٹا تولد ہوا۔ ہم نے اس کا نام سربیک رکھا ہے۔ اس دوران ہم مسلسل سفری میں تو رہے ہیں۔“

”خدا کا شکر ہے.....! سچ پوچھو طاہر جان تو میں ایک زمانے میں بالکل ہی مایوس ہو گیا تھا۔ سوچتا تھا کہ تم سے اب کبھی بھی ملاقات نہ ہو سکے گی۔ لیکن ہوا اس کے برعکس۔ بس سر سلامت رہنا چاہئے۔ تمہیں مصائب سے نجات مل چکی ہے۔ غموں سے بھی نجات مل جائے گی..... لیکن اہل اند جان پر کیا ہتی؟“

”ارے ماموں جان، اس داستان غم کو نہ چھیڑیے! شیبانی خان نے وہاں جانے کتنے ہی لوگوں کو قتل کروا دیا! آج بھی مجھے راتوں کو خواب میں خون کی ندیاں بہتی نظر آتی ہیں، سوتے میں بڑبڑانے لگتا ہوں.....“

”اس دونخ سے نکل بھاگنے میں تم لوگ کیسے کامیاب ہو گئے؟“

واقعی وہ لوگ شیبانی خان سے بھاگ نکلنے میں کیسے کامیاب ہوئے تھے؟ ان کے سفر کا سلسلہ روز و شب جاری رہتا تھا۔ لوگ تھکن سے بری طرح نڈھال ہو گئے تھے۔ رسد ختم ہو جانے کے باعث گھوڑوں اور اونٹوں کو ذبح کرنے کی نوبت آگئی تھی۔ خود بابر نے اپنا گھوڑا اپنی والدہ کو دے دیا تھا اور پیدل چلنے لگا تھا۔ چاروں طرف پہاڑ ہی پہاڑ تھے، کھڑی چڑھائیاں ہی چڑھائیاں تھیں۔ جوتے گھس گئے تھے اور سر پہچانے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔

بعض معمولی معمولی عسکریار تک بابر سے گستاخی کرنے پر اتر آئے تھے کتے تھے۔ ”یہاں بیٹھے رہنے کی کوئی ضرورت نہیں، آگے بڑھئے، حصار پہاڑیوں کو جلد از جلد پار کیجئے۔“ طاہر کو ان پر کبھی کبھی سخت غصہ آجاتا اور وہ تلوار نکال لیتا تھا لیکن بابر ہر بار اس کے غصے کو ٹھنڈا کرتا اور کہتا تھا:

”بھئی ہمیں مبر سے کام لینا چاہئے۔ یہ لوگ ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں..... ان کی نگاہ میں ہماری وقت ہی کیا ہے؟ چلئے، رفتار تیز کیجئے۔ ہمیں جلد از جلد دریائے امو کو پار کر لینا چاہئے۔“ طاہر کو بعد میں پتا

چلا کہ بادشاہ کی بات کتنی درست تھی۔ ان لوگوں نے امو کو پار کیا ہی تھا کہ شیبانی خان نے حصار پر حملہ کر دیا۔ حصار کا حکمران خسرو اپنی بزدلی کے باعث لڑنے کی جرات نہ کر سکا اور اپنے لشکر کو چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ زیادہ تر بیگوں نے ایک قاصد کے ذریعے بابر کے پاس خفیہ طور پر پیغام بھیجا: ”تشریف لے آئیے، ہم حصار کو آپ کے حوالے کر دیں گے۔“ لیکن بابر نے انکار کر دیا کیونکہ اسے یقین نہیں تھا کہ بیگ اس کے وفادار ثابت ہوں گے۔ اس نے جواب بھیجوا دیا: ”آپ لوگ واقعی میرے حامی ہوں اور آپ کو میری ضرورت ہو تو خود ہی یہاں آجائیے۔“

شیبانی نے حصار پر قبضہ کر لیا اور خسرو کی تیس ہزار سپاہیوں کی فوج منتشر ہو گئی۔ فوجی نکستوں سے پیدا ہونے والی اتھل پتھل کے موقعوں پر بیگ جن کی شان و شوکت اور طاقت اپنی عزت اور آن کو بچائے رکھنے اور اپنے سپاہیوں کو ساتھ چھوڑ کر چلے جانے سے روکے رہنے کے لئے توبہت کافی ہوتی تھی لیکن اس بات کے لئے بالکل ناکافی کہ وہ اپنے خاندان کے کسی فرد کو تخت پر بٹھادیں، کسی مشہور و ممتاز شاہی خاندان کے طاقتور حکمران کو تلاش کرنے لگتے تھے۔ کچھ تو اسی وجہ سے اور کچھ قاسم بیگ کی جو ابھی بابر کا وفادار تھا، لگن کے باعث بیگوں کی نظر انتخاب بھادر بابر پر پڑی تھی۔ سب سے پہلے باقی بیگ چغتائیانی اپنے چار سو سپاہیوں کے ساتھ بابر سے آن ملا۔ بابر نے اس بیگ کی توقعات سے زیادہ ہی عزت و احترام کے ساتھ اس کا خیر مقدم کیا اور اسے اپنا وزیر اعظم بنادیا۔

بابر نے محض دو سو چالیس سپاہیوں کے ساتھ امو دریا کو پار کیا تھا لیکن چار مہینے بعد ہی اس کے لشکریوں کی تعداد چار ہزار تک پہنچ گئی۔

طاہر کی باتیں سننے ہوئے فضل الدین کے دل میں خیال آیا کہ اس عرصے میں اس کا بھانجا کتنا بدل چکا ہے۔ پہلے اسے ایسی شیریں اور نصیح زبان کہاں آتی تھی۔ یہ سب تو ممتاز افراد کی محبت کا فیض تھا۔

”تو ماموں جان، اس طرح ہم لوگ کابل پہنچ گئے۔“ طاہر نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”وہاں ان دنوں ارغن ترک قبیلے کا کوئی متیم بیگ حکمران تھا۔ تخت پر اس کا کوئی حق نہیں تھا بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ہم سے ٹکر لینے کی طاقت نہیں رکھتا تھا۔ بہر حال ہمارے بادشاہ نے اس سے کچھ یوں بات چیت کی کہ اس نے جنگ کے بغیر ہی کابل کی سلطنت ہمیں سونپ دی۔ کچھ دنوں کے بعد ہرات کے بادشاہ حسین بیکرا کا پیغام موصول ہوا۔ انہوں نے مرزا بابر کو کابل کا حکمران تسلیم کر لیا تھا اور ان سے فوج لے کر دریاے مرغاب کے کنارے پہنچنے کی درخواست کی تھی تاکہ متحدہ طور پر

شیبانی کا مقابلہ کیا جاسکے۔ ایسے دوست کی ہمیں عرصے سے تلاش تھی اسی لئے گھوڑوں کو سرپٹ دوڑاتے ہوئے چالیس دنوں اور چالیس راتوں کی مسافت کے بعد اتنی دور دراز جگہ تک پہنچ گئے پر اس اثنا میں افسوس کہ حسین بیتر کا انتقال ہو چکا تھا۔ دیکھئے نا، قسمت کتنی خراب نکلی۔“ طاہر نے اچانک اپنی بات ختم کر دی اور جانے کیوں مسکرایا۔

”یہ بہت اچھا ہوا کہ آپ لوگ طاقتور حکمرانوں کی طرح شان کے ساتھ ہرات میں دخل ہوئے ورنہ حسین بیتر ا خدا انہیں جنت نصیب کرے۔ کے بیٹے مرزا بابر کے ساتھ بڑی سرد مہری سے پیش آتے۔“

”جی ہاں، ماموں جان۔ یہ کہنے کی کوئی ضرورت نہیں کہ آج کل یہاں ہماری بہت عزت کی جارہی ہے۔ ہم جہاں بھی جاتے ہیں، داروغہ شہر ہمارے ساتھ ہوتا ہے اور یہاں کے تمام قابل دید مقامات کی سیر کر چکے ہیں۔ شاموں کو امرا و عمائد کے ہاں ہمارے اعزاز میں تقریبات اور ضیافتوں کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ آج تو مرزا مظفر سفید محل میں مرزا بابر کا استقبال کریں گے۔۔۔ اوہ، ماموں جان“ طاہر نے آسمان پر نظر دوڑاتے ہوئے کہا ”دیکھئے نا، آفتاب غروب ہو چکا ہے۔ مجھے تاخیر کرنے کی اجازت نہیں۔ کیا میں کل آپ سے ملاقات کے لئے حاضر ہو سکتا ہوں؟ اپنے گھر کا راستہ سمجھا دیجئے۔“

جب تک وہ اس سپاہی کے پاس پہنچے جو طاہر کے گھوڑے کی لگام تھامے ہوئے تھا، تب تک فضل الدین نے طاہر کو اپنے گھر کا راستہ ٹھیک سے سمجھا دیا۔ طاہر نے سپاہی سے لگام لے کر اچانک فضل الدین سے پوچھا:

”اور آپ کا گھوڑا کہاں ہے؟“

”میں تو پیدل چلتا ہوں۔۔۔ عادی ہو چکا ہوں۔۔۔“

طاہر کو سخت ندامت محسوس ہوئی کہ اپنے ماموں کے مفلس ہو جانے کا اسے اب کیسے جاکر اندازہ ہوا ہے۔ اس نے چمکتی ہوئی لگام کو فیصلہ کن انداز میں فضل الدین کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا:

”تو پھر یہ گھوڑا آپ کی نذر ہے۔“

”لیکن تم خود کیا کرو گے؟“

”اصطبل میں میرے دو گھوڑے اور بندھے ہیں۔ آپ سوار ہو جائیے نا!“

اس نے نفرتی ملنے والے دستے کا چابک بھی جو اس کی پیٹی میں ٹھنسا ہوا تھا، نکال کر فضل الدین

کو دے دیا:

”ایک بار آپ نے بھی تواوش میں مجھے اپنا گھوڑا دے دیا تھا۔ نیا لباس عطا کیا تھا، یاد ہے نا؟“
 ”میرے عزیز بھانجے، جان سلامت رہے تو لباس مل ہی جاتا ہے۔ بیتی ہوئی باتوں کو یاد دلانے کی کیا ضرورت؟“

”کل میں ماموں جان کے سارے خاندان کے لئے تحائف پہنچا کر سب کو مسرور کر دوں گا۔
 ممانی جان اور دونوں بچوں کو سرسے پاؤں تک نئے لباس پہنا دوں گا“ طاہر نے دل ہی دل میں کہا۔
 کچھ دوری پر موجود نوجوان گھڑسوار سپاہی سمجھ ہی نہیں پارہا تھا کہ یہ کیسی ملاقات ہے۔ وہ ماموں
 بھانجے کو حیرت سے منہ کھولے نکلے جا رہا تھا۔

فضل الدین ”انشاء اللہ کل ملاقات ہوگی۔“ کہہ کر رخصت ہوا اور اس نے گھوڑے کو
 ایڑ لگا دی۔ طاہر نے فضل الدین کو جاتے ہوئے دیکھا اور پھر سپاہی سے دھیرے سے کہا:

”ارے عقل کے نرے دشمن ہی ہو کیا....؟ سپاہی گھوڑے پر اور بیک زمین پر؟“
 سپاہی کو احساس ہوا کہ اس نے لاپرواہی میں گستاخی کی ہے اور وہ فوراً ہی گھوڑے سے نیچے
 کود گیا۔

فضل الدین نے مڑ کر دیکھا، طاہر گھوڑے پر بڑی آن بان کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا (”بیک ہو گیا“
 صحیح معنوں میں بیک!) سپاہی سر جھکائے دھیرے دھیرے پیدل چل رہا تھا۔ ”خدا نہ کرے کہ کہیں
 طاہر بھی بیگوں جیسا مغرور و متکبر ہو جائے۔“ فضل الدین نے تشویش کے ساتھ سوچا۔

۲

بابر کو شاندار محل انیسہ میں جو کبھی نوائی کا ممکن تھا، رہتے ہوئے سترہ دن ہو چکے تھے۔ اس کے
 بلند دروازے، نیلگوں گنبد اور آفتاب کی شعاعوں میں چمکتی ہوئی رنگ برنگی پچی کاری سمرقند کے
 الخ بیک مدرسے کی یاد دلارہے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ محل کے چاروں کناروں پر بنے ہوئے مینار
 الخ بیک مدرسے کے میناروں سے کچھ زیادہ بلند تھے اور تعمیر کو پندرہ ہی سال ہونے کے باعث بالکل
 نیا سا لگتا تھا۔

انیسہ کے کئی کمروں میں نوائی کا ذاتی کتب خانہ اب بھی موجود تھا۔

بابر اس کتب خانے میں کئی کئی گھنٹے قلمی کتابوں کے مطالعے میں گزار دیتا تھا۔ بعض کتابوں کے
 حاشیوں پر اسے اس عظیم شاعر کے لکھے ہوئے مختصر تبصرے بھی دکھائی دیتے تھے۔ بابر کو نوائی کا وہ
 خط بار بار یاد آتا تھا جو اسے سمرقند میں موصول ہوا تھا اور وہ سوچتا کہ تب سے اب تک کتنی

تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں، کتنا انسانی خون بہہ چکا ہے۔

کتب خانے کے دروازے کے قریب ہی خوبصورت تنگ الماری سے مشابہ گھڑی فرش پر رکھی ہوئی تھی۔ مقررہ اوقات پر الماری کے اوپری حصے میں رکھا ہوا ننھے بچے کا چھوٹا سا چوبی مجسمہ حرکت میں آکر طلائی ہتھوڑی سے طشتی پر ضرب لگا کر شیریں جھنکار پیدا کر دیتا تھا۔ یہ گھڑی میر علی شیر نے اپنی پسند کے بموجب بنوائی تھی، اس کے نمونے کی گھڑیاں ہرات میں بہت مقبول ہو گئی تھیں اور ”علی شیر ساعت“ کہلانے لگی تھیں۔

.... بابر نے کتب خانے کے دروازے کو بند کر دیا اور گھڑی کو جسے کتنی ہی بار دیکھ چکا تھا، ایک بار پھر دیکھا۔ اس کے دل میں پھر سے یہ خیال آیا: ”کتنی عجیب بات ہے کہ انسان دنیا سے اٹھ گیا لیکن اس کے کارنامے، اس کی زندگی کے خواب و خیال برقرار ہیں۔ گھڑی کی تھن کی کیا یہ نہیں بتا رہی ہے کہ حیات ثانی ممکن ہے؟“

انہی کے اندرونی کمروں اور باہری حصوں میں ہر جگہ محل کو تعمیر کرانے والے کی روح کی موجودگی کا احساس ہو رہا تھا۔ بابر دروازوں کو اس خیال سے بہت احتیاط کے ساتھ کھولتا تھا کہ انہیں کبھی نوائی کے ہاتھ چھو چکے ہیں۔ وہ کمروں کی مختصر درمیانی گزر گاہوں اور سیڑھیوں پر اس احساس کے ساتھ ہولے ہولے قدم رکھتا تھا کہ اس شخص کے نقوش قدم پر چل رہا ہے جو کچھ عرصہ قبل تک زندہ تھا۔

احاطے کے کشادہ حوض کے چاروں طرف لگے ہوئے چنار کے درختوں کی گری ہوئی پتیوں کو ملازم نے جھاڑو دے کر ایک طرف ڈھیر کر دیا تھا۔ ”کیا واقعی ہماری زندگیاں بھی انہی گری ہوئی پتیوں ہی سے مشابہ ہیں؟ کیا انہیں بھی بعد میں کوئی آکر جھاڑو ہمارے ایک جگہ ڈھیر کر دے گا، جلا دے گا اور سب کچھ خاک ہو کر ہواؤں میں اڑ جائے گا؟“ بابر نے سوچا۔ وہ ایک خوبصورت روش کی طرف مڑ گیا جس کے دونوں کناروں پر سرو کے سڈول سرسبز و شاداب اشجار کھڑے تھے۔ روش کے دوسرے سرے پر دو افراد اس کے منتظر تھے۔ ان میں سے ایک تو مورخ خواند میر تھا جو نوائی کا شاگرد اور اس کا ایک قریبی رفیق رہ چکا تھا اور دوسرا سن رسیدہ شخص صاحب دارا جو بڑی دیر سے اپنے ڈنڈے کی نیک لگائے کھڑا تھا۔ نوائی کو ان دونوں سے دل کھول کر باتیں کرنا خاص طور سے پسند تھا۔

”شاہ عالی، عظیم نوائی کے انتقال کے بعد یہ محل بے جان جسم بن کر رہ گیا تھا۔ آپ نے اس میں دوبارہ جان ڈال دی“ صاحب دارا نے اس کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا اور کورنش بجالایا۔

تیس سالہ خواند میر نے اپنی تیز سب کچھ تاڑ لینے والی آنکھوں سے بابر کو کچھ یوں دیکھا جیسے آزماتا چاہتا ہو کہ یہ پچیس سالہ اند جانی اتنے شائستہ اور پرستائش تخطاب کا جواب کیسے دیتا ہے: اپنی عمر کے بموجب سادگی سے یا شاہی انداز میں ستائش کو ایک عام بات تصور کر کے؟

بابر کا دل افسردگی اور زیاں کے جذبات سے بیٹھا جا رہا تھا۔ پر نصیح شاعرانہ زبان میں جواب دینے کو اس کا جی نہ چاہا اور اس نے سیدھے سادے لفظوں میں کہا:

”نہیں جناب، نئی جان تو عظیم میر علی شیر کے اس ممکن نے خود میرے جسم میں ڈال دی ہے۔ پہلے تو میں اس کے خواب ہی دیکھا کرتا تھا، صرف خواب۔“

خواند میر نے مطمئن ہو کے سر ہلایا۔ صاحب دارا بھی مطمئن ہو گیا۔

”آپ نے بجا فرمایا، عالی جاہ۔“ وہ دوبارہ کورنش بجالایا۔

”جس چیز پر بھی اس عظیم روح کا سایہ پڑ گیا تھا اس پر اس کی گہری چھاپ باقی ہے۔ مثال کے طور پر ازراہ کرم ذرا ان میناروں ہی کو دیکھ لیجئے!“ اور بوڑھے نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ اپنے ہاتھ کو پہلے دائیں جانب اور پھر بائیں جانب گھمایا۔ بابر نے دونوں جانب جدھر اشارے کئے گئے تھے۔ دیکھا۔ رنگ برنگی پچی کاری والے چمکتے ہوئے بلند میناروں کے اوپری حصے آسمان کی نیلاہٹ اور بادلوں کی سفیدی کے پس منظر میں بہت خوبصورت معلوم ہو رہے تھے۔

ایسے میناروں کے اوپری حصے بارہ درمی نمایاں جاتے تھے تاکہ ان کے اوپر سے موزنون کے اذان دینے کے علاوہ قرب و جوار کے علاقوں کا نظارہ کرنے میں بھی آسانی ہو۔ لیکن انیس کے میناروں پر بیچ میں خاص قسم کے گول برآمدے بھی بنے ہوئے تھے۔ صاحب دارا نے انہی کی طرف اشارے کئے تھے۔

”میر علی شیر بلند یوں سے ہرات کی خوبصورتی کا نظارہ کرتے تھے تو انہیں دلی سکون محسوس ہوتا تھا۔ لیکن ضعیفی میں انہیں اتنی بلندی تک چڑھنے میں دشواری ہوتی تھی اس لئے ان کے حکم پر معماروں نے میناروں کے بیچ ہی میں گول برآمدے بنا دیئے تھے۔“

”کیا ہم بھی وہاں چڑھ سکتے ہیں؟“

”ہم آپ کو بڑی خوشی سے لے کر چلیں گے!..... مغربی مینار کی طرف تشریف لے چلے.....“

صاحب دارا مینار کے نیچے ہی ٹھہر گیا اور نوجوان بابر اور خواند میر چکر دار سیڑھیوں کو جلدی جلدی طے کر کے برآمدے میں پہنچ گئے۔

وہاں سے دکھائی دینے والے مناظر آنکھوں کو کتنی فرحت بخش رہے تھے! سامنے دوریوں پر

برف پوش پہاڑیاں مختار اور اسکنجہ دکھائی دے رہی تھیں۔ اور نیچے انجیل ندی کا چاندی کی طرح چمکتا ہوا پتلا دھارا۔ ندی کے بائیں کنارے پر نوائی کی زندگی میں تعمیر کیا جانے والا گوہر شادنیگم کا مشہور مدرسہ تھا اور دائیں کنارے پر بالکل سامنے نوائی کی زندگی ہی میں تعمیر کیا جانے والا اور اتنا ہی مشہور مدرسہ اخلاصیہ۔ اس سے تھوڑی ہی دوری پر اسپتال شفاۃ کی عمارت واقع تھی۔ جہاں مریضوں کے علاج کے ساتھ ہی ساتھ علم طب کی تعلیم بھی دی جاتی تھی اس سے کچھ آگے بڑھ کر مسافر خانے خلاصیہ کی شاندار گنبد والی عمارت نظر آرہی تھی جہاں بے خانماں افراد کو بھی سر چھپانے کی جگہ مل جاتی تھی۔

کتنا شاندار تھا ہرات کا حسن! نوائی کے منصوبوں سے کیسے کیسے معجزے رونما ہوئے تھے! دوسری سمتوں میں بھی مینار ہی مینار، گنبد ہی گنبد نیلگوں کو مساروں کی مانند شہر کے اوپر ابھرے ہوئے تھے۔ باہر کے سینے میں ایک بار پھر سرفرد جانے کی خواہش کروٹیں لینے لگی۔ دل محبت، شک اور درد سے ترپ اٹھا۔

”اچھا یہ بتائیے“ باہر نے خواند میر سے کہا، ”ایسی عالی شان عمارات جنہوں نے تعمیر کیں ان میں ماورالنہر کے معمار بھی شامل تھے؟“

”لگتا ہے کہ عالم پناہ کو ہرات کے حسن میں سرفرد کے حسن کی بھی کچھ جھلک نظر آرہی ہے؟“

”جی ہاں، اسی لئے تو دریافت کیا ہے۔“

”ہرات میں ایسے بہت سے معمار ہیں جو حصول تعلیم کے لئے سرفرد گئے تھے اور واپس لوٹے تو ان کے دلوں پر سرفرد کی تصویر نقش تھی۔ اس کے علاوہ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، بہت سے باصلاحیت افراد نے ماورالنہر کو خیر یاد کہہ کے یہاں، میر علی شیر مرحوم کے ہاں پناہ لی تھی۔۔۔ ادہ، ہمارے عظیم میر علی شیر کتنی صفات کے حامل تھے۔ لیکن آپ کے اس حکم بردار کو ان کی یہ کوئی دیگر خوبیوں سے کہیں زیادہ غیر معمولی معلوم ہوتی تھی کہ وہ فطری صلاحیت والوں کو تلاش کرتے، انہیں اپنی محبتوں اور عنایتوں سے نوازتے اور ان کی صلاحیتوں کے فروغ کے مواقع فراہم کرتے تھے۔ میر علی شیر سے بہتر طور پر اس حقیقت کا اور کسی کو بھی علم نہ تھا کہ عظیم کارنامے عظیم صلاحیتوں والے افراد کے بغیر انجام نہیں دیئے جاسکتے۔ وہ اپنے احباب اور مجھ جیسے شاگردوں سے اکثر کہا کرتے تھے: یاد رکھئے کہ رشک اور خود غرضی کے جذبات عموماً ”جابلے“ بے علم اور بے مروت افراد کے دلوں ہی میں پیدا ہوتے ہیں۔ علم و فن کے اعلا و ارفع میدانوں میں تو جہلاً خاص طور سے صلاحیت مندوں کے آگے بڑھنے کی راہیں مسدود کر دیتے ہیں۔ ان کے جوہر کو ابھرنے کا موقع ہی

نہیں دیتے، اسے پامال کر دیتے ہیں۔ جہلا کا رشک اس دنیا کی بدترین شے ہے۔ انتہائی بلند پایہ فیاضی ان افراد کی فیاضی ہوتی ہے جو نادر صلاحیتوں والے افراد کو تلاش کرتے اور انہیں ترقی کرنے کا موقع دیتے ہیں۔“

”یہ بالکل درست ہے!“ بابر بڑے جوش کے ساتھ کہہ اٹھا۔
 ”اس داو سے خواند میر کا حوصلہ کچھ اور بڑھ گیا:

”ہم شاگردان کسی طویل سفر کے بعد یا کئی دنوں کے وقفے سے میر علی شیر کی خدمت میں حاضر ہوتے تو وہ پہلا سوال یہی کرتے تھے: ”بڑی خوشی کی بات ہے کہ واپس آگئے لیکن کسی نادر صلاحیت والے کو بھی تلاش کیا؟“ ہم جنہیں تلاش کرتے تھے ان میں سے کئی ایک پندرہ سولہ سال کے اور بعض اوقات اس سے بھی کم عمر کے لڑکے ہوتے تھے۔ ہم لوگوں کو اپنی ان ”دریا فتوں“ کا ذکر کرتے ہوئے جھجک محسوس ہوتی تھی لیکن وہ ہمیں نصیحت کرتے تھے: ”ارے میاں، صلاحیت تو پندرہ سال کی عمر میں بھی نمایاں ہو جاتی ہے لیکن کند ذہنی چالیس کی عمر میں بھی کند ذہنی ہی رہتی ہے..... آپ نے جس نا سمجھ لیکن باصلاحیت لڑکے کو تلاش کیا ہے اسے میرے پاس لائیے نا“ صاحب دارا ایک تاجیک زین الدین واصفی کو میر علی شیر کے پاس لائے تھے تو ان کی عمر صرف پندرہ سال کی تھی۔ یہی زین الدین نوائی کی حکمت و دانائی سے فیض یاب ہونے کے بعد چیتان گوئی کے ماہر کی حیثیت سے جلد ہی سارے ہرات میں مشہور ہو گئے..... عظیم مصور کمال الدین ہزار دے بچپن ہی سے میر علی شیر کی شاگردی میں رہتے ہوئے اپنے فن کو اوج کمال پر پہنچایا۔ شاعر ہلالی اور خطاط سلطان علی مشہدی کی صلاحیتوں کو بھی میر علی شیر ہی نے دریافت کیا اور پروان چڑھایا تھا..... انہی سب باتوں کی بدولت یہ ہرات جو اس وقت ہماری نگاہوں کے سامنے درخشاں ہے، گزشتہ تیس برسوں میں پہلے کی بہ نسبت کہیں زیادہ عالی شان اور خوبصورت ہو گیا ہے۔ درست ہے نا؟“

”آپ کا خیال بالکل درست ہے۔ میں دنیائے اسلام کے جن علاقوں میں جا چکا ہوں وہاں ہرات جیسا عظیم شہر کہیں بھی نہیں دکھائی دیا۔“

”اور جہاں پناہ، ہرات کا یہ سارا حسن، یہ ساری عظمت کیا ہمارے عوام کے جنم دیئے ہوئے باصلاحیت افراد کی تخلیق کردہ نہیں ہے؟“

”یہ بھی بالکل درست ہے! ہمیں نظر آنے والی یہ شاندار عمارت دنیا کو باصلاحیت لوگوں ہی کے ذہنی و فکری خزانے کے عطا کئے ہوئے در شہوار ہیں!“

”در اصل میر علی شیر کو ان خزانوں کو تلاش کرنے اور ان خزانوں کے حامل افراد کو لائق و قابل

لوگوں کی حقیقی راہوں پر گامزن کرنے میں بڑا ملکہ حاصل تھا۔ ان کی اہلیت کا سلطان صاحب قران حسین یترا بھی اعتراف کرتے رہتے تھے۔ آپ نے شاید سنا ہی ہوگا، محترم حکمران کہ بہت سے خود غرض اور بد طبیعت لوگ میر علی شیر اور سلطان صاحب قران کے درمیان نفاق ڈالنے کے کوشاں رہتے تھے..... اور یہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں ”خواند میر کی آواز مرتلش ہوا تھی، ”کہ عظیم میر علی شیر بار ساد پر ہیز گار تھے جبکہ سلطان صاحب قران عیاش تھے اور بد ہوشی کے عالم میں ان سے بعض نازیبا حرکات بھی سرزد ہو جایا کرتی تھیں..... لیکن سلطان حسین یترا اپنی پرہیز گاری کے ایام میں جبکہ ان کی عقل روشن ہوتی تھی، میر علی شیر کو اتنی زیادہ عزت بخشے تھے کہ دیکھنے والے دنگ رہ جاتے تھے۔“

اتنے میں خواند میر کو کوئی دلچسپ واقعہ یاد آگیا اور وہ قدرے پراسرار انداز سے مسکرانے لگا۔ اس راز کو جاننے کی خواہش کے تحت بابر کا چہرہ غیر معمولی تجسس کا آئینہ دار بن گیا۔

میانہ قد خواند میر ابھی خاصا جوان ہی تھا پر مسلسل بیٹھے بیٹھے کام کرتے رہنے کے باعث چربی چھا جانے سے جسم عجب بے ڈول سا ہو گیا تھا۔ اس نے اپنی موٹی موٹی انگلیاں بھوؤں پر پھیریں اور بخوشی بڑے موثر انداز میں قصہ چھیڑ دیا:

”میر علی شیر نے اپنا ”خند“ مکمل کیا جس سے ہم سب کو بے حد خوشی ہوئی۔ انہوں نے یہ کتاب مطالعے کے لئے سلطان حسین کی خدمت میں پیش کی جو جیسا کہ آپ کو معلوم ہی ہے، شعرو سخن کا بہت اچھا تنقیدی شعور رکھتے تھے۔ ”نئے“ کے مطالعے کے بعد ہمارے حکمران نے میر علی شیر کو دربار میں طلب کیا اور سب کے سامنے انہیں مبارک باد دی۔ حسین یترا اپنے ایک قیمتی گھوڑے کو دوسرے تمام گھوڑوں سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ انہوں نے حکم دیا: ”میر آخور“ ہمارے سفیر گھوڑے کو یہاں لایا جائے!“ میر علی شیر نے حیرت کے ساتھ سوچا: ”کیا واقعی ایسے گھوڑے کو تحفے میں دینا چاہتے ہیں؟“ پھر سلطان نے میر علی شیر کو دیکھتے ہوئے کہا: ”عالی جاہ استاد تو آپ ہم سبھی کے ہیں، یہ ناچیز تو آپ کا مرید ہے“ اس اثنا میں طلائی ملمعے والے ساز سے آراستہ گھوڑا دربار میں لے آیا گیا۔ تب حسین یترا نے مسکراتے ہوئے دریافت کیا: ”یہ فرمائیے کہ مرید کو اپنے مرشد کا کتنا ماننا چاہیے نا؟“ میر علی شیر نے اثبات میں جواب دیا جس کے بعد بادشاہ نے فرمایا: ”تو اس گھوڑے پر سوار ہو جائیے!“ سلطان کی حکم عدولی کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا اس لئے میر علی شیر گھوڑے کے پاس گئے۔ پر وہ گھوڑا بے حد تند خو تھا، سلطان کے سوا اور کسی کو بھی سواری نہیں کرنے دیتا تھا، فوراً ہی زین سے گر اڑتا تھا۔ میر علی شیر کے قریب پہنچتے ہی گھوڑا اچھکارنے

چکر کاٹنے اور الف ہونے لگا۔ سلطان حسین نے اٹھ کر گھوڑے کی لگام خود ہی تھام لی اور گھوڑے کو دھمکایا: ”چپ چاپ کھڑا رہ!“ آخر گھوڑا پرسکون ہو گیا اور میر علی شیر اس پر سوار ہو گئے۔ درباری سانس روکے ہوئے بیٹھے تھے کہ گھوڑا بس اچھلنے کو دینے ہی کو ہے۔ سب کو فکر تھی کہ دیکھیں اب کیا ہوتا ہے۔ اور ہوا یہ کہ سلطان حسین گھوڑے کی لگام تھامے دربار سے نکل کر محل کے احاطے میں آگئے اور وہاں اسے شملانے لگے۔ ظاہر ہے کہ تمام درباری حیرت میں پڑ گئے۔ تب سلطان صاحب قرآن نے گھوڑے پر سوار توائی سے فرمایا: ”اس بات کے لئے کہ آپ نے ہماری ترکی زبان میں ”خمسہ“ لکھا ہے، میں تازنگی آپ کے گھوڑے کی لگام سنبالنے کو تیار ہوں!“ اس بات نے سب کو اور بھی زیادہ حیرت زدہ کر دیا اور خود میر علی شیر تو فرط استعجاب سے بے ہوش ہوتے ہوتے بچے، نوکروں کو انہیں گھوڑے پر سے اتارنا پڑا..... تو ایسے واقعات بھی پیش آتے رہتے تھے،

عالی جاہ.....“

”لگتا ہے کہ مجھ پر آپ کی بات واضح ہو گئی ہے“ بابر نے ذرا دیر خاموش رہنے کے بعد کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”جہاں جلنے والے بے شعور افراد یا صلاحیت لوگوں کا گلا نہیں گھونٹ پاتے اور ان لوگوں کے لئے فیاض دلوں والے راستے کھول دیتے ہیں وہاں ترقی کی رفعتوں پر پہنچا جاسکتا ہے۔ سچ ہے نا؟“

بابر نے خواند میر کے دل کی گہرائیوں میں روپوش خواہشات کا درستی اور وضاحت کے ساتھ اظہار کر دیا تھا۔ خواند میر نے محسوس کیا کہ اسے اس اندجانی تاجدار کی شخصیت میں اپنا ایک ہم خیال مل گیا ہے اور اس نے مسرور ہو کر کہا:

”میں آپ کا قائل ہو گیا، عالم پناہ! میر علی شیر اور سلطان صاحب قرآن اپنی اپنی عظمت کے اعتبار سے بے مثل تھے، ان کے دور میں آفتاب ہرات نصف النہار پر تھا۔ لیکن آفتاب نصف النہار پر پہنچنے کے بعد ڈھلنے لگتا ہے۔ میرا دل اس احساس سے لرز اٹھتا ہے کہ ہرات پستیوں کی طرف لڑھکتا چلا جا رہا ہے..... ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ جو تاریکی ہماری طرف امنڈتی چلی آ رہی ہے اس سے کیسے بچیں؟

خواند میر نے پیش بینی کر لی تھی کہ ماورالنہر سے شیبانی خان اور اس کے لشکر کے ساتھ جنگ کی تباہ کن آندھی خراسان کو اپنی لپیٹ میں لیتی ہوئی ہرات کی طرف بڑھتی چلی آ رہی ہے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا بابر ان تکلیف دہ سوالات کا اوروں سے بہتر جواب دے سکے گا؟

”آپ کے شکوک بجا ہیں“ بابر نے بطور تائید سر ہلایا۔ ”مجھے تو ہرات کا موجودہ امن عارضی ہی

لگتا ہے، خطرناک طوفان کی آمد سے قبل کے سنائے جیسا۔ میں تاشقند پہنچا تھا تو مجھے اس شہر کی فضا بھی ہرات کی موجودہ فضا جیسی ہی لگی تھی۔ میں بے شمار مصائب جھیل کر بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ دوزخ سے نکل کر تاشقند پہنچا تھا۔ میں نے اپنے ماموں محمود خان سے کہا کہ متحد ہو کر فوجی اقدام کرنا چاہیے تاکہ آپ کو ایسے مصائب نہ جھیلنے پڑیں لیکن انہوں نے میرا مذاق اڑایا اور جلد بازی سے کام لیا۔ دراصل وہ نااہل لوگوں میں سے تھے اور دوسروں سے حد سے زیادہ رشک کرتے تھے۔ شیبانی خان نے محمود خان کو کس طرح کچل کے رکھ دیا، یہ آپ کو معلوم ہی ہے۔“

”تو کیا شاہ عالی، واقعی یہی سب ہرات میں بھی دہرایا جائے گا؟“

بابر نے کوئی جواب نہ دیا، وہ صرف فضا معلق غبار کے باعث دھندلائی ہوئی دوزیوں کو تکتا رہا جہاں ہرات کے شمال مغرب میں بے کراں ریگستان میں ساق سلمان کی ریت پھیلی ہوئی تھی۔ خواند میر جانتا تھا کہ ہرات میں بابر کی آمد کا مقصد خانوادہ تیموری کے بچے کچے حکمرانوں کو ایک پرچم کے تلے جمع کر کے شیبانی خان کے خلاف طاقتور محاذ قائم کرنا ہے۔ اس سلسلے میں سترہ دنوں سے محل میں خفیہ مذاکرات جاری تھے۔

”جہاں پناہ“ میں نہ ریاست کے رازدوں کو جاننے کی جسارت کر سکتا ہوں اور نہ ہی اس بات کو کہ حکمرانوں کے درمیان کس مسئلے پر گفتگو ہو رہی ہے۔ تاہم خطرے کی نوعیت تو ہم سب کے لئے یکساں ہی ہے.....“

”یہاں ہم اکیلے ہیں“ بابر نے خواند میر کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”میں آپ سے کچھ راز نہیں رکھنا چاہتا۔“ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے ذرا تکیے لہجے میں کہا: ”آپ جانتے ہی ہیں کہ اس وقت دو حکمران، دو بھائی ہرات کے تخت پر بیٹھے ہوئے ہیں۔“

”جانتا کیوں نہیں۔ تخت نشینی کے جائز حقدار بدیع الزماں ہیں لیکن خدیجہ بیگم کے طرفداروں نے مظفر مرزا کے دوسرے بادشاہ ہونے کا اعلان کر دیا ہے۔ تاریخ میں ایسی مثالیں کم ہی ملتی ہیں۔“

صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ خواند میر واقعات کے ایسا رخ اختیار کر لینے سے خوش نہیں ہے۔ بابر نے محتاط انداز میں اپنی بات جاری رکھی:

”ہاں تو..... آپ کے دونوں ہی بادشاہ مہمان نوازی، مہربانی کی گفتگو اور شاندار ضیافتوں کے اہتمام میں اپنا کوئی جواب نہیں رکھتے۔ رہی جنگ و جدل کی بات تو اس سے ان کے مزاج خاک بھی لگاؤ نہیں رکھتے۔ اس خیال کا اظہار میں ذاتی تجربے کی بنا پر کر رہا ہوں۔ دریائے مرغاب کے

کنارے ان دونوں سے میری ملاقات کے وقت ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا تھا..... خبر موصول ہوئی کہ شیبانی کا ایک دستہ چیچیکٹو گھائی میں جو خراسانی علاقہ ہے، کھس آیا ہے۔ خود خان اپنے لشکر کے خاص حصے کے ساتھ دریائے امو کے دوسرے کنارے پر تھا۔ اس کی بہ نسبت ہم لوگ چیچیکٹو سے کہیں زیادہ قریب تھے۔ میں نے کہا کہ اگر چیچیکٹو میں دشمن کے محض پانچ چھ سو سپاہی ہی ہیں تو ہمیں تاخیر نہ کرنی چاہیے، چلے جلدی سے وہاں پہنچ کر حملہ آوروں کو مار بھگائیں تاکہ لٹیرے خان کے دوسرے دستے خراسان پر پھر کبھی حملہ کرنے کی جرات نہ کر سکیں۔ لیکن..... بدیع الزماں مرزا چاہتے تھے کہ چھوٹے بھائی مظفر مرزا اس مہم پر روانہ ہوں۔ آپ کو معلوم ہی ہے کہ دونوں کے دزیر، خدام، فوج اور سپہ سالار۔ سب کچھ الگ الگ ہے۔ مظفر مرزا نے کبھی کوئی جنگ نہیں لڑی ہے، وہ خائف ہو گئے اور چیچیکٹو جانے کی ہمت ہی نہ کر سکے۔ انہوں نے کہا: ”بہتر ہو گا کہ ہمارے بڑے بھائی وہاں جائیں، ہم دوسری سرحدوں کی حفاظت کریں گے۔“ اور بدیع الزماں نے کیا سوچا؟ میرے خیال میں انہوں نے یہی سوچا ہو گا: ”میں جاتا ہوں تو بہت ممکن ہے کہ لڑائی میں کام آجاؤں اور تب میرا بھائی تخت و تاج کا واحد مالک ہو گا“ چنانچہ وہ بھی جانے پر آمادہ نہ ہوئے۔ ان دونوں کی یہ طویل تو توتوں میں مجھ سے برواشت نہ ہو سکی اور میں نے کہا: ”مجھے اجازت دیجئے تو میں خود ہی اپنے بہادوروں کے ساتھ جاکر دشمنوں کو بھگا آؤں“ دونوں بھائیوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، انہیں لوگوں کی موجودگی میں شاید خفت محسوس ہوئی اور مجھے جواب دیا: ”آپ تو ہمارے مہمان ہیں بہتر ہو گا کہ ہم سب ساتھ ہی ہرات چلیں۔“ انہوں نے میری میزبانی تو خوب کی لیکن چیچیکٹو پر شیبانی کا قبضہ ہو گیا۔ ہے نا عجیب سی بات؟“

خاندان میر نے گہری ٹھنڈی سانس لی:

”ہرات سے تقدیر نے منہ پھیر لیا ہے، جہاں پناہ..... آپ اور ول سے بہتر طور پر جانتے ہیں کہ آج ہمارے سروں پر مصائب کے کیسے کیسے بادل منڈلا رہے ہیں۔ مصور ہنزدا کو بھی یہی خیال ہے۔ ہرات کے تمام صاحبان علم و فن کی جو شہر کے سچے خیر خواہ ہیں، ساری امیدیں آپ ہی سے وابستہ ہیں۔ شاید آپ ہمارے حکمرانوں کو یقین دلا سکیں کہ خطرہ کتنا سنگین ہے جس کے بعد ہم اپنی مشترکہ کوششوں سے اس خطرے کو ٹال سکیں گے۔“

”میں کچھ کہہ نہیں سکتا، جناب، کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔“

اور بابر نے اپنی نگاہیں فرش پر گاڑ دیں۔ ”مجھے جلد ہی آپ کے تاجداروں سے ملاقات کرنی

چاہیے۔“

”خدا کرے آپ اپنے مقصد میں کامیاب ہوں، جہاں پناہ!“
 ”شکریہ..... لیکن میں کچھ کہہ نہیں سکتا، کچھ بھی نہیں کہہ سکتا....“
 ”میں اسے نیچے اترتے وقت باہر نے ٹیلے پر بنے ہوئے ہرات کے شاہی محل کو معاندانہ نگاہوں سے دیکھا۔

۳

دونوں تاجدار اور ان کے مغرب امرا و روسا شاید اس وجہ سے کہ موسم خزاں کچھ گرم تھا، اپنا وقت فہرست شہر سے باہر واقع باغات میں گزار رہے تھے۔

شہر کے شمال مغرب میں واقع سفید سنگ مرمر کے محل ”باغ سفید“ میں جسے عہد شاہ رخ ہی سے شہرت حاصل تھی، مظفر مرزا نے باہر کے اعزاز میں ایک شاندار ضیافت کا اہتمام کیا تھا۔ ہرات کے نامی رکاب دار ریگستانی ہرن کے نرم گوشت کے سج کباب تیار کر رہے تھے اور زیرے اور دیگر مسالوں کی سوندھی خوشبو والے مختلف کھانوں کی قافیں یکے بعد دیگرے محل کی سہرے بیل بوٹوں سے آراستہ دیواروں والی اوپری منزل میں لائی جا رہی تھیں۔ دروازے کے قریب بیٹھے ہوئے سازندوں نے مسرور کن شیریں دھنیں چھیڑ رکھی تھیں اور مشہور و معروف مغنی نیچی آواز میں نشاط و غم کے ملے جلے جذبات سے معمور پراثر گیت گارہے تھے۔

ضیافت شباب پر پہنچ چکی تھی تو ساقی باہر کے پاس آکر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور اس نے صراحتی سے تیز اور مسالے دار بیہ سالہ مے ناب طلائی جام میں انڈیلی۔ باہر نے اس وقت تک دختر زکو کبھی بھی منہ نہیں لگایا تھا لیکن جانے گیتوں اور موسیقی کے زیر اثر یا اپنے یا سہمی کے دلوں پر چھائی ہوئی افسردگی کے زیر اثر اچانک اس کا جی چاہا کہ جو جام اس کی طرف بڑھایا گیا اسے خالی کر دے۔ اس نے عادتاً ”قاسم بیک کی طرف دیکھا جو اس کے قریب ہی بیٹھا ہوا تھا۔

قاسم بیک اس کی اجازت سے حصار چلا گیا تھا لیکن اسی سال اپنے سپاہیوں کے ساتھ باہر کے پاس لوٹ آیا تھا۔ کابل میں اسے ایک بار پھر باہر کے قریبی مشیر کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ قاسم بیک مذہبی آدمی تھا، خود نے کبھی شراب نہیں پی تھی اور باہر کو بھی نشہ آور مشروبات سے دور رکھنے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔

”عالی جاہ“ قاسم بیک نے چپکے سے کہا، ”یہ تو آپ کو بدیع الزماں مرزا کی دعوت میں بھی پیش کی گئی تھی لیکن آپ نے نہیں پی تھی، یاد ہے نا؟ اس وقت پی لیں گے تو بڑے بھائی کو معلوم ہو گا اور شاید وہ برا مان جائیں۔“

ان الفاظ نے باہر کو دونوں بھائیوں کے اچھے ہوئے معاملات پر جو کسی طرح سلجھنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے، ایک بار پھر متوجہ کر دیا۔ اس نے بادہ نوشی کی خواہش کو دبا کر مظفر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

”محترم مرزا، معافی چاہتا ہوں۔ میں نے کبھی بھی نہیں پی۔“
 باہرے ناب سے ڈرتا ہے؟ مظفر مرزا نے سوچا اور نشتے کے اکھڑپن میں ناشائستگی کے ساتھ زوردار قہقہہ لگایا۔

”مہمان عزیز، اندجان اور سمرقند میں لوگ شراب کی عطا کردہ مسرتوں سے خود کو محروم رکھتے ہیں کیا؟ وہاں آپ لوگوں کو اور کاہے سے مسرتیں حاصل ہوتی ہیں؟“
 ”میرے عزیز مرزا، سمرقند اور اندجان میں بھی اس نوعیت کی مسرتیں ضرورت سے زیادہ ہی پائی جاتی ہیں۔ لیکن آپ کے اس خادم کے لئے تو دوسری نوعیت کی فکریں اور... مسرتیں ہی بہت تھیں... اس سلسلے میں آپ کے برادر محترم بدیع الزماں مرزا نے بھی میری معذرت قبول کر لی تھی، انہیں ذرا بھی حیرت نہیں ہوئی تھی کہ میں پابند شرع ہوں۔“

بدیع الزماں کا نام سن کر مظفر ذرا سنجیدہ ہو گیا۔ اس نے سوچا: ہونہ، آخر میں بھی تو پابند شرع ہوں، یہ اندجانی نہیں بیٹا تو یہ اس کی حماقت ہے، اس سے اصرار تھوڑی کروں گا۔ اور اس کے اشارے پر ساقی نے بڑی مستعدی سے وہ جام بدیع الزماں مرزا کے وزیر ذوالنون بیگ ارغن کو پیش کر دیا جسے اس لئے مدعو کر لیا گیا تھا کہ لوگ کہیں یہ نہ سوچیں کہ چھوٹا بھائی بڑے بھائی کے خلاف کوئی سازش کر رہا ہے۔

رنگ رلیاں زور پکڑتی جا رہی تھیں۔ نشتے کے عالم میں بیگ بار بار اپنی جگہوں سے اٹھ کر دیوان خانے کے وسطی حصے میں رقص کرنے لگتے تھے۔ مشہور اسکیا بازوں میر سربرہنہ اور برہان گنگ کے درمیان جاری پر لطف نوک جھونک پر اتنے زوردار قہقہے بلند ہو رہے تھے کہ لگتا تھا چھت کا شاندار آرائشی پلستر اکھڑ کر گرنے ہی کو ہے۔

حسین بیگرا کے انتقال کو ابھی تھوڑی ہی دن ہوئے تھے اور اس کے بیٹے اتنی لاپرواہی کے ساتھ کھجھرے اڑا رہے تھے، وہ بھی ایسے زمانے میں جب کہ شیبانی خراسان کی سرحدوں پر پہنچ چکا تھا۔

قاسم بیگ نے اپنے غصے کو اس خیال سے کہ کیس بھڑک نہ اٹھے، کہیں ان جاہل عیاشوں کو پتا نہ لگ جائے، دباتے ہوئے باہر سے چپکے سے کہا:

”اس کتے نوجوان بادشاہ سے تو اب آپ کے باتیں کرنے کا سوال ہی نہیں رہ گیا۔ ویسے بھی یہ اپنی مرضی کا مالک نہیں ہے، جو کچھ بھی ہوتا ہے اس کی والدہ خدیجہ بیگم کے حکم ہی سے ہوتا ہے۔ آئیے، چل کر انہی سے باتیں کر لیں۔“

”صیافت ختم ہونے سے پہلے ہی اٹھ لیٹا نامناسب ہوگا؟“

”آپ کے اس خادم نے سب کچھ پہلے ہی سے طے کر رکھا ہے۔ بیگم صاحبہ بڑی بے صبری سے آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔“

آخر اسکیا بازوں کا مقابلہ ختم ہو گیا اور تھکے تھکے تو باہر نے مظفر مرزا سے اس کی والدہ سے ملاقات کی اجازت مانگ لی۔

ظہیم الشان محل کی تینوں منزلوں پر جگہ جگہ شمعیں روشن تھیں۔ بابر، قاسم بیگ اور مظفر مرزا کا ایک مقرب بورندوق بیگ جوان دونوں کو خدیجہ بیگم کے پاس لے جانے کے لئے ساتھ آیا تھا، نرم اور خوبصورت قالین پر چلتے ہوئے تیسری منزل پر پہنچ گئے۔ بابر چند لمحوں کے بعد شروع ہونے والی دشوار گفتگو کے بارے میں سوچ رہا تھا اس کے باوجود دیوار پر بنے ہوئے نقش و نگار کو دیکھتا جا رہا تھا۔ اس طرز کی آرائش شاہ رخ کے حکم پر اس کے بیٹے بائے سنقور کے لئے کی گئی جو خود بھی رنگوں اور نقاشی کا اچھا تنقیدی شعور رکھتا تھا۔

خدیجہ بیگم نے بابر سے اپنے شاندار دیوان خانے میں ملاقات کی۔ اس نے بابر کو جان بوجھ کر خود سے کچھ دور چھ پایلوں کی جن پر سونے کے پتر چڑھے ہوئے تھے، میز کے پاس بٹھایا۔ میز کی چمکتی ہوئی سطح پر سیپ کا جڑاؤ کام بنا ہوا تھا۔ خدیجہ بیگم بڑی آن بان سے بیٹھی ہوئی تھی اور اپنی چالیس سال کی عمر کے باوجود خاصی سڈول اور حسین و جمیل لگ رہی تھی۔ اس کے عقب میں نمایاں ترین جگہ پر رکھا ہوا سونے کے تتے، زمرد کی پتیوں اور یاقوت کے گلابوں والا ایک عجیب و غریب پودا ورخشاں تھا۔ اس کی ایک ٹہنی پر سونے کی بلبل دکتے ہوئے ہیرے کو چونچ میں دبائے بیٹھی تھی۔ دروازوں اور درپچوں کے پردوں میں بھی چھوٹے چھوٹے قیمتی ہیرے چمک رہے تھے۔

چاندی جیسی چمک دمک والے سیاہ لباس میں ملبوس خدیجہ بیگم نے زیورات نہیں پہن رکھے تھے، صرف سر کی نیلگوں، محروطی ٹوپی میں البتہ نادر موتی لٹکے ہوئے تھے جو بیگم کی طرف براہ راست دیکھنے کی جرات کرنے والے کی آنکھوں کو اپنی تابانی سے خیرہ کر دیتے تھے۔ شان و شوکت، امارت لیکن سادگی! دیوان خانے میں موجود دوسری خواتین کے رنگ برنگ لباس آنکھوں کو ہیا رہے تھے لیکن خود ملکہ کی وضع قطع کہہ رہی تھی کہ وہ ان خواتین سے مختلف ذوق و پسند

رکھتی اور ذہانت کو عیش و آرام پر ترجیح دیتی ہے۔

باہر اس ماحول میں کچھ بوکھلا سا گیا اور گفتگو نہ شروع کر سکا۔ ویسے ان بھی دھجی خواہش کی موجودگی میں خفیہ امور سلطنت پر گفتگو کی بھی کیسے جاسکتی تھی۔ خدیجہ بیگم پر سکون انداز میں لطف و عنایت کے ساتھ مسکرائے لگی۔

”میرے عزیز مرزا، آپ کوئی غیر تھوڑی ہیں، ہمارے رشتے دار ہیں اور یہ میری بہن ہیں جو ہمارا بہت زیادہ احترام کرتے ہوئے شریک گفتگو رہیں گی۔“ اور اس نے اچانک ناز و انداز کے ساتھ اضافہ کیا: ”جو باتیں کرنی ہیں، کیجئے نا۔ بھلا شرباب کی کیا ضرورت ہے۔“

”شکریہ“ باہر بس اتنا ہی کہہ سکا۔

شمعوں کی مدھم روشنی میں خواتین کے متعلق جن کی آنکھیں ابھی بند تھیں، چہرے باریک سفید نقابوں سے ڈھکے ہوئے تھے، یہ کہنا مشکل تھا کہ کون کیسی ہے تاہم حنا آلود نازک نازک ہاتھوں، ابھرے ہوئے سینوں اور پتلی کروں پر پکے ہوئے ریشمی لباسوں سے صاف ظاہر تھا کہ وہ ابھی جوان ہی ہیں۔ تارا کو زینبیم نے جس کے متعلق کہا جاتا تھا کہ مظفر مرزا کی سب سے دلکش اور بہت زیادہ محبت کرنے والی بیگم ہے، ساس کے کان کے پاس منہ لے جا کر چپکے سے کچھ کہا اور دھیرے سے ہنس پڑی۔ خدیجہ بیگم بھی ہنس پڑی لیکن زور سے، قدرے شرارت آمیز انداز سے۔ پھر اس نے سر کو جھٹک کر باہر سے کہا:

”میرے عزیز مرزا، سنا ہے کہ ہرات کے اعلیٰ حاکم کی شاہی خاندانوں کی حسینائیں بھی آپ پر محبت بھری نگاہیں ڈالتی ہیں لیکن پتا چلا ہے کہ آپ جیسا شجاع حکمران اور خوبصورت دلیر نوجوان بھی، آپ جیسا باصلاحیت شاعر بھی حرم کے بغیر کنواری ہی زندگی بسر کر رہا ہے۔ کیا یہ سچ ہے؟“

باہر کا چہرہ سرخ ہو گیا اور اس نے نظریں پھیرتے ہوئے سوچا کہ آخر یہاں اس کے حرم یا کنواری زندگی کے تذکرے کا کیا تک ہے، سب کچھ تو جانتی ہیں پھر بھی دریافت کر رہی ہیں۔

”یہ سچ ہی ہے، ملکہ عالیہ“ اس نے اپنی گھبراہٹ پر تابیلا تے ہوئے کہا۔ ”شاید میری قسمت میں غمی لکھا تھا۔“

”میں تو سمجھتی ہوں کہ اب قسمت آپ پر مہمان ہو جائے گی۔ آپ ہرات میں روک جائیے، مظفر مرزا کے بھائی کی طرح رہئے۔ آپ دونوں ہی تیوری خاندان کے حکمران ہیں۔ ہرات میں ہم آپ کے لئے کوئی حسین و جمیل اور سلیقہ مند لڑکی تلاش کر لیں۔ آپ کی شادی کر دیں گے۔“

اور ایسی شاندار ضیافت کا اہتمام کریں گے کہ نہ پوچھئے۔“

اس شوخ مذاق میں ایک سنجیدہ اشارہ مضمحل تھا، بہت ہی سنجیدہ اشارہ۔ بابر پر فوراً ہی واضح ہو گیا کہ بظاہر سیدھے سادے معلوم ہونے والے ان الفاظ کے ذریعے چالاک اور دور اندیش خدیجہ اسے کیسی سازش میں پھانس رہی ہے۔ وہ سلطان حسین بیکرا کے پوتے مومن مرزا کے قاتلوں کی حوصلہ افزائی کر چکی تھی اور اب لگ رہا تھا کہ بدیع الزماں کو بھی راستے سے ہٹانے کا منصوبہ بنا رہی ہے تاکہ اس کا بیٹا مظفر مرزا ہرات کا واحد حکمران بن بیٹھے۔ بابر نے سوچا کہ اگر وہ مظفر کا بھائی بن کر رہ جائے گا تو خدیجہ بیگم کو مقصد کے حصول میں وہ خود ہی معادن نہ ثابت ہو گا تو پھر کون ہو گا۔

”میں آپ کا شکر گزار ہوں، ملکہ عالیہ کہ آپ میرا اتنا خیال کر رہی ہیں“ بابر نے مصنوعی انکسالی سے کہا۔ ”لیکن ہم سب کی راہ میں ایک رکاوٹ حائل ہے۔“

”رکاوٹ کیسی؟“

”آپ مجھے معاف فرمائیں لیکن یہ بات ان خواتین کے نازک کانوں کے لئے ناقابلِ سماعت نہیں... معاف کیجئے گا...“

اور بابر نے سر جھکا لیا۔ خدیجہ بیگم اپنی آرام کرسی پر تن کر بیٹھ گئی۔ اس نے آنکھوں سے اشارہ کیا اور خواتین بار بار کورٹش بجالاتی ہوئی دیوان خانے سے چلی گئیں۔

تب بابر نے بتدریج جوش میں آتے ہوئے وہ بات چھیڑی جس کا شادی وغیرہ سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ اس نے کہا کہ ہرات پر شیبانی خان کا حملہ یقینی ہے، ایسے میں جشنوں، ضیافتوں اور شادی بیاہ کی نگروں کو بلائے طاق رکھ کر سب کو زندگی اور موت کے سوال کی بنیاد پر جدوجہد کی تیاری کرنی چاہئیں۔

”شیبانی نے اندجان سے خوارزم تک، مرو سے ترکستان تک وسیع و عریض علاقوں پر تسلط قائم کر لیا ہے اور بے شمار سپاہی اکٹھا کر لئے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ ہر جگہ کی تیاری بہت جی لگا کر کرتا اور میدان جنگ میں تیزی سے اپنے لشکر کو اتارتا ہے تو بہادر سے بہادر اور ہوشیار سے ہوشیار سپہ سالار بھی اس کے سامنے نہیں ٹک پاتے... میں یہ سب... خود اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں۔“

بابر نے شیبانی خان کی فوجی طاقت اور اس کی سنگدلی کو ثابت کرنے کے لئے بہت سے دلائل پیش کئے۔ آخر کار خدیجہ بیگم کے ممبر کا بیٹا نہ لبرز ہو گیا:

”ارے مرزا، ہمیں یہ بتائیے کہ آخر ہم اس بلا کو ٹالیں کیسے؟“

”اس کا بس ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ خاندان تیوریہ کے سب حکمرانوں کو متحد کیا جائے“
 صحیح معنوں میں متحد کیا جائے! جہاں جہاں ہماری حکومتیں اب بھی برقرار ہیں وہاں سپاہی بھرتی کئے
 جائیں، انہیں ایک ساتھ تربیت دی جائے تاکہ پچاس ساٹھ ہزار فوجیوں کا ایک لشکر تیار ہو جائے۔
 اس لشکر سے موسم سرما کے پورے زمانے میں جنگی مشقیں کرائی جائیں اور کسی ایک سپہ سالار کی
 کمان میں میدان جنگ میں اتارا جائے۔“

”آپ کے خیال میں یہ ”ایک سپہ سالار“ کون ہو سکتا ہے؟“ خدیجہ چونک اٹھی۔
 قاسم بیگ نے فوراً ہی بابر کی طرف دیکھا۔ اس پر یہ بخوبی واضح تھا کہ مجوزہ لشکر کا ممتاز ترین سپہ
 سالار صرف بابر ہی ہو سکتا تھا۔ خود بابر بھی اس بات کو جانتا اور یہی چاہتا بھی تھا لیکن زمانہ قدیم ہی
 سے یہ حقیقت واضح چلی آرہی تھی کہ فوج جس کے قابو میں ہوتی تھی وہی حکومت بھی کرتا تھا۔
 مشترکہ فوج کا سالار بابر کو ہرگز نہیں بتایا جاسکتا تھا، خدیجہ یہ کبھی بھی گوارہ نہیں کر سکتی تھی کہ اس
 کے بیٹے کے سوا کوئی اور حکومت کرے۔

بابر خدیجہ بیگم کو مطمئن کرنے کے لئے کہہ سکتا تھا: ”سپہ سالار مظفر مرزا بن سکتے ہیں!“ (اور وہ
 خود مظفر مرزا کا مشیر خاص) لیکن دیوان خانے میں دوسرے بادشاہ بدیع الزماں کا وزیر ذوالنون بیگ
 بھی موجود تھا۔ بھائیوں کا باہمی تنازعہ ویسے ہی کافی بڑھ چکا تھا۔

”سپہ سالار کون ہوگا اس کا فیصلہ تاجدار برادران کو کرنا چاہئے۔ ضیافتوں کا سلسلہ بند کر کے
 ملک کی حفاظت پر توجہ مبذول کی جانی چاہئے۔ اس وقت تو ایک ایک دن بے حد اہمیت رکھتا ہے،
 ملکہ عالیہ۔“

خدیجہ بیگم نے بورندوق بیگ اور ذوالنون کی طرف دیکھا جیسے ان کی رائے معلوم کرنا چاہتی ہو۔
 ذوالنون بیگ نے اپنی بھویں سکوڑ کر جس سے ان کے بال کھڑے ہو گئے، بابر پر نظریں جماتے
 ہوئے کہا:

”یہ کہ ہمارے مہمان، اعلیٰ حضرت مرزا نے ہمیں شیبانی خان کی چالوں اور اس کی طاقت سے
 آگاہ کر دیا، ظاہر ہے کہ ایک اچھی بات ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر شیبانی خان سے خراسان
 میں قدم رکھنے کی حماقت سرزد ہوئی تو جس تلوار سے اس نے ماورالنہر کو فتح کیا ہے اسے یہاں توڑ دیا
 جائے گا۔ میں ایک بار پھر کہہ رہا ہوں اور مجھے اس کا پورا یقین ہے، ملکہ عالیہ کہ گھبرانے اور خوف
 زدہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔“

ذوالنون بیگ کی یہ بات جیسا کہ صاف ظاہر ہو رہا تھا، خدیجہ بیگم کو بہت پسند آئی۔

”محترم بیگ، خدا کرے کہ شیبانی کی تلوار تو ڈویئے جانے سے متعلق آپ کی پیش گوئی درست ثابت ہو۔ لیکن آپ کے ایسا سوچنے کے لئے کوئی بنیاد بھی ہے؟“ بابر نے اس بار پر متحیر ہو کر پوچھا کہ یہ لوگ اتنے زیادہ سادہ لوح اور ایسے سخی باز ہیں۔

”یہ خیال صرف میرا ہی نہیں، محترم مرزا، ہرات کے معزز اولیا اور شیوخ بھی یہی رائے رکھتے ہیں۔“

ذوالنون بیگ نے ہنستے ہوئے خدیجہ بیگم کو التجا بھری نگاہوں سے دیکھا جو ازراہ کرم مسکرائی اور وضاحت کرنے لگی:

”مہمانان عزیز، ہمارے ہرات میں ایک بہت ہی مشہور بزرگ رہتے ہیں جو قطب کہلاتے ہیں۔ انہوں نے اب تک جتنی بھی پیش گوئیاں کی ہیں، سب سچی ثابت ہوئی ہیں۔ محترم ذوالنون بیگ کے وزیرین جانے کے بعد ان بزرگ کو بشارت دی گئی کہ شیبانی خان کی تلوار کو ذوالنون بیگ ہی توڑیں گے۔ ہمارے ہاں کے قابل احترام نجومیوں نے ستاروں کے حکم سے اس پیش گوئی کی تصدیق بھی کر دی...“ خدیجہ بیگم اب کھل کر مسکرائیں اور بابر کو لگا کہ وہ اس ”دانشمند“ وزیر کا کھلے عام مذاق اڑا رہی ہیں۔ ”اس کے بعد ہمارے شیوخ نے ذوالنون بیگ کے شانے پر پڑھا ہوا گذا باندھ دیا اور انہیں ایک لقب عطا کیا: ”حربر اللہ“۔“

حربر اللہ، شیر خدا، ہمیشہ فتح حاصل کرنے والا۔ بابر جانتا تھا کہ بہت سے عربی الفاظ کئی کئی معنی رکھتے ہیں نیز یہ کہ حربر شیر ہی کو نہیں بلکہ موٹی ٹھوس چیز کو بھی کہتے ہیں۔ اس نے سوچا کہ عربی کے لقب بھی کتنے پر فریب ہوتے ہیں اور اس کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ بکھر گئی۔

”جہلا اس بات پر کون شک کر سکتا ہے کہ محترم ذوالنون بیگ صحیح معنوں میں حربر اللہ ہیں! اور ملکہ عالیہ نے بھی شیوخ اور پیران دانا کی پیش گوئی کا تذکرہ بہت ہی بروقت کیا ہے۔ مجھے وہ دن یاد آرہا ہے جب میں سرپل میں صرف اپنی طاقت کے بھروسے پر شیبانی سے کھلے میدان میں ٹکر لینے کے لئے نکل کھڑا ہوا تھا۔ محترم قاسم بیگ بھی وہاں موجود تھے اور اس بات کی تصدیق کر سکتے ہیں۔ اس موقع پر ایسے ہی پیروں اور نجومیوں میں سے ایک نے مجھ سے کہا تھا: ”خوش بختی کے آٹھ ستاروں کا سایہ ابھی آپ کے سر پر ہے۔ اگر آپ کل میدان جنگ میں اتریں گے تو فتح آپ کے قدم چومے گی۔“ افسوس کہ اس نے مجھے حربر اللہ کا لقب نہیں عطا کیا تھا۔ میں نے اس لقب کے بغیر ہی کمک کا انتظار کرے بغیر ہی اپنی فوج میدان جنگ میں اتار دی... اور شکست کھا گیا کیونکہ اکیلا تھا“ بابر نے کسی طنز کے بغیر کہا۔ ”اور اپنی اس غلطی کا خمیازہ آج تک بھگت رہا ہوں۔“

خدیجہ بیگم کے چرے پر اداسی چھا گئی، ہونٹ بچھ گئے لیکن ذوالنون بیگ نے بڑے تکبر کے ساتھ باہر کی بات کی مخالفت کی:

”محترم مرزا، ہمارے ہرات کے پیر آپ کے سمرقند کے نجومیوں جیسے نہیں ہیں! ہرات جیسے عظیم شہر میں سربل والی غلطی نہ دھرائی جائے گی!“

”عقل کا اندھا کیس کا!“ باہر نے سوچا۔

بورندوق نے وزیر کو جو آپے سے باہر ہوا جارہا تھا، پرسکون کرنے کی کوشش کی:

”محترم ذوالنون بیگ، ہمارے ذی جاہ مہمان ہماری خیر خواہی کے جذبے ہی سے اتنی دور سے یہاں تشریف لائے ہیں۔ ہمارے حالات واقعی بہت پر خطر ہیں اور یہ بھی سچ ہے کہ ہمیں شیبانی خان سے ٹکر لینے کی فکر کرنی چاہئے، اس معاملے میں تاخیر کی ذرا بھی گنجائش نہیں۔“

خدیجہ بیگم نے اس وقت دونوں بحث کرنے والوں میں سے کسی کی بھی طرف داری نہ کرنے اور انہیں نرمی سے قائل کرنے کا فیصلہ کیا:

”ذی حرمت ذوالنون بیگ، آپ کو بخوبی احساس ہونا چاہئے کہ واقعی ہم لا پرواہی نہیں برت سکتے اور ہمارے بورندوق کو یہ نہ بھولنا چاہئے کہ بار بار شکست کھانے والے کو خطرات کے معاملے میں رائی کا پہاڑ بنانے کی عادت پڑ جاتی ہے۔ ہمارے عظیم مہمان بھی بالکل یہی کر رہے ہیں... مرزا صاحب، آپ ضرورت سے زیادہ پریشان نہ ہوں۔ اگر شیبانی خان نے ہرات پر حملہ کرنے کی حماقت کی تو اسے تھپتا“ اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے گا!“

”مجھے حیرت ہوتی ہے کہ خدیجہ بیگم جو زمانے کے اتنے نشیب و فراز دیکھ چکی ہیں، پیروں اور چاپلوں نجومیوں پر اعتبار کر رہی ہیں“ باہر نے اگلے روز بدیع الزماں مرزا سے کہا۔

بدیع الزماں نے جو شکل صورت اور آنکھیں سکوڑنے کی عادت کے اعتبار سے بالکل اپنے والد حسین بیقرار پر پڑا تھا، نفرت بھری مسکراہٹ کے ساتھ کہا:

”حیرت کا ہے کی۔ کچھ بھی کئے، عورت ہمیشہ عورت ہی رہتی ہے۔ عورت کی عقل تو گدی میں ہوتی ہے۔“

”مگر اس کو تاہنہ بینی کے نتیجے میں تو سر پر بہت بڑی بلا نازل ہو سکتی ہے...“

”لیکن کبھی کیا سکتے ہیں۔ انہی کی پر فریب سازشوں سے تو میرے تخت جگر مومن مرزا کو قتل کر دیا گیا تھا۔“

”محترم حکمران، اس تکلیف دہ غلطی کو تو اب فراموش ہی کر دیجئے، کیونکہ کہا جاتا ہے کہ اس

وقت آپ کے والد مرحوم نئے میں تھے۔“

”کبھی بھی نہیں فراموش کر سکتا... میرے والد مرحوم کا اس میں ذرا بھی تصور نہ تھا۔ سلطان صاحب قرآن اپنے پوتے سے بے حد محبت کرتے تھے، اس کے اشعار تک انہیں زبانی یاد تھے... وہ مجھ سے بھی بہت محبت کرتے تھے۔ ان کے نزدیک میں، صرف میں ہی دلی عہد تھا! خدیجہ بیگم ہی دونوں میں دشمنی کرانے کے طریقے تلاش کرتی رہتی تھیں۔ جب مومن مرزا ان کے بیٹے اور افسوس کہ میرے سوتیلے بھائی مرزا مظفر سے لڑتے ہوئے قید کر لئے گئے تھے تو وہ کسی غیر کی قید میں تھوڑی، اپنے چچا ہی کی قید میں تھے!... لیکن خدیجہ بیگم کو جس طریقے کی تلاش تھی وہ انہیں مل گیا۔ انہوں نے مدہوش سلطان کے حکم سے مومن مرزا کو قتل کروایا اور اس طرح مجھے اور والد مرحوم کو ایک دوسرے کا جانی دشمن بنا دیا۔ اس کے بعد میرے بجائے خدیجہ بیگم کے بیٹے مظفر مرزا کو دلی عہد بنا دیا گیا... موجودہ صورت حال انہی چال باز خاتون کے کرتوتوں کا نتیجہ ہے! میں جانتا ہوں کہ وہ مجھے عارضی طور پر برداشت کر رہی ہیں، مناسب موقع کی تلاش میں ہیں تاکہ مجھے ٹھکانے لگا کر مظفر مرزا کو ہرات کا واحد حکمراں بنادیں۔“

بابر نے بدیع الزماں کی توجہ شیبانی خان کی طرف مبذول کرانے کے ارادے سے پوچھا کہ کیا اسے خان کے بارے میں کوئی خبر ملی ہے۔

”خان خوارزم پر قبضہ کر کے سمرقند لوٹ گیا ہے...“

”یعنی اب خراسان کی باری ہے۔ اب وہ خراسان پر حملہ آور ہوگا“ بابر نے یقین کے ساتھ کہا۔

”فوراً ہی حملہ کر دے گا؟ خوارزم پر لشکر کشی کے بعد سال دو سال آرام نہ کرے گا کیا؟“

”ہونہ، بابر نے سوچا، تو ہرات کا یہ دوسرا بادشاہ بھی بالکل بے خبر ہی ہے۔ اس کے پاس تو جیسا کہ صاف ظاہر ہو رہا ہے، شیبانی کے ہاں کی خبریں لانے والے خبر تک نہیں ہیں۔ دونوں بھائی اپنے اپنے مخبروں کے ذریعے ایک دوسرے کی سرگرمیوں پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ انہیں خاندان تیموری کے جانی دشمن شیبانی سے بھلا کیا واسطہ اور بابر نے اس اندھے پن پر متغیر ہو کر بدیع الزماں کو ایک بار پھر سمجھانے کی کوشش کی:

”میں اپنے ذاتی تجربے کی بناء پر جانتا ہوں، حکمراں کہ شیبانی خان کتنا دور اندیش اور مکار ہے۔ مجھے اس بارے میں ذرا بھی شک نہیں کہ خان کے جاسوس و رویشوں یا سوداگروں کے ہمیں میں ہرات آتے رہتے ہیں اور ان کے ذریعے اسے سمرقند میں یہاں کی ساری خبریں ملتی رہتی ہیں۔“

بدیع الزماں نے اپنی لاپرواہی پر باہر کے اس مخفی طنز کو محسوس کیا لیکن اسے مذاق میں ٹال دیا:

”ارے مرزا صاحب، آپ کے جاسوسوں نے سمرقند سے کچھ نئی خبریں بھیجی ہیں کیا؟“

”یقین مانیئے کہ میں جتنی عزت اپنے والد کی کرتا تھا اتنی ہی آپ کی بھی کرتا ہوں۔ میں آپ کا مہمان ہوں، اپنے ذاتی تجربے کی بناء پر یہ عرض کر رہا ہوں کہ شیبانی اپنے دشمنوں کی لاپرواہی سے فائدہ اٹھانے میں طاق ہیں۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا کہ شیبانی اس پر حملہ کر دے گا لیکن شیبانی ایک لشکر کشی کے بعد مقبوضہ علاقے میں اپنی تھکی ہوئی فوج کو چھوڑ کر فوراً ہی دوسرے اور تازہ دم لشکر کے ساتھ کسی اور جگہ حملہ کر دیتا ہے۔ اس کے حملے کی توقع نہ کرنے والا فوری طور پر اپنی طاقت کو مجتمع ہی نہیں کر پاتا۔ شیبانی کی ساری طاقت اس بات میں مضمر ہے کہ وہ اپنے سارے بھائیوں اور رشتہ داروں کو جو اس کی کچھ بھی مدد کر سکتے ہیں، ساتھ لے کر لڑتا ہے۔۔۔ ایسے دشمن سے سابقہ پڑا ہے تو تیمور خاندان کے تمام حکمرانوں کو چاہئے کہ اپنی اختلافات اور جھگڑوں کو بھول جائیں۔ اگر ہم سب متحد نہ ہوں گے، ایک سپہ سالار کی کمان میں جنگ کی تیاریاں نہ کریں گے تو ہم مصیبت میں پھنس جائیں گے!“

”ایک سپہ سالار کی کمان میں کیا مطلب؟ کون ہوگا، مرزا صاحب؟“

باہر پر اب پوری طرح واضح ہو گیا کہ دونوں بھائی یہی سوچ رہے ہیں: ”اگر میں نہ بن سکوں تو دوسرا بھی نہ بننے پائے“ خواہ وہ سلطنت جس کے لئے دونوں میں کھینچا تانی جاری ہے، ان دونوں یا ان کے چچیرے بھائی باہر کے قبضے میں رہنے کے بجائے، اگر قسمت کو یہی منظور ہو تو کسی غیر کے قبضے ہی میں کیوں نہ چلی جائے۔

”تو آپ دونوں میدان جنگ میں بھی الگ الگ ہی اترنا چاہتے ہیں کیا؟“ باہر نے پوچھا۔

”اور کیا صورت ہو سکتی ہے؟ دونوں کی فوجیں اور امرا الگ الگ ہی تو ہیں۔ مظفر مرزا پر مجھے ذرا بھی اعتبار نہیں۔ آپ کے ساتھ البتہ میں کسی بھی جنگ میں جانے کے لئے تیار ہوں۔ میرے عزیز مہمان، آپ ہرات میں ٹھہر جائیے، میرے سپہ سالار بن جائیے۔ جس چیز کی بھی ضرورت ہو فرمائیے، انتظام کر دیا جائے گا۔“

دونوں بھائی اگر کسی بات پر متفق تھے تو صرف اپنی اس خولپوش کے سلسلے میں ہی کہ فن حرب کا ماہر یا ہر اپنے سپاہیوں اور بیگوں کے ساتھ ہرات میں ٹھہر جائے اور وہ خطرے کی گھڑی میں شیبانی کے خلاف محض اسی کے ساتھ مل کر میدان جنگ میں اترے، دوسرے بھائی کے ساتھ نہیں۔

باہر کو حسین۔۔۔ بیٹوں کا یہ مشترکہ اقتدار اس کشتی جیسا معلوم ہوا جس کے پیندے میں

سوراخ ہو گئے ہوں۔ اس نے سوچا ایسی کشتی پر آخر کیوں سوار ہو جاؤں جس کا غرقاب ہونا یقینی ہے؟

۴

فضل الدین آخر کار ہمت کر کے بابر سے ملاقات کے لئے انیہ آیا۔ محل میں نماز ظہر کے بعد عموماً ”شناٹا چھا جاتا تھا لیکن اس روز ایسا نہیں ہوا تھا۔ سپاہیوں اور خدمت گاروں کی بھاگ دوڑ سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی طویل سفر کی تیاریوں میں مصروف ہوں۔ اسے طاہر جو خاصا متشکر اور مصروف نظر آ رہا تھا، کمرؤں کے درمیانی گزرگاہ میں ملا۔

”خدا کا شکر ہے کہ آپ خود ہی آگئے، ماموں جان“ اس نے فضل الدین سے کہا۔

”کیوں کیا بات ہے، یہاں یہ بھاگ دوڑ کیسی؟“

”صرف آپ ہی کو بتا سکتا ہوں کہ ہم لوگ کل صبح ہرات سے جا رہے ہیں۔“

”کابل؟“

”جی ہاں۔ لیکن شاہ برادران کو اس کی بھنک بھی نہ لگنی چاہئے“ طاہر نے چپکے سے کہا۔ ”ان سے تو صرف یہ کہا گیا ہے کہ ہم لوگ سردیاں گزارنے کے لئے شہر سے باہر جا رہے ہیں۔“

فضل دین کے شانے اچانک کچھ جھک سے گئے اور اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا:

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمیں ایک بار پھر بے یار و مددگار یتیموں کی طرح چھوڑ کر جا رہے ہو۔۔۔“

”سردیاں ختم ہوتے ہی آپ بھی کابل آجائیے گا۔ خود مرزا بابر نے بھی گزشتہ ملاقات کے دوران آپ سے فرمایا تھا کہ کابل آجائیے۔“

”ارے بھانجے، نئی جگہ جانہ کوئی ہنسی کھیل تھوڑی ہے۔ مینے بھر بلکہ پورے چالیس دنوں کی مسافت ہے۔ بیوی بچوں والا آدمی ہوں۔۔۔“

پھر فضل الدین اداس اداس سا بابر سے ملنے گیا۔ بہت ہی کشادہ کمرے کے جو کبھی نوائی کے دیوان خانے کا کام دیتا تھا، طلائی ملتے والے نقش دروازے پر پریدار کھڑا ہوا تھا۔ اسے شاید علم تھا کہ فضل الدین ملاقات کے لئے آنے والا ہے کیونکہ وہ اندر گیا اور فوراً ہی باہر آکر فضل الدین کے لئے دروازہ پوری طرح کھول دیا۔

فضل الدین نے دیوان خانے میں بابر سے مصروف گفتگو افراد کو دیکھتے ہی پہچان لیا۔ وہ بینتالیس سالہ شاعر محمد سلطان سے جو اکثر نوائی سے بات چیت کیا کرتا تھا، اچھی طرح متعارف تھا۔ محمد

سلطان کے پاس ہی پالتی مارے ماہر خطاط سلطان علی مشمدی بیٹھا ہوا تھا۔ بابر کے دائیں طرف کمال الدین ہنزا اور خواند میر بیٹھے تھے۔

بابر فضل الدین کے استقبال کے لئے گدے پر اٹھ کھڑا ہوا۔ دوسرے افراد بھی کھڑے ہو گئے۔ میر عمارت نے نیم دائرے کی سب سے الگ تھلگ جگہ پر بیٹھنا چاہا لیکن خواند میر جو ملاقاتیوں میں بابر کو چھوڑ کے سب سے کم عمر تھا، بول اٹھا:

”آپ ہمارے ذی جاہ مہمان کے ہم وطن ہیں“ اور اس نے فضل الدین کو بابر کے قریب ہی اپنے اور ہنزا کے درمیان بٹھالیا۔

خواند میر نے گفتگو کا سلسلہ جس میں میر عمارت کی آمد سے خلل پڑ گیا تھا، فوراً ہی جاری کر دیا:

”قسمت کے مذاق بھی کتنے عجیب و غریب ہوتے ہیں! عالی جاہ، آپ تو ہرات میں فنون کی ترقی اور یہاں کے ممتاز اہل علم و فن سے بہت متاثر ہوئے ہیں لیکن خود ہمیں اس بات کا افسوس ہے کہ موجودہ ہرات میں آپ کا جیسا اعلا تعلیم یافتہ اور باصلاحیت حکمران نہیں ہے۔“

دونوں حکمران بھائی بابر کا بہت پر تپاک خیر مقدم کر چکے تھے اس لئے بابر نے ان کے وقار کو ٹھیس پہنچانے سے گریز کیا:

”میرے خیال میں تو موجودہ ہرات کے حکمران بھی اعلا تعلیم یافتہ ہیں۔“

ہنزا کے دبلے پتلے، تھکے ناک نقشہ اور خوبصورت کچی واڑھی والے چہرے پر شرارت آمیز مسکراہٹ پھیل گئی:

”جی ہاں، عالم پناہ، ہرات میں آج کل تعلیم کا تو خیر کچھ پتا نہیں پر روشنی بہت زیادہ ہے۔“ اور مصور نے بابر کی طرف دیکھا۔ ”جانتے ہیں کیوں؟ اس لئے کہ ہمارا ایک بادشاہ آفتاب ہے تو دوسرا متاب۔ ان دونوں ہرات میں ایک نظم بہت مقبول ہے جس میں کچھ اس طرح کا خیال ظاہر کیا گیا ہے: حسین بیکرا اصلی بادشاہ تھے، اصلی جنگوں میں فتوحات حاصل کیا کرتے تھے۔ ان کے بیٹے دو تختوں پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک کتا ہے ”میں ماہتاب ہوں“ دوسرا کتا ہے ”میں آفتاب ہوں۔“ دونوں میں شب و روز یہی مقابلہ جاری رہتا ہے۔ ان کی باہمی کشاکش شطرنج کھیلتے ہوئے دو بادشاہوں کی یاد دلاتی ہے۔ یہ دونوں اپنے والد کے نقش قدم پر نہیں چل رہے ہیں، یہ تو نقلی بادشاہ ہیں، محض شطرنج کے مرے۔۔۔“

بابر غیر ارادی طور پر مسکرا دیا:

”واقعی دونوں بھائیوں کی عداوت شطرنج کی بازی جیسی ہی ہے۔“

”مصیبت تو یہ ہے“ خواند میر نے کہا جو ایک بار بھی نہیں مسکرایا تھا، ”کہ اپنے اس کھیل میں یہ لوگ خراسان کو ہارتے جا رہے ہیں۔ اور یہ بات انہیں کسی طرح بھی سمجھائی نہیں جاسکتی۔“
شاعر محمد سلطان کی آنکھوں میں خون اتر آیا:

”سمجھائی تو ضرور جاسکتی ہے لیکن باتوں سے نہیں، ششیر سے!“

خواند میر نے گھبرا کر دروازے کی طرف دیکھا۔ ہرات کے بادشاہوں کے معتبر افراد جو کسی زمانے میں بڑی مہارت کے ساتھ نوائی پر نظر رکھتے تھے، اب بابر کی باتیں بھی چھپ کر سن سکتے تھے۔

سلطان علی مشہدی نے گھنگو کا رخ اس خطرناک موضوع سے موڑنے کے لئے اپنے سامنے رکھے ہوئے چری جزدان سے کچھ کاغذات نکالے۔

”یہ خادم عظیم مہمان کی کچھ غزلیں نقل کر کے لایا ہے۔“

ریشم جیسے چکنے ان اوراق کو سب نے باری باری ہاتھوں میں لے کر دیکھا۔ واقعی بڑی شاندار کہانت تھی، باریک باریک حرف خوش نویسی کی مہارت اور نفاست پسندی کے آئینہ دار تھے۔
خواند میر پہلی غزل پر نظر ڈالتے ہی حیرت سے کہہ اٹھا:

اے ملا جاں کے سوا یار وفادار کوئی
نہ ملا دل کے سوا محرم اسرار کوئی
یکھ لے اب تو بنا یار کے جینا بابر
خوب کی سیر جہاں پر نہ ملا یار کوئی

”بہت خوب!“ ہزاد نے بابر کو ستائشی نظروں سے دیکھا۔

”آپ نے بالکل بجا فرمایا ہے، عالی جاہ! انسان کو خود اپنے اوپر ہی اعتبار کرنا چاہئے، صرف خود ہی سے امیدیں وابستہ کرنی چاہئیں۔“

شاعر محمد سلطان کو ایک دوسری غزل کے مطلع پسند آیا جسے اس نے بڑے جذباتی انداز سے

پڑھا:

مجھ کو تم جیسا جفا کار ملے یا نہ ملے
تم کو مجھ جیسا وفادار ملے یا نہ ملے

فضل الدین نے ٹھنڈی سانس بھر کر دھیرے سے کہا:

”یہ شعر تو میرے درد کی بھی ترجمانی کر رہا ہے۔۔۔“

بابر کو داد و تحسین سے جھینپ سی محسوس ہوئی:

”عزیز دوستو! میں پروردگار کا شکر گزار ہوں کہ مجھے آپ جیسے سخن فہموں سے ملاقات اور گفتگو کا موقع ملا۔“ اس کی آواز غیر فطری ہیجان سے معمور تھی۔ ”آپ کو میرے اٹلے سیدھے مصرعے پسند آئے تو اس میں مجھ سے کہیں زیادہ ہاتھ خوش نویسی کے حقیقی استاد مشہدی صاحب کے بے مثل فن کا ہے۔ اجازت ہو تو میں آپ سب کو یادگار کے طور پر اپنی غزلوں کا خاص طور سے نقل کیا ہوا ایک ایک ورق نذر کر دوں۔“

”آپ تو حقیقی شاہانہ انداز سے ہمیں تحفے عطا کر رہے ہیں!“ خواند میر اپنی مسرت کو چھپانہ سکا۔ پھر خواند میر، ہزاد اور محمد سلطان نے شاعر اور خوش نویس دونوں کو خراج تحسین پیش کرنے کی علامت کے طور پر اپنے ہاتھوں کے ورق کو کسی مقدس اور عزیز شے کی طرح آنکھوں سے لگایا۔ بابر نے آخری ورق فضل الدین کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا:

”آپ اور ہم صرف ہم وطن ہی نہیں بلکہ دونوں کا درد بھی ایک ہی ہے۔“
فضل الدین نے غزل کے ورق کو لے کر آنکھوں سے لگایا اور بڑے مخلصانہ اور جذباتی لہجے میں جواب دیا:

”مجھے یقین ہے کہ ہرات میں نقل کی جانے والی یہ غزل جلد ہی سمرقند اور اندجان تک پہنچ جائے گی۔ خدا کرے کہ انہی غزلوں کے پیچھے پیچھے ہمارے بادشاہ اور ہم سب کو جو وطن سے دور زندگی گزار رہے ہیں، وطن واپس ہونا نصیب ہو!“
”آمین!“

بابر نے قاسم بیگ کو طلب کیا اور سلطان علی مشہدی کو طلائی بنوں والا زری کا چوغہ پہنایا۔
”جہاں پناہ“ خواند میر نے کہا، ”خدا کرے کہ آپ کے نیک اور عظیم منصوبے پورے ہوں، میر علی شیر کی عظیم روح ہمیشہ آپ کے حوصلے بڑھاتی رہے۔“
سب نے اس دعا کے سلسلے میں آمین کہی۔

لوگ رخصت لے کر جانے لگے تو بابر نے میر عمارت کو بل بھر کے لئے روک لیا۔
”آئندہ سال آپ سے کابل میں ملاقات ہوگی نا؟ ویسے تو ہمارے لئے فی الحال عظیم الشان عمارتیں تعمیر کرنا ممکن نہیں ہے اور کابل ہرات کے مقابلے میں ابھی گاؤں جیسا ہی معلوم ہوتا ہے لیکن خدا سے امید کرتے ہیں کہ قسمت ہم پر بھی مہربان ہوگی۔۔۔“
”آپ کا یہ حکم سر آنکھوں پر، بہت بہت شکریہ۔ ضرور حاضر ہوں گا!“ اور فضل الدین کو ریش

بجایا۔

آفتاب طلوع ہو رہا تھا۔ بابر اور اس کے ہم رکاب ہرات کے باہر یافات کے درمیان واقع ایک راستے سے گزر رہے تھے۔ اینٹوں کی دیواروں کے دوسری طرف گنبد والے محل کبھی کبھی اور ہرات کے ممتاز لوگوں کے گرمیاں گزارنے کے مکانات اکثر دکھائی دے رہے تھے۔ اچانک ایک نسبتاً اونچی دیوار کی اوٹ سے کسی نے گلاب کا چھوٹا سا گلدستہ پھینکا۔ ایک سرخ گلاب سیدھا آکر بابر کے لاکھی گھوڑے کی ایال پر بھی گرا اور کانٹوں کی وجہ سے اس میں الجھ گیا۔ بابر نے سر اٹھایا تو اسے دیوار پر ایک لڑکی کی جھٹک نظر آئی۔ نہایت ہی دلکش چہرہ کمان جیسے ابرو اور سر پر پھول دار مخروطی ٹوپی۔ بابر نے گھوڑے کی گردن پر جھک کر پھول کو احتیاط کے ساتھ ایال سے نکالا اور ہونٹوں سے لگا لیا۔۔۔

خزاں کے آخری ایام تھے۔ دروہوں پر واقع زنجیر گاہ کو ہمارے برف کی ٹھوس تہیں جم چکی تھیں پھر بھی کتنی شاندار تھی گلاب کی خوشبو! اس موسم میں بھی گلاب کا پورے نکھار پر ہونا کیا کسی معجزے سے کم تھا؟ بابر نے لگام کھینچ کر گھوڑے کو روکا، رکابوں میں پیر جما کر کھڑا ہو گیا اور دیوار کے اوپر ہی حصے پر نظر ڈالی۔ لڑکی اسے دوبارہ دکھائی دی۔ آنکھیں سیاہ تھیں اور بلا کی شوخ اور تابتاک۔ بابر پہلے بھی اس راستے سے گزر چکا تھا اور لڑکی شاید اس سے قبل ہی اسے دیکھ چکی تھی۔ اس وقت اس نے اپنی لمبی لمبی پلکیں جھپکائیں، چہرہ سرخ ہو گیا اور پل بھر کے بعد بابر کو دوبارہ نظر آیا تو حیا کی سرخیوں کے باعث پہلے سے بھی زیادہ دلکش معلوم ہوا۔ بابر نے سوچا کہ یہ لڑکی اس کا خیر مقدم کر رہی ہے یا اسے الوداع کہہ رہی ہے؟ اس کی عمر کیا ہوگی؟ شاید اٹھارہ سال، اس سے زیادہ ہرگز نہیں۔ اوہ، کیسی حسین و جمیل ہے!

بابر کی سمجھ ہی میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے اور وہ اپنے گھوڑے کو دیوار کے قریب ہی روکے رہا۔ اتنے میں دوسرے سواروں نے بھی یہ دیکھ کر کہ بادشاہ ٹھہر گیا ہے، اپنے اپنے گھوڑے روک لئے۔ ہرات کے نیک دل دارو غہ یوسف علی بیگ نے جو بابر کو رخصت کرنے کے لئے ساتھ آیا تھا، لڑکی کو پہچان لیا اور حیرت سے مسکراتے ہوئے بولا:

”اخواہ عزیز دختر ماہم، تم کتنی بڑی ہو گئیں!“

لڑکی کو جیسے ہوش آگیا، چہرے پر کچھ اور بھی زیادہ سرخی چھا گئی اور وہ تیر نظر سے بابر کو زخمی کر کے غائب ہو گئی، دوبارہ نظر نہ آئی۔

بابر کا چہرہ اندرونی حرارت سے سرخ پڑ گیا، آنکھیں چمک اٹھیں اور اس نے یوسف علی بیگ پر

سوالوں کی بوچھاڑ کر دی:

”یہ کون ہے؟ بتائیے نا، کون ہے؟ کس کی بیٹی ہے؟“

”محترم مرزا، یہ سلطان حسین کے ایک دور کے رشتے دار کا مکان ہے۔ اس لڑکی کے والد کو حسین بیٹرا کا قرب حاصل تھا اور یہ ناچیز بھی یہاں آتا جاتا رہتا تھا۔“

”کیا وہ زندہ ہیں؟“

”جی ہاں، زندہ تو ہیں لیکن سلطنت کے کاموں سے الگ کر دیئے گئے ہیں۔“

”آخر کیوں؟“

”مجھے معلوم نہیں لیکن... لڑکی کے والد کو شاہ برادران پسند نہیں کرتے... مجھے ایسا ہی لگتا ہے

جہاں تک مجھے معلوم ہے، وہ ہرات چھوڑ کر کہیں چلے جانا چاہتے ہیں، شاید قندھار یا پھر غزنی...“

گھوڑے آگے بڑھنے لگے۔ باہر ماہم نام کی اس لڑکی سے دور ہوتا گیا۔ اچانک اس لڑکی سے دور ہو جانے کا احساس ہوا اور اس کے سینے میں تاسف کا طوفان امنڈ پڑا۔ اس نے سوچا کہ ہرات میں بیس دن گزارے لیکن ماہم کا دیدار صرف آج ہی، شہر چھوڑتے وقت ہی آخر کیوں ہوا؟

باہر نے پھول پر جواب بھی اس کے ہاتھ میں تھا، نظر ڈالی۔ ہاتھ نے اس پھول کو غیر شعوری طور پر اس کے ہونٹوں اور پھر ریشمی دستار تک پہنچا دیا۔ پتلی اور مضبوط ڈنڈی والے پھول نے جیسے خود ہی اپنے لئے موزوں جگہ تلاش کر لی۔ سفید پس منظر میں سرخ گلاب بے حد خوبصورت لگ رہا تھا اور پہلی نظر میں دستار ہی کا جزو معلوم ہوتا تھا۔

۵

سردیاں امن و سکون کے ساتھ بیت گئیں۔ موسم بہار کے وسط میں شیبانی خان نے اپنے پچاس ہزار لشکریوں کے ساتھ دریائے مرغاب کو پار کیا اور خراسان کی سرحدوں میں داخل ہو گیا۔ اس وقت تک بدیع الزماں مرزا اور مظفر مرزا اپنی فوج اور سپہ سالار کے ساتھ ہرات کے شمال میں بالترتیب قارا رابط اور ترناب میں پڑاؤ ڈالے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے تھے۔

عبید اللہ سلطان اور تیمور سلطان کی کمان میں شیبانی کی گھڑسواری فوج ہراتی افواج کے قلب میں نیزے کی طرح دھنس گئی۔ بدیع الزماں اور اس کا بھائی اپنے زیادہ تر بیگوں کے ساتھ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ صرف ذوالنون بیگ ”مرزب اللہ“ ہی اس یقین کی بناء پر کہ شیبانی کی

تکوار کو توڑنے کا کام قسمت نے ایک اسی کو سونپا ہے، اپنے ایک ہزار سپاہیوں کے ساتھ عبید اللہ کا مقابلہ کرنے کے لئے سامنے آیا اور یہ تسلیم کرنا ہو گا کہ آخری دم تک بڑی شجاعت سے لڑتا رہا۔ لیکن عبید اللہ سلطان نے جلد ہی اسے مغلوب کر دیا۔ تصادم کے دوران ذوالنون بیگ کو زین سے نیچے گرا دیا گیا، اس کا سر فتح کی دیگر نشانوں کے ساتھ شیبانی خان کے پڑاؤ پر لے جایا اور خان کے گھوڑے کے سمن تلے پھینک دیا گیا۔

بدلج الزماں میدان جنگ سے فرار کے بعد گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا ہوا سب سے پہلے ہرات کے قریب پہنچا لیکن شہر کے اندر نہ گیا۔ وہ ایک باغ میں چند گھنٹوں تک رکا رہا تاکہ اس کے ساتھ آئے ہوئے لوگوں کے گھوڑے دم لے لیں اور وہ ان پر زیادہ سے زیادہ سونا، چاندی اور دیگر قیمتی اشیاء جنہیں اس نے خزانے سے منگوا لیا تھا، لاد سکے۔ اس کی بیگمات اور بچے شہر کے اندر شاہی محل میں اس کے منتظر تھے لیکن وہ دشمنوں سے اس بری طرح دہشت زدہ ہو چکا تھا کہ انہیں لینے کے لئے بھی شہر جانے کی ہمت نہ کر سکا۔ اس نے کھلوا بھیجا کہ ہرات کے دروازے بند کر لئے جائیں، محاصرہ کر لیا جائے تب بھی نہ کھولے جائیں نیز یہ کہ وہ جلد ہی ملک لے کر واپس آئے گا اور انہیں بچالے گا۔ پھر وہ اپنی دولت کے ساتھ جنوب میں قندھار کی سمت بھاگ کھڑا ہوا۔

مظفر مرزا رات کو ہرات پہنچا اور اس نے بھی بالکل وہی سب کیا جو اس کے بھائی نے کیا تھا۔ فرق بس اتنا ہی تھا کہ وہ شہر کے باہر ایک دوسرے باغ جہاں آرا میں نہیں بلکہ سفید باغ میں ٹھہرا۔ وہاں اس نے دم لیا اور بدلج الزماں ہی کی طرح قیمتی اشیاء گھوڑوں پر لادوا لیں، شاہی محل تک نہ گیا۔ اس نے تقریباً ”ویسے ہی الفاظ میں ہرات کے باہری دروازے بند کر لئے جانے، شہر کے اندر محل میں مورچہ بندی کرنے اور اپنی واپسی تک محاصرے کو جھیلنے کا حکم دیا۔ پھر وہ مغرب میں استر آباد کی طرف فرار ہو گیا۔

شیبانی خان نے توقع سے کہیں زیادہ آسانی سے ظفریاب ہونے کے بعد ہرات کی طرف کوچ کیا اور شہر کوئی ساڑھے تین فرسخ رہ گیا تو خوشگوار آب دہوا کے لئے شہرت رکھنے والے سرسبز و شاداب میدان کھدستان میں پڑاؤ ڈال دیا۔ ہرات کے شیخ الاسلام سن رسیدہ تفت زنی اور دیگر ممتاز افراد نے فیصلہ کیا کہ کسی امید کے بغیر محاصرے میں پھنسے رہ کر مصائب جھیلنے کا کوئی تک نہیں۔ انہوں نے شہر کے دروازوں کی کتلیاں لے جا کر فاتح خان کے حوالے کر دیں اور ظاہر ہے کہ صلے کے طور پر قیمتی تحائف وصول کئے۔

شیبانی خان اپنی ایک اور فتح کے نشے سے سرشار ہو کر موسم بہار کی ہریالی میں ڈوبے ہوئے

کھدستان میں جشن مسرت منانے لگا۔ اس کے دل میں کسی نئی حسینہ کو اپنی باموں میں جکڑنے کی خواہش کروٹیں لینے لگی۔ سب سے زیادہ شہرہ قارا کو ز بیگم کے حسن و جمال کا تھا جو مظفر مرزا کی چہیتی بیگم اور ہرات کی خوبصورت ترین عورت تھی۔ خان بخوبی جانتا تھا کہ تاشقند اور اندجان کی قارا کو ز نام کی بیگمات بے حد حسین تھیں۔ اس نے سوچا بھلا ہرات کی یہ سیاہ چشم حسینہ کیسی ہے؟ لیکن خود کو غازی خلیفہ اور امام کھلانے والا شیبانی خان اس معاملے میں کوئی زبردستی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے معمول کے بموجب بیس سالہ بیگم سے اپنے عشق کا اظہار کرنے کے لئے چند اشعار کی ایک غزل کہی جسے شاعر محمد صالح نے بچولے کے فرائض انجام دیتے ہوئے اس پری پیکر تک پہنچا دیا۔ قارا کو ز بیگم کو جو مظفر مرزا کی بزدلی پر سخت چراغ پا ہو رہی تھی، خان کی یہ غزل بہت پسند آئی۔ خدیجہ بیگم اپنی دوسری ہوسوں کے ساتھ ہرات کے سب سے مضبوط محل قلعہ اختیار الدین کو منتقل ہو گئی اور اس کے دروازے بند کر لئے گئے۔ قارا کو ز ان سب بیگمات سے الگ ہو کر اپنے والد کے شہر سے باہر واقع مکان کو چلی گئی۔ وہاں اسے حمام میں نہلا کر دلہن کی طرح سجایا سنوارا اور خان کی بھیجی ہوئی شاندار گھوڑا گاڑی میں کھدستان لے جایا گیا۔

شام کو شیخ الاسلام اور ہرات کے قاضی القضاۃ کو شیبانی کے خیمے میں طلب کیا گیا۔

خان اپنی عمر کے لحاظ سے کہیں زیادہ جوان نظر آ رہا تھا۔ اس نے ہرات کے ان دینی پیشواؤں کا اپنے خیمے میں خیر مقدم کیا جہاں فرش پر بچھے ہوئے بہت بڑے اور خوبصورت قالین کے بتل بوٹے اور دلکش الفاظ کے اشعار ایک دوسرے سے گتھے ہوئے تھے۔ عبدالرحیم نے ان دونوں کو بتایا کہ آج عظیم خان کا نکاح قارا کو ز بیگم سے ہونے والا ہے۔

”نکاح؟“ شیخ الاسلام نے گہرا کر قاضی کی طرف دیکھا۔ اس کے بعد عدت کی مدت پوری ہوئے بغیر خان سے اس کے نکاح کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔

شیخ الاسلام منہ کے بل لیٹ کر قالین کے جس پر خان کھڑا ہوا تھا، بو سے لینے لگا لیکن اس نے احکام شریعت کا ذکر چھیرا ہی تھا کہ خان نے اسے ٹوک دیا:

”ہمیں درس شریعت نہ دیجئے! بیگم کے زنجے شوہر نے انہیں چار ماہ قبل ہی طلاق دے دی تھی! آپ کو یہ بھی نہیں معلوم کیا؟“

”معلوم ہے، عظیم خان!“

”معلوم ہے!“ قاضی نے بھی قالین کو چھومتے ہوئے کہا۔

واقعی انہیں معلوم تھا کہ چار ماہ قبل مظفر مرزا نے شدید غصے کے عالم میں بنا سوچے سمجھے اپنی

بیگم سے دوبار ”طلاق“ کہہ دیا تھا لیکن عدت کی مدت کے دوران ہی دونوں میں صلح ہو گئی تھی اور خود شیخ الاسلام اور قاضی نے شاہ اور ملکہ کی اس صلح صفائی پر دعائیں دی تھیں، نیک تمناؤں کا اظہار کیا تھا۔ پر اس وقت غصے میں بھرے ہوئے خان کو جو جیسا کہ صاف ظاہر ہو رہا تھا، اپنے سامنے قارا کو ز بیگم کے نوجوان شوہر کا نام لے لئے جانے سے کچھ اور بھی بھنا گیا تھا، یہ بتانا کہ دراصل وہ طلاق رجعی تھی نہ کہ طلاق مغلظہ، خود اپنی موت کو دعوت دینے کے مترادف ہوتا۔

چنانچہ وہ دونوں خان اور قارا کو ز بیگم کے نکاح اور اس نکاح کو اپنی دعاؤں سے مقدس رشتے کی حیثیت دینے کی یہ غلت تیاریاں کرنے لگے۔

صبح کو شیبانی خان نے سپہ سالار عبداللہ سلطان، منصور بخش اور درباری شعرا محمد صالح اور بینائی کو اپنے خیمے میں طلب کیا۔

اس نے سب سے پہلے عبداللہ سلطان سے جو اس کا بھتیجا تھا، سخت لہجے میں پوچھا:

”قلعہ انتیاری الدین پر قبضہ ہو گیا؟“

”عظیم خان، جلد ہی قبضہ کر لیں گے!“

”میں نے تمہیں اتنی بڑی فوج دے دی پھر بھی تم اس قلعے پر جسے ایک فاحشہ بند کر کے بیٹھی ہوئی ہے، قابض نہ ہو سکے؟ خود مجھے ہی جانا ہو گا کیا؟“

سب پر واضح ہو گیا کہ گزشتہ شب خان کو کسی ایسی ویسی بات سے سابقہ پڑا ہے۔ طویل قامت میں سالہ عبداللہ سلطان کچھ اس طرح کورنش بجالایا کہ دہرا ہو گیا:

”عظیم خان، میں قلعے کو آج ہی فتح کر لوں گا! ابھی ابھی جا کے حملہ کر دوں گا!“

”حملہ کر دوں گا“ خان نے اس کی نقل اتاری۔ ”تمہاری فوج تو پہلے ہی ساری فصلوں کو روند چکی ہے۔ ہم ہرات میں مسمان بن کر تھوڑی آئے ہیں۔ فصلوں کی تو خود ہمیں بھی ضرورت پڑے گی۔ باغات کی حفاظت کا بھی انتظام کر دو۔ ان کے پھل تو تم خود بھی کھاؤ گے۔“ پھر وہ بلا سبب زور سے چیخ اٹھا:

”ہمیں خاندان تیموریہ کو جڑ سے نیست و نابود کرنا ہے! خراسان کے غداروں کو کچل ڈالو!“

”آپ کے احکام کی تعمیل کی جائے گی، عالی جاہ!“

عبداللہ سلطان کو جانے کی اجازت دینے سے قبل شیبانی نے مزید کہا:

”قلعے پر آج ہی قابض ہو جانے کا ارادہ ہے تو منصور بخش کو بھی اپنے ساتھ لیتے جاؤ۔ یہ بچارا ان دنوں پھر رنڈو ابھی گھوم رہا ہے۔ عورتیں اس کی طاقت کو برداشت ہی نہیں کر پاتیں۔ سنا ہے کہ

خدیجہ بیگم بھی ایسے ہی کسی دیو کے لئے تڑپ رہی ہے۔ قلعے پر قبضہ کرنے کے بعد خدیجہ بیگم کو منصور بخشی کی خدمت میں پیش کر دینا تاکہ دونوں کو سکون مل جائے۔“

منصور بخشی جس کا منہ پا کچھ اور بھی بڑھ گیا تھا اور اب بالکل گول خیمے جیسا نظر آتا تھا، بہ دقت کورنش بجالایا:

”میں آپ پر قربان ہو جاؤں، عظیم خان! آپ نے بجا فرمایا ہے۔ سرفرد کی زہرہ بیگم کے انتقال کے بعد سے تمہاری وصال جان ہو رہی ہے، ماہی بے آب ہو رہا ہوں!“

”لیکن بخشی، تم فقط اپنے ہی فائدے کی نہ سوچو۔ ہرات میں سب سے زیادہ دولت خدیجہ بیگم ہی کے پاس ہے۔ مثال کے طور پر میں نے سنا ہے کہ اس عورت کے حکم پر سونے کا پھول بنایا گیا تھا جس کی ٹہنی خالص سونے کی ہے اور پتیاں زرد کی۔ پھول پر ٹیٹھی ہوئی بلبل بھی سونے ہی کی ہے اور اس کی چونچ میں بڑا سا ہیرا دبا ہوا ہے۔“

”عظیم خان، اس چیز کو تو آپ اپنی ہی تصور فرمائیے“ منصور بخشی نے سینہ ٹھونکتے ہوئے کہا۔

”خدیجہ بیگم کی ساری دولت بھی شاہی خزانے ہی میں جائے گی۔ میرے لئے تو وہ خود ہی بہت ہے!“

اس عیاش کی ہنسی مذاق سے شیبانی خان کا چہرہ کچھ کھل اٹھا اور اس نے خوشگوار زہنی کیفیت کے ساتھ عید اللہ سلطان اور منصور بخشی کو جانے کی اجازت دی۔

لیکن دونوں شعرا محمد صالح اور بینائی اب بھی خان کے سامنے مودب اور خاموش کھڑے ہوئے تھے۔ زری کے سرخ گدے پر آلتی پالتی بیٹھا ہوا خان بھی ذرا دیر تک خاموش رہا۔ پھر اس نے محمد صالح سے تلخ لہجے میں کہا:

”ارے شاعر، تم تو مسلسل ہرات کی تعریفوں کے پل باندھتے رہتے تھے اور تمہارا ہرات تو شرم و حیا سے عاری بے ایمانوں اور فاحشاؤں کا اڈا ثابت ہوا!“

محمد صالح نے بہت پہلے بھی بھانپ لیا تھا کہ خان نے رات کسی طرح کی پریشانی میں کٹی ہے۔ اب اس نے سوچا کہ رات کو شاید حکمران کی قوت مردی جواب دے گئی تھی اسی لئے کھیا نی ملی کی طرح کھبا نوج رہے ہیں۔ پر بادشاہ کے زخموں پر نمک چھڑکنے کی جرات کسے ہو سکتی ہے؟ ان سے تو خدا ہی بچائے! اور شاعر نے جواب دیا:

”عظیم خلیفہ! ہرات کو زنا کاری کا اڈا تو تیمور خاندان کے مکروہ حکمرانوں نے بنایا تھا۔ آپ نے ... انہیں جنگ میں شکست دی، ان کی روحوں کو اپنے زہد اور پارسائی سے پچھاڑ دیا ہے۔ آپ کی یہ پارسائی ایک دن اہل ہرات کے لئے زندگی کے جادہ مستقیم کو منور کرنے والی مشعل بن کر رہے

گی۔

”لفاعلیٰ میں تو تمہارا کوئی جواب ہی نہیں۔ پر یہ کیوں بھول رہے ہو کہ اہل ہرات کا کردار بگاڑنے میں شعرا کا بھی ہاتھ رہا ہے؟ کیا یہاں ایسے شاعر نہیں تھے جو اپنے واہیات اشعار کے ذریعے تیموری قبیلے کو آسمان پر چڑھاتے اور اس کے صلے میں اشرافیاں پاتے تھے؟“

”تھے، عالم پناہ، ضرور تھے... ایسے ہی شعرا نے تو بینائی صاحب کو یہاں سے نکلوا یا تھا۔“

شیبانی خان نے بینائی کی طرف دیکھا:

”کیا یہ سچ ہے؟“

”جی ہاں، عالی جاہ!“ اور بینائی نے جیسا کہ خان کو لگا، جذبات پر قابو پانے کی کوشش میں سر جھکا

لیا۔

”اگر ایسا ہوا تھا“ خان نے ذرا اونچی آواز سے کہا، ”تو بینائی صاحب، اپنی کمر میں انصاف اور جائز انتقام کی تلوار باندھ لیجئے۔ ہمارے فتح مند سپاہیوں میں سے ایک سو سپاہی اپنے ساتھ لے کر جائیے۔ ان لوگوں کی املاک ضبط کر لی جائیں! ان شعرا کی املاک ضبط کر لی جائیں جو سونے کی بدولت مغرور اور بدحواس ہو جانے والے تیمور خاندان کے حکمرانوں کی شان میں قصیدے لکھا کرتے تھے! ان لوگوں کا سارا سونا چھین کر شاہی خزانے میں جمع کر دیا جائے! شاید اس کے بعد ان لوگوں کو ہوش آجائے اور تب ان کا پارسائی کے راستے پر لوٹ آنا آسان ہو جائے گا۔“

بینائی بو کھلا گیا۔ ہرات کے کچھ شعرا کبھی اس کی توہین کا باعث بنے تھے اور یہ بھی سچ تھا کہ وہ ان شعرا کو پسند نہیں کرتا تھا لیکن سپاہیوں کو ساتھ لے جا کر ان کے گھروں کی تلاشی لینے کا وہ تصور ہی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اس طرح کے کام سے کوئی سروکار نہیں رکھ سکتا تھا ضمیر کبھی اجازت ہی نہ دیتا۔ لیکن خان کے سامنے اپنی ناراضمندی کیسے ظاہر کرتا؟

بینائی اپنے بودے پن کے باوجود قوت ارادی سے محروم نہ تھا۔

”عظیم خان کا شکر گزار ہوں کہ مجھ پر اتنا زیادہ اعتبار کر رہے ہیں۔ بس مجھے ڈر ہے کہ...“

”... میں یہ خدمت نہ انجام دے سکوں گا، محترم حکمران کیونکہ زندگی میں تلوار کبھی بھی ہاتھ میں نہیں لی اور اب تو میں سن رسیدہ ہو چکا ہوں... میرے خیال میں اس نیک حکم کی تعمیل آپ کے اس حقیر غلام کی بہ نسبت محمد صالح صاحب جو بہت دلیر اور جوشیلے آدمی ہیں، سو گنا بہتر طور کر سکیں گے۔ میں ان کی حتی الامکان مدد کرنے کے لئے تیار ہوں۔“

لیکن محمد صالح بھی اس گھٹیا کام میں ملوث ہونے کی کوئی خاص خواہش نہیں رکھتا تھا اور کایاں

بھی غضب کا تھا:

”بینائی صاحب‘ میں بڑی خوشی سے آپ کی اس اہم اور جائز ذمہ داری کا بار اپنے شانوں پر اٹھا لیتا پر مشکل یہ ہے کہ ہراتی شعرا کے متعلق میری معلومات اتنی گہری نہیں جتنی کہ آپ کی ہیں۔“
شیبانی خان نے ان دونوں کی اس شاعرانہ بحث کا سلسلہ اپنی چیخ سے بند کر دیا اور اس کی آنکھوں سے چنگاریاں سی ٹکنے لگیں:

”ارے بینائی صاحب‘ ذرا سوچئے تو کہ آپ کا یہ طرز عمل کیسا ہے! چھ برسوں سے آپ کی کفالت آخر کون کر رہا ہے؟ ہم نے آپ کو گھوڑا عطا کیا جس پر سواری کرتے ہیں۔ ہم نے نعلت عطا کیا جسے آپ پہنتے ہیں۔ آپ کو مکان دیا، پیسے دیئے، کبھی کسی چیز سے انکار کیا؟ اور جب ایک کام کرنے کا وقت آیا تو آپ انکار کر رہے ہیں؟!“

خان آگ بگولا ہو گیا۔ بینائی نے سوچا کہ اس کے منہ سے مخالفت کا ایک لفظ بھی نکل گیا تو شیبانی فوراً ہی جلااد کو طلب کر کے حکم دے گا کہ سر قلم کر دو۔ ایسے میں اس ”نیک“ کام کو سر جھکا کر قبول کر لینے کے سوا اور کوئی صورت ہی نہ تھی...

جلد ہی اہل ہرات ایک دوسرے کو بتانے لگے کہ مشہور شاعر بینائی مسلح سپاہیوں کے ساتھ دوسرے شاعروں کے گھروں میں جا جا کر تلاشی لے رہا ہے، سپاہی سونے کی تلاش میں گھروں کی ساری چیزیں الٹ پلٹ دیتے ہیں، جن گھروں میں سونا ملتا ہے انہیں پوری طرح لوٹ لیتے ہیں اور اسی طرح یہ لوگ شیبانی کے خزانے کو بھی بھرتے جاتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اپنی جیبوں کو بھی۔

شیبانی خان کے پینٹھ سالہ وزیر اور دست راست عبدالرحیم نے ہرات کے صاحبان علم و فن کا سونا ”ضبط“ کرنے کی ایک اور ہی ترکیب سوچی۔ شہر کے قرب و جوار میں واقع علاقوں میں فاتحین کے ہاتھ جو مال لگا تھا اس میں بھیڑوں کے گلے بھی شامل تھے عبدالرحیم نے ہر گلے کی ساٹھ بھیڑوں کو ہرات کے قیاقی دروازے کے باہر لگنے والے بازار میں لے جانے کا حکم دیا پھر اس نے ایک چھوٹا سادستہ شہر میں بھیجا جس نے تقریباً دس شعرا اور دیگر اہل علم کو بازار میں پہنچنے کے لئے مجبور کر دیا۔ ان میں تیمور خاندان کے بادشاہوں کے عہد حکومت کی تعریف و توصیف کرنے والا مورخ خواند میر، بابر سے قربت کی بنا پر شہرت رکھنے والا میر عمارت فضل الدین اور حسین عتہ کی شان میں قصائد لکھنے والا شاعر سلطان محمد بھی شامل تھے۔ خود عبدالرحیم بھی اپنے قدم باز گھوڑے پر بازار پہنچ گیا۔ اس کے ایک ملازم نے خواند میر اور دیگر اہل علم سے کہا:

”وزیر اعظم نظام الدین عبدالرحیم اپنی یہ بھیڑیں صرف آپ لوگوں ہی کے ہاتھ فروخت کرنا

چاہتے ہیں۔“

خواند میر نے اپنے رفقا سے نظرس ملائیں (کاش یہ معاملہ اتنے ہی پر ختم ہو جائے!) اور وزیر کو کورنش بجالاتے ہوئے سب کی طرف سے کہا:

”ہم لوگ خرید لیں گے، بخوشی خرید لیں گے۔ قیمت بتائیے۔“ ملازم نے بڑی شان سے کہا:

”ان بھیڑوں پر کئی بار وزیر اعظم کی پاک نگاہیں پڑ چکی ہیں اس لئے یہ مقدس بھیڑیں ہیں۔ آپ لوگ تیمور خاندان کے حکمرانوں کی خدمت انجام دیتے رہنے کی بناء پر ناپاک ہو چکے ہیں، ناپاک اور لغو زندگی گزار رہے ہیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ ان بھیڑوں کا گوشت کھا کر آپ پاک ہو جائیں گے۔ اسی لئے ہر بھیڑ کی قیمت ہے چھ سو دینار!“

چھ سو دینار میں کتنی ہی بھیڑیں خریدی جاسکتی تھیں لیکن وزیر اعظم کی متعین کردہ قیمت پر خریداری نہ کرنے کا مطلب اسے ناراض کرنا اور سخت سزائیں پانا ہوتا۔

فضل الدین نے جو اپنی مالی زبوں حالی سے پریشان تھا، ظالموں کو سمجھانے کی کوشش کی:

”حضور والا! ابھی حال میں تو ہم نے عام محصول اور فاتحین کی ضروریات پوری کئے جانے کا خاص محصول ادا کیا ہے....“ شاعر محمد سلمان نے مسکراتے ہوئے طنز کیا!

”ارے فضل الدین صاحب! آپ کو بتا دیا گیا ہے کہ یہ نایاب بھیڑیں ہیں، ان پر وزیر اعظم کی پاک نگاہیں پڑ چکی ہیں! اور جو کچھ مقدس ہوتا ہے وہ سونے کے مول ہی بلکتا ہے۔“

عبدالرحیم نے اس طنز کو محسوس کر لیا اور طیش میں آکر سپاہیوں کو حکم دیا:

”ان میں سے ہر ایک کے ہاتھ دس دس بھیڑیں فروخت کر دو!... گستاخ کہیں کے! نکتہ چینی کرتے ہیں! دولت کے نشے میں کسی کو خاطر ہی میں نہیں لاتے! انہیں آسمان سے زمین پر اتارنا چاہئے... اپنی بھیڑیں خود ہی ہانک کر لے جائیں، خبردار جو کسی نے ان کی ذرا بھی مدد کی! تم لوگ ان کے پیچھے پیچھے جا کر طے شدہ قیمت لے آؤ۔ دینے سے انکار کریں تو ان کی تمام املاک ضبط کر لی جائیں اور انہیں زنداں میں بند کر دیا جائے!“

عبید اللہ سلطان کے ڈیڑھ ہزار سپاہی دس دنوں سے قلعہ اختیار الدین پر جو چاروں طرف سے حملہ کر رہے تھے لیکن قابض ہونے میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔ اس کی دیواروں کی بلندیوں تک تیر بھی نہیں پہنچ پاتے تھے، سیڑھیوں کا تو ذکر ہی کیا۔

قلعے کی آہنی پھانک پر توپوں سے گولہ باری بھی کی گئی لیکن بے سود رہی۔ آخر کار سرتکلیں کھودی جانے لگیں...

اس اثنا میں ہرات میں امن پوری طرح بحال ہو چکا تھا (جو کچھ لوٹا جاسکتا تھا، بڑی سرعت اور ہوشیاری سے لوٹ لیا گیا تھا۔)

شیبانی خان جو کھدستان سے آکر باغ جہاں آرا میں مقیم ہو گیا تھا، شہر کے مشہور شاعروں، مصوروں اور دیگر اہل علم کو اپنی خدمت میں طلب کرنے لگا۔ حکومت کے علمی و فنی امور کا نگران محمد صالح ہزاد کو بھی کئی بار بلوا کے خان کی خدمت میں پیش کر چکا تھا۔ وزیر اعظم عبدالرحیم کو تو مصوری ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی لیکن شیبانی بخوبی جانتا تھا کہ حسین بیگرا کو اس کی ہزاد کی بنائی ہوئی تصویر کی بدولت کتنی شہرت حاصل ہو گئی تھی۔ اب وہ چاہتا تھا کہ مصور کی صلاحیت و مہارت سے خود اس کی شہرت بھی دو بالا ہو جائے۔

مصور کی درخواست پر خان زری کے گہرے سرخ گدے پر سیاہ مخمل کے غلاف والے گاؤ نکلتے سے نیک لگا کر بیٹھا مصور ہی کی تجویز پر خان کی کمر میں پتلی طلائی پٹی باندھ دی گئی اور اس کے سامنی سنہری جلد والی ایک کتاب، قلم اور دو دوات رکھ دیئے گئے۔ خان کا مہیب چابک پہلو میں رکھا ہوا تھا۔

ہزاد اپنی تخلیقی زندگی کے تیس برسوں میں کئی بادشاہوں کو دیکھ چکا تھا اور جانتا تھا کہ ان سے گفتگو کے دوران صرف ستائشی الفاظ ہی استعمال کئے جاسکتے تھے۔ چنانچہ اس نے کہا:

”آپ کا یہ حکم بردار تصویر میں آپ کو شمشیر برہنہ لئے قدم باز جنگی گھوڑے پر سوار دکھا سکتا ہے۔ لیکن یہ کون نہیں جانتا کہ آپ عظیم سپہ سالار ہیں۔ آپ کو تو دنیا کے سامنے ایسے عظیم خلیفہ کی حیثیت سے پیش کیا جانا چاہئے جس نے کئی برسوں تک دینی درس گاہ میں تعلیم حاصل کی ہے اور جس کا علم دین کے معاملے میں عمد حاضر کے تمام اماموں میں کوئی ہم سر و ثانی نہیں۔ یہی سبب ہے کہ یہ خادم تصویر میں آپ کو مقدس کتاب اور سونے کے قلم کے ساتھ پیش کرنا چاہتا ہے۔“

”مجھے منظور ہے“ خان نے جواب دیا۔

ہزاد نے تصویر مکمل کر لی تو شیبانی خان نے اس کے فنی معیار کو پرکھنے کے لئے اپنی مقررین کو بلایا۔ عبدالرحیم نے پہلے تصویر اور پھر خان پر نظر ڈالی اور دنگ رہ گیا:

”عالی جاہ، یہ تو ہو، ہو آپ کی شبیہ ہے!“

تصویر یہ تاثر دے رہی تھی کہ شیبانی خان نے اپنی زندگی میں بہت کچھ دیکھا اور اپنے تجربات سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ کوئی عام آدمی اسے دیکھ کر سوچ سکتا تھا کہ یہ جس شخص کی تصویر ہے وہ بہت ہی خوددار اور پردوار ہے نیز یہ کہ مصور اس کا احترام کرتا ہے۔ لیکن محمد صالح فن کو پرکھنے کے

معالے میں بہت ذہین اور باریک بین تھا۔ اس کی توجہ فوراً ہی اس بات پر مبذول ہو گئی کہ تصویر میں خان جس گدے پر بیٹھا ہوا ہے وہ بہت ہی گہرے، خون جیسے سرخ رنگ کا ہے اور لگتا ہے کہ وہ خون سے لبالب بھرے ہوئے کسی گڈھے پر بیٹھا ہے۔ اسی طرح پتلی طلائی چینی کا سرا گہرے بھورے سردالے زرد سانپوں کی طرح لٹکا ہوا تھا اور پالتی مارے بیٹھے خان کے پیروں پر سے مل کھاتا رہتا ہوا اسے ڈس لینے کو تیار لگتا تھا۔ سیاہ رنگ کا بڑا سا گاؤ تکیہ بدی کی قوت کی تحسین معلوم ہو رہا تھا۔

واقعی رنگوں کا انتخاب بے حد ذہانت سے کیا گیا تھا۔ رنگ بہت کچھ کہہ رہے تھے اور ان کی پراسرار علامتی زبان کو محمد صالح نے سمجھ لیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے وہ اس اندیشے سے سہم کر رہ گیا کہ کہیں خان نے بھی رنگوں کے علامتی مفہوم کو، سرخ، سیاہ اور بھورے اشاروں کو بھانپ لیا تو کیا ہو گا؟ اس صورت میں نہ تو ہزاد کا سر سلامت رہ سکتا تھا اور نہ ہی خود اس کا جس نے ہزاد کو بلوایا تھا۔

وہ فوراً ہی کہہ اٹھا:

”ہمارے بزرگان دین سبز رنگ کو پسند فرماتے تھے۔ ہمارے عظیم خلیفہ کو بھی سبز رنگ پسند ہے۔ دیکھئے نا، ہمارے عظیم خان کا لباس سبز ہے اور جس دیوار سے ہمارے خلیفہ کا گاؤ تکیہ لٹکا ہوا ہے وہ بھی سبز ہی ہے۔“

”یہ ... کافی مناسب ہے“ آخر کار خان کے لبوں نے جنبش کی۔ ”لیکن ... ہم نے ہزاد کی بتائی ہوئی دوسری تصویریں بھی دیکھی ہیں۔“

شیبانی خان کے مراد حسین بیترا کی اس تصویر سے تھی جس میں اسے ہزاد نے شیر جیسا دکھایا تھا۔ ہزاد کی بتائی ہوئی ایک دوسری تصویر میں حسین بیترا کو رزم گاہ میں اترتے دکھایا گیا تھا۔ لگتا تھا جیسے بادل، آسمان اور کوہسار بھی حسین بیترا کے پیچھے پیچھے چلے آرہے ہوں۔ یہ غیر معمولی سا کہہ رہا تھا کہ جس کی تصویر بتائی گئی ہے وہ بھی غیر معمولی شخصیت کا مالک ہے۔ پر اس تصویر میں؟ شیبانی نے سوچا کہ ہزاد نے تیمور خاندان کے حکمران کو تو آسمان پر چڑھا دیا تھا لیکن خود اسے بس یوں ہی سا ... معمولی سا آدمی بنا کر پیش کر دیا ہے۔

خان کو ان پیچیدہ سے جذبات کے اظہار کے لئے فوری طور پر موزوں الفاظ نہ مل سکے جو اچانک اس کے سینے میں امنڈ آئے تھے اور باہر نکلنے کو بے تاب تھے۔

”لایئے، قلم مجھے دیجئے!“ اس نے معور سے کہا اور سب کو احساس ہو گیا کہ خان کسی بار سے

غیر مطمئن ہے۔

بہزاد نے مندو پتی جس میں رنگوں کی پیالیوں میں قلم رکھے ہوئے تھے، خان کی طرف بڑھائی اور خان نے بھورے رنگ والی پیالی سے تنزی کے ساتھ قلم نکال لیا۔ اس نے بخارا مدرے میں تعلیم کے دوران نقاشی بھی سیکھی تھی اور قلم پکڑنا بہر حال جانتا تھا۔

خان نے اپنی تصویر کو غور سے دیکھا کہ بھلا اس میں کیا درست کرنا ہے۔ وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ داڑھی موٹھیں بہت چھدری ہیں اسی وجہ سے اس کی شان میں فرق آگیا ہے اور وہ معمولی آدمی لگ رہا ہے۔

”داڑھی ذرا بہتر طور پر بنائی جانی چاہئے“ شبانی نے کہا اور تصویر میں اصلاح کرنے لگا۔ لیکن قلم میں رنگ ضرورت سے کچھ زیادہ ہی آگیا تھا اور داڑھی منہ کے نکلے جیسی نظر آنے لگی۔ بہزاد کے منہ سے اچانک بڑی دردناک چیخ نکلی جیسے اس کا دانت اکھاڑ لیا گیا ہو۔ محمد صالح نے فوراً مصور کی کلائی کو دوپتے ہوئے کہ:

”مرحبا! عظیم خان کے قلم کے لمس سے تصویر میں کیسی جان پڑ گئی!“ پھر اس نے بہزاد سے مخاطب ہو کر اضافہ کیا: ”یہ تو نہایت ہی اہم گھڑی ہے۔ آپ کی تخلیق کو خود عظیم خلیفہ کے، سکندر ثانی کے دست مبارک نے سنوار دیا، کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ ارے جناب، اس واقعے کے تذکرے تو اب صدیوں تک ہوتے رہیں گے!“

”کچھ سمجھ ہی نہیں سکا! ساری محنت پر پانی پھیر دیا کبخت نے!“ بہزاد نے خان کی اس حرکت کے ذہن میں ایک اور ہی خیال آیا: ”واقعی... خان کو فراموش نہ کیا جاسکے گا۔ لوگ ہنس ہنس کر ایک دوسرے کو بتائیں گے کہ خان نے اپنے کانوں پر مندا کیسے چکایا تھا... بہت ہو چکا، اب آگ سے کھیلنے کی ضرورت نہیں۔ اچھا ہی ہوا کہ رنگوں کے مفہوم کو صرف محمد صالح ہی سمجھ سکا۔“ اور بہزاد نے سر جھکا کر خفی طنز کے ساتھ کہا:

”آپ کا یہ خادم خوشی سے پھولا نہیں سا رہا ہے کہ اس کی بنائی ہوئی تصویر میں کسی مصور نے نہیں بلکہ خود خلیفہ نے ہاتھ لگایا ہے جو ہم سب کے لئے دینی پیشوا کا درجہ رکھتے ہیں۔“

”آپ لائق ستائش ہیں“ خان نے ازراہ کرم کہا۔

”ارے تو اسی کا مستحق ہے!“ بہزاد نے تصویر میں کانوں پر چپکے ہوئے منہ کے کو ایک بار پھر دیکھ

کر سوچا۔

کبھی کبھی لوگوں کے مقدر بالکل ایک جیسے ہو جاتے ہیں، خواہ وہ نجی زندگی ہو یا سلطنت کی زندگی۔ خدیجہ بیگم پوری طرح کوشاں تھی کہ اس کا حشر بھی ویسا ہی نہ ہو جیسا کہ سمرقند کے سابق حکمران سلطان علی مرزا کی والدہ زہرہ بیگم کا ہوا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ شیبانی خان عورتوں کے ساتھ بڑی مکاری اور بے رحمی سے پیش آتا ہے اسی لئے قلعہ اختیار الدین کے پھانک کو مضبوطی سے بند کروا کے اس کے اندر بیٹھی ہوئی تھی۔ لیکن سترہویں دن قلعہ محفوظ نہ رہ سکا۔

عبید اللہ سلطان کے سپاہی کسی نہ کسی طرح پھانک کو توڑ کر قلعے کے اندرونی حصے میں داخل ہونے لگے تو اچانک خدیجہ بیگم نمودار ہوئی۔ جسم پر نہایت ہی شاندار لباس تھا اور سر پر نکیلے گوشوں والی ٹوپی جس میں بڑا ساموئی ٹنکا ہوا تھا۔ شاہانہ وقار اور سانچے میں ڈھلے ہوئے سے بدن کی اس خاتون کو دیکھتے ہی پسینے سے شرابور سپاہیوں نے تلواریں جھکالیں اور اس کے سامنے بے حس و حرکت کھڑے ہو گئے۔ خدیجہ بیگم دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی ہوئی سپاہیوں کے قریب پہنچی تو ان لوگوں نے اس کے لئے راستہ چھوڑ دیا۔ اس نے سپہ سالار سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔

سپاہی اسے ساتھ لے کر احاطہ میں آگئے جہاں عبید اللہ سلطان بڑے کروفر سے اپنے گھوڑے پر بیٹھا ہوا تھا۔ خدیجہ بیگم نے جیسے کنیزیں اپنے حلقے میں لئے ہوئے تھیں، اطمینان کے ساتھ کہا: ”طاقتور سپہ سالار، ہم قسمت کے مارے آپ کی قید میں ہیں۔ مہربانی کر کے مجھے اپنے حکمران شیبانی خان کے پاس لے چلئے۔“

عبید اللہ نے منصور بخشی کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھا اور طنزیہ انداز سے مسکرایا:

”ہمارے حکمران خان نے آپ کے لئے ایک پیغام بھجوایا ہے۔“

”فرمائیے، شہ زور سلطان!“

عبید اللہ کے بیگوں میں سفید عمامے والا ایک ملا بھی شامل تھا۔ اس کے اشارے پر منصور بخشی اور ملا اپنے گھوڑوں سے اتر پڑے۔ منصور بخشی کو جو اپنی دستار، زری کے چونے اور سرخ جوتوں کی بناء پر بانگے دولھے جیسا لگ رہا تھا، سات آٹھ جوانوں نے باراتیوں کی طرح گھیرے میں لے لیا۔

تب عبید اللہ سلطان نے خدیجہ بیگم کو رسمی انداز سے مخاطب کیا:

”عظیم امام کے حکم سے ہم آپ کا نکاح منصور بیگ کے ساتھ کر رہے ہیں۔“

”بیگم تو کچھ ایسے بناؤ سنگار کے ساتھ آئی ہیں جیسے انہیں یہ سب پہلے ہی سے معلوم رہا ہو“

لوگوں نے قہقہے لگائے۔

خدیجہ بیگم نے خوف زدہ ہو کر منصور بخش کی چپک کے داغوں والے سانولے چہرے اور بے حد سونے اور بے ڈول جسم پر نگاہ ڈالی۔

”میں... میں بادشاہ سلامت سے بات کرنا چاہتی ہوں...“

”ارے محترمہ، خان کے پاس اتنا وقت کہاں...“

”میں شاہی خاندان سے تعلق رکھتی ہوں۔ آپ میری توہین کرنے کی جرات نہیں کر سکتے!“

”بدکردار افراد کو مزا دینا کار نیک ہے، کار ثواب ہے۔“

”محترم سلطان، آپ کے بھی شاید والدہ ہوں۔ میں عمر میں آپ کی والدہ جیسی ہوں، کم از کم

اسی کا لحاظ کیجئے...“

”میری والدہ نے آپ کی طرح سنگین جرائم نہیں کئے ہیں اور پھر ایسی بھی کوئی ماں ہو سکتی ہے جو

خود اپنے پوتے کو قتل کرا دے؟ آپ نے تو اپنی خون کی پیاس مومن مرزا کی خون سے بجھائی تھی!“

خدیجہ بیگم کے چہرے سے تکبر کا تاثر کا فور ہو گیا، شانے خمیدہ سے ہو گئے، ہاتھ کمزوری کے

باعث چاکوں کی طرح پیلو میں لٹک گئے۔

عبید اللہ سلطان نے سپاہیوں کو حکم دیا:

”انہیں زنان خانے میں لے جاؤ۔ اب ان کی عقل منصور بخش ہی درست کریں گے...“

... خدیجہ بیگم کی منظوری زبردستی حاصل کر کے نکاح کی رسم ادا کی گئی اور سب لوگ چلے گئے۔

اس کے فوراً ہی بعد منصور بخش نے کینڑوں کو باہر بھیج دیا اور خود خدیجہ بیگم کے ساتھ رہ گیا۔

نصف شب بیت چکی تھی تب منصور بخش خدیجہ بیگم کو جو بمشکل ہی کھڑی ہو پار ہی تھی، دھکے دیتا

ہوا خواب گاہ سے باہر نکال لایا۔ وہ قلعے کے چاندی سے منور احاطے کے اندرونی حصے کی طرف

بڑھنے لگے۔

”سوئے کا پھول“ منصور بخش نے چلتے چلتے خدیجہ بیگم سے دھیرے سے کہا۔ ”اس پر سونے کی

بلین بیٹھی ہے۔ بلبل کی چونچ میں دبا ہیرا دبا ہوا ہے۔ یہ پھول نہ ملا تو تمہاری حالت اس سے بھی

زیادہ بگاڑی جائے گی۔ اسے تلاش کرو! جلدی کرو!“

خدیجہ بیگم کو جان کے لالے پڑے ہوئے تھے اس لئے وہ منصور بخش کو فوراً ہی قلعے کے ایک

کونے میں واقع خفیہ زیر زمین خزانے کی طرف لے گئی۔ خزانے کا خفیہ دروازہ پینے کے پانے کے

حوض کے گردینی ہوئی دیوار میں واقع تھا۔

تمہ خانے میں خدیجہ بیگم نے ٹٹول ٹٹول کر مشعل کی جگہ تلاش کی، منصور بخش نے بہ دقت

مشعل کو جلایا اور اس کی روشنی میں کئی قطاروں میں رکھے ہوئے صندوق چمک اٹھے۔ تب خدیجہ بیگم نے جو بالکل بے جان ہو رہی تھی، بڑی مشکل سے کنبیاں لگا لگا کر صندوقوں کو کھولنا شروع کیا۔ وہ صندوق چاندی کے سکوں سے بھرے ہوئے تھے اور ایک اشرافیوں سے۔ باقی میں قیمتی زیورات رکھے ہوئے تھے۔ منصور بخشی کی آنکھیں چمک اٹھیں، ہاتھ مارے ہوس کے صندوقتوں کے مال کو اٹھنے پلٹنے لگے پھر وہ پرسکون ہو کر پل بھر کے لئے کسی سوچ میں ڈوب گیا۔

”لیکن وہ پھول کہاں ہے؟ زمرہ کی پتیوں والا گلاب کا وہ پودا کہاں ہے؟“ اس نے دھمکی آمیز لہجے میں پوچھا۔

دونوں نے ساری چیزیں الٹ پلٹ کر دیکھیں لیکن پھول کیس بھی نہ ملا۔
 ”ہائے ہائے!“ خدیجہ بیگم استہوائی غم زدہ ہو کر بین کرنے لگی۔ ”کسی نے پھول چرا لیا! مجھ سے میرا آخری سارا بھی چھین لیا! ہائے میں مر گئی! ہائے میں لٹ گئی!“

”ارے خاموش ہو جا! تو اپنی ان آہوں سے حسین بیتر کی آنکھوں میں دھول جھونک سکتی تھی۔ لیکن مجھے فریب نہیں دے سکتی۔ پھول کو تلاش کرنا، کہاں چھپا دیا ہے؟“
 ”اسی صندوق میں تھا...“

”جھوٹ بول رہی ہے! تو نے اسے اور کیس چھپا رکھا ہے۔ چل، بتا، فوراً بتا!“
 اور منصور بخشی خدیجہ بیگم کو بڑی سختی سے پکڑ کر حوض کی کنارے گھسیٹ لایا۔
 ”چل، بتانا! تو مجھے فریب نہیں دے سکتی!“

”میں آپ کو فریب نہیں دے رہی ہوں، جناب والا۔ فریب تو خود مجھی کو دیا گیا ہے! ہائے، لگتا ہے میری آخری گھڑی آن پہنچی۔ مظفر مرزا کے لئے میں نے کیا کیا نہیں کیا۔ بیٹا بھی مجھے دعا دے کر بھاگ کھڑا ہوا! رگا بیٹا ان سارے مصائب کو جھیلنے کے لئے مجھے چھوڑ گیا! رگا بیٹا!“

”لیکن وہ پھول تو نے اپنے بیٹے کو تھوڑی دیا ہے۔ اسے تو کیس چھپا رکھا ہے تو نے! خود حکمران مجھ سے فرما چکے ہیں کہ سونے کی بلبل کی چونچ میں ہیرا دبا ہوا ہے۔ میں ان سے وعدہ کر دکا ہوں کہ بلبل والے اس پھول کو تلاش کر کے ان کی خدمت میں نذر کر دیں گا۔ فوراً اسے تلاش کر کے نکال!“

”کسی نے چرا لیا ہے تو تلاش کہاں کروں؟“

”نہ تلاش کرے گی؟ تلاش کرنا ہی نہیں چاہتی! تو یہ لے!“

منصور بخشی نے خدیجہ بیگم کو دھکا دیا اور وہ سیدھی حوض کے برلے پانی میں جاگری۔ وہ ذرا دیر

تک پھرا ہوا کھڑا رہا، خدیجہ بیگم کو پانی نکلتے اور غوطہ کھاتے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر خدیجہ بیگم کے بال پکڑ لئے، پانی سے باہر کھینچ لیا اور جوں تو گھسیٹتا ہوا خواب گاہ کی طرف لے چلا۔
خدیجہ بیگم کو تین دنوں تک طرح طرح کی اذیتوں کا نشانہ بنایا گیا لیکن پھول کو نہ ملنا تھا نہ ملا۔
چوتھے روز رات کو وہ دنیا سے کوچ کر گئی۔

طاقتور، عاقل اور عیار شیبانی خان نے اپنے پیش رو فاتحین کے تجربات سے کچھ بھی تو نہیں سیکھا تھا۔ وہ دریائے مرغاب کے کنارے ایران کے شاہ اسماعیل کی تیس ہزار سپاہیوں پر مشتمل نہایت ہی جری فوج کے زرعے میں آگیا۔

سردیوں کا زمانہ تھا اور دن بہت سرد اور آبر آلود اس نے اس یقین کامل کے ساتھ شاہ اسماعیل کے لشکر پر حملہ کر دیا تھا کہ ایک اور فتح اس کی منتظر ہے۔ ایک گھنٹے، صرف ایک ہی گھنٹے قبل تک اس کی سپاہ کو تعداد اور طاقت دونوں اعتبار سے دشمن کے لشکر پر برتری حاصل تھی۔ اسے جو اطلاعات ملی تھیں (درست اطلاعات حاصل کرنے میں وہ ہمیشہ ہی کامیاب رہتا تھا) ان کے بموجب شاہ اسماعیل نے مرو کے گرد بارہ ہزار سپاہی مامور کر رکھے تھے اور وہ بارہ ہزار سپاہی پورے ایک مہینے سے خزاں کے آخری ایام کی سردی اور سیلن بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ موسم سرما کی سردی میں ٹھہر رہے تھے۔ دوسری طرف وہ خود مرو کے قلعے کو بند کئے ہوئے اس کے اندر اپنے پندرہ ہزار شکم سیر پوری طرح مسلح اور گرم بیکروں میں رہنے والے سپاہیوں کے ساتھ مقیم تھا، شاہ اسماعیل کی کمزور پڑتی ہوئی فوجوں پر حملے کے لئے مناسب موقع کا منتظر تھا۔
لیکن عیار کو عیار کے کان کاٹنے والے بھی مل ہی جاتے ہیں۔

شیبانی خان کو اگر معلوم ہوتا کہ اب کے اس کا پالا کتنے طاقتور اور عیار دشمن سے پڑا ہے تو وہ مرو کے قلعے سے باہر نکلنے میں جلد بازی ہرگز نہ کرتا۔ لیکن فتوحات کے نشے نے تو اس کی احتیاط برتنے کی حس ہی کو کند کر دیا تھا۔ ایک سال قبل شاہ اسماعیل شیبانی خان کو دباؤ کے آگے جھک جانے والا اور کمزور معلوم ہوا تھا۔ خان نے ہرات کو فتح کرنے کے بعد اپنے پچاس ہزار سپاہیوں پر مشتمل لشکر سے ایران کے وسطی علاقے پر حملہ کر دیا تھا اور راستے میں استر آباد، گورگان اور کرمان پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔ ان دنوں شاہ اسماعیل مغرب میں ترکی کے سلطان بایزید دوم سے جنگ میں الجھا ہوا تھا اسی وجہ سے شمال سے ہونے والے خان کے اس حملے کا مقابلہ نہیں کر سکا تھا۔ حملہ آور کی ہوس برابر بڑھتی ہی گئی تھی۔ اس نے اپنے سپاہیوں کو سب کچھ لوٹ لینے اور جی بھر کے قتل عام کرنے کی آزادی دے دی تھی۔ لیکن اس موقع پر شاہ اسماعیل کو مجبوراً اپنے غصے کو دبانا اور شیبانی

خان سے معاہدہ امن کرنے کے لئے اپنا ایک اہلچی قیمتی تحائف کے ساتھ خان کے پاس بھیجا پڑا تھا۔ اہلچی کے ذریعے بھیجے جانے والے پیغام میں شاہ نے خان کو ماورالنہر کے علاوہ خراسان کا بھی حکمران تسلیم کیا تھا اور اچھے ہم سابیوں کے جیسے تعلقات قائم کرنے کے درخواست کی تھی۔

شیبانی خان کے بھتیجے اور اس کی گھڑسوار فوج کے سالار عبید اللہ سلطان اور بیٹے تیمور سلطان کے علاوہ اس کے چچا کوچ کینی خان نے بھی شاہ کے اہلچی کا پورے اعزاز کے ساتھ یا کم از کم اس طرح خیر مقدم کرنے کا مشورہ دیا تھا جس طرح خان نے کبھی تاشقند کے حکمران محمود خان، اندجان کے حکمران احمد تہل اور سمرقند کے حکمران سلطان علی مرزا کے سفیروں کا کیا تھا۔ ان صلاح کاروں کا خیال تھا کہ اہلچی کے ساتھ اچھے سلوک کے ذریعے، ماہرانہ حکمت عملی کے ذریعے ایسی فضا پیدا کی جانی چاہئے جس سے شاہ اسماعیل کی چوکی میں ڈھیل پڑ جائے اور پھر مناسب موقع ملے ہی فیصلہ کن حملے کے ذریعے اس کا بھی اسی طرح خاتمہ کر دیا جائے جس طرح محمود خان، احمد تہل اور دیگر مخالفین کا کیا جا چکا تھا۔

اب شیبانی خان دریائے مرغاب کے کنارے کف افسوس مل رہا تھا کہ اس نے اس صلاح کاروں میں مانا تھا اور اپنے دشمن کی طاقت کو بہت کم سمجھ بیٹھا تھا۔ اسے ماورالنہر سے بھی تنویش ناک خبریں موصول ہوتی رہی تھیں۔ خان کے خانہ بدوش صوبیداروں کے باعث سمرقند، بخارا اور وادی فرغانہ میں بے چینی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ اسے خراسان سے تیس ہزار لشکریوں کو عبید اللہ سلطان اور تیمور سلطان کی کہان میں ماورالنہر روانہ کرنا پڑا تھا کیونکہ وہ ماورالنہر پر برقیقت اپنا اقتدار برقرار رکھنا چاہتا تھا۔

شیبانی خان کے اعلیٰ عہدیدار اور سردار بھی اس سے نالاں ہوتے جا رہے تھے۔ عام طور پر تاریخ و حسرائی جا رہی تھی، ماضی کی طرح اس وقت بھی وسیع و عریض مقبوضہ علاقوں کے صوبیدار اپنے ”آقا“ سے آزاد ہونے کے کوشاں تھے، مرکز سے اپنا رشتہ توڑنے پر مائل عناصر طاقتور ہوتے جا رہے تھے۔

شیبانی خان نے اس صورت حال سے نپٹنے کے لئے عبید اللہ سلطان سے بخارا اس، اپنے چچا کوچ کینی سے ترکستان اور حمزہ سلطان سے حصار کو چھین کر ان کی جگہوں پر ان کی یہ نسبت کم آزاد خیال اور زیادہ فرماں بردار صوبیدار مقرر کر دیئے تھے۔ اپنے بیٹے تیمور سلطان کو وہ کافی دنوں سے اپنے تخت کے قریب بھی نہیں پھینکنے دیتا تھا، ڈرتا تھا کہ کہیں جو شیلہ، بہ غلت فیصلے کرنے والا اور ذہین مینا باپ کے خلاف کسی سازش کا سرغنہ نہ بن بیٹھے۔

شاہ اسماعیل کو شیبانی خان کے صدر مقام پر نفاق اور ماورالنہر میں پھیلی ہوئی بے چینی کا علم ہو گیا۔ اس نے موسم سرما کی پروا نہ کرتے ہوئے براہ راست ہرات پر جہاں شیبانی مقیم تھا، حملہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ خراسان میں بھی خان کی حالت زیادہ مضبوط نہ تھی اس لئے وہ شاہ کے حملے کا مقابلہ کرنے کے بجائے ہرات سے پیچھے ہٹ کر مرو چلا گیا۔ مرو کا قلعہ بہت مضبوط تھا اور ایک لحاظ سے ماورالنہر جانے کے راستے کو روکے ہوئے تھا۔ اس کے علاوہ خان نے ماورالنہر کو اپنے قاصدوں کے ذریعے یہ ہدایات بھی بھیج دیں کہ تیس ہزار منتخب اور دلیر سپاہیوں کی اس فوج کو مدد کے لئے فوری طور پر واپس بھیجی گئی تھی۔

اس مرحلے پر خان کے سپہ سالاروں میں دوبارہ اختلاف رائے پیدا ہو گیا۔ اس اندیشے کے تحت کہ کہیں سپہ سالار یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ شیبانی خان شاہ سے دہشت زدہ ہو کر بھاگ رہا ہے، یہ دلیل دی گئی: شاہ کو مرو کی طرف بڑھنے کی ترغیب دی جائے گی، اس اثنا میں ہماری فوج ماورالنہر سے واپس آجائے گی اور تب یہ ”شیخ پچہ“ ہمارے مضبوط شکنجے میں پھنس جائے گا۔

اس منصوبے کو ہمیشہ ہی کی طرح دانشمندانہ تصور کر لیا گیا اور شیبانی اور اس کے لشکر نے مرو کے قلعے کے اندر مضبوطی سے قدم جمائے۔ شاہ اسماعیل مذاق اڑانے والے انداز میں خان کو خطوط لکھ لکھ کر لکارنے لگا کہ ہمت ہو تو درویش کا ”کشکول گدائی“ اور عصا لے کر آئے ہوئے غریب شیخ کے فرزند سے کھلے میدان میں نکل کر ٹکرو۔ دوسرے الفاظ میں اسے خان کے فوجی اعتبار سے بالاقوت ہونے پر شک ہو رہا تھا۔ اسماعیل کے یوں دل ہی دل میں مسرور ہونے کو متکبر خان دانت پیس پیس کر پروا نہ کرتا رہا۔

تاریخ دہرائی جا رہی تھی۔ کبھی بابر کو ایسا کرنا پڑا تھا اور اب اس کے دشمن شیبانی خان کو قلعہ بند ہو کر بڑی بے چینی کے ساتھ ملک کا انتظار کرنا پڑ رہا تھا۔ تجربہ کار سپہ سالار شیبانی جانتا تھا کہ چوبیس سالہ شاہ اسماعیل کتنا ہی جوشیلا اور بہادر کیوں نہ ہو، اس کے لئے پورے موسم سرما میں محاصرہ جاری رکھنا ناممکن ہو جائے گا۔ برہنہاری اور انتہائی سرد ہوائیں اسے دیر دوری محاصرہ اٹھانے پر مجبور کر دیں گی۔ وہ سوچتا تھا کہ جب شاہ کی تھکی ہوئی اور کمزور فوج اپنے مقصد کے حصول میں ناکام ہو کر واپس لوٹنے لگے گی تب... اس سے پہلے ہرگز نہیں! وہ ایرانی سپاہ پر ٹوٹ پڑے گا، اسے پوری طرح نیست و نابود کر دے گا۔ فتح کے نتیجے میں ایران پر اس کا قبضہ ہو جائے گا۔ اس کے بعد بغداد اور پھر مکہ شریف کا راستہ کھل جائے گا۔ تب ساری دنیائے اسلام اسے حقیقی خلیفہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائے گی اور ساری غیر اسلامی دنیا اسے سکندر ثانی مان لے گی۔

لیکن خان کے ان شاندار خوابوں کو تیس ہزار سپاہیوں کے لشکر کا انتظار خاک میں ملائے دے رہا تھا۔ ماورالنہر سے مرو تک کا فاصلہ کم ہی تھا پھر بھی جانے کیوں یہ لشکر مرو پہنچنے میں اتنا زیادہ وقت لگا رہا تھا۔ فوج کے راستے میں رکاوٹ بھی بس ایک ہی تھی۔ تندو تیز دریائے امو۔ پھر بھی ہمیشہ ہی مستعدی اور پھرتی سے کام کرنے والے عبید اللہ سلطان، تیمور سلطان اور حمزہ سلطان جانے کیوں اتنی دیر لگا رہے تھے۔ شیبانی خان ان لوگوں کی تساہلی کے اسباب کے متعلق قیاس آرائیاں کرتا رہتا تھا: شاید یہ لوگ ناراض ہیں کیونکہ میں نے انہیں صویداروں کے ممتاز اور منفعت بخش عہدوں سے ہٹا دیا ہے۔ یقیناً ان لوگوں کو مجھ سے سخت جھلاہٹ محسوس ہو رہی ہوگی۔ شاید یہ لوگ ایک دوسرے سے کہہ رہے ہوں گے: (ساری پرخطر مہموں میں تو ہم لوگ پیش پیش رہے، ساری اہم جنگوں میں فتوحات تو ہماری تلواروں کے بل پر حاصل کی گئیں لیکن خان ان دنوں جوان بیگمات کے ساتھ عیش کر رہا ہے، اس کی نگاہوں میں ہماری خاک بھی وقعت نہیں۔ وہ تو ہمیں عمدہ و منصب سے ہٹا رہا ہے، ہمارا مذاق اڑا رہا ہے۔ خیر کوئی بات نہیں، اب ہمارے بغیر ہی کام چلائے! اب اس شاہ سے اکیلے ہی نکلے۔“

شیبانی خان آگ بگولا ہو ہو کے دل ہی دل میں اپنے سپہ سالاروں کے اس طرز عمل پر معترض ہوتا تھا: ”منک حرام کتے کہیں کے! نہیں، کتے نہیں، پلے! کیا اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ میں نہ ہوتا تو لوگ کہیں کے نہ رہتے؟ یہ بھی کوئی ناراض ہونے کا وقت ہے جبکہ نہایت ہی اہم بات کا میرے مقدر سے کہیں زیادہ اہم بات کا فیصلہ ہونے جا رہا ہے! فتح مجھ کو حاصل ہوتی ہے یا شاہ اسماعیل کو۔ یہ وہ سوال ہے جس پر ہمارے شاہی خاندان کی زندگی اور موت کا انحصار ہے یا تو ہمارا دشمن زندہ رہے گا یا ہم!“ خان دل ہی دل میں قسم کھاتا تھا کہ شاہ ایران پر فتح حاصل کرتے ہی ماورالنہر کی اس فوج کے سب سالاروں کو بدل دے گا، تاخیر کرنے کے سلسلے میں جو لوگ قصور وار ٹھہریں گے انہیں سخت سے سخت سزا دے گا!

لیکن وہ فوج کسی طرح مرو پہنچ ہی نہیں رہی تھی۔ کوئی ایسا تھا ہی نہیں جسے وہ سزا دے سکتا۔ خاص بات یہ تھی کہ کوئی ایسا بھی نہ تھا جس کے ساتھ مل کر وہ فتح حاصل کر لیتا۔ قیامت کی سردی پڑنے لگی، درجہ حرارت نقطہ انجماد سے بھی نیچے گر گیا۔ شاہ اسماعیل نے خان کو ایک اور خط بھیجا جس میں اسے بزدل قرار دیتے ہوئے کہا کہ وہ محاصرہ اٹھا رہا ہے لیکن انتقام لینے کے لئے موسم بہار میں ضرور آئے گا۔

مرو کے مضبوط قلعے کی فصیلوں کے اوپر سے بڑی دلچسپی کے ساتھ دیکھا گیا کہ شاہ اسماعیل کے

سپاہیوں نے خیمے اکھاڑ اکھاڑ کر اراہوں پر لا دے اور صف آرا ہو کر جنوب مغرب کی سمت روانہ ہو گئے۔

شیبانی خان نے اپنی گھڑسوار فوج کو تیزی سے قلعے سے باہر نکل کر حملے کے لئے تیار ہو جانے کا حکم دے دیا۔ قلعے کا پھانگ کھولنے سے قبل وہ ایک مینار پر سے کافی دیر تک دریائے امو کی طرف دیکھتا رہا۔ کمک کی آمد کا وہ ابھی منتظر تھا لیکن اس کی تیز نگاہوں نے بھی مجبوروں کی لائی ہوئی اطلاع ہی کی تصدیق کی۔ تیس ہزار سپاہیوں کا اس کا وہ لشکر ابھی امودریا کے اس طرف ہی کافی دوری پر تھا۔ آخر کار خان نے قطعی فیصلہ کر لیا: خزانے اور حرم کی حفاظت کے لئے پانچ سو سپاہی چھوڑ دیئے جائیں گے اور باقی فوج کو وہ حملہ کے لئے ساتھ لے جائے گا۔

شاہ اسماعیل کی فوج بڑی افرا تفری کی حالت میں مرو قلعے سے دور ہوتی جا رہی تھیں۔ خان نے سوچا کہ وہ جانی دشمن کو اس طرح بچ کر نکل جانے کی اجازت دے سکتا ہے؟ بعد میں لوگ اس کے بارے میں کیا کہیں گے؟ یہی ناکہ شاہ اسماعیل کو برتری حاصل تھی اور خان اپنے نانی گرامی سلطانوں کے بغیر مقابلے سے کترا رہا تھا؟ نہیں، وہ تو خان اور خلیفہ ہے، وہ تو اپنی زندگی میں کبھی بھی بزدل نہیں رہا۔ وہ ساری اسلامی دنیا پر ثابت کر دکھائے گا کہ اپنی تمام جنگوں میں فتوحات خود اپنے بل بوتے پر حاصل کی ہیں۔ بس قسمت آج بھی اس کا ساتھ دے جائے...

حکم کی تعمیل کی جا چکی تھی۔ گھڑسوار حملے کے لئے صف آرا ہو چکے تھے۔ اتنے میں عبدالرحیم اس کے پاس آیا اور بریلی ہواؤں سے نیلے پڑ جانے والے ہونٹوں کو بمشکل کھول کر سمجھانے لگا کہ قلعے سے باہر نکلنا قرین مصلحت نہیں:

”عظیم خان، ہمیں آپ کی بیش بہا زندگی کو خطرے میں ڈالنے کا کوئی حق نہیں۔ ہمیں ماوراءالنہر والی فوج کے یہاں پہنچ جانے کا انتظار کرنا چاہئے۔“

”پر وہ فوج ہے کہاں؟ آخر اور کتنا انتظار کروں ان... ان کتوں کا؟“ خان برس پڑا۔

”سردیوں میں اموجیسے دریا کو پار کرنا لوہے کے چنے چبانا ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ عبید اللہ

سلطان اور تیمور سلطان جلد ہی آجائیں گے۔“

”کب آئیں گے؟ جب سرا کی تیز ہوائیں شاہ اسماعیل کے قدموں کے نشانات مٹا چکی ہوں گی؟ یہ سلطان، یہ کتے آنا چاہتے تو کبھی کے یہاں پہنچ چکے ہوتے! ارے ان کبجھوں نے جان بوجھ کر مجھے اکیلا چھوڑ دیا ہے! سوچتے ہیں کہ ان کے بغیر میں جنگ کرنے سے خائف ہوں! ڈینگ مار رہے ہوں گے کہ ساری فتوحات انہی کی طاقت سے حاصل ہوئی تھیں۔ خود میں نے... اپنے انہی

عقابوں کے سہارے!“

اور شیبانی نے گھڑسواروں کی صفوں کے پاس پہنچ کر بلند اور واضح آواز میں انہیں مخاطب کیا:
 ”میرے عقابو، آپ دیکھ چکے ہیں کہ دشمن کیسی افرا تفری کی حالت میں بھاگے جا رہے ہیں۔
 تعداد میں وہ ہم سے کم ہیں۔ قیامت کی سردی نے انہیں کمزور کر دیا ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ خدا
 آج ہمیں ایک اور فتح سے ہمکنار کر دے گا۔ دشمنوں پر ٹوٹ پڑو، میرے عقابو! انہیں موڑ چہ بندی
 کا موقع دیے بغیر ہی ان پر ٹوٹ پڑو اور کشتوں کے پستے لگا دو! پروردگار، ہمیں ایک بار پھر فتح عطا کر!
 آمین! اللہ اکبر!“

”آمین! اللہ اکبر!“ لشکریوں کا نعرہ گونج اٹھا۔

اور خان کے کمان میں گھڑسوار شاہ کی واپس جاتی ہوئی فوج کے تعاقب میں ہوا سے باتیں کرنے
 لگے۔ لیکن وہ فوج واپس کب جا رہی تھی۔ یہ تو محض ایک چال تھی۔ تزلباز محض دکھانے کے
 لئے ہی پیچھے ہڑ رہے تھے خان کے خیر جو دشمنوں کے بارے میں ہمیشہ ہی درست اطلاعات فراہم کیا
 کرتے تھے، اس بار غپا کھا گئے تھے۔ انہیں بھٹک تک نہیں لگ سکتی تھی کہ شاہ نے مروتلے کے
 محاصرے پر اپنی تھوڑی ہی فوج مامور کی تھی اور بیس ہزار منتخب سپاہیوں کو مرو سے کچھ فاصلے پر
 دریائے مرغاب کے اس پار ریگستانی ٹیلوں کے عقب میں بڑی ہوشیاری کے ساتھ چھپا دیا تھا۔
 فن حرب کی یہ دی پر فریب چال تھی جسے خود شیبانی خان بھی بارہ سال قبل بخارا کے قریب
 واقع شہر تارا کول کے باغیوں کے خلاف اپنا چکا تھا۔ اس موقع پر خان نے محاصرہ اٹھا لیا تھا،
 دکھاوے کے لئے پیچھے ہٹ کر قلعے کے محافظین کو باہر نکلنے کی ترغیب دی تھی اور جب وہ باہر آ گئے
 تھے تو انہیں ریگستان میں گھیر کر ایک ایک کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ بعد میں خان نے گھوڑوں
 کے بازار میں ان باغیوں کے سروں کا ”مینار“ کھڑا کر دیا تھا۔

ہاں، شیبانی خان کو اپنی طاقت کا ضرورت سے زیادہ ہی یقین تھا۔ وہ تصور بھی نہ کر سکا کہ کوئی پہ
 سالار خود اس کے خلاف بھی یہی پر فریب چال چل سکتا ہے۔ شاہ اسماعیل کے بارہ ہزار فوجی پیچھے
 ہٹ رہے تھے، ہٹ نہیں رہے تھے بلکہ مرو سے بھاگ رہے گئے۔ شیبانی نے ان کے ساتھ
 تعاقب کرنے کا فیصلہ کیا شاہ کا لشکر اتنے میں محمودی نامی جگہ پر بنے ہوئے پل کو پار کر کے دریائے
 مرغاب کے دوسرے کنارے پر پہنچ گیا۔ خان نے سوچا کہ تعاقب جاری رکھتے ہوئے قریب پہنچ کر
 حملہ کر دینا چاہئے۔ شاہ اسماعیل دکھاوے کے طور پر پل کی حفاظت کے لئے تقریباً تین سو سپاہی
 مامور کر کے آگے بڑھ گیا لیکن خان کی نہایت ہی طاقتور گھڑسوار فوج کے پل کے پاس پہنچتے ہی شاہ

کے یہ سب سپاہی خوف زدہ ہو جانے کا جان بوجھ کر تاثر دیتے ہوئے سر پر پیر رکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ شیبانی نے پل کو پار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ دراصل دریا کے دوسرے کنارے پر پہنچنے کی اور کوئی صورت بھی نہ تھی۔ دونوں کناروں پر عمودی ڈھلانوں والے بلند کراڑے موجود تھے، کہیں کوئی گھاٹ نہیں تھا اور دیے بھی برف جیسے سرد پانی میں اتر کر دریا کو پار کرنا ممکن نہ تھا۔ آگے بڑھنے کے لئے پل کو پار کیا جانا ضروری تھا۔

شیبانی کی ساری فوج جب تک دوسرے کنارے پر نہیں پہنچ گئی تب تک اسماعیل کے گھات میں بیٹھے دستوں نے کسی بھی طرح اپنی موجودگی نہ ظاہر ہونے دی۔ شیبانی کی فوج پل سے کافی دور تک آگے نکل گئی تب ہی یہ دستے ٹیلوں کی آڑ سے نکل کر حملہ آور ہوئے اور پہلے سے بہت ہی مہارت کے ساتھ نصب کی گئی توپوں سے پتھر کے گولے داغنے اور تیر برسانے لگے۔ قزلباشوں نے شیبانی کی فوج کو تین طرف سے گھیر لیا اور چوتھی طرف دریا تھا۔

اب کہیں جا کر خان کی سمجھ میں آیا کہ وہ پھندے میں پھنس گیا ہے۔ اسے یاد آگیا کہ کبھی اس نے قارا کول کے باغیوں کے خلاف خود بھی یہی چال اپنائی تھی۔ اب وہ فتح کے بجائے اپنی جان کی سلامتی کی دعائیں مانگنے لگے۔ وہ گھوڑے کو تیزی سے دوڑاتا ہوا پل کے قریب آیا لیکن یہ چوبی پل ٹوٹ چکا تھا۔ ایرانی دستوں کے دباؤ سے خان کی فوج کے گھوڑے اور سوار بلند کراڑے سے دریا میں گرنے لگے اور جلد ہی سطح آب پر لاشیں ہی لاشیں نظر آنے لگیں۔ خود خان اپنے کچھ دلیر سپاہیوں کے ساتھ دریا کے کنارے کنارے بھاگا اور کچھ دور جا کر جاڑوں میں بھجڑیں رکھنے کے ایک باڑے میں پھنس گیا۔ قزلباشوں نے فوراً ہی باڑے کو گھیر کر حملہ شروع کر دیا۔ خان کے نجی محافظین جان بازی کے ساتھ لڑتے ہوئے یکے بعد دیگرے ہلاک ہونے لگے۔ اسماعیل نے خان کو عزم و استقلال کے ساتھ اپنا دفاع کرتے دیکھا تو اس نے توپیں باڑے کے قریب ہی لگوا دیں۔

یہ کارروائی فیصلہ کن ثابت ہوئی۔ زخمی گھوڑے گولوں کے دھماکوں سے غضب ناک ہو کر ایک دوسرے کو اور سپاہیوں کو روندتے ہوئے بھاگنے لگے۔ شیبانی خان نے جو ہاتھ میں برہنہ شمشیر لہرا رہا تھا، اپنی بلند آواز سے چیخ چیخ کر اس جھڈر کو روکنے کی کوشش لیکن یہ کوشش ادھوری ہی رہ گئی۔ پتھر کا ایک گولہ آکر براہ راست اس کے گھوڑے کے سر پر لگا۔ دوسرے ہی لمحے گھوڑا بھی زمین پر ڈھیر ہو گیا اور سوار بھی۔

شیبانی خان رکابوں سے پاؤں نہ نکال سکا اور اس کی ایک ٹانگ گھوڑے کے نیچے دب گئی۔ اسی لمحے ایک دوسرا گھوڑا خان کے اوپر آن گرا۔ اس طرح خان جس کی پسلیاں ٹوٹ گئی تھیں اور جو

گھوڑے کے وزن سے زمین میں دھنسا جا رہا تھا بے ہوش ہو گیا۔

لڑائی کے بعد ایک قزل باش سردار نے جو خان کو پہچانتا تھا، اس کی لاش ڈھونڈ نکالی۔ خان کے چاروں طرف کی زمین دشمنوں اور عبدالرحیم اور منصور بخشی سمیت خود اس کے بہت سے عہدیداروں اور سرداروں کی لاشوں سے پٹی پڑی تھی۔

فاتحین نے شیبانی کی لاش سے سر کاٹ کر نیزے پر اٹھایا اور اسے شاہ کے جا کر اس کے گھوڑے کے سموں کے نیچے پھینک دیا۔ بعد میں شیبانی خان کے بہائے ہوئے خون کے بدلے کے طور پر اس کے سر کی کھال اتروا کر اس میں بھوسا بھر دیا گیا۔ شیبانی کے کاسہ سر پر سونے کے پتر مڑھ دے گئے اور فاتحین نے اس ”جام“ سے شراب پی۔

قدز... اور ایک بار پھر سمرقند

۱

... یہ خان زادہ بیگم کے اپنے دس سالہ بیٹے خرم کے ساتھ مرو سے بلخ ہوتے ہوئے قدز پہنچنے کے سفر کا دوسرا ہفتہ شروع ہو چکا تھا۔

سفید اونٹ پر بندھے شاندار محمل میں جو سنہرے پھندنوں والے ریشمی پردوں سے ڈھکا ہوا تھا، بیٹھ کر سفر کرنے کے باوجود کاروں کے راستے بہت دشوار ثابت ہو رہے تھے۔ انہیں اونچے نیچے ٹیلے، جنگل، لٹق و دق صحرا اور نالے پار کرنے پڑے تھے لیکن قدز اب بھی کافی دور ہی تھا۔ خان زادہ بیگم اور اس کا بیٹا تھک چکے تھے۔ اسی طرح چار کنیریں، چھ خادم اور سو قزل باش محافظ بھی جو ان دونوں کے ساتھ سفر کر رہے تھے، تھکن محسوس کرنے لگے تھے۔

... شاہ اسماعیل شیبانی سے سخت نفرت کرتا تھا اور خان زادہ بیگم پر جو شیبانی کی بیگمات میں سے ایک تھی، اس نے لفظ وعنایت کی بارش اپنی فتح کے فوراً ہی بعد نہیں کی تھی۔ مرو میں خان کی بیگمات کی تقسیم کے موقع پر شاہ کے ایک معتبر سردار نجم ثانی نے خان زادہ بیگم کو اپنے حرم میں رکھ لینے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ خان زادہ بیگم کے اکلوتے بیٹے خرم کو کچھ دنوں کے لئے زندان میں بند کر دیا گیا تھا کیونکہ خان کے خاندان والوں پر کوئی بھی شخص رحم نہیں کرنا چاہتا تھا، سبھی اس خاندان کو مکمل طور پر نیست و نابود کو دینے پر تلے ہوئے تھے۔

لیکن اس اثنا میں قدز سے باہر کا ایک اچلی شاہ اسماعیل کے نام اس کا پیغام لے کر آن پہنچا۔

بابر نے شاہ کو مبارک باد دی تھی کہ اسے حملہ آور شیبانی پر شاندار فتح حاصل ہوئی۔ اس نے شاہ سے یہ درخواست بھی کی تھی کہ اس کی بہن خان زادہ بیگم پر جو اپنی مرضی کے خلاف ظالم و جابر شیبانی کے حرم میں داخل ہو گئی تھی، خاص طور سے رحم کھایا جائے۔

شاہ اسماعیل نے سن رکھا تھا کہ بابر ایک دانشور بادشاہ ہے۔ وہ یہ جانتا تھا کہ بابر بے تعصب ہے اور شیبانی اور اس کی حکمت عملی کے حامیوں کا جانی دشمن۔ شاہ ایران شیبانی خاندان کے حکمرانوں کے خلاف اپنی مسموں کا سلسلہ جاری رکھنے اور ان سے سارے ماوراء النہر کو چھین لینے کا بھی ارادہ رکھتا تھا۔ اس جدوجہد میں بابر سے اچھا دوست اسے اور کہاں مل سکتا تھا اور پھر بابر اپنے لشکر کو کابل سے لے کر ماوراء النہر کے نزدیک واقع شر قندزیوں ہی تھوڑی پہنچ گیا تھا۔ قندزیں تو وہ اپنی لشکریوں کی تعداد بڑھانے کا بھی ارادہ رکھتا تھا۔ ان سب باتوں کے مد نظر شاہ اسماعیل نے موقع سے فائدہ اٹھا کر بابر کو اپنا اتحادی اور مرہون احسان بنالینے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے سوچا کہ وہ بابر کی مدد سے ماوراء النہر کو شیبانی کے بیٹوں سے چھین لے گا اور اس کے بعد دیکھے گا کہ ماوراء النہر پر اپنا دعویٰ ثابت کرنے کی زیادہ طاقت کس میں ہے۔

چنانچہ شاہ نے سنگدلی کے بجائے نیکی اور رحم دلی کا مظاہرہ کیا۔ خلیفہ زادہ بیگم اور اس کے بیٹے (اس کے نہ کہ خود ساختہ خلیفہ کے بیٹے!) کو رہا کر دیا گیا۔ ان دونوں کو نہ صرف یہ کہ سو سپاہیوں پر مشتمل دستے کی حفاظت میں بابر کے پاس جانے کی اجازت مل گئی بلکہ شاہ کے ایک اعلیٰ نسب وزیر محمد جان کو بھی ساتھ کر دیا گیا۔

خان زادہ بیگم کو نہ شاہ کے ان خیالات کا علم تھا اور نہ ہی اس بات کا کہ اس کے ساتھ سفر کرنے والا ایرانی سفیر خفیہ فوجی معاہدہ کرنے کے مقصد سے بابر کے پاس جا رہا ہے۔ اسے تو دل ہی دل میں نامعلوم آلام و مصائب کا جو اس کو اور اس کے بیٹے کو اپنے گرداب میں کھینچ سکتے تھے، جیسے پہلے ہی سے احساس ہو رہا تھا۔ اس عورت کا جو بے شمار تکالیف جھیل چکی تھی، دل طرح طرح کے اندیشوں اور خوف سے معمور تھا۔

ویسے اسے ایرانی محافظ دستے کے سپاہیوں سے ذرا بھی خوف نہیں محسوس ہو رہا تھا۔ یہ سپاہی اس کی کنیزوں سے بھی کسی قسم کی چھیڑ چھاڑ نہیں کرتے تھے۔ کئی ایسے مواقع آئے تھے جب کہ خان زادہ بیگم کو یقین ہو گیا تھا کہ بظاہر تند خو معلوم ہونے والے قزلباش خواتین کے ساتھ بڑی شائستگی سے پیش آتے ہیں۔

وہ شاہ کی بھی ممنون تھی اور اس کے سپاہیوں کی بھی۔ تاہم کسی نامعلوم خطرے کے احساس نے

جس خوف اور تشویش میں مبتلا کر رکھا تھا اس سے اسے کسی طرح نجات ہی نہیں پاری تھی۔ اسے لگ رہا تھا جیسے خطرہ گھاٹیوں اور گھنے جنگلوں سے دبے پاؤں اس کی طرف بڑھتا چلا آ رہا ہو۔ کارواں کھڑی ڈھلانون سے اترنے یا تنگ گھاٹیوں سے گزرنے لگتا تو وہ محسوس کرتی کہ اچانک پہاڑ ان لوگوں کے اوپر پھٹ پڑنے ہی کو ہیں۔ طوفان برق و باراں کے دوران تو خوف کے مارے اس کی جان ہی نکل جاتی تھی، انتہائی تیزی سے شروع ہو جانے والی موسلا دھار بارش اسے واقعی بے حد خطرناک لگتی تھی۔

دوران سفر ایک بار کارواں نے دریائے امو کے بائیں کنارے پر ایک جگہ جو سر ہسپتال کہلاتی تھی، جنگل کے پاس رات گزارنے کے لئے پڑاؤ ڈالا۔ خان زادہ بیگم کو ہرنوں کا شکار کرتے ہوئے شیروں کی دھاڑیں سنائی دیتی رہیں اور اس نے ساری رات آنکھوں میں کاٹ دی۔

غوری اور قندز زندیاں مل کر جس جگہ دریائے امو میں گرتی تھیں وہاں سے سرکنڈوں سے پوری طرح ڈھکا ہوا دلدلی علاقہ شروع ہو جاتا تھا۔ اس جگہ ہواؤں میں کچھ اتنی زیادہ نمی اور بدبو سی ہوئی تھی کہ سانس لینا سخت مشکل ہو رہا تھا۔ کہاں جاتا تھا کہ شیبانی خان کا چھوٹا بھائی محمود سلطان جس کا بہت سے خونیں معرکے پال بھی یکا نہیں کر سکے تھے، قندز میں کسی عجیب نوعیت کے بخار میں مبتلا ہو کر چند ہی دنوں میں چل بسا تھا۔ خان زادہ بیگم اس مسیب بخار کو یاد کر کے اپنے بیٹے کو تشویش بھری نگاہوں سے دیکھتی رہتی تھی۔

اس نے کبھی ایک افغان کماوت سنی تھی۔ ”جان سے ہاتھ دھونا چاہتے ہو تو قندز چلے جاؤ۔“ وہ اسے مذاق سمجھ کر ہنس پڑی تھی۔ لیکن اب یہی کماوت اسے سچی معلوم ہونے لگی۔ اسے اپنی زندگی سے کہیں زیادہ تشویش اپنے عزیز فرزند کی زندگی کی طرف سے لاحق رہتی تھی جو دراصل اسی کا بیٹا تھا کیونکہ وہ نفرت انگیز بوڑھا شیبانی بس کہنے ہی کا باپ تھا۔ اس نے تو بیٹے کی دس سالہ زندگی میں بس کبھی کبھار ہی اسے دیکھا تھا، بیٹے سے بس برائے نام ہی دلچسپی لی تھی۔

”کیس ایسا نہ ہو کہ بابر مرزا قندز میں موجود ہی نہ ہوں، پہاڑ کو پار کر کے اند جان نہ چلے گئے ہوں۔ کیس وہ کابل نہ لوٹ گئے ہوں۔ تب ہم کیا کریں گے؟“ خان زادہ بیگم بار بار فکر مند ہو کر سوچتی رہتی تھی۔

پامیر اور ہندوکش سے گھری ہوئی وادی قندز خان زادہ بیگم کو بمیانیک پھندے کی سی لگی۔ پھر ایک دن دوسرے کو اس مقام پر جہاں امو کے کنارے سے راستہ کو بہتانی رفعتوں کی طرف جاتا تھا، کارواں کو اس کے محافظ دستے سے ٹکے ہوئے اور پوری طرح مسلح دستے نے روک لیا۔ جلد ہی پتا

چل گیا کہ راستہ روک لینے والا یہ دستہ باہر کے روانہ کئے ہوئے غشتی دستوں میں سے ایک ہے۔ غشتی دستے کا سردار محمد کوکلتاش کاروں کو پہاڑی پر واقع قلعے کی طرف لے چلا۔ خان زادہ بیگم کو اب اچانک یہ وادی بہت خوبصورت معلوم ہونے لگی: کوساروں سے آتی ہوئی ہوائیں خوشگوار تھیں، ڈھلوانوں پر اگے ہوئے اشجار نہایت ہی دلکش تھے اور دریا کے کنارے گزرتا ہوا راستہ دل فریب۔

قندز کے سابق خانوں نے قلعے اور اس کے اندر واقع محل کی تعمیر کے لئے بہت ہی صحت افزا مقام منتخب کیا تھا۔ ”اور بڑی خوش مذاقی کے ساتھ“ خان زادہ بیگم نے یہ سوچتے ہوئے کہ اسی محل میں اس کی ملاقات اپنے عزیز بھائی سے ہونے والی ہے، بڑے سکون و اطمینان سے دل ہی دل میں کہا اور بے پایاں مسرتوں سے ہنسنے لگی۔

پھانک پر محل دار نے ان کا خیر مقدم کیا۔ وہ خان زادہ بیگم، اس کے بیٹے اور کینڑوں کو محل کے خاص طور سے آراستہ کئے گئے جھے میں لے گیا اور پھر فوراً ہی باہر کو مطلع کرنے چلا گیا۔

چند لمحات کے بعد ہی خوبصورت داڑھی اور سلیقے سے سنواری ہوئی مونچھوں والا کوئی تیس سال کا ایک جوان تقریباً دوڑتا ہوا دیوان خانے میں داخل ہوا۔ خان زادہ بیگم نے سمجھا کہ یہ باہر کا کوئی بیگ ہے کیونکہ اس کے پیچھے ہی پیچھے ایک اور جوان بھی اندر آیا تھا۔

خان زادہ بیگم کو بھائی کا اس زمانے ہی کا چہرہ یاد تھا جب وہ انیس سال کا نوجوان تھا اور داڑھی بھی ٹھیک سے نہیں نکلی تھی۔ اندر داخل ہونے والے اس شخص اور اس جوان میں کوئی خاص مماثلت نہیں پائی جاتی تھی۔ پھر چوڑے شانوں اور تڑپتی ہوئی ہموار مونچھوں والے اس جوان کا لباس بھی شاہانہ نہ تھا: ہیروں موتیوں سے خالی روپے دستار اور عام ریشمی چوندہ دراصل باہر بہن کی آمد کی اطلاع پاتے ہی خلوت گاہ سے جہاں وہ عموماً ”لکھتا پڑھتا رہتا تھا“ جس حالت میں تھا ویسے ہی دوڑ پڑا تھا۔

خان زادہ بیگم جواب بھی یقین نہیں کر سکی تھی کہ اندر داخل ہونے والا جوان ہی ہے، اس کے چہرے کو غور سے نکتنے لگی۔ باہر متعجب ہو کر ٹھہر گیا۔ اس کا گلا رندھ گیا اور بمشکل ہی آواز نکل سکی:

”آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟!... میں آپ کا بھائی ہوں! ہر مات کے لئے قصور وار آپ کا باہر!“

”ہاں ہاں، یہ آنکھیں تو پیارے باہر جان ہی کی ہیں! یہ آواز تو پیارے باہر جان ہی کی ہے!“ اور خان زادہ بیگم لپک کر بھائی کے پاس پہنچی، اس کے سینے پر اپنی ہتھیلیاں رکھیں اور پھر چہرہ بھی ٹکا

دیا۔ بابر نے بہن کو گلے سے لگایا اور اسے سسکیوں کے درمیان، مسرت اور غم کے آنسوؤں کے درمیان یہ الفاظ سنائی دیئے:

”بابر جان... میں اس وقت... خان کے پاس چلی گئی تھی... آپ کے حکم کے برعکس... میں جانتی ہوں کہ میرے اس اقدام کی وجہ سے آپ کو کیسے کیسے خباثت بھرے طعنے سننے پڑے تھے... لیکن یقین کیجئے کہ اس وقت میرے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ ہی نہ تھا...“

”ہاں مجھے معلوم تھا... میں سمجھ گیا تھا کہ آپ نے میری خاطر اپنی زندگی قربان کر دی... میں اپنی آخری گھڑی تک آپ کا مرہون منت رہوں گا۔“

”اگر آپ اسے احسان ہی کہتے ہیں تو کیا آج... آپ نے اس کا بدلہ نہیں چکا دیا۔ آپ نے مجھے قید سے، غم ثانی کے حرم سے بچا لیا ہے، بابر جان!... خدا کا ہزار ہزار شکر کہ اس نے مجھے ایسا بھائی عطا کیا۔“

”مجھے آپ پر فخر ہے، آبا جان! صد افسوس کہ والدہ محترمہ کو یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوا۔“

خان زادہ بیگم کو اپنی والدہ کے انتقال کی خبر گزشتہ سال ہی مل گئی تھی لیکن اس وقت اس کا دل ایک بار پھر اس ناقابل برداشت درد سے تڑپ اٹھا کہ وہ ماں کو اب کبھی بھی نہ دیکھ سکے گی۔

”ہائے! پروردگار نے ہمیں اپنی والدہ سے اتنی جلدی کیوں محروم کر دیا؟“ خان زادہ بیگم نے بابر سے الگ ہٹ کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ”کب ہوا تھا انتقال؟ علیل تھیں کیا؟“

”پانچ سال قبل... عرقہ دماغی سے کابل کے باغ میں سپرد خاک کر دی گئی تھیں...“

”افسوس کے پچاس سال کی بھی نہ ہو پائی تھیں کہ چل بسیں۔“

”ہاں۔ ویسے تو کتنے ہی لوگ اسی نوے سال تک جیتے رہتے ہیں۔“

”ہماری وجہ سے انہوں نے جانے کتنی تکالیف جھیلیں، برابر فکر مند رہیں اور آخر انہی سب پریشانیوں نے انہیں قبر میں پہنچا دیا۔“

اتنے میں محمد کو کلماتش نے جو دلیر خاموش کھڑا ہوا تھا، کہا:

”ارے بیگم صاحبہ، قسمت کے لکھے کو بھلا کون مٹا سکتا ہے؟... خوشی کی بات ہے کہ آپ ہمارے حکمران سے، اپنے برادر عزیز سے آن ملیں۔ آپ کی والدہ مرحومہ کی روح اس ملاقات سے کتنی مسرور ہو رہی ہوگی... آئیے، بیٹھ کر ان کے لئے دعائے مغفرت کریں۔“

وہ تینوں زر، منت کے گردے پر بیٹھ گئے۔ قاسم بیگ اندر آیا اور وہ بھی خاموشی سے انہی کے پاس بیٹھ گیا۔ پھر اس نے قلوغ نگار خانم کی روح کو ثواب پہنچنے کے لئے دھیمی اور سوگوار آوازیں

لُحْن کے ساتھ فاتحہ پڑھی۔ اس کے بعد ہی اس نے خان زادہ بیگم کو قد ز بچنے پر مبارک باد دی۔
خان زادہ بیگم نے اپنے بیٹے خرم کو جو دیوان خانے کے کونے میں کینروں کے درمیان بیٹھا ہوا
اس سب کو قدرے ہزاری سے دیکھ رہا تھا، اشارے سے بلایا۔ لڑکا آکر ماں کے پیروں کے پاس بیٹھ
گیا۔

خرم اپنے گورے چٹے چہرے، نیلی آنکھوں اور چھدری بھوؤں کی بناء پر ہو ہوا اپنے باپ شیبانی
خان جیسا لگ رہا تھا۔ بابر نے شیبانی کو قریب سے کبھی بھی نہیں دیکھا تھا لیکن اسے اس مشابہت کا
احساس ہو گیا: ”ناک نقشہ ہمارے خاندان کے افراد کا سا نہیں ہے، ہرگز نہیں۔۔۔ یہ لڑکا بھی ہمارا
ہو سکے گا کہ نہیں؟“

خرم ابھی سات سال کا بھی نہیں ہوا تھا کہ باپ نے اسے بلخ کا صوبیدار نامزد کر دیا تھا۔ اس
عہدے کی ذمہ داریاں اس کے سرپرست مہدی سلطان نے سنبھال رکھی تھیں لیکن خرم جلد ہی
اس بات کا عادی ہو گیا تھا کہ عمر میں بہت بڑے اور ممتاز عہدیدار بھی اسے کورنش بجالایا کریں۔

خان زادہ بیگم نے بابر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خرم سے کہا کہ یہ تمہارے ماموں جان ہیں۔
پھر بھی خرم ایک اجنبی شخص کے سلسلے میں اپنے بے تعلقی کے طرز عمل پر فوری طور پر قابو نہ پاسکا،
دل ہی دل میں اسے نظر انداز کرتا رہا اور محض اس کے عام لباس ہی کے باعث نہیں۔ اس نے
بادل خواستہ سر کی ایک جنبش سے بابر کو سلام کیا اور بس۔ نہ اٹھ کر بابر کے پاس گیا اور نہ ہی اس
سے کوئی بات کی۔

خان زادہ بیگم نے بیٹے کے شانے کو ہلکا سا دھکا دیتے ہوئے سخت لہجے میں کہا:
”ذرا ہوش میں آئیے نا! ہم لوگ بابر مرزا کے دربار میں ہیں! انہی کی سفارش پر تو شاہ اسماعیل
نے ہمیں آزاد کیا تھا۔“

خرم کو جیسے اچانک ہوش آگیا۔ اس نے آنکھیں پوری طرح کھول دیں اور متحیر اور احسان مند
نگاہوں سے اپنے ماموں کی طرف دیکھا۔ بابر کو اب احساس ہوا کہ لڑکے کی آنکھیں ماں ہی کی
آنکھوں کی طرح بڑی بڑی اور تیز ہیں۔

خرم درباری آداب کو جو اسے سکھائے گئے تھے، بھولا نہیں تھا۔ اس نے اپنے مڑے ہوئے
بائیں پیر کو آگے کیا، دائیں گھٹنے کے بل بابر کے سامنے بیٹھ کر دونوں ہاتھ سینے پر رکھے اور سر جھکا کر
لڑکوں کی جیسی کھکتی ہوئی دلنشین آواز میں بولا:

”عالی جاہ! یہ تاجیز آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔“

اور اب باہر نے دیکھا کہ خرم کی ناک بھی خان زادہ بیگم ہی کی ناک جیسی ہے۔ اس کے دل میں بھانجے کے لئے جو بہت ہی خوددار لڑکا معلوم ہو رہا تھا، محبت کے جذبات امنڈ آئے حالانکہ ان جذبات میں بھی حال ہی میں بھائی جانے والی آگ کے تلخ دھوئیں کی کچھ بو بھی بسی ہوئی تھی۔

”خدمت میں حاضر ہوئے ہو تو خوش آمدید، عزیز بھانجے!“ باہر نے کہا اور خرم کو اپنے دائیں پہلو میں بٹھالیا۔

اتنے میں کوئی پچاس سال کی ایک فریہ اندام عورت جو حرم کی نگران تھی، اجازت لے کر اندر آئی اور کہا کہ ملکہ عالیہ بادشاہ سلامت اور ان کی، بشیرہ سے ملاقات کرنا چاہتی ہیں۔

باہر نے بہن کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے معنی خیز انداز میں عورت سے کہا:

”ان سے کہئے کہ مرزا ہمایوں کو بھی اپنے ساتھ لیتی آئیں۔“

باہر کی نوجوان ملکہ ماہم بیگم کو نامحرموں کی موجودگی کے باعث دیوان خانے میں آتے ہوئے شرم محسوس ہو رہی تھی چنانچہ قاسم بیگ اور محمد کو کلتاش باہر سے اجازت لے کر دبے پاؤں باہر چلے گئے۔

خان زادہ بیگم کے لئے محل کا جو حصہ وقف کیا گیا تھا اس کے دروازے کے باہر متعدد افراد اکٹھا ہو چکے تھے۔ مرغیلان کا خواجہ کلاں بیگ، قوا کا طاہر، تاشقند کا سعید خان، سمرقند کا مجید برلاس اور اندجان کا سپاہی یوسف۔ سب لے سب خان زادہ بیگم سے ملاقات کر کے اپنے اپنے وطن کی خبریں دریافت کرنا چاہتے تھے۔ قاسم بیگ نے ان لوگوں کو واپس کر دیا۔

”پہلے وہ اپنے عزیزوں سے جی بھر کے باتیں کر لیں پھر آپ لوگوں کے لئے بھی اجازت حاصل کر لوں گا۔“

۲

چھریہ بدن اور شفتالو کے رنگ کا چست لباس۔ یہ تھی نوجوان ملکہ جو تین سالہ شہزادے (ولی عہد!) کی انگلی پکڑے ہوئے دیوان خانے میں داخل ہوئی۔ خان زادہ بیگم کو فوراً ہی احساس ہو گیا کہ لڑکا بالکل باہر ہی پر پڑا ہے۔ وہ تیزی سے اٹھ کر ان دونوں کی طرف بڑھی۔ ماہم بیگم سادگی، شائستگی اور نفاست سے سر کو خم کر کے آداب بجالائی۔ خان زادہ بیگم نے قریب پہنچ کر اپنے ہاتھ اس کے نازک اور گول شانوں پر رکھ دیئے، چہرے کو دیکھا، ”اوہ، کتنی حسین و جمیل ہیں!“ اور پھر باہر کی طرف مڑ کر بڑے مسرور لہجے میں کہا:

”مبارک ہو! کتنے موزوں ہیں آپ دونوں ایک دوسرے کے لئے! پروردگار ہمیشہ شادان

و فرحان رکھے!“

ننھا ہایوں ماں کا دامن تھامے اپنی اجنبی پھوپھی کا پاؤں سے سر تک بغور جائزہ لے رہا تھا۔ خان زادہ بیگم نے اسے گود میں اٹھالیا اور حیرت کی بات تھی کہ بچے نے اس کی گود سے نکلنے کی ذرا بھی کوشش نہ کی۔ پھر جب خان زادہ بیگم نے اپنا رخسار اس کے گل سے سایا تو وہ مسکرانے لگا۔ خان زادہ بیگم ہایوں کو گود میں لئے ہوئے خرم کے پاس آئی اور اسے نیچے اتار کر بولی:

”لیجئے، چھوٹے بھائی، اپنے بڑے بھائی سے ملئے۔“

”دلی عہد“، بابر کا تین سالہ بیٹا اور شیبانی کا دس سالہ بیٹا دونوں ذرا دیر تک چپ چاپ کھڑے ایک دوسرے کو تکتے رہے۔ پھر ہایوں کی توجہ خرم کی کمر سے لٹکتے ہوئے چھوٹے سے شاندار خنجر کی طرف مبذول ہو گئی اور اس نے نیام کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ خرم نے ننھے سے ہاتھ کو تھام کر دھیرے سے دباتے ہوئے سلام کیا لیکن خنجر دینے پر آمادگی نہ ظاہر کی اور ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ یہ دیکھ کر دوسرے سب افراد ہنس پڑے اور بابر نے سوچا: ”اپنے مال سے محروم ہونا کوئی بھی نہیں چاہتا۔“ لیکن خان زادہ بیگم نے کچھ بھی نہ سوچا، وہ تو سوچنے کے بجائے مسرور ہو رہی تھی۔ جن نکروں اور اندیشوں سے وہ قدز تک کے سفر کے دوران کانپ اٹھتی تھی ان کی جگہ اب مسرتوں نے لے لی تھی۔ اب ان کی جگہ یہ قسم تھی، ان کم سن تاجداروں کو نہیں بلکہ ان بچوں کو دیکھنے کی مسرت تھی، دلکش و دلربا ماہم بیگم کی مسکراہٹوں کے جواب میں مسکرانے کی خواہش تھی، بھائی کے ساتھ جس سے وہ بچپن کے ان ایام سے لے کر جب وہ دونوں بھی انہی بچوں کے جیسے تھے، آج تک شدید محبت کرتی رہی تھی، خوشیوں کو بانٹنے کی راحت تھی... اس کے دل میں انتہائی سرد موسم سرما کے بعد آخر کار بہار آگئی تھی، خوبصورت اور پر مسرت بہار۔

خان زادہ بیگم نے ایک بار پھر ماہم کو دیکھا اس کے بعد بابر پر شرارت آمیز نظر ڈالتے ہوئے کہا:

”عزیز حکمران، آپ کی تو قسمت جاگ اٹھی۔ ملکہ تو غیرت حور ہیں۔ کہاں مل گئی تھیں، کیسے شیشے میں اتارا تھا؟ آپ کہاں کی رہنے والی ہیں، ماہم بیگم؟“

”خراسان کی، آبا جان۔“

ماہم آنکھوں ہی آنکھوں میں شوہر سے التجا کرنے لگی: ”مجھے شرمندہ نہ کر دیجئے گا، یہ نہ بتا دیجئے گا کہ میں نے ہرات میں دیوار کے اوپر سے آپ کی طرف پھول پھینکے تھے...“ بابر کا دل بارغ بارغ ہو گیا لیکن اس نے جان بوجھ کر اکتائے ہوئے سے لہجے میں گویا کہ کوئی سرکاری دستاویز پڑھ رہا ہو، خان زادہ بیگم کو بتایا کہ اس کی شریک زندگی سلطان حسین بیکتر کی رشتہ دار ہے لیکن چار سال قبل

اس کے والد کو بدیع الزماں سے بد مزگی ہو جانے کے باعث ہرات سے غزنی جا کر وہیں بس جانا پڑا تھا۔ بابر نے ماہم کے والد اور بھائیوں کو غزنی سے کابل بلا لیا تھا جہاں ماہم سے اس کی ملاقات ہوئی تھی۔

پھر اس نے اچانک لہجہ بدل کر بہن سے پوچھا:

”ہرات اور مرغاب کے درمیان ایک شہر پڑتا ہے۔ حضرت جام آپ نے دیکھا تھا اسے؟“

”جی ہاں، مجھے معلوم ہوا ہے کہ یہ نام شاعر جامی کے اعزاز میں رکھا گیا تھا۔ سچ ہے نا؟“

”سچ ہے لیکن میں تو دوسری ہی بات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ ہماری بیگم کے نخیلیاں بزرگ جامی کے رشتے دار تھے۔“ پھر اس نے مذاق کے انداز میں اضافہ کیا: ”میں نے آپ کو یہ بات اس لئے بتائی کہ ہماری بیگم شعرو سخن کا بہت اعلیٰ ذوق رکھتی ہیں، بڑی قدردان ہیں۔ انہیں تو عظیم اساتذہ عبدالرحمان جامی اور علی شیر نوائی کے دیوان کے دیوان زبانی یاد ہیں۔ میں جب بھی کوئی غزل کہتا ہوں تو یہ اتنی خامیاں نکالتی ہیں کہ نہ پوچھئے۔“

ماہم نے شوہر کے مذاق کا جواب بھی مذاق ہی سے دیا:

”کوشش کرنی پڑتی ہے۔ میرے سر تاج میری تنقیدی صلاحیت کو خواہ مخواہ آسمان پر چڑھا رہے ہیں۔“

خان زادہ بیگم نے ان دونوں کی اس چھیڑ چھاڑ کا سلسلہ کچھ اور آگے بڑھا دیا:

”میں تو اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ بابر جان آپ کی جتنی بھی تعریف کریں کم ہے۔“

”شکریہ، آپا جان۔“ ماہم بیگم ذرا دیر خاموش رہی پھر اس نے خان زادہ بیگم سے کہا: ”میں نے آپ کی دلیری اور ایثار کے متعلق بہت کچھ سن رکھا تھا اور ہمیشہ آپ سے نیاز حاصل ہونی کا خواب دیکھتی رہتی تھی۔ خدا کا ہزار ہزار شکر کہ آج وہ خواب پورا ہو گیا۔ آپا جان، میں آپ کا تصور کچھ اس طرح کرتی تھی جیسے آپ قدیم داستانوں کی کوئی ملکہ ہوں لیکن آپ سے ملاقات ہوئی تو دل میں خیال آیا کہ آپ کا موازنہ کسی افسانوی ملکہ سے کرنے کی کیا ضرورت ہے... آپ کو تو ہمیشہ ہی ہمارے گھر اور ہمارے دل میں انتہائی قابل احترام مقام حاصل رہے گا۔“

خان زادہ بیگم نے ان الفاظ میں دلی غلوص کو محسوس کیا اور اسے بے اختیار عائنہ بیگم یاد آگئی (”اچھا ہی ہوا کہ بابر جان نے اپنی پہلی بیگم کو طلاق دے دی تھی۔“) ساتھ ہی ساتھ اسے خود اپنی حالت پر افسوس بھی ہوا کہ بھائی جیسی خوش بختی اسے نہیں نصیب ہوئی تھی، اسے تو مقدر نے تکالیف جھیلنے کے لئے شیبانی خان کے حرم میں ڈھکیل دیا تھا۔

اتنے میں بابر کی توجہ اس بات کی طرف مبذول ہو گئی کہ خان زادہ بیگم کے بالوں میں ہلکی ہلکی سفیدی نمودار ہو چکی ہے حالانکہ وہ ابھی چونتیس ہی سال کی تھی۔ بہن نے بابر کو ماں کا اس زمانے کے چہرہ یاد دلایا جب وہ بیوہ ہو گئی تھی۔ اور اب خان زادہ بیگم بھی بیوہ ہو چکی تھی۔ اس نے دلی ہمدردی کے ساتھ بہن سے کہا:

”میں آپ کا مرہون منت ہوں، آپا جان اور زندگی بھر رہوں گا!... میں شاہ اسماعیل کی شرافت کو بھی کبھی فراموش نہ کروں گا جنہوں نے آپ کو صحیح سلامت ہمارے ہاں بھجوا دیا۔“

”میں آپ کی اجازت سے شاہ کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتی ہوں“ خان زادہ بیگم کا چہرہ کچھ اور کھل اٹھا۔ ”شاہ کی ملکہ تاج خانم بے حد حسین ہیں۔ وہ مجھے شاہ کے پاس لے گئیں میں نے شاہ کے بارے میں عجب بھیاںک سے قصے سن رکھے تھے۔ میں ان سے بہت خائف تھی پھر بھی چلی گئی۔ سوچتی تھی کہ پرانے قصوں کہانیوں میں جن دیوؤں کا ذکر آتا ہے بس انہی کے جیسے ہوں گے۔ لیکن میں نے تو تخت پر نفیس چہرے مہرے کے کوئی پچیس سال کے نوجوان کو بیٹھے دیکھا۔ داڑھی نہیں تھی، مونچھیں البتہ پتلی پتلی لمبی لمبی سی تھیں۔ ناک بھی ذرا لمبی ہی تھی۔ اور آنکھیں خوب بڑی بڑی سی... وہ آذربائیجانی زبان میں باتیں کر رہے تھے لیکن میری سمجھ میں آرہی تھیں۔ ان کے ہاں عورتوں کی بہت عزت کی جاتی ہے۔ اس بات کو میں نے اپنے اس سفر کے دوران بھی محسوس کیا۔“

”عورتوں کی عزت تو پہلے ہمارے ہاں بھی بہت کی جاتی تھی“ بابر بیچ میں بول پڑا۔ ”سرفرد میں ایک مدرسے کا نام بھی بی بی خانم کے نام پر یوں ہی تھوڑی رکھا گیا تھا۔ اس کے سامنے ہی سرائے ملک خانم کے نام کا مدرسہ واقع تھا۔ شاہ زندہ مقبرے میں شادی ملک خانم اور تومان آقا کی قبریں بھی موجود ہیں۔ ہرات میں گوہر شاد بیگم کے نام کا مشہور مدرسہ موجود ہے۔ یہ سب امیر تیمور کے خاندان کی خواتین ہی تھیں۔“

”پتا نہیں، بہت ممکن ہے کہ امیر تیمور کے زمانے میں ممتاز خواتین کی بہت عزت کی جاتی رہی ہو“ ماہم بیگم بابر کی طرف دیکھتے ہوئے کہہ اٹھی، ”پر آجکل نہ جانے کیوں حالات کچھ بدل گئے ہیں...“

”یہ تو قسمت کے کھیل ہیں“ بابر نے کہا۔ ”اس زمانے میں، علوم و فنون کی ترقی کے اس زمانے میں عورتوں کی عزت بڑھ گئی تھی کیونکہ علوم و فنون کی حقیقی ترقی عورتوں کی شرکت کے بغیر ممکن نہیں۔ وہ شعرا اور اہل علم کو تخلیقی تحریک عطا کرتی اور خود بھی تخلیقی تحریک کے تحت انجام دیئے جانے والے کاموں میں اوج کمال پر پہنچنے کے جوش و خروش کی حامل ہوتی ہیں۔ عہد زوال میں

جتنی تکالیف اہل علم اور مصوروں کو جھیلنی پڑتی ہیں اتنی ہی عورتوں کی حالت بھی بدتر ہوتی جاتی ہے۔“

”بجا فرمایا آپ نے۔ روحانی زندگی کے جس زوال کا آپ نے ذکر کیا وہ آج سارے ماورائے النہر میں پھیل چکا ہے اور اسے دیکھ کر دلی اذیت ہوتی ہے۔“ خان زادہ بیگم مغوم سی ہو گئی، ملک بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہو گا کہ اس کے جسم پر مسلط ہو جانے کا جنون سوار ہے۔ انہیں ماورائے النہر کی روح کی خاک بھی فکر نہیں... مجھے جنگ میں ہلاک کر دیئے جانے والے اپنے شوہر میں اب عیب نہ نکالنے چاہئیں لیکن مجبور ہوں... شیبانی خان فی بکھرے ہوئے، ایک دوسرے کے جانی دشمن قبائل کو متحد کیا، ماورائے النہر پر قابض ہو گئے، اپنے نام پر مدرسہ تعمیر کرایا۔ انہوں نے دریائے زرافشان پر پل بھی بنوایا۔ یہ ان کے کچھ نیک کام ہیں۔ لیکن نہ پوچھئے کہ وہ اہل علم اور مصوروں کے ساتھ کتنے اجڑپن سے پیش آتے تھے، کتنی نفرت کرتے تھے عورتوں سے! کوئی ان سے کہہ دیتا کہ تیمور خان کے حکمرانوں نے عورتوں کی یاد میں مدرسے اور مقبرے تعمیر کرائے تھے تو وہ غصے سے پاگل ہو اٹھتے تھے۔ ان کا تو کہنا تھا کہ عظیم الخ بیگ نے علم و فن کے چکر میں پڑ کر مذہب اسلام ہی کو فراموش کر دیا تھا، عورتوں کی تعریف کر کے، ان کے لئے مدرسے کھلوا کر اخلاق کو خاک میں ملا دیا تھا۔ ان کے حکم سے ”شیبانی نامہ“ اور ”نصرت نامہ“ دو کتابیں لکھوائی گئی تھیں۔ یہ میری نظر سے گزری ہیں۔ ان کتابوں میں ایک بھی عورت کا نام شامل نہیں ہے۔ بادشاہوں اور سلطانوں کی ماؤں اور بیٹیوں کے تذکرے بس یوں ہی فلاں کی دختر، فلاں کی بیگم کہہ کے کر دیئے گئے ہیں۔ غیر عورت کا نام لینے کا حق کسی کو بھی نہیں تھا حتیٰ کہ مورخین کو بھی نہیں اور یہ وحشیانہ دلیل خان کی تھی جنہوں نے جوں توں مدرسے کی تعلیم مکمل کی تھی اور جوں توں ہی الٹے سیدھے عشقیہ اشعار کہہ لیتے تھے۔“

بابریہ سن کر مسکرا دیا لیکن اب اس کی مسکراہٹ مسرت کی آئینہ دار نہ تھی۔ خان زادہ بیگم نے اپنی بات جاری رکھی:

”جہاں تک شیبانی کے بیٹوں کا تعلق ہے تو ان کی علمی استعداد اتنی بھی نہیں جتنی کہ ان کے والد کی تھی، بیٹے تو محض وحشیانہ طاقت ہی کے مالک ہیں۔ تمام ارباب علم و فن مطلق العنان سلطانوں کی سلطنت کو چھوڑ چھوڑ کر بھاگ رہے ہیں۔ کوئی خراسان بھاگا جا رہا ہے، کوئی استنبول تو کوئی کابل... اب سب کی امیدیں تو آپ ہی سے وابستہ ہیں، بابر جان!“ خان زادہ بیگم شاہی آداب کو جیسے بھول سی گئی۔ ”براہر عزیز،“ جانے کتنے ہی صاحبان علم ہیں جن کی نگاہیں آپ پر جمی ہوئی ہیں!

جو سوچتے ہیں کہ تخلیقات کی عظیم روح کو جس کا ماورائے صدیوں ہی سے حامل رہا ہے، حیات نوعطا کرنا آپ ہی کی قسمت میں لکھا ہے۔ آپ کو اپنے وطن واپس لوٹ کر آفتاب علم و فن پر چھائے ہوئے سیاہ بادلوں کو ہٹا دینا چاہئے۔“

”علم... تعلیم... حسن... شاعری... ان سب کا کہنا ہی کیا لیکن افسوس کہ دنیا محض انہی پر نہیں قائم ہے“ بابر نے سوچا پر فوراً ہی اپنے اوپر معترض ہو گیا: ”اور یہ سب نہ ہو تو پھر اقتدار ہی کس کام کا؟“

اقتدار، ماورائے صدیوں اس کا اپنا اقتدار قائم ہو سکتا تھا۔ شیبانی خان کے ہلاک کر دیئے جانے کے بعد بابر اپنے متعدد معتبر لوگوں کو سرقتد اور اندجان روانہ کر چکا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ صحرائی سلطانوں کے مظالم سے پریشان ہزاروں افراد اس کے ماورائے صدیوں میں قدم رکھتے ہی علم بغاوت بلند کر دینے کو تیار ہیں۔

”اندجان سے تو گزشتہ ہفتے ہی خوشخبری موصول ہوئی ہے“ بابر نے کچھ یوں کہا جیسے خود اپنے ہی خیالوں کا جواب دے رہا ہو۔ ”ہمارے ایک نانہالی رشتے دار سعید محمود نے اپنے حامیوں کو منظم کر کے صحرائی سلطانوں کو اندجان سے مار بھگایا ہے۔ انہوں نے مجھے لکھا ہے: ”آپ قارا تیگن ہوتے ہوئے جلد از جلد اندجان پہنچ جائیے۔ آپ کا وطن بڑی بے چینی کے ساتھ آپ کا انتظار کر رہا ہے۔“

”تو پھر آپ اندجان تشریف لے جائیں گے؟“ خان زادہ بیگم نے دھیرے سے پوچھا۔

بابر نے اسی طرح کھوئے کھوئے سے انداز میں نفی میں سر ہلا دیا۔ دراصل وہ چاہتا تھا کہ اپنے کسی معتبر بیگ کی کمان میں کچھ فوج اندجان بھیج دے اور خود حصار ہوتے ہوئے براہ راست سرقتد چلا جائے۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ بیک وقت دو شہروں پر حملہ آور ہونے کے لئے اس کے پاس کافی لشکر نہیں ہے۔ اس کے لئے شاہ اسماعیل کو نظر انداز کرنا بھی ممکن نہ تھا جو اس سے خانہ بدوش سلطانوں کے خلاف فوجی معاہدہ کرنا چاہتا تھا۔ بابر کو معلوم تھا کہ خان زادہ بیگم کے ساتھ شاہ کا ایلچی کس مقصد کے تحت آیا ہے۔ ویسے ایلچی نہ آیا ہوتا تب بھی خان زادہ بیگم کو آنے کی اجازت دے کر شاہ نے اتنی فیاضی کے ساتھ بابر پر جو احسان کیا تھا اس کا مقصد واضح ہی تھا۔

نہیں، اکیلے تو اندجان ہی پر حملہ آور نہیں ہو سکتا تھا، سرقتد کا تو خیر ذکر ہی کیا۔ بابر کو یہ اطلاع بھی مل چکی تھی کہ شیبانی کا بیٹا، دیر سپہ سالار تیمور سلطان اپنے ایک سفیر کو تحائف کے ساتھ شاہ کے پاس بھیج چکا ہے۔ اس نے سوچا خدا نخواستہ کہیں دونوں بڑی طاقتوں میں گٹھ جوڑ نہ ہو جائے۔

اپنی چیز سے بھلا کون محروم ہونا چاہتا ہے۔ ان دونوں کیساتھ گانٹھ سے نقصان صرف تیرے ہی کو، صرف اسی کو ہی پہنچے گا جو فی الحال سب سے کمزور ہے۔ لیکن اگر وہ عارضی طور پر، بس کچھ ہی دنوں کے لئے اسماعیل سے مل جائے گا تو۔۔۔

بابر نے یہ سب سوچا مگر خواتین کے سامنے بات چھپڑی شاہ اسماعیل کی شاعرانہ صلاحیتوں کی: ”ہمارے ایلچی مرزا خان نے جنہیں میں جلد ہی دوبارہ شاہ کے پاس بھیجنے والا ہوں، ایک بار مجھے شاہ کی کچھ غزلیں دکھائی تھیں۔ وہ آذر بایبجانی ترکی زبان میں شعر کہتے ہیں اور بہت ہی خوب کہتے ہیں۔ تخلص بھی بڑی انکساری کے ساتھ ”خطائی“ رکھا ہے۔“

”واقعی وہ بہت اچھے شاعر ہیں“ خان زادہ بیگم نے کہا۔

”میں نے ان کی کچھ غزلیں سنی ہیں، قزل باش لوگ گارہے تھے۔ شاہ سے جب میری ملاقات ہوئی تھی تو انہوں نے بھی میرے برادر عزیز کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا: ”ہم بابر شاہ اور بابر شاعر کا تمہ دل سے احترام کرتے ہیں۔“ پھر انہوں نے آپ کی ایک غزل کا مطلع بھی سنایا تھا۔ ہمارے بادشاہ کی بہت سی غزلیں ہرات کے مغنی گاتے رہتے ہیں۔ شاہ نے آپ کا شعر سنانے کے بعد کہا تھا: ”آفریں! بہت خوب!“

بابر کو اپنی اس ستائش سے مسرت کا احساس ہوا۔ اس نے ذرا شربتاتے ہوئے کہا:

”دلچسپ بات ہے۔ لیکن وہ کون سی غزل تھی؟“

خان زادہ بیگم نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کے اسے یاد کرنے کی کوشش کی۔ اتنے میں ماہم بول اٹھی:

”پہلا مصرعہ یہ تو نہیں تھا؟“

تمہ بہ تمہ بس خون ہے غنچے کا جیسا میرا دل

”جی ہاں، جی ہاں، یہی تھا!“ خان زادہ بیگم نے کہا اور دوسرا مصرعہ سنا دیا:

آئیں کتنی ہی بہاریں کیا کھلے گا میرا دل

”شاید اس شعر نے شاہ کے دل کو یوں ہی نہیں چھو لیا“ بابر نے کہا۔ ”ان کے سر سے بھی تو والد کا سایہ کم سنی ہی میں اٹھ گیا تھا، بہت سے مظالم سہنے پڑے تھے، تکالیف جھیلنی پڑی تھیں۔ سنا ہے کہ اب شاہ اسماعیل منصفانہ انداز سے حکمرانی کرنا چاہتے ہیں۔۔۔“

بابر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس سے شاہ کے ایلچی کی ملاقات کے لئے مقرر کیا گیا وقت ہو چکا تھا۔ ماہم بیگم اسے چھوڑنے کے لئے دیوان خانے کے دروازے تک آئی۔

باہر نے چلتے چلتے مختصراً ”بہ آواز بلند کہا:

”خیال رکھئے گا کہ میری ہمشیرہ ہم سب کی سگی ماں جیسی ہیں!“

ماہم پر ان الفاظ کا خفیہ مفہوم فوراً ہی واضح ہو گیا۔ اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر جواب دیا:

”آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔۔۔ اور عالی جاہ‘ میں آپ سے ایک التجا بھی کرنا چاہتی ہوں۔ ذرا محتاط رہئے گا! کبھی کبھی زہریلے تیروں کو بھی کاٹنا ہی سمجھ لیا جاتا ہے۔“

باہر کا دل یہ سوچ کر کہ ماہم اس کا کتنا خیال رکھتی ہے‘ اس کی سلامتی کی طرف سے کتنی نگر مند رہتی ہے‘ اپنی شریک زندگی کے سلسلے میں محبت اور احسان مندی کے جذبات سے معمور ہو گیا اور اس نے یقین دلایا:

”آپ فکر نہ کیجئے۔ مجھے یہ بات معلوم ہے۔“

اور اس نے دل ہی دل میں کہا: ”اسماعیل کو معاہدے پر آمادہ کرنے کے لئے مجھے سونے کی خاک بھی پروانہ کرنی چاہئے‘ سونے کے علاوہ دوسرے طریقوں سے بھی کام لینا چاہئے۔ شاہ کو بھی اور اس کے ایلچی کو بھی اپنی فیاضی سے جیت لینا چاہئے۔“

۳

شاہ اسماعیل کے بھیجے ہوئے تحائف۔ بیش بہا موتی‘ بدخشانی لعل‘ زری کے کام کے شاندار لمبوسات‘ بہترین طلائی دستے دار تلواریں اور عیش و آرام کی بہت سی نادر اشیاء۔ واقعی بہت شاندار تھے۔ ایسی ہی شاندار ضیافت کی تیاریاں بھی ہو رہی تھیں۔ رکاب دار اور ڈھیروں نوکر چاکر اس ضیافت کے سلسلے میں جیسی قدر میں پہلے کبھی بھی دیکھی سنی نہیں گئی تھی‘ دونوں اور دو راتوں سے بھاگ دوڑ میں مصروف تھے۔ اسی سے زیادہ تو صرف حصاری دہنے ہی فزع کئے گئے تھے۔ جہاں تک کوہستانی اور صحرائی علاقوں‘ جنگلوں اور دریا کے کناروں سے شکار کر کے لائے گئے ہرنوں‘ مرغابیوں اور تیتروں کا تعلق تھا تو ان کی تو گنتی ہی مشکل تھی۔

باہر کے مشیر مرزا خان نے جو ایران کے متعدد دوروں میں شاہ کی ضیافتوں میں شریک ہو چکا تھا‘ باہر کو آگاہ کر دیا تھا:

”قزل باش تو بادہ و جام سے خالی ضیافت کا تصور ہی نہیں کر سکتے۔“

وزیر اعظم قاسم بیگ جیسا کہ پہلے بھی ذکر آچکا ہے‘ شراب سے نفرت کرتا تھا۔ خود باہر نے بھی ابھی تک بادہ نوشی نہیں کی تھی‘ ایک بار کابل میں البتہ ماہم سے عقد کے بعد ذرا سی چکھ لی تھی اور بس۔

اس وقت بابر کے دل پر چھائی ہوئی مسرتوں کے درمیان کوئی مبہم سی تشویش بھی کوندتی جا رہی تھی جیسے کہ اس کا دل اس پیچیدہ کھیل پر صدائے احتجاج بلند کر رہا ہو جسے اس نے شروع کیا تھا اور جس کے بغیر کام چلانا ناممکن تھا۔

وہ چاہتا تھا کہ ہر شے کو فراموش کر دے، اس تشویش سے کم از کم ضیافت کے دوران تو نجات ہی پا جائے۔ ویسے بھی مہمانوں کے بادہ خور ہونے کے مد نظر میزبان کو اخلاقاً ”تھوڑی بہت تو ہنی ہی تھی۔“

خوشبودار اور تیز مے ناب اور دیگر شرابیں کافی تعداد میں (جتنی کہ قند میں مل سکتی تھیں) محل میں پہنچادی گئی تھیں۔

ہلکے زرد گربان والے پھولدار کامزول میں ملبوس مغھے طلائ اور نقرئی پیالوں میں شراب انڈیلنے لگے۔ سب سے پہلے جام شراب بابر کو، اس کے بعد اس کے پاس ہی بیٹھے ہوئے شاہ کے سفیر اور ایران کے وزیر محمد جان اور مرزا خان کو پیش کئے گئے۔

ضیافت میں سو سے زائد بیک اور دیگر ممتاز افراد شریک تھے۔ ان میں سے زیادہ تر لوگ اس سے قبل کی شاہی ضیافتوں میں بابر اور قاسم بیک سے چھپا کرے نوشی کیا کرتے تھے۔ لیکن آج تو کچھ اور ہی عالم تھا، آج تو یہ لوگ جام تھامے ہوئے ایک دوسرے کو شرارت آمیز نگاہوں سے دیکھ دیکھ کر حکمران کے اشارے کا انتظار کر رہے تھے۔ نسبتاً ”غیر اہم بیگوں کے درمیان بیٹھا ہوا طاہر نقرئی جام کی طرف بار بار بڑی احتیاط سے جیسے کہ وہ کوئی جاندار شے ہو، دیکھ رہا تھا۔ اسے شراب عجیب سی لیکن پرکشش لگ رہی تھی۔“

اتنے میں مرزا خان نے اپنی گھنی گھنی، ایک دوسری سے جڑی ہوئی بھوؤں کو جنبش دیتے ہوئے شاہ کے سفیر سے سرگوشی کے انداز میں کہا:

”مہمان عظیم، آپ ایک غیر معمولی واقعے کے چشم دید گواہ ہوں گے۔ یہ پہلا موقع ہے جب بابر مرزا کی کسی ضیافت میں دور جام چلے گا۔۔۔ ذرا ملاحظہ کیجئے نا۔۔۔ شرکاء پر کیسی بیجانی کیفیت طاری ہے!“

عقاب جیسی ناک اور مندی سے رنگی ہوئی داڑھی والے سفیر نے اپنے بڑے سے عمامے کو جس پر سرخ تاج کا نشان لگا ہوا تھا، جھٹک کر دسترخوان پر نظریں دوڑائیں اور پھر مرکز بابر کو ٹٹکی باندھ کر دیکھنے لگا۔

بابر جام کو یوں تھامے ہوا تھا جیسے وہ کوئی طائر ہو جو پھر سے اڑ جائے یا اسے زور سے کاٹ کھانے

کو تیار بیٹھا ہو۔ سب کو انتظار تھا کہ باہر کچھ کہے۔ آخر کار اس نے لب کھولے:

”خوشی کے مواقع پر عالی نسب مہمانوں کے ساتھ بہترین انگور کی شراب پینے کا رواج ہمیں اپنے بزرگوں سے ورثے میں ملا ہے۔ ہماری زندگی میں اب تک مرتیں کم تھیں اور غم زیادہ اسی لئے ہم جشنوں میں بھی یادہ نوشی سے اجتناب ہی کرتے رہے۔ ہمارے معزز بیک صاحبان کو علم ہے کہ ہرات میں ہمارے تاجدار رشتے داروں مرزا بدیع الزماں اور مرزا مظفر نے ہمارے اعزاز میں جن شاندار ضیافتوں کا اہتمام کیا تھا ان میں ہمیں بے تاب پیش کی گئی تھی لیکن ہم نے ان دونوں سے معذرت کر لی تھی۔ دراصل ان دونوں ہمارا ضمیر خوشیاں منانے کی اجازت ہی نہیں دے رہا تھا۔ اب قسمت سے ہمیں بھی خوشی کے دن دیکھنے نصیب ہو گئے ہیں اور یہ ہم پر ایران کے شاہ اسماعیل کی عنایت و نوازش ہی کا نتیجہ ہے۔ آج کی یہ مسرت ہمیں ہمارے مہمان عزیز نے بطور تحفہ عطا کی ہے۔ آئیے، یہ پہلا جام شاہ اسماعیل کے احترام کے نام پر جس سے ہمارے دل معمور ہیں اور ان کے دانش مند سفیر وزیر محمد جان سے دوستی کے نام پر پیئیں!“

ان الفاظ سے بے حد متاثر ہو کر سفیر کھڑا ہو گیا، اس کی آنکھیں چمک اٹھیں اور وہ سر کو خم کر کے باہر کو کورٹس بجا لایا۔ پھر اس نے بیٹھ کر جام کو ہونٹوں سے لگایا اور خالی کر دیا۔ سازندوں نے پر مسرت نغمہ ”سرودنوا“ چھیڑ دیا۔

۴

موسم بہار کے آخری زمانے میں جب کہ باہر کے لشکر کا زیادہ تر حصہ حصار پر حملہ آور ہونے کے لئے ہندوکش کے شمال مغربی دامن میں پہنچ چکا تھا، ایک روز قاسم بیک کو ان مغل بیگوں کی سازش کا علم ہوا جو کچھ عرصہ قبل شیبانی کا ساتھ چھوڑ کر باہر سے آنے لگے تھے۔ کوئی بیس ہزار سپاہی جو ان بیگوں کے ساتھ تھے، ہمیشہ ہی جنگ پر آمادہ رہتے تھے۔ پیسوں اور مال غنیمت کے لئے جنگ کرنا ان بیگوں کے لئے ایک طرح کا اصول زندگی سا بن گیا تھا۔ کوئی حکمران ان کی خدمات کے عوض زیادہ پیسوں کی پیش کش کرنا تو زیادہ تر مغل بیک اس سے جا ملتے تھے، کسی جنگ میں زیادہ مال غنیمت ہاتھ لگنے کی توقع ہوتی تھی تو اس میں لڑنے کے لئے چل کھڑے ہوتے تھے۔ انہیں باہر کی فتح کا پہلے ہی سے یقین تھا اسی لئے وہ باہر سے آنے لگے تھے لیکن ان کے درمیان ایسے بیک بھی تھے جو ابھی تک درپردہ اپنے سابق آقاؤں ہی کے حامی تھے۔

سازش کا سرغنہ تبر علی اس بات کو عارضی طور پر راز میں رکھے ہوئے تھا کہ وہ باہر کا جانی دشمن ہے کیونکہ گزشتہ سال اس کے چھوٹے بھائی کو جو ایک دوسری سازش میں ملوث تھا، کابل میں

سزائے موت دے دی گئی تھی۔ قبر علی نے اپنے ارد گرد ایسے لوگوں کو اکٹھا کر لیا تھا جو بابر کا تختہ الٹنے کے لئے تڑپ رہے تھے۔ انہیں شاہی خاندان کے کسی ایسے فرد کی تلاش تھی جسے بابر کی جگہ تخت پر بٹھاسکیں۔ ان لوگوں کی نظر انتخاب بابر کے ماموں الاچہ خان کے سترہ سالہ بیٹے سعید خان پر پڑی تھی جس کی پرورش بابر ہی نے کی تھی۔ قبر علی نے اس لڑکے کو اپنے دام میں پھانسنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ ایماندار اور ہوشیار ثابت ہوا تھا۔ اس نے مغل بیگوں کی اس سنگین سازش پر کسی قسم کے اظہار خیال کے بغیر ہی ان کی تجویز پر غور و خوض کرنے کا وعدہ کر لیا تھا اور بعد میں یہ سارا قصہ قاسم بیگ سے کہہ سنایا تھا۔

قاسم بیگ نے اس سازش کی تفصیلات بابر کو تنہائی میں اس وقت بتائیں جب وہ دونوں دامن کوہ میں لوگوں کی نگاہوں سے کافی دور نکل چکے تھے۔ بابر یہ سنتے ہی آگ بگولہ ہو گیا:

”کیسے بیگ! آخر یہ کبخت مجھ سے کب تک غداری کرتے رہیں گے؟ وہ اند جانی احمد تبتل بھی تو مغل ہی تھا! بہت ہو چکا اگر قاتل کر لیجئے ان سب کو! ٹکڑے ٹکڑے کر دو! دیجئے ان کے، پٹکوا دیجئے ان کی لاشوں کو تاکہ زاغ وزغن فوج فوج کر کھا جائیں!“

قاسم بیگ نے گھوڑے کی لگام کھینچ کر کوہستانی ڈھلوانوں پر نظر دوڑائیں جن کے دامن میں ہزاروں خیمے نصب تھے۔

”لیکن حکمران ان کی تعداد تو بہت ہے۔ بیس ہزار سپاہی ان کے ساتھ ہیں۔“

”تو کیا واقعی سارے کے سارے مغل اس سازش میں شریک ہیں؟“

”جی نہیں، سب نہیں شریک ہیں۔ سعید خان بھی تو مغل قبیلے ہی کا ہے لیکن اس نے ہم سے

مکمل وفاداری کا مظاہرہ کیا۔ دوسرے کئی ہزار مغل بھی ہمارے خیر خواہ ہیں۔“

”تب ہمیں ان لوگوں پر، مغل قبیلے پر اعتبار کرنا چاہئے مگر ان سب سازشی بیگوں کو قید کر لیتا

چاہئے جن کا سرغہ قبر علی ہے۔“

”لیکن قبر علی ہی تو سب سے زیادہ بااثر ہے۔ بہت سے بیگ اس کے رشتے دار بھی ہیں اور

ان سب کے سینوں میں انتقام کی آگ ہمیشہ بھڑکتی رہتی ہے۔ اگر ہم ان دشمنوں کو کچلنے میں

مصروف ہو گئے تو دوسرے دشمنوں کے خلاف لشکر کشی کیسے کر سکیں گے؟ کیسے ہمارے منصوبوں پر

پانی نہ پھر جائے؟“

قاسم بیگ کا خیال درست تھا۔ بیس ہزار سپاہیوں کی فوج میں مجرموں کا پتہ لگانا، انہیں سزائیں

دینا کوئی کھیل تو تھا نہیں۔ پھر اس کا رروائی میں کافی وقت بھی لگ سکتا تھا اور تب تک ماورائے النہر پر

حملہ کرنے کا موقع ہاتھ سے نکل جاتا۔ بعد میں واپسی کے راستے بھی بند ہو سکتے تھے۔ دوسری طرف بابر کسی طرح وطن واپس پہنچنے کے لئے اپنا سب کچھ داؤں پر لگانے کو، سنگین سے سنگین خطرات مول لینے کو بھی تیار تھا۔

بابر نے صورت حال کے موافق پہلوؤں پر غور کیا تو اس کا غیظ و غضب ناراضگی میں تبدیل ہو گیا۔

”غدار کہیں کے! خوب جانتے تھے کہ وار کب کرنا چاہئے۔ دراصل تبر علی جیسے منغل ہی ساری غداری کی جڑ ہیں!“

”عالی جاہ بجا فرما رہے ہیں لیکن عیارانہ چالوں کی کاٹ ایمانداری سے کرنا ٹھیک نہیں ہوتا۔۔۔ آپ کا یہ خادم کچھ دوسرے ہی اقدامات کرنے کی سوچ رہا ہے۔“

”کیسے اقدامات؟“

”سعید خان آپ سے اپنی وفاداری کا ثبوت دے چکا ہے نا؟ یقیناً دے چکا ہے۔ سازشی بیگیوں کی تعداد ان کے سرغنہ تبر علی سمیت تقریباً دس ہے اور یہ لوگ سعید خان کو اپنا خان بنانا چاہتے ہیں۔ ٹھیک ہے، اسے ان لوگوں کا خان بن جانے دیئے۔ ہم ان بیگیوں سے کہیں گے: (سعید خان آپ لوگوں کا حکمراں ہے۔ آپ اپنے سپاہیوں کو لے کر اندجان چلے جائیے۔“ اہل اندجان اب ہمارے طرفدار ہو چکے ہیں۔ سعید خان وہاں جا کر آپ کے نام سے حکومت کرے۔ اس طرح ہم تبر علی سے نجات پا جائیں گے۔“

”اور اگر بعد میں باقی مغلوں نے بھی سازش کی راہ اختیار کر لی تو؟“

”اس کا امکان بہت کم ہے۔۔۔ باقی غیر مطمئن بیگیوں سے میں خود ہی بات کر لوں گا۔ کہوں گا کہ اس بار تو آپ لوگ میری حمایت کی بدولت مرزا بابر کے قہر و عتاب سے بچ گئے ہیں لیکن اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ میں دوبارہ آپ کی حمایت کرنے سے رہا۔۔۔ ویسے جن بیگیوں پر زیادہ شک ہے ان پر میرے آدمی بہر حال نگاہ رکھیں گے۔ پانی سر سے اونچا ہونے لگا تو انہیں فوراً ہی گرفتار کر لیا جائے گا۔۔۔“

بابر نے گہری ٹھنڈی سانس لی۔ سعید خان کو قربان کر دینے کا منصوبہ اسے پسند نہ آیا لیکن مسئلے سے بچنے کی کوئی بہتر تدبیر بھی اسے نہ سوچھی۔

موسم گرما کے آغاز میں بابر کے لشکر (ان منغل دستوں کو چھوڑ کر جو سعید خان کے ساتھ اندجان روانہ کر دیئے گئے تھے) نے دریائے پنج کو پایاب عبور کیا اور وادی وحش میں تیزی سے آگے بڑھنے

شیبانی کے بیٹے جانتے تھے کہ اگر بابر کا لشکر ترمذ کی جانب سے آگے بڑھتے ہوئے قزل باشوں سے مل گیا تو وہ لوگ کہیں کے نہ رہیں گے۔ چنانچہ بابر کے دشمنوں نے اپنی فوج کا کچھ حصہ عبید اللہ سلطان کی کمان میں قرشی اور سمرقند میں چھوڑ کر باقی ساری فوج حصار میں جمع کر لی تھی۔ تیس ہزار سواروں کی اس فوج نے جس کے سالار تیمور سلطان، جانی بیگ سلطان، حمزہ سلطان اور ممدی سلطان تھے، صحراؤں کو تیزی سے پار کیا اور بابر کے لشکر کو دریائے وحش پار کرنے سے روکنے کے لئے پہاڑوں پر چڑھنے لگی۔

لیکن بابر کا لشکر پہاڑوں پر سے بہت تیزی کے ساتھ اترتا ہوا اپنے دشمنوں سے پہلے ہی وحش کے کنارے پہنچا اور دریا پر بنے ہوئے پل کو جو ”پل سنگین“ کہلاتا تھا پار کر کے دوسرے کنارے پر پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے بعد بابر کے سپاہیوں نے وادی میں آنے والے راستوں کی نگرانی کے سلسلے میں چٹانوں کے آگے کو نکلے ہوئے حصوں پر مضبوط مورچے قائم کر لئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صحرائی سلطانوں کی فوج وادی میں قدم رکھنے کی جرات نہ کر سکی اور ٹھہر گئی۔

بابر نے کوہستانی بلندیوں سے دیکھا کہ سلطان اپنے گھوڑوں سے اترے بغیر ہی صلاحیت و مشورہ اور بحث مباحثہ میں الجھ گئے ہیں۔ کچھ دیر بعد کوئی دس ہزار فوجی جو تیمور سلطان کے پرچم لئے ہوئے تھے، وادی میں داخلے کے راستے کے دائیں طرف چل دئے۔ ساری کارروائی کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ لوگ ان پہاڑی بلندیوں کا جن پر بابر کا لشکر قابض تھا، محاصرہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ یہ ایک قسم کا تلغمہ تھا۔ تیمور سلطان کے ان دس ہزار فوجیوں کو روکنے کے لئے مرزا خان کی کمان میں اتنے ہی گھڑسوار روانہ کر دیئے گئے۔ تیمور سلطان کا راستہ چکر دار تھا جبکہ مرزا خان کا سیدھا اس لئے آخر الذکر اپنے دشمن سے پہلے ہی منزل مقصود پر پہنچ کر اہم کوہستانی بلندیوں پر قابض ہو جانے میں کامیاب ہو گیا۔ تیمور سلطان اپنے فوجیوں کے ساتھ ڈھلانوں کے تنگ گڈ بندڑیوں کے ذریعے بلندیوں پر چڑھنے کے لئے دوسرے دن بھادری سے لڑتا رہا لیکن اس کی کوششیں رائیگاں ثابت ہوئیں۔ بلندیوں سے برستے ہوئے پتھروں اور تیروں نے اس کے تلخے کے منصوبے کو خاک میں ملا دیا۔

تیمور سلطان کے سپاہی کھلے میدان میں لڑنے کے عادی تھے اس لئے وہ تنگ گھاٹی میں چٹانوں کے آگے کو نکلے ہوئے حصوں کے درمیان ہمیشہ کے جیسے تال میل، تیزی اور بہادری سے کارروائی نہ کر سکے۔ گھوڑے جن کے ساز اور تنگ کوہستانی علاقے کے لئے بالکل ناموزوں تھے، ہلاک اور

زخمی ہو کر عمودی ڈھلانوں سے نیچے گرنے لگے اور انہی کے ساتھ ہلاک اور زخمی ہو جانے والے سپاہی بھی۔ زندہ اور غیر زخمی سپاہی بھی جنہیں جنگ کے غیر معمولی حالات نے بری طرح بدحواس کر دیا تھا، نیچے گرنے لگے۔ ان میں سے ایک سپاہی کو گرفتار کر کے بابر کے پاس لے جایا گیا جس سے پوچھ گچھ کے بعد معلوم ہوا کہ عبید اللہ سلطان جو شیبانی خاندان کے سپہ سالاروں میں سب سے زیادہ باصلاحیت اور فن حرب کا ماہر تھا، وہاں موجود نہیں ہے۔ باقی سپہ سالار تلغہ کی حربی چال کے ناکام ہو جانے کے بعد سمجھ ہی نہیں پارے تھے کہ لڑائی کو کیسے جاری رکھیں۔

بابر کو اطلاع مل چکی تھی کہ دشمن کی فوج نشیبی علاقے میں جہاں موجود تھی وہاں سے پانی خاصی دوری پر واقع تھا۔ گرمی بڑھتی جا رہی تھی اور صاف ظاہر تھا کہ جلد ہی فوجی اور ان کے گھوڑے پیاس سے تڑپنے لگیں گے لیکن پانی وادی میں داخل ہونے کی جگہ سے نصف فرسخ سے بھی زیادہ فاصلے پر تھا۔

شام ہو گئی۔ آفتاب غروب ہونے لگا اور بابر اپنے گھوڑے سے نیچے اترا۔ اس کے ساتھ ہی پہاڑی بلندی پر جو نشیب سے دکھائی دے رہی تھی، موجود کوئی ایک ہزار سوار بھی جان بوجھ کر اپنے گھوڑوں سے اتر پڑے۔

تو کیا جنگ اگلی صبح تک کے لئے ملتوی کی جا رہی تھی؟

سلطانوں نے بابر اور اس کے سواروں کو گھوڑوں سے اترتے دیکھ کر یہی نتیجہ اخذ کیا لیکن وہ یہ نہ دیکھ سکے کہ وادی کے عقبی دروں میں بابر کے دستے ان پر ٹوٹ پڑنے کے لئے تیار کھڑے ہیں۔ سلطانوں نے غلطی سے اپنی فوج کو آرام کرنے کا حکم دے دیا۔ مہض دو ہم برہم ہو گئیں اور بہت سے فوجی وادی میں داخل ہونے والے راستے سے پانی کی تلاش میں پیچھے لوٹنے لگے۔

”آگے بڑھو! جلدی کرو! جلدی!“ بابر نے چیختے ہوئے حکم دیا۔ ”دشمن پیچھے ہٹ رہا ہے۔ جا کر اس پر ٹوٹ پڑو، صف آرا ہونے کا موقع دیئے بغیر تمہ تیغ کرو!“

وادی سے فوراً ہی بارہ ہزار سوار آندھ کی طرح دشمن کی طرف چھپے۔ ان کے ساتھ ہی ساتھ کو ہستانی بلندی پر موجود تین ہزار لشکریوں نے بھی یلغار شروع کر دی۔ بابر جس نے تلوار نیام سے کھینچی تھی، اپنے علم برداروں کے آگے آگے گھوڑا دوڑاتا ہوا بڑھ رہا تھا۔

دشمن انتہائی بدحواسی کے عالم میں بھاگنے لگے۔ ان کے فوجی ادھر ادھر منتشر ہو گئے۔ تیمور سلطان اس ڈر سے کہ کہیں گھیرے میں نہ پھنس جائے، دوری پر واقع ایک دوسری وادی کی سمت بھاگ کھڑا ہوا۔ اندھیرا ہوتے ہوتے محمد دودلانی کا دستہ حمزہ سلطان کے ڈھیروں سپاہی کو ہلاک کرتا

ہوا اس تک پہنچا اور اسے گرفتار کر لیا۔ آدمی رات بھی نہیں ہوئی تھی کہ خواجہ کلاں کی کمان والے دستے نے مددی سلطان کو بھی زندہ پکڑ لیا۔

شیبانی کے یہ دونوں سلطان قارا کول اور اندجان میں قتل عام کے مجرم تھے۔ باہر نے حکم دیا کہ ان کے سر قلم کر دیئے جائیں۔

صاف و شفاف آسمان پر باریک جالی جیسی ہلکی کر چاندی کی طرح چمک رہی تھی جس کے دھاگے سفید ریشم کی مانند نرم معلوم ہو رہے تھے۔ باغات میں انار اور سب سے میٹھے سیب جو ”نقش“ کہلاتے تھے، پک چکے تھے، ”صاحبی“ انگوروں کے خوشے بیلوں میں لٹک رہے تھے۔ یہ خزاں کے ایام تھے، سمرقند کی شاندار خزاں کے ایام۔

عظیم شہر کے تمام دروازے پوری طرح کھلے ہوئے تھے، آنے جانے کی پوری آزادی تھی۔ گزشتہ دس دنوں سے سمرقند میں نہ کوئی فوج تھی نہ کوئی حکمراں۔ شیبانی کے درٹانے دریائے وحش کے قریب اپنی شکست کے بعد غزار یا قرشی کے قرب و جواب میں باہر سے دوبارہ ٹکر لینے کے ارادے سے فوج اکٹھا کر لی تھی لیکن یہ سنتے ہی کہ باہر کے لشکر کے ساتھ مل کر جنگ کرنے کے لئے شاہ اسماعیل کے بھیجے ہوئے تیس ہزار سپاہی بھی آن پہنچے ہیں، یہ سب سلطان قرشی، بخارا اور سمرقند کو چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے تھے، مویشیوں کے گلوں کو ہانکتے اور جہاں جتنا غلہ مل سکا تھا اسے لوٹنے ہوئے صحرا میں چلے گئے تھے۔ ماورالنہر کے وحقان جو ان طویل جنگوں میں کتنی ہی بار لوٹے جا چکے تھے اور بیگلوں اور خانہ بدوش سلطانوں سے نفرت کرتے تھے، اب باہر کو اپنا نجات دہندہ تصور کر کے اس کا انتظار کر رہے تھے۔

باہر اپنی لشکر اور اپنے اتحادی کی فوج کے ساتھ جو بڑی تیز رفتاری سے اس سے آن ملی تھی، قرشی اور بخارا پر قابض ہونے کے بعد سمرقند کی طرف جنوب کے بجائے شمال مغربی سمت سے آگے بڑھا۔

سمرقند کے میں ممتاز ترین افراد نے قلعہ نما شاہی محل کی کنجیوں اور قیمتی تحائف کے ساتھ شہر سے باہر نکل کر باہر کا استقبال کیا۔ چار راہا دروازے کی طرف جانے والے راستے کے دونوں کناروں پر بے شمار افراد کھڑے ہوئے تھے۔ خود شہر کی اندر جگہ جگہ خوبصورت قالین، دریاں اور مشجر آویزاں تھے، چاروں طرف مسرت و شادمانی کا دور دورہ تھا اور چھتوں اور پچانکوں کے اوپر قربا و سرنا نواز بیٹھے ہوئے تھے کیونکہ سمرقند میں موسیقی کے بغیر جشن کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ شہر کے شعرا نے باہر کی حصار پر فتح اور سمرقند میں آمد کے سلسلے میں اشعار بھی کہے تھے جن میں سے کچھ

اشعار چوڑی چوڑی سفید ریشمی پٹیوں پر لکھ کر سڑکوں کے کنارے، دوکانوں کے اوپر اور محل کے سامنے لٹکا دیے گئے تھے۔ باہر نے سوچا بھی نہ تھا کہ وطن میں جسے وہ کبھی ذلیل ہو کر چھوڑنے اور بے گھر ہو جانے پر مجبور ہو گیا تھا، اس کا اتنا شاندار طریقے سے خیر مقدم کیا جائے گا۔ اس نے خاص شاہراہ سے کوک سرائے محل جاتے ہوئے ریگستان میدان میں جہاں اس کا محبوب الخ بیگ بدرہہ واقع تھا، خیر مقدم کرنے والے ہجوم کے نعزہ ہائے تحسین سنے تو فوراً انبساط سے اس کا سارا جسم لرز سا اٹھا اور آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ اس نے قاسم بیگ کی طرف جو ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی اس کے پاس موجود تھا، دیکھتے ہوئے اپنے بچپن کے انداز میں کہنا:

”یقین ہی نہیں آ رہا ہے۔ یہ سب خواب ہے کہ حقیقت؟“

”حقیقت ہے، عالی جاہ! حقیقت!“

باہر کے محافظ گھڑ سواروں کے پیچھے پیچھے قزل باش بیگ جن کی دستاروں پر سرخ نشانات لگے ہوئے تھے، چل رہے تھے۔ ان میں احمد بیگ، صوفی اوغلی، شاہ رخ بیگ افشار اور وزیر محمد جان بھی جس سے باہر پہلے ہی سے متعارف تھا، شامل تھے۔ ان بیگوں کے چروں پر چھایا ہوا فخر واضح طور پر کہہ رہا تھا: ”ہم نہ ہوتے تو باہر کو سمرقند میں قدم رکھنا نصیب نہ ہوتا۔“

اہل سمرقند خوش تھے کہ انہیں شیبانی خاندان کے سلطانوں سے نجات مل گئی ہے لیکن جب قزل باش ان کی سامنے گزرنے لگتے تھے تو سرے، قرنہ اور فٹارے خاموش ہو جاتے تھے۔ لوگ، قزل باشوں پر واضح کر دینا چاہتے تھے کہ خیر مقدم صرف باہر ہی کا کیا جا رہا ہے۔

باہر نے اپنے ہم وطنوں کے دلوں میں مہمان نوازی کے جذبات بیدار کرنے کی کوشش کی اور حکم دیا کہ منادی گر شر کے چوراہوں اور سڑکوں پر اعلان کریں: شاہ اسماعیل کے بہادر سپاہی ہمارے عزیز مہمان ہیں۔“ اس نے شیبانی خاندان کے سلطانوں پر اپنی فتح کی خوشی میں اہل سمرقند اور مہمانوں کے لئے ضیافتوں کا اہتمام کیا اور جشن مسرت پورے تین دنوں تک جاری رہا۔

دس سال قبل جب کہ شیبانی نے شر کا محاصرہ کر رکھا تھا، باہر، شاہی خاندان اور تمام دوسرے افراد کو شدید غذائی قلت کا شکار ہونا پڑا تھا۔ لیکن اب بستاں سرائے محل میں، شر کے تمام محلوں اور گھنی آبادی والے علاقوں کی کھانے کی دوکانوں میں، باغوں اور سیرگاہوں میں طرح طرح کی ذائقے دار نانیں پک رہی تھیں، ہزاروں قابوں میں خوشبودار پلاؤ و دسترخوانوں پر رکھا جا رہا تھا، ہزاروں بھیڑیں ذبح کی جا رہی تھیں جن کے گوشت سے تورمہ، طرح طرح کے کباب اور دوسرے کھانے پک رہے تھے۔ اور عمدہ شرابیوں کی بڑی بڑی صراحیاں، بھی کھولی جا رہی تھیں۔

سب کچھ فراہم کیا جا رہا تھا عزیز اور وفادار اہل سرقند کو بھی اور قزل باشوں کو بھی جو جنگ کے میدان میں اپنی جرات و جسارت دکھا چکے تھے اور توقع کی جا رہی تھی کہ دوستی کے میدان میں بھی پیچھے نہ رہیں گے۔ خوشخبروں کا تو تانتا سا بندھا ہوا تھا (تاشقند، اودگت، سیرم اور اوش نے بابر کی اطاعت قبول کر لی تھی)۔ شراب اور خزاں کے پھلوں سے لطف اندوز ہونے کا زمانہ آگیا تھا۔ بابر کو لگ رہا تھا کہ اس کی زندگی کے سب سے پر مسرت دور کا آغاز ہو چکا ہے۔ جس میں اس کا ایک ایک خواب حقیقت بن جائے گا۔

لیکن بابر چاہتا تھا کہ اب اس کے ”عزیز مہمان“ جلد از جلد ایران واپس لوٹ جائیں۔ اس نے شاہ اسماعیل کی شبیہ والے ہزاروں سکے ڈھلوائے اور انہیں قزل باشوں کو دے دیا۔

دراصل قزل باشوں کی موجودگی کے باعث ماورالنہر کے شہروں اور دیہی علاقوں میں طرح طرح کی اشتعال انگیز افواہیں پھیلنے لگی تھیں۔ یہ بھی کہا جا رہا تھا کہ روز قیامت قریب آگیا ہے۔

سرقند میں بازار کے بھیڑ بھاڑ والے ایک دن جب کہ خرید و فروخت پورے شباب پر تھی، پانچ ایرانی سپاہیوں نے رنگ برنگی جھلملاتی ہوئی مقامی اطلس خریدنے کا فیصلہ کیا۔ وہ ایک دوکان میں داخل ہوئے تھا، چار کرتوں کے لئے اطلس کاٹ دینے کو کہا۔

دوکان دار نے لکڑی کا گڑا اٹھایا اور طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ قزل باشوں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا:

”لیکن آپ کے پاس سکے کون سے ہیں؟ ذرا دکھائیے تو۔“

ایک سپاہی نے جو سر پر سمور کی ٹوپی پہنے ہوئے تھا، اپنے چرمی بٹے سے تین چار اشرفیاں نکالیں اور انہیں ذرا دور ہی سے الٹ پلٹ کے دکھایا۔ دوکان دار نے اشرفیوں پر شاہ اسماعیل کی شبیہ دیکھ لی اور فوراً ہی ہاتھ ہلا کر انکار کر دیا۔

قزل باش نے اپنی ہتھیلی پر رکھے ہوئے سکوں کو دیکھا اور حیرت کے ساتھ دوکان دار سے پوچھا:

”کیا بات ہے؟ آخر ان سکوں میں کیا خرابی ہے؟“

”ہمارے ہاں یہ سکے نہیں چلتے۔ انہیں کوئی بھی نہیں لیتا۔“

”آخر کیوں؟ لوگ انہیں لیتے کیوں نہیں؟“ قزل باش نے غصے سے پوچھا۔

”نہیں لیتے، بس!“

اتنے میں دوکان کے دروازے کے پاس کھڑے ہوئے ایک شخص نے جس کے چہرے سے ڈھٹائی ٹپک رہی تھی، فخرہ چست کیا:

”غیروں کے سکے ناپاک ہیں!“

”ناپاک ہیں؟!“ ایرانی سپاہی تیزی سے مڑا اور تلوار نیام سے نکال کر قہرہ چست کرنے والے کی طرف جھپٹا پر وہ شخص بھاگ کر بھیڑ میں کھو گیا۔ دوسرے ہی لمحے بھیڑ میں سے کسی نے سپاہی پر پتھر پھینکا۔

دوسرے قزل باشوں نے بھی تلواres نکال لیں اور خریدار کے ایک ساتھی نے دوکان دار سے دھمکی آمیز لہجے میں پوچھا:

”ہمارے سکے لے گایا نہیں؟“

دوکان دار نے یہ دیکھتے ہی کہ سپاہی آپے سے باہر ہو رہے ہیں، اپنا لہجہ بدل دیا اور نرمی سے کہا:

”لے لوں گا تو میرا دولا ہی نکل جائے گا۔ میری دشواری کو سمجھئے نا، عزیز مہمانو یہاں لوگ پرانے سکوں ہی میں خرید و فروخت کے عادی ہیں۔“

”پرانے سکوں میں؟ تو تمہیں شیبانی خان کے سکے چاہئیں؟“

بات تھی بھی یہی۔ شیبانی خان کے سکے زیادہ وزنی ہوتے تھے۔

خان نے ہرات سے تاشقند تک پھیلی ہوئی اپنی ساری سلطنت میں ایک طرح کی مالی اصلاح کی تھی۔ اس بچارے دوکان دار کو یاد تھا کہ شیبانی نے جو اشرفی رائج کی تھی وہ تیمور خاندان کے حکمرانوں کے عہد حکومت میں رائج اشرفی سے چھ رتی زائد وزنی کی ہوتی ہے۔ یہی سبب تھا کہ خراسان اور ماورالنہر کے بازاروں میں دوسرے سکوں کی بہ نسبت شیبانی کے سکوں کی مانگ کہیں زیادہ تھی۔ لیکن دوکان دار یہ بات غصے میں بھرے ہوئے قزلباش سے صاف صاف نہیں کہہ سکتا تھا اس لئے مختصراً جواب دیا:

”شیبانی خان تو مرچکا ہے۔“

اتنے میں دوکان کی دہلیز پر سے دوبارہ کسی نے چوٹ کی:

”ارے اجنبی، اپنا بوریا بستر سمیٹو اور سر قند سے چلتے پھرتے نظر آؤ۔“ اور اس نے سپاہی کو مٹی

کا ڈھیلا مارا۔

ڈھیلا قزل باش کی ٹوپی سے ٹکرا کر ٹوٹ گیا اور مٹی اس کے چہرے پر بکھر گئی۔ وہ اپنی تنگی تلوار لئے ہوئے آگے بڑھا اور اس کی نگاہیں ڈھیلا مارنے والے کو تلاش کرنے لگیں۔ اسے کامیابی نہ حاصل ہوئی اور وہ مٹلے دوکان دار کے پاس لوٹ آیا۔ سپاہی نے جو جملوں کے آخری الفاظ پر زور دینے کی بناء پر تہریز کا رہنے والا معلوم ہوتا تھا، چلا کر پوچھا:

”نہ لے گا یہ سک... کہ؟ نہ لے گا شاہ اسماعیل کا یہ سک... کہ؟“

”ارے سورا، اسے لے لوں گا تو برباد ہو جاؤں گا...“

”نہیں لے... اے گا؟“ اور قزل باش نے دوکان دار پر اتنا زور دار کیا کہ تلواریشانے سے جسم کو کاٹتی ہوئی تقریباً ناف تک اتر گئی۔ دوسرے ہی لمحے سپاہی کے ایک ساتھی نے تخت پر ڈھیر ہو جانے والے دوکان دار کا سر ایک ہی وار سے قلم کر دیا۔

ریشمی کپڑے خون سے تر ہو گئے۔ بھیڑ میں جو لوگ آگے کھڑے ہوئے تھے، اس نظارے سے پل بھر کے لئے بت بن کر رہ گئے پھر دہشت زدہ ہو کے چیختے چلاتے بھاگے اور مجمع منتشر ہو گیا۔ اور اس کے بعد ”عزیز مہمانوں“ نے کل کر لوٹ مار شروع کر دی...

۶

قزل باش بیگ باہر اور شاہ اسماعیل کی درمیان ہونے والے معاہدے پر پوری طرح عمل درآمد کی یقین دہانیوں سے مطمئن نہیں تھے۔ دوسری طرف ان کے خلاف عوام کی نفرت میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا جس سے وہ خائف رہتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ بیگ تشویش میں مبتلا ہو گئے۔ آخر کار ان بااثر بیگوں کو قیمتی ملبوسات، تیز رفتار گھوڑے، طلائی و نقرئی ظروف اور نقد رقوم نذر کی گئیں اور تیس ہزار ایرانیوں کی یہ فوج اور النہر سے ایران کے لئے روانہ ہو گئی۔

اس کے بعد سمرقند کی زندگی تقریباً معمول پر آ گئی۔ نئے محصول خاص طور پر نئے علاقوں سے وصول کئے جانے لگے اور شاہی خزانہ جو کچھ تو شیبانی خاندان کے حکمرانوں کے لوٹنے کی وجہ سے اور کچھ قزل باشوں کے قیام پر آنے والے مصارف کے باعث بالکل خالی ہو چکا تھا، دوبارہ بھرنے لگا۔

اب کہیں جا کر بابر کو ذرا دم لینے، جشن منانے اور اپنے محبوب منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے پر توجہ مبذول کرنے کا موقع نصیب ہوا۔

موسم بہار میں جب کہ ہلکے گلابی پتھلوں سے لدے ہوئے بادام کے اشجار آنکھوں کو فرحت بخش رہے تھے، بابر ایک روز اپنے کچھ درباریوں کے ساتھ النہر کے کنارے کی طرف سیر کو نکلا۔ محافظ دستے کا سربراہ طاہر کیت گھوڑے پر سوار تھا۔ خود بابر نے اپنے پسندیدہ سفید جنگلی گھوڑے کا انتخاب کیا تھا اور اس کے ایک پہلو میں قاسم بیگ اور دوسرے میں خواجہ کلاں بیگ اپنے اپنے

گھوڑوں پر چل رہے تھے۔ ان لوگوں سے کچھ پیچھے پیچھے میر عمارت فضل الدین اپنے سیاہ گھوڑے پر چل رہا تھا۔ وہ ہرات سے ایک ہفتہ قبل ہی سمرقند پہنچا تھا۔ ممتاز بیگوں کے درمیان مکاتب اور مدارس سے متعلق امور کے نگران میر منشی و مدرس کا دہلا پتلا جسم بے شکل ہی نظر آ رہا تھا۔

یہ لوگ آب رحمت کہلانے والی نہر سے پہلے ہی باغ میدان کی طرف مڑ گئے جو الخ بیگ کے عہد حکومت میں ماورالنہر کا سب سے آرام دہ اور مشہور باغ تھا۔ پندرہ سال قبل تک اس باغ کی خوبصورتی اور دلکشی برقرار تھی لیکن بعد میں شیبانی خان کی حکمرانی کے دوران اس کی دیکھ بھال نہیں کی گئی تھی، نالیوں میں پانی آنا بند ہو گیا تھا اور جانے کتنے ہی درخت سوکھ گئے تھے۔ باغ میں واقع دو منزلہ عمارت چینی خانہ کی جو اپنے ستونوں اور چینی مٹی پر بنے نقش و نگار کے لئے شہرت رکھتی تھی، چھتوں سے اس طرح پانی رسنے لگا تھا کہ شاندار نقاشی کا زیادہ تر حصہ خراب ہو گیا تھا۔

باہر نے میر عمارت سے مخاطب ہو کر مغموم لہجے میں کہا:

”ہم نے آپ کو ہرات سے اس امید میں بلوایا ہے کہ آپ کی عمرانی میں شہر میں نئے محل اور شہر کے باہر باغات وجود میں آئیں گے لیکن ذرا دیکھئے تو جو قدیم عمارتیں دنیا بھر میں مشہور ہیں وہ بھی کیسی خراب حالت میں ہیں۔“

”عالی جاہ، مرزا الخ بیگ کی رصد گاہ بھی عالمی شہرت رکھتی ہے اور اس کی حالت بھی اتنی ہی خراب ہے جتنی کہ چینی خانہ کی“ فضل الدین نے افسوس کے ساتھ کہا۔ ”کل میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا اور میرا دل آج تک اداس ہے۔ لیکن اس کے سوا اور توقع ہی کیا کی جاسکتی تھی۔ ساٹھ برسوں سے رصد گاہ کی ذرا بھی دیکھ بھال نہیں کی گئی۔ دیواروں سے چینی مٹی کے آرائشی ٹکڑوں اور سنگ مرمر کی ٹیوں کو لوگ اکھاڑ لے گئے۔ آئندہ بھی یہ سلسلہ جاری رہا تو یہ شاندار عمارت کھنڈر بن کر رہ جائے گی۔“

”نہیں، ہم اس کی نوبت نہ آنے دیں گے! محترم قاسم بیگ، میر عمارت کو جتنی رقم اور جتنے معماروں کی ضرورت ہو ان کا انتظام کر دیجئے۔ رصد گاہ اور چینی خانہ ہمارے بزرگ مرزا الخ بیگ کی یادگار ہیں۔ ہم ان کی بحالی چاہتے ہیں۔“

”یہ خادم دلی مسرت کے ساتھ حکمران کے حکم کی تعمیل میں مصروف ہو جائے گا۔ چینی خانہ پہلے ہی کی طرح چمک اٹھے گا۔ کام زیادہ دشوار تھوڑی ہے۔ ہم باغ میں نالیوں کی صفائی کر کے ان میں پانی چھوڑیں گے، بیڑا در پھولوں کے پودے لگا دیں گے۔“

”یہ کام نوروز تک مکمل ہو سکے گا؟“ باہر نے مسکرا کر پوچھا۔ ”اگر اس سال جشن نوروز اسی

چینی خانے میں منایا جائے تو کیسا رہے، محترم قاسم بیگ؟“

بادہ و جام اور رقص و نغمہ والی تقریبات کا دلدادہ خواجہ کلاں بیگ خوشی سے مسکرانے لگا:
”بڑا نیک خیال ہے، عالی جاہ! سرفرد میں اچھے سے اچھے معمار اور باغبان کافی تعداد میں مل جائیں گے۔ میر عمارت فضل الدین اپنی نگرانی میں نوروز تک باغ کو آراستہ کرا دیں گے۔ تب یہاں جشن منایا جائے گا۔“

فضل الدین نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا:
”چینی خانے کی مرمت تو کی جاسکتی ہے لیکن رصد گاہ کے معاملے میں کیا کیا جائے گا، عالم پناہ؟“
”اس کی بھی مرمت کرائی جانی چاہئے۔۔۔ قاسم بیگ صاحب، یہ کام کب اور کیسے شروع کیا جائے؟“ بابر نے پوچھا۔

قاسم بیگ رصد گاہ کی مرمت کا کام ہاتھوں میں لینے سے ڈر رہا تھا۔ کسی زمانے میں اہل سرفرد کی اکثریت اس رصد گاہ پر فخر کیا کرتی تھی، لیکن مذہبی علما اس زمانے میں بھی رصد گاہ پر لعنت بھیجتے رہتے تھے۔ الف بیگ کے انتقال کے بعد ان علما نے رصد گاہ کو مرکز کفر کہہ کر، اس پر مسلسل لعنت بھیج بھیج کر زیادہ تر دین داروں کو بھی اپنا ہم خیال بنانے میں کامیابی حاصل کر لی تھی۔ رصد گاہ کی بحالی کا کام شروع کرانے کا مطلب یہ ہوتا کہ علمائے دین اور متعصب افراد بابر کے خلاف کچھ اور بھی زیادہ مشتعل ہو جاتے۔ اور یہ وہ لوگ تھے جو الف بیگ کے قتل کا باعث بنے تھے اور اب بابر کے قتل کی بھی کوشش کر سکتے تھے۔

اس پس منظر میں قاسم بیگ نے تجویز کی مخالفت کرنے کا فیصلہ کر لیا:

”عالی جاہ، خوابیدہ افغانی کی دم پر پاؤں رکھنے میں جلد بازی درست ہوگی کیا؟۔۔۔ اور ہم رصد گاہ کی مرمت کرا دیں تو بھی ایسے اہل علم کو کہاں سے لائیں گے جو دانش و حکمت کے اس کام کو لگن کے ساتھ سنبھال سکیں؟ مرزا الف بیگ کی رحلت کو ساٹھ سال ہو چکے ہیں۔ اس زمانے کے صاحبان علم میں سے کوئی زندہ نہیں بچا اور جہاں تک نئی نسل والوں کا تعلق ہے تو وہ دوسرے ملکوں کو جا چکے ہیں۔“

”انہیں یہاں بلوایا جاسکتا ہے، وزیر صاحب“ بابر نے کہا اور اچانک کسی گہری سوچ میں ڈوب جانے سے اس کی بھوئیں سکڑ گئیں۔ اس کا پر عزم مزاج متقاضی تھا کہ اس معاملے میں ابتدائی کارروائی تو شروع ہی کر دی جائے۔ ”ارے میر منشی، ہماری طرف سے تمام اہل علم کو خط لکھئے!“
میر منشی نے جلدی جلدی اپنی چرمی تھیلے سے لکھنے کا سامان نکالا اور اسی جگہ فرش پر بیٹھ گیا۔ بابر

اپنے حکم کو بولنے اور میرٹھی تیزی سے لکھنے لگا۔

”ہمارے عظیم بزرگ مرزا الخ بیک کے شروع کئے ہوئے علم حسیت کے ماہرین کو خواہ وہ ہرات، ترکی اور تہران میں یا اور کہیں بھی رہتے ہوں، ہماری طرف سے سرفرد آنے کی دعوت دی جائے اور میرے اس فیصلے کا منادی گروں کے ذریعے بھی اعلان کرا دیا جائے۔ ہم رصد گاہ کو دوبارہ کھولنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ جو حسیت داں مرزا الخ بیک کے عظیم کام کو جاری رکھ سکے گے انہیں اس سلسلے میں تمام ضروری سہولیات فراہم کی جائیں گی۔ ان لوگوں کے یہاں تک سفر کے مصارف ادا کر دیئے جائیں گے اور انہیں رہائش اور مشاہرے کے سلسلے میں کسی شکایت کا موقع نہ ملے گا۔ ہماری طرف سے قاصدوں کے ذریعے اس مضمون کے دعوت نامے بھیج دیئے جائیں اور یہ کام میرٹھی صاحب، ہم آپ کو سپرد کر رہے ہیں۔“

فضل الدین کی نگرانی میں باغ میدان کی پانی کی ٹوٹ جانے والی تالیوں کی مرمت اور صفائی کر دی گئی، سوکھے ہوئے درختوں کو کاٹ کے ان کی جگہ پر نئے پیڑ اور پھولوں کے پودے لگا کر کیا ریاں بنا دی گئیں۔ فضل الدین کو چینی خانہ کی بحالی میں کسی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ اچھی اجرت دینے کی بنا پر تیل بوٹوں کو درست کرنے والے، معمار، باغبان اور مزدور آسانی سے مل گئے تھے جنہوں نے اپنا کام محنت اور لگن کے ساتھ کیا۔ لیکن رصد گاہ کو تین منزلہ گول عمارت کی شکل عطا کرنے والی دیواروں کی مرمت کا کام بہت دشوار ثابت ہوا۔ نیم دائرے کی شکل میں بنی ہوئی میڑھیوں کے نیچے ایک گہرا گڑھا واقع تھا جس کی تہ میں بہت بڑے آلے زاویہ پیا کے نیچے کچے ہوئے حصے چمک رہے تھے اور یہ ایک ایسی چیز تھی جس کی نوعیت کے متعلق مرمت کرنے والوں کو کچھ بھی معلوم نہ تھا۔ معمار اس کے قریب پہنچتے ہی یوں تھر تھرا کانپنے لگے جیسے دونخ میں پہنچ گئے ہوں۔ شیوخ نے مشہور کر رکھا تھا کہ وہ جگہ بھوت پریت کا مسکن ہے اور گڑھے میں جس نے بھی اترنے کی کشش کی اسے شیطان ہڑپ کر لے گا۔ ان دنوں علما و شیوخ خاص طور سے نقش بندیہ سلسلے کے شیوخ بہت طاقتور اور بااثر تھے اور انہی کے دباؤ سے الخ بیک کے انتقال کے بعد سرفرد کے زیادہ تر مکاتب و مدارس بند کر دیئے گئے تھے۔

اس سب کے باوجود فضل الدین کو اچھی اجرت دینے کی بنا پر کوئی ساٹھ معمار اور مزدور کاٹھا کر کے رصد گاہ کی بحالی کا کام شروع کرنے میں کامیابی حاصل ہو گئی۔ دیواروں اور دوسری تیسری منزلوں کی چھتوں کی مرمت کے لئے پاڑیں بھی باندھ دی گئیں۔ لیکن اسی مرحلے پر نقش بندی شیوخ کے حامی درویشوں نے وہاں منڈلانا شروع کر دیا۔ یہ لوگ معماروں کے سامنے ہی حلقے بنا کر

”حق دوست یا اللہ!“ ”حق دوست یا اللہ!“ کے نعرے لگا کر ناپتے اور ایسے پراثر اشعار اور گیت گاتے تھے جن میں کہا جاتا تھا کہ چاروں خلفا کو نہ ماننے والوں پر عذاب الہی نازل ہوگا۔ ان درویشوں میں شیبانی خاندان کے سلطانوں کے مخبر بھی شامل ہوتے تھے۔

اور یہ مخبر معماروں اور مزدوروں کے درمیان بھی موجود تھے۔ ایک مخبر اینٹوں کی ڈھلائی کا کام کر رہا تھا اور اس نے کچھ دنوں کے بعد بلند پہاڑ پر سے ایک پچی کار کو جو اپنے کام میں اوروں کی بہ نسبت کہیں زیادہ ماہر، دلیر اور بابر کا وفادار بھی تھا، ”انجانے“ میں دھکا دے کر نیچے گرا دیا۔ یہ معمار تیسری منزل سے پتھروں کے انبار پر آن گرا اور فوراً ہی چل بسا۔

درویشوں کو جیسے منہ مانگی مراد مل گئی۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر رہی کی جنوبی کیفیت میں چینچنے چلانے لگے: ”اس پر عبات الہی نازل ہو گیا! بدروحوں نے اس کی جان لے لی! یا اللہ دوست! یا اللہ! حق دوست یا اللہ!“

اس واقعے کے بعد معمار اور مزدور مرمت پوری کئے بغیر ہی کام چھوڑ کر چلے گئے۔ فضل الدین اس خیال سے بازار گیا کہ اتنے اچھے نہ سہی، کام چلاؤ معماروں اور مزدوروں ہی کو بلالائے لیکن وہاں جتنے افراد بیکار بیٹھے تھے ان سے کہیں زیادہ انواہیں پھیلی ہوئی تھیں: ”رصد گاہ میں کمایا ہوا پیسہ ٹپاک ہے! دین داروں کے لئے دہاں جانا خطرے سے خالی نہیں، ان پر عذاب الہی نازل ہوگا!“ فضل الدین نے رصد گاہ میں کام کرنے کی بات چھیڑی ہی تھی کہ معمار اس سے دور بھاگنے لگے جیسے کہ وہ کوئی بھوت پریت ہو...

اس اثنا میں بستیاں سرائے محل میں ضیافتوں پر ضیافتیں منعقد ہو رہی تھیں۔

ایسی ہی ایک ضیافت ارگنچ اور قارا کول کے بیگوں اور دیر ممتاز افراد کے اعزاز میں ہوئی جو قیمت تحائف کے ساتھ بابر کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ ایک ماہ قبل بابر نے اپنے کچھ افراد کو ان شہروں میں بھیجا تھا۔ دونوں شہروں نے جنگ کے بغیر بادشاہ کی اطاعت قبول کر لی تھی اور اب دونوں جگہوں کے بیگوں کی آمد سے ”ناورالنہر کو متحد کرنے والے“ (بابر دل ہی دل میں خود کو یہی کہتا تھا اور اپنے لئے دوسروں کے منہ سے یہ الفاظ سن کر اسے فخر کا احساس بھی ہوتا تھا) کو دلی مسرت ہوئی۔ بہت سے افراد اور بہت سی شراب والی ضیافتیں جن کا سلسلہ قندز میں شروع ہوا تھا، اب آئے دن ہی ہوتی رہتی تھیں۔ پہلے یہ کامیابیوں کا جشن منانے کے لئے ہوتی تھیں بعد میں معمول کی حیثیت اختیار کر گئیں۔ دعوتیں باری باری کبھی ایک بیگ کے ہاں تو کبھی دوسرے کے ہاں ہوتی تھیں اور ہر گئی کو بادہ نوشی کے معاملے میں ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرنے ہی کی پڑی رہتی

تھی۔

قاسم بیگ پہلے کی طرح اب بھی دختر رز سے دور دوری رہتا تھا۔ وہ بابر کے ہوش کے عالم میں اسے برابر احساس دلاتا رہتا تھا کہ سلطنت میں امن وامان کی صورت حال تسلی بخش نہیں، بہت سے دشمن غداری کرنے کے لئے بس مناسب موقع ہی کے منتظر ہیں۔ وہ یہ بھی بتاتا کہ صحرائی علاقوں میں شیبانی خاندان کے بچے کچھ سلطان بھی ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھے ہیں بلکہ اپنی شکست کا بدلہ لینے کے لئے زوردار تیاریوں میں مصروف ہیں نیز یہ کہ اگلا معرکہ زندگی اور موت کی جدوجہد جیسا ہوگا...

اس سب کے جواب میں بابر کو انتہائی نشاط و انبساط کے عالم میں کسی ہوئی اپنی ایک غزل کے یہ دو اشعار سنانا بہت پسند تھا:

ہمار آئی ہے، وصل جاناں اور یاروں کی صحبت ہے
شراب اور شاعری ہے، درد عشق اور اس کی لذت ہے
مزہ کچھ اور ہی ہے فصل گل میں بادہ نوشی کا
یہ نشہ ہر مسرت سے حسین، یہ نشہ دولت ہے
رواج کے بموجب غزل کے دھن تیار کر لی گئی تھی اور دعوتوں میں اکثر اسے مغنی سازوں کے ساتھ گایا کرتے تھے۔

بعض اوقات بابر عالم کیف و مستی میں قدرے سنجیدہ مسائل کا بھی تذکرہ کرتا تھا لیکن ان کا مستقبل کی جنگوں سے کوئی دور کا بھی تعلق نہیں ہوتا تھا:

”وزیر اعظم صاحب، آپ نے سنا کہ میرے ایجاد کردہ خط بابری کو سرقد کے مکاتب میں استعمال کیا جا رہا ہے اور اس کی مدد سے بچے دوسرے حروف کے مقابلے میں کچھ جلد ہی سے دریافت کر کے دیکھ لیجئے۔“

اور مدرس اپنے بڑے سے عمامے والی سرکوبلا کر فوراً ہی تصدیق کر دیتا تھا:

”محترم وزیر اعظم، خط بابری ہمارے عوام کو کابلی اور جہالت سے نجات دلانے کا نہایت موثر ذریعہ ہے۔ عربی خط ہمارے لئے یقیناً مقدس ہے لیکن آپ تسلیم کریں گے کہ اعراب کی وجہ سے حصول تعلیم میں دشواری ہوتی ہے۔ خط بابری ان سب پیچیدگیوں سے پاک ہے اور اسے سیکھنا کہیں زیادہ آسان ہے۔“

قاسم بیگ جانتا تھا کہ بابر نے تین سال قبل کابل میں جو حروف جمعی تیار کئے تھے وہ دریائے

سر کے کنارے سغناق میں دریافت کئے جانے والے قدیم ترکی رسم خط کے بچے کچھ نمونے کسے مل جاتے تھے تو انہیں فوراً ہی ضائع کر دیتے تھے۔ بابر باقیات اسلاف کے سلسلے میں اس طرز عمل کو غیر مذہب سمجھتا اور صاف صاف کہا کرتا تھا کہ حروف کی ساخت کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ یہ بھی کہتا تھا کہ قرآن اپنے رسم خط کی بناء پر نہیں بلکہ اس بناء پر مقدس ہے کہ یہ انسان کو ان احکام خداوندی کے معنی و مفہوم کا قائل کر دیتا ہے جو اس میں شامل ہیں۔ اسی لئے اس نے عربی اور قدیم ترکی خطوں کی بنیاد پر ایک نیا خط ایجاد کیا تھا۔

ایسے نازک معاملات میں قاسم بیگ نے نہ کچھ دخل رکھتا تھا نہ ہی کوئی دلچسپی۔ وہ تو عملی آدمی تھا اور اس بات چیت کے دو دن بعد فضل الدین اور خط بابر کی کو عام کرنے کے ذمے دار مدرس کو ساتھ لے کر یابر کی خلوت گاہ میں پہنچ گیا۔

بابر نے فوراً ہی تاڑ لیا کہ تینوں کسی بات سے فکر مند ہیں اور مطالبہ کیا کہ جو بھی معاملہ ہو فوراً بیان کیا جائے۔

”عالی جاہ، غضب ہو گیا!“ مدرس نے جس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں، کہا۔ ”جس استاد نے کتب کھول کر اس میں خط بابر کی کو ذریعہ تعلیم بتایا تھا، اسے جاہلوں نے مار ڈالا، سنگسار کر دیا۔“

”سنگسار کر دیا؟!“ بابر فوراً ہی آگ بگولا ہو گیا۔ ”کیسی وحشیانہ حرکت ہے!... قاسم بیگ، آخر یہ سب کیا ہے، بغاوت بھڑک اٹھی کیا؟! آپ سب لوگ اپنی آنکھیں بند کئے بیٹھے ہیں کیا؟“

”عالم پناہ، میں تو آپ سے کئی بار عرض کر چکا ہوں کہ نقش بندی ہر جگہ رعایا کو بھڑکا رہے ہیں، ہمارے خلاف اشتعال پیدا کر رہے ہیں۔ رصد گاہ میں معمار پہاڑ پر سے گر کر مر گیا تھا تب تو درویشوں نے اچھا خاصا ہنگامہ ہی کھڑا کر دیا تھا۔“

”آپ نے فسادوں اور بے بنیاد افواہیں پھیلانے والوں کے فوراً گرفتار کر لئے جانے کا حکم کیوں نہیں جاری کیا تھا؟...“

پل بھر میں غضب ناک اور پل ہی بھر میں مسرور ہو جانا تو اب بابر کا وتیرہ ہی بن چکا تھا۔

”فوج میں بھی حالات خراب ہی ہیں، عالی جاہ“ قاسم بیگ نے صاف گوئی کے ساتھ اپنی بات جاری رکھی۔ ”ہمار میں فضلیں اچھی نہیں ہوئیں۔ قیثیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔ سپاہیوں کے پاس پرانے سکے ختم ہو چکے ہیں اور نئے سکوں کو آسانی سے کوئی لیتا نہیں۔ نئے سکوں میں قیمت ادا کی جاتی ہے تو چیزیں کچھ اور بھی مہنگی ملتی ہیں... بیگ اور سپاہی دونوں مطالبہ کر رہے ہیں مگر تنخواہیں بڑھائی جائیں اور تنخواہیں بڑھادی جائیں تو خزانے میں کچھ بچے گا ہی نہیں۔“

”تو پھر کیا کرنا چاہئے؟“ قاسم بیک؟“ بابر نے بھی بھیجی سی آواز سے پوچھا۔

”میری تجویز یہ ہے حکمران کہ ہم سب کو مل کر اس مسئلے پر صلاح مشورہ کرنا چاہئے۔ بیگم کو فوراً طلب کر کے انہیں بھی خواب غفلت سے بیدار کیا جانا چاہئے اور اپنے آپ کو بھی۔“

”میں خوب جانتا ہوں کہ اس سب کا مطلب کیا ہے۔ بیگم پر صحرا نور و سلطانوں سے بدلہ لینے کا جنون سانا رہی ہے۔ ہمارے بیک ایک بار پھر جنگ کے لئے بے تاب ہو رہے ہیں۔ اور کیوں نہ ہوں؟ نئے علاقوں پر قبضے کے ساتھ ہی ساتھ بیگم اور سپاہیوں کو نیا مال غنیمت جو ملتا ہے۔ یہ لوگ سرقہ میں بیٹھے بیٹھے اوب چکے ہیں۔ ان کی تلواریں نئے خون کی پیاسی ہیں۔“

”لیکن حکمران، سپاہی کا تو پیشہ ہی لڑنا ہے۔۔۔ خاص طور سے اس وقت جبکہ ہمارے دشمن سلطانوں کی طاقت ایک بار پھر بڑھ گئی ہے۔۔۔ عید اللہ سلطان کی دس ہزار سپاہیوں کی فوج صحرا کے شمالی علاقے سے بخارا کی طرف بڑھ رہی ہے۔۔۔“ قاسم بیک اپنی جگہ سے کھسک کر بابر کے کچھ اور قریب پہنچ گیا۔ ”اور یہ ساری باتیں سرقہ کے شیوخ کے علم میں ہیں۔ بیرونی اور اندرونی دونوں خطرات ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔۔۔ یہ وقت جنگ کے سوا اور کسی بھی کام کی طرف متوجہ ہونے کا نہیں ہے۔ آج تو عالی جاہ، فاتحانہ مہم کی ہمیں پہلے سے کیسی زیادہ ضرورت ہے۔“

بابر نے اپنی نگاہیں وزیر پر سے ہٹا کر فضل الدین اور مدرس کی طرف دیکھا:

”تو صاحبان، یہ ہے صورت حال! مقدر ہمیں ایک بار پھر دشوار حالات اور فکروں کے دام میں الجھانا چاہتا ہے۔ ہمیں تعلیم و تعمیر سے متعلق اپنی سرگرمیاں آئندہ کے لئے ملتوی کرنی پڑیں گی، مکاتب میں خط باری کی ترویج کا سلسلہ روک دینا ہوگا۔۔۔ رصد گاہ کی مرمت بھی بعد ہی میں کرائی جائے گی۔۔۔ یہ وقت جن کے سوا اور کسی بھی کام کی طرف متوجہ ہونے کا نہیں ہے“ اس نے تلخی کے ساتھ قاسم بیک کے الفاظ دہرائے۔

عید اللہ سلطان کو بابر کے ۳۰ ہزار سپاہیوں کے لشکر کے ساتھ سرقہ سے کوچ کی خبر ملی تو وہ اپنی فوج کو لے کر فوراً ہی ریگستان کی طرف لوٹ گیا۔ بابر نے اس امید میں کہ دشمن کی فوج بے آب و گیاہ ریگستان سے جلد ہی کسی ایسی جگہ کو لوٹنے پر مجبور ہو جائے گی جہاں سپاہیوں اور گھوڑوں کو غذا اور پانی مل سکے، بخارا میں پڑاؤ ڈال دیا لیکن وہ انتظار کب تک کرتا خاص طور سے اس حقیقت کے مد نظر کہ اس کا لشکر دشمن کی فوج سے گھنا بڑا تھا؟ آخر کار اس نے ریگستان میں رات کے ٹیلوں کے درمیان کافی دور تک آگے بڑھ جانے کا غلط فیصلہ کر لیا۔ عید اللہ سلطان تو یہی چاہتا ہی تھا۔

بابر کے لشکر کا ایک حصہ وفادار کوہستانی سپاہیوں پر مشتمل تھا جو کوہستانی علاقوں میں دلیری کے

ساتھ لڑ سکتے تھے لیکن ریت میں ان کے گھوڑے بہت دھیرے دھیرے ہی آگے بڑھ پارہے تھے۔ جن اراہوں پر بندوقیں لدی ہوئی تھیں وہ بھی ریت میں پھنس گئے اور بالا خراس کا لشکر ایک طویل کاروں میں تبدیل ہو جانے پر مجبور ہو گیا۔ اس مرحلے پر اس کے ساتھ غداری بھی کی گئی۔ دس ہزار مغل سپاہی اور بیک اس کاروں سے الگ ہو کر ان لوگوں کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے جنہیں عبید اللہ سلطان نے ریگستان میں راستہ دکھانے کے لئے بھیجا تھا۔

عبید اللہ سلطان نے جو ریگستان کے چپے چپے سے واقف تھا، بابر کے لشکر کا کافی دوری سے محاصرہ کرنے کی حکمت، عملی اپنائی اور خیر آباد اور کول ملک نام کی جھیل کے قریب واقع شہر تارا کول کے درمیانی علاقے میں اپنے غنیم پر ٹوٹ پڑا۔ یہ حملہ اس وقت ہوا جب بابر کے فوجی دستے اس کے قابو میں نہیں رہ گئے تھے۔ تلفہ جو اس بار بے حد کامیاب رہا تھا، مغلوں کی غداری اور بھانت بھانت کے سپاہیوں پر مشتمل لشکر کی پس ہمتی۔ ساری باتوں نے مل کے قیامت ڈھا دی۔ بری طرح ہار گیا۔

وہ اپنے بچے کچے دستوں کے ساتھ بخارا کو چھوڑ کر سمرقند لوٹا لیکن ماوراءالنہر کی دار الخلافہ میں بھی زیادہ قیام نہ کیا اور تیزی سے حصار کی طرف کوچ کیا۔ حصار میں اسے ساٹھ ہزار ایرانی سپاہیوں کا لشکر ملا جسے شاہ اسماعیل نے نجم ثانی کے زیر کمان کئے کو تو بابر کی مدد کے لئے لیکن دراصل بابر کی جگہ پر کسی زیادہ معتبر شخص کو تخت پر بٹھانے کی غرض سے بھیجا تھا۔ شاہ اس بات پر ناراض تھا کہ ایرانی فوج بہت جلد سمرقند سے واپس بھیج دی گئی تھی۔ اس کے علاوہ اسماعیل کے مجبوروں نے اسے بہت پہلے ہی یہ اطلاع بھی فراہم کر دی تھی کہ بابر ماوراءالنہر میں اپنی آزاد سلطنت کے قیام کے خواہاں ہے۔

ماوراءالنہر پر ایران کے تسلط سے متعلق شاہ اسماعیل اور نجم ثانی کے منصوبے کو بہت زیادہ راز میں رکھا گیا تھا اور بابر کے ساتھ کیا جانے والا معاہدہ بظاہر اب بھی برقرار تھا لیکن نجم ثانی نے بابر سے اپنی پہلی ہی ملاقات میں اس سے کھلی ہوئی نفرت کا طرز عمل اپنایا جس سے بابر کو غیر ملکیوں کے عیارانہ ارادوں کا بخوبی احساس ہو گیا۔

پھر قزل باشوں اور شیبانی خاندان کے سلطانوں کی تلواریں نجدوان میں ایک دوسرے سے ٹکرائیں۔ بابر نجم ثانی کے ساتھ گیا تھا لیکن یہ واضح ہوتے ہی کہ فتح سلطانوں ہی کی ہوگی، اس نے اپنے دستوں کو اس خونیں محر کے سے الگ کر لیا اور حصار لوٹ آیا۔

نجدوان کی اس لڑائی میں نجم ثانی مار ڈالا گیا۔ زیادہ تر قزل باش بھی مار ڈالے گئے، کچھ قید

کر لئے گئے اور کچھ افراد تفری کی حالت میں امور دیا کو پار کرتے ہوئے اس میں ڈوب گئے۔
اور اس طرح نامعلوم آفات سے متعلق اندیشے سچ نکلے۔ ڈیڑھ سال قبل خان زادہ بیگم کے دل پر چھائے ہوئے خوف کے بادل جو بعد میں کچھ دنوں کے لئے چھٹ گئے تھے، شکست کے ان دشوار لمحات میں دوبارہ نمودار ہو گئے۔

بابر بائے سون ہوتا ہوا حصار کے قارا تاغ علاقے میں پہنچا اور وہاں دامن کوہ سے ملحق ایک چھوٹی سی وادی میں اپنے سات ہزار سپاہیوں اور شاہی خاندان کے افراد کے ساتھ رات گزارنے کے لئے پڑاؤ ڈال دیا۔ اس کے خیمے کے قریب ہی خان زادہ بیگم کا خیمہ بھی نصب کیا گیا جس میں وہ اپنے بیٹے اور کنیر کے ساتھ سو گئی۔

نصف شب کے بعد وہ گھوڑوں کی ٹاپوں اور کتوں کے زور زور سے بھونکنے کی آوازوں سے چونک کر جاگ گئی۔ اس نے شدت خوف سے کانپتے ہوئے سنا کہ باہر لوگ غصے سے بھری ہوئی آوازوں سے چیخ رہے ہیں:

”مارو! مارو! ان بد معاش کفار کو قتل کر دو!“

خیمے کے اندر ایک چراغ ٹٹمارا تھا۔

”دشمنوں نے حملہ کر دیا! دشمن!“

خان زادہ بیگم، خرم اور کنیر آتا ”فانا“ کھڑے ہو گئے۔

خان زادہ بیگم نے جلدی جلدی جوتے پہنے اور بیٹے کی ہانہوں کو چونے کی آستینوں میں ڈالنے لگی۔ اتنے میں کسی تیر کی تیز نوک خیمے کے موٹے نمدے کو چیر کر اندر آئی لیکن پچھلے حصے میں لگے ہوئے پروں کے باعث تیر نمدے ہی میں پھنس کر رہ گیا۔ خوفزدہ ماں نے خرم کو سینے سے لگا لیا لیکن خود خرم جس کا قد خان زادہ بیگم کے شانوں سے اونچا ہو چکا تھا، اس تیر کی نوک کو بڑی دلچسپی کے ساتھ دیکھنے لگا جو اس کی جان لے سکتا تھا۔

”ارے“ تنگی کہاں ہیں؟ خواجہ کلاں بیک! قاسم بیک! طاہر! حرم کی حفاظت کرو! بچوں کو

سنبا لو! بندوقیں چلاؤ!“

بابر کے نجی محافظین کے پاس کچھ چھماتی بندوقیں موجود تھیں جو اس زمانے میں غالباً ”سب سے بھیانک“ نادر اور مہنگے اسلحہ کی حیثیت رکھتی تھیں۔ یہ بندوقیں بابر نے قزل باشوں سے خریدی تھیں۔

اتنے میں کہیں قریب ہی ایک بندوق اور پھر ایک ساتھ کئی بندوقوں کی آوازیں سنائی دیں۔

خان زادہ بیگم کی ہمت اب اتنی بڑھ گئی کہ اس نے اطمینان کے ساتھ بیٹے کو کپڑے پہنائے اور چوٹے پر وہ بیٹی باندھنا نہ بھولی جس میں شاندار خنجر لٹک رہا تھا۔

خیسے کی مندے کی دیوار پر ”خرم شاہ“ کا تقریباً دس تیروں والا ترکش بھی لٹکا ہوا تھا۔ لڑکے نے ترکش کو شانے پر لٹکایا اور کمان ہاتھ میں لے لی۔

لڑائی کی آوازوں سے گیارہ سالہ لڑکا یقیناً سہم گیا لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کے اندر لڑنے کا جوش بھی جاگ اٹھا۔ اس پر بچپن ہی میں ماں باپ کے جنگ و جدل سے گہرا لگاؤ رکھنے والے مزاج کی چھاپ پڑ گئی تھی اور وہ جلد از جلد بڑا ہو کر شجاعت کا مظاہرہ کرنا چاہتا تھا۔ اس نے باہر کی بخارا کی لڑائی کے دوران بھاگ کر اپنے ماموں کے لشکر میں شامل ہو جانے کی بھی کوشش کی تھی لیکن بابر نے فن حرب سے اس کی دلچسپی کی تعریف کر کے اسے اس کے استاد کے ساتھ واپس بھیج دیا تھا۔ خرم اپنی ماں کی اس قدر شدید محبت سے بھی متاثر ہوا تھا جو وہ بہن کی حیثیت سے بابر سے کرتی تھی۔ وہ اپنے اساتذہ سے جو بابر سے دلی عقیدت رکھتے تھے، بار بار اس کی جرات و شجاعت کے تذکرے بھی سن چکا تھا۔ اس طرح شیبانی خان کے بیٹے کے دل میں اپنے ماموں کے سلسلے میں محبت اور اس کے دشمنوں یعنی شیبانی خاندان کے سلطانوں کے خلاف نفرت کے جذبات روز بروز بڑھتے جا رہے تھے۔

وہ ان لوگوں سے نفرت کرتا تھا جنہوں نے ابھی ابھی ”ماروا“ کے نعرے کے ساتھ پڑاؤ پر حملہ کر دیا تھا اور چاہتا تھا کہ اپنے ”شاہی“ ترکش کے سارے تیروں لوگوں پر برسا دے۔ وہ باہر جانے کے لئے لپکا اور خیسے کے دروازے کے پردے کو جھٹکے سے ایک طرف ہٹا دیا۔ بوڑھی کنیر چلائی: ”ارے شہزادے، آپ کہاں جا رہے ہیں، ٹھہر جائیں!“ اس نے خرم کو خیسے میں واپس کھینچنے کے لئے اس کی بیٹی پکڑ لی لیکن دیر لڑکے کو روکنے میں ناکام رہی۔

”چھوڑ دیجئے مجھے! جانے دیجئے! میں اپنے ماموں جان کی مدد کرنا چاہتا ہوں! جانے دیجئے!“

بابر کے محافظ دستے نے بندو قوں کی گولیوں اور تیروں کی بوچھار سے دشمنوں کو عورتوں اور بچوں کے خیموں کے قریب نہ آنے دیا۔ ظاہر دو گھوڑے لے کر خان زادہ بیگم کے خیسے کے سامنے آیا اور سخت لہجے میں بولا:

”عالی نسب بیگم صاحبہ! فوراً سوار ہو جائیے!“

خان زادہ بیگم نے صندوقوں اور گٹھریوں پر نظر دوڑائی:

”اور سارا سامان چھوڑ دیں کیا؟“

”جان سلامت تو سامان پھر مل جائے گا! فوراً سوار ہو جائیے! عالی جاہ نے یہی حکم دیا ہے۔“
آسمان پر ماہ کامل چمک رہا تھا۔ اس کی روشنی میں ماہم بیگم پانچ سالہ ہمایوں کو گود میں لئے ہوئے
سفید خیمے سے باہر نکلی۔ گھوڑے پر سوار قاسم بیگ نے جھک کر ہمایوں کو تھاما اور اپنی آگے بٹھا کر
اپنے چوٹے سے ڈھک لیا۔

خان زادہ بیگم گھوڑے پر سوار ہو گئی (خرم سب سے پہلے ہی اچھل کر گھوڑے پر سوار ہو چکا تھا)
تو طاہر نے اپنی بیوی اور دس سالہ بیٹے سفیر کو گھوڑے پر سوار کرایا۔

عورتوں اور بچوں کو قاسم بیگ کے زیرِ کمان سپاہیوں نے حفاظتی گھیرے میں لے لیا اور یہ لوگ
پہاڑ سے اس واحد سمت میں بڑھے جدھر ابھی تک لڑائی نہیں ہو رہی تھی۔ باقی تینوں سستوں سے
گولیوں کی ٹھائیں ٹھائیں، تلواروں کی جھنکاروں، زنجیروں کی کراہوں اور گھوڑوں کی پھینکار اور
ہنسناٹ کے درمیان غصے سے بھری ہوئی آوازیں ابھر رہی تھیں:

”نکما یا بر مردہ باد!“

”مردہ باد!... مار ڈالو!“

”نیمت و تابوہ کرو و کبھی نہ کو!“

خان زادہ بیگم نے جو کچھ سمجھ نہیں پا رہی تھی، قاسم بیگ سے پوچھا:

”یہ کون دشمن ہیں جو ایسے برے الفاظ استعمال کر رہے ہیں؟“

”باغی“ وزیر نے جھلاٹ سے کہا۔ ”اس بار بھی وہی مغل ہی ہیں۔ دو سال قبل بھاگ کر قندز
میں ہم سے آن ملے تھے پھر لوٹ گئے تھے... یہ لوگ تو لگتا تھا کہ ہمارے ساتھ ہی رہیں گے لیکن
اب... ان کا ارادہ تھا کہ ہمارے حکمران پر اچانک حملہ کر کے سوتے ہی میں جان لے لیں۔ خدا کا
شکر ہے کہ طاہر بیگ کے سپرد اوروں کو خطرے کا بروقت علم ہو گیا۔“

”اف، مصیبت پر مصیبت!“

”سب سے بری بات یہ ہے کہ باغی تعداد میں ہم سے دگنے ہیں اور انہوں نے حملے کی تیاری
پہلے ہی سے کر لی تھی... آپ سچ ہی میں رہنے، خانم۔ اگلی صف سپاہیوں کے لئے ہے...“

باغی پڑاؤ کا محاصرہ مکمل کرنے ہی کو تھے کہ اتنے میں کہیں قریب ہی سے باہر کی آواز سنائی دی:

”استاد علی! بندو قیوں کو آگے لے جائیے! ہم محاصرے کو توڑیں گے!“

گولیاں بہ آسانی زور ہوں اور خودوں کے پار ہو جاتی تھیں اور بندو قیوں کے سامنے باغی ٹک
نہیں پارہے تھے۔ باہر اپنے تمام معتبر اور عمدہ سپاہیوں کو یکجا کرنا اور ان کے ساتھ محاصرے کو توڑ کر

حصار کے قلعے تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔ سازشی اسے قلعے کی سمت نہیں جانے دینا چاہتے کیونکہ وہ خود ہی قلعے پر قابض ہونے کے خواہیں تھے اور اسی لئے بغاوت بھی کی تھی۔

جسماتی بندوقیں جن کی نالیاں تین چار گولیاں چلانے کے بعد بہت گرم ہو جاتی تھیں، اب لڑائی کے کام کی نہ رہ گئیں۔ خواجہ کلاں بیک کے زیرِ کمان ایک ہزار سپاہی محاصرے کو توڑ کر نکلے لیکن جنوب کی سمت نہیں جدھر عورتیں اور بچے موجود تھے بلکہ مشرق کی سمت تیزی سے بڑھنے لگے۔

گھڑسواروں کی دست بدست لڑائی میں ہلاکی تندی و تیزی آگئی۔

خرم اپنے خوف پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کے دل میں شدید خواہش پیدا ہوئی کہ جن لوگوں نے اس کے ماموں اور والدہ پر دھوکے سے حملہ کیا ہے ان میں سے کم از کم ایک ہی کو اپنے تیرے مار گرائے۔

لڑائی نے الگ الگ بکھرے ہوئے گردہوں کے تصادموں کی شکل اختیار کر لی اور ایک تصادم ان سپاہیوں کے قریب ہی ہونے لگا جو عورتوں اور بچوں کی حفاظت کر رہے تھے۔ خرم نے اچانک بڑے عزم کے ساتھ اپنے گھوڑے کو ایڑی لگائی اور سپاہیوں کی اگلی صف میں پہنچ کر اپنی کمان سے یکے بعد دیگرے تین تیر چلا دیئے۔ خان زادہ بیگم کی نگاہوں سے وہ بس پل بھر کے لئے اوجھل ہوا تھا۔ اس نے بیٹے کو تیر چلاتے دیکھا تو فوراً ہی اپنا گھوڑا اس کی طرف بڑھایا لیکن قریب پہنچی ہی تھی کہ اتنے میں دشمن کا ایک تیر آکر خرم کے دائیں پہلو میں دھنس گیا۔ کمان اس کے ہاتھوں سے گر گئی اور وہ خود بھی زین سے نیچے لڑھکنے لگا۔

”میرا کلیجا!“ ماں کی چیخ سے لڑائی کا شور دب سا گیا۔

ظاہر ہے فوراً ہی خرم کو اس کے گھوڑے پر سے کھینچ کر اپنے آگے بٹھالیا لیکن اس اثنا میں وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔

آخر کار پوچھنے لگی۔ لڑائی ختم ہو چکی تھی۔ بابر محاصرہ توڑ کر قلعہ حصار کو جانے والے راستے کی طرف نکل جانے میں ناکامی کے بعد وادی وحش میں لوٹ آیا تھا۔ باغی اب اس حالت میں نہیں رہ گئے تھے کہ اس کا تعاقب کرتے۔

شاہی طبیب صاف ستھرے چوغے پر لیٹے ہوئے خرم کو ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس نے زخم پر مرہم لگایا، خون بننے کا سلسلہ روک دینے میں بھی کامیاب ہو گیا لیکن خرم کسی طرح ہوش میں نہ آ سکا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد کراہتا رہا اور بس

بھیڑے اور معدے کے درمیان داخل ہونے والے تیر سے اندرونی اعضا بری طرح متاثر ہو گئے تھے۔ طیب نے پانی کے ذریعے بہترین قسم کی مومیائی کھلانے کی کوشش کی لیکن ناکامی رہا کیونکہ بے ہوش لیٹے ہوئے لڑکے کے حلق میں اندیلا جانے والا پانی اور اس کے ساتھ ہی دوا بھی باہر نکل آتی تھی۔ خان زادہ بیگم یہ دیکھ کر بدحواس ہو گئی، بیٹے پر جھکی اور اس کے بے حس جسم سے پلٹ کر رونے لگی:

”خرم جان! ہائے میرے اکلوتے بیٹے! میرے لخت جگر!“

اچانک لڑکے کی آنکھیں پوری طرح کھل گئیں لیکن وہ کچھ دیکھ نہیں رہی تھی۔ پتلیاں ادھر ادھر گھومیں اور پتھرا گئیں، پلکیں بے حس و حرکت ہو گئیں۔

باہر سمجھ گیا کہ خرم دم توڑ چکا ہے۔ اس نے بہن کے شانوں کو پکڑ کر اسے الگ لے جانے کی کوشش کی لیکن خان زادہ بیگم نے خود کو اس کی گرفت سے آزاد کرایا۔ وہ بیٹے کی میت سے پلٹ گئی، اسے پیار کرنے اور کچھ اوپر اٹھا کر رندھے ہوئے گلے سے پکارنے لگی:

”خرم! کہاں چلے گئے تم، خرم جان؟! کہاں ہو تم، میرے جگر گوشے؟! اٹھو، بیٹے! بولونا! کچھ کہو

تا!“

آخر کار باہر نے جو خود بھی اٹکبار تھا، میت کو کسی طرح ماں کی گرفت سے چھڑایا اور دوبارہ چونے پر لٹا دیا۔ قاسم بیگ نے آنکھیں بند کرنے کے لئے اپنی انگلیاں دھیرے دھیرے بھوؤں پر سے نیچے پھیریں لیکن لڑکے کی آنکھیں نیم وا ہی رہ گئیں۔ اب کہیں جا کر خان زادہ بیگم کو یقین ہوا کہ بیٹا دنیا سے کوچ کر گیا۔ وہ بیجانی کیفیت میں سرپیٹ پیٹ کر بڑے دردناک انداز سے بین کرنے لگی:

”ہائے اللہ! میں تمہاری حفاظت نہ کر سکی، میرے لاڈلے! اس سے تو کہیں اچھا تھا کہ مجھی کو

موت آجاتی! ہائے، مے مرجاؤں! آخر تمہیں یہاں لائی ہی کیوں تھی، آخر کیوں؟!“

باہر نے بہن کی بہنچی ہوئی مٹھیوں کو تھام کر اس کا منہ زبردستی اپنی طرف پھیرا۔

”اس سانچے کے لئے کسی کو کتنا ضروری ہو تو مجھے کوئے۔“ اس نے تلخی کے ساتھ کہا۔

”آپ پر مصیبت کا یہ نیا پاڑ میری ہی وجہ سے ٹوٹا ہے۔ موت اگر منصف ہوتی تو پہلے میری جان

لیتی کیونکہ ہریات کے لئے سب سے زیادہ قصور وار میں ہوں! میری ہی وجہ سے تو یہ معصوم لڑکا دو

تکواروں کی چپیٹ میں آگیا۔ میں نے ہی تو آپ سب کو پھنسا یا ہے اس جنگ میں!“

قاسم بیگ نے اظہار ہمدردی کے طور پر باہر کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر اسے چٹالیا۔ وہ دل ہی دل

میں اپنے اوپر لعنت بھیج رہا تھا کہ گزشتہ سال قندز میں مغل بیگم کے سازش کا علم ہوا تھا تو اس نے باہر کو سخت کارروائی کرنے سے روک دیا تھا۔ آج کی یہ بنات وہی پرانا پھوڑا تھا جو پھوٹ گیا تھا۔ ”قصور وار تو ہم بھی ہیں، عالی جاہ“ آخر کار قاسم بیگ نے کہا۔ ”دنیا کا تو ہمیشہ ہی یہی حال رہا ہے، غدار لوگ ایماندار اور بے قصور افراد کو یوں ہی برباد کرتے رہے ہیں۔“

اتنے میں خان زادہ بیگم دوبارہ چیخ مار کر خرم کی میت کی طرف جھپٹی:

”میں عاجز آپکی ہوں آپ کی اس دنیا سے! بت ہو چکا! مجھے بھی میرے بیٹے کے ساتھ ہی دفن کرو دیجئے! میں دوسری دنیا میں چلی جاؤں گی، خرم کے ساتھ چلی جاؤں گی!“

ان لوگوں نے منور کے تنے اور شاخوں سے ایک پلنگزی بنا کر میت کو اس پر رکھ دیا اور اس پلنگزی کو اٹھائے ہوئے باری باری کندھا دیتے ہوئے دن بھر چلتے رہے۔ شام کو اسے ایک سربز و شاداب ٹیلے پر جہاں سے عظیم الشان کوہ پامیر دکھائی دیتا تھا، دفن کر دیا گیا۔ چھوٹی سی قبر پر ایک سفید جھنڈی لہرانے لگی جو اس بات کی علامت تھی کہ وہاں ایک معصوم روح ابدی نیند سو رہی ہے۔

خان زادہ بیگم کو جو زندہ درگور ہو رہی تھی، کسی طرح قندز نے جایا گیا پھر وہاں سے کابل۔

کابل

۱

شام سے ذرا قبل جھیل سے لمبی چوچ والی مرغابیوں کے ایک غول نے اوپر کی طرف پرواز کی۔ مرزا ہمایوں اس لمحے کے انتظار میں کافی دیر سے جھاڑیوں میں چھپا بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے کمان کی تانت کھینچ کر ایک اور پھر فوراً ہی دوسرا تیر چلایا۔ غول کی ایک مرغابی کی رفتار دھیمی پڑ گئی اور وہ بازو لٹکائے ہوئے تیزی کے ساتھ نیچے آکر مخالف سمت والے کنارے کے قریب پانی میں گر گئی۔

وہیں آٹھ چھوٹوں والی شاہی کشتی جس پر ساتباں پڑا ہوا تھا، ہلکی ہلکی لہروں پر ڈول رہی تھی۔ ہمایوں گھوڑے پر سوار ہو کر اپنے اتالیق اور سپاہیوں کے ساتھ جھیل کے کنارے کنارے چلتا ہوا دوسری جانب پہنچا لیکن اس سے قبل ہی بادشاہ کے کچھ درباری کشتی پر سوار ہو کر مرغابی کو پانی سے نکال لائے تھے اور اب وہی عمد کی طرف چلے آ رہے تھے۔

ہمایوں نے دیکھا کہ مرغابی کو جسے کسی درباری نے ذبح کر دیا تھا، خود باہر ہاتھ میں لئے غور سے

جائزہ لے رہا ہے۔ وہ جلدی سے گھوڑے پر سے اترا اور شاہی آداب کے بموجب دور ہی سے اپنے والد کو کورنش بجالایا۔

باہر نے ایک ہی جھٹکے سے پرندے کے سینے میں چبھے ہوئے تیر کو نکال لیا اور بیٹی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا:

”یہ آپ کا تیر ہے؟“

ہمایوں فوراً سمجھ گیا کہ والد پر اس وقت بھی ہلکا ہلکا سرور طاری ہے۔ گزشتہ کچھ دنوں سے باہر خاصا بلا نوش ہو گیا تھا اور آج بھی درباریوں کے ساتھ کشتی پر بے تاب پئی تھی۔ ہمایوں کو یاد آ گیا کہ جھیل اور اس کے ارد گرد کا علاقہ بادشاہ کے آرام کرنے کے لئے وقف ہے۔ اس نے ندامت کے ساتھ آنکھیں جھپکاتے ہوئے جواب دیا:

”معاف فرمائیے، جہاں پناہ۔ میں یہاں شکار کھیلنے آ گیا تھا۔۔۔ بے وقت۔“

”لیکن نشانہ خوب لگایا۔“ باہر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”لہجے اپنے پرندے کو۔ شاباش!“

ہمایوں بائیں ہاتھ کو سینے پر رکھ کر والد کے پاس گیا اور دائیں ہاتھ سے مرغابی لے کر فوراً ایک خادم کو تھمادی۔

باہر کے مصاحبین میں شامل بڑی بڑی آنکھوں والا ایک دیلا پتلا سانولا نوجوان جو ہندو بیگ کہلاتا تھا، اس طرح مسکرایا کہ اس کے اچلے اچلے دانت دکھائی دینے لگے:

”ولی عہد لا جواب نشانہ بازی اور ہاتھ کی مضبوطی کے معاملے میں بالکل بادشاہ ذی جاہ ہی پر پڑے ہیں۔“

خواجہ کلاں بیگ نے فوراً ہی قدرے بے ربطی کے ساتھ جو بے تاب کا نتیجہ تھی، تائید کی کہ شہزادہ اپنے مشہور و معروف والد کے شایان شان ہے۔

باہر نے مطمئن ہو کر قاسم بیگ کی طرف دیکھا جو ہمیشہ ہی کی طرح اس وقت بھی باہر کی طرف سے بہت زیادہ متوجہ چپ چاپ ایک طرف کھڑا ہوا تھا۔ اس کی عمر ساٹھ سے تجاوز کر چکی تھی، وزیر اعظم کے عہدے سے خود اپنی مرضی سے علیحدگی اختیار کر لی تھی اور اب ہمایوں کے اتالیق کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ باہر نے سوچا: ”قاسم بیگ کسی زمانے میں میرے اتالیق بھی تھے۔۔۔ ان کا جیسا وفادار شخص نہ ہو تا تو مجھے جانے کتنی مشکلات جھیلنی پڑتیں۔“

”ہمایوں کی اس کمال کی تیر اندازی کے لئے ان کے محترم اتالیق لائق ستائش ہیں“ باہر نے۔

”لیکن ولی عہد کے لئے نشانہ بازی کی مہارت ہی کافی نہیں ہوتی میرے ولی عہد کو گھر سواری کے فن

پر کتنا عبور حاصل ہے؟“

قاسم بیگ نے ہایوں کو حوصلہ افزا نگاہوں سے دیکھا اور لڑکے نے اس سوال کا جواب عملی طور پر دینے کی آنکھوں ہی آنکھوں میں اجازت مانگی۔

”اچھی بات ہے، دکھا دیجئے۔“

تیرہ سالہ ہایوں قد میں تقریباً اپنے والد کے برابر ہو چکا تھا اور صورت شکل اور وضع قطع سے ابر کے لڑکین کی جیتی جاگتی تصویر لگ رہا تھا۔

قاسم بیگ کے اشارے پر دو سپاہی دو گھوڑوں کو جن پر کانٹھیاں کسی ہوئی تھیں، پکڑ کر ایک سیدھ میں، ایک دوسرے سے کوئی پچاس قدموں کے فاصلے پر کھڑے ہو گئے۔ ہایوں بڑی پھرتی سے اچھل کر گھنی ایال اور ماتھے پر سفید نشان والے اپنے گھوڑے پر سوار ہوا، اسے کچھ دور تک پچھاڑ لے گیا پھر ایڑ لگا کر دوڑاتا ہوا پہلی گھوڑے کے برابر پہنچا، اپنی لگام چھوڑی، رکابوں سے پاؤں نکالے، دوسرے گھوڑے کی کاٹھی تھامی اور پلک جھپکتے میں اپنے گھوڑے کی کاٹھی پر سے اچھل کر اس پر سوار ہو گیا۔ اس گھوڑے کی لگام فوراً ہی تمام کر اسے سرپٹ دوڑاتے ہوئے اس نے اگلے گھوڑے کو پکڑے کھڑے ہوئے سپاہی کو آواز دی: ”اپنی جگہ سے نہ ہٹنا!“ اور اتنی ہی پھرتی سے اچھل کر تیسری کاٹھی پر بھی سوار ہو گیا۔

بیگ جنہیں نشے نے خاصا بے باک بنا دیا تھا، تقریباً ایک ساتھ چیخ اٹھے:

”آفرس! صد آفرس!“

”نہ کبھی شانہ دیکھا! بے نظیر!“

”بالکل جہاں پناہ ہی کی طرح!“

بابر کو یاد آگیا کہ لڑکین میں جب کہ وہ بہت دلیر تھا، گھڑ سواری کی ایسی ہی مشقیں خود بھی کیا کرتا تھا، اندجان کے باہر واقع باغ میں یوں ہی ایک گھوڑے کی کاٹھی سے اچھل کر دوسرے کی کاٹھی پر سوار ہو جاتا تھا۔ اسے یہ بھی یاد آگیا کہ ایک بار وہ چوک گیا تھا اور پیر میں سخت چوٹ آگئی تھی۔

”چشم بد دور۔ گھڑ سواری سے متعلق پھرتی کے معاملے میں تو لگتا ہے کہ مرزا ہایوں مجھے بھی آگے بڑھ گئے۔“

”مرزا ہایوں تو ہر معاملے میں آپ کو نمونہ تقلید تصور کرتے ہیں، عالی جاہ“ قاسم بیگ نے صدق دل سے کہا۔

اس کا جواب بابر نے بھی صدق دل سے ہی دیا:

”ہر معاملے میں تو میں بھی شاید ہی ان کے لئے نمونہ تقلید بن سکوں۔“

اتنے میں ہمایوں دوبارہ ان لوگوں کے قریب آگیا۔ اسے والد کے مغموم دملول چہرے کو دیکھ کر حیرت ہوئی اور اس نے کہا:

”کیوں نہیں، عالم پناہ! میرے محترم اتالیق مجھے آپ کی ان جنگوں کے بارے میں بھی جن میں قسمت نے آپ کا ساتھ نہیں دیا، سب کچھ بتا چکے ہیں۔ دشمنوں کا مقابلہ آپ نے جس شجاعت سے کیا اس سے تو شاید رستم، سراب اور الپامش نے بھی نہ کیا ہو گا۔“

”ارے شہزادے، جنگیں زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں۔ دیکھئے نا، جنگوں سے کیسے کیسے نتائج رونما ہوتے ہیں“ بابر نے کہا اس کا اشارہ اپنی نکتوں اور ان کے نتائج کی طرف خاص طور سے اپنے ماوراءالنہر سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہاتھ دھو بیٹھنے کے سنگین ترین نتیجے کی طرف تھا۔

لیکن ہمایوں کے نزدیک خاص بات کچھ اور ہی تھی: اس کے والد نے خونیں معرکوں میں جانے سکتی ہی بار موت سے لکری تھی اور ہر بار اس مقابلے سے زندہ و سلامت نکل آیا تھا۔ کیا یہ حقیقی شجاعت کا مظاہرہ نہ تھا؟ ہمایوں حال ہی میں قاسم بیگ سے سن چکا تھا کہ بابر نے ہرات اور کابل کے درمیان بلندیوں پر واقع درے کو کیسے پار کیا تھا۔ سردیوں کے ایام تھے، لو کو منجمد کر دینے والی سردی پڑ رہی تھی اور نہایت ہی بھیانک برفانی طوفان بھی آیا ہوا تھا۔ ایسے میں اس درے کو جہاں موسم گرما تک میں برف کی موٹی موٹی تہیں جمی رہتی تھیں، پار کرنے کا کوئی دوسرا شخص تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن بابر نے اسے اپنے سپاہیوں کے ساتھ پار کیا اور تمام مشکلات پر قابو پایا۔ ایسے بہادرانہ اقدام کا تصور وہی شخص کر سکتا تھا جو خود کو قربان کر دینے کا عزم رکھتا ہو، اس بات کی خاک بھی پروانہ نہ کرتا ہو کہ وہ برف کے گرتے ہوئے توڑوں میں دفن ہو سکتا ہے۔ اتالیق نے ہمایوں کو بتایا تھا: ”ہم لوگ سینے سینے تک برف میں دھنس جاتے تھے۔ گھوڑوں کے لئے قدم اٹھانا سخت دشوار ہو گیا تھا، برف پر گر کر پڑتے تھے پھر بھی لوگ باری باری آگے نکل کر برف کو اٹھا اٹھا کر دونوں جانب پھینکتے اور راستہ بناتے جاتے تھے۔ آخر سپاہیوں کے لئے بھی تھکن اور کوششانی بلندیوں پر ہوا کی کمی کے نتیجے میں ہو جانے والی بیماری کے باعث چلنا تقریباً ناممکن ہو گیا۔ تب ہمارے حکمران آگے بڑھے۔ سردی میں برابر اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا، حکمران کا چہرہ اور کان اکڑ کر سوچ گئے لیکن انہیں اس کا احساس تک نہ ہوا۔ وہ ہم سب کو لئے ہوئے آگے بڑھتے ہی رہے اور آخر کار ہم نے موسم سرما میں انتہائی پر خطر بن جانے والے اس درے کو پار کر لیا۔“

قاسم بیگ نے ان آفتوں کے جو بابر کے سر پر مسلسل نازل ہوتی رہی تھیں، قصے سنا سنا کر ہمایوں

کو یقین دلا دیا تھا کہ اس کے والد کے آگے موت بھی بے بس ہو جاتی ہے۔ ہمایوں اسی خوش اعتقادانہ یقین کے سائے میں پروان چڑھ رہا تھا اور اس وقت اس نے بچوں جیسی با اعتباری اور سادگی کے ساتھ بابر سے پوچھا:

”عالی جاہ! کیا یہ سچ ہے کہ ہمیں کابل میں جب سازش کرنے والوں سے لڑائی ہو رہی تھی تو دوست نام کے پہلوان جیسے کسی سپاہی نے جو آپ کو پہچان نہیں سکا تھا، آپ پر تلوار چلا دی تھی؟“

بابر مسکراتے لگا:

”ہاں شہزادے! یہ سچ ہے... قیامت کی سردی میں درے کو پار کرتے وقت میرا چہرہ اکڑ کے سوچ گیا تھا اور ظاہر ہے کہ جب یہاں پہنچا تو صورت خاصی بگڑی ہوئی تھی۔ لیکن کابل میں غداروں نے ہمارا استقبال تلواروں سے کیا۔ انہوں نے جن سپاہیوں کو فریب دیا تھا ان میں دوست بھی شامل تھا... یہ سپاہی مجھ سے بخوبی واقف تھا۔ میں نے عین وقت پر اسے لٹکرا کر: ”دوست! ذرا ہوش میں آؤ!“ لیکن انھی ہوئی تلوار کو روک لیتا بہت مشکل ہوتا ہے۔ تو اس کی تلوار میرے خود پر آن پڑی۔ میں سمجھتا ہوں کہ دوست نے میری آواز سنتے ہی مجھے پہچان لیا تھا اور اس کا ہاتھ لرز اٹھا تھا اسی لئے وار زیادہ زور دار نہ ہو سکا۔ ویسے تو اس کی تلوار کی ضرب ہمیشہ ہی جان لیوا ثابت ہوتی تھی لیکن میرے صرف سر اور گردی میں زخم آئے اور بس۔“

”اور اس سپاہی کا کیا حشر ہوا تھا؟“

”وہ مارے ڈر کے تلوار پھینک کر بھاگ کھڑا ہوا تھا... میں نے تعاقب نہیں کیا تھا۔“

یہ سن کر ہمایوں اور سب بیگ بے حد سرور ہوئے۔ انکساری انسان کی شان بڑھاتی ہے لیکن... بابر کے موجودہ وزیر اعظم محمد دولدائی نے جو چالیس سال کا بہت ہی وجہ و تکلیل بیگ تھا، قدرے لڑکھڑاتے ہوئے ایک ایسی بات کہنے کا فیصلہ کیا جو اس کے خیال میں سچ تھی:

”وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔ پروردگار نے ہمارے عظیم بادشاہ کو ایسا بنایا ہے کہ ان کا نہ تلوار کچھ بگاڑ سکتی ہے نہ قیامت کی سردی اور نہ ہی تیر۔“

ہمایوں اس چالپوس وزیر کے قریب سے جس کا چہرہ نشے کے باعث سرخ ہو رہا تھا، بڑی رکھائی کے ساتھ الگ ہٹ گیا۔ وہ اس وقت صرف اپنے والد ہی سے باتیں کرنا چاہتا تھا جس کی شخصیت کچھ دنوں سے اس کے لئے زیادہ سے زیادہ پرکشش ہوتی جا رہی تھی۔ خود بابر امور سلطنت میں فرامین و احکام جاری کرنے، تنہائی میں پڑھنے لکھنے اور فرصت کے وقت اپنے معتبر بیگوں کے ساتھ ضیافتوں میں مصروف رہتا تھا۔ اس کے نزدیک ہمایوں تو ابھی کل کا لڑکا تھا جس کے معقول ہم کلام

ثابت ہونے کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔ لیکن ہمایوں اپنے والد سے باتیں کرنے کے لئے بے تاب رہتا تھا۔ اس کی دلچسپی لڑکپن کی شرارتوں میں شامل ہونے والے اپنے دوستوں سے بھی اور قاسم بیگ سمیت اپنے سب اکتا دینے والے اساتذہ سے بھی روز بہ روز کم ہی ہوتی جا رہی تھی۔

”والد محترم، لوگ کہتے ہیں کہ گزشتہ سال آپ دریائے سندھ کے کنارے کسی شیر سے لڑ گئے تھے۔“

”آپ کو کیسے معلوم ہوا؟“

”میں نے آپ کی خواب گاہ میں شیر کی کھال دیکھی ہے۔“

بابر نے سر کی جنبش سے اپنے پیچھے کھڑے ہوئے بیگوں کی طرف اشارہ کیا:

”اس شیر کا کام تو ہم سب نے مل کر تمام کیا تھا۔“

ہندو بیگ نے مسکراتے ہوئے اس بات کی تردید کی:

”ارے نہیں، عالی جاہ ہمارے ساتھ نہ ہوتے تو ہم شیر کے قریب پھٹکنے کی بھی جرات نہ کرتے۔“

اور ہمایوں نے اپنے والد کے چہرے پر پرستائش نگاہیں جمادیں...

لیکن بابر بیٹے سے باتیں کرتے ہوئے تصور ہی تصور میں ماوراالنہر پہنچ چکا تھا۔ شیبانی اور شیبانی خاندان کے سلطانوں کے ہاتھوں اپنی ہزیمت کی یادیں آج بھی اس کے ذہن پر مسلط تھیں، آج بھی دل کو پارہ پارہ کئے دے رہی تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا: ”مجھے حصار تنک سے محروم ہونا پڑا!... یہ مطلب ہوتا ہے طاقت کا۔ طاقت نہیں رہتی تو کامیابی بھی قدم نہیں چومتی... طائر خوش بختی ہما جانے کتنی ہی بار میرے شانوں سے دور اڑ گیا۔“ وہ خود کو بھول جانے کے لئے، درد اور غم کو جو کہیں زیادہ بڑھ چکے تھے، غلط کرنے کے لئے بار بار بادہ و جام کا سہارا لیتا تھا لیکن بے سود۔ اس پر نشہ ضرور طاری ہوتا تھا لیکن درد و کرب سے نجات نہیں ملتی تھی۔ یہ پست حوصلہ انسان اپنے بیٹے کو دیکھتا تھا تو اسے لگتا تھا کہ اس کی زندگی سے ہمایوں کی دلچسپی بڑھ گئی ہے۔

بابر نے ایک لمحے کے لئے خود کو اپنے کم سن بیٹے کی نگاہوں سے دیکھا۔ وہ سب جس پر اس کے لخت جگر کو ناز تھا، واقعی پیش آیا تھا اور اس کی آپ بیتی میں لکھا بھی جا چکا تھا۔ بگ اسے خوش کرنے کے لئے اس کی شجاعت کو کوئی ساوی چیز، اللہ کے اس پر مخصوص فضل و کرم کی ایک علامت قرار دیتے تھے لیکن اللہ ہی تو اسے سزا بھی دے رہا تھا... دراصل اچھائیوں اور برائیوں کا، فتوحات اور شکستوں کا انحصار ارضی اور عام لوگوں پر ہوتا تھا اور وہ خود بھی ارضی اور عام آدمی ہی تھا، یہ

الگ بات کہ وہ کچھ غیر معمولی صلاحیتوں کا بھی حامل رہا ہو جیسا کہ ہمایوں کا سادہ و معصوم دل سوچتا تھا۔

بابر کو غالباً پہلی بار احساس ہوا کہ وہ باپ کی حیثیت سے ہمایوں کا سارا انہیں بلکہ اس کے برعکس اس کا تیرہ سالہ بیٹا ہمایوں اس کا سارا ہے، اس کے حوصلے بڑھانے والا ہے۔ بابر کو زندگی شب تیرہ و تار جیسی معلوم ہو رہی تھی لیکن اب اس رات کو اپنے بیٹے کی نگاہوں سے دیکھنے پر اسے اس میں ستاروں سے مشابہ تابندہ نقطے نظر آنے لگے۔

اتنے میں ہمایوں نے دھیمی آواز سے تقریباً سرگوشی کی طرح جیسے کہ اس وقت وہ اپنے والد کے ساتھ اکیلا ہو، کہا:

”آپ نے مجھے وہ جو دیوان عطا کیا تھا نا اس کے تمام اشعار میں نے یاد کر لئے۔ آزمانا چاہتے ہوں تو پوچھ لیجئے۔“

بابر کے پیچھے اس نے بیک، اس کے مقربین کھڑے ہوئے تھے۔ اس وقت انہیں سب سے زیادہ دلچسپی کا ہے سے تھی؟ محض اس بات سے کہ جلد از جلد کشتی پر واپس چل کر محفل بادہ کو جاری رکھیں۔

بابر نے بیگلوں کی طرف مڑ کر اچانک سخت لہجے میں کہا:

”حضرات، ہم نے آج جتنی سیر کی، جتنا دل بہلایا وہ میرے خیال میں کافی ہے۔ اب میں کچھ وقت مرزا ہمایوں کے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں۔ گھوڑا لاؤ!“

بابر گھوڑے پر سوار ہو گیا تو ہمایوں بھی بڑی خوشی سے اچھل کر اپنے گھوڑے پر پہنچا اور باپ، بیٹے نے شہر کا رخ کیا۔ قاسم بیک اور دوسرے لوگ ان دونوں کے پیچھے پیچھے درمیان میں کچھ فاصلہ چھوڑ کر چلنے لگے۔

بابر کی آنکھوں میں معمول سے زیادہ چمک تھی لیکن کسی وقت وہ اچانک بند بھی ہو جاتی تھیں۔ بے تاب واقعی بہت تیز تھی۔

اس نے شراب کے اثر پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے نشے میں مسکرا کر ہمایوں سے کہا:

”ہاں تو شہزادے... میں ہمہ تن گوش ہوں۔“

ہمایوں نے جس کا چہرہ والد کے ہم رکاب ہونے کے احساس سے دمک اٹھا تھا، جلدی جلدی ایک رباعی سنائی:

ہم اپنی باتوں سے اوروں کے دل دکھاتے ہیں

تلاش کرتے ہیں غم اور انہیں بڑھاتے ہیں
 دلوں کو اپنے پہنچتے ہیں جب بہت آزار
 تو بارہ نوشی میں ہر شے کو بھول جاتے ہیں
 نہیں، ہمایوں اتنا بھولا نہیں ہے، بابر نے سوچا۔ اشعار بھی کیسے منتخب کئے! کہنا چاہتا ہے کہ وہ
 بارہ و ساغر سے والد کے گمرے لگاؤ کی وجہ کو سمجھتا ہے نیز یہ کہ آج کی اس نشے کی حالت کے لئے
 اسے معاف کر رہا ہے۔

”بالکل درست... بس پہلے مصرعے کو بحر کے اعتبار سے پڑھنے میں ذرا سی غلطی ہو گئی... اور
 ہاں، ان اشعار میں جو طنز مضمر ہے اسے بھی آپ پوری طرح نہیں سمجھ سکتے۔“
 ”کیا نہیں سمجھ سکا؟ طنز کس پر؟“ ہمایوں نے حیرت سے کہا۔

”اس بات پر... ان لوگوں پر جو... خیر، ایسا ہوتا ہی رہتا ہے۔ لوگ ایک دوسرے کو برا بھلا کہتے
 ہیں، ایسے الفاظ تلاش کر لیتے ہیں جو عزیزوں کے دلوں میں کانٹے کی طرح چبھ جائیں۔ اور پھر...
 اپنے دل کے درد سے نجات حاصل کرنے کے لئے خود کو شراب میں غرق کر دینا چاہتے ہیں... اور
 ایک بار پھر دوسروں کو اپنے عزیزوں کو برا بھلا کہنے لگتے ہیں... کبھی کبھی خود اپنا مذاق اڑانا بھی مفید
 ہی ہوتا ہے۔“

ہمایوں دوبارہ متحیر ہو گیا۔

”مفید ہوتا ہے؟ وہ کیسے؟“

”آپ کی عمر میں اس بات کو سمجھنا مشکل ہو گا... جانتے ہیں، تیس سال کی عمر تک مجھے شراب
 سے خاک بھی رغبت نہیں تھی۔ اور آپ؟ آپ کا جی چاہتا ہے پینے کو؟“

اس سوال سے ہمایوں بالکل بوکھلا گیا پھر اس نے اپنے والد کے پھولے ہوئے پوٹوں پر تیز اور
 اداس نظر ڈالتے ہوئے کہا:

”مجھے شراب پسند نہیں ہے۔“

خود بابر بھی تیرہ سال کی عمر میں شراب سے نفرت کرتا تھا۔ اس نے سر ہلا کر اظہارِ پسندیدگی
 کرتے ہوئے پوچھا:

”تو پھر آپ کو کیا پسند ہے؟“

”کیا پسند ہے؟“ ہمایوں چند لمحات کے لئے سوچ میں پڑ گیا۔ ”مجھے گھڑ سواری پسند ہے، نئی نئی
 چیزوں کو دیکھنا اور معلومات میں اضافہ کرنا پسند ہے۔ سب سے زیادہ پسند ہیں بہادروں کی حکایات

والی اچھی اچھی کتابیں۔ انہیں تو میں صبح سے شام تک پڑھتا رہوں تب بھی جی نہ بھرے۔۔۔“
 ”بالکل مجھی پر پڑا ہے“ بابر نے سوچا۔ اس نے ہمایوں کو غور سے دیکھا اور اس کی نگاہیں چابک کو تھامے ہوئے ہاتھ پر ٹھہر گئیں۔ ”ہمایوں کی رنگت سانولی ہے۔۔۔ شاید اس لئے کہ جنوبی علاقے میں پیدا ہوا اور بڑھا پلا ہے۔ لیکن کلائی بالکل میری کلائی جیسی ہی ہے۔“ اور بابر نے لپک کر اپنا ہاتھ بیٹے کی کلائی پر رکھ دیا:

”ذرا اپنا ہاتھ تو دکھائیے۔“

ہمایوں نے چابک کو کمر کی پٹی میں ٹھونس کر ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔ بابر نے اپنی ہتھیلی ہمایوں کی ہتھیلی کے قریب لا کر موازنہ کیا۔ دونوں کے ہاتھوں کی چھوٹی اور بڑی لکیریں یکساں تھیں۔ ہمایوں خوشی سے ہنس پڑا لیکن بابر نے ٹھنڈی سانس بھری:

”خدا کرے کہ آپ کا ان آلام و مصائب سے کبھی بھی سابقہ نہ پڑے جو میں نے جھیلے ہیں۔“

”میں وہ سب کرنا چاہتا ہوں جو آپ کر چکے ہیں۔ آپ کا وارث جو ہوں۔“

بابر نے گھبرا کر بیٹے کی طرف دیکھا:

”لیکن اس معاملے میں عقل و ہوش سے کام لیجئے گا۔ میں نے تو کچھ ایسے اقدامات بھی کئے ہیں جو نہ کرنے کے لائق ہیں اور نہ ہی ورثے میں دینے کے لائق ہیں۔“

”وہ کون سے اقدامات ہیں، عالی جاہ؟“

”نہایت ہی تلخ اقدامات۔۔۔ بے رحمی اور بے انصافی کے اقدامات۔۔۔ جانے کتنے ہی!“

ہمایوں نے سوچا: والد محترم نے جن آلام، مصائب کا تذکرہ کیا ان کی ترجمانی کیا ان کی شاعری میں بھی کی گئی ہے؟ ہاں، لگتا ہے کہ کی گئی ہے اور اس نے یہ اشعار پڑھے:

جس کام سے بھی نکلوں ہمراہ رہے محنت
 جس سمت بھی منہ پھیروں آتی ہے نظر حسرت
 سو جو رستم جھیلے، راحت نہ کبھی پائی
 کاہے کو کوئی ہوگا مجھ جیسا بھی بد قسمت!

ان اشعار کی تلخ حقیقت نے بابر کے دل میں ہلچل مچا دی۔

”بہت خوب پڑھا آپ نے مرزا ہمایوں“ اس نے ستائشی انداز میں کہا۔ ”میں نے آپ سے پہلے جو کچھ کہا تھا اسے آپ سمجھ گئے۔ میں نہیں چاہتا، قطعاً“ نہیں چاہتا کہ میں نے جو مصائب جھیلے ہیں وہ آپ کو بھی جھیلنے پڑیں۔“

”میں سمجھ گیا، والد محترم... آپ کی زندگی میرے لئے بہت کشش رکھتی ہے لیکن اب میں اس کے صرف خوشگوار واقعات ہی کا تذکرہ کیا کروں گا۔ ٹھیک ہے نا؟“

شر پینچے کے بعد قلعے میں بھی ان دونوں کی گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔ وہ کشادہ اور روشن دیوان خانے میں جس کی کھڑکیاں شاہ کابل کو ہمار کی طرف کھلتی تھیں، کافی دیر تک بیٹھے رہے۔ اچانک ہمایوں نے قلم کاغذ لے کر بابر کی یہ بیت خط بابر کی میں لکھ دی:

مقدر میں نہیں ترکوں کے اپنا خط ہی کیا کیجئے
ہے سفاقتی یہ خط بابر میرا بھی کیا کیجئے

بابر کو سمرقند کے جاہل اور متعصب افراد یاد آگئے جنہوں نے خط بابر کی کے ذریعے بچوں کو تعلیم دینے کی جارت کرنے والے استاد کو سنگ سار کر دیا تھا۔ ان جاہل اور بے رحم عناصر نے جو کبھی الغ بیگ کی ہلاکت کا باعث بن چکے تھے، بابر کے اس عظیم مفکر کی رصد گاہ کی مرمت شروع کراتے ہی زہرا گنا شروع کر دیا تھا۔ انہوں نے بابر پر اسلام سے منحرف ہو جانے کا بھی الزام لگایا تھا اور اس کے لشکر کے خاصے بڑے حصے کو اپنا ہم خیال بنالینے میں بھی کامیاب ہو گئے تھے جس کے نتیجے میں اسے ریگستان قراقم میں شکست کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔

یہی وہ افراد تھے جنہوں نے لوگوں کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ بابر کے ایجاد کئے ہوئے آسان حروف حتمی کے استعمال سے انکار کر دیں...

”آپ نے یہ خط اپنے کسی استاد سے سیکھا ہے؟“ بابر نے ہمایوں کی تحریر کو پرست نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”خوش نویس میر بدل سے۔“

ہمایوں نے بیت بالکل درست لکھی تھی لیکن ان حروف حتمی کا ابھی تک وہ عادی نہیں ہو سکا تھا اسی لئے حروف ٹیڑھے میڑھے سے تھے، کوئی چھوٹا ہو گیا تھا تو کوئی بڑا۔

”یہ خط آپ کو پسند ہے، فرزند عزیز؟“

”بہت زیادہ! اعراب برائے نام ہی ہیں، لکھنے پڑھنے میں آسانی ہوتی ہے۔“

”تو ٹھیک ہے، ذرا جی لگا کے خوب مشق کر لیجئے۔ بعد میں کبھی مجھے خط لکھئے گا تو یہی حروف استعمال کیجئے گا، ہے نا؟ میں بھی اسی خط میں جواب دیا کروں گا۔ اس طرح جو باتیں راز کی ہوں گی وہ راز ہی رہیں گی۔“

ہمایوں نے تصور کیا کہ وہ اپنے والد کے ساتھ خفیہ انداز سے کیسے خط و کتابت کیا کرے گا اور

اس کا دل یہ سوچ کر جذبہ فخر سے معمور ہو گیا کہ وہ بھی کچھ اہمیت رکھتا ہے، اس کے والد جیسے پیکر شجاعت کو بھی اس کی ضرورت ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ہمایوں کے دل میں نہایت لطیف، بچکانی، متاثر کن اور سیدھی سادی یہ خواہش بھی پیدا ہوئی کہ وہ اپنے والد کو خوش کرنے کے لئے کچھ کرے۔

”عالی جاہ پسند فرمائیں تو میں رباب بجا کے سناؤں۔“

”اوہ، بڑی خوشی سے سنوں گا۔“

فوراً ہی سیسوں سے مرصع افغان رباب لایا گیا۔ ہمایوں نے سر ہلا کر تار چھیڑے اور رباب سے کوسا روں میں گونجنے والی صدائے بازگشت جیسا شاندار شیریں نغمہ پھوٹ نکلا۔

اس نے دودھیں بجائیں، پہلے ”نوا“ کی اور پھر ”صوت“ کی۔

آخری نغمہ بابر کو بہت جانا پہچانا سا لگا اور کیوں نہ لگتا۔ گزشتہ سال اسی نے تو اس نغمے کی تخلیق کر کے اس کا نام ”صوت چار گاہ“ رکھا تھا۔ سازندے اس دھن کو شاذ و نادر ہی بجاتے تھے کیونکہ اس میں کچھ ایسی کیفیت تھی کہ اسے ضیافتوں کے موقع پر نہیں بجایا جاسکتا تھا۔ بابر سوچنے لگا کہ آخر ہمایوں نے اس دھن کو کیسے یاد رکھا؟ کیا اس کے اساتذہ نے بتایا ہے کہ والد کو کیسے خوش کیا جاسکتا ہے؟ کیا اس کے اساتذہ اس طرح بادشاہ سے اپنی تعریف کرانا اور انعام و اکرام حاصل کرنا چاہتے ہیں؟... لیکن اگر یہ درست بھی ہو تو کیا قباحت ہے؟ خاص بات تو یہ ہے کہ ہمایوں سچی لگن کے ساتھ ساز بجا رہا ہے۔ شاید وہ تکلیف کی آگ میں تپ کر نکلے ہوئے اس رات میں مضمر منہوم کو پوری طرح سمجھ نہ سکنے کے باوجود اسے اپنی اس بات کی سچائی کے ثبوت کے طور پر بجا رہا ہے کہ سہ گری کے معاملے میں بھی اور علوم و فنون کے معاملے میں بھی اپنے والد کی تمام صفات کو اپنائے گا اور یہ خواہش شہزادے کے لئے بری ہے کیا؟

بابر موسیقی سے محظوظ ہو رہا تھا، اپنے بیٹے کے متعلق مسرت اور جوش کے ساتھ سوچ رہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ یہ خیال بھی اس کے ذہن میں کروٹیں لے رہا تھا کہ وہ خود کیسی پستیوں میں گر چکا ہے جو ہر بات کا منفی پہلو ہی دکھاتا ہے، ہر شخص پر خود غرض ہونے ہی کا شک کرتا ہے لیکن آخر ہمایوں کی کیا غرض ہو سکتی ہے؟ کچھ بھی نہیں۔ اس خیال کے بعد بابر کو لگا کہ اس کی زندگی محض افکار کی کالی کالی گھٹاؤں ہی میں محصور نہیں ہے کیونکہ ہمایوں ہی کی طرح کبھی اس کے سینے میں بھی نیک اور اعلیٰ وارفع خواہشات امنڈتی رہتی تھیں اور تب اس کی زندگی شفاف جیسے کی مانند بہہ رہی تھی۔ بعد میں البتہ پہاڑی تو دوں کے گرنے سے اس جیسے کاپانی گدلا ہو گیا تھا تاہم یہ چشمہ آج بھی

برقرار تھا، شعر و سخن اور موسیقی کی شکل اختیار کر کے پھوٹ نکلا تھا اور باہر نے سوچا کہ کاش اس جیسے کا دھارا ہمایوں کے دل کی آبیاری کرتا رہے۔

باہر کو آج پہلی بار واضح طور پر احساس ہوا کہ اس کی زندگی اور اس کے بیٹے کی زندگی ایک دوسرے سے کتنا گہرا، کیسا غیر معمولی رشتہ رکھتی ہیں۔ اس نے سوچا ظاہر ہے کہ بیٹا ہر معاملے میں باپ کے نقش قدم پر نہیں چل سکتا لیکن اس کی کوئی ضرورت بھی نہیں۔ بیٹا اگر باپ سے گہرا لگاؤ رکھتا ہے اور اگر وہ جیسا کہ لوگ کہتے ہیں، بالکل باپ ہی پر پڑا ہے تو وقت گزرنے کے ساتھ ہی ساتھ باپ اور بیٹے کی زندگیاں مل کر ایک ہو جائیں گی۔ باپ جو کچھ نہ کر سکے گا اسے بیٹا کر دکھائے گا۔ اور یہی وہ بات تھی جس کا باہر اب یقین کرنا چاہتا تھا۔

پھر اس کے دل میں خیال آیا کہ ہمایوں کے تالیق اور والدہ اس کے دل میں باپ سے محبت اور عقیدت کے جذبات کو تقویت پہنچانے کی کوشش میں باپ کی زندگی کے صرف روشن پہلوؤں کو پیش کر کے اچھا ہی کر رہے ہیں۔ یہ لوگ ہمایوں کو چالپوسی کرنا نہیں بلکہ برائیوں سے اجتناب کرنا سکھا رہے ہیں۔ وہ خود بھی تو ہمایوں کو اس امید کے ساتھ محض اپنی خوبیاں ہی دینا چاہتا ہے کہ جو غلطیاں اس سے سرزد ہوئی ہیں ان کا ہمایوں اعادہ نہ کرے گا، جو تکالیف اس نے جھیلی ہیں وہ ہمایوں کو نہ جھیلنی پڑیں گی۔

اسی روز شام کو باہر نے قاسم بیگ کو بلا کر اسے شاہی خفے کے طور پر طلائی بیٹنوں کا پوسٹین اور ساز سمیت ایک خوبصورت گھوڑا عطا کیا۔ ولی عہد کے دوسرے اساتذہ کو بھی طلائی اور نقرئی چیزوں کے تحفے دیئے گئے۔

”اور آپ کو کیا تحفہ دوں؟“ خیر نہ بتائیے“ باہر نے ایک روز ہمایوں کے رہائشی حصے میں جا کر کہا۔ اس وقت کمرے میں ان دونوں کے سوا اور کوئی بھی موجود نہیں تھا۔

ہمایوں کو کتابوں کا بڑا شوق تھا اور وہ ایک مخصوص کمرے میں واقع اپنے کتب خانے کو بڑے سلیقے سے رکھتا تھا جہاں ڈھیروں قلمی کتابیں موجود تھیں۔ کتابوں کے لئے اخروٹ کی لکڑی کی بنی ہوئی ایک خوبصورت الماری اس کی خواب گاہ میں بھی رکھی ہوئی تھی۔ اس نے الماری کھول کر اس کے سب خانوں سے بہتر نقاشی والا خانہ باہر کو دکھایا جس میں صرف ایک ہی کتاب رکھی ہوئی تھی۔ باہر کا دیوان۔

”یہ خانہ میں نے آپ کی لکھی ہوئی کتابوں کے لئے چھوڑ رکھا ہے“ ہمایوں نے کہا۔ ”خدا سے دعا مانتا رہتا ہوں کہ وہ آپ کو بہت سی کتابیں لکھنے کے مواقع عطا کرے۔ میری دلی آرزو ہے کہ

کسی دن یہ سارا خانہ آپ کی کتابوں سے بھر جائے۔“

”بہت خوب! لیکن... آپ کی آرزو پوری کرنے کے لئے تو مجھے زندگی بھر لکھنا پڑے گا۔“

پھر اس نے یہ دیکھ کر کہ ہمایوں جھینپ سا گیا ہے، نیک دلی کے ساتھ اضافہ کیا:

”خدا کرے ایسا ہی ہو۔ کہتے ہیں کہ اچھی آرزو کا مطلب ہے نصف کام کی تکمیل، میں آپ کے

لئے آج ہی نئی کتاب لکھنا شروع کر دوں گا۔ اچھا، ذرا اپنا دفتر تو دکھائیے۔“

ہمایوں نے فوراً ہی الماری سے سنہری دبیز جلد والی نئی کاپی نکالی اور دونوں ہاتھوں پر رکھ کر اپنے

والد کے آگے بڑھا دی۔

بابر کاپی کو لے کر آٹھ پایوں والی چوکی کے پاس گیا جس پر سلیقے سے تراشا ہوا قلم اور دو دوات

رکھے تھے۔ اس نے ایسی شدید محبت کے ساتھ جو اس کے دل میں پہلے کبھی بھی نہیں پیدا ہوئی تھی،

لکھا:

میرے فرزند، میرے دل کی شاخ

اس نے ایک شاندار درخت کا تصور کیا جس میں نئی شاخ پھوٹی ہو اور سوچا کہ کتنا گہرا رشتہ ہوتا

ہے درخت اور اس کی شاخوں میں! لیکن انسانوں میں تو ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔ تاجدار باپوں

اور دلی عہد بیٹوں کی دشمنی اس دنیا میں ایک عام بات ہے۔ ایسی ہی عداوت نے عظیم الغ بیگ کی

جان لے لی تھی اور بعد میں الغ بیگ کے قاتل بیٹے عبداللطیف کو بھی قتل کر دیا گیا تھا۔ مقدر کا

خاص عطیہ یہ ہے کہ بیٹا اپنے باپ سے زندگی بھر محبت کرے، اس سے عقیدت رکھے اور اس کے

کام کو آگے بڑھائے۔ لیکن ایسا کب ہوتا ہے؟ صرف اسی صورت میں جب باپ بھی بیٹے سے

شدید محبت کرتا ہو۔

یہ سب سوچ کر بابر نے بڑے عزم کے ساتھ ہمایوں کی کاپی میں پہلی بیت لکھی:

بن ہمایوں، نصیبے والا ہو

تیرا دنیا میں بول بالا ہو

بابر نے مثنوی کا انداز اپنایا تھا جسے رزمیہ اور اصلاحی نظموں بلکہ علمی رسائل تک میں استعمال

کیا جاتا تھا۔ اگلا شعر یہ آسانی موزوں ہو گیا:

سارے ارمان اپنے پورے کر

تجھ کو لاکھوں بٹھائیں آنکھوں پر

”کوئی طویل مثنوی ہی کیوں نہ لکھ ڈالوں؟ مکمل کر کے انتساب ہمایوں کے نام کر دوں گا“ بابر

نے سوچا اور اسے اس خیال سے بے حد خوش ہوئی۔

”اس کے آگے بعد میں لکھتا رہوں گا“ اس سے کہا اور تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ”میں آپ کو ایک کتاب تحفے میں دوں گا۔“

بابر نے اپنی کتاب ”مبین“ دراصل اسی سال لکھی اور اس میں ہایوں کے لئے نیک تمنائوں کا اظہار کرنے والی وہ ابیات بھی شامل کر لیں جو پہلی بار بیٹے کی کاپی ہی پر وجود میں آئی تھیں۔ ”مبین“ کی نقل کامل کے بہترین خوش نویس نے اور جلد ایک ماہر جلد ساز نے تیاری کی۔

اس کتاب میں شرعی احکام و مسائل کا منظوم خلاصہ پیش کیا گیا تھا۔ فقہ کو اس کی خشک، مشکل اور پیچیدہ عربی زبان کی بناء پر سمجھنے میں ہایوں کو بھی اتنی ہی دشواری پیش آتی تھی جتنی کہ کبھی خود بابر کو لڑکپن میں پیش آنچکی تھی۔ اب ہایوں نے اپنے والد کی لکھی ہوئی اس شاندار منظوم درسی کتاب کا مطالعہ شروع کیا تو اس کی مادری زبان ترکی کے رواں مصرعے بے آسانی ذہن نشیں ہونے لگے۔ ”مبین“ کی بدولت والد سے ہایوں کی محبت، اس کی صلاحیتوں کے سلسلے میں عقیدت اور اس کی غیر معمولی قوت پر ہایوں کے یقین میں بھی اضافہ ہو گیا۔ والد کے قول کے سچے ہونے کا یقین بھی بڑھ گیا کیونکہ ہایوں جانتا تھا کہ بابر کو جانے کتنے ہی پیچیدہ امور سلطنت سے نپٹا اور صبح سے رات تک مصروف رہتا پڑتا ہے۔ اس کے باوجود اس نے قول نبھایا تھا اور ہایوں کے لئے کتاب لکھنے کا وقت نکال ہی لیا تھا اور اشعار بھی کتنے شاندار تھے! ہایوں ان کی ہمیشہ تعریف کرتا اور کتاب کو آنکھوں سے لگا کر چومتا تھا جیسے کہ وہ کوئی مقدس کتاب ہو۔

ہایوں پندرہ سال کا ہوا تو اس کی کتابوں کی الماری کے بچ والے خانے میں ایک اور کتاب ”رسالہ عروض“ کا اضافہ ہو گیا جس کی مدد سے اس نے اس فن کو سیکھا۔ وہ اپنے والد کی دیکھا دیکھی شعر کہنے کی طرف بھی مائل ہوا لیکن والد کے اشعار کے مقابلے میں اپنے اشعار اتنے حقیر معلوم ہوتے تھے کہ وہ انہیں چھپانے لگا۔ والد کو یہ اشعار دکھاتے ہوئے اسے شرم محسوس ہوتی تھی اور آخر کار اسے یقین ہو گیا کہ اس میدان میں کچھ کر دکھانا اس کے بس کی بات نہیں۔ بابر نے ایک بار اس سے کہا تھا: ”اے سیدھے شعر کہتے رہنے سے کیا حاصل؟ اس سے تو شعر و سخن کا غیر متعصب ناقد اور قدرداں بننا کہیں بہتر ہے۔“ اور یہ بات ہایوں کے دل میں بیٹھ گئی۔

ہایوں کی ”تزک“ یعنی اپنے والد کی سرگزشت حیات کا مطالعہ کرنے کی خواہش البتہ ابھی تک پوری نہیں ہو سکی تھی جسے جیسا کہ اس نے سنا تھا، والد نے اپنے لڑکپن ہی میں لکھنا شروع کر دیا تھا۔ بابر نے اس کے کچھ حصے جو اس کی فرغانہ، اندجانہ اور سمرقند میں گزری ہوئی زندگی سے متعلق

تھے، پڑھ کر ماتم بیگم کو سنائے تھے۔ شاہی خاندان میں اب اس کتاب کو ”بابر نامہ“ کہا جانے لگا تھا۔ ہمایوں اپنے والد سے اس کتاب کو مانگنے کے لئے کافی دنوں سے مناسب موقع کی تلاش میں تھا۔

ہمایوں سولہ سال کا ہو گیا تو بابر نے اسے کابل سے دور دراز واقع کستانی علاقے بدخشاں کا صوبیدار مقرر کر دیا۔ اسے بابر نے قاسم بیگ، کچھ دوسرے بہت ہی قابل اعتبار لوگوں اور صرف دو ہزار منتخب سپاہیوں کے ساتھ بدخشاں کے لئے روانہ کیا۔ بابر بیٹے کی طرف سے یقیناً فکرمند تھا، اسے رخصت کرنے خود دورے تک گیا اور راستے میں برابر ہدایات دیتا رہا۔

ہمایوں نے اس سفر کو اپنے خوابوں میں بسی ہوئی کتاب کی بات چھیڑنے کا نہایت ہی موزوں موقع تصور کیا:

”عالم پناہ، آپ کے بغیر میرے لئے بدخشاں میں قیام بہت دشوار ثابت ہو گا۔ آپ نے جس مدد کا اتنی سخاوت کے ساتھ وعدہ فرمایا ہے وہی میرا سہارا ہو گی۔ لیکن آپ کی عدم موجودگی میں بھی یہ خادم آپ سے ہم کلام ہوتا رہے گا کیونکہ آپ کی کتابیں ساتھ لئے جا رہا ہے۔ صد افسوس کہ کتابوں میں آپ کی ”ترک“ شامل نہیں ہے۔ آپ سے درخواست ہے، عالی جاہ کہ ازراہ نوازش کسی خوش نویس سے میرے لئے اس کی ایک نقل بھی تیار کرادیں۔“

بابر نے جو ہمیشہ بیٹے کی ہر خواہش بخوشی پوری کر دیا کرتا تھا، اس وقت نفی میں سر ہلادیا اور اس کے ماتھے پر بل بھی پڑ گئے:

”وہ کتاب ابھی مکمل کہاں ہوئی۔ الگ الگ حصوں کی شکل میں ہے اور میں اسے خوش نوییوں کو نہیں دے سکتا۔“

”کب تک مکمل کر لیں گے، والد محترم؟ میں بڑی بے چینی کے ساتھ منتظر رہوں گا۔“

بابر نے اسے معنی خیز نگاہوں سے دیکھا:

”ایسی غلٹ بھی کیا، شہزادے۔ ہاں، یہ جان لیجئے کہ کتاب کے خاتمے کا مطلب ہو گا میری زندگی

کا خاتمہ۔“

”خدا کے لئے یہ نہ فرمائیے، والد محترم!“

”بابر نامہ“ لکھنے کا سلسلہ دراصل رک گیا تھا۔ شاہ اسماعیل سے معاہدہ کرنا، بیرونی لشکر کو اپنے وطن میں بلانا اور اس کے بعد بری طرح ہزیمت اٹھانا۔ یہ سب ایسے واقعات تھے جن کے بارے میں کچھ لکھنا تو کیا سوچنا تک انتہائی اذیت دہ ہوتا تھا۔ لیکن... اس نے سوچا کہ کیا یہی واقعات اس

کی کتاب زندگی کا آخری باب بن کر رہ جائیں گے؟ یہاں کابل میں رہتے ہوئے اپنی سلطنت کے مختلف قبائل سے جنگ یا صلح کرنا اور کابل کے قابل دید مقامات کے بارے میں لکھنا (یہ سب تو وہ کر چکا تھا، کوئٹہ، ہزاروں، دریاؤں، درختوں، پودوں اور جانداروں کے بارے میں تو وہ لکھ چکا تھا) کیا اس کے لئے ناکافی نہیں ہے؟ کیا وہ اپنی زندگی کو یہی ختم ہو جانے دے، چھوٹی چھوٹی، غیر اہم فکروں میں ڈوب کر دھیرے دھیرے بھجھ جانے دے؟ پھر اس کے دل میں خیال آیا کہ اس کتاب کو آگے بڑھانے اور شایان شان طریقے سے ختم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ اور بہت سی شاندار فتوحات حاصل کرے تاکہ شیبانی اور اس کے خاندان کے سلطانوں کے ہاتھوں اپنی شکستوں کے داغوں کو دامن سے دھو سکے۔ اب اس کا بیٹا ہمایوں، اس کا قابل اعتبار حامی و مددگار بڑا ہو رہا ہے۔ تو کیا وہ ایک عظیم الشان، طاقتور اور مکمل طور پر متحد سلطنت کے قیام کے عزیز ترین مقصد کو جسے اپنے مختلف اتحادیوں اور بیگمیں کے ساتھ مل کر نہیں حاصل کر سکا تھا، اب اپنے بیٹے کے ساتھ مل کر حاصل کر لے گا؟

یہ سارے خیالات اس کے ذہن میں گولوں کی جیسی تیزی سے ابھرے لیکن اس نے اپنے بیٹے کو بایوس نہ کرنے کے لئے یہ آواز بلند صرف یہ کہا:

”زندگی کے خاتمے کی جو بات میں نے کہی اس سے آپ پریشان نہ ہوں۔ دراصل میرا مطلب یہ تھا کہ میں ”تربک“ کو آخری دم تک لکھتے رہنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ دلی آرزو ہے کہ اس کے اگلے حصوں میں آپ کے نیک کاموں کے بارے میں بھی لکھنے کا موقع نصیب ہو۔“

”عالی جاہ“ اگر یہ بات ہے تو خدا کرے کہ آپ ”بابر نامے“ کو لکھنے کا سلسلہ مزید پچاس بلکہ سو برسوں تک جاری رکھیں۔“

”تو کیا آپ اتنی طویل مدت تک انتظار کر سکیں گے؟“ بابر کے ہونٹ متبسم ہو گئے۔

ہمایوں نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا:

”خدا گواہ ہے، اس وقت تک انتظار کرتا رہوں گا جب تک کہ قسمت میں جینا لکھا ہے!“

۲

سنگ مرمر کے نیلگوں محل کا نام باغ دل کشا رکھا گیا تھا۔ اسے بابر نے دریائے کابل کے کنارے خان زادہ بیگم کے لئے تعمیر کرایا تھا۔

اس محل کے دیوان خانے میں میر عمارت فضل الدین کچھ یوں اکڑوں بیٹھا ہوا تھا جیسے فراشی سلام کرنے والا ہو۔ پہلو میں اس کا بیٹا گھٹنوں پر ہاتھ رکھے، نظریں جھکائے قالین سے چپکا ہوا سا

بیٹھا تھا۔ اس نوجوان کی مسیں بھیگ رہی تھیں۔

ان دونوں کے سامنے گمرے نیلے لباس میں خان زادہ بیگم بیٹھی ہوئی تھی جس کے چہرے کو سفید ریشمی نقاب نے ڈھک رکھا تھا۔

دیوان خانے میں بڑی پردہ خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ آخر کار اس سکوت کو خان زادہ بیگم نے اپنی دھیمی، شدت جذبات سے رندھی ہوئی آواز سے توڑ دیا۔ اس نے جیسے خود اپنے خیالات کا جواب دیتے ہوئے، جیسے رک جانے والی گفتگو کا سلسلہ جاری کرتے ہوئے کہا:

”سب سے زیادہ خسارے میں بالا خروہ رہتا ہے جو اس دنیا سے اٹھ جاتا ہے، فضل الدین صاحب۔ مرنے والا واپس تو نہیں آسکتا۔۔۔ جو زندہ رہ جاتے ہیں وہ آہیں بھرتے ہیں، آنسو بہاتے اور مغموم و ملول ہوتے ہیں لیکن اس سب کے باوجود خود کو تسلی دے لیتے ہیں، غموں سے سمجھوتا کر لیتے ہیں۔ آپ میری ہی مثال لے لیجئے نا۔۔۔ میں اب بھی زندہ ہوں۔۔۔“

”لیکن بیگم صاحبہ، ہمارے زمانے میں جو زندہ ہیں ان کے لئے بھی زندگی کوئی ہنسی کھیل تھوڑی ہے۔ مجھے اندجان کو چھوڑے ہوئے کوئی تینیس سال ہو چکے ہیں۔ اس دوران مصائب کے کیسے کیسے پہاڑ ٹوٹ چکے ہیں مجھ پر! کیسے کیسے غموں کو جھیل چکے ہم سب!“

خان زادہ بیگم پل بھر کے لئے سب کچھ بھول کر تصور ہی تصور میں اندجان میں گزرے ہوئے اپنے عہد شباب میں پہنچ گئی جو سوچنے میں بہت قریب ہوتے ہوئے بھی بہت دور جا چکا تھا۔ اب تو اس بات کا یقین کرنا بھی دشوار تھا کہ فضل الدین ان دنوں قوی و کلیل جوان تھا۔۔۔ فضل الدین، میر عمارت فضل الدین، جوان بانکا فضل الدین۔۔۔ تیزی سے گزر جانے والے ان تینیس برسوں میں جانے کتنی ہی تکالیف نے اسے اپنا نشانہ بنایا تھا۔ صرف چہرے ہی پر نہیں بلکہ ساری گردن پر بھی جھریاں ہی جھریاں نظر آرہی تھیں۔ ہاتھ سوکھ گئے تھے، ان پر نیس ابھر آئی تھیں اور قامت خمیدہ ہو گئی تھی۔ لگتا تھا کہ اس کی عمر ساٹھ سال سے تجاوز کر چکی ہے حالانکہ خان زادہ بیگم اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ تیرن سال کا ہے۔ ”اور خود میں؟“ خان زادہ بیگم نے اپنی شکل صورت کا جسے وہ آئینے میں ہر روز کئی بار دیکھا کرتی تھی، تصور کرتے ہوئے سوچا۔ چند اگلے دانت گر چکے تھے، لبوں پر پڑمردگی چھا چکی تھی، ڈھیروں بال جھڑ گئے تھے اور جو بچے تھے ان میں سفیدی جھلکنے لگی تھی۔

بہترین سال، شباب اور نسوانی حسن کے عہد زریں کے سال مسلسل مرجھاتے ہوئے بیت گئے، پھول کھلنے سے قبل ہی سوکھ گیا۔ یہ خیال آتے ہی خان زادہ بیگم کی آنکھوں میں دوبارہ آنسو آگئے جنہیں پونچھ کر ان سے پوچھا:

”آپ کے صاحبزادے کتنے سال کے ہو گئے؟“
 ”اکیس سال کے، محترمہ۔“

خان زادہ بیگم کو فوراً ہی یاد آگیا کہ اس کا خرم زندہ ہوتا تو اس وقت بائیس کا ہو گیا ہوتا۔ ناقابلِ برداشت درد سے جو کبھی اس کے دل کا پیچھا ہی نہیں چھوڑتا تھا، ایک بار پھر اس کی آنکھوں سے اشک جاری ہو گئے اور اس نے روتے ہوئے بات جاری رکھی:

”خدا آپ کے فرزند کی عمر دراز کرے۔ خدا آپ کو اس مہم ترین غم سے محفوظ رکھے جو اولاد کی موت سے ہوتا ہے... میں تو اپنے اکلوتے بیٹے کے ساتھ ہی دنیا سے اٹھ جانے کو بے تاب تھی پر لوگوں نے مرنے ہی نہ دیا...“

فضل الدین جانتا تھا کہ وہ خان زادہ بیگم کے بپتے ہوئے آنسوؤں کو کسی بھی طرح روک نہیں سکتا۔ اس نے اپنے بیٹے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا لیکن بیٹے نے آنکھیں جھکا لیں۔ آخر اس نے خان زادہ بیگم کی توجہ اذیت دہ یادوں کی طرف سے کسی طرح ہٹانے کی کوشش میں اپنی تکالیف اور مصائب کا ذکر چھیڑ دیا:

”آپ کو تو معلوم ہی ہے، محترمہ کہ ہرات میں کیسی افرا تفری پھیل گئی تھی۔ پہلے تو شاہ اسماعیل نے شہر پر قبضہ کیا اور قزل باشوں نے لوٹ مار شروع کر دی۔ لیکن زیادہ دن نہیں بیتے تھے کہ حکومت بدل گئی اور اب شیبانی خان کے بٹے اور سپہ سالار انتقام لینے لگے۔ مرو میں قبریں کھود ڈالی گئیں اور وہاں جن قزل باشوں نے شیبانی خان کو ہلاک کر دیا تھا ان کی ہڈیاں توپوں میں بھر بھر کر داغی جانے لگیں۔ لیکن قزل باشوں نے ہرات پر دوبارہ قبضہ کر لیا اور ایک بار پھر انتقام لیا جانے لگا... اب کے شیبانی خاندان کے سلطانوں کے حامیوں سے... چاروں طرف خون کی ندیاں بہہ نکلیں، بربریت کا دور دورہ ہو گیا... کمال الدین ہنزاد کو شاہ اسماعیل کے دربار میں ملازمت اختیار کرنے کے لئے ہرات سے تہمت پر پہنچا دیا گیا۔ مورخ خواند میر آئے دن کے ہنگاموں سے جان بچانے کے لئے شہر سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ سنا ہے کہ وہ دور دراز واقع اپنے آبائی گاؤں کو چلے گئے۔ ہم لوگ سمرقند سے دوبارہ ہرات لوٹ آئے تھے لیکن ہمیں اپنے اس اقدام پر بے حد پچھتانا پڑا۔ ہمارے ہاتھ اپنے پیٹے کے کام کرنے کے لئے ترس رہے تھے پر نہ میر... لئے کوئی کام تھا نہ میرے بیٹے کے لئے... میرا بیٹا علاؤ الدین بہت اچھا سنگ تراش ہے لیکن آج ہرات میں فنون کی ضرورت بھلا کسے ہے؟ آخر میں نے شاعر محمد سلطان سے مشورہ کیا اور مرزا بابر کی سلطنت میں پناہ لینے کے لئے کابل چلا آیا۔“

فضل الدین کی اس درد بھری سرگزشت کو سنتے سنتے خان زادہ بیگم نے اپنے آنسوؤں پر قابو پایا تھا اور وہ کچھ پر سکون ہو گئی تھی۔

”آپ نے بہت اچھا کیا جو یہاں آگئے“ وہ کمری ٹھنڈی سانس بھر کے بولی۔ ”مجھے بھی آپ کی ایک امانت واپس کرنی تھی۔ یاد ہے نا، آپ نے مجھے کچھ سوچنا تھا، سمجھ ہی میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا کروں۔“

فضل الدین نے آنکھیں جھپکائیں:

”امانت کیسی، بیگم صاحبہ؟“

خان زادہ بیگم بڑی اداسی کے ساتھ مسکرائی: بھول گئے، سب کچھ بھول گئے... واقعی سب کچھ فراموش کر دیا؟

”ابھی، بس ابھی دیکھ لیجئے گا۔“ وہ ایک اندرونی چھوٹے دروازے کو کھول کر دیوان خانے سے باہر چلی گئی اور تھوڑی ہی دیر کے بعد لوٹی تو اس کے ساتھ ایک کنیز بھی تھی جو سفید ریشمی کپڑے میں لپٹی ہوئی کوئی چیز ہاتھ میں لئے ہوئے تھی۔ خان زادہ بیگم کے اشارے پر کنیز نے اس چیز کو دونوں ہاتھوں پر رکھ کر فضل الدین کی طرف بڑھا دیا اور خود سر جھکا کر آلے قدموں پیچھے ہٹی ہوئی باہر نکل گئی۔ کم خن علاؤ الدین بھی اپنے والد کے اشارے پر اسے خان زادہ بیگم کے ساتھ اکیلا چھوڑ کر باہر نکل گیا۔

فضل الدین نے کاغذات کو جن کے کنارے زرد پڑ چکے تھے، بڑی احتیاط کے ساتھ کھولا۔ اوہ خدا! یہ تو اسی کے لگائے ہوئے تھمبنے تھے، ان عمارتوں کے نقشے تھے جنہیں اندجان میں تعمیر کرنے کے لئے کسی زمانے میں اس نے، نہیں اس نے اور خان زادہ بیگم نے مل کر تیار کیا تھا۔ فضل الدین کے رگ و پے میں بجلی سی دوڑ گئی، آنکھیں جوش و خروش سے چمک اٹھیں۔ وہ حیران ہو گیا کہ خان زادہ بیگم اتنا سب جھیلنے کے باوجود اس کے کاغذات کو اتنے برسوں تک سنبھال کر رکھے رہی۔ فضل الدین کو وہ اتنی ہی پری پیکر اور دلربا نظر آنے لگی جتنی ان دنوں تھی جب وہ اس پر مرمتا تھا۔ دور دراز ماضی کے وہ مسکور کن لمحات جیسے واپس آگئے جب اوش کے قریب واقع پہاڑی سے جہاں اس نے باہر کے لئے پہلا حجرہ تعمیر کیا تھا، ڈھلوان پتھر لی پگڈنڈی کے ذریعے اترتے وقت خان زادہ بیگم کا پیر پھسل گیا تھا اور اس نے خان زادہ بیگم کو گرنے سے بچانے کے لئے اس کی کمریاموں میں لے لی تھی۔

سب کچھ فضل الدین کی نگاہوں کے سامنے پھر گیا اور اس نے خان زادہ بیگم سے کہا:

”اوہ! آپ نے تو مجھے میرے اس بھولے بسرے زمانے کی روح واپس کر دی! معجزہ ہی معجزہ! جانے کتنے برسوں کے بعد‘ جانے کتنے راستوں کی مسافت کے بعد میرے‘ نہیں ہمارے یہ خواب دوبارہ میاں مل گئے۔“

خان زادہ بیگم بھی اپنے ان ایام شباب کی یادوں سے سرور ہوئے بغیر نہ رہ سکی اور یہ مسرت اس کے لہجے سے جھلکنے لگی:

”بجا فرمایا آپ نے‘ فضل الدین صاحب‘ یہ پوٹلی واقعی میرے ساتھ‘ ساری قیمتی چیزوں کے ساتھ جو زیادہ تو نہیں ہیں پر مجھے بے حد عزیز ہیں نہ جانے کتنی مصیبتوں سے گزر کر یہاں تک پہنچی ہے۔ صرف ایک ہی بار جب کہ ہم لوگ قندز سے سمرقند جا رہے تھے تب... کوہساروں اور دریاؤں کو پار کرنے کی مشکلات کے مد نظر... میں اپنے کچھ صندوق قندز ہی میں چھوڑ گئی تھی اور انہی میں سے ایک میں آپ کے یہ کاغذات بھی رکھے ہوئے تھے۔ سمرقند میں ہر وقت میرا دل ان کاغذات میں لگا رہتا تھا اور اس کے بعد کے اصل موجود نہیں ہے۔ سوچا تھا کہ گرمیوں میں کسی معتبر شخص کو قندز بھیج کر انہیں منگوا لوں گی... لیکن سمرقند میں تو ایک بار پھر ہمارے سر پر آفت نازل ہو گئی... خیر یہ اچھا ہی ہوا کہ میں انہیں قندز میں چھوڑ گئی تھی کیونکہ میرے دو سرے صندوق سازشی بیگیوں کے ہاتھ لگ گئے تھے... بھیڑی ذرا دیکھ لیجئے‘ سارے کاغذات صحیح سلامت ہیں نا؟“

اور اس نے اپنے چہرے سے ریشمی نقاب کو ہٹا کر کاغذات کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

”جی ہاں‘ سب موجود ہیں!“ فضل الدین نے اپنی پیاسی نگاہیں جن سے احسان مندی جھلک رہی تھی‘ خان زادہ بیگم کے چہرے پر جمادیں اور بات کا رخ بدلتے ہوئے کہا: ”سمرقند میں آپ سے ملاقات کرنے کو بہت جی چاہ رہا تھا لیکن آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کی ہمت نہیں کر سکا تھا...“

”میں خود ہی آپ کو بلوانا چاہتی تھی لیکن... آپ کے کاغذات قندز میں رہ گئے تھے... اس لئے فیصلہ نہ کر سکی...“

فضل الدین کا جی جان زادہ بیگم کی اس تصویر کا ذکر چھیڑنے کو چاہا جو اس نے اندجان میں بنائی تھی (اوہ خدا! کیا کیا جھیلنا پڑا تھا اس تصویر کے باعث اس کے مصور کو!) کاغذات میں وہ تصویر نہیں تھی۔

اس نے سب کاغذات کو دوبارہ ایک ایک کر کے دیکھا۔

خان زادہ بیگم سمجھ گئی کہ وہ کیا ڈھونڈ رہا ہے اور شرماتے ہوئے پوچھا:

”اور مصوری کا کیا حال ہے؟ اب بھی تصویریں بناتے ہیں؟“

”بیگم صاحبہ‘ برسوں تک تصویریں نہ بنائی جائیں تو ہاتھوں میں صفائی کیا خاک رہے گی... اب تو

بس عمارت سازی ہی سے دلچسپی رہ گئی ہے، نقشے بنایا کرتا ہوں۔“

”آپ نے اندجان میں جو کچھ بنایا تھا... میرا مطلب عمارتوں سے نہیں ہے... اسے میں نے الگ رکھ چھوڑا ہے“ خان زادہ بیگم نے کہا اور مسکرا کر نظریں پھیر لیں۔

فضل الدین سمجھ گیا کہ وہ اپنے سیانے لڑکے کو بھی ساتھ لایا تھا اس لئے خان زادہ بیگم نے اپنی تصویر کو وہاں لانا مناسب نہیں تصور کیا۔ ویسے بھی عہد شباب کی محبت کی یادوں کو تازہ کرنے میں اب رکھا ہے کیا تھا؟ صرف پرانے زخم ہی ہرے ہو جاتے اور وہ بھی بے سود۔

”آپ نے بجا فرمایا، بیگم صاحبہ... وہ تصویر ہمیشہ آپ ہی کے پاس رہنی چاہئے۔“ اور فضل الدین نے سینے پر ہاتھ رکھ کر سر جھکا لیا۔

پھر اس نے سوچا کہ تعمیرات کے منصوبوں، عمارتوں کے تخمینوں اور نقشوں کی گفتگو ہی بہتر رہے گی۔

”میں اب اس کام کو آگے بڑھانا چاہتا ہوں“ اس نے کاغذات کو دھیرے سے چھوتے ہوئے کہا۔ ”ہرات میں اس فن کے بارے میں جو کچھ سیکھ چکا ہوں اسے ملحوظ رکھتے ہوئے اب ان منصوبوں کو بڑی خوبی کے ساتھ عملی جامہ پہنایا جاسکتا ہے... پر یہ بتائیے، بیگم صاحبہ کے مدرسے اور محل کہاں تعمیر کئے جاسکتے ہیں؟ اندجان تو دور ہے۔ تو پھر کیا کابل میں؟“

خان زادہ بیگم نے چند لمحات کی خاموشی کے بعد نفی میں سر ہلا دیا:

”نہیں، کابل میں بھی یہ ممکن نہ ہو سکے گا۔“

”لیکن میں تو ان نقشوں کی مدد سے ایسا مدرسہ تعمیر کرنے کا خواب دیکھ رہا ہوں جو سمرقند کے بی بی خانم مدرسے کی نگر کا ہو۔ میری دلی خواہش ہے کہ اس مدرسے کا نام آپ کے نام پر رکھا جائے۔“ خان زادہ بیگم مدرسہ!۔

”اس تجویز کے سلسلے میں زندگی بھر آپ کی شکر گزار رہوں گی لیکن صد افسوس کہ ان بیگم کی بات سچ نکلی۔ یاد ہے نا، بیگم نے کہا تھا کہ عظیم الشان عمارتیں تعمیر کرانے کے لئے عظیم الشان سلطنت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ مرزا بابر اپنے اس خواب کو حقیقت بنانے کے لئے برسوں سے جدوجہد کر رہے ہیں... لیکن کابل کی سلطنت زیادہ بڑی نہیں ہے، وسیع پیمانے پر عمارتوں کی تعمیر اس سلطنت کے بس کی بات نہیں۔“

”اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اپنے خوابوں کو پورا کرنا ہماری قسمت ہی میں نہیں لکھا ہے۔“

خان زادہ بیگم جانتی تھی کہ بابر کچھ برسوں سے خراسان،

خان زادہ بیگم جانتی تھی کہ باہر کچھ برسوں سے خراسان بدخشاں اور خاص طور سے شمالی ہندوستان کو ملا کر ایک عظیم الشان سلطنت قائم کرنے کا خفیہ طور پر منصوبہ تیار کر رہا ہے۔ دہلی سلطنت کا شیرازہ بکھر رہا تھا۔ مقامی راجا ایک دوسرے سے عداوت رکھتے تھے۔ ہندو مسلمان حکمران طبقوں کو قبول نہیں کر رہے تھے اور مسلمان حکمران طبقوں نے ہندو مذہب کو نہ تسلیم کر کے ہندوؤں کو اپنا مخالف بنا لیا تھا۔ باہران دنوں حریف کی فوجی طاقت کا اندازہ لگانے کی مہم پر دریائے سندھ کے کنارے واقع علاقوں کو گیا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ کچھ جاسوس بھی لودی حکومت کے بارے میں اسے معلومات فراہم کرتے رہتے تھے۔

”میں تو اب کسی چیز کا خواب دیکھتے ہوئے بھی ڈرتی ہوں“ خان زادہ بیگم نے اعتراف کیا۔ ”میں جانتی ہوں کہ عظیم الشان سلطنت کے قیام کی کوشش کی اور اسی طرح عظیم الشان عمارات کی تعمیر کی بھی کتنی بڑی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ اب میرے لئے اپنے اس دیرینہ خواب کو ٹھکرا دینا آسان ہو گیا ہے کیونکہ میں اپنے برادر عزیز اور اس سلطنت کے مستقبل کو ایک بار پھر خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتی۔“

فضل الدین نے گہری ٹھنڈی سانس لی اور سب کچھ سمجھتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا:

”آپ نے بالکل درست فرمایا، بیگم صاحبہ، خود مقدر ہی ہمارے خوابوں کی مخالفت کر رہا ہے۔ میں بوڑھا ہو چکا ہوں“ اور اس کی آواز میں واقعی بوڑھوں کی آواز جیسی خراہٹ پیدا ہو گئی، ”اور مقدر تمام عمر مجھ سے منہ پھیرتا رہا ہے۔ جنگ و جدل، حکومتوں میں روز روز کا تغیر و تبدل، حملے، تباہیاں اور بربادیاں... کیا یہ سب واقعی ہمیشہ یوں ہی جاری رہے گا؟ ایک بھی کو نہیں جانے کتنے ہی صاحبان علم، شعرا اور ماہرین عمارت سازی کو، مجھ سے کہیں زیادہ تعلیم یافتہ اور باصلاحیت افراد کو ماورائے انہر اور خراسان سے جلا وطن کر دیا گیا ہے۔ ان سب کو اقربا کش جنگوں اور مذہبی جھگڑوں کی آندھیاں خانہ بدوشوں کی طرح آخر کس دیار کو اڑائے لئے جاری ہیں؟ اگلے وقتوں میں ایسا ہوتا تھا کہ مصائب کی کالی آندھی کسی کو اند جان چھوڑنے پر مجبور کرتی تھی تو اسے سمرقند میں پناہ مل جاتی تھی۔ کوئی شخص سمرقند چھوڑنے پر مجبور ہو جاتا تھا تو ہرات جا کر اپنی جان بچا لیتا تھا۔ پر اب تو ان کالی آندھیوں نے ہر جگہ دہشت پھیلارکھی ہے۔ جان نہ سمرقند میں بچ سکتی ہے نہ ہی ہرات میں۔ ہم سب کے سب جلا وطن ہیں جیسے کوئی دریا اپنی راستے کو بھول کے ادھر ادھر بہکنے لگے... یا خدا! کیسے اہل صلاحیت، کیسی کیسی جاں فزاں لہرس ریگ زار حیات میں گم ہوتی جا رہی ہیں، ضائع ہوتی جا رہی ہیں!... کتنے ہیں کہ کسی زمانے میں دریائے جیوں بھی اسی طرح

ریگزاروں میں بھٹکنے اوزدم توڑنے لگا تھا لیکن بالاخر اس نے سمندر تک پہنچنے کا ایک نیا راستہ بنا لیا۔ تو کیا ہم لوگ بھی ایسا ہی کوئی نیا راستہ تلاش کر لیں گے؟... رحم کر پروردگار ہمارے بیٹوں پر۔ نئی نسلوں کو نیا راستہ تلاش کرنے اور سمندر تک پہنچنے میں کامیاب کر، پروردگار!

خان زادہ بیگم کو میر عمارت سے دلی ہمدردی کا احساس ہوا۔ اس نے جو کچھ کہا تھا وہ ایسے شخص کے دل کی فریاد تھی جسے اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے کام لینے کا زندگی میں کبھی بھی موقع نہیں نصیب نہیں ہوا تھا۔

”فضل الدین صاحب، صرف آپ ہی نہیں مرزا بابر بھی اسی نئے سمندر کے متلاشی ہیں تاکہ صلاحیتوں کے سارے دریا آکر اس بحر علوم و فنون میں مل جایا کریں۔“

”میں جانتا ہوں بیگم صاحبہ کہ قسمت نے مرزا بابر پر کیا کیا ستم ڈھائے ہیں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ میرا آخری سارا وہی ہیں... اسی لئے تو یہاں حاضر ہوا ہوں۔“

”لیکن آپ ٹھہرے کہاں ہیں؟“

”کوئی مستقل انتظام تو ابھی تک نہیں ہو سکا، عارضی طور پر اپنے بھانجے طاہر بیگ کے ہاں ٹھہر گیا ہوں۔ ویسے خود طاہران دونوں مرزا بابر کے ساتھ مہم پر گیا ہوا ہے۔“

خان زادہ بیگم سمجھ گئی کہ میر عمارت اور اس کے خاندان کا کوئی کفیل نہیں اسی وجہ سے وہ اتنا مفلوک الحال، اتنا نحیف و لاغر نظر آ رہا ہے جیسے فالے کرتا رہا ہو... اس نے سوچا خدا انخواستہ کہیں واقعی ایسا ہی تو نہیں؟

وہ تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور فضل الدین کو چند لمحات کے لئے تنہا چھوڑ کر جانے پر اظہار معذرت کر کے دیوان خانے سے ملحق کمرے میں چلی گئی۔ وہاں اس نے کنجی لی اور دیوار میں ہوائی خفیہ الماری کو جس پر ریشمی پردہ پڑا ہوا تھا، کھولا۔

بابر نے اپنی بہن کے مصارف کے سلسلے میں سلطنت کے اعلیٰ ترین عہدیداروں کے مشاہرے کی جیسی کثیر رقم دیئے جانے کا حکم دے رکھا تھا۔ شاہی خزانچی ہر ماہ چرمی تھیلی میں ایک ہزار اشرفیاں پہنچا دیا کرتا تھا۔ خان زادہ بیگم کو ایک جاگیر بھی ملی ہوئی تھی لیکن اس کے مصارف کوئی خاص نہ تھے اس لئے ڈھیروں اشرفیاں اسی الماری میں رکھی ہوئی تھیں۔ کچھ تھیلیوں کو تو اس نے چھوا تک نہیں تھا۔

خان زادہ بیگم نے دل ہی دل میں حساب لگایا کہ فضل الدین کو کچھ زمین سمیت مکان، گھوڑا اور بعض دوسری چیزوں کی خریداری اور تین چار ماہ تک جس کے بعد اسے توقع تھی کہ میر عمارت کو

باقاعدہ تنخواہ ملنے لگے گی، اپنے خاندان کی کفالت کے لئے کتنی رقم درکار ہوگی۔ آخر اس نے دو تھیلیاں الماری سے نکال کر کنیز کو آواز دی۔ کنیز ان تھیلیوں کو چاندی کے طشت پر رکھ کر مہمان کے پاس لے آئی۔۔۔

فضل الدین کے لئے خان زادہ بیگم سے رقم لینا خاصا تکلیف دہ تھا لیکن اور کوئی چارہ بھی نہ تھا اور خاص بات یہ تھی کہ مالی امداد خان زادہ بیگم خود اپنی مرضی سے پیش کر رہی تھی۔
 ”یہ دو ہزار اشرفیاں شاہی خزانے کی ہیں۔ مرزا بابر کی عدم موجودگی میں ان کی طرف سے میں آپ کی مناسب تنخواہ ادا کر رہی ہوں۔ ایک تھیلی آپ کے لئے ہے اور دوسری آپ کے صاحبزادے کے لئے۔ مہربانی کر کے قبول فرمائیے۔۔۔“

۳

کابل، موسم خزاں اور آسمان کی رفعتوں پر اڑتے ہوئے سارس۔۔۔
 بابر اور ماہم بیگم نے جو شر سے باہر واقع شاہی بیٹگلے کے برآمدے میں بیٹھے ہوئے تھے، سارسوں کی حلق سے نکلتی ہوئی آوازیں سنیں تو نظریں آسمان پر جمادیں۔ شمال سے جنوب کی جانب محو پرواز ان تیز رفتار پرندوں کا جھنڈ نیلگوں آسمان کے پس منظر میں سیاہ موتیوں کی لڑی جیسا لگ رہا تھا۔
 سارسوں کی نہایت ہی دلکش اور صاف آوازیں کچھ تھکی تھکی سی معلوم ہوئیں۔ وہ بہت دور سے اڑتے ہوئے آرہے تھے۔ بابر نے سوچا شاید یہ سارس ماوراء النہر کے اوپر سے گزرے ہوں یا پھر شاید سیدھے اندجان کے اوپر سے اڑتے ہوئے آرہے ہوں؟ کہیں وہ دم لینے کے لئے سرفتد کے قرب وجوار میں ٹھنڈے پانی کی ندیوں کے کنارے تو نہیں اترے تھے؟
 ان پرواز کرتے ہوئے طائروں نے اس کے وطن کو دیکھا ہے جسے وہ خود اب کبھی بھی نہ دیکھ سکے گا، بابر کے دل نے اس سے کہا۔

سارسوں کی آوازیں بتدریج دھیمی ہوتے ہوئے آخر کار خاموشی میں ڈوب گئیں۔ وطن کی یاد میں دل سے ایک بے صدا آہ نکلی، ہر شے سے زیادہ پر معنی اور متاثر کن آہ۔۔۔

بابر کے چہرے پر ادا سی چھائی۔ اس نے تالی بجا کر خادم کو بلایا اور شراب لانے کا حکم دیا۔
 ماہم بیگم نے کھسک کر خاوند سے کچھ اور قریب ہوتے ہوئے محبت بھرے لہجے میں اعتراض کیا:
 ”عالی جاہ، صبح ہی صبح شراب؟ بچے سلام کرنے کے لئے آنے والے ہیں۔۔۔ وہ دیکھئے، مرزا ہندال اپنے استاد کے ساتھ آرہے ہیں۔“

آٹھ سالہ ہندال کے سر پر چھوٹی سی ریشمی دستار بندی تھی اور خوبصورت پیٹی سے منجھی سے

تکوار لٹک رہی تھی۔ وہ پیڑھیاں ملے کر کے اونچے برآمدے پر پہنچا اور بتوں کی طرح انتہائی ادب سے سینے پر ہاتھ رکھ کر کورٹس بجالایا۔ باہر اسی سے مسکراتا ہوا شہزادے کے پاس گیا، اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر اس جگہ تک لے گیا جہاں وہ لوگ بیٹھے ہوئے تھے اور زری کے گدے پر اپنے قریب ہی بٹھالیا۔

”ارے شہزادے، تکوار کمر سے باندھ رکھی ہے تو کسی مہم پر جانے کا ارادہ ہے کیا؟“
لڑکے نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے ماں پر سوالیہ نگاہیں ڈالیں اور ماہم بیگم نے اثبات میں سر ہلا کر اسے گفتگو میں حصہ لینے کی اجازت دے دی۔
”شاہ عالمی، مہربانی کر کے مجھے اپنے ساتھ میدان جنگ میں لے چلے۔“
”کہاں؟“

”ہندوستان۔“ اور لڑکے کی آنکھیں چمک اٹھیں۔
”ہندوستان میں ہم لوگ کیا کریں گے؟“
”میں شیروں کو دیکھنا چاہتا ہوں۔“
”بہت خوب!“ باہر ہنس پڑا۔ ”آپ دیکھنا چاہتے ہیں؟ صرف دیکھنا ہی چاہتے ہیں؟“
لڑکے کا چہرہ سرخ ہو گیا اور اس نے اپنی ”اصلی“ تکوار کا دستہ مضبوطی سے تھام لیا۔
”جی نہیں! اگر شیر نے مجھے ہڑپ کرنا چاہا تو اس تکوار سے اس کے دو ٹکڑے کر دوں گا!“
باہر نے بڑی محبت سے بیٹے کی پیٹھ ٹھوکی:

”شباباش! اب تو یقیناً ہمیں ہندوستان پر حملہ کرنے کے لئے جانا ہو گا۔۔۔“
اتنے میں خادم شراب کی صراحی لئے ہوئے دروازے میں آن کھڑا ہوا۔ ماہم نے اسے چپکے سے اشارہ کیا گویا کہ کہہ رہی ہو: حکمران باتوں میں لگ کر شراب کو بھول چکے ہیں، واپس جاؤ، اور خادم دبے پاؤں لوٹ گیا۔
باہر نے ہندال سے دریافت کیا کہ اس نے حرفِ حجبی سیکھ لئے کہ نہیں نیز یہ کہ اسے کوئی غزل بھی یاد ہے۔

”میں نے قرآن شریف کی کچھ سورتیں یاد کر لی ہیں“ لڑکے نے فخریہ بتایا۔
”ہندال کی دلچسپیاں ہمایوں کی دلچسپیوں سے مختلف ہیں“ ماہم نے وضاحت کی۔ ”انہیں جنگ کے کھیل اور تیر اندازی پسند ہیں لیکن کتابوں سے رغبت ابھی ذرا کم ہے۔“
”ابھی بہت کم سن ہیں، یہی سبب ہے نا؟“

”کچھ عرض نہیں کر سکتی۔ ویسے گل بدن تو ہندال سے بھی چھوٹی ہیں... لیکن... آپ خود ہی دیکھ لیجئے... انہیں پڑھنے کا شوق ہمایوں سے بھی زیادہ ہے۔“

”تو کیا ہندال واقعی اپنے ماموؤں پر پڑے ہیں؟“ بابر نے کہا اور خیالوں میں ڈوب گیا۔

ماہم بیگم پر بابر کی اس بات کا مغموم فوراً ہی واضح ہو گیا۔ دراصل ہندال کی سگی ماں وہ نہیں بلکہ چھوٹی ملکہ بابر کے چچا سلطان محمود کی دختر دلدار بیگم تھی۔ بابر کی تین بیگمات تھیں جو کابل میں الگ الگ محلوں میں رہتی تھیں۔ ماہم بیگم نے اس حقیقت کو بلاچوں و چرا تسلیم کر لیا تھا لیکن دل سے نہیں لیکن۔ اسے دلی صدمہ بابر کی دوسری شادی سے پہنچا تھا جو کابل کی ایک حسین و جمیل لڑکی گل رخ بیگم سے ہوئی تھی۔ گل رخ بیگم کے بطن سے دو بیٹے پیدا ہوئے: مرزا کامران اب سولہ سال کا تھا اور مرزا عسکری چودہ سال کا۔ ”ہم لوگ خود ہی بھائیوں کے درمیان مستقبل کی عداوت کی بنیاد رکھ رہے ہیں“ ہمایوں کی ماں سوچا کرتی تھی لیکن اس معاملے میں خاموش ہی رہتی تھی۔ قسمت نے ماہم بیگم کا ساتھ نہیں دیا تھا۔ ہمایوں کے بعد دو بیٹیاں اور ایک بیٹا اور پیدا ہوئے تھے لیکن یہ تینوں ایام طفلی ہی میں چل بے تھے اور پھر کوئی بچہ پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔ ماہم بیگم تک گل رخ بیگم کے جیتے ہوئے قترے پہنچتے رہتے تھے۔

بابر کو ماہم کے جو اس کی پہلی اور عزیز ترین بیگم تھی، درد و غم کا احساس رہتا تھا اور وہ اپنی دوسری شادیوں کی بنا پر خود کو اس کے سامنے قصور وار بھی تصور کرتا تھا۔

ایک بار اس نے اسی بیگلے میں ماہم بیگم کے ساتھ رات گزاری تھی تو ماہم نے اچانک یہ تجویز پیش کر دی تھی: ”میں اس غم سے گھلی جا رہی ہوں کہ میرے کوئی بچہ نہیں ہو رہا ہے... اب تو میں آپ کی دوسری بیگمات کے بچوں کی پرورش کرنے کو تیار ہوں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ دلدار بیگم ایک بار پھر امید سے ہیں۔ خدا انہیں بچے کی ولادت کی خوشی نصیب کرے... لیکن میری گزارش ہے کہ فرزند تولد ہو یا دختر، پرورش کے لئے اسے مجھے عنایت کرو دیجئے!“ بابر نے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ یقیناً ایسا ہی کرے گا۔ پھر ہندال پیدا ہوا تھا اور تیسرے دن ہی بابر نے حکم دیا تھا کہ بچے کو ماہم بیگم کے ہاں پہنچا دیا جائے۔ دلدار بیگم جس نے ہندال کو نو مہینے تک پیٹ میں رکھا تھا، پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی، شکایت کرنے لگی تھی کہ اسے اس کے لخت جگر سے محروم کر دیا گیا ہے۔ ”کیا کریں“ ہمارے ہاں کا رواج ہی یہی ہے“ بابر نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔ ”شہنشاہ خاندان میں زمانہ قدیم ہی سے بیٹوں کی پرورش کے لئے بڑی بیگم کے سپرد کیا جاتا رہا ہے۔ ماہم بیگم نے دلی عہد مرزا ہمایوں کو پروان چڑھایا ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ ہندال بھی ہمایوں جیسا ہی ہو گا۔“

تاہم اس وقت یہ دیکھ کر کہ ہندال کی دلچسپیاں مختلف نوعیت کی ہیں، باہر کو خود بخود دلدار بیگم کے والد اور بھائیوں کا خیال آگیا جو شاہی خاندان سے تعلق رکھنے کے باوجود اجڈ قسم کے تھے اور جنہیں علوم و فنون سے خاک بھی لگاؤ نہ تھا۔

ماہم بیگم نے باہر کے اس شک کو بھانپ کر اسے بے بنیاد ثابت کرنے کی کوشش کی:

”ہندال کی رگوں میں بھی آپ ہی کا خون بہہ رہا ہے۔ یہ بھی ہمایوں ہی کی طرح تیز طبع ہیں، طرح طرح کے منصوبے سوچتے رہتے ہیں۔ ہندال کی عمر میں تو خود آپ بھی جیسا کہ میں نے خان زادہ بیگم سے سنا ہے، جنگ کی فکروں والے کھیل پسند کیا کرتے تھے۔“

باہر فس پڑا اور ایک بار پھر بیٹے سے مخاطب ہوا:

”میں آپ کو کتابیں دوں تو انہیں آپ بعد میں پڑھیں گے؟“

ہندال نے غیر یقینی انداز سے جواب دیا:

”... پڑھوں گا۔“

باہر نے میرنشی کو طلب کر کے حکم دیا کہ کتابوں کی فہرست (جو ماہم بیگم کو تیار کرنی تھی) کابل کے کتب خانے کے مہتمم کو بھیج دی جائے۔ ان کتابوں کی نقلیں ہندال کے لئے تیار کی جانی تھیں۔ پھر باہر کے اشارے پر خادم نے اندرونی کمرے سے خوبصورت بیل بوٹوں والی ایک چھوٹی سی کمان اور دس سترے تیر جو تاشقند کے کسی عمدہ کاریگر کے بنائے ہوئے تھے، لا کر ہندال کو دیئے جو خوشی سے پھولے نہ سایا۔

”تیر کمان لیجئے، تیر اندازی کیجئے لیکن کتابوں کا بھی خیال رکھئے“ باہر نے اس کو رخصت کرتے ہوئے کہا۔

ہندال کے جانے کے بعد کوئی ادھیڑ لیکن خاصی دلکش عورت ایک پانچ سالہ لڑکے کے ہاتھ پکڑے ہوئے برآمدے میں آئی۔ عورت کو ریش بجالائی جس کا باہر نے سر کی جنبش سے جواب دیا۔ یہ عورت رابعہ تھی، طاہر کی بیوی جو قتلوغ نگار خانم کے انتقال کے بعد ماہم بیگم کی کینڑوں میں شامل ہو گئی تھی اور گل بدن کی دیکھ بھال کر رہی تھی۔ گل بدن کی پرورش بھی بڑی بیگم کی نگرانی ہی میں ہو رہی تھی۔ طاہر کا اکلوتا بیٹا سفر جو بڑا ہو چکا تھا، مدرسے میں زیر تعلیم تھا جبکہ خود طاہر اب بھی باہر کے نجی محافظین کا دستہ دار تھا۔

گڑیا کی طرح جی ہوئی گل بدن ناک نقشے کے اعتبار سے اپنی ماں دلدار بیگم کی جیتی جاگتی تصویر معلوم ہو رہی تھی۔ دلدار بیٹی کے ماہم بیگم کے سپرد کئے جانے پر ذرا بھی معترض نہیں ہوئی تھی۔

اسے تو خوشی ہی ہوئی تھی کیونکہ دیکھ چکی تھی کہ ماہم بیگم ہندال کا کتنا زیادہ خیال رکھتی ہے اور اسے ماہم بیگم کی ذہانت، شرافت اور ایثار کا بھی یقین ہو چکا تھا۔ اس میں اور بد مزاج اور ضدی گل رخ بیگم میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ بابر کی یہ منجھلی بیگم صرف ماہم بیگم ہی سے نہیں بلکہ دلدار بیگم سے بھی خار کھاتی تھی۔ یہی سبب تھا کہ یہ دونوں گل رخ کے خلاف متحد ہو گئی تھیں۔ پھر ان دونوں کے بچے بھی اب ”مشترک“ ہو گئے تھے اور یہ ایسی صورت حال تھی جو ان کی ”اتحاد“ کو کچھ اور بھی زیادہ مستحکم کرتی جا رہی تھی۔ اس کے علاوہ خود بابر بھی اب گل رخ بیگم سے بے رخی اختیار کرتا جا رہا تھا۔۔۔

معصوم اور دلکش گل بدن جن کے ماحول میں انسانی تعلقات واقعی بے حد الجھے ہوئے تھے، اپنے والد کو متنبہ اور بھونڈے انداز سے کورنش بجالائی۔ بابر نے اسے بڑی محبت کے ساتھ اٹھا کر اپنے گھٹنوں پر بٹھالیا۔ اتنے میں ان لوگوں کے سامنے دسترخوان بچھا کر اس پر تیر کے گوشت کے سج کباب، طرح طرح کے حلوے، طلائی طشتروں میں انگور کے کچے، انار اور باغ دفا (بابر نے آدینہ پور میں واقع اس باغ کا نقشہ خود ہی تیار کیا تھا) میں چنچا ہونے والی نارنگیاں اور لیمو رکھ دیئے گئے۔ بابر نے نارنگیوں اور بادام کے حلوے کی طرف اشارہ کیا جیسے گل بدن سے کہہ رہا ہو: ”لیجئے، بہت ذائقے دار ہیں لیکن لڑکی نے مسکراتے ہوئے انکار کر دیا۔ وہ بابر کی عبا کے سونے کے بٹنوں سے کھیل رہی تھی۔

ہر بٹن کے اوپر کسی جاندار کی شبیہ کندہ تھی۔ ایک بٹن پر یا قوت کی دھکتی ہوئی سرخ آنکھوں والا ننھا سا شیر بنا ہوا تھا اور دوسرے پر کوئی عجیب و غریب طائر جس کی چونچ میں سفید موتی دبا ہوا تھا۔

”آپ کو یہ بٹن پسند ہیں کیا؟“

لڑکی نے اثبات میں سر ہلادیا۔

بابر نے اپنی طاقتور انگلیوں سے اوپر والے بٹن کو عبا سے توڑ لینے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا کیونکہ بٹن بہت مضبوطی سے ٹنکا ہوا تھا۔

”یہ آپ کیا کر رہے ہیں، محترم حکمراں؟“ ماہم بیگم نے اس کے ارادے کو بھانپ کر حیرت کے ساتھ مخالفت کی۔ ”اسے توڑنے کی زحمت نہ کیجئے۔ شاہی عبا بیکار ہو جائے گا۔“

”کوئی قیامت تھوڑی آجائے گی۔ مرصع ساز سے دوسرا بنوا کر ٹانگ دیا جائے گا۔“

بابر نے بیٹی میں لگتے ہوئے چاقو سے جسے وہ قلم بنانے میں استعمال کیا کرتا تھا، دھاگے کاٹ کر



اس بٹن کو نکال لیا جس پر چڑیا بنی ہوئی تھی۔

اس نے یہ بٹن گل بدن کو دیتے ہوئے کہا:

”کہیں اسے کھونہ دیجئے گا۔ اس پر خوش بختی کے پرندے ہاکی تصویر بنی ہوئی ہے۔ خدا آپ کو خوش نصیب بنائے، دختر عزیز!“

لڑکی نے بھونڈے پن سے بدقت کہا:

”شکریہ، اعلیٰ حضرت... بادشاہ سلامت...“

”صرف ابا جان کئے نا۔“

گل بدن نے اجازت مانگنے کے انداز میں مڑ کر ماہم بیگم کی طرف دیکھا۔

”ہاں ہاں، ضرور“ اس کی منہ بولی ماں نے ہمت بڑھائی۔ تب گل بدن نے اپنے والد کی گردن میں

ہاتھ ڈال کر کہا:

”شکریہ، ابا جان!“ اور اس نے بابر کو پیار کر لیا۔

بابر اور ماہم بیگم نے بیٹی کی اس محبت سے متاثر ہو کر نگاہیں چار کیں۔

”اچھا گل بدن، اب اپنے ابا جان کو کوئی حکایت تو سنائیے۔“

گل بدن اپنے والد کی گود سے نکل کر اس کے سامنے کھڑی ہو گئی اور اپنے استاد کی جیسی رعب

دار آواز میں اس گڈریئے کی سبق آموز کہانی سنانے لگی جو جھوٹ موٹ ”بھینڑا آیا! بھینڑا آیا!“ کی

چیخ پکار سے لوگوں کو پریشان کیا کرتا تھا۔ لوگ دوڑے دوڑے اس کی مدد کی لئے پہنچتے تھے تو ان کا

مذاق اڑانے لگتا تھا۔ پھر ایک بار ایسا ہوا کہ بھینڑیوں کو ایک غول چچ اس کے گلے پر ٹوٹ پڑا۔

گڈریئے نے لوگوں کو مدد کے لئے پکارا لیکن اس بار کسی کو بھی یقین نہ آیا اور ”بھینڑیئے اس کی

سامری بھینڑیوں کو چٹ کر گئے“ لڑکی نے پر جوش انداز سے حکایت ختم کی۔

”واہ وا، کتنے مربوط اور پر جوش انداز سے سناتی ہیں!“ بابر نے گل بدن پر نظریں جما کر تعریف

کی۔

”ماشا اللہ بڑی ذہین ہیں، جو کچھ سنایا جاتا ہے اسے یاد کر لیتی ہیں اور لفظ بہ لفظ سنا دیتی ہیں۔

انہیں حکایات شاعری سے زیادہ پسند ہیں۔ خود بھی جو کچھ دیکھتی ہیں اسے بڑے دلکش اور مربوط

انداز سے بیان کر دیتی ہیں۔ کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ ہمارے ہاں شاعرات تو ہیں، ایسی خواتین تو

موجود ہیں جو اشعار تخلیق کر رہی ہیں لیکن آپ کی تزک کی طرح اپنی سرگزشت لکھنے والی خواتین

نہیں ہیں۔ اس میدان میں شاید گل بدن آپ کے نقش قدم پر چلیں، شاید پہل کریں؟“

”اوہ، کیا کیا جھیلنا پڑتا ہے تب کہیں جا کر۔۔۔“ بابر کی نگاہیں اچانک گل بدن پر پڑیں جو اپنے والدین کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ کتنے لہجہ کی، بچوں جیسی کتنی دلچسپی کی آئینہ دار تھیں اس کی بہت کچھ کہتی ہوئی آنکھیں۔ کان کیسے کھڑے کر لئے تھے! بابر نے فوراً اپنی بات کا رخ بدل دیا: ”بیگم صاحبہ، آپ کو گل بدن کی اس صلاحیت کا اندازہ ہو گیا ہے تو آپ کو چاہئے کہ اس کی صلاحیت کے فروغ پر متوجہ ہوں۔ جب تک یہ بڑی ہوں گی اس وقت تک شاید میں تزک کا پہلا حصہ مکمل کر لوں گا اور اس کے کچھ مناسب اجزاء کی نقل ان کے لئے تیار کر لی جائے گی۔“

”میں خود بھی آپ سے یہی عرض کرنا چاہتی تھی!“ ماہم اچانک جوش میں آگئی۔ ”میری دیرینہ آرزو ہے کہ شہزادے ہی نہیں بلکہ شہزادیاں بھی اپنے نام روشن کریں۔“

اوہ، ماہم کے ایثار کا، ان کی نیکی اور شرافت کا کہنا ہی کیا! کسی نے سچ ہی تو کہا ہے کہ حقیقی ماں وہ نہیں ہوتی جو بچے کو پیدا کرتی ہے بلکہ وہ ہوتی ہے جو اسے پروان چڑھاتی اور انسان بناتی ہے۔ ان خیالوں کے ساتھ ہی بابر کے ذہن میں یہ خیال بھی آیا کہ جب انسان کی عمر چالیس سے تجاوز کر جاتی ہے جیسا کہ خود اس کی کرچکی ہے تو اس کی زندگی میں اس کے بچے کتنی زیادہ اہمیت اختیار کر جاتے ہیں۔ بچے باپ سے گمراہ گڈو رکھتے ہوں تو باپ اس سے بڑی مسرت کا تصور تک نہیں کر سکتا!۔۔۔ اور خود اس کی زندگی میں یہ مسرت بھی ماہم ہی کی دین ہے، اس سے ماہم ہی کی بے کراں محبت کا ثبوت ہے۔ ماہم اس سے اس حقیقت کے باوجود شدید محبت کرتی ہے کہ وہ قصور وار ہے، گل رخ اور دلدار کی وجہ سے ماہم کے سامنے قصور وار ہے۔

بابر تیزی سے اٹھ کر ماہم بیگم کے پاس گیا، اسے بڑی گرجو شکی کے ساتھ بھیجنے لیا اور ویسی ہی گرم جوشی سے اس کی آنکھوں کے پوسے لے لے۔

”ماہم بیگم، میں کتنا خوش قسمت ہوں کہ مجھے آپ میسر ہیں! بادشاہ ہوں تو کیا ہوا! آپ کے لئے تو محض غلام ہوں! حکم دیجئے، آپ کی ہر خواہش کی تکمیل کے لئے حاضر ہوں!“

ماہم نے شرماتے ہوئے چپکے سے کہلا

”گل بدن! گل بند دیکھ رہی ہیں!۔۔۔“

”ارے ہاں، گل بدن!“ اور بابر نے زور سے تابی بجا کر خادم کو آواز دی: ”منہی شہزادی کے لئے دو ہندوستانی طوطے لے آؤ!“

خوبصورت شجرے میں بند رنگ برنگے چمکتے ہوئے پروں والے طوطے فوراً ہی گل بدن کی توجہ کا مرکز بن گئے۔ یہ طوطے بولتے بھی تھے۔ ایک نے جلدی سے کرخت آواز میں کہا: ”السلام علیکم،

بیگم! ”گل بدن نے خوش ہو کر جواب دیا:
”وعلیکم السلام!“

شاہ، ملکہ، خادم اور راجہ سبھی ہنس پڑے اور گل بدن نے ایک بار پھر اپنے والد کا رخسار چوم لیا۔

بابر اور ماہم بیگم اکیلے رہ گئے اور جب برآمدے کی میزبھیوں سے اترتے ہوئے افراد کے قدموں کی آوازیں بند ہو گئیں تو وہ دونوں اٹھ کر اندرونی کمروں کی طرف چلے گئے۔

ایک دیوان خانے میں جو سب سے بڑا اور نسبتاً ”کیس زیادہ آراستہ تھا“ شہ نشین پر ایرانی قالین اور قالینوں پر زری کے گدے بچھے ہوئے تھے۔ بابر نے جو ماہم بیگم کی کمر میں ہاتھ ڈالے ہوئے دھیرے دھیرے چل رہا تھا، نیچی اور جذبات سے معمور آوازیں کہا:

”ماہم جان، آپ کی کمر تو آج بھی اتنی ہی پتلی ہے جتنی کہ شادی کے فوراً ہی بعد تھی۔“

”اس کا سبب صرف یہ ہے کہ آپ بھی میری نظروں میں پچیس سال کے نوجوان ہی ہیں۔“

اچانک دونوں کی دھکتی ہوئی نگاہیں پھلو والے کمرے کے دروازے پر ٹھہر گئیں۔ یہ خواب گاہ تھی جہاں گزشتہ سب وہ دونوں ہم آغوش تھے... شعلوں میں جلتے جا رہے تھے۔ ان کے جسم کبھی ایک دوسرے میں ضم ہو جاتے تھے اور کبھی ارتعاش اور تکان کے ساتھ الگ ہو جاتے تھے تاکہ بعد میں دوبارہ پر جوش اور پر مسرت وجود میں تبدیل ہو سکیں۔ انہوں نے محبت کے سوا دنیا کی ہر شے کو فراموش کر دیا تھا۔ ”آپ میرے ہیں، سر تا پا میرے ہیں، صرف میرے! میں آپ کو کسی کو بھی نہ دوں گی!“ ماہم نے رات کے پر مسرت لمحات کے دوران اس سے کہا تھا اور تب بابر نے پہلی بار وہ الفاظ کہے تھے جنہیں اس نے ابھی ابھی دھرایا تھا:

”میں شاہ بابر ہوں لیکن آپ کے سامنے محض غلام، آپ کا غلام...“

ماہم بیگم نے جو اپنی شوخ و شنگ آنکھوں کی بناء پر سیستیس سال کی عورت نہیں بلکہ دوشیزہ جیسی لگ رہی تھی، پوچھا:

”یعنی یہ کہ اس وقت میں آپ سے جو بھی مانگوں گی، مجھے عطا کر دیں گے؟“

بابر نے سوچا کہ آخر ماہم بیگم کیا مانگ سکتی ہیں؟ شاید شہر کے باہر کوئی نیا باغ لگوانے کی فرمائش کریں یا پھر شاید کسی قیمتی چیز کی خریداری کے لئے رقم مانگیں؟

اور اس نے پوری تیاری کے ساتھ کہا:

”جی ہاں، سب کچھ جو میرے بس میں ہے!“

ماہم چند لمحات تک خاموش رہی۔

”میں آپ سے التجا کرتی ہوں، عالی جاہ“ اب اس کی آواز سے شوخی کا نور ہو چکی تھی، ”کہ میرے ہمایوں کو کامل واپس بلا لیجئے۔“

بابر بھی فوراً ہی سنجیدہ ہو گیا:

”کیسے بلا لوں؟ مستقل طور پر؟“

”انہیں ہماری شمالی سرحدوں کی حفاظت کرتے پورے دو سال ہو چکے ہیں۔ ان کی جگہ پر کسی اور کو نہیں بھیجا جاسکتا؟“

”مثلاً کسے؟“ بابر سمجھ گئے کہ منفنگو سنجیدہ رخ اختیار کرنے والی ہے اور محبت کا سارا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔

”مرزا کامران ہی کو بھیج دیجئے نا۔ وہ سولہ سال کے ہو چکے ہیں اور گل رخ بیگم ان پر بہت نازاں رہتی ہیں۔ وہ تو ہر ایک سے کتنی رہتی ہیں کہ ان کے صاحبزادے جواں مرد ہو چکے ہیں۔“

بابر کے چہرے پر اداسی چھا گئی۔ دراصل اسے اپنی بیگمات کے جھگڑوں سے سخت اذیت پہنچتی تھی۔ گل رخ تو ماہم اور دلدار سے کھلم کھلا عدولت پر اتر آتی تھی اور اپنے بچوں کو بھی ان دونوں کے خلاف بھڑکاتی رہتی تھی۔ یہ صورت حال مستقبل کے لئے، خاص طور سے بابر اور اس کی آئندہ منصوبوں کے لئے خطرناک تھی...

”ماہم، آپ گل رخ بیگم کی باتوں کو اہمیت ہی نہ دیا کیجئے۔ مرزا کامران اس اہم ذمے داری پر پورے نہ اتر سکیں گے۔ ویسے بھی میں بڑے بڑے کام صرف مرزا ہمایوں ہی کو، اپنے ولی عہد ہی کو سونپ سکتا ہوں۔“

”گل رخ بیگم خوش قسمت ہیں کہ ان کے دونوں بیٹے ان کے ساتھ کامل میں رہتے ہیں۔ میں تو ایک سال سے ہمایوں کی صورت دیکھنے کو ترس رہی ہوں۔ کتنا فاصلہ حائل ہے میری اور ان کے درمیان، گھوڑے پر پورے دو دنوں کی مسافت۔ اور پھر ان کے علاقے کے ارد گرد شیبانی خان کے خونخوار بیٹے بھی منڈلاتے رہتے ہیں، کسی بھی وقت حملہ آور ہو سکتے ہیں۔ مجھے ہر وقت طرح طرح کے اندیشے گھیرے رہتے ہیں، میری پریشانی کو محسوس کیجئے نا۔“

”آپ کے یہ اندیشے بے بنیاد ہیں، بیگم۔ میں تو آپ سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ مرزا ہمایوں کے پاس تین ہزار منتخب سپاہیوں کا لشکر موجود ہے۔ جہاں تک شیبانی کے بیٹوں کا تعلق ہے تو وہ ان دنوں خود ہی باہمی جھگڑوں میں الجھے ہوئے ہیں اور ان سے ہمارے تعلقات بھی پر امن ہیں... لیکن

آپ کو شہزادے کی یاد اتنی ہی زیادہ ستا رہی ہے تو... تو تین چار ہفتوں میں ان سے ملاقات کر لیجئے گا۔“

”کہاں؟“ ماہم اچانک جوش میں آگئی۔ ”کابل میں؟“
 ”نہیں، آدینہ پور میں۔“

آدینہ پور۔ ماہم بیگم نے سوچا کہ یہ جگہ تو سلطنت کے جنوبی علاقے میں ہندوستان کے قریب واقع ہے۔ اس نے سن رکھا تھا کہ بابر اپنے سارے لشکر کو وہاں لے جانا چاہتا ہے اور صاف ظاہر تھا کہ ہمایوں کے لئے کابل ہو کر جانے کے بجائے اپنی فوج کے ساتھ براہ راست آدینہ پور پہنچنا کہیں زیادہ آسان ہوتا۔

”تو آپ مرزا ہمایوں کو بھی ہندوستان لے جائیں گے؟“

بابر نے جو اپنی اس مہم کو آخر وقت تک راز میں رکھنا چاہتا تھا، غیر شعوری طور پر ادھر ادھر نظرس دوڑائیں اور کان لگا کر آوازوں کو سننے لگا... نہیں، آس پاس کوئی اور موجود نہ تھا... لیکن بابر کی تمام احتیاط کے باوجود اس انتھک حکمران کے نئے منصوبوں کا، مجوزہ لشکر کشی کا جانے کتنے ہی لوگوں کو علم ہو چکا تھا... اس کے ماوراء النہر کو دوبارہ فتح کرنے کے خواب چکنا چور ہو چکے تھے اور اب وہ اپنے مستقبل کو جنوبی علاقے میں سنوارنے کا کوشاں تھا۔ وہ گزشتہ دس برسوں سے اپنے جاسوس یکے بعد دیگرے ہندوستان کی مختلف سلطنتوں میں بھیجتا رہا تھا جنہوں نے وہاں اس کے خیر خواہوں سے روابط قائم کر لئے تھے۔ ان خیر خواہوں کی تعداد خاصی بڑی تھی کیونکہ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں اور ہندو راجاؤں کے ایلچی چھ بار قابل آچکے تھے۔ ان میں سے زیادہ تر دہلی کے سلطان ابراہیم سے تنگ آچکے تھے۔ ابراہیم کے متعلق کہا جاتا تھا کہ اس نے عوام کو مفلوک الحال بنا دیا ہے، ملک کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے ہیں، ہندوستان کی دولت اپنے خزانے میں بھری ہے جہاں وہ بیکار پڑی ہے اور اسے ملک کے حالات کو بہتر بنانے کی خاک بھی فکر نہیں ہے۔ مہیب خانہ جنگیوں نے عظیم ملک کو تباہ و برباد کر دیا تھا اور اب ایک ایسی طاقت کی، ایک ایسے نام کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی جس کے گرد سارا ملک متحد ہو سکے۔ ”یہ نام آپ کا ہے، ظہیر الدین بابر!“ ہندوستان سے آنے والے ایلچی کہتے تھے۔

”ماہم بیگم! یقین کیجئے کہ میں وہاں مال غنیمت کی ہوس میں نہیں جا رہا ہوں۔ میں تو وہاں ایک طاقتور سلطنت قائم کرنا چاہتا ہوں۔ یہ خواب میں زندگی بھر دیکھتا رہا ہوں اور آپ کو اس کا علم ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ علوم و فنون کو جو ماوراء النہر اور خراسان میں زوال کا شکار ہو گئے ہیں، میری

ہندوستان کی سلطنت میں حیات نو نصیب ہو۔ پنجاب کے حکمران دولت خاں نے اپنے بیٹے دلاور خاں کو بھیجا تھا۔ ہندو راجا رانا سنگرام سنگھ کا ایلچی بھی میرے پاس آیا تھا۔ ہمارے درمیان ابراہیم لودی کے خلاف متحدہ طور پر لشکر کشی کا معاہدہ ہو چکا ہے۔“

بابر اب خاندان اور والد کی حیثیت سے نہیں بلکہ مدبر اور حکمران کی حیثیت سے گفتگو کر رہا تھا اور ماہم بیگم نے بھی غیر شعوری طور پر شاہی آداب کو ملحوظ رکھا:

”اعلا حضرت، علوم و فنون اور جنگ کے درمیان تو گہری خلیج حائل ہوتی ہے۔“

”ہم اس خلیج کو پار کر لیں گے!“

”لیکن کتنی یواؤں اور تیبوں کے آنسو بہہ جائیں گے اس خلیج میں؟ جہاں تک میں سمجھ سکی ہوں، یہ مہم توسیع پسندانہ نوعیت کی ہوگی“ (شیبانی کی مسموں کی طرح) ”الفاظ اس کے منہ سے نکلتے نکلتے رہ گئے۔ اس ملک کی ہزاروں مائیں اور بیویاں کیا آپ کو اپنے بیٹوں اور شوہروں کے ہلاک کئے جانے کے سلسلے میں معاف کر سکیں گی؟“

”کیا ان ماؤں اور بیویوں کے ہزاروں بیٹے اور شوہران دونوں وہاں اقریا کشی کی جنگوں میں ہلاک نہیں کئے جا رہے ہیں؟ ابراہیم لودی ہر سال پنجاب کے حکمران سے لڑتا ہے اور پنجاب کا حکمران خود اپنے رشتے دار عالم خاں کو تباہ کرتا رہتا ہے۔ سلطان علاؤ الدین سے اس کے علاوہ خودیہ راجہ بھی ایک دوسرے کی عداوت پر کمر بستہ رہتے ہیں۔ ہندوستان کے حالات تو اس وقت ماورائے النہر کے حالات سے بھی بدتر ہو رہے ہیں۔“ پھر بابر نے یہ دیکھ کر کہ ماہم بیگم اس دلیل سے بھی متاثر نہیں ہوئی، ایک دوسری بات چھیڑ دی: ”وہاں کے بہت سے لوگ بھاگ بھاگ کے پناہ لینے کے لئے ہمارے ہاں آ رہے ہیں، ہمارے ہاں سمجھیں؟ آپ جانتی ہیں کہ ہمارے امرا وروسا میں دہلی سے بھاگ کر آئے ہوئے ہندو بیک بھی شامل ہیں جو گزشتہ پانچ برسوں سے ہمارے ہاں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ نہیں؟ تو ہندو بیک ہی کی بات سنئے نا، بیگم۔ وہ برابر کہتے رہتے ہیں کہ ہندوستان کے عوام نفاق اور اقریا کشی کی لڑائیوں سے نجات پانے کے لئے تڑپ رہے ہیں۔ وہ دہلی کے تخت پر ابراہیم لودھی کے بجائے کسی ایسے تعلیم یافتہ بادشاہ کو دیکھنا چاہتے ہیں جو ملک کو متحد کر سکے، اس کی شان کو دوبالا کر سکے، علوم و فنون کو حیات نو عطا کر سکے۔“

”یہ بادشاہ اگر اسی ملک کا ہوتا تو اس کی تلوار کا زخم جلد ہی بھر جاتا، عوام اس سارے خون خرابے کو جس سے میرے خیال میں بچنا ممکن نہ ہوگا، نسبتاً جلد ہی فراموش کر دیتے۔ لیکن کسی غیر ملکی چہلہ آور کے تلوار کے زخم خواہ وہ حملہ آور کتنا ہی تعلیم یافتہ کیوں نہ ہو، صدیوں تک نہیں

بھرتے، ان زخموں کے لئے اسے صدیوں تک معاف نہیں کیا جاتا۔ کیا یہ درست نہیں ہے، عالی جاہ؟“

ان لفظوں نے بابر کی دکھتی ہوئی رگ کو چھولیا۔ اسی کشکش میں تو وہ رات رات بھر جلا رہتا تھا، دل ہی دل میں موافق اور مخالف دلیلیں دیتا رہتا تھا کہ ہندوستان پر حملہ کرے یا نہ کرے۔ وہ تیزی کے ساتھ گدے پر سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”قسمت کی تلوار کے کبھی نہ بھرنے والے زخم خود ہم نے کچھ کم کھائے ہیں کیا؟!“ اس نے جھلا کر کہا اور اچانک اسے دوبارہ شراب یاد آگئی: ”میں نے تو برآمدے ہی میں شراب طلب کی تھی، ابھی تک کیوں نہیں لائی گئی؟“

اس نے خادم کو بلانے کے لئے بڑی برہی کے ساتھ تالی بجائی لیکن جانے کیوں اس وقت اس پاس کوئی موجود نہ تھا۔ ماہم بیگم جلدی سے کھڑی ہو گئی۔ اس نے پردہ ہٹا کر منقش طاق سے شراب کی لٹائی صراحی، چینی کے چھوٹے چھوٹے دو پیالے اور ایک طشتی جس میں نارنگیاں رکھی ہوئی تھیں، نکال کر انہیں شہ نشیں پر رکھ دیا۔ پھر اس نے بابر سے شہ نشیں پر بیٹھنے کو کہا۔ پیالے میں سنہری شراب اٹھلتے ہوئے ماہم نے مسکرا کر کہا:

”آج میں ساتی کی خدمت انجام دینے کی اجازت چاہتی ہوں۔ قبول فرمائیے، اعلا حضرت! آپ کی زندگی پر مسرت اور دراز ہو۔“

ملکہ کے بڑھائے ہوئے پیالے سے خوشبودار شراب پھلک رہی تھی۔ بابر نے بھانپ لیا کہ ماہم اس سے کچھ پر خلوص الفاظ کی توقع کر رہی ہے لیکن اس قسم کے الفاظ اس وقت اس کے دل سے نکل ہی نہیں رہے تھے۔ اس کے دل میں تو اس وقت جارحانہ خیالات کا بریلا طوفان امنڈ رہا تھا۔ کبھی اس کی نگاہوں کے سامنے ہزارہ قبیلے کے لیئرے گھوم جاتے تھے جو کابل آنے والے قاتلوں کو لوٹ لیا کرتے تھے اور ان پر حملہ کر کے ہی ان کی اس لوٹ مار کا سلسلہ ختم کیا جاسکتا تھا۔ کبھی وہ اپنے ذہن میں ان کاموں کو شمار کرنے لگتا تھا جس کا انجام دیا جانا ضروری تھی تاکہ دس ہزار لشکریوں کی خاطر جاڑے بھر کے لئے کافی رسد اکٹھا کر لی جاتی... کبھی اس کے خیالات اسے پنجاب اور وہاں کی خانہ جنگی کی آگ کی طرف جو روز بہ روز سنگین تر ہوتی جا رہی تھی، کھینچ لے جاتے تھے اور اس کا جی چاہتا تھا کہ جلد از جلد وہاں پہنچ کر نظم و ضبط کو بحال کر دے... اس کے بعد وہ خود اپنی ہی سلطنت کے بے شمار خانہ بدوش قبائل کے درمیان کابل کے مغربی علاقوں میں ہونے والی لڑائیوں کا جو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں، تصور کر کے آزمائش کا سماں اس کی نگاہوں

میں پھر گیا جب تخمینوں میں کوئی نقص رہ جانے کے باعث نالیں پھٹ گئی تھیں اور پانچ توپچی ہلاک ہو گئے تھے۔

آخر کار باہر نے خود کو برف کے اس مہیب طوفان سے بہ دقت نجات دلا کر ماہم بیگم سے اپنی بات چیت کی طرف توجہ مبذول کی اور ذرا سخت لہجے میں کہا:

”طویل پر مسرت زندگی تو میرے لئے ایک ایسے خواب کی حیثیت رکھتی ہے جو کبھی بھی حقیقت نہ بن سکے گا، ماہم۔“

”نہیں نہیں! اللہ ہمارا حامی و ناصر ہو، یہ خواب ضرور حقیقت بن جائے گا!“

”بے گاہ... یقیناً حقیقت بن جائے گا...“

باہر نے پیالہ خالی کر دیا، نارنگی چھیل کر ایک پھانک کھائی اور کہا:

”تھوڑی سی اور عنایت کیجئے، بیگم۔“

دوسرے پیالے کے بعد اسے محسوس ہوا کہ طوفان کہیں دور چلا گیا ہے اور اس کے دل کو کچھ سکون مل گیا۔

”آپ کو معلوم ہے، ماہم کہ میں امور سلطنت سے، ان سارے وزیروں، سپہ سالاروں اور ایلچیوں سے کتنا اوب چکا ہوں؟ کبھی کبھی تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ خود میرا وجود بھی دو حصوں میں منقسم ملک جیسا ہے جہاں بڑی بے رحمی کے ساتھ اقربائش لڑائیاں جاری ہیں۔ اس کے ایک حصے میں بیگ، سفیر اور امرا و روسا اکٹھا ہو گئے ہیں اور یہاں موت کی سزاؤں، چھاپوں اور جنگوں کا بول بالا ہے۔ حکمرانی آدمی سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ سرد مہر اور سنگ دل ہو جائے، دوسروں کے مصائب کی خاک بھی پروا نہ کرے... میں حکمرانی کا عادی ہو چکا ہوں... حکومت کرنے میں مجھے زیادہ سے زیادہ مزا آنے لگا ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ سنگ دل ہو گیا ہوں اور شعر گوئی میرے بس کی بات نہیں رہی۔ شراب مجھے اپنی اس سرد مہری سے نجات دلاتی ہے۔“

”اور دوسرے حصے میں؟“

”دو سرا حصہ بھی ہے... یہ بات گویا کہ آج ہی مجھ پر واضح ہوئی کہ میرے وجود کا دو سرا حصہ بھی ہے۔ اس میں آپ ہیں، ہمایوں، ہندال اور گل بدن ہیں... آپ سب کی قربت میں مجھے زندگی پر حرارت اور پاک و صاف لگتی ہے۔“

”تو پھر آپ اسی حصے میں رہنے ناچس میں ہم لوگ ہیں۔ ہمیں اپنا سب کچھ تسلیم کر کے ہمارے ساتھ ہی رہنے، ہمارے لئے اس سے بڑھ کر پر مسرت بات اور کیا ہو سکتی ہے۔“

”یعنی یہ کہ تخت و تاج کی زسے داریوں کو ٹھکرا دوں، حکومت کسی دوسرے کو سونپ دوں؟“
 ”ٹھکرانے کی کیا ضرورت ہے؟“ ماہم بیگم اس خیال سے متفق نہ ہوئی۔ ”آپ نے یہاں کوئی معمولی سلطنت تھوڑی قائم کی ہے۔ کابل کے قرب و جوار کے علاقوں کو جو ایک دوسرے کی عداوت پر کمر بستہ رہتے تھے، آپ نے قندز سے قندھار اور بدخشاں سے سندھ تک ملا کر ایک کر دیا ہے۔ کابل میں آپ نے کتنے ہی باغات لگوائے ہیں، کارواں سرائیں تعمیر کرائی ہیں۔ نئی نہریں کھدوا کر بنجر زمینوں کی آبپاشی کا انتظام کیا ہے۔ کیا اس سب کے باوجود کابل آپ کو عزیز نہیں ہے؟“

”ہاں، مجھے مقدر کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ کابل میں ابھی تک شکست نہیں کھائی پڑی۔ کابل ہی میں تو مجھے آپ ملیں، ماہم بیگم اور یہیں ہمارے بچے پیدا ہوئے۔ میں نے یہاں جو کچھ حاصل کیا اس پر مطمئن ہونا چاہتا تھا۔۔۔ لیکن دراصل جو کچھ حاصل کیا وہ بہت کم ہے۔ میں اب بھی خود کو مجبور اور بے بس ہی پا رہا ہوں۔ چاروں طرف سرکش خانہ بدوش قبائل موجود ہیں۔ ہماری آمدنی کم ہے، تنگی سے گزر بسر ہو رہی ہے۔ اس پتھریلے ملک میں تعمیرات کا سلسلہ کس طرح شروع کرواؤں، آخر اسے کیسے آراستہ کروں؟۔۔۔ غزنی میں محمود غزنوی کے باندھ کا کچھ حصہ اب بھی برقرار ہے۔ اس کی مرمت کرا دی جائے تو وسیع و عریض دادی میں جو آج ریگستان ہے، کھیت لہلہانے لگیں۔ میں اس باندھ کی مرمت کرانا چاہتا تھا لیکن تخمینہ لگوانے پر پتا چلا کہ میرا حقیر خزانہ اس کے لئے ناکافی ہوگا، ماہم۔۔۔ میں ہنرمندوں کی تنخواہیں کہاں سے ادا کروں گا؟ دینے کے لئے میرے پاس کچھ بھی تو نہیں! شاہ اسماعیل کمال الدین بنزاد کو اپنے ساتھ تہیز بلا لے گئے تھے۔ میں بھی مدعو کروں تو بہت سے صاحبان علم، اچھے سے اچھے معمار اور شاعر بخوشی یہاں آجائیں لیکن میں تو ابھی تک صرف ایک میر عمارت فضل الدین ہی کے لئے کوئی مناسب کام نہیں فراہم کر سکا حالانکہ وہ خود ہی کابل آگئے ہیں۔ ہم غریب ہیں، ہم آج بھی دنیائے اسلام کے ایک کونے ہی میں پڑے ہوئے ہیں، سمجھیں ماہم؟ میں اس سے زیادہ کا مستحق نہیں ہوں کیا؟ میرے لئے کوئی اس سے وسیع ترجگہ نہیں ہو سکتی کیا؟“

”میں جانتی ہوں کہ ہندوستان آپ کے لئے بہت سی باتوں کی بنا پر باعث کشتش ہے۔ لیکن آپ ایک پرانے ملک میں تلوار لے کر جا رہے ہیں۔ آپ اس طرح نہیں جا رہے ہیں جیسے آپ کے ہم وطن، خوارزم کے البیرونی ہندوستان گئے تھے جن کی کتاب ”ہندوستان“ کا آپ مطالعہ بھی کر چکے ہیں۔ آپ اس طرح بھی نہیں جا رہے ہیں جس طرح آپ کے محبوب شاعر امیر خسرو دہلوی کے

بزرگوں نے سمرقند اور شہر سبز کے درمیانی علاقے سے مجبوراً ”ترک سکونت کر کے ہندوستان کا رخ کیا تھا۔“

بابر کو اچانک محسوس ہوا کہ اس کے دل میں ایک بار پھر برف کا طوفان اٹھ گیا ہے۔

”تو کیا ماہم، آپ مجھے ہندوستان پر لشکر کشی سے روکنا چاہتی ہیں؟“

ماہم بیگم یقیناً اس مہم کی مخالف تھی۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اس کے لئے اپنی بات کو منوانا ممکن نہ ہو گا اس کے باوجود اس نے بڑے عزم کے ساتھ اپنی دلیل جاری رکھی:

”میر خسرو کے بہت سے اشعار آپ کو زبانی یاد ہیں۔ آپ نے ان کے اشعار کو اپنے رسالہ عروض میں مثالوں کے طور پر بھی استعمال کیا ہے۔ آپ خود بھی حقیقی اور عظیم شاعر ہیں۔ صاحب علم بھی ہیں۔ میری دلی آرزو ہے کہ آپ عوام کے ذہنوں میں نیک نشانیاں ہی چھوڑیں، البیرونی کی طرح، امیر خسرو کی طرح!“

طوفان زور پکڑنے لگا۔

”اچھا! تو آپ یہ کہنے سے کترا رہی ہیں کہ میں ابھی صرف بادشاہ ہوں“ بابر نے سرد مہری سے کہا۔ ”ہونہ،“ جیسے عوام کسی بادشاہ کو ہمیشہ نیک الفاظ ہی سے تو یاد کرتے ہوں۔ ارے بیگم صاحبہ! ایسا کہاں ہوتا ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے تو میں اپنی بے شمار تعریفیں بھی سن چکا ہوں اور بے شمار برائیاں بھی! میں اس سب سے بلند ہو چکا ہوں۔ اب نہ تعریفوں کی پروا کرتا ہوں اور نہ ہی برائیوں کی۔“

ماہم کو یاد آگیا کہ بابر اپنے ایک شعر میں بھی اسی خیال کا اظہار کر چکا ہے۔ وہ اس خیال سے متفق نہیں تھی۔ وہ جانتی تھی کہ خود بابر بھی ہمیشہ ایسا نہیں سوچتا ہے تاہم اس خیال میں بابر کی روح اور اس کی سچائی کا ایک جزو مضمر ہے اور وہ اس وقت اسی میں یقین رکھتا ہے اور ماہم نے محسوس کیا کہ وہ بابر کے اس یقین کو اس وقت کسی بھی طرح بدل نہیں سکتی ہے۔ ذرا دیر قبل تک وہ اپنے آپ سے کہہ سکتی تھی: ”وہ میرے ہیں، صرف میرے ہیں!“ لیکن اب نہیں۔ اب تو اس کے سامنے اس کا غلام نہیں بلکہ پر عزم بادشاہ بیٹھا ہوا تھا۔

”شاہ عالی، تب آپ سے میری التجا ہے کہ مرزا ہمایوں کو کابل میں چھوڑتے جائیے۔ آپ کی مہم کے دوران آخر کسی نہ کسی کو تو یہاں فرماں روائی کرنی ہی ہوگی نا؟“

”فرماں روائی آپ کیجئے گا، ماہم بیگم!“

”میں؟ میں تو عورت ہوں۔ شرعاً“ شہزادوں کو بیگمات کی بہ نسبت زیادہ حقوق حاصل ہیں۔ مرزا

ہمایوں آپ کے ساتھ چلے جائیں گے۔ مرزا کا مران اور مرزا عسکری یہاں رہیں گے اور ظاہر ہے کہ قانوناً انہیں مجھ سے زیادہ حقوق حاصل ہوں گے۔“

بابر نے فوراً ہی ٹھنڈے دل سے فیصلہ کیا:

”مرزا کا مران کو میں قندھار کا صوبیدار بنادوں گا۔ وہ اپنے ساتھ مرزا عسکری کو بھی لے جائیں گے۔ یہاں امور سلطنت کی دیکھ بھال میں سن رسیدہ قاسم بیگ آپ کے معاون ہوں گے۔“

یہ مکمل اعتماد کا مظاہرہ تھا۔ یہ دور اندیشی بھی تھی کیونکہ ماہم بیگم اتنی بلندیوں پر پہنچ جانے کے بعد گل سرخ بیگم کی سازشوں کی رسائی سے باہر ہو جاتی۔ وہ اتنے اعتبار و اعتماد کے بعد بابر سے مزید بحث بھلا کیسے کر سکتی تھی۔

”عالی جاہ نے تو اپنے بے پایاں اعتبار سے اس ناچیز کو آسمان پر چڑھا دیا لیکن آپ جانتے ہی ہیں کہ مجھے فرماں روائی کی ہوس نہیں۔“

”عنان حکومت سوچنی ہی اسی کو جانی چاہئے جسے فرماں روائی کی ہوس نہ ہو۔ کابل سلطنت کے قبائل سے تعلقات اور اندرونی معاملات سے قاسم بیگ نہیں گے۔ لیکن وہ صرف احکام کی تعمیل کریں گے اور احکام آپ صادر کریں گی۔ آپ مرزا ہندال کی سرپرست ہوں گی، ان کے نام سے احکام جاری کریں گی اور یہ شریعت کے مطابق ہی ہوگا۔“

ماہم بیگم بادشاہ کی قائم مقامی کی آرزو نہیں رکھتی تھی تاہم اسے بابر کے اس فیصلے سے خوشی ہوئی۔ اس نے سوچا کہ مرزا کا مران کو بھی خوشی ہوگی کہ ان کے والد نے ان پر اعتبار کرتے ہوئے قندھار کی صوبیداری سونپنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس کے دل میں یہ خیال بھی آیا کہ واقعی میرے سر تاج لوگوں کی اندرونی قوت عمل اور کسی معاملے میں ان کی دلچسپی کو بیدار کرنے میں طاق ہیں اور اگر لوگوں کی دلچسپی میرے خاوند کے تختیوں اور منصوبوں کے مطابق ثابت ہوتی ہے تو ان کی تخمینوں، منصوبوں اور خیالات کو عملی جامہ پہنانے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

سیاست ماہم بیگم کو بساط شطرنج پر مہوں کی چالوں جیسی معلوم ہوئی۔ گزشتہ برسوں میں بابر اپنے بیگوں اور عہدیداروں کو قابو میں رکھنے کے فن پر کافی عبور حاصل کر چکا تھا۔ دراصل ان لوگوں کی اندرونی قوت عمل کو سمجھ لینے کے بعد ان پر پوری طرح قابو رکھنا اس کے لئے بہت آسان ہو گیا تھا۔ اس وقت اس نے اپنی منظور نظر بیگم کی مخفی قوت عمل کا بھی اندازہ لگا لیا تھا۔ بابر نے اس پر مکمل طور سے اعتبار کیا تھا، اسے اس کی سوت پر برتری عطا کی تھی تو کیا وہ خود اپنی نگاہوں میں بھی برتر نہیں ہو گئی تھی؟

لیکن چند لمحوں کے بعد ہی ماہم بیگم کو ایک بار پھر اپنے بیٹے کی فکر لاحق ہو گئی:

”محترم حکمران! میں آپ کو اور مرزا ہمایوں کو دنیا کی ہر شے سے زیادہ اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتی ہوں۔ آپ نے ایسے پر خطر مہم کا بیڑا اٹھایا ہے کہ... اس کی تصویر ہی سے میرے روتگٹے کھڑے ہوئے جارہے ہیں۔ سپہ سالار کی حیثیت سے آپ کا کوئی جواب نہیں پھر بھی ہندوستان کا تو مطلب ہے بے شمار افراد!... بے شمار لشکری! سمندر! ماورالنہر میں ہی سلطنت کی بقا کے لئے خون کی ندیاں بہ گئی تھیں اور ہندوستان میں تو...“

ماہم بیگم یہ بھی کہنا چاہتی تھی: ”کیس وہ سمندر آپ کو نگل نہ لے“ لیکن ہمت نہ پڑی تو خاموش ہو گئی۔

بابر بھی اس سمندر سے خائف رہتا تھا، اس کے تصور نے بابر کی راتوں کی نیندیں حرام کر رکھی تھیں۔

”جنگیں ہوتی ہیں تو خون بہتا ہی ہے“ اس نے پر عزم لہجے میں کہا۔ ”اس حقیقت سے آپ بخوبی واقف ہیں۔ آخر آج آپ کو ہوا کیا ہے، بیگم؟“

”میں خائف ہوں، مرزا ہمایوں کی وجہ سے فکر مند ہوں۔ آپ سے ایک بار پھر التماس ہے کہ انہیں کابل ہی میں رہنے دیجئے۔“

ہونہ، عورت عورت ہی رہتی ہے، بابر نے سوچا۔ بیگم سوچ رہی ہیں کہ اگر خاوند جنگ میں کام آجائے تو کم از کم بیٹا ہی زندہ و سلامت رہے۔

”مرزا ہمایوں دلی عہد ہیں!“ بابر جھلا کر چیخ اٹھا۔ ”انہیں لشکر کے ساتھ رہنا چاہئے... آپ نے یہ کیوں فراموش کر دیا کہ صدیوں سے یوں ہی ہوتا رہا ہے؟“

شہنشاہی خاندانوں کی قدیم روایات کی بموجب کسی فرماں روا کے میدان جنگ میں ہلاک کر دیئے جانے پر اس کے وارث کو فوج کی کمان سنبھالنی ہوتی تھی۔ ایسا نہ ہونے کی صورت میں یہ امکان رہتا تھا کہ کوئی دوسرا شخص تخت و تاج کا دعویدار ہو جائے اور فوج اس شخص کی طرفدار بن جائے۔ بابر نے ماہم بیگم کی توجہ انہی شہنشاہی روایات کی طرف مبذول کرائی تھی۔ تاہم اس نے بات کو واضح طور پر کہنے کے بجائے صرف اشارہ ہی کر دیا: ”اگر میری قسمت میں موت ہی لکھی ہے تو مرزا ہمایوں کو میری جگہ لینی ہوگی اسی لئے انہیں اپنے ساتھ لئے جا رہا ہوں۔“

ماہم بیگم سمجھ گئی اور اس کا دل کچھ اور بھی مغموم ہو گیا۔ اس نے ہندوستان کو اچانک ایک ایسا ملک تصور کیا جہاں سے کوئی واپس نہ لوٹتا ہو۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

”پرودگار، تیری یہ دنیا اتنی بے رحم کیوں ہے؟“
بابر خاموش رہا۔

نئے کنارے۔ لاہور، پانی پت، دہلی

۱

لشکر جیسے جیسے آگے بڑھتا جا رہا تھا ویسے ویسے جنگل کچھ اور بھی زیادہ گھنے ہوتے جا رہے تھے۔
برگد کے اونچے اونچے اشجار کی پختی شاخوں سے پھوٹنے والی جڑیں نیچے آکر زمین میں سما گئی تھیں۔ کہیں کہیں موٹی موٹی جنگلی بیلوں نے درختوں کے تنوں سے لپٹ کر ان کے درمیان خاردار جھاڑیوں کی اونچی اونچی دیواریں سی کھڑی کر رکھی تھیں جنہیں پار نہیں کیا جاسکتا تھا۔ پیروں تلے کسی قسم کی ریختی ہوئی سی گھاس اور جھاڑیوں نے زمین کو پوری طرح ڈھک رکھا تھا۔
فضا میں کچھ اتنی گھٹن اور نمی تھی کہ سانس لینے میں سخت دقت ہو رہی تھی، سرچکرائے جا رہے تھے۔

بابر صرف ہلکا ریٹھی کرتا پینے ہوئے تھا کیونکہ زرہ اس کے لئے بھی بار ثابت ہو رہی تھی اور اس کے گھوڑے کے لئے بھی اس کے باوجود وہ پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ اس نے برگد کے بلند اشجار کی پھنگیوں پر نظر دوڑائی۔ ہوائیں پھنگیوں کو ہلارہی تھیں لیکن نیچے گھنی گھنی جھاڑیوں کے اندر ان کا گزر نہیں ہو پا رہا تھا۔ بابر کا سرری طرح چکرا رہا تھا، اسے لگ رہا تھا جیسے کوئی غیر مرئی طاقت اس کے گھوڑے کو کبھی ایک طرف، کبھی دوسری طرف لئے جا رہی ہے۔

کہیں شاخوں پر بندرہ رہ کر چیخ رہے تھے۔ کبھی کبھی موروں کی ناخوشگوار اور کرخت آوازیں بھی فضاؤں میں گونج اٹھتی تھیں۔

اچانک ایک سپاہی جو اونٹوں کو گھنی جھاڑیوں سے نکال کر لے جا رہا تھا، چیخ اٹھا۔
”کیا ہوا؟“

”سانپ نے ڈس لیا!“

”ارے ناگ ہے، ناگ!۔۔۔“

فوجیوں اور ان کے گھوڑوں کو سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا اور لگتا تھا کہ ان اراہوں کو بھی گھینے میں دشواری پیش آرہی ہے جن پر بھاری توپیں لدی ہوئی تھیں۔

”آخر کار اس کی نیت کیوں بگڑ گئی؟“ باہر نے پرسکون رہنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔ ”اس نے تو خود ہی اپنے بیٹے دلاور خاں کو ہمارے پاس کابل بھیجا تھا جس سے بات چیت میں سارے معاملات طے پا گئے تھے..... میں دولت خاں کی عزت محض اس کے سفید بالوں کی بنا پر کرتا تھا۔“

”دولت خاں کو یہ سب اب کہاں یاد رہا۔ اب تو وہ کمر میں دو تلواریں باندھتا ہے۔ اس کا مطلب اس نے خود ہی مجھے بتایا تھا: ایک تلوار سے سلطان ابراہیم کو سبق سکھانا چاہتا ہے اور دوسری سے آپ کو۔“

”اس کا بیٹا بھی عداوت پر اتر آیا؟“

”جی نہیں۔ دلاور خاں ہمارا خیر خواہ ہے۔ اس نے معاہدہ کو فراموش نہیں کیا اور جنگ کے بغیر ہی لاہور کو ہمارے حوالے کر کے اپنی وفاداری کا ثبوت بھی پیش کرنا چاہتا ہے۔ اسی نے تو مجھے موت سے بچایا، آگاہ کر دیا کہ اس کا باپ میرے قتل کا منصوبہ بنا رہا ہے... بڑا بیٹا غازی خاں البتہ اپنے باپ کا طرفدار ہے۔“

”اور عالم خاں؟“

”عالم خاں تو دہلی کے سلطان سے بری طرح سہا ہوا ہے۔ ایک بار شکست کھانے کے بعد ابراہیم سے دوبارہ ٹکر لینے کی ہمت نہیں رہی۔ ویسے جب آپ لاہور پہنچیں گے تو میرا خیال ہے کہ عالم خاں اظہار وفاداری کے لئے آپ کے پاس آئے گا۔ دراصل ہمارے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ غازی خاں ہی ہے۔ وہ تو بیگوں پر اپنے باپ سے بھی زیادہ اثر رکھتا ہے۔ اسے شکست دے دیں گے تو سب بیگ ہمارے حامی ہو جائیں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جنگ کے بغیر ہی لاہور پر آپ کا قبضہ ہو جائے گا... لیکن لاہور پہنچنے کے لئے آپ نے اتنا خراب راستہ کیوں منتخب کیا؟“

”راستہ تو ہمیں لاہور کے احباب کا بھیجا ہوا ایک آدمی دکھا رہا ہے۔“

”وہ آدمی ہے کہاں؟ مجھے اس سے کچھ اگلوانے کی اجازت دیجئے۔“

راستہ بتانے والے کو ایک بار پھر طلب کیا گیا۔

لال چند متعدد زبانیں جاننے والے ہندو بیگ کی اجازت سے اپنے ہاتھی پر ہی بیٹھا رہا۔ اس نے ہندو بیگ کو ہاتھ جوڑ کر سلام کیا۔ ہندو بیگ نے بھی ہندوؤں کے اسی انداز سے سلام کا جواب دیا پھر اپنے گھوڑے کی کاٹھی پر بیٹھے بیٹھے سینہ تان کر ہندوستانی میں پوچھا:

”کہاں کے رہنے والے ہو؟“

”آگرے کا“ صاحب۔“

”یہاں پنجاب میں کیسے آتا ہوا؟“

”کام کی تلاش میں... پیٹ تو کسی طرح بھرتا ہی ہے۔“

”ایسے ہاتھی کے مالک ہو پھر بھی تمہیں ابراہیم لودی کے ہاں کام نہ مل سکا؟“

”ابراہیم لودی تو صاحب بے حد کجوس بادشاہ ہے۔ اس نے سارا سونا سمیٹ کر اپنے خزانے

میں بند کر رکھا ہے، کچھ خرچ ہی نہیں کرنا چاہتا۔ ہم سب مایوس ہو چکے ہیں اس سے...“

”سچ کہہ رہے ہو، بالکل سچ“ ہندو بیگ بے اختیار کہہ اٹھا۔

”میں خود ہی انہی لودیوں کے مظالم سے تنگ آکر بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ ابراہیم کے باپ سکندر نے

میرے والد پر نافرمانی کا الزام لگایا تھا۔ انہیں پھرے ہوئے ہاتھی کے سامنے پھینک دیا گیا تھا جس

نے روند ڈالا۔“

لال چند کے چہرے پر ہندو بیگ کے سلسلے میں ہمدردی کے جذبات چھا گئے اور اس نے پوچھا:

”آپ کھتری ہیں؟“

”ہاں، میرا اصلی نام اندر ہے۔ بادشاہ نے مجھے ہندو بیگ کہنا شروع کر دیا تھا۔ یہ نام سب کو اچھا

لگا... اور مجھے بھی... تمہارا کیا نام ہے؟“

”لال چند۔“

”اچھا تو لال چند، تمہارے خیال میں لودی کے مظالم سے ہمیں کون نجات دلا سکتا ہے؟“

”بھگوان۔“

”اس کا کوئی بندہ نہیں دلا سکتا؟“

لال چند سوچ میں پڑ گیا۔

”اور دولت خان؟“ ہندو بیگ نے سمجھایا۔

”دولت خان بڑا دریا دل ہے... غازی خاں بہر حال ابراہیم سے اچھا ہے۔“

ہندو بیگ نے نیچی آواز سے پوچھا:

”اچھا سچ بتاؤ، تم نے شاہی فوج کے لئے یہ راستہ کیوں منتخب کیا؟“

”غازی خاں نے یہ حکم دیا تھا۔“

”لیکن غازی خاں نے لشکر کو اتنے زیادہ دشوار راستے سے لانے کو کیوں کہا تھا؟“

”لشکر کے لئے یہی بہترین راستہ ہے۔ ضروری راستہ!“

”آخر ان لوگوں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟“

اتنے میں استاد علی قل جو کچھ سے لت پت گھوڑے پر سوار تھا، باہر کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ اس کی آنکھوں سے خوف جھلک رہا تھا۔

”عالی جاہ، ان جنگلوں سے بھاری توپوں کو نکال لے جانا ہمارے بس کی بات نہیں رہی۔ ایک جگہ دلدل میں سارے ارابے بھنس کر رہ گئے ہیں۔“

باہر نے مڑ کر اپنے پیچھے موجود طاہر سے کہا:

”ارے بیگ، ذرا راستہ بتانے والے کو تو بلائے۔“

راستہ بتانے والا لال چند لشکر کے آگے آگے ہاتھی پر چل رہا تھا۔ وہ ہاتھی پر بیٹھے بیٹھے ہی وہاں آہٹا کیونکہ طاہر نے اس سے کہا تھا کہ اس طرح جلدی پہنچ جائے گا۔ ہاتھی کو دیکھ کر باہر کا کیت گھوڑا کچھ بھڑک کر پھینکانے لگا لیکن لال چند نے ہاتھی کو باہر سے کچھ فاصلے ہی پر روک لیا۔ پھر اس کی ہدایت پر ہاتھی نے سوئٹ بند کی اور وہ سوئٹ کے سہارے نیچے اتر آیا۔ لال چند نے ہاتھوں کو جوڑ کر باہر کے آگے تعظیماً ”اپنا سر جھکا لیا۔ باہر نے اس سے فارسی میں کہا:

”یہ راستہ ہماری لئے موزوں نہیں ہے، کسی دوسرے راستے سے لے چلو۔“

”عظیم شاہ، ہم پنجاب کے علاقے میں ہیں۔ یہاں کے پانچوں دریاؤں میں طغیانی آئی ہوئی ہے۔ دوسرے سب راستوں پر پانی بھر گیا ہے۔“

”ہمیں معلوم ہے کہ پنجاب میں اور بھی بہت سے راستے ہیں۔ ایسے راستے بھی ہیں جن سے ارابے گزر سکتے ہیں۔ یہاں تو ہمارے سارے ارابے دلدل میں بھنس گئے ہیں۔ ہم لوگ راستے سے ہٹک گئے ہیں کیا؟“

”نہیں، ہٹکے نہیں ہیں، شاہ عالی! ارابے کس جگہ بھنس گئے ہیں؟ آپ کا حکم ہو تو میرا ہاتھی انہیں کھینچ کر باہر نکال دے۔ ہمیں سفر جاری رکھنا چاہئے، ٹھہرنا ٹھیک نہیں۔ آج مسافت جاری رہے گی تو کل اچھے راستے پر پہنچ جائیں گے۔ لاہور یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔“

”ہاتھی لے کر جائیں اور ارابوں کو باہر نکلو ایسے۔“ باہر نے استاد علی قل سے کہا جس نے بادشاہ کے سامنے تعظیماً اپنے سر کو خم کر لیا۔ لال چند بے حد دلا پٹلا تھا۔ وہ اپنے بھاری بھر کم ہاتھی کی مدد سے فوراً ہی اس کی گردن پر سوار ہو گیا اور ”ٹھکریاں مارتا، ایڑیں لگاتا اور کبھی کبھی اکش کو چبھوتا ہوا استاد علی قل کے پیچھے پیچھے ارابوں کی طرف لے گیا۔

ہاتھی نے ارابوں کو بہ آسانی کھینچ کھینچ کر کچھ سے باہر نکال لیا۔

ایک ارابے پر وہ سپاہی لیٹا ہوا کراہ رہا تھا جسے ناگ نے ڈس لیا تھا۔ اس کا جسم نیلا پڑ گیا تھا اور

بچنے کا امکان نہ ہونے کے برابر ہی تھا پھر بھی اس کے ساتھیوں نے پیر میں اس جگہ جہاں سانپ نے کاٹا تھا، کوئی بوٹی پس کر لگا دی تھی اور اس جگہ سے کچھ اوپر کس کے رسی باندھ دی تھی تاکہ دوران خون رک جائے اور زہر سارے جسم میں نہ پھیل سکے۔

توپوں والے ارابے ایک بار پھر آگے بڑھنے لگے۔ سپاہی کھنی جھاڑیوں میں بہ دقت راستہ بتاتے ہوئے دوبارہ گامزن ہو گئے۔ لال چند کا ہاتھی آگے آگے چل رہا تھا۔

لشکر دھیرے دھیرے کافی دیر تک چلتا رہا۔ فضا کی امس اور ٹھن میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا۔ سانس لینے میں کچھ اور بھی زیادہ دقت محسوس ہو رہی تھی۔

دوپہر کے بعد ہندوبیک اپنے مسلح سپاہیوں کے ساتھ دریائے راوی کے کنارے پر لشکر سے آن

ملا۔

ہندوبیک دہلی کے ممتاز لوگوں میں سے تھا۔ وہ ابراہیم لودی سے اپنے اختلافات کی بنا پر سات سال قبل کابل آکر بابر کے دربار سے وابستہ ہو گیا تھا۔ اس کی عمر چالیس سے تجاوز کر چکی تھی لیکن اب بھی بہت شجاع تھا اور بابر اس کی دلیری اور شجاعت کا ہندوستان پر اپنی گزشتہ آزمائشی مہم کے دوران قائل ہو چکا تھا۔ بابر ہندوبیک کی قدر صرف اس کی دلیری کی بنا پر ہی نہیں بلکہ اس وجہ سے بھی کرتا تھا کہ ہندوبیک اپنے ملک میں ففاق و عداوت کے ماحول کو ختم کرنے کا متہمی تھا اور چاہتا تھا کہ یہ مقصد فضول خون خرابے کے بغیر ہی حاصل ہو جائے وہ ترکی اور فارسی زبانوں پر عبور رکھتا تھا، مطالعہ بھی خاصا وسیع تھا اسی لئے ان بیگوں میں شمار ہوتا تھا جن سے بے تکلف گفتگو بابر کے لئے باعث مسرت ہوتی تھی۔ بابر کی گزشتہ مہم کے دوران ہندوبیک کے دانش مندانہ مذاکرات کی بدولت ہی دریائے جہلم کے کنارے واقع شہر بھیرا نے جنگ کے بغیر ہی شاہ کابل کی اطاعت قبول کر لی تھی۔ اس کے بعد ہندوبیک کو اس خوش حال علاقے کا صوبیدار بنا دیا گیا تھا۔ اب بابر چاہتا تھا کہ اسی طرح پر امن طریقے سے لاہور پر بھی اس کا قبضہ ہو جائے۔ ہندوبیک اس سلسلے میں لاہور کے امیر دولت خاں سے بات چیت کر رہا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ امیر بابر کی اطاعت قبول کر لینے کی طرف مائل ہے۔

بابر نے ہندوبیک کو دور ہی سے پہچان لیا اور اپنے گھوڑے کو ایک طرف ہٹا کر سپاہیوں کو آگے بڑھ جانے دیا کیونکہ وہ ہندوبیک سے تنہائی میں بات چیت کرنا چاہتا تھا۔

”محترم حکمران، دولت خاں کی نیت لگتا ہے کہ بگڑ گئی“ ہندوبیک نے فوراً ہی بتایا۔ ”وہ تو مجھے قتل کر دینا چاہتا تھا، خیریت ہوئی کہ میں بھاگ نکلا۔“

”ہمارے لے ابراہیم لودی کچھ کم ہے کیا جو ایک اور ظالم آدمہ کا؟ وہ بھی غیر ملکی!“
 ”تمہاری خاں نے تمہیں فریب دیا ہے۔“

اچانک لال چند ہاتھی کو گھنی جھاڑیوں کی طرف بڑھاتے ہوئے چلایا:
 ”یہ غیر ملکی حملہ آور جلا دیں جلا دیں! انہوں نے باجوہ قلعے میں ہمارے تین ہزار سپاہیوں کو موت
 کے گھاٹ اتار دیا تھا! شر اور گاؤں سب لوٹ لئے تھے!“ یہ کہتے ہوئے اس نے ہاتھی کو گھنے جنگل
 میں داخل کر دیا۔۔۔

”عالی جاہ، حکم دیجئے کہ اس آدمی کو گرفتار کر لیا جائے۔ اسے دشمنوں نے بھیجا تھا۔ یہ آپ کے
 لشکر کو جان بوجھ کر غلط اور پر خطر راستے سے لے جا رہا تھا۔۔۔“
 ”پکڑ لو!“ بابر غصے سے چلایا۔ ”جانے نہ پائے! فوراً گرفتار کر لو!“

کچھ سپاہی گھوڑے دوڑاتے ہوئے لپکے اور ان میں سے تین نے ہاتھی کے آگے پہنچ کر اس کا
 راستہ روکنے کی کوشش کی۔ اتنے میں لال چند نے جلدی جلدی انکس گڑاتے ہوئے ہاتھی کو
 سواروں کی طرف موڑ کر کچھ ہدایات دیں اور دوسرے ہی لمحے ہاتھی نے سوئٹ سے حملہ کر کے تین
 میں سے دو سواروں کو زمین پر ڈھیر کر دیا یہ دیکھ کر سب ہکا بکا رہ گئے۔ تیسرے سوار نے اپنے
 گھوڑے کو روکا اور تیزی سے پیچھے ہٹ کر جنگل میں جا چھپا۔

ہاتھی نے جو اس مڈ بھیڑ اور مہارت کی لٹکارتی ہوئی آوازوں سے بھرا اٹھا تھا، زور سے چٹکھاڑ
 ماری اور جنگلی بیلوں چیرتا اور درختوں کی شاخوں کو چر مراہٹ کے ساتھ توڑتا ہوا جنگل میں داخل
 ہو گیا۔

”تیر چلاؤ!“ بابر چیخ اٹھا۔

لیکن گھنے جنگل نے تیروں کے راستے میں دیوار کا کام کیا، صرف چند تیر ہی شاخوں میں الجھتے
 الجھتے دھیرے سے جا کر ہاتھی کے گئے جن سے اسے کوئی نقصان نہ پہنچ سکا۔ بندو تیبوں کو بھری
 ہوئی بندوقوں کی فلیتوں میں چھتاق رگڑ کر آگ لگانے اور نشانہ درست کرنے میں اتنا وقت لگ گیا
 کہ لال چند ان کی گولیوں کی پہنچ سے باہر ہو گیا۔

”زخمی سپاہیوں کو ارا بے پر بٹھا دو اور ان کے گھوڑوں کو پکڑ لاؤ!“ بابر نے حکم دیا۔ ”اور اس
 بد معاش کو اس کی کرتوت کی سزا ضرور ملنی چاہئے! کمبخت کو گھیر لو! جنگل کا محاصرہ کر لو! فوراً!“
 ساری کوششیں رائیگاں گئیں کیونکہ چاروں طرف گھنے جنگلات پھیلے ہوئے تھے۔
 ”بندوبیک، اب آپ راستہ دکھائیں گے۔“

”آپ کا حکم سر آنکھوں پر، عالی جاہ۔“

شام ہوتے ہوتے ہندو بیگ لشکر کو سرسبز و شاداب میدانِ علاقے میں لے آیا۔ بابر نے جو تھکن سے نڈھال ہو رہا تھا، حکم دیا کہ اس کا خیمہ وہیں نصب کیا جائے اور لشکر پڑاؤ ڈال دے جلد ہی لال چند کا تعاقب کرنے والے سپاہی بھی واپس آگئے۔ ان بیچاروں کے لباس تار تار ہو چکے تھے، گھوڑے کچڑ میں لت پت تھے اور خود ان کی تھکن کا یہ عالم تھا کہ کاٹیوں پر بیٹھا نہیں جا رہا تھا۔

صبح کو دولت خاں اور دلاور خاں کوئی پچاس افراد کے ساتھ بابر کے پڑاؤ کے قریب آکر ٹھہر گئے۔ یہ لوگ بابر سے اپنی وفاداری کے اظہار اور اس کی اطاعت قبول کرنے کے سلسلے میں لاہور سے آئے تھے۔ پسریداروں کو حکم دے دیا گیا کہ ان افراد کو لشکر گاہ میں آنے دیا جائے لیکن بابر نے ملاقات کے لئے صرف دلاور خاں ہی کو اپنے خیمے میں طلب کیا۔ اس نے دلاور خاں کو اپنے معزز و مقرب بیگوں کے درمیان بیٹھا کر خیریت پوچھی اور پھر سخت لہجے میں براہ راست دریافت کیا:

”محترمی، ذرا یہ بتائیے کہ آپ کے والد نے جن کی میں تقریباً اپنے والد کے برابر عزت کیا کرتا تھا، آخر معاہدے کی شرائط کا پاس کیوں نہ کیا، دشمنی پر کیوں آمادہ ہو گئے؟ آخر وہ ہمارے خلاف ہتھیار کیوں اٹھانا چاہتے ہیں؟“

دلاور خاں نے بھی اسی طرح براہ راست جواب دیا:

”محترم فرماں روا، میرے والد کو دراصل میرے بھائی غازی خاں نے گمراہ کر دیا تھا۔ اس نے ان کو خانف کیا تھا، کہا تھا کہ یہاں کسی غیر کا لشکر آئے گا تو لاہور ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ شاہ بابر بھی ہمارے لئے ویسا ہی دشمن ہے جیسا کہ ابراہیم لودی۔“

”اور سرسفید دولت خاں نے راستہ بتانے کے لئے ایک فریبی کو اس لئے بھیجا تھا تا کہ ہم گھنے جنگلوں میں پھنس کر جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں؟“

”یہ کہنا درست نہ ہو گا، عالم پناہ۔ میرے والد کو اس کمینہ چال کی بھنک تک نہیں لگی۔ یہ بھی غازی خاں ہی کی حرکت ہے۔ والد نے ایسا کیا ہوتا تو وہ یہاں کیوں آتے... وہ تو آپ کے خیمے کے اگلے پر کھڑے ہوئے شرف باریابی کے خنجر ہیں... میرے والد خون خرابا نہیں چاہتے، یقین رکھتے۔ وہ تو لاہور پر آپ کے الطاف و عنایات کی امید رکھتے ہیں... اور ہم سب پر بھی۔“

”الطاف و عنایات کے مستحق تو آپ ہیں، صرف آپ، دلاور صاحب۔ آپ کے والد کو سزا دی جائے گی جو انصاف پر مبنی ہوگی۔ ہمارے بزرگان دین کی ہدایت ہے کہ دشمنوں کو سزا دو اور دوستوں کی مدد کرو، ٹھیک ہے نا؟“ اور بابر نے پسریداروں کے سردار کی طرف مڑ کر کہا: ”سننا ہے کہ

دولت خاں کچھ دنوں سے دو تلواریں باندھنے لگے ہیں۔ ذرا ہم بھی تو دیکھیں... انہیں ان کی تلواروں کو مناسب جگہ پر لٹکا کر یہاں لے آئیے۔“

دو تومند سپاہی سفید ریش دولت خاں کے ہاتھوں کو مضبوطی سے پکڑ کر تقریباً ٹانگے ہوئے خیمے کے اندر لے آئے۔ وہ سپاہیوں کی گرفت سے آزاد ہونے کی کوشش کر رہا تھا جس کی وجہ سے اس کی گردن میں لٹکتی ہوئی دونوں لمبی لمبی تلواریں ایک دوسرے سے ٹکرا رہی تھیں۔ بیک بلی بلی آوازوں میں ہنس پڑے۔ دولت خاں بابر کو گھورتے ہوئے غصے سے چیخ اٹھا:

”میں قید کر کے نہیں لایا گیا، خود اپنی مرضی سے آپ کے پاس آیا ہوں! اپنی مرضی سے! آپ نے مجھ سے غداری کی! اور بے رحمی!“

”یہ غداری کی بات کون کر رہا ہے؟“ بابر نے اونچی آواز سے کہا۔ ”آپ تو ہندو بیگ کو دھبے سے قتل کرا دیتا چاہتے تھے حالانکہ وہ میرے ایلچی کی حیثیت سے آپ کے ہاں آئے تھے... کس کو پھنسا دیا تھا جنگل اور دلدل میں غازی خاں نے؟ کس کا بیٹا ہے وہ؟ کس کی اجازت سے کی تھی یہ کارروائی اس نے؟ جو بے رحم ہوتے ہیں ان سے ہم بھی بے رحمی ہی سے پیش آتے ہیں!...“ بابر چند لمحات تک خاموش رہا پھر اس نے اپنے وزیر سے مخاطب ہو کر اضافہ کیا: ”اس شخص کو قید کر کے اس کے خاندان سمیت بھیرا بھیج دیجئے، وہاں اسے ملوث قلعے میں بند کر دیا جائے! لاہور اس شخص کے بغیر ہی کام چلا لے گا۔“

دولت خاں کچھ اتنا حیران و ششدر اور نڈھال ہو گیا کہ اس کے پیر قابو میں نہ رہے اور وہ فرش پر بیٹھ گیا۔ سپاہی لاہور کے اس امیر کو خیمے سے باہر گھسیٹ لے گئے۔ دوسرے دو پیردار اپنی جگہوں سے اٹھے اور کچھ ایسی تیزی سے دلاور خاں کے پیچھے جا کھڑے ہوئے جیسے زمین سے پھوٹ نکلے ہوں...

۲

گر میوں کے ایام میں بھی اشجار کتنے سرسبز و شاداب تھے! کوئی بھی موسم ہو، کتنی خوبصورت نظر آتی تھیں ہندوستان کی بے کراں وادیاں!

بابر اپنے لشکر کے ساتھ دریائے جہنا کے کنارے دھیرے دھیرے، محتاط انداز میں دہلی کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اس نے پانی پت کے قریب جو سلطان ابراہیم کے دار الحکومت کے شمال میں کوئی پچپن میل کے فاصلے پر واقع تھا، پہنچ کر فیصلہ کن جنگ کے لئے پراؤ ڈال دیا۔ مقابلے کے لئے ابراہیم لودی اگرے سے ایک لاکھ سپاہیوں کے لشکر جہاد کے ساتھ جس میں ہاتھی بھی شامل تھے،

اسی سمت بڑھتا آ رہا تھا۔ وہ گزشتہ سال دہلی کی سرحد پر عالم خاں، دلاور خاں اور دوسرے ”مقامی“ دشمنوں کی چالیس ہزار سپاہیوں کی فوج کو شکست دینے میں خوش قسمتی سے کامیاب ہو گیا تھا۔ خود بابر کے فوجیوں کی تعداد اس وقت بارہ ہزار سے بھی زائد نہ تھی۔ لیکن سلطان دہلی کی فوج کی یہ اعتبار تعداد اس زبردست برتری کے باوجود بابر کا کوئی بھی بیک خائف نہیں تھا۔ بیک ایک دوسرے سے کہتے رہتے کہ اگر شکست کا منہ دیکھنا پڑا تو ہم سب اسی بے کراں اجنبی سرزمین پر جان دے دیں گے، کہیں روپوش نہ ہوں گے کیونکہ جان بچ جانے کی خاک بھی امید نہیں۔ اس سے مختلف رائیں بھی ظاہر کی جا رہی تھیں تاہم زیادہ تر بیگوں نے بابر کے جنگی تجربات، اس کی سپہ سالاری کی صلاحیتوں اور یقیناً استاد علی قل کی توپوں اور بندوقوں سے بھی ایسے اسلحہ ابراہیم لودی کے پاس نہیں تھے۔ امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں۔ طاہر جو اب ممتاز بیگوں کی قربت حاصل کر چکا تھا، جانتا تھا کہ بابر جنگی ہاتھیوں کو جن پر عموماً ہندوستان میں جنگ کے نتیجے کا انحصار ہوتا تھا اور جو بابر کے لشکر میں شامل نہیں تھے، توپوں اور بندوقوں سے خائف کر کے بھگا دینے کا ارادہ رکھتا ہے۔

بابر نے پانی پت شہر کے پہلو میں ایک ایسے مقام کا انتخاب کیا جو جنگ کے لئے بہت ہی موزوں تھا۔ یہاں لشکر کے ساتھ آئے ہوئے سارے اراہوں کو جن کی تعداد سات سو تھی، ایک قطار میں کھڑا کر کے چرمی رسیوں سے ایک دوسرے کو باندھ دیا گیا۔ ہر دو گاڑیوں کے درمیان چھ چھ سات سات دھس رکھ دیئے گئے۔ ان اراہوں اور دھسوں کی آڑ سے بابر کے بندو قیچوں اور توپچیوں کو غنیم پر گولا باری کرنی تھی۔ باہری منہ کی حفاظت کے لئے دائیں جانب گنجان آباد شہر پانی پت رکاوٹ کا کام دے رہا تھا۔ میسرہ کی حفاظت کے لئے بابر نے ایک کافی لمبی خندق کھدوائی جس کے کنارے کنارے درختوں کو کاٹ کر ان کی باڑ بھی کھڑی کرا دی گئی۔ دوسری جنگوں پر بھی کچھ خندقیں کھدوائی گئیں۔

بابر نے تمام تیاریاں وقت کے اندر ہی مکمل کر لیں تاکہ جنگ خود اس کے منصوبے کے بموجب ہو، دشمن کی مرضی کے مطابق نہیں۔

دشمن کے لئے صرف ایک ہی راستہ کھلا رہ گیا تھا۔ وہ بابر کی فوج پر صرف سامنے ہی سے حملہ کر سکتا تھا۔ سب کچھ اس بات پر منحصر تھا کہ خندقیں اور اراہے تعداد میں دس گنا بڑے اور طاقتور لشکر کے دباؤ کو کس حد تک کم کر سکیں گے۔

طاہر کو کابل میں اپنے قیام کے ابتدائی برسوں میں اند جان اور قوا کی یاد بہت ستاتی رہتی تھی۔ اب وہ کابل کو یاد کر کے اداس ہو رہا تھا۔ کابل میں اس کا مکان تھا جس میں وہ اپنی بیوی راجہ، بیٹے

سفر اور ماموں فضل الدین کے ساتھ گزشتہ پندرہ برسوں سے زندگی گزار رہا تھا۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا جب طاہر کسی جنگ میں شرکت کے موقع پر موت کا خیال بھی دل میں نہیں لاتا تھا لیکن آج وہ بار بار دعائیں مانگ رہا تھا ”پروردگار“ مجھے اس جنگ میں ہلاک ہونے سے محفوظ رکھ۔ اگر میں اس بار بھی زندہ بچ نکلا تو ملازمت چھوڑ دوں گا۔ یقیناً میں کافی اونچے عہدے پر مامور ہوں لیکن اب میری عمر بھی تو پچاس کے قریب ہو چکی ہے۔ آخر میں اس طرح کب تک در بدر مارا پھرتا رہوں گا؟ سفر جو ان ہو چکا ہے، اس سال مدرسے کی تعلیم مکمل کر کے میر عمارت بن جائے گا۔ اب تو اس کی شادی کی جانی چاہئے... یا اللہ! کیا مجھے بیٹے کا سہرا دیکھنا نصیب ہو سکے گا؟ میں اپنی رابعہ کو ایک بار پھر دیکھ سکوں گا کہ نہیں؟ مجھے جنگ میں ہلاک ہونے سے بچا، پروردگار!“

شراب اداسی، خوف اور اذیت وہ خیالات سے کسی حد تک نجات دلا دیتی تھی۔ ہندوستان میں انگوڑ بہت کم پیدا ہوتے تھے اس لئے انگوڑ کی شراب بہت کم بنتی تھی۔ بیک مہوے کی تیز شراب سے کام چلا رہے تھے۔

جنگ چمڑنے سے قبل والے دن طاہر نے یہ تند و تیز شراب کافی مقدار میں پی لی تھی۔ علی الصباح اس کی آنکھ کھلی تو خاصی گرانی محسوس ہوئی۔ بدن بری طرح ٹوٹ رہا تھا، منہ کڑوا ہو رہا تھا، سر بھاری لگ رہا تھا، بیٹھا رہا تھا۔ اس نے دوبارہ سو جانے کی کوشش کی لیکن نیند نہ آئی، لینا کوٹیں بدلتا رہا۔ تب اس نے اٹھ کر شراب کے چند قطرے جو صراحی میں باقی رہ گئے تھے، حلق میں اندیل لئے۔

اتنے میں نقاروں اور صوروں کی آوازیوں سے سارا ماحول گونج اٹھا۔ ”صف بندی کرو! صف بندی کرو!“ احکام سنائی دئے۔ گشتی دستے نے آکر اطلاع دی تھی کہ ابراہیم لودی کا لشکر تیزی کے ساتھ بڑھتا ہوا قریب آگیا ہے۔

طاہر نے نشے کے باعث کپڑے اور جوتے پہننے میں کافی وقت لگا دیا۔ اس کا پستہ قد سائیس مدم جو طاہر سے اپنی پرانی دوستی اور عمر میں بڑے ہونے کی وجہ سے کبھی کبھی بڑبڑانے کی حماقت کر بیٹھتا تھا اس وقت بھی ضبط نہ کر سکا:

”ارے بیک، آخر منہ اندھیرے ہی پینے کی کیا ضرورت تھی؟“

”خاموش رہ! پہلے میرا گھوڑا لے کر آ۔ اور زیادہ جلدی کر، ہڈیوں کے ڈھانچے!“

ممد اس مہم کے دوران واقعی بے حد دھلا ہو گیا تھا۔ ”اچھا ہی ہوا، گھوڑوں کے پیچھے دوڑنے میں آسانی ہوگی کعبخت کو!“ طاہر نے رکھائی کے ساتھ دل ہی دل میں کہا۔

گھوڑے پر رات بھر کاٹھی کسی رکھنے کی ضرورت پڑتی تھی تو عموماً اس کا تنگ کچھ ڈھیلہ کر دیا جاتا تھا۔ اس وقت ممد گھوڑے کو جو رات میں کھل گیا تھا، کچھ دیر کے بعد ہی پکڑا اور جلدی میں اسے تنگ کو کس دینے کا خیال نہ رہا۔ طاہر غلت میں تھا، اسے جلد از جلد باہر کے سامنے حاضر ہونا تھا اس لئے رکابوں پر نظر ڈالے بغیر ہی اچھل کر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ کاٹھی کھسکنے لگی اور اگر طاہر نشے میں نہ ہوتا تو فوراً ہی سمجھ جاتا کہ کاٹھی ڈھیلی ہے لیکن اس وقت اس نے سوچا کہ یہ محض وہم ہے۔ اس نے رکابوں پر پاؤں جما کر گھوڑے کو تیزی کے ساتھ موڑا لیکن شکم سیر و توانا گھوڑا الف ہو گیا، کاٹھی اس کے کولھے کی طرف کھسک گئی اور طاہر زمین پر ڈھیر ہو گیا۔

ممد نے لپک کر ایک ہاتھ سے گھوڑی کی لگام تھام لی اور دوسرے سے طاہر کو کھڑے ہونے میں سہارا دیتے ہوئے مسکرا کر کہا:

”ارے طاہر جان، آپ تو بیک بن جانے کے بعد علی الصباح ہی مے نوشی کرنے لگے۔ میں نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ زیادہ نہ پیا کیجئے اس زہر کو۔“

نرم مٹی پر گرنے کی وجہ سے طاہر کو چوٹ تو نہیں آئی تھی لیکن ایسی اہم جنگ سے قبل گھوڑے سے گر پڑنا شگون بد تھا۔ اس نے غصے سے گالی کی اور کاٹھی اور ڈھیلے تنگ کی طرف اشارہ کیا۔ ممد نے مذاق کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے مانتھا ٹھونکنے:

”جلدی میں بھول گیا تھا، احمق جو ٹھہرا۔“

شراب نے طاہر کی عقل پر جھاڑو پھیر دی تھی۔ اسے سائیس کا مذاق سخت ناگوار گزرا اور اس کے دل میں خیال آیا کہ ممد نے ”عالی نب“ بیک گھوڑے سے گرانے کی چال جان بوجھ کر اپنائی تھی۔ طاہر ماضی کی طرح سپاہی ہوتا تو اس واقعے پر خود بھی ہنس پڑتا لیکن اب تو وہ بیک تھا، بیک!

”ارے ہڈی کے ڈھانچے، تو نے یہ حرکت جان بوجھ کر کی تھی؟! میرے بیک بن جانے سے

تیرے سینے پر سانپ لوٹا ہے نا! تو میری جان لینا چاہتا تھا، بول؟“ وہ غصے سے کانپنے اور پیٹی کو دیکھے بغیر اس سے چابک نکالنے کے لئے ٹٹولنے لگا۔ لیکن چابک تو زمین پر پڑا ہوا تھا۔ قصور وار سپاہی کو گالیاں دینا اور مارنا پیٹنا ایک عام بات تھی۔ طاہر بیک بھی اس دستور کو ایک حد تک اپنا چکا تھا لیکن ممد سے اپنی پرانی دوستی کو ملحوظ رکھتے ہوئے ابھی تک اس پر ایک بار بھی ہاتھ نہیں اٹھایا تھا۔

ممد نے جبکہ کر چابک کو اٹھالیا اور اسے طاہر کی طرف بڑھایا:

”لیجئے، سزا دیجئے مجھے میری غلطی کی لیکن یہ بات نہ کہئے۔ آپ کی جان کیوں لینا چاہوں گا، نمک

حرام تھوڑی ہوں!“

طاہر کو ایک بار پھر ایسا لگا جیسے مہاس کا مذاق اڑا رہا ہو، اپنی شرافت اور ایمانداری پر زور دے کر خود کو بیگ سے برتر ثابت کرنے کا کوشاں ہو۔

”جنگ سے قبل مجھے گھوڑے سے گرا دینے کا مطلب میری موت کے خواہاں ہونے کے سوا اور کیا ہے؟!“ طاہر کچھ اس طرح چیخ اٹھا جیسے مہر پر تھوک رہا ہو اور دوسرے ہی لمحے مہر کے سر پر زور سے مکا مار دیا۔

مکا پڑتے ہی مہر پیچھے لڑھکا، پیروں پر نلک نہ پایا اور زمین پر گر پڑا۔ طاہر کو انگوٹھا چننے کی آواز سنائی دی، پورے دس بائیس ہاتھ میں تیز دردی لہری دوڑ گئی اور سر جھکا گیا۔ ”انگوٹھا ٹوٹ گیا، ٹوٹ گیا!“ اب تلوار کیسے اٹھاؤں گا؟ یہ سب اس کجخت کی وجہ سے ہوا... اسی کی وجہ سے...“ طاہر نے اب کے مہر پر جو اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا، اپنے بائیس کے سے وار کیا اور پچارا سائیس دوبارہ زمین پر ڈھیر ہو گیا۔

اتنے میں ایک قوی الجیش سپاہی مہر کی طرف سے بول پڑا:

”رہنے بھی دیجئے، بیگ صاحب، اس بار انہیں معاف کر دیجئے۔ مہر تو آپ کی خاطر جان دینے کو بھی تیار رہتے ہیں! تنگ کو میں خود ہی کے دیتا ہوں... چند لمحے ٹھہر جائیے... یہ لیجئے، ٹھیک ہو گیا۔ سوار ہو جائیے...“

طاہر گھوڑے پر سوار ہو کر روانہ ہو گیا۔ وہ اپنے سوچے ہوئے انگوٹھے کو جس میں ہلکی سے جنبش سے بھی ناقابل برداشت درد محسوس ہوتا تھا، بار بار دیکھے جا رہا تھا۔

اور جب وہ باہر کے نجی محافظین کے اکٹھا ہونے کی جگہ کے قریب پہنچا تو اس کے دل میں خیال آیا: ”بس، اب اور کامیابی میرے مقدر میں نہیں!“

کم و بیش بیس سپاہی طاہر کے پیچھے پیچھے گھوڑے دوڑاتے چلے آ رہے تھے۔ ان میں مہر بھی جس کے پیرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں، شامل تھا۔ دراصل قاعدہ ہی یہی تھا: بیگ سپاہی کو کتنا بھی کیوں نہ زد و کوب کرتا، سپاہی کو اپنے بیگ کے ہم رکاب رہنا ہی پڑتا تھا۔

آفتاب طلوع ہو کر سلطان دہلی کے بے شمار لشکریوں کی صفوں کو دھوپ میں منسلک ہوا تیزی سے سمت الہ اس کی طرف بڑھنے لگا۔ ان یکساں اور ایک دوسرے سے قریب قریب واقع صفوں نے لگتا تھا کہ سارے افق کو ڈھک لیا ہے۔ انہی صفوں کی درمیان جنگی ہاتھی بھی موجود تھے جن کے بھاری بھر کم جسم تو اس ٹیلے پر سے جہاں باہر اپنے محافظین کے دستے کے ساتھ کھڑا ہوا تھا، پوری

طرح نظر نہیں آرہے تھے لیکن ان کی تعداد کو دیکھ کر روح لرز اٹھتی تھی۔ وہیں کہیں سب سے بڑے ہاتھی پر ابراہیم لودی بیٹھا ہوا تھا۔ یہ ہاتھی اس کے لئے جائے مشاہدہ کا بھی کام دے رہا تھا کیونکہ وہ اس کی پیٹھ پر سے سارے میدان جنگ پر نظر رکھ سکتا تھا۔

مہیب دشمن قریب آتا جا رہا تھا لیکن بابر کو کسی قسم کی گھبراہٹ نہیں محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے اراہوں اور دھولوں کی دیوار مضبوط تھی۔ اس کے سینے کی کمان اس کا زین اور نڈر بیٹا ہالیوں کر رہا تھا جس کے ساتھ خواجہ کلاں بیگ، ہندو بیگ اور دیگر معتبر اور تجربہ کار سپہ سالار بھی موجود تھے۔ قلب تو بیچوں، ہندو قیدیوں، تیر اندازوں اور پیدل دستوں پر مشتمل تھا۔ سینہ اور میرہ کے گھڑ سوار دستے طوفانی حملوں کے لئے تیار کھڑے تھے۔ جنگلی ہاتھی پر سوار سلطان ابراہیم کے ساتھ ساتھ بے شمار پیدل سپاہی آگے بڑھ رہے تھے۔ اتنی کثیر تعداد کے لئے میدان تنگ ثابت ہونے کی بنا پر سپاہی اپنی صفوں میں ایک دوسرے کے جسم سے جسم ٹاکر چلنے پر مجبور ہو گئے تھے اسی وجہ سے ان کی رفتار بہت دھیمی تھی۔ یہ بہترین موقع تھا تلفہ کے لئے جو ایک زمانے میں شیبانی کا سب سے موثر حربہ رہ چکا تھا اور اب بابر کا بھی سب سے موثر حربہ بن گیا تھا۔ سینہ اور میرہ کے کناروں پر انتہائی مبارقار گھوڑوں والے دستے غنیم پر ٹوٹ پڑنے کے لئے تیار تھے۔

طاہر، بابر سے کچھ پیچھے شاہی محافظین اور دیگر افراد کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔ بادشاہ سے تھوڑی ہی دوری پر پیغام رسانوں کے ساتھ وہ بیگ کھڑے ہوئے تھے جنہیں فوج کے مختلف حصوں کے درمیان مال میل قائم رکھنے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ بابر خود اعمادی سے معمور اور واضح لہجے میں احکام جاری کر رہا تھا۔ ”ہم لوگ اس شخص کے پیچھے پیچھے چلتے رہے ہیں اور کتنی ہی جنگوں سے زندہ و سلامت بچ نکلے ہیں“ طاہر نے خود کو تسلی دیتے ہوئے سوچا۔ ”اگر مرزا بابر زندہ رہے تو میں اس بار بھی زندہ بچ نکلوں گا۔“

سیاہ آندھی کا جو قریب سے قریب تر آتی جا رہی تھی، کسی جوابی اقدام کے بغیر بے حس و حرکت کھڑے کھڑے انتظار کرتے رہنا بے حد دشوار ثابت ہو رہا تھا۔ بہت سے بیگ متشکر و مضطرب ہونے لگے۔ بابر تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد پرسکون، واضح اور حکمانہ آواز سے کہہ اٹھا تھا:

”صبر سے کام لو۔۔۔ انتظار کرو۔۔۔ کوئی آگے نہ بڑھے۔۔۔“

ابراہیم لودی نے یہ دیکھ کر کہ بابر اراہوں اور دھولوں کی پیچھے ہی کھڑا ہوا ہے، آگے بڑھ ہی نہیں رہا ہے، اپنے لشکر کو بھی آگے بڑھنے سے روک دیا۔ وہ اس سوچ میں پڑ گیا کہ کیا اسی براہ راست بابر کے قلب پر حملہ کرنا چاہئے؟ آخر اس نے اپنے سپہ سالاروں کے مشورے پر

اپنے لشکر کو مرنے کا حکم دیا تاکہ خاص حملہ قلب کے بجائے بابر کے مہم پر کیا جائے اور اسے توڑتے ہوئے شہر کی طرف سے نکل کر بابر کے لشکر کا محاصرہ کر لیا جائے۔

لیکن ایک لاکھ سپاہیوں کے اس لشکر کے مختلف حصوں تک احکام پہنچانے میں؛ دستوں کے یکجا ہو کر بابر کے مہم کی اور شہر کی جانب مرنے میں کافی وقت لگ گیا۔

اس اثناء میں بابر نے جو ابلی کارروائی کر دی۔ اس کے دو ہزار سوار ابراہیم لودی کے میسرہ کے قریب سے؛ دشمن کی حملہ کرنے والی مرکز قوت یعنی ہاتھیوں اور پیدل سپاہیوں کے قریب سے جو قلب سے بائیں جانب مڑ رہے تھے؛ انتہائی تیزی کے ساتھ گزرتے ہوئے دشمن کے پیچھے پہنچ گئے۔ مہم سے ہمایوں کے گھڑسوار اپنی جانب مڑتے ہوئے دشمن کے سپاہیوں کی طرف بڑھے تاکہ انہیں دوبارہ صف بندی کا موقع دیے بغیر ہی ان پر ٹوٹ پڑیں۔ ٹھیک اسی لمحے قلب میں اراہوں کے درمیان نصب توپیں گرجنے لگیں۔

دراصل بابر پانی پت کے میدان میں اپنے ان سارے حربی تجربات سے فائدہ اٹھا رہا تھا جو اسے اپنی شاندار فتوحات اور افسوس ناک شکستوں میں حاصل ہو چکے تھے۔ ایک متعین وقت تک اس کا بنیادی مقصد دشمن کے لشکر کا محاصرہ کرنا۔ خواہ یہ محاصرہ کمزور ہی کیوں نہ ہو۔ دشمن کے مہم و میسرہ کو غیر موثر بنانا؛ ان دونوں حصوں کے دستوں کو میدان کے اندرونی علاقے کی طرف مڑنے پر مجبور کر دینا اور عام کھلبلی مچانا رہا۔ لیکن محاصرین کی بہ نسبت ان کے محصورین تعداد میں کئی گنا زیادہ تھے۔ محاصرین کے گھوڑے یقیناً تیز رفتار تھے لیکن ان کے پاس ہاتھی نہ تھے جس کی وجہ سے وہ کچھ اور بھی کمزور پڑ رہے تھے۔ یہی سبب تھا کہ ابراہیم لودی کے سپاہی محاصرے کو کبھی دائیں جانب سے توڑ کر باہر نکل آتے کبھی بائیں جانب سے۔ بابر جس پہلو پر بھی اپنے گھڑسواروں کو زیادہ مشکلات میں گھرا ہوا دیکھتا تھا ادھر اپنے قلب میں مامور دستوں کی کمک بھیج دیتا تھا۔ لیکن دراصل یہ کمک دشمن کو دکھارہا تھا کہ اس کے لشکر کا وسطی حصہ جہاں اراہے کھڑے تھے؛ غیر محفوظ ہو چکا تھا۔ اور ابراہیم لودی آخر کار اس چال کا شکار ہو گیا۔ اس نے اپنے مہم؛ میسرہ اور عقب پر ہونے والے حملوں کو پسا کر کے اپنی خاص طاقت یعنی جنگی ہاتھیوں کو بابر کے قلب کی طرف آگے بڑھایا اور جنگ کا فیصلہ اپنے حق میں کرنے کے مقصد سے دھاوا بول دیا۔ عین اسی وقت بابر نے حکم دیا کہ گولہ باری تیز کر دی جائے۔ توپیں اور بندوقیں سلطان دہلی کے ہاتھیوں اور پیدل سپاہیوں پر جواب بہت قریب آچکے تھے؛ آگ برسانے لگیں۔ توپوں کی گھن گرج سے کانوں کے پردے پھٹنے سے لگے؛ دھوئیں اور سیاہی کے باعث آنکھوں کے لئے کچھ دیکھنا محال ہو گیا اور گولیاں اور گولے

زیر ہوں او ڈھالوں کی دھجیاں اڑانے لگے۔ ابراہیم لودی کے سپاہی اس سب کے لئے بھلا کہاں تیار تھے۔ زخمی اور خوف زدہ ہاتھی ترپے اور زور زور سے چٹکھاڑنے لگے۔ مہادتوں نے انہیں موڑنے کی کوشش کی جس سے کچھ اور بھی زیادہ اہتری پھیل گئی اور دھکا پیل میں سپاہی اور گھوڑے زمین پر گرنے اور روندے جانے لگے۔

توپوں اور بندوقوں نے اپنا مہیب اور تباہ کن عمل جاری رکھا۔ ڈھلان پر بہت سے مردہ یا شدید زخموں کے باعث دم توڑتے ہوئے ہاتھی پڑے ہوئے تھے۔ ان کے گرنے سے بہت سے سپاہی ان کے نیچے دب کر ہلاک ہو گئے تھے۔ اس اثناء میں نشیب سے سپاہی اور سوار مسلسل جوق در جوق چلے آ رہے تھے اور لاشوں اور زخموں کے ڈھیر پر ڈھیر لگتے جا رہے تھے۔

آخر کار ابراہیم لودی کے لشکر میں بخند رچ گئی، سپاہی ہتھیار پھینک کر ہنگامے کرنے والوں کو روندتے ہوئے میدان جنگ سے بھاگنے لگے۔ میدان کے مختلف حصوں اور دشمن کے عقب میں موجود بار کے فوجی جن کی تعداد گھٹ چکی تھی، بھاگنے والوں کے اس ریلے کو روکنے میں ناکام رہے۔ ہاتھی ان کے محاصرے کو بہ آسانی توڑتے ہوئے باہر نکلے اور ان کے پیچھے پیچھے دشمن کی پیدل فوج کا انہو بھی میدان سے نکل بھاگا۔

باہر نے اپنے ٹیلے پر سے دشمنوں کو فرار ہوتے دیکھ لیا۔

”دشمن دہلی لوٹ کر شہر کے دروازے بند کر کے بیٹھ سکتا ہے!“ وہ چیخ اٹھا اور ان بیگوں کی طرف مڑا جنہیں اس کی فوج کے مختلف حصوں کے درمیان رابطہ قائم رکھنے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ لیکن یہ سب بیک اور پیغام رساں کیے بعد دیگرے میدان جنگ میں بھیج دیئے گئے تھے اور ابھی تک واپس نہیں لوٹے تھے۔ یہ کتا بھی مشکل تھا کہ ایسی بھیانک جنگ میں ان میں کتنے لوگ زندہ بچے ہوں گے۔ باہر نے اپنا گھوڑا اپنے محافظین کے دستے کی طرف موڑا۔

”طاہر بیک، مجھے یہ معلوم ہونا چاہئے کہ خود ابراہیم لودی بھاگ کھڑا ہوا یا ابھی تک میدان جنگ میں موجود ہے۔ اگر بھاگ کھڑا ہوا ہے تو ہمیں اپنی محفوظ فوج کے دستوں کو اس کے تعاقب کے لئے روانہ کرنا چاہئے۔“

طاہر نے میدان پر نظریں دوڑاتے ہوئے دھوئیں اور غبار کے اس بہنم کا جائزہ لیا۔ اس کے طاقتور جسم میں عجیب جھرجھری سی پیدا ہوئی جسے اس نے چھپانے کی کوشش کی تاہم اس کی آواز سے ارتعاش نمایاں ہو گیا:

”آپ کا حکم سر آنکھوں پر، عالی جاہ!“

اتنے میں ایک پیغام رساں گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا ہوا آن پہنچا۔ اس کے زخمی پیر سے رکاب پر خون ٹپک رہا تھا۔ اس نے گھوڑے سے اترے بغیر ہی چلا کر تیزی سے کہا:

”محترم حکمران، ہمیں فتح حاصل ہو گئی! دشمن بھاگ کھڑا ہوا!“

”ابراہیم بھی؟“

”جی ہاں، میں نے دیکھا ہے کہ بھاگتے ہوئے ہاتھیوں میں ابراہیم کا سفید جھول والا ہاتھی بھی شامل تھا۔ ابراہیم بھی بھاگ رہا ہے۔“

”طاہر بیگ، ٹھہر جائیے۔ قاسم تائے مرزا!“

کوئی چالیس سال کا ایک ہٹا کٹا بیگ بابر کے سامنے آیا۔ یہ بیگ ترکستان میں پیدا ہوا اور بڑا ہوا تھا اور تیور خاندان کا دور کا رشتے دار بھی تھا۔ قاسم تائے گزشتہ پندرہ برسوں سے بابر کے دربار سے وابستہ تھا۔

”اگر ابراہیم بھاگتا ہوا دہلی یا آگرہ پہنچ کر قلعہ بند ہونے میں کامیاب ہو گیا تو جنگ بہت طول کھینچ جائے گی“ بابر نے قاسم تائے سے کہا۔ ”ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ دہلی اور آگرہ پر لڑائی کے بغیر ہی قبضہ ہو جائے... قاسم تائے مرزا، آپ محفوظ فوج کے ایک ہزار لشکریوں کو ساتھ لے لیجئے... بابا چوہرا کو ان کے سپاہیوں سمیت اور طاہر بیگ کے دستے کو بھی ساتھ لے لیجئے اور انتہائی تیز رفتاری سے ابراہیم کا تعاقب کیجئے! دہلی تک پیچھا کیجئے اور اگر وہ آگرہ کی طرف بھاگے تو آگرہ تک پیچھا کیجئے!“

”یہ خادم اپنی جان پر کھیل کر آپ کے حکم کی تعمیل کرے گا!“

”اس معاملے میں میری ساری امیدیں آپ ہی سے وابستہ ہیں۔ اللہ آپ کا حامی و ناصر ہو۔ تباہ کر دیجئے ابراہیم کو۔ خدا کرے آپ کا بال بھی بیکا نہ ہو!“

”آمین!“

فاتح فوج کے ہراول میں رہنا کتنے اعزاز کی بات تھی! طاہر کو لگا جیسے اس کے انگوٹھے کا درد اچانک بند ہو گیا۔ وہ اپنے دستے کے ساتھ تیزی سے گھوڑے کو دوڑاتا ہوا قاسم تائے کے لشکریوں کی انگلی صف میں پہنچ گیا۔

آفتاب سمت الراس پر پہنچ چکا تھا۔ بلا کی گرمی پڑ رہی تھی جس سے بھاگنے والے بھی پریشان تھے اور تعاقب کرنے والے بھی۔ دشمن افزا تفری کے عالم میں پیچھے ہٹ رہا تھا لیکن اب بھی کافی طاقتور تھا۔

آخر سفید جھول والا ہاتھی کہاں تھا؟ کیس سلطان ابراہیم ہاتھی سے اتر کر گھوڑے پر تو نہیں سوار ہو گیا تھا؟

قاسم تائے اور طاہر نے دشمن کی ہاری ہوئی، بے ترتیبی سے پیچھے ہٹی ہوئی فوج کے دونوں بازوؤں سے آگے نکل کر کئی مہاتوں کو پکڑ لیا۔ ان قیدیوں سے قاسم تائے نے بابر کی فوج میں شامل ایک ہندوستانی کے ذریعے بات چیت کی:

”ان سے کہو کہ اگر یہ بتادیں کہ ابراہیم لودھی والا دستہ کدھر گیا ہے تو ہم انہیں آزاد کر دیں گے۔“

ایک قیدی فوراً ہی بول پڑا:

”کہتے ہیں کہ ابراہیم کا ہاتھی گھسان کی لڑائی کے دوران ہی زمین پر ڈھیر ہو گیا تھا اور خود سلطان بھی لڑائی میں کام آگیا۔“

دونوں زبانیں جاننے والے ہندوستانی نے ترجمہ کر دیا لیکن قاسم تائے کو یقین نہ آیا اور اس نے سخت لہجے میں کہا:

”ہمارے سپاہیوں نے ابراہیم کو بھاگتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس شخص سے کہو کہ سچ بچ بتائے ورنہ سر قلم کر دیا جائے گا!“

لیکن قیدی نے ایک بار پھر کہا کہ ابراہیم میدان جنگ میں ہلاک ہو چکا ہے۔ ایک دوسرے قیدی نے قیاس ظاہر کیا کہ بہت ممکن ہے ابراہیم ہارے ہوئے دستوں کے اس انبوہ میں موجود ہو جو جان بچا کر بھاگا جا رہا ہے۔ ایک اور قیدی نے دائیں جانب بھاگتے ہوئے دستوں کی طرف اشارہ کر دیا۔

قاسم تائے نے ان قیدیوں کو ان کے ہاتھیوں سمیت اپنی سپاہیوں کی نگرانی میں ٹیلے کی طرف باہر کے پاس روانہ کر دیا اور خود دشمن کی فوج کی طرف لپکا۔ قریب پہنچ کر اس نے دیکھا کہ یہ فوج خاصے منظم انداز سے واپس جا رہی تھی کیونکہ ہاتھی اور گھوڑے اس کے دونوں پہلوؤں پر چل رہے تھے یہ راجپوت تھے جو واقعی بہت بہادر اور کامیاب فوجی تسلیم کئے جاتے تھے۔ قاسم تائے ایک پہلو سے اس فوج کے آگے جا پہنچا اور بابا چوہرا اور طاہر دوسرے پہلو سے۔ راجپوتوں نے یہ دیکھ کر کہ تعاقب کرنے والوں کی تعداد زیادہ نہیں ہے، تیر کمان اور تلواریں سنبھالیں اور مقابلے پر آمادہ ہو گئے۔

طاہر نے گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتے ہوئے کمان پر تیر لگا کر نشانہ درست کیا لیکن تانت کو کھینچتے ہی اسے پتا چلا کہ انگوٹھا تو بیکار ہو چکا ہے۔ اسے تانت اور تیر کے اوپر والے سرے کو انگوٹھے کے

بغیر دو انگلیوں ہی سے پکڑنا پڑا تاہم تیر نشانے پر لگا اور نقلی تلواریں لئے سامنے سے حملہ آور ہونے والوں میں سے ایک سانولا سوار اپنے گھوڑے کی ایال پر منہ کے بل گر پڑا لیکن طاہر کو دوسرا تیر چلانے کا موقع نہ مل سکا کیونکہ راجپوت اپنے گھوڑوں کو تیزی سے دوڑاتے ہوئے بہت قریب آگئے۔ ان میں سے کچھ سخم گھڑ سوار گز اٹھائے ہوئے تھا۔ طاہر نے فوراً ہی تلوار نیام سے نکال لی اور دشمن کے اٹھے ہوئے ہاتھ پر وار کرنے کے لئے گھوڑا اس کی طرف بڑھایا۔ حریف نے خود کو اس وار سے بچا لیا، اس کے گرز سے طاہر کی تلوار زور سے ٹکرائی اور دوسرے ہی لمحے طاہر کو صرف انگوٹھے ہی میں نہیں بلکہ سارے جسم میں ناقابل برداشت درد کا احساس ہوا۔ اسے پتا بھی نہ چلا کہ کب اس کی تلوار ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گری۔ طاہر نے بڑی پھرتی سے خود کو راجپوت کے وار سے بچا کر کمر میں لٹکتے ہوئے خنجر کو نکالنے کی کوشش کی لیکن اتنے میں گرز اس کے سر سے آکر ٹکرایا۔ اسے محسوس ہوا کہ شدید درد کی ایک لہری اس کے شانے گردن اور ٹھوڑی کی طرف بڑھتی جا رہی ہے، انگوٹھے کا درد غائب سا ہو گیا اور آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ وہ بھی سینے کے بل اپنے گھوڑے کی ایال پر ڈھیر ہو گیا... راجپوت نے ایک اور زوردار وار کیا جو خالی گیا۔ طاہر نے سوچا: ”یہ تو مجھے گرا کر ہی دم لے گا!“ اور اس نے جانے کیوں دل ہی دل میں دعا مانگی: ”خدا کرے میں جلد ہی بے ہوش ہو جاؤں۔“

طاہر کو تیسرے وار سے جو ملک ثابت ہو سکتا تھا، ممد نے بچایا۔ اس نے اپنے تمبر کی زوردار ضرب سے راجپوت کو مار گرایا۔ پھر اس نے گھوڑے سے لڑھکتے ہوئے طاہر کو فوراً ہی پکڑ لیا اور اس طرح وہ دونوں اس تصادم کی جگہ سے بھاگ نکلے۔

۳

ہمایوں نے دہلی پہنچ کر کسی لڑائی کے بغیر ہی شہر اور قلعے پر اپنا اقتدار قائم کر لیا اور ابراہیم لودھی کے خزانے پر قابض ہو گیا۔ پھر وہ اپنے تین سو سپاہیوں کے ساتھ شہر کو دیکھنے کے لئے نکلا۔ وسیع و عریض اور بے کراں ملک، عظیم الشان اور دور دور تک آباد شہر!

دہلی میں نیچے نیچے ٹیلے بھی موجود تھے لیکن شہر کا زیادہ تر حصہ ہموار اور ہرے بھرے علاقوں پر مشتمل تھا۔ مکانات بے شمار تھے لیکن سڑکوں پر لوگ برائے نام ہی نظر آرہے تھے۔ دراصل بیرونی حملہ آوروں کے خوف سے اہل شہر اپنے اپنے گھروں میں بند بیٹھے تھے، دروازوں کے شگافوں سے کبھی کبھی باہر جھانک لیتے تھے اور بس۔

ہندوؤں کے مختلف گروہ اپنے مقدس دریا جتنا کے کنارے اپنے مردوں کی آخر رسوم ادا کر رہے

تھے۔ مردوں کو خوشبودار گھی والی چٹاؤں پر نذر آتش کر کے ان کی راکھ دریا میں بہا دی جاتی تھی۔ یہ راکھ ابدیت کا جزو بن جاتی تھی۔۔۔ آخری رسوم ادا کرنے میں کچھ اس طرح کھوئے ہوئے لوگ گویا کہ خود ان کی روہیں بھی دوسری دنیا میں پہنچ گئی ہوں، اس فانی دنیا کی فکروں سے اتنے بے نیاز تھے کہ اپنے شر پر قابض ہو جانے والے غیر ملکوں کی طرف بھی توجہ نہیں مبذول کر رہے تھے۔

ہایوں کو بازار میں برہنہ پا عورتیں اور بچے ہاتھوں میں پھول لئے کہیں جاتے دکھائے دیئے۔ اسے کچھ سفید ریش بوڑھے بھی نظر آئے اور ان کے ہاتھوں میں بھی پھول تھے۔ برہنہ پا افراد اور ہاتھوں میں پھول، ہایوں کو یہ نظارہ عجب سالگا۔

”ہم لوگ شہر کے ایک خاص بازار سے گزر رہے ہیں“ اسے ہندو بیگ نے بتایا جو ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

”آج کوئی مذہبی تیوہار ہے کیا؟ یہ لوگ ڈھیروں پھول کیوں لئے جا رہے ہیں؟“ ہایوں نے پوچھا۔

”جی ہاں، آج تیوہار ہے۔ یہ لوگ بت خانے میں عبادت کرنے جا رہے ہیں۔ دیوتاؤں سے ان کے فضل و کرم کی دعائیں مانگیں گے۔ ویسے ہندوستان میں بہت سے تیوہار ہوتے ہیں، تقریباً ہر مہینے میں۔“

”عجیب ملک ہے!“ ہایوں نے شانے اچکا دیئے۔

ایک جگہ کسی بہت بڑی پرانی عمارت کے اوپر لمبی ٹانگوں، دموں اور کالے منہ والے پھرتیلے بندر اچھل کود کر رہے تھے۔ ان کے بچے بڑی تیزی کے ساتھ چھلانگ لگا لگا کر چھت سے پھیل اور برگد کے درختوں کے اوپر جاتے اور دوبارہ چھت پر لوٹ آتے تھے۔ بندر ایک دوسرے کا پیچھا کرتے ہوئے زمین پر بھی اتر آتے تھے۔ عمارت کے آس پاس اور احاطے سے گزرتے ہوئے لوگ ان نگوروں کی طرف ذرا بھی توجہ نہیں مبذول کر رہے تھے۔

ہایوں کے ہمراہیوں میں شامل ایک بیگ کی آنکھیں آسان شکار کو دیکھ کر چمک اٹھیں۔ اس نے اپنی کمان سنبھالی لیکن ہندو بیگ نے اسے فوراً ہی ٹوک دیا:

”بندر پر ہتھیار چلانا بہت بڑا گناہ تصور کیا جاتا ہے۔ جو ایسا کرتا ہے اس پر مصیبت نازل ہو سکتی ہے۔“ ہندو بیگ کی آواز بظاہر بڑی غیر جذباتی تھی۔

خواجہ کلاں بیگ نے جو ہایوں کے دائیں جانب چل رہا تھا، مسکراتے ہوئے پوچھا:

”اور محترم بیگ، ہمیں گایوں کی بھی حفاظت کرنی چاہئے نا؟“

”بہت مشکل سے حاصل کی جانے والی چیز بہر حال مقدس ہوتی ہے“ ہندو بیگ نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”ہندوستان کی گرمیوں میں گائے پالنا آسان نہیں ہوتا۔ اور اس سے حاصل ہونے والی پانچ چیزیں ہندوؤں میں مقدس بھی مانی جاتی ہیں۔“

ہمایوں نے اس نوک جھونک کو روکنے کے لئے کہا:

”ہمیں اپنے بادشاہ کے اس احکام کو فراموش نہ کرنا چاہئے کہ ہمیں ہندوستانی رسوم و رواج کا احترام کرنا چاہئے، ایسی کوئی بھی حرکت ہرگز نہ کرنی چاہئے جس سے رعایا کی عزت اور مذہب کو ٹھیس پہنچے۔“

خواجہ کلاں بیگ نے اپنا دایاں ہاتھ سینے پر رکھ کر کہا:

”عالی جاہ کا ارشاد ہمارے لئے قانون کی حیثیت رکھتا ہے، ولی عہد۔ میں تو اپنے دوست ہندو بیگ سے مذاق کر رہا تھا۔“

اتنے میں ان گھڑسواروں کو اونچے اونچے درختوں کے درمیان کوئی بلند مینار دور سے چمکتا ہوا نظر آیا۔

”وہ قطب مینار ہے“ ہندو بیگ نے احترام کے ساتھ بتایا۔

یہ لوگ قطب مینار کے پاس پہنچے تو ہمایوں گھوڑے سے اتر کر بیگوں کے ساتھ مینار کی بلند ترین منزل تک چڑھ گیا۔ وہاں سے واضح طور پر دکھائی دیا کہ مینار کے قریب ہی واقع ایک سیاہ ستون کے ارد گرد کچھ لوگ کھڑے ہوئے ہیں۔

”اور وہ کیا ہے؟“

”وہ ایک آہنی ستون ہے جو چھ سو سال پرانا بتایا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ کوئی شخص اس ستون سے پیٹھ ٹکا کر پبلوں سے اپنے ہاتھوں کو اس کے پیچھے لے جائے اور دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے کو چمکولیں تو وہ بہت خوش نصیب ہوگا اور اس کی دلی مراد بر آئے گی۔“

ہمایوں جو بیگوں کے درمیان اپنے چہرے پر سنجیدگی طاری کئے ہوئے تھا، یہ سنتے ہی نوجوانوں کے جیسے جوش کے ساتھ کہہ اٹھا:

”چلے، ذرا آزما کر تو دیکھیں!“ اور وہ مینار کی چکر دار سیڑھیوں سے جلدی جلدی نیچے اترنے لگا۔

ان لوگوں کے قریب پہنچتے ہی ستون کے قریب موجود لوگ ایک طرف ہٹ گئے۔

”ہندو بیگ صاحب، ذرا دکھائیے تو کیسے کیا جاتا ہے۔“

ستون کے نچلے اور اوپری حصے سیاہ تھے لیکن درمیانی حصہ بے شمار پیٹھوں اور ہاتھوں کی رگڑ

کھاتے رہنے کے بناء پر چمک رہا تھا۔

ہندو بیگ نے ستون سے پیٹھ ٹکا کر ہاتھ پیچھے کئے لیکن لاکھ کوشش کے باوجود ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے کو چھو لینے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔
بیگ یہ دیکھ کر قہقہے لگانے لگے۔

ہمایوں بھی ہنس پڑا۔ اس نے خود بھی کوشش کی لیکن ہندو بیگ ہی کی طرح ناکام رہا۔ بیگوں اور سپاہیوں نے بھی قسمت آزمائی کی لیکن بے سود۔ آخر میں لمبے ہاتھوں والے ایک دبلے پتلے سر قندی نوجوان کو کامیابی نصیب ہو گئی۔

ہمایوں نے اسے انعام کے طور پر مٹھی بھر چاندی کے سکے دے دیئے۔

دہلی کی گلیوں میں منڈلانے والے فاتحین کے درمیان کچھ ایسے لوگ بھی تھے جنہیں ہر وقت عمدہ سے عمدہ مال غنیمت ہی کی فکر لگی رہتی تھی۔ ان میں یار حسین بھی شامل تھا جو کبھی درہ خیبر کے جنوب میں واقع راستوں پر مسافروں کو لوٹنے والا ڈاکو تھا لیکن معاف کر دیئے جانے کے بعد ایک بیگ بن چکا تھا۔ وہ سوتے جاگتے ایسے ہی مال کے خواب دیکھتا رہتا تھا، کئی بار سن چکا تھا کہ ہندوؤں کے مندر میں دولت بھری ہوئی ہے اس لئے اپنے سپاہیوں کو لے کر دہلی کے سرے پر واقع ایک مندر میں پہنچ گیا۔

کتنی دولت بھری تھی یہاں! کیسے بیش بہا موتی جڑے ہوئے تھے دیویوں دیوتاؤں کی صورتوں میں!

مندر کی مرمریں دیواروں پر آفتاب کی شعاعیں رقصاں تھیں۔ سن رسیدہ پجاری جس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے، بھگوان کرشن کے بہت بڑے بت کے سامنے ہاتھ جوڑے محویت کے عالم میں کھڑا تھا۔ عورتیں، بوڑھے اور بچے بھی بت کے سامنے سر جھکائے خاموش کھڑے ہوئے تھے۔

”منتشر کر دو ان کفار کو!“ یار حسین کا حکم گونجا اور اس کے سپاہی پوجا میں کھوئے عقیدت مندوں کو ڈھکیلتے اور گراتے ہوئے بت کی طرف لپکے۔ انہوں نے جلدی سے سیڑھی لگائی اور بت میں لگے ہوئے جواہرات کو اکھاڑنے اور زیورات کو اتارنے لگے۔

ہمایوں نے ان لٹیروں کو جائے واردات ہی پر دیکھ لیا۔

”میں شاہ بابر کی طرف سے حکم دے رہا ہوں!“ وہ آگ بگولا ہو کے چیخ اٹھا۔ ”خبردار جو کسی نے ہیروں، موتیوں کو ہاتھ لگایا! فوراً نیچے اترو!“

یار حسین مندر کے اندر زیادہ اجالا نہ ہونے کے باعث ہمایوں کو پہچان نہ سکا:
 ”یہ چیخ کون رہا ہے؟ تجھے ان کفار کے بچوں کی حفاظت کرنے کی کیا پڑی ہے؟!“ اور اس نے
 بیڑھیوں پر چڑھے ہوئے سپاہی کو حکم دیا: ”خنجر سے اکھاڑ لو جو اہرات کو!“

سپاہی نے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اتنے میں ہمایوں کا چلایا ہوا تیرا اس کی کلائی میں آن لگا اور خنجر
 جھنکار کے ساتھ فرش پر گر گیا۔ سپاہی نے درد کی شدت سے چیختے ہوئے اپنی کلائی تھام لی اور
 بیڑھی سے نیچے گرتے گرتے بچا۔

یار حسین نے تلوار نیام سے کھینچ لی۔

”ارے تو ہے کون؟“ اور وہ ہمایوں کی طرف جھپٹا۔

ہندوبیک فوراً ہی تلوار کھینچ کر آگے آگیا۔

”ارے بیک، ہوش میں آؤ... یار حسین بیک، تمہارے سامنے شہنشاہ بابر کے دلی عہد کھڑے
 ہوئے ہیں!“

یار حسین فوری طور پر ہمایوں کو نہ پہچان سکا۔ اس بات کا یقین ہمایوں کے چوغے کو غور سے دیکھ
 کر ہی ہوا۔ یہ چوغہ جس میں موتی لٹکے ہوئے تھے، پہلے بابر پہنا کرتا تھا۔ پانی پت کی جنگ سے قبل
 ہمایوں نے ابراہیم لودھی کے سپہ سالار حمید خاں کو ایک تصادم میں بری طرح شکست دے دی تھی
 اور بابر نے اس کی شجاعت اور پر عزم سپہ سالاری سے خوش ہو کر فوراً ہی اپنا یہ شاندار چوغہ اتار کر
 ہمایوں کو پہنا دیا تھا۔ اس موقع پر سب بیگمیں کے ساتھ یار حسین بھی موجود تھا۔ ہمایوں اس وقت
 وہی چوغہ زیب تن کئے ہوئے تھا جس کے شانے ڈھیلے ہونے کی بناء پر کچھ لٹکے ہوئے تھے۔

”معافی کا خواستگار ہوں، محترم دلی عہد۔ یہ خادم آپ کو پہچان نہیں سکا تھا“ یار حسین نے کہا
 اور اپنی جگہ سے پیچھے ہٹ گیا۔

”اپنی تلوار مجھے دے دیجئے!“ ہمایوں نے حکم دیا۔

”لیکن دلی عہد، میں تو ان بیگمیں سے ہوں جو انتہائی وفاداری کے ساتھ شاہی خدمات انجام
 دیتے رہے ہیں!“

”عبادت گاہ میں نیام سے کھینچی جانے والی تلوار باعث ننگ ہے۔ میں یہ تلوار فرماں روا کی
 خدمت میں پیش کروں گا... آپ سے صرف یہ کہوں گا کہ... آپ نے لوٹ مار سے جو توبہ کی تھی
 وہ شاید وقتی ہی تھی۔ کیا آپ کو اس شاہی فرمان کا علم نہیں ہے کہ ہندوستان میں، خاص طور سے
 ہندوؤں کے مقدس مقامات پر کسی ایسی کارروائی کی اجازت نہ دی جائے گی جو رضائے الہی کے

مطابق نہ ہو؟ ارے بیگ، آخر اتنی ہوس کاہے کے لئے؟ ہم نے اپنے دشمن ابراہیم لودھی کو شکست دی ہے، اس کے خزانے سے ہمارے سارے سپاہیوں کو حصہ ملے گا۔ آپ کو بھی حصہ ملتا جو آپ کے ضروریات سے کہیں زیادہ ہوتا... یہ لوگ ”ہایوں نے ہندوؤں کی طرف اشارہ کیا، ”ہمارے دشمن تھوڑی ہیں۔ یہ لوگ بھی عبادت کر رہے تھے، اپنے خدا کی ہی سہی لیکن بہر حال عبادت کر رہے تھے۔ ہم قانون کے بموجب حکومت کرنے آئے ہیں جبکہ آپ لوٹ مار پر اتر آئے ہیں۔ ہندوؤں کے بتوں سے ہیرہ تو ابراہیم لودھی کے سپاہیوں تک نے نہیں اکھاڑے تھے۔ ایسی کہیں حرکت کی جرات تو صرف آپ ہی نے کی ہے۔ یہ بات کیا ہم سب کے لئے باعث شرم نہیں ہے؟... یار حسین کی تلوار چھین لو! اسے اور اس کے سپاہیوں کو زنداں میں بند کر دو! ہمارے سارے سپاہیوں کو اس سے عبرت حاصل کرنی چاہئے!“

ہایوں کے حکم کی تعمیل کردی گئی تو اس نے ہندو بیگ کے ذریعے پجاری اور پوجا کرنے کے لئے آئے ہوئے افراد کو مخاطب کیا:

”شہنشاہ بابر آپ سب پر واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ ہم لوگ آپ کے دشمن نہیں ہیں... آپ کا مذہب البتہ مختلف ہے اور آپ کو ہمارے قانون کے مطابق جذبہ ادا کرنا ہوگا۔ تاہم جو لوگ ہمارے خلاف تلوار نہ اٹھائیں گے وہ اطمینان کے ساتھ زندگی گزار سکیں گے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ تمام انسان ایک ہی خدا کے پیدا کئے ہوئے ہیں۔ ہم نیک ارادوں کے ساتھ ہندوستان آئے ہیں۔ ہم اس عظیم ملک کو ہندوؤں کے ساتھ مل کر خوش حال بنانا چاہتے ہیں۔ ان کے شانوں سے شانہ ملا کر... اور ہم آپ کی عبادت گاہوں کا احترام کریں گے۔“

ہایوں کی اس بات کو جس کا ہندو بیگ نے ترجمہ کیا، اکٹھا خاموش کھڑے ہوئے لوگوں نے بڑی توجہ کے ساتھ سنا اور تائید و پسندیدگی کے اظہار کے طور پر اپنے سر ہلا دیئے۔ ہایوں مندر سے چلا گیا تو پجاری ایک بار پھر بت کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اسے اب اپنی حفاظت کے سلسلے میں احسان مندی کا اظہار کرنا تھا، پوجا کے لئے آنے والوں کو یقین دلانا تھا کہ دیوتا کے جواہرات اکھاڑنے کی ذیل کو شش کرنے والے غیر ملکی کو دیوتا کی مرضی کے مطابق سزا مل گئی ہے۔

ہندوستان سے دور دراز واقع دریائے سر کے کناروں پر بہار کا مینہ ٹور، لالے کے اولین پھولوں کے نمودار ہونے کا زمانہ شروع ہی ہوا تھا۔ لیکن جتنا کے کناروں پر ماورائے النہر کے شدید گرمیوں کے ایام کی سی گرمی پڑ رہی تھی۔

بابر دن بھر چلچلاتی دھوپ میں گھوڑے پر سوار رہا تھا اس لئے شام ہوتے ہوتے اس کا جسم تمام دن دھوپ میں رکھے رہنے والے تانبے کے برتن کی طرح تنے لگا۔ اس نے قیامت کی گرمی سے عاجز آکر جتنا کے کنارے جانے کا فیصلہ کیا۔

گرمی کے علاوہ تاب نے بھی جسے وہ دوسرے کے بعد ڈھیروں چڑھا گیا تھا، بدن میں آگ سی لگا رکھی تھی۔ اس کے بیک کابل میں بلا نوشی کے عادی ہو گئے تھے اور اب ہندوستان میں بھی ”عظیم بادشاہ“ کو پانی پت میں حاصل ہونے والی ”عظیم فتح“ کی خوشی میں تقریباً روز ہی پینے پلانے کی محفلیں منعقد کرتے رہتے تھے۔

بابر بے تاب اور دوسری شرا میں یکے بعد دیگرے مسلسل پیتا رہتا تھا جو اس کے سینے میں ناقابل برداشت درد پیدا کرتی اور گرمی اور ٹھن بھری راتوں میں نیندیں حرام کر دیتی تھیں۔ شائد بلا نوشی کے بعد صبحوں کو کھانے پر اکثر اس کے منہ سے خون نکل آتا تھا۔ طبیب یوسفی جو بابر کے قیام ہرات کے زمانے ہی سے اس کا علاج کرتا آ رہا تھا، بار بار ترک مے کی التجائیں کرتا رہتا تھا۔ خود بابر بھی بے خوابی سے پریشان ہو کر کئی بار عہد کر چکا تھا کہ بادہ و جام کو اب کبھی ہاتھ نہ لگائے گا۔ لیکن دن میں اس کا جی اوتا یا کہیں سے کوئی خوش خبری موصول ہوتی تو وہ فوراً ہی مے نوشی کے لئے تڑپ اٹھتا تھا۔ پینے کا سلسلہ شروع کرنے کے بعد اس پر ہلکا ہلکا نشہ طاری ہو جاتا تھا تو اس کے بیک کسی نہ کسی خوشی کے موقعے کا تذکرہ کر کے اصرار کرنے لگتے تھے کہ شغل مے جاری رہے۔ ان لمحات میں بابر بیگوں کی اس تجویز کو فوراً ہی مان لیتا تھا آج بھی یہی ہوا تھا۔ دوسرے کو اس نے نشہ کے عالم میں خود ہی بیگوں کو شام ہی کی نہیں بلکہ تمام شب کی بادہ نوشی کی دعوت دے دی تھی۔ ”آئیے، رات کو دریا پر جشن منائیں“ اس نے شام کو کہا حالانکہ اس کا بدن ٹھکن سے چور چور تھا اور دوسرے کی پی ہوئی مے کے شمار سے سراسیمہ بھی تک بھنا رہا تھا۔

بابر اپنے مقربین اور محافظین کے ساتھ جتنا کے کنارے پر پہنچا تو وہاں اسے ایک برہمن، کچھ عورتیں اور جوان اور بوڑھے مرد دکھائی دیئے۔ کسی مرد کی آخری رسوم ادا کی جا رہی تھیں، بابر نے سوچا کہ دیکھیں یہ رسوم کیسے ادا کی جاتی ہیں اور گھوڑا اس طرف بڑھا دیا جہاں لوگ اکٹھا تھے۔ لیکن یہ لوگ جو پانی پت کی جنگ کے بھیا تک قہے سن سن کر سہمے ہوئے تھے، اجنبیوں کو دیکھتے ہی بھاگ کھڑے ہوئے۔ آخری رسوم ادا کرنے کے لئے آئے ہوئے افراد میں سے صرف تین ہی افراد وہاں رکے رہے: چتا کے قریب کھڑی ہوئی جوان بیوہ، ایک بوڑھی عورت اور برہمن جس کی کمر جھکی ہوئی تھی۔ چتا پر رکھے ہوئے مردے کے سر اور پیشانی کے زخم سے اندازہ ہوتا تھا کہ

موت تلواری کے وار سے واقع ہوئی ہے۔ دراصل وہ بابر کے سپاہیوں کا دلیری کے ساتھ مقابلہ کرنے والوں میں سے ایک تھا۔ نوجوان بیوہ اپنے سنگار کی وجہ سے بے حد خوبصورت لگ رہی تھی۔ بابر نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں دنیاوی راحتوں کو ٹھکرانے اور سر پر منزلاتی ہوئی موت سے بغل گیر ہونے کے عزم کی آئینہ دار تھیں۔

رواج کے بموجب مرنے والے کی بیوی اپنی باقی زندگی بیوگی کی حالت میں گزارتی تھی یا پھر شوہر کی لاش کے ساتھ چتا پرستی ہو جاتی تھی۔ اس عورت نے دوسرے راستے کا انتخاب کیا تھا۔

بابر نے ہندوبیک سے پوچھا:

”کیا یہ عورت واقعی اپنے شوہر کی میت کے ساتھ جل مرے گی؟ مرے کی خاطر یہ جیتی جاگتی خوبصورتی تباہ ہو جائے؟ آخر یہ کیسی بے انصافی ہے؟ اس برہمن کو میری طرف سے حکم دیجئے کہ عورت کو یہاں سے واپس لے جائے!“

ہندوبیک نے شک کے ساتھ سر ہلایا پھر اپنے گھوڑے کو چتا سے کچھ اور قریب بڑھالے گیا اور برہمن کو بابر کے حکم سے مطلع کیا۔

عورت تیزی کے ساتھ بابر کی طرف مڑی۔

”تو ہی ہے حملہ آوروں کا بادشاہ؟“ اس نے پوچھا اور بابر زبان نہ جاننے کے باوجود عورت کے اس سوال کو بھی سمجھ گیا اور اس بات کو بھی جسے عورت نے فوراً ہی چیختے ہوئے کہا:

”آخر تو یہاں کیوں آگیا؟ تیرے ہی حکم پر تو میرے شوہر کو ہلاک کر دیا گیا تھا! تیرے بس میں ہو تو میرے شوہر کو دوبارہ زندہ کر دے! کر دے نازندہ! اس صورت میں میں بھی زندہ رہوں گی!“

اس کے بعد عورت نے فوراً ہی برہمن کی طرف مڑ کر جلدی جلدی کہا:

”میں شوہر کے سر کو گود میں رکھ کر جیسے ہی چتا پر بیٹھوں ویسے ہی آپ آگ لگا دیجئے!“

ہندوبیک باوہل ناخواستہ عورت کی ان باتوں کا ترجمہ کر کے بابر کو بتانے لگا۔ اس اثناء میں برہمن نے گھبراہٹ کی حالت میں چتا میں آگ لگا دی۔ نوجوان عورت لپک کر چتا پر بیٹھ گئی اور اس نے شوہر کے سر کو اپنی گود میں رکھ لیا۔

”روکو، روکو اسے، عورت جل مرے گی!“ بابر زور سے چلایا۔

”چلا جا، حملہ آور! دور ہو جا میری نگاہوں سے سے! لوٹ جا اپنے ملک کو!“ بھڑکتے ہوئے شعلوں میں گھری عورت چیخ اٹھی۔

بابر نے یہ دردناک چیخ سنی اور دیکھا کہ عورت شعلوں کی پروانہ کرتے ہوئے شوہر کی میت کو

لپٹائے ہوئے ہے۔ اسے تیز چراند کے باعث مٹلی آنے لگی، گھوڑے کا رخ موڑ کے چابک مارا اور وہاں سے چل دیا۔

جنما کی ایک بند کھاڑی میں جہاں شام کے وقت ماحول ٹھنڈا اور پرسکون تھا، بہت بڑی اور آراستہ دو منزلہ کشتی بابر کی منتظر تھی۔ نیچے رکاب دار انواع و اقسام کے کھانے پکا رہے تھے اور اوپر ضیافت کی تیاریوں کو آخری شکل دی جا رہی تھی۔

مغموم اور خاموش بابر کشتی کی چھت پر گیا جہاں بڑے سے چھترے کے نیچے اس کے بیٹھنے کے لئے ایک بلند جگہ کو خاص طور سے آراستہ کیا گیا تھا۔

لیکن وہ خوبصورت بیوہ اپنے کھلے ہوئے بالوں اور ترک دنیا کے جذبات سے معمور آنکھوں کے ساتھ اب بھی بابر کی نگاہوں میں منڈلا رہی تھی، بھڑکتے ہوئے شعلوں میں لپٹی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ نیچے سے سچ کبابوں کی لطیف خوشبوئیں فضا میں پھیل رہی تھیں لیکن بابر کے دل و دماغ پر اب بھی وہی مٹکی پیدا کرنے والی چراند حاوی تھی۔ اس نے حکم دیا کہ کھانوں کی تیاری فوراً بند کر دی جائے۔ ”لیکن اعلا حضرت، ضیافت کا کیا ہو گا؟“ میر مٹنی نے حیرت سے پوچھا۔

”سب کو روک دیجئے! نیچے ساری بھاگ دوڑ بند کر دیجئے!“

چند لمحات کے اندر ہی کشتی پر سناٹا چھا گیا۔

لیکن سناٹے میں کچھ اور بھی زیادہ واضح طور پر بابر کے کانوں میں ہندو بیوہ کے سہی ہونے سے قبل چیخ چیخ کر کئے ہوئے الفاظ گونجنے لگے: ”آخر تو یہاں کیوں آگیا، حملہ آور؟ دور ہو جا میری نگاہوں سے! لوٹ جا اپنے ملک کو!“

کتنا مسرور ہوا تھا وہ پانی پت کی جنگ میں اپنی فتح پر! یقیناً وہاں ایک خلیج منہ پھاڑے ہوئے اس کی منتظر تھی لیکن اس نے دلیری کے ساتھ چھلانگ لگا کر اسے پار کر لیا تھا اور پھر جنگ اور خون خرابے کے بغیر ہی دہلی اس کے قبضے میں آگئی تھی۔ اسے کتنا زیادہ یقین تھا اس بات کا کہ اب سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا! لیکن جو کچھ اس کے وجود کی اندر پنہاں تھا۔ پہلی مہم کے دوران اس کے سپاہیوں کے ہاتھوں ہونے والی لوٹ مار اور قتل و غارت کی یادیں، موت کا شکار ہو جانے والوں کا غیر ارادی شمار، صرف انہی کا نہیں جو مسلح ہو کر اس کے مقابلے کے لئے نکلے تھے بلکہ ان پر ائے بچوں کا بھی شمار جو اس کی فتوحات کے نتیجے میں یتیم ہو گئے تھے، ان نوجوان عورتوں کا بھی شمار جو بیوہ ہو گئی تھیں (یا خدا! کیا وہ عورتیں بھی اسی عورت ہی کی طرح زندہ جل کر خاک ہوئی جا رہی تھیں؟!)۔ ساری پنہاں اذیتیں، دل کے تمام پنہاں ناسور ایک بار پھر ہرے ہو گئے، چیخ اٹھے، لعنت ملامت کرنے لگے،

کچوکے لگانے لگے۔ اس تاسف کے سامنے ”سچ مذہب“ اور یہاں تک کہ مختلف ذاتوں اور مذہب والے عظیم ملک کو متحد کرنے اور پر آسائش بنانے کے خیال کی بھی وقعت ہی کیا تھی! فاتح کی نخوت و تکبر پر مبنی دانائی اسے تسلی دینے لگی، حق بجانب ثابت کرنے لگی لیکن اس کی روح... بابر کو یاد آگیا کہ وہ اپنی اس مہم پر روانہ ہو رہا تھا تو مہم بیگم نے کتنی تشویش ظاہر کی تھی، کتنی پریشان تھی وہ۔ اس نے سوچا کہ مہم کو بیوی اور ماں کی حیثیت سے آج کی ان تکالیف کا یقیناً پہلے ہی سے علم ہو گیا تھا۔

”تیرے ہی حکم پر تو میرے شوہر کو ہلاک کر دیا گیا تھا! تیرے بس میں ہو تو میرے شوہر کو دوبارہ زندہ کر دے، تب میں بھی زندہ رہوں گی!“ بابر کو زمین بھٹتی ہوئی سی محسوس ہوئی۔ اس نے سوچا نہیں، خطرناک ترین خلیج پیچھے نہیں چھوٹ گئی ہے، یہ پانی پت کے میدان میں تھی ہی نہیں۔ خلیج تو آگے ملنے والی ہے! پنجاب میں راستہ بتانے والا وہ آدمی جو جان بچا کر بھاگ نکلے میں کامیاب ہو گیا تھا... کیا نام تھا؟... لال چند... اس نے بھی تو چیختے ہوئے کہا تھا: ”حملہ آور! غیر ملکی! جلاد! تو نے میرے ہزاروں بھائیوں کو قتل کرا دیا!“... ٹھیک ہی تو ہے، بھلا وہ لوگ جنہیں حملہ آوروں کے ہاتھوں آلام و مصائب کا شکار ہونا پڑا، جو حملہ آوروں سے ہونے والی لڑائیوں میں اپنے اعزاء و اقارب سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گئے، اور سوچ بھی کیا سکتے ہیں؟ ہونہ، یہ تیرے شہر نہیں ہیں، تیرے گاؤں نہیں ہیں، بابر۔ ”اپنے ملک کو واپس جا!...“ کس ملک کو؟ کہاں؟ بھلا وہ کسے قاتل کر سکتا ہے، بھلا کون قاتل ہو جائے گا کہ وہ نیک مقاصد کے تحت ہندوستان آیا ہے؟ غلط فہمی کی اس خلیج کو کیا وہ آج نہیں توکل پار کر سکے گا؟

بابر کے دل میں مکمل مایوسی اور بے بسی کے تکلیف دہ جذبات، کسی ایسے نامراد شخص کے جذبات کروٹیں لینے لگے جس کے افعال سے ہمیشہ ہی توقعات کے برعکس نتائج رونما ہوتے ہوں، جس کی فتوحات تک کنکستوں میں بدل جاتی ہوں۔ آخر مقدر نے اسے فتح ماورالنہر میں کیوں نہیں دلائی تھی؟ وہ جانتا تھا، محسوس کرتا تھا کہ پانی پت میں اسے جو فتح حاصل ہوئی ہے اسے صدیوں تک سراہا جاتا رہے گا لیکن آج... آج تو فاتح ہونا ایک ایسا کلک کا ٹیکا تھا جسے وہ اپنی پیشانی سے مٹا نہیں سکتا تھا... آج اس کی سمجھ میں آگیا کہ اپنی فتح کے سلسلے میں دو روز قبل جذبات مسرت کی ترجمانی کرنے والی غزل کہنے میں کیوں ناکام رہا تھا۔

اس کی بیاض میں صرف قلم زد کئے ہوئے مصرعے ہی باقی رہ گئے تھے۔ دراصل دو روز قبل بھی وہ حقیقی مسرت سے ہم کنار نہیں ہو سکا تھا۔ اس مسرت میں تلخی مضمر تھی جو اب واضح ہو گئی تھی۔

یہ تلخی ہی حقیقت تھی۔

بابر نے قلم اٹھایا اور پہلا مصرعہ چشمے کی طرح پھوٹ نکلا:

بدبختی میری جان کی دشمن بلا ہوئی

اس نے اپنی نگاہیں دوری پر، سطح دریا پر جمادیں۔ دھارا بڑے پرسکون انداز سے بہہ رہا تھا۔ غروب ہوتے ہوئے آفتاب کی ارغوانی شعاعیں سطح آب پر رقصال تھیں، آنکھوں کو خیرہ کئے دے رہی تھیں۔ لہروں پر خون دکھائی دے رہا تھا، چاروں طرف خون ہی خون۔

بابر نے اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا:

بدبختی میری جان کی دشمن بلا ہوئی

ہر کام میرا 'بگڑا' خطا پر خطا ہوئی

بدقسمتی سے چھوڑا وطن، ہند آگیا

یارب میں کیا کروں، مری حالت یہ کیا ہوئی

شام کے جھپٹے میں چار چپوؤں والی ایک ناؤ جس کے اوپر شاندار چھترتا ہوا تھا، شاہی کشتی کے قریب آکر ٹھہر گئی۔ پیریدار نے پکارا:

”کون ہے؟“

بابر کان لگا کر سننے لگا۔

”مرزا ہایوں شہنشاہ سے ملاقات کی اجازت چاہتے ہیں“ ناؤ پر سے کسی نے جواب دیا۔

بابر خود بھی بیٹے سے تنہائی میں دل کھول کر باتیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے میر خدام کو بلا کر حکم دیا:

”کہہ دیجئے کہ مرزا ہایوں فوراً ہی میرے پاس آسکتے ہیں۔“

جلد ہی سیڑھیوں پر قدموں کی ہلکی ہلکی آوازیں سنائی دیں اور ہایوں اس کے قریب آگیا۔ آنکھیں جوش شباب کی آئینہ دار تھیں، مونچھیں ابھی تک کھنی نہیں ہوئی تھیں لیکن چوڑے چکلے شانوں اور سینے سے مردانگی پھوٹی پڑ رہی تھی۔ ابھی ہایوں کا دل نہ کسی درد سے آشنا تھا اور نہ جسم کسی قسم کے کمزوری سے۔

”اٹھارہ سال کی عمر میں تو میں بھی ایسا ہی تھا۔ اس زمانے کے بانک پن میں سے اب مجھ میں بچا ہی کیا ہے؟“ بابر نے سوچا اور دوسرے ہی لمحے اسے محسوس ہوا کہ سینے اور سر کے درد میں اضافہ ہو گیا ہے۔

صاحب سلامت کے بعد ہایوں نے اپنے والد کے سامنے بیٹھ کر کرکری میٹھی کچھ ڈھیلی کی اور

مکراتے ہوئے سیپ کے کام کا ایک ڈبہ نکالاجے وہ لباس کے نیچے سینے پر چھپا کر رکھے ہوئے تھا۔
 ”اسے کھول کر ملاحظہ کیجئے، عالی جاہ۔“

بابر نے ڈبے کو کسی غلت کے بغیر کھولا تو دیکھا کہ اس کے اندر مٹل کے اوپر ستارے کی طرح جگمگاتا ہوا کوئی جوہر رکھا ہوا ہے۔ وہ حیرت میں پڑ گیا: ہیرا ہے کیا؟ ہیرا اور اخروٹ جتنا بڑا؟ وہ اپنی زندگی میں کتنے ہی ہیرے دیکھ چکا تھا لیکن اتنا بڑا کبھی بھی نہیں دیکھا تھا اور تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ ہیرا اتنا بڑا بھی ہو سکتا ہے۔

”یہ کون سا جوہر ہے؟“

”ہیرا۔“

”وزن کتنا ہے؟“

”کوئی سات آٹھ مثقال ☆۔“

”ہیرا اور اتنا بڑا؟“

”عالی جاہ“ میں نے ایک جوہری کو طلب کر کے اس ہیرے کو دکھایا تھا۔ پتا چلا کہ یہ تو مشہور ہیرا کوہ نور ہے۔ دنیا کا سب سے بڑا ہیرا۔ اس کی قیمت تو سونے سے بھرے ہوئے کئی صندوقوں سے بھی زیادہ ہے۔“

”میں نے سنا ہے کہ بنگال کے سلطان علاؤ الدین کے پاس کوئی بہت شاندار ہیرا ہے جو دوسرے ہیروں سے کہیں زیادہ خوبصورت اور قیمتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی قیمت اتنی زیادہ ہے کہ کسی بڑے سلطنت کے پورے مہینے بھر کے اخراجات کے لئے کافی ہو سکتی ہے۔“

”اور جوہری کا کہنا ہے کہ کوہ نور کی قیمت اتنی زیادہ ہے کہ دنیائے اسلام کے سارے ملکوں کے ڈھائی دنوں کے اخراجات کے لئے کافی ہو سکتی ہے۔۔۔ واقعی اس نے یہی کہا تھا۔“ اور ہایوں نے تہقہ لگایا۔

”لیکن یہ آپ کو کہاں مل گیا؟“

ہایوں نے قدرے ہچکچاہٹ کے ساتھ جواب دیا:

”مجھے بطور تحفہ ملا ہے۔۔۔ گوالیار کے مہاراجہ کے خاندان کی طرف سے۔“

”کس خوشی میں؟“

ہایوں نے یہ قصہ شراتے ہوئے شروع کیا لیکن دھیرے دھیرے اس کی جھجک ختم ہو گئی۔
 ”عالی جاہ کو یہ تو معلوم ہی ہے کہ مہاراجہ و کراجیت جن کا خاندان متمول سلطنت گوالیار پر سو

برسوں سے حکومت کرتا رہا ہے، ابراہیم لودی کی اطاعت قبول کرنے پر کسی بھی طرح تیار نہیں ہوئے تھے اور سلطان دہلی سے عرصے تک جنگ کرتے رہے تھے۔ اس کے باوجود وہ گوالیار شہر کو ابراہیم کے حوالے کر دینے پر مجبور ہو گئے تھے اور خود شمس آباد چلے آئے تھے جہاں ان کا انتقال ہو گیا تھا۔“

پانی پت کی فتح کے بعد بابر کے گھڑسوار دستوں نے ہمایوں کی کمان میں شمس آباد پر قبضہ کر لیا تھا۔ وہاں کے قلعے میں مہاراجہ کی بیوہ، دو بیٹیاں اور ایک بیٹا مقیم تھے۔ مہاراجہ کے بیس سالہ بیٹے نے ہمایوں کو یقین دلایا تھا: ”ابراہیم لودی صرف آپ ہی کا نہیں بلکہ ہمارا بھی دشمن تھا۔ ہمیں بھی خوشی ہوئی کہ ابراہیم کو ہمیشہ کے لئے کچل دیا گیا۔ اب آپ ہمیں شمس آباد سے اپنے وطن گوالیار لوٹ جانے کی اجازت دے دیجئے۔“

ہمایوں نے نوجوان مہاراجہ کے ساتھ ہمدردانہ طرز عمل اپنایا لیکن اس نے کہا کہ مہاراجہ کے خاندان کو گوالیار واپس لوٹ جانے کی اجازت وہ خود نہیں دے سکتا، یہ فیصلہ اس کے والد کے ہاتھوں میں ہے اس لئے مہاراجہ کے خاندان کو بابر کے شمس آباد پہنچنے تک انتظار کرنا چاہئے۔ ہمایوں نے یہ بھی کہا کہ مہاراجہ کے قلعے کی حفاظت کے لئے وکیس بیگ کی نگرانی میں پچاس بہترین سپاہی مامور کر دیئے جائیں گے۔۔۔ رات کو ہمایوں جو قلعے کے باغ میں نصب کئے جانے والے خیمے میں سو رہا تھا، قلعے کے اندر ہونے والی شور و غل اور چیخوں سے بیدار ہو گیا۔ وہ اپنے محافظین کے ساتھ فوراً ہی تیزی سے قلعے کے اندر داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ دیوان خانے کے دروازے پر وکیس بیگ کا ایک سپاہی خون میں لت پت مردہ پڑا ہوا ہے اور اٹھارہ سالہ راج کمار میڑھیوں پر بیٹھی ہوئی اپنے برہنہ شانوں کو ڈھکنے کے لئے فرش پر گرے ہوئے ساری کے پلو کو مرتعش ہاتھوں سے اٹھانے کی کوشش کر رہی ہے۔ ہمایوں نے یہ بھی دیکھا کہ پانچ سپاہی راج کمار کی بھائی کو گھیرے ہوئے اس کے ہاتھ سے تگوار چھین رہے ہیں۔

دراصل وکیس بیگ کو دونوں راج کماریوں میں سے ایک پسند آگئی تھی جسے اس نے کچھ سپاہیوں کی مدد سے زبردستی اپنے کمرے میں اٹھالے جانے کی کوشش کی تھی۔ نوجوان مہاراجہ اپنی بہن کی حفاظت کے لئے آن پہنچا تھا اور اس نے تگوار کے وار سے اس سپاہی کو مار گرایا تھا جو راج کمار کو اٹھالے جانے کی کوشش کر رہا تھا۔

ہمایوں نے فوراً حکم دیا کہ مہاراجہ کو چھوڑ دیا جائے۔

”بہن کی عزت بچانے والے بہادر کا احترام کیا جانا چاہئے“ ہمایوں نے ظالم سپاہیوں کو قہر آلود

نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کیا تم لوگوں نے اس شاہی فرمان کو نہیں سنا کہ ہندوستان کے عالی نسب افراد کے ساتھ ادب و احترام سے پیش آنا چاہئے؟ وکیس بیگ کو شاہی فرمان کی خلاف ورزی کرنے کے جرم میں کال کوٹھری میں بند کر دو! اور زور زبردستی میں اعانت کرنے والے ان سپاہیوں کو دس دس درے مارو!“

اس کے بعد ہمایوں نے بیوہ مہارانی سے ملاقات کی۔ اس عالی نسب اور تعلیم یافتہ عورت نے جو کئی زبانوں پر عبور رکھتی تھی، ہمایوں سے فارسی میں کہا:

”شہزادے، اس دُبے میں ہماری سب سے قیمتی چیز رکھی ہوئی ہے۔ لیکن میرے لئے میرے بچے دنیا کی ہر شے سے زیادہ عزیز ہیں۔ آپ نے میری بیٹی کی عزت اور میرے بیٹے کی جان بچائی اور اس طرح مجھے میری زندگی لوٹا دی۔ اظہارِ ممنونیت کے طور پر یہ ہیرا آپ کی خدمت میں پیش کر رہی ہوں۔ مہربانی کر کے قبول فرمائیے۔“

ہمایوں نے اس قصے کو ختم کرتے ہوئے اپنے والد کی طرف قدرے تشویش کے ساتھ دیکھا۔ ”میں نے ٹھیک تو کیا“ اس نے سوچا۔ ”لیکن ہمارے سپاہی کے ہلاک کئے جانے کا بدلہ نہ لیا جاسکا اور وکیس بیگ کو بھی شاید ضرورت سے کچھ زیادہ ہی سخت سزا ملی۔ کچھ بھی ہو، وہ بہر حال ہمارا بیگ ہے۔“

”صد افسوس کہ اتنے خوبصورت ہیرے پر بھی خون اور ظلم و جبر کے داغ لگ گئے!“

”عالی جاہ، اگر مجھ سے اس معاملے میں غلطی سرزد ہو گئی ہے تو مجھے معاف کر دیجئے۔ میں نے تو سوچا تھا کہ جن لوگوں کے نزدیک عزت اور آن دنیا کے سب سے قیمتی ہیرے سے بھی زیادہ اہمیت رکھتے ہوں وہ خواہ بے دین ہی کیوں نہ ہوں، غیر مسلم ہی کیوں نہ ہوں... پھر بھی...“

”ارے فرزند عزیز، آپ کو اپنی صفائی پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ آپ کا طرزِ عمل انتہائی شریفانہ تھا اس ملک میں بھی فیاض اور بے لوث لوگ پائے جاتے ہیں آخر ہم یہاں یوں ہی تھوڑی آئے ہیں ہمیں فوجی نیک نامی تو چاہئے لیکن ایک اور طرح کی بھی، غیر فوجی نوعیت کی بھی نیک نامی کی بھی ضرورت ہے۔ کچھ بیگ، خود غرض اور اجڈ سپاہی میرے اعلا و ارفع مقصد کو بھی نہیں سمجھتے ان لوگوں کو تو کسی بھی قیمت پر بس ٹھوس ٹھوس کر پیٹ بھرنے، خوبصورت رقاصوں کے ساتھ رنگ رلیاں منانے، ہیکڑی جتانے اور مال و دولت بٹورنے کے لئے پڑی رہتی ہیں۔ یہ لوگ اپنی سفاکی، خود غرضی اور جہالت سے ہندوستانیوں میں خوف و ہراس پھیلا رہے ہیں جب کہ ہم یہاں ایک طاقت ور سلطنت کے قیام کی، اس سلطنت کی اچھی اور مستحکم بنیاد رکھنے کی فکر میں ہیں۔ یہ

ہے ہمارا اہم ترین مقصد۔ جب یہ مقصد پورا ہو جائے گا تو یہاں خانہ جنگیاں ختم ہو جائیں گی، چاروں طرف امن و سکون کا دور دورہ ہوگا اور علوم و فنون کی ترقی کی راہیں ہموار ہو جائیں گی۔ ہندوستان میں ایسے مسلمان اور غیر مسلمان حکمران بھی پائے جاتے ہیں جو ہمارے اس مقصد کو سمجھتے ہیں اور اسی لئے ہم سے تعاون کر رہے ہیں۔ ہماری کوشش ہونی چاہئے کہ ہم زیادہ سے زیادہ ہندوستانیوں کا اعتماد حاصل کر لیں، ان کے دلوں کو مسخر کر لیں۔“

”دلوں کو مسخر کر لیں؟ اعتماد حاصل کر لیں؟“ ہمایوں نے سوال کیا۔ ”کہیں ہارنے والے بھی جیتنے والوں سے محبت کیا کرتے ہیں! وہ جزیہ بھی ادا کریں اور ہم سے تعاون بھی کریں۔ بھلا ہم ایسے لوگوں کا اعتماد کیسے حاصل کر سکتے ہیں جو ہمیں غیر تصور کرتے ہیں، جو اپنے شہروں اور گاؤں کو چھوڑ چھوڑ کر جنگلوں کو بھاگ رہے ہیں تاکہ ہماری اطاعت نہ قبول کرنی پڑے؟“

بابر کو ایک بار پھر وہ سنی ہونے والی عورت یاد آگئی جس نے اسے بددعا دی تھی۔ اس نے سوچا، ”ہاں، ہمارے اور ان لوگوں کے درمیان واقعی ایک خلیج حائل ہے۔“

”ہاں، ہمارے اور ان لوگوں کے درمیان...“ بابر نے نرم لہجے میں جواب دیا، ”جنہیں ہمارے سپاہیوں کے ہاتھوں مصائب کا شکار ہونا پڑا، ایک گہری خلیج حائل ہے۔ ہم اس خلیج کو ایک ہی کوشش سے تو نہیں پار کر سکتے اور فرزند عزیز، بچ پوچھے تو مجھے بھی کبھی کبھی شک ہونے لگتا ہے کہ ہم اس خلیج کو کبھی پار بھی کر سکیں گے۔ لیکن مایوسی کے لمحات گزر جاتے ہیں تو میں سوچتا ہوں کہ... اور آپ نے جو واقعہ بیان کیا اس سے بھی میرے اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے کہ ہم صبر سے کام لیں گے تو دھیرے دھیرے اس خلیج کے اوپر پل تعمیر کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ یہ بہت دشوار اور پیچیدہ کام ہے...“ بابر نے چوکی کے اوپر سے سیپ کے کام والے ڈبے کو اٹھا لیا، ”پھر بھی مجھے ابھی امید ہے کہ اس مقصد کو حاصل کیا جاسکتا ہے۔ آخر آپ بھی تو گوالیار کے مہاراجہ کے خاندان والوں کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے نا؟ اور یاد ہے نا آپ کو کہ دہلی کے ایک عبادت گاہ میں آپ نے ہندوؤں کے جذبات کو ٹھیس نہیں لگتے دی تھی؟ آپ کے مہر و قتل اور وائش مندی کا سب سے مناسب انعام یہی ہیرا ہے۔ اسے لے لیجئے...“

”نہیں عالی جاہ“ ہمایوں نے ڈبے کو چھوا تک نہیں اور ہاتھ سینے پر رکھ لئے۔ یہ ہیرا تو میں آپ کو نذر کرنے کے لئے لایا ہوں!“

بابر نے ڈبے کو دوبارہ چوکی پر رکھ دیا اور بڑے جذباتی لہجے میں کہا:

”خدا کا ہزار ہزار شکر کہ اس نے آپ کو فیاض اور نیک بنایا اور ساتھ ہی ساتھ شجاع بھی۔ پانی

پت کی جنگ میں آپ نے ہی تو اپنے گھڑسوار دستوں کے حملے سے قسمت کے ترازو کا پلڑا ہمارے حق میں جھکا دیا تھا۔ آپ ہی کی بدولت ہمارے لشکر کے حوصلے بلند ہو گئے تھے اور ہمیں فتح نصیب ہوئی تھی۔ اس سب کے لئے آپ میں ابھی تک آپ کو کوئی انعام نہیں دے سکا ہوں۔“

”آپ اس سے قبل ہی جو تحائف عطا کر چکے ہیں وہ میری زندگی بھر کے لئے کافی ہوں گے“

ہمایوں نے باہر کو اس کی کتاب ”مبین“ کی یاد دلانے کے لئے کہا۔ ”اسی وجہ سے عرصے سے میری دلی آرزو تھی کہ آپ کی خدمت میں کوئی شایان شان تحفہ پیش کر سکوں۔“

”خیر ٹھیک ہے، میں اس تحفے کو قبول کرتا ہوں۔ اب یہ ہیرا میرا ہو گیا؟“

”یقیناً“

”خدا نے مجھے آپ جیسا فرزند عطا کیا ہے۔ یہ تحفہ دنیا کے سارے ہیروں سے بھی زیادہ قیمتی ہے۔۔۔ آپ کو بخوبی علم ہے کہ حکمران اور ان کے بیٹے تخت و تاج اور مال و زر کے لئے ایک دوسرے سے کس سفاکی سے، کیسے مکرو فریب سے پیش آتے رہے ہیں۔ میری تمنا ہے کہ میرے اور میری اولاد کے درمیان اس قسم کی صورت حال ہرگز نہ پیدا ہو۔ آپ میرے دلی عہد ہیں۔ خدا کرے کہ مجھ سے آپ کو اور آپ سے آپ کی اولاد کو صرف نیک منصوبے اور دلوں کا ایثار ہی بطور میراث ملے۔۔۔ ایسا ہو گا تو ہمارے وہ مقاصد پورے ہو جائیں گے جن کے لئے ہم ہندوستان آئے ہیں۔“

”ان مقاصد کی تکمیل کے لئے آپ کا بیٹا سب کچھ حتیٰ کہ اپنی جان تک قربان کرنے کو تیار ہے۔“

”مجھے اس کا یقین ہے اور آپ یقین ماننے کہ اس نایاب ہیرے کے مستحق صرف آپ ہی ہیں۔ میری طرف سے اسے قبول کیجئے۔“

ہمایوں نے اس لمحے کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے فوراً ہی کھڑے ہو کر تعظیماً ”سرجھکایا اور ڈبے کو اپنے والد کے ہاتھ سے لے کر آنکھوں سے لگا لیا۔

”بیٹھے، بیٹھے“ باہر نے کہا اور زور سے تالی بجائی۔ ایک خدمتگار حاضر ہوا تو باہر نے جوانوں جیسی جو شیلی اور کھنکشی ہوئی آواز سے حکم دیا: ”ہندوبیک اور خواجہ خلیفہ کو یہاں بھیج دیجئے، یہ لوگ کشتی ہی پر کہیں ہوں گے۔“ پھر اس نے رازدارانہ انداز سے ہمایوں کی طرف جھکتے ہوئے کہا: ”اگرہ کے قلعے میں سلطان ابراہیم کی ماں، اس کا بیٹا اور وزیر ملک داد کرانی پھاٹک بند کئے بیٹھے ہیں۔ کوئی ایک ہزار سپاہی بھی قلعے میں موجود ہیں۔ کہتے ہیں کہ ان لوگوں نے آخر دم تک لڑتے رہنے کی قسم

کھائی ہے۔“

خواجہ خلیفہ اور ہندوبیک آکر کورنش بجالائے۔ بابر نے انہیں اپنے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور پہلے ہی طرح جوانوں جیسے پر جوش لہجے میں کہا:

”آپ لوگ میرے سفیر ہوں گے۔ آپ کو آگرہ جانا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ لڑائی کے بغیر ہی قلعے پر قبضہ ہو جائے۔ جو لوگ قلعے میں موجود ہیں ان سب کی جان بخش دی جائے گی۔ سلطان ابراہیم کی والدہ کو جتنا کے کنارے ایک جاگیر دے دوں گا۔ سنا ہے کہ ابراہیم کا بیٹا کافی تعلیم یافتہ ہے، عربی، فارسی پر کافی عبور رکھتا ہے۔ اسے میں اپنے درباریوں میں شامل کر لوں گا۔ میں نے یہ بھی سنا ہے کہ ملک داد کرانی بھی لائق وزیر ہے۔ اسے میں ہندوستان کے پیچیدہ معاملات میں اپنے مشیر بنالوں گا۔ ان لوگوں سے باتیں کر کے انہیں میرے ان فیصلوں کا یقین دلادیتے ہو گا اور کہئے گا کہ اگر ان کی کوئی اور خواہش ہوگی تو اس سلسلے میں بھی حتی الامکان ان کی مدد کرنے کو تیار ہوں۔ ان پر واضح کر دیتے ہو گا کہ قلعے پر دھاوا بول کر قبضہ کر لینے کے لئے ہمارے پاس ضرورت سے زیادہ ہی فوج موجود ہے لیکن ہم خون خرابے اور لوگوں کے ہلاک کئے جانے پر، بیواؤں اور یتیموں کی تعداد میں اضافہ کرنے پر باہمی مصالحت کو ترجیح دیتے ہیں۔ مختصر یہ کہ آپ کا کام قلعے کی تسخیر کے بجائے وہاں موجود افراد کے دلوں کو مسخر کرنا، ان کا اعتماد حاصل کرنا ہے۔“

آگرہ

۱

ابراہیم لودھی کی ماں بیدہ پانی پت کے میدان میں کام آجانے والے بیٹے کے غم میں ماتمی لباس پہنتی تھی تاہم اس نے ہندوبیک اور خواجہ خلیفہ سے گفتگو کے دوران اپنے مفادات کی دانش مندی اور عزم کے ساتھ حفاظت کرنے میں اپنے مغموم دل اور ماتمی لباس کو ذرا بھی رکاوٹ نہ ڈالنے دی۔ یہ دونوں بیدہ کو آگرہ چھوڑنے کے لئے بڑی مشکل ہی سے راضی کر سکے۔ شاہی آن بان والی یہ متکبرانہ سیدہ عورت جتنا کے کنارے پر بابر کو قلعے کے پھانکوں کی کنجیاں سپرد کرنے لگی تو اس کی آنکھیں تو ضرور نم ہو گئیں لیکن ٹٹنٹے میں ذرا بھی فرق نہ آیا۔

ایسی ابھری چوڑی پیشانی، ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ایسی بھوس شاید کہیں پہلے بھی تو دیکھی تھیں؟ بابر نے سوچا اور اسے اچانک پانی پت کا میدان یاد آگیا۔ کشتوں کے پشتوں میں ابراہیم لودی کی لاش تلاش کر لی گئی تھی، رواج کے بموجب سر قلم کر کے نیزے پر اٹھایا گیا تھا اور لاکر بابر کے سامنے پیش کر دیا گیا تھا۔ اس وقت اسے ایسا لگا جیسے خود ابراہیم لودی اپنی مفتوح ماں کی شکل میں

فاتح کے سامنے آن کھڑا ہوا ہو۔ بابر بری طرح بوکھلا سا گیا، اس نے عجیب ناقابل فہم سی پر عقیدت خفت محسوس کرتے ہوئے اس مغرور عورت کی طرف دیکھ کر پوچھا کہ اس کی کوئی اور خواہش تو نہیں ہے۔

بیدہ نے جلدی سے آنسو پونچھ کر دھیرے سے جواب دیا:

”مجھے اب اور کوئی اذیت نہ دی جائے۔“

بابر نے اپنے درباریوں سے کہا:

”آپ صاحبان ان عالی نسب خاتون کو میری منہ بولی والدہ تصور کر کے احترام کریں!“

درباریوں نے اپنے سروں کو خم کر کے اس شامی حکم کی تعمیل پر آمادگی ظاہر کی۔ بیدہ نے بھی اظہار ممنونیت کے طور پر پل بھر کے لئے سر خم کر لیا لیکن یہ بھی کوئی نہ دیکھ سکا کہ اس کی خم آنکھوں میں نفرت کی فحجر کی سی چمک نمودار ہو کر دوسرے ہی لمحے غائب ہو گئی۔ اسے پانی پت کی شکست فاش اور سلطان ابراہیم کے کام آجانے کی خبر موصول ہوتے ہی ایسا لگا تھا جیسے آسمان پھٹ پڑا ہو۔ اس کی دل میں شدید خواہش پیدا ہوئی تھی کہ بیٹے کی میت ہی کو ایک بار دیکھنا نصیب ہو جائے، اس کی تجینز و تکلفین کا انتظام کرے اور اس کی قبر پر آنسو بہا کر دل کو کچھ تسکین دے سکے۔ لیکن اگر وہ پانی پت تک تیز رفتار گھوڑے پر بھی پورے تین دنوں کا سفر تھا۔ یہی سبب تھا کہ اس کے بھیجے ہوئے آدمیوں کو ابراہیم کی لاش نہیں مل سکی تھی، صرف اتنا ہی پتا چل سکا تھا کہ جنگ ختم ہونے کے بعد ابراہیم کا سر قلم کر کے بابر کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔

بیٹے کی میت کی اس بے حرمتی کی خبر سن کر ماں کو کچھ اور بھی زیادہ اذیت پہنچی لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کے سینے میں انتقام کی آگ بھڑک اٹھی۔ ”ہائے میرے لخت جگر، تجھے دنیا میں قبر بھی نہ مل سکی، مجھے تیری میت سے بھی محروم کر دیا گیا!“ اس کے دل سے برابر یہی آہ نکلتی رہتی تھی۔ وہ پانچوں وقت کی نماز کے بعد یہی ایک دعا مانگا کرتی تھی: ”بابر کو موت آجائے پروردگار! جس نے میرے بیٹے کی جان لے لی اسے میرے بیٹے کی موت سے ہزار گنی بھیانک موت نصیب ہو!“

بیدہ کی کنیزیں اور خادمائیں شہر میں سنی ہوئی افواہیں سنا سنا کر اسے تسلی دینے کی کوشش کرتی تھیں اور افواہوں کی کوئی کمی نہ تھی۔ کہا جا رہا تھا کہ چارے کی قلت کی وجہ سے بابر کی فوج اپنے گھوڑوں کو کسانوں کا بچا کچھا غلہ کھلانے پر مجبور ہو گئی اور کسانوں نے بغاوت کرتے ہوئے بہت سے غیر ملکی سپاہیوں کا جیلوں اور کھانا ڈیوں سے کام تمام کر دیا۔ یہ بھی کہا جا رہا تھا کہ ہندوستان کی شدید گرمی نے فاتحین کو پریشان کر رکھا اور سرد کوہستانی آب و ہوا کے عادی سپاہی اور گھوڑے یکے

بعد دیگرے دم توڑتے جا رہے ہیں۔ یہ افواہ بھی گرم تھی کہ لشکریوں میں طاعون اور بخار کی وبا نہیں پھیل رہی ہیں جن سے برابر اموات واقع ہو رہی ہیں۔ اس طرح کی افواہوں سے لوگ یہ تصور کر رہے تھے کہ ان کی دلی مراد پوری ہو رہی ہے۔

بیدہ نے اپنے پوتے بہادر سے جو بار کے دربار سے وابستہ تھا، یہ معلوم کرنے کا فیصلہ کیا کہ آخر ان افواہوں میں کہاں شک صد اقت پائی جاتی ہے۔ اس نے یہ سوچ کر کہ صرف دادی سے ملاقات کے لئے پوتے کو آنے کی اجازت نہ مل سکے گی، اپنی ایک خادمہ کو ایک خط کے ساتھ محل بھیجا جس میں کہا گیا تھا کہ وہ بیمار ہے اور پوتے کو دیکھنے کے لئے بے تاب۔

سترہ سالہ سلطان بہادر فارسی اور سنسکرت زبانوں سے بخوبی واقف تھا اور اسے بعض دستاویزات کے جن کی بابر کو ضرورت تھی، ترجمے کا کام سونپ دیا گیا تھا۔ فاتح حکمران کی خدمات انجام دینے کے لئے دوسرے مترجمین بھی موجود تھے اور بہادر پر کام کرنے کا زیادہ بار نہیں ڈالا جاتا تھا پھر بھی وہ فرصت کے اوقات اپنی مرضی کے مطابق نہیں گزار سکتا تھا۔ اس کی حفاظت کی جاتی تھی تاکہ کچھ دن قبل تک کے دشمن کے بیٹے کی کوئی توہین نہ کر دے۔ اس پر نظر بھی رکھی جاتی تھی کیونکہ ڈر تھا کہ کوئی سازشی گروہ سابق سلطان کے اس وارث کو اپنا سرغنہ نہ بنالے۔ یہی سبب تھا کہ بہادر کو شاذ و نادر ہی محل سے باہر نکلنے دیا جاتا تھا۔

لیکن وزیر محمد دولدائی نے بیدہ کا خط پڑھا تو اس نے بابر کی اس ہدایت کے مد نظر کہ بیدہ کو اس کی منہ بولی ماں تصور کر کے احترام کیا جائے، بہادر کو دادی سے ملاقات کے لئے جانے کی اجازت دے دی۔ احتیاطاً اس نے بہادر کے ساتھ رہنے والے سپاہیوں کی تعداد گنی کر دی اور اسی روز محل واپس لوٹ آنے کا سختی کے ساتھ حکم بھی دے دیا۔

بیدہ نے پوتے کو اپنے محل کی نیم روشن خواب گاہ ہی میں بلالیا جہاں وہ علالت کا بہانہ کئے لپٹی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر اداسی چھائی ہوئی تھی اور نگاہیں چھت کو نکلے جا رہی تھیں۔ وہ بد وقت نکیوں کی ٹیک لگا کر کچھ اٹھ بیٹھی اور بہادر سے اپنے سامنے اونچی جگہ پر بیٹھنے کو کہا۔

وہ دیر تک پوتے کی پسینے سے تپیشانی کو دیکھتی رہی پھر شکایت کی کہ اس سال قیامت کی گرمی پڑ رہی ہے اور چند لمحات تک خاموش رہنے کے بعد پوچھا:

”یہ سچ ہے کیا کہ غیر ملکوں سے ہمارے ہاں کی گرمی برواشت نہیں ہو رہی ہے؟ سنا ہے کہ وہ

لوگ مر رہے ہیں۔ یہ سچ ہے؟“

”جی ہاں، کچھ لوگ مر بھی رہے ہیں“ بہادر نے بھیجی ہوئی آواز سے جواب دیا۔

”سنا ہے ان میں سے بہتوں کا کہنا ہے کہ ہندوستان میں نہ ٹھہریں گے، اپنے سرد علاقوں کو لوٹ جائیں گے۔ یہ بھی سچ ہے کیا؟“

”بھلا ان کا بادشاہ انہیں ایسا کرنے بھی دے گا؟ غیر ملکوں کی اکثریت اس کے کسے پر عمل کرتی ہے۔ اور پھر بادشاہ اپنی باتوں سے لوگوں کو قائل کر دینے میں بھی ماہر ہے۔ اس کی خوش بیانی کا کہنا ہی کیا۔ جو لوگ واپس لوٹ جانے کی خواہش کا کھلم کھلا اظہار کرتے رہتے تھے ان کو بادشاہ نے محل میں طلب کر کے باتیں کیں اور اب وہ سب بھی خاموش ہو گئے ہیں۔“

”آپ اپنے والد کے قاتل کی ستائش کر رہے ہیں؟“

بادور نے فوراً ہی چوکی کے ساتھ دروازے کی طرف دیکھا تو بیدہ نے دھیرے سے پوچھا:

”تو بیٹے، آپ کے اوپر نظر رکھی جاتی ہے کیا؟“

”جی ہاں“ پوتے نے سرگوشی کے سے انداز میں کہا، ”مجھے کسی کے ساتھ اکیلے رہ جانے اور بات کر لینے کا موقع نہیں دیا جاتا۔ ہر وقت لوگ مجھے گھیرے ہی رہتے ہیں، چھپ چھپ کر میری باتیں سنتے ہیں۔۔۔ میں ذرا بھی نکتہ چینی کر دوں گا تو فوراً ہی بادشاہ تک پہنچا دی جائے گی۔“

”آپ فکر نہ کیجئے۔ ہم دونوں کے سوا یہاں اور کوئی بھی نہیں۔ شاہی محل میں ہمارے آدمیوں میں سے بھی کوئی ہے یعنی کوئی ایسا شخص جو ہماری خدمات انجام دے چکا ہو؟“

”جی ہاں، ایسے لوگ ہیں۔۔۔ مثلاً ملک داد کرانی صاحب۔۔۔ ان کے علاوہ وہ اہل علم جو شاید آپ کو یاد ہو ہمارے کتب خانوں میں کام کیا کرتے تھے۔۔۔ دراصل بادشاہ باہر ہمارے آدمیوں کو اپنی طرف جھکا لیتا چاہتا ہے، ہندوؤں اور ہندوستانی مسلمانوں کے دلوں کو جیت لیتا چاہتا ہے۔ اس نے تو والد مرحوم کے سارے چاشنی گیروں کو بھی بلوایا تھا اور ان میں سے چار کو اپنے محل میں رکھ لیا ہے۔۔۔“

”اچھا؟۔۔۔ اور وہ ان کے پکائے ہوئے کھانے بھی کھاتا ہے؟“

”سنا ہے کہ کھاتا ہے۔ وہ تو ہندوستانی کھانوں کی تعریف بھی کرتا رہتا ہے۔۔۔“

”یہ تو بہت اچھا ہے کہ وہ ان کے پکائے ہوئے کھانے بھی کھاتا ہے!“ بیدہ نے اپنے پوتے کی بات کاٹتے ہوئے کہا اور بڑی پھرتی کے ساتھ پلنگ سے نیچے اتر آئی۔

اس کا دل پہلے ہی کی طرح درد و غم سے معمور تھا لیکن غم سے پیدا ہونے والی انتقام کی خواہش اب مبہم نہ رہ گئی۔ اسے اپنا مقصد واضح طور پر نظر آنے لگا، بھیا تک لیکن بہت واضح اور اس بات نے بیدہ کو نئی توانائی عطا کر دی۔ ”اگر بابر کو۔۔۔ ہلاک کر دیا جائے تو اس کے لشکری یہاں نہ ٹھہر سکیں

گے، واپس لوٹ جائیں گے... یقیناً چلے جائیں گے۔“ اس نے سوچا۔ ”چاشنی گیروں میں سے اگر ایک بھی ہتھے چڑھ جائے تو اسے انتقام کا حربہ بنایا جاسکتا ہے۔“

بیدہ نے پوتے سے سرگوشی کی:

”چاشنی گیروں کو آپ نے خود دیکھا ہے؟“

”جی ہاں۔“

”ان میں احمد بھی شامل ہے؟“

بہادر ابھی تک اپنی ”علیل“ دادی کے منصوبے کو خاک بھی نہیں بھانپ سکا تھا۔

”جی نہیں۔ چاشنی گیر احمد تو آگرے سے چلا گیا ہے۔ کوئی خاص بات؟“ اور اس نے ایک بار

پھر گھبرا کر دروازے کی طرف دیکھا۔

بیدہ مسکرا دی۔ ”صاحبزادے خاصے بودے ہیں، ویسے بھی ان پر کتنے ہی لوگ نظر رکھتے ہیں۔

کیس انہوں نے اچانک بھونڈا پھوڑ دیا تو اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے اور میرا منصوبہ بھی

خاک میں مل جائے گا۔“ اس نے سوچا اور فیصلہ کیا کہ بہادر کو ایسے پر خطر معاملے سے دور ہی رکھے

گی۔ وہ ایک بار پھر علالت کی ڈھونگ رچا کر کرانے لگی:

”ہائے ری دنیا، کتنی مکار ہے تو! جو لوگ کل تک ہماری وفاداری کا دم بھرتے تھے وہ آج

ہمارے دشمنوں کی جوتیاں سیدھی کر رہے ہیں! ملک داد کرانی، چاشنی گیر، کجمنت سبھی دغا دے

گئے۔ ہائے، کیسا دل دکھتا ہے، سارا بدن کیسا پھوڑے کی طرح دکھتا ہے... خیر میرے عزیز پوتے،

آپ ان لوگوں کی خدمت کرنے کا ڈھونگ جاری رکھئے پر دل میں اپنے والد مرحوم کے وفادار بنے

رہئے۔“

”میں یہی کر رہا ہوں، دادی جان!“ بہادر نے چپکے سے جواب دیا۔

پوتے کے جاتے ہی ملکہ بیدہ نے علالت کا ڈھونگ ترک اور رہ رہ کر کرانے کا سلسلہ بند کر دیا۔

اسے فوراً کسی وفادار اور دلیر چاشنی گیر کی فکر لاحق ہو گئی جو پیسے لے کر یا پھر انتقامی جذبے کے تحت

باہر کو زہر دینے پر آمادہ ہو جائے۔ اس کے ارد گرد فاتحین سے نفرت کرنے والوں کی کوئی کمی نہ

تھی۔ باہر کے سپاہیوں کے ہاتھوں کسی کا بھائی مارا گیا تھا تو کسی کا باپ۔ باہر کے عہدیداروں نے کسی

سے شاندار آمدنی والا منصب چھین لیا تھا تو کسی کو سرے سے کنگال ہی کر دیا تھا... بیدہ بے جلد ہی

پتا لگا لیا کہ باہر نے جن چار چاشنی گیروں کو محل میں رکھ لیا تھا ان میں سے ایک: چیتا چھوٹا بھائی

پانی پت کی جنگ میں ہلاک کر دیا گیا تھا۔ لیکن بیدہ نے اس سے براہ راست بات کرنے کو پر خطر

تصور کیا کیونکہ اس پر بھی بابر کے مخبر نگاہ رکھے ہوئے تھے۔ سلطان ابراہیم کے محل کے ان سابق چاشنی گیروں کے ساتھ کام کرنے والوں میں سب سے زیادہ وفادار وہی احمد ہی تھا جو آگرے سے جاچکا تھا۔ بیدہ نے معلوم کر لیا کہ وہ اٹاؤہ گیا ہوا ہے اور ایک آدمی بھیج کر اسے بلوایا۔

چاشنی گیر احمد بیدہ کے پاس آیا تو اس کا دل غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف شدید نفرت سے معمور تھا کیونکہ اسے آگرے میں واقع اس کے مکان اور جائیداد سے محروم کر دیا گیا تھا۔ بیدہ نے اسے اپنی جاگیر پر نوکر رکھ لیا، رہنے کو گھر دیا اور ماہانہ تنخواہ مقرر کر دی۔ پھر اس نے دھیرے دھیرے بڑے محتاط انداز سے چاشنی گیر کو شیشے میں اتارنا شروع کیا۔ آخر کار جب احمد کو اصل قصے کا علم ہوا تو گھبرا کر کہنے لگا کہ یہ ٹیڑھی کھیر اس کے بس کی نہیں ہے۔ لیکن بیدہ نے اس کی حوصلہ افزائی کی اور یقین دلایا کہ اسے اس معاملے میں جو کردار ادا کرنا ہے اس میں ذرا بھی خطرہ نہیں۔ اس نے احمد سے کہا کہ تمہارا کام اس چاشنی گیر کو جس کا بھائی پانی پت میں ہلاک ہو گیا ہے، راضی کرنا ہے اور بس، ”باقی باتوں سے ہم خود ہی نپٹ لیں گے۔“ احمد کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر وہ شاہی محل میں داخل کیسے ہو گا مگر بیدہ نے اس کی بھی ایک ترکیب نکال ہی لی۔ اس نے اپنے پوتے سے ملاقات کی اجازت حاصل کر لی اور ریشمی کپڑوں کی ایک بڑی سی پوٹلی کے ساتھ۔ اس تحفے کو احمد اٹھائے ہوئے تھا۔ محل کے اندر پہنچ گئی۔ سن رسیدہ ملکہ جب تک پوتے سے ملاقات کرتی رہی تب تک احمد نے اس چاشنی گیر کو تلاش کر لیا جو اس کا جگری دوست نکلا۔ دونوں چاشنی گیروں نے اگلے روز قلعے کے باہر ملنے کا وقت طے کر لیا۔ ایک ہفتے کے بعد احمد نے بیدہ کو بتایا کہ اس کا دوست بھی اپنے بھائی کے قاتل غیر ملکیوں سے نفرت کرتا ہے اور وہ کام انجام دینے پر راضی ہو گیا ہے۔

۲

موسم گرما کے تین مہینوں میں گرمی بڑھتے بڑھتے جیٹھ کے مہینے میں اپنے نقطہ عروج پر پہنچ گئی۔ برسات شروع ہونے میں اب ایک ماہ سے کچھ کم ہی وقت رہ گیا تھا۔

جمنائے کنارے پر باغ زر افشان میں انکوروں کی ہری بھری بلیں پھیلنے لگی تھیں۔ یہ باغ ایک ایسی جگہ پر لگایا گیا تھا جہاں پہلے جھاڑیوں کی سوا اور کچھ بھی نہ تھا۔ دریا کے قریب کے نشیبی علاقے کو ہموار کر کے وہاں ہرات اور سمرقند کے طرز کی ”چارچن“ کیا ریاں بنا دی گئی تھیں۔۔۔ سنگ مرمر کے ایک بڑے حوض اور پیچیدہ فواروں کی تعمیر کا کام بھی شروع کر دیا گیا تھا۔ باغ کی نالیوں میں شفاف پانی گنگناٹا ہوا بہتا رہتا تھا۔ روشوں پر چمکی ہوئی سرخ بجری پر چلنے سے بڑی خوشگوار چرمابٹ ابھرتی تھی۔

ایک روز بابر خواجہ کلاں بیک، ہندو بیک، ملک داد کرانی اور اپنے محافظ گھڑسوار دستے کے ساتھ باغ زار افشان کو دیکھنے گیا۔ اس بلا کی گرمی پڑ رہی تھی کہ چٹپلائی دھوپ میں چتی ہوئی رکابوں پر بابر کو جوتوں کے اندر اپنے پیر چلتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ قاش زین بھی جس پر مڑھے ہوئے سونے کے پتھر چمک رہے تھے، انگاروں کی طرح تپ رہی تھی، چھوٹے ہی ہاتھ جل اٹھتا تھا۔

اس سب کے باوجود بابر ناقابل برداشت گرمی کے تذکرے سے گریز کر رہا تھا کیونکہ زیادہ تر بیک موقع ملتے ہی ہندوستان کی ناموافق آب و ہوا کا رونا رونے لگتے تھے۔ انہیں آگرے میں نئی عمارت کی تعمیر اور شہر کے باہر نئے باغات لگوانے کے منصوبوں سے خاک بھی دلچسپی نہ تھی۔ وہ اس بات سے تو یقیناً خوش تھے کہ بابر سابق ممتاز لوگوں یعنی لودھی خاندان کے افراد اور لودھی دربار سے وابستہ امرا و روسا کی جاگیریں محتاط انداز سے ہی کیوں نہ سہی، بہر حال یکے بعد دیگرے ضبط کر کے اپنے بیگوں اور سپہ سالاروں کو عطا کرتا جا رہا تھا۔ تاہم بیک بابر کے نئے انتظامات سے مطمئن نہ تھے۔ انہیں ان کی وفاداری کے صلے میں جاگیریں تو دی جا رہی تھیں لیکن بابر ان آراضیات کو لگان سے مستحاکم کے اس طریقے سے نہیں دے رہا تھا جو خود ان کی وطن میں رائج تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جن کو نئی جاگیریں عطا کی جاتی تھیں انہیں شاہی خزانے میں کافی بڑی رقم جمع کرنی پڑتی تھی۔ دوسری طرف بادشاہ تاجروں سے لطف و عنایت کا سلوک کر رہا تھا، جس تاجر کی آمدنی جتنی زیادہ ہوتی تھی اسے اتنا ہی کم محصول ادا کرنا پڑتا تھا۔ ہمایوں جانتا تھا کہ اس کے والد نے اپنی تصنیف ”مبین“ میں بھی اپنے اس نقطہ نظر کی وضاحت کی ہے۔ بیگوں کو اس بات کا علم نہیں تھا اور ہوتا بھی تو صورت حال میں کیا تبدیلی واقع ہو سکتی تھی؟ ان کی خود پسندی کو ٹھیس لگ رہی تھی، انہیں جتنے مال و زر کی ہوس تھی اتنا مل ہی نہیں پا رہا تھا... اور پھر کتنی وبال جان ثابت ہو رہی تھی اجنبی ہندوستان کی آب و ہوا بھی! خواجہ کلاں سمیت بہت سے بیک کسی نہ کسی تحریک سے، کسی نہ کسی بہانے سے برابر اپنے وطن کابل و غزنی کی سرد آب و ہوا کی تعریفوں کے پل باندھتے رہتے تھے، کہتے رہتے تھے کہ پردہ گار جلد از جلد کسی طرح وہاں لوٹ جانے کی کوئی صورت نکال دے۔

بابر نے ایک سن رسیدہ معمار کی طرف اشارہ کیا جس کے سر پر چھوٹی سی دستار تھی اور جسم پر ہلکا کرتا۔

”انہیں پہچانا آپ نے؟“ اس نے خواجہ کلاں سے پوچھا۔

”اند جان والے فضل الدین ہیں نا؟“

”جی ہاں، میں نے انہیں کابل سے بلوایا ہے۔ اپنے معمار اور نقاش بیٹے کے ساتھ یہیں آئے

ہیں... ہم جس باغ کو دیکھنے چل رہے ہیں وہ انہی کی نگرانی میں تیار ہوا ہے... اگر یہ سن رسیدگی کے باوجود، سپاہی کی زندگی کے عادی نہ ہونے کے باوجود اس گرمی کو برداشت کر سکتے ہیں تو پھر ہم فوجی لوگ کیوں نہیں برداشت کر سکتے؟“

”لیکن عالی جاہ، کچھ لوگوں کو ایسی شدید گرمی ذرا بھی راس نہیں آرہی ہے۔ کل جیسے ہی لو چلنے لگی ویسے ہی میرے تین سپاہی یکے بعد دیگرے گھوڑوں سے نیچے گر پڑے اور شام ہوتے ہوئے چل رہے۔“

”خدا کی یہی مرضی تھی، آخر وقت آن پہنچا تھا، لو تو صرف ایک بہانہ بن گئی ان کے انتقال کا... اللہ انہیں جنت نصیب کرے“ بابر نے آسمان کی طرف نظریں اٹھا کر کہا اور فوراً ہی انہیں جھکا لیا۔ اتنے میں فضل الدین سامنے آکر کورنش بجلا لایا۔ بابر نے اس سے کہا: ”خدا کرے آپ کبھی بھی نہ تھکیں، میری عمارت... آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتائیے، انتظام کر دیا جائے۔“

”عالی جاہ، ہمیں ہاتھیوں اور ان سے کام لینے کے لئے ماہروں کی ضرورت ہے۔ دھول پور سے بڑے بڑے پتھر لانے ہیں جنہیں بڑے اور مضبوط اراہوں پر صرف ہاتھی ہی لاد سکتے ہیں۔“

بابر نے ہندوستانی معاملات کے اپنے مشیر ملک داد کرانی سے کہا:

”ملک داد صاحب، کیا جنگی ہاتھیوں کو زمانہ امن کے کاموں کے لئے سدھایا جاسکتا ہے؟“

”جی ہاں، اعلیٰ حضرت۔ ہاتھی بہت ہی عقل مند جانور ہوتا ہے۔ ہندوستان میں اسے محض جنگ کے لئے ہی نہیں بلکہ عام کاموں کے لئے بھی سدھایا جاتا ہے۔ دور دراز مواضع سے ہاتھی اور ان کے مساوت یہاں لائے جاسکتے ہیں...“

”نہیں، ہم یہ کام ایک اور طریقے سے نکال لیں گے... ہمیں لڑائیوں میں ہاتھیوں کو استعمال کرنا نہیں آتا لیکن پانی پت اور اس کے بعد کی جنگوں میں جو مال ہمارے ہاتھ لگا ہے اس میں ہاتھی بھی شام ہیں۔ انہیں عمارت سازی کے کاموں کے لئے سدھایا جانا چاہئے۔ ملک داد صاحب، آپ آج ہی ہمارے اس حکم سے ان ہاتھیوں کے مساوتوں کو مطلع کر دیجئے۔“

”خادم آپ کا یہ حکم فوراً ہی بجالائے گا، عالی جاہ۔“

ملک داد اسی وقت شہر جانے لگا لیکن بابر نے اسے روک لیا:

”ایک کام اور کیجئے... شہر شہر، گاؤں گاؤں منادی کرا دیجئے کہ ہم ابراہیم لودھی کی ساری دولت کو جو ہمیں ملی ہے، تعمیرات اور ملک کے حالات کو بہتر بنانے پر صرف کریں گے۔ سرعام اچھی طرح اعلان کرایئے تاکہ سب کو معلوم ہو جائے... اور فضل الدین صاحب، آپ کو جتنے معماروں کی

ضرورت ہے اتنے موجود ہیں نا؟“

”جی ہاں، فی الحال کافی معمار موجود ہیں۔ بعض دشواریاں البتہ پیش آرہی ہیں۔ عالی جاہ کا ارشاد ہے کہ مرمریں محل اور پتھروں کے بڑے حوض کی تعمیر سال بھر میں مکمل ہو جانی چاہئے۔ خاص کام پتھروں کو تراشنے اور ان پر نقاشی کرنے کا ہے جس کے لئے بہت زیادہ محنت اور وقت درکار ہیں۔“

”اگر ہم اس فن کے کچھ اور ماہرین کا انتظام کر دیں تو؟“

”دراصل شاہ عالیؒ میں خود بھی یہی درخواست کرنا چاہتا تھا۔ ہندوستان میں اینٹوں اور کاشینوں کے بجائے جن کا استعمال ہرات اور سمرقند میں کیا جاتا ہے، پتھروں اور مرمر کا استعمال بہتر رہے گا۔“

”یہ بتائیے کہ ہمارے ہاں کی تعمیر کے سلسلے میں کل کتنے سنگ تراش کام کر رہے ہیں؟“

”صرف اگرے ہی میں ان کی تعداد چھ سو اسی ہے۔ سیکری، دھول پور اور دوسری جگہوں پر کام

کرنے والے سنگ تراشوں کو ملا کر مجموعی تعداد ایک ہزار چار سو نوے ہو جاتی ہے۔“

”بہت ہیں“ بابر مطمئن ہو کر مسکرایا۔ ”میر تیمور سمرقند میں عالی شان عمارات تعمیر کر رہے تھے تب انہیں الگ الگ ملکوں کے تقریباً دو سو کاریگروں ہی کی خدمات حاصل تھیں۔ مشہور مورخ مولانا شرف الدین علی یزدی نے اس تعداد کو بھی بے مثال قرار دیا تھا۔ لیکن ہندوستان کاریگروں کے معاملے میں اتنا شاندار اور متمول ہے تو ہم سینکڑوں بلکہ ہزاروں سنگ تراشوں اور نقاشوں کو کام کرنے کے لئے مدعو کریں گے۔ جی ہاں، انہیں زبردستی، قیدیوں کی طرح کام پر نہیں لگائیں گے بلکہ مدعو کریں گے! ملک داد صاحب، ہماری سلطنت کے تمام شہروں میں متادی کرادیجئے۔ سب کو معلوم ہو جانا چاہئے کہ جو معمار ہمارے ہاں کام کرنے آئیں گے انہیں اتنی زیادہ اجرت دی جائے گی جتنی ہندوستان میں اب تک کبھی نہیں دی گئی۔ پروردگار کو خوش اور عظمت اسلام کو نمایاں کرنے کے لئے مسلمان اور ہندو کاریگروں کو یکساں مشاہرے دیئے جائیں گے، انہیں یکساں حیثیت حاصل ہوگی۔ جتنے بھی معمار اور کاریگر ہمیں اپنے کاموں سے خوش کر دیں گے ان سب کو ہماری سرپرستی حاصل ہوگی۔“

ملک داد کرانی شہر کو لوٹ گیا۔ باقی بیک بار بار اس مخصوص شاہی کشتی کو جو اس جگہ سے کچھ ہی دوری پر جہنا میں لہروں پر ہلکورے کھا رہی تھی، حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ بابر کو زیر تعمیر عمارات اور باغات کے معائنے کے بعد دریا میں سیر کرنے کے لئے اسی کشتی پر جانا تھا۔ لیکن

ایسا لگ رہا تھا کہ بادشاہ کو وہاں پہنچنے کی کوئی جلدی نہیں ہے۔ وہ میر عمارت سے پوچھنے لگا کہ حمام کا گنبد کیسا ہوگا؟ اس کی اندرونی آرائش کیسی ہوگی نیز یہ کہ محل اور دریا کی درمیانی جگہ میں کیا بنانے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

”اس کی اندرونی دیواروں پر سارے ماورائے نہر میں مشہور عظیم الف بیک کے حمام کی طرح رنگ برنگے سنگ مرمر کی پٹیاں لگائی جائیں گی۔“ فضل الدین نے دھیرے دھیرے بتانا شروع کیا۔ ”گنبد سمرقند کے اس حمام کے گنبد سے کچھ بڑا ہوگا۔ دیواریں مضبوط تخت پتھر کی بنائی جائیں گی۔۔۔ جیسا کہ عالی جاہ بخوبی جانتے ہیں سنگ مرمر میں ایک عجیب صفت یہ ہوتی ہے کہ اندر سے نہ زیادہ گرمی کو باہر نکلنے دیتا ہے اور نہ ہی باہر سے اندر داخل ہونے دیتا ہے۔ اسی لئے حمام کی سنگ مرمر کی پٹیاں موسم گرما میں جبکہ ٹھنڈک کی بہت زیادہ ضرورت ہوتی ہے، بڑی کارآمد ثابت ہوگی۔“

”بہت خوب، بہت خوب۔ لیکن اس حمام کو ذرا جلد ہی مکمل کرایئے ورنہ یہ چلچلاتی دھوپ ہمیں جھلس کر خاک کر دے گی!“

”لیکن یہ گرمی خود آپ کو پریشان نہیں کرتی کیا؟“

”کرتی کیوں نہیں، شاہ عالی۔ لیکن میں اسے جھیلتا رہتا ہوں۔ دراصل آپ کا یہ خادم ایسی شاندار عمارتیں اندجان میں تعمیر کرنے کے خواب دیکھا کرتا تھا پر وہ تو خراب ہی رہ گئے۔ میں امید کرتا تھا کہ ایسی عمارتیں سمرقند اور ہرات میں تعمیر کر سکوں گا۔۔۔ ان عمارات کے نقشوں پر تیس برسوں تک غبار کی تھیں جتنی رہیں، کاغذات زرد پڑ گئے۔ اب لگ رہا ہے کہ میری زندگی کے یہ خواب میرے وطن سے بہت دور آگرے میں حقیقت بنتے جا رہے ہیں۔ قسمت میں یہی لکھا ہے تو گرمی کو بھی جھیل ہی لوں گا۔ ویسے اہل ہند اس گرمی کو کیوں برداشت کر لیتے ہیں؟ اس لئے کہ یہ لوگ موسم گرما میں گوشت برائے نام ہی کھاتے ہیں، پیاس بجھانے کے لئے شربت پیتے ہیں، پھلوں کا استعمال بہت زیادہ کرتے ہیں۔ میں بھی ہلکی غذاؤں کا عادی ہو چکا ہوں۔ علی الصبح بیدار ہو کے صبح کی ٹھنڈک میں کوئی چار گھنٹے کام کرتا ہوں۔ گرمی میں شدت پیدا ہو جاتی ہے تو سائے میں چار گھنٹے آرام کرتا ہوں اور دھوپ کی تمازت گھٹ جاتی ہے تو دوبارہ چار گھنٹے کام کر لیتا ہوں۔“

”یہ لیجئے!۔۔۔ اور ہم ہیں کہ صبح سے شام تک بس گوشت ہی گوشت کھاتے رہتے ہیں۔ کبھی قری تو کبھی طرح طرح کے کباب“ بابر نے خواجہ کلاں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اور ان سب کھانوں کو بھی تندو تیز شرابوں کے سارے حلق سے نیچے اتارتے ہیں گویا کہ ماحول کی گرمی ہمارے لئے ناکافی ہو۔“

خواجہ کلاں بیک کے لئے کاٹھی پر بیٹھے رہنا سخت دشوار ثابت ہو رہا تھا۔ اس کے چہرے سے پسینے کی دھاریں سی داڑھی پر سے لڑھکتی ہوئی قطرات کی شکل میں سینے پر ٹپک رہی تھیں۔ خود بابر کو بھی ایسا لگ رہا تھا جیسے سانس کے ساتھ ہوا کے بجائے آگ کی لپٹیں سینے میں داخل ہوئی جا رہی ہوں۔ اس جگہ سے جلد از جلد چل دینا ضروری تھا۔ اس نے فضل الدین کی خوشگوار باتوں کے لئے اس کا شکریہ ادا کرنے کے بعد گھوڑے کا رخ دریا کی طرف موڑ دیا جہاں لمبوں پر ڈولتی ہوئی شاندار کشتی سراب معلوم ہو رہی تھی۔ گھوڑا تیزی سے دوڑانے لگا، ہواؤں کے جھونکے چہرے کو تازگی بخشنے لگے اور سانس لینا آسان ہو گیا۔

دریا تھوڑی ہی دور رہ گیا تھا کہ اتنے میں خواجہ کلاں بیک کے ایک سپاہی کے بدخشان منہ کی گھوڑے نے اچانک ٹھوکر کھائی اور سر ہلاتا ہوا زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ سپاہی نے جو پھرتی سے نیچے کود گیا تھا، لگام کھینچ کھینچ کر گھوڑے کو کھڑا کرنے کی کوشش کی لیکن گھوڑا پلو کے بل پڑے پڑے تڑپنے لگا اور اس کے منہ سے جھاگ کے ساتھ ہی ساتھ خون بھی بہہ نکلا۔ سپاہی اس ڈر سے کہ کہیں گھوڑے کے سم سے اسے چوٹ نہ لگ جائے، اچھل کر پیچھے ہٹ گیا۔

”اوہ، لو اس گھوڑے کی جان بھی لے بیٹھی!“ کلاں بیک نے گہرا کر کہا۔ ”ایسے شاندار گھوڑے روز روز کہاں ملتے ہیں۔“

”محض ایک گھوڑے کے زیاں سے انسان کا دل نہ بیٹھنا چاہئے،“ بیک صاحب۔ آپ کے سپاہی کو شاہی اصطبل سے کوئی تیز رفتار گھوڑا دے دیا جائے گا، یہ میرا حکم ہے۔“

”میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں،“ فرماں روا، ”خواجہ کلاں بیک نے اداسی سے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”لیکن بات صرف گھوڑے کی ہی نہیں ہے۔ مجھے تو اس حادثے میں اپنے مستقبل کی جھلک بھی نظر آرہی ہے۔“

بابر گھوڑے سے نیچے اترا کیونکہ وہ لوگ دریا کے کنارے پہنچ چکے تھے۔ اس نے شاہی کشتی ”آسانش“ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

”اس وقت تو بیک صاحبان، آپ کا قریب ترین مستقبل وہ رہا۔ چلے، پرسکون آرام کے لمحات سے محفوظ ہوں۔“

سب لوگ چھوٹی چھوٹی کشتیوں کے ذریعے ”آسانش“ تک پہنچے اور اس پر سوار ہو گئے۔ بابر اور کلاں بیک شاہی کشتی کے اگلے سائے دار حصے میں جا بیٹھے۔ چو حرکت میں آئے اور کشتی یکساں تیز رفتار سے آگے بڑھنے لگی۔ سامنے سے آتی ہوئی ہوائیں زندگی کو محض قابل برداشت ہی نہیں

بلکہ خوشگوار بھی بناتی جا رہی تھیں۔

خدا م نے سنگترے اور لیمو کے ٹھنڈے ٹھنڈے شربت لا کر پیش کئے۔ خواجہ کلاں بیگ نے سنگترے کے شربت کا بھرا ہوا پیالہ ایک ہی بار میں خالی کر دیا۔ ”نہیں نہیں، ہندوستان میں بھی عیش و آرام کے ساتھ جینا ممکن ہے“ اس نے سوچا اور معنی خیز نگاہوں سے باہر کی طرف دیکھنے لگا۔ ”اگر نے میں تو عالی جاہ، آپ بہت دبلے ہو گئے، رنگت کالی پڑ گئی، چہرہ اتر گیا۔ یہ الگ بات کہ آپ پر جو کچھ بیت رہی ہے اسے ہم سے چھپاتے رہتے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ دوسرے بیگ آپ کی مشکلات کو نہ بھانپ سکے ہوں لیکن میں نے بھانپ لیا ہے۔ مجھے سب معلوم ہے، سب کچھ محسوس کر رہا ہوں۔“

”ہاں بیگ، ہماری آپ کی رفاقت کوئی تیس برسوں کی ہے۔ جانے کتنی ہی مشکلات اور تکالیف کو ہم ساتھ ساتھ جھیلتے رہے ہیں، ٹھیک ہے نا؟ ماضی کی مشکلات کے مقابلے میں یہ گرمی اور موجودہ تکالیف تو کچھ بھی نہیں ہیں نا؟ یہ تو بالکل معمولی سی لگتی ہیں نا؟“

خواجہ کلاں بیگ نے جب سے ریشمی رومال نکال کر پیشانی سے مسلسل بتے ہوئے پسینے کو جس سے آنکھیں ڈھکی جا رہی تھیں، پونچھ ڈالا۔

”اعلا حضرت، مجھے تو لگتا ہے کہ زندگی کی آخری گھڑیاں آن پہنچیں۔ جوانی میں نہ سردی کو خاطر میں لاتا تھا نہ ہی گرمی کو لیکن اب جب کہ میری عمر پچاس سے تجاوز کر چکی ہے، میں محسوس کر رہا ہوں کہ ہندوستان میں گزرنے والا ہر ہفتہ میری عمر میں ایک سال کا اضافہ کر دیتا ہے، سن رسیدگی کی طرف کچھ اور آگے ڈھکیل دیتا ہے۔ آپ کے دیرینہ وفاداروں میں بس ایک قاسم بیگ ہی مجھ سے عمر میں بڑے تھے سو وہ بھی کچھ دن ہوئے دنیا سے کوچ کر گئے۔ اللہ انہیں جنت نصیب کرے۔ یہی لیل و نمار ہیں تو میری باری بھی آنے ہی کو ہے۔ اب اور زیادہ نہ جی سکوں گا، واقعی نہ جی سکوں گا۔“

”ایسی بات نہ کہئے، بیگ صاحب۔ یوں تو سب کچھ اللہ کی مرضی پر منحصر ہوتا ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ بہت طویل عمر پائیں گے۔“

”میں تو تصور بھی نہیں کر سکتا کہ سرد علاقوں کا رہنے والا کوئی شخص ایسی آگ برساتی دھوپ والے ماحول میں ساٹھ سال کی عمر تک بھی پہنچ سکتا ہے۔“

”کیوں نہیں پہنچ سکتا؟ آخر اس گرم ملک میں بھی تو لوگوں کو کتنی طویل عمریں ملتی ہیں۔ امیر خسرو دہلوی کی مثال کیوں بھول رہے ہیں؟“

خواجہ کلاں بیگ خسرو دہلوی کی شاعری کا بڑا مداح تھا۔ بابر دہلی میں اپنے مختصر قیام کے دوران حضرت نظام الدین اولیا کے مزار کی زیارت کے لئے گیا تھا تو اس کے ہم رکابوں میں کلاں بیگ بھی شامل تھا۔ وہاں یہ لوگ خسرو دہلوی کی قبر پر بھی گئے تھے جس کے سامنے خاموش کھڑے کھڑے کلاں بیگ کو خسرو کا یہ مشہور مصرعہ یاد آگیا تھا: ”رو بہ ہند آوردن صاحب دلاں بے چیز نیست“ اور اسے اپنے اوپر فخر محسوس ہوا تھا۔ یہ کیفیت کچھ لغوی لیکن بڑی متاثر کن معلوم ہوئی تھی۔ ویسے گرمی بھی ان دنوں اتنی وبال جان نہ تھی۔

بابر نے اس وقت خسرو دہلوی کا ذکر یہ دیکھنے کے لئے کیا تھا کہ کلاں بیگ کو وہ مصرعہ اور اس سے طاری ہونے والی ذہنی کیفیت یاد آتی ہے کہ نہیں۔

کلاں بیگ کو سب یاد آگیا، اس پر سب کچھ واضح ہو گیا، اس نے گھبراہٹ میں کھنکار کے حلق بھی صاف کیا لیکن مصرعہ اس کے لبوں پر نہ آسکا۔ اس نے تو خاصی انکساری کے ساتھ دوسری ہی بات کہی:

”خسرو تو بہت ہی عظیم انسان تھے، عالی جاہ۔ میں تو کسی بھی معاملے میں ان کی ہم سری نہیں کر سکتا۔۔۔“

”بیگ صاحب، عظیم افراد کی ہم سری کی جسارت کرنا ہماری زندگی کا مقصد بھی نہیں۔ یاد ہے نا، آپ کہا کرتے تھے کہ آپ عظیم افراد کے کاموں کا سلسلہ آگے بڑھاتے رہنے کے معنی ہیں۔ یہ ممکن بھی ہے اور لازمی بھی۔۔۔“

”بڑے بڑے کاموں کا آغاز تو آپ نے کابل میں بھی کیا تھا، حکمراں۔ میں دیکھتا ہوں ان کاموں کے سلسلے کو جاری رکھنا چاہتا ہوں۔ آپ سے درخواست ہے کہ مجھے غزنی لوٹ جانے کی اجازت دے دیں۔“

”پھر وہی غزنی! فراموش کر دیا غزنی میں ہم پر کیا گزری تھی؟ غزنی میں ہم نے محمود غزنوی کے شکستہ باندھ کی مرمت کرانی چاہی پر نہ کرا سکے! معمار مل گئے تو پیسوں کی کمی پڑ گئی۔ پیسوں کا انتظام ہو گیا تو کسی اور چیز کی قلت سے ہاتھ بندھ گئے۔ اور یہاں تو ہمیں سب کچھ میسر ہے، کلاں بیگ، ہندوستان تو طاقت اور دولت کا بحر ہے کراں ہے!“

”لیکن کہیں یہ بحر بے کراں اس ناچیز پر دیکھی ہی کو ہڑپ نہ کر جائے۔ میرا تو نام و نشان بھی باقی نہ

رہے گا!“

خواجہ کلاں بیگ نے ویسے تو یہ بات اپنے متعلق ہی کہی لیکن بابر پر واضح ہو گیا کہ اس کی مراد ان تمام افراد سے ہے جو بابر کے ساتھ ہندوستان آئے تھے اور خود بادشاہ سے بھی۔ دوسرے بیگ بھی دہلی زبان میں اکثر کہا کرتے تھے: ”اتنے وسیع و عریض ملک میں ہماری کوئی وقعت بھی ہے۔ بے شمار ہندوؤں کے اس بحر بے کراں میں ہم لوگ تو کسی قطرے کی طرح کھو کر رہ جائیں گے۔ بہتر ہو گا کہ حتی الامکان زیادہ سے زیادہ دولت بٹور کر اپنے وطن کو لوٹ چلیں۔“

”آپ اپنے پیچھے نام و نشان چھوڑ جانے کو مقصد حیات تصور کرتے ہیں؟“ بابر نے دریافت کیا ”ہم سب لوگوں نے آج باغ و زرافشان دیکھا ہے۔ اور زندہ رہے تو یہاں ایسے نئے اور شاندار محلات اور خوبصورت لہلاتے ہوئے باغات بھی دیکھ لیں گے جن کے آگے سمرقند و ہرات کے محلوں اور باغوں کی شہرت ماند پڑ جائے گی۔ وہاں کے حالات تو روزیہ روزا بہتری ہوتے جا رہے ہیں، جمالت بڑھتی ہی جا رہی ہے، میرے عزیز کلاں بیگ۔ لیکن یہاں تو ان کاموں کو جو سمرقند و ہرات میں شروع کئے گئے تھے جاری رکھنا ممکن بھی ہے اور ضروری بھی۔ یہ کارنامے ہندوستان جیسے شجر عظیم کا جزو بن کر آسمان سے باتیں کر سکتے ہیں! کیا آنے والی نسلیں انہیں یاد نہ رکھیں گی؟ کیا وہ ہمارے نام کو روشن نہ کریں گی؟“

”امیر تیمور نے تو کچھ اور ہی کیا تھا۔ اور محمود غزنوی نے بھی۔ امیر تیمور تو ہندوستان کو فتح کرنے کے بعد یہاں سے دولت اور جتنے بھی کام کے آدمی ملے انہیں زبردستی ساتھ لے کر وطن لوٹ گئے تھے۔“

”لیکن ان کی سلطنت کا حشر کیا ہوا؟ اور کیا مجھے اپنے لئے محمود غزنوی کو نمونہ تقلید بنانا چاہئے؟“

”نہیں عالی جاہ، آپ تو بالکل دوسری ہی طرح کے فرماں روا ہیں۔ آپ کے لئے تو نمونہ تقلید کی حیثیت سے البیرونی اور خسرو دہلوی کیس زیادہ باعث کشش ہیں۔ لیکن اعلا حضرت، کیا ہم ہندوستان کو بہ زور شمشیر نہیں فتح کر رہے ہیں؟“

بابر خاموش ہو گیا۔ اس نے دریا کی طرف ٹھٹکی باندھ کر دیکھتے ہوئے اپنے سر کو ہوا کے جھونکوں کے سامنے کر دیا اور دھیرے دھیرے کہنے لگا:

”نہ ہم لوگ قزاق ہیں اور نہ ہی اس ملک کی تمام دولت اور تمام اچھے اچھے معماروں کو یہاں سے لے جانا کسی کے بس کی بات ہے۔۔۔ میں تو اس کے برعکس خراسان، ماورالنہر اور ایران سے

بھی عمارت سازی کے ماہرین اور صاحبانِ علوم و فنون کو یہاں بلوا رہا ہوں۔ آپ آج خود ہی اندجان کے میر عمارت فضل الدین کو دیکھ چکے ہیں۔ فوارے بنانے کے لئے مہندس سلیمان ردی بھی انشا اللہ جلد ہی تہریز سے یہاں آجائیں گے۔ ہرات سے میں نے مورخ خواند میر کو بلوایا۔۔۔ نہیں بیک، ہم لوگ اب یہاں غیر نہیں رہے۔ ہم یہاں اجنبیوں کی طرح زندگی نہ بسر کریں گے۔ ہمیں اپنی ساری دانائی اور استعداد اس ملک کو خوش حال بنانے پر صرف کرنی ہوگی۔ تب ہی ہم اس خلیج کو پاٹ سکیں گے۔۔۔“

کلاں بیک خاک بھی نہ سمجھ سکا کہ بادشاہ آخر یہ کیسی خلیج کی بات کر رہا ہے لیکن اس نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ وہ جانتا تھا کہ ایسی بحثوں میں تو بابر اپنے دلائل اور خوش بیانی کی بدولت ہمیشہ ہی مات دے دیتا ہے۔ کلاں میں نے اس بحث میں اعترافِ شکست کا جھوٹا تاثر دیتے ہوئے چالوسی کا طریقہ اپنالیا جو اس کے خیال میں سلاطین کے لئے ہمیشہ ہی باعثِ مسرت ہوتا تھا۔

”عالمِ نہا“ آپ زبردست قوتِ ارادی کے مالک ہیں اور عزم اور حوصلے کے معاملے میں آپ کا کوئی جواب نہیں۔ آپ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ ان آلام و مصائب کے عشرِ عشیر کو بھی نہیں جھیل سکتا تھا جن کو آپ برداشت کرتے رہے ہیں۔ یہی نہیں، آپ تو ان ساری مشکلات کے باوجود ایسے کارنامے انجام دینے کا بھی حوصلہ رکھتے ہیں جو شاید سکندر اعظم، جہشید یا رستم ہی کے بس کی بات ہو سکتے تھے۔۔۔ میری زندگی آپ کے سائے میں گزرتی رہی ہے اور میں آپ کی عظمتوں کا روز بہ روز زیادہ سے زیادہ قائل ہوتا جا رہا ہوں۔ میں خود کو ایک کوہِ عظیم کے دامن میں کسی حقیر ٹیلے جیسا تصور کرتا ہوں۔ ہر شخص کا اپنا اپنا مقدر ہوتا ہے۔ جو کچھ آپ کو نصیب ہے وہ آپ کے اس خادم کو کبھی بھی نصیب نہیں ہو سکتا، شاہِ عالی۔“

خواجہ کلاں بیک جس کی آواز تقریباً واضح طور پر مرتعش تھی، خاموش ہو گیا۔ تب بابر نے امیر خسرو کے اس مصرعے کو دہرے دہرے پڑھا:

”اصل کس از کس نہ باشد کم چو جملہ ز آدم اند۔“

”پھر بھی پانچوں انگلیاں برابر تو نہیں ہوتیں۔۔۔ جیسا بارگراں آپ نے اٹھا رکھا ہے ویسا اگر میں اٹھا لوں گا تو میرے چھکے چھوٹ جائیں گے۔۔۔ خلل الہی، کیا آپ یہ نہ پسند فرمائیں گے کہ میں کم از کم پانچ سال ہی اور جی لوں؟ مجھے واپس جانے کی اجازت دے دیجئے۔ میں غزنی چلا جاؤں گا۔ وہاں کے قدیم باندھ کی مرمت کرا لوں گا، ریگستانوں کو گلزاروں میں بدل کر آپ کا نام روشن کروں گا۔“

بابر سوچ میں ڈوب گیا اور کلاں بیک نے فوراً ہی اندازہ لگالیا کہ اسے بادشاہ کے دل کا وہ تار مل

گیا ہے جسے چھو کر وہ اپنی مراد حاصل کر سکتا ہے۔

”میری درخواست پر غور فرمائیے، اعلیٰ حضرت۔ میں اپنی زندگی کے آخری ایام میں بڑھتی ہوئی فارغ البالی کے دوران پرودگار سے آپ کے لئے دعا گو رہوں گا۔ میری دلی آرزو ہے کہ غزنی میں اپنے وطن کے نزدیک ہی سپرد خاک کیا جاؤں۔“

بابر نے دیکھا کہ کلاں بیگ کی آنکھیں نم ہو گئی ہیں۔ آخر کار اس نے پوچھا:

”آپ کی دیکھا دیکھی دوسرے بیگ بھی اگر لوٹ گئے تو پھر میرے ساتھ کون رہ جائے گا؟“

”دوسرے بیگوں سے میں خود ہی بات کر لوں گا۔ قسم کھاتا ہوں کہ ان سے صرف یہی کہوں گا: ”حکمران مجھے باندھ کی مرمت کرانے کے لئے غزنی بھیج رہے ہیں۔“ یقین مانئے، میں اس طرح جاؤں گا کہ میرے پیچھے پیچھے کوئی دوسرا بیگ نہ جائے گا۔“

بابر کو ابھی تک اس بات کا علم نہیں ہو سکا تھا کہ خواجہ کلاں بیگ نے ایک بار محفل بادہ میں بیگوں سے شرط لگائی تھی کہ وہ بادشاہ سے اجازت حاصل کر کے غزنی لوٹ جائے گا۔ اس نے شرط جیتنے کے لئے طرح طرح کے جھکڑے اپنائے تھے اور اپنی مذمت تک کی تھی۔ ویسے اسے یہ بات ناگوار بھی گزری تھی کہ جب وہ اپنی مذمت کر رہا تھا تو بابر نے تردید نہیں کی تھی، یہ یقین نہیں دلایا تھا کہ وہ شجاع اور با اثر بیگ ہے۔

”خیر ٹھیک ہے، جیسی آپ کی مرضی“ بابر راضی ہو گیا۔ ”لیکن آپ پہلے کابل جائیے گا اور میرا خط اور تحائف ماہم بیگم تک پہنچا دیجئے گا۔ میں نے ان صاحب علوم و فنون کے سفر خرچ کے لئے جو میری دعوت پر ہرات، سمرقند، ترمذ اور دوسرے شہروں سے یہاں آ رہے ہیں، رقم منظور کر دی ہے۔ اس رقم کا نصف حصہ بھی اپنے ساتھ لیتے جائیے گا۔ کیونکہ وہاں ان لوگوں کو سفر خرچ دینا ہو گا جن کی ہاں ضرورت ہے۔ اس معاملے میں پیسوں کی کوئی پروا نہ کی جائے گی“ بابر نے کلاں بیگ کے چہرے پر اطمینان کے تاثرات دیکھ کر کہا۔ ”پیسوں کی آج ہمارے ہاں افراط ہے۔ ہم ہر قسم کی محنت کے لئے اچھی سے اچھی اجرت دے سکتے ہیں۔ آپ بھی ہماری طرف سے ان تمام افراد کو یہاں آنے کی دعوت دے دیجئے گا جو آل شیبانی کی جمالت اور قزلباشوں کے مظالم سے تنگ آچکے ہیں اور اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانا چاہتے ہیں۔ ان سب افراد کو یہاں آجانا چاہئے“ سب کو روزگار فراہم کیا جائے گا۔“

”میں ان سب شاہی احکام کی خلوص دل سے تعمیل کروں گا۔ میرا طرز عمل یہ ہو گا کہ جاؤں گا تو تنہا ہی لیکن میرے بدلے میں دسیوں بلکہ سینکڑوں کام کے آدمی یہاں آجائیں گے۔“

باہر نے محسوس کیا کہ کلاں بیگ نے یہ ساری باتیں بڑے خلوص کے ساتھ کی ہیں۔ تاہم کلاں بیگ کے غزنی روانہ ہو جانے کے فوراً ہی بعد اس کی آگرے کی حویلی کی ایک دیوار پر یہ شعر لکھا ہوا نظر آیا جس سے باہر کے جذبات سے متعلق اس عیار کا حقیقی رویہ بے نقاب ہو گیا:

اگر بنجر و سلامت گزر ز سند کسم
سیاہ رو شوم گر ہوائے ہند کسم

دیوار پر جلی حروف سے لکھا ہوا یہ شعر ان بیگوں میں جلد ہی عام ہو گیا جو کلاں بیگ کی طرح ہندوستان سے لوٹ جانے کے خواہاں تھے۔ کچھ ہی دنوں بعد ایک موقع پر باہر کو ہندو بیگ سے کلاں بیگ کی اس شرط کا بھی علم ہو گیا جو اس نے محفلِ بادہ میں اپنے رفقا سے لگائی تھی۔

”فرسبی بد معاش کسین مہا!“ وہ غصے سے کہہ اٹھا۔ ”شرط بھی جیت لی اور میری آنکھوں میں دھول بھی جھونک گیا۔ خیر دیکھتا ہے کہ بالاخر جیت کس کی ہوتی ہے۔“ اس کے بعد باہر بھرا ہوا دیر تک ٹھکتا رہا۔

وہ سوچنے لگا کہ آخر کلاں بیگ کو کیا سزا دی جائے؟ کیا کوئی قاصد اس حکم کے ساتھ فوری طور پر روانہ کیا جانا چاہئے کہ کلاں بیگ کو غزنی کے صویدار کے عہدے سے ہٹایا جا رہا ہے اور اب اسے صویدار کی حیثیت سے حاصلِ مراعات سے محروم ہو کر باندھ کی مرمت کرانی چاہئے؟ پھر اس کے دل میں خیال آیا کہ ایسا کرنے کا مطلب تو یہ ہو گا کہ وہ اپنے ایک پرانے۔ عیار اور کائیاں ہی کیوں نہ سہی۔ بیگ کی جسے وہ صحیح معنوں میں ایک اہم کام سپرد کر چکا ہے، خدمات سے پوری طرح ہاتھ دھو بیٹھے۔ تو پھر کیا قدم اٹھایا جائے؟ خاموشی اختیار کر لی جائے؟ خاموش بیٹھ رہنے کی اجازت نہ آن بان دے رہی تھی اور نہ ہی عقل سلیم کیونکہ کلاں بیگ کا یہ سیدھا سادہ سا شعر ہندوستان سے لوٹ جانے کے خواہاں بیگوں اور سپاہیوں کے لئے کچھ اور بھی زیادہ ترغیب دہ ثابت ہو سکتا تھا۔ دوسری طرف کلاں بیگ کو کسی قسم کی سزا دینے سے بھی شعری مقبولیت میں اضافہ ہو سکتا تھا۔

”تو کیا وہ بیت اب بھی دیوار پر لکھی ہوئی ہے؟“ باہر نے ہندو بیگ سے پوچھا۔

”جی نہیں۔ میں نے اسے مٹوا دیا تھا۔“

”فضول۔ زبردستی مٹائی جانے والی چیزوں کی یادیں عوام کے دلوں پر اور بھی زیادہ مضبوطی کے ساتھ نقش ہو جاتی ہیں“ اچانک باہر کے ذہن میں خیال آیا۔ ”ارے خادم، ذرا میرنشی کو تو بلاؤ۔ فوراً!“

کاغذ، کلم اور دوات سنبھالے ہوئے ایک نوجوان اندر آیا اور بادشاہ کے سامنے سر جھکا کر کھڑا

ہو گیا۔

”لکھو... آرام سے بیٹھ کر لکھو نا۔“

میرٹھی پالٹی مار کر بیٹھ گیا، ختنی تھنوں پر رکھ لی اور کاغذ پر ہاتھ پھیر کر قلم کو درست کیا۔

ہزار شکر کہ بابر تجھے خدائے کریم
ہے خود ہی بخش چکا سندھ اور ہند عظیم

بابر نے سوچا: نہیں، اس خیال کا واضح طور پر اظہار ضروری ہے کہ ہندوستان ہمارے لئے کوئی
غیر سرزمین نہیں بلکہ ہمارا دوسرا وطن ہے۔

اور اس نے فوراً ہی پر عزم لےجے میں لکھانا شروع کیا:

ہزار شکر کہ بابر بہ فضل رب کریم
ملا اک اور وطن - سندھ اور ہند عظیم
وہ جائے غزنی جو ہو سرد مر اور کنور
یہاں کی گرمی میں تڑپے جو رہ سکے نہ مقیم

ہندوبیک کا دل باغ باغ ہو گیا۔ خواجہ کلاں بیک واقعی اپنے آپ کو سرد مر اور متکبر ظاہر کرنے کا
بڑا شوقین تھا۔ سادگی تو اسے چھو بھی نہیں مگنی تھی کیونکہ اس کا خیال تھا کہ وہ اوروں سے کہیں
زیادہ دور اندیش ہے۔

”تمن فکلیں تیار کر دیجئے“ بابر نے حکم دیا۔ ”ایک خواجہ کلاں بیک کو بھجوا دی جائے اور
دوسری، ہندوبیک صاحب، آپ لے لیجئے۔ اسے ان بیگلوں اور سپاہیوں کو پڑھنے کے لئے دیجئے گا جو
کلاں بیک کا شعر پڑھتے ہیں۔ دیکھتے ہیں کہ اس شعری مقابلے میں کون جیتتا ہے۔“

بابر نے ایک بار کسی بیک کو گرمی کا رونا روتے اور فوراً ہی ایک دوسرے بیک کو جواباً یہ مشورہ
دیئے کہ ”وہ جائے غزنی جو ہو سرد مر اور کم زور۔ یہاں کی گرمی میں تڑپے جو رہ سکے نہ مقیم“ سنا تو
وہ کچھ گیا کہ اس کا تیر نشانے پر لگا ہے۔

۳

پانی پت کی جنگ کے بعد طاہر تمن مہینوں تک صاحب فراموش رہا۔ بادشاہ نے علاج کے لئے
جس طبیب کو مامور کیا تھا اس نے زخموں کا مداوا تو کر دیا لیکن چنچ جانے والی پسلیوں اور ہاتھوں کی
ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کے معاملے میں کچھ بھی نہ کر سکا۔ طاہر درد کی وجہ سے روز و شب پریشان رہتا تھا۔
وہ حتی الامکان کوشاں رہتا تھا کہ اس کی کراہیں آگے کے اس چھوٹے سے گھر میں نہ گونجنے پائیں

جس میں وہ اپنے وفادار سائیکس کے ساتھ مقیم تھا۔ ”اب تو شاید میری میت ہی اس گھر سے باہر نکل سکے گی“ اس کے دل میں رہ رہ کے خیال آتا تھا۔

انہیں دنوں میر عمارت فضل الدین کابل سے طاہر کے بیٹے سفر کو جو در سے کی تعلیم مکمل کر کے معمار بن چکا تھا، ساتھ لے کر آگرہ آگیا۔ ان دونوں نے جائے تعمیر پر کام کرتے ہوئے ہندوستانی معماروں کے مشورے سے ایک مشہور وید کا پتا لگایا اور اسے طاہر کو دکھانے کے لئے گھر بلا لائے۔ فضل الدین کو بتایا گیا تھا کہ یہ وید ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کے علاج میں بڑی مہارت رکھتا اور غریبوں سے بہت ہمدردی کے ساتھ پیش آتا ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس شخص کو دماغ بھی اچھا ملا تھا اور دل بھی۔

”بشن چند صاحب“ فضل الدین نے وید سے کہا، ”میرا بھانجا خاندانی بیگ نہیں ہے۔ اس کا تعلق تو محنت مشقت کرنے والے کاشتکاروں سے ہے جو دل و جان سے اپنے وطن کی خدمت کرتے رہتے ہیں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ یہ فوج میں بھرتی ہو۔ کیوں طاہر جان، میں نے تم سے اوش میں یہی کہا تھا؟“

”صد افسوس، ماموں جان کہ میں نے اس وقت آپ کے کہے پر عمل نہیں کیا تھا“ طاہر نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”بیگ بن جانے کے بعد میں اپنے آپ کو جانے کیا سمجھنے لگا تھا...“

میر عمارت نے ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی میں جس کے زیادہ تر الفاظ فارسی کے تھے، آخر کار خاص بات بیان کی:

”میرا بھانجا سفاک بیگوں اور سپاہیوں سے جنہیں ہر وقت لڑائیوں اور لوٹ مار ہی کی پڑی رہتی ہے، رشتہ توڑ کے وطن لوٹ جانا چاہتا ہے۔ وہ محنت مشقت کرتے ہوئے امن و سکون کی زندگی گزارنے کا خواہاں ہے۔ جیسی زندگی مہد باغبان کی ہے، جیسی خود آپ کی ہے، وید صاحب... مہربانی کر کے میرے بھانجے کو اس کے قدموں پر کھڑا کر دیجئے۔“

”میں جانتا ہوں کہ آپ ہمارے ملک میں جنگ کرنے کے لئے نہیں آئے ہیں“ بشن چند نے فضل الدین سے کہا۔ ”میں آپ کی عزت کرتا ہوں، میر عمارت صاحب اور آپ کے بھانجے کے لئے جو کچھ میرے بس میں ہے، ضرور کروں گا۔“

وید نے ایک مہینے تک طاہر کا علاج کیا۔ اس نے اپنی حساس انگلیوں سے ان جگہوں کا جہاں ہڈیاں ٹوٹی تھیں، پتا لگا کر اپنی دوائیں اور پیٹیاں وغیرہ بہت احتیاط و صبر کے ساتھ استعمال کیں اور علاج بے حد کامیاب رہا۔ علاج کے دوران طاہر کا ایک قطرہ خون بھی نہ بہا۔ وہ وید کی گہریاں

ہتھیلیوں اور پتلی پتلی لمبی انگلیوں کا کچھ اس طرح عادی ہو گیا جیسے وہ اس کی اپنی ہتھیلیاں اور انگلیاں رہی ہوں۔

دید نے پیسے لینے سے انکار کر دیا۔ اس نے صحت یاب ہو جانے والے طاہر سے کہا:

”آپ نے میرے ہاتھوں کو، ایک دید کے ہاتھوں کو آنکھوں سے لگا لیا۔۔۔ اظہار ممنونیت کے لئے یہی بہت ہے۔“

”نہیں نہیں، میں تو زندگی کے آخری لمحے تک آپ کا احسان مندر ہوں گا“ طاہر کہہ اٹھا۔

”کون جانے، شاید میں نے اس طرح اپنے پچھلے جنم میں کئے جانے والے کسی کے احسان کا بدلہ چکا دیا ہو۔۔۔“

فضل الدین اور طاہر نے دیر تک دید سے اصرار کیا، یقین دلایا کہ اس کے منہ سے جو کچھ بھی سنیں گے اس کا کسی سے تذکرہ نہ کریں گے تب کہیں جا کر بٹن چند نے انہیں اپنے مہات بھائی کا قصہ سنایا۔ ابراہیم لودھی کے عہد حکومت میں بھائی کو کہیں کام نہیں مل سکا تھا تو وہ آگرے سے پنجاب چلا گیا تھا۔ وہاں اس نے یہ سننے کے بعد کہ باہر نے اپنے بہت سے مخالفین کو قتل کرا دیا ہے، قسم کھائی تھی: ”میں ان غیر ملکوں کو اپنے وطن میں نہ گھسنے دوں گا!“ اس نے دشمن کی فوج کو راستہ بتانے کی ملازمت اختیار کر لی تھی اور اسے لے جا کر دہلی علاقوں اور گھنے جنگلوں میں پھنسا دیا تھا۔

”ذرا ٹھہر جائیے“ طاہر کو اچانک لال چند یاد آ گیا۔ ”اس وقت تو ان کے ہاتھی نے ہمارے دو سپاہیوں کو زخمی کر دیا تھا اور وہ خود بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ بہر حال میں ان کی دلیری سے بہت متاثر ہوا تھا۔ وہ تو پورے لشکر سے بھی خائف نہیں ہوئے تھے! ہم لوگوں نے تو سوچا تھا کہ وہ خود بھی دلدل اور جنگلات سے زندہ بچ کر نہ نکل سکے ہوں گے۔ تو وہ بچ نکلے تھے؟ زندہ ہیں نا؟“

”جی ہاں، زندہ ہیں لیکن مارے خوف کے آگرہ نہیں آرہے ہیں۔۔۔ افسوس کی بات ہے کہ ان کے ہاتھوں آپ کے دو سپاہی معذور ہو گئے لیکن ان کے قصور کی اس بات سے کسی حد تک تلافی ہو گئی تاکہ میں نے طاہر صاحب کو صحت یاب کر دیا؟“

فضل الدین اور طاہر نے احتجاج کیا:

”آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں، بٹن چند صاحب! وطن کا دفاع کرنا اور وہ بھی اتنی دلیری کے ساتھ۔ یہ کوئی قصور نہیں بلکہ شجاعت کا کارنامہ ہے!“

”میں شکر گزار ہوں کہ آپ نے اس خیال کا اظہار کیا۔ لیکن شجاعت سے پیٹ کی آگ تھوڑی

”بھتی ہے۔ میرے بھائی خود اپنی ملک کے اندر ہی روپوشی اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ وہ بے روزگار ہیں اور کوڑی کوڑی کو محتاج۔ بچوں کا پیٹ کیسے پالیں۔“

”آپ کے بھائی کو عمارت سازی سے متعلق کاموں کا کوئی تجربہ ہے؟“

”جی ہاں، انہوں نے اپنے ہاتھی کو پتھروں اور شہتیروں کی ڈھلائی کے لئے سدھا لیا ہے۔“

”تو پھر آپ انہیں میرے پاس بھیج دیجئے۔ ہم لوگ ان دونوں جنگی ہاتھیوں کو دوسرے کام انجام

دینے کے لئے سدھا رہے ہیں۔“

”یہ بات میرے بھائی کے علم میں ہے۔ وہ بھی ہم سب کی طرح خوش ہیں کہ آپ کے بادشاہ

اس ساری دولت کو جسے امرا ایم لودھی نے اپنے خزانوں میں بند کر رکھا تھا، شہروں کو خوش حال

بنانے پر صرف کر رہے ہیں۔ پھر بھی ڈرتا ہوں کہ کہیں میرے بھائی دوبارہ آپ کے سپاہیوں کے

چنگل میں نہ پھنس جائیں۔۔۔ میری عمارت صاحب“ وید نے فضل الدین سے مخاطب ہوتے ہوئے

کہا۔ ”ہمارے لوگوں نے سنا ہے کہ آپ کے بادشاہ آپ کی بہت عزت کرتے ہیں کیونکہ آپ ہی

کی نگرانی میں وہ آگرے، دھول پور اور سیکری میں عظیم الشان عمارات تعمیر کرا رہے ہیں۔ کیا آپ

شاہ باہر سے یہ درخواست کر سکتے ہیں کہ میرے بھائی کو معاف کر دیا جائے؟“

فضل الدین نے نفی میں سر ہلا دیا:

”ویسے تو مرزا باہر بہت بڑے شاعر ہیں، ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے لیکن آپ نے یہ کہاوت بھی

سنی ہے: ”شیر اور بادشاہ کے نزدیک غلطی سے بھی نہ پھنکو؟ بہتر ہو گا کہ آپ کے بھائی اپنا نام اور

حلیہ بدل لیں۔“

”یہ تو وہ کر چکے ہیں۔ نام کشن رکھ لیا ہے اور داڑھی بڑھالی ہے۔“

”انہوں نے بہت اچھا کیا۔ آپ ہفتے بھر بعد انہیں میرے پاس بھیج دیجئے گا لیکن یہاں نہیں،

دھول پور میں۔ وہاں ہم کوئی ایسی صورت نکالیں گے کہ کسی کو ان کے ماضی کا علم ہی نہ ہو سکے

گا۔“

آگرے میں آغاز برکات کے مہینے اساتذہ میں طاہر باہر سے ملاقات کرنے کے لئے محل میں گیا۔

بادشاہ اپنے وفادار بیگ کو بڑی مشکل سے پہچان سکا کیونکہ داڑھی موٹھیں خاصی سفید ہو چکی تھیں

اور شانے جو پہلے مردانہ آن کے ساتھ تھے رہتے تھے، اب لگ رہا تھا کہ کھوکھلے ہو کر جھک گئے

ہیں۔ رخسار پر تیرچھے زخم کے پرانے نشان کے علاوہ تھوڑی اور گردن پر پوندوں جیسے نئے نشانات

بھی نمودار ہو چکے تھے۔

”خدا کا شکر ہے، بیگ کہ آپ صحت یاب ہو گئے“ بابر نے طاہر سے جان بوجھ کر پر جوش لہجے میں کہا۔ ”بہت اچھا ہوا کہ کابل سے آپ کے ماموں بھی یہاں آ گئے۔“

”جی ہاں، لگتا ہے کہ پروردگار نے خود ہی انہیں میرے پاس بھیج دیا۔۔۔ انہوں نے تو میری جان بچالی۔“

”خیر، اب یہ بتائیے بیگ کہ اپنی خدمات کب سے انجام دینا شروع کریں گے؟“

طاہر کا دایاں ہاتھ ٹھیک سے نہیں مڑ پاتا تھا۔ وہ اپنی گردن کو بھی نہیں گھما پاتا تھا جس کی وجہ سے دائیں یا بائیں جانب دیکھنے کے لئے سارے جسم کو گھمانا پڑتا تھا۔

”صد افسوس کہ اب میں اعلا حضرت کے محافظ کی حیثیت سے کام کرنے کے لائق نہیں رہ گیا۔“

”میں اس کی بات کب کر رہا ہوں۔ میں تو آپ کو اپنے درباریوں کے، معتبر و مقرب بیگوں کے درمیان دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”جی نہیں۔ میں بیگ نہیں بن سکتا اور اب بیگ بننے کی خواہش بھی نہیں رہی۔“

”لیکن کیوں؟“

طاہر نے نئے اور نخوت کے زیر اثر اپنے دوست محمد پر بے رحمی سے ہاتھ اٹھانے اور اس کے بعد پیش آنے والے واقعات کی ساری تفصیلات من و عن بیان کر دیں جنہیں بابر توجہ کے ساتھ سنتا رہا۔

”میں زخموں کے باعث شدید درد میں مبتلا بستر پر پڑا اڑیاں رگڑ رہا تھا لیکن میرے لئے اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ تھی خود میرے اپنے ضمیر کی پھنکار۔ نہیں حکمران، مجھے بیگ بننا زیب نہیں دیتا۔۔۔ میں کاشت کار ہوں اور سپاہی بھی لیکن اب تو معذور ہو چکا ہوں۔ اب تو آپ مجھے اسی باغ میں کام کرنے کی اجازت دے دیجئے جسے میرے ماموں جان تیار کر رہے ہیں۔ میں باغبان کی حیثیت سے پھولوں کے پودے لگایا کروں گا۔ تو میں کاشت کاری کے ساتھ ہی ساتھ میں باغبانی بھی بڑے شوق سے کیا کرتا تھا۔“

بابر یہ سب سن رہا تھا اور اس کی نظریں منقش مرمرین ستونوں سے بہت بلندی پر فضاؤں میں خراماں کالی کالی گھٹاؤں کے نظارے میں محو تھیں۔ حسن۔۔۔ نگاہوں سے اوچھل ہوتا ہوا مسمور کن حسن۔ اس نے طاہر کو نیک ارادوں سے بیگ بنایا تھا لیکن اب وہ دیکھ رہا تھا کہ طاہر اس منصب

سے مسرور و مطمئن نہیں ہے۔ آخر کار اس نے کہا:

”خیر ٹھیک ہے، جیسا چاہتے ہیں ویسا ہی کیجئے۔ آپ میرے جنگ جو بیگ اور رفتی ہیں لیکن آپ اس منصب کو چھوڑ کر باغبان بن جائیں گے۔ آپ کو تو بیگوں سے نجات مل جائے گی لیکن مجھے۔۔۔ مجھے کیسے نجات مل سکے گی بیگوں سے؟“

طاہر بوکھلا گیا لیکن اس نے جوں توں جواب دیا:

”آپ بادشاہ ہیں۔ کاشت کار اور بادشاہ میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ بیگ تو آپ کے ماتحتی میں رہتے ہیں۔۔۔“

”وہ ماتحتی ہی میں نہیں رہتے بلکہ مجھے بھی اپنے ماتحت رکھتے ہیں۔ ذرا بھی غفلت برتی جائے تو یہ لوگ ایسے غار میں ڈھکیل دیتے ہیں جس سے آدمی کسی بھی طرح باہر نہیں نکل سکتا۔ غرق کر دیں گے۔۔۔ میں نے اسفرہ میں جو کچھ کہا تھا وہ یاد ہے؟“

”آپ کی اس بات کو شاہ عالیٰ میں زندگی بھر نہ فراموش کر سکوں گا۔“
”اور خود آپ نے کیا کہا تھا؟ کیا وعدہ کیا تھا؟ یاد ہے کہ آپ نے کہا تھا: ”میں ہمیشہ آپ کے ساتھ رہوں گا؟“

”ان دنوں تو میں طاقتور جوان تھا۔۔۔ اب مجھ میں کچھ سکت ہی باقی رہ گئی تو میں آپ کے کس کام کا، عالی جاہ؟“
”مجھے محل میں کسی ایسے شخص کی ضرورت ہے جو میری خلوت گاہ کا خلوص دل سے خیال رکھے۔“

بابر کی مراد اس جگہ سے تھی جہاں وہ تنہائی میں لکھتا پڑھتا تھا۔ طاہر چلتا تھا کہ بابر کی زندگی کے محبوب ترین اور انتہائی خوشگوار لمحات وہیں گزرتے ہیں۔ لیکن اس نے ان سازشوں، افواہوں اور ترچھی نگاہوں کا تصور کیا جن سے اسے سابقہ پڑ سکتا تھا کیونکہ بادشاہ کے چیتوں کو کوئی بھی پسند نہیں کرتا تھا۔ اور اس نے اپنے ماموں کے ساتھ باغ میں کام کرنے کی اجازت کی ایک بار پھر درخواست کرنے کا فیصلہ کیا:

”اعلا حضرت سے یہ غلام معافی کا خواستگار ہے۔ دل چاہتا ہے کہ باغ ہی میں کام کروں۔۔۔“

”اچھی بات ہے، ہم باغ میں اپنی خلوت گاہ کا انتظام کر لیں گے۔ حجرہ تعمیر ہو جائے گا تو اس کی دیکھ بھال آپ ہی کیجئے گا۔ ٹھیک ہے نا؟“

اب انکار کرنے کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔ ویسے طاہر بابر کی کسی بات کی مخالفت کرنے کا عادی

بھی نہ تھا۔ آخر اس نے اپنے دائیں ہاتھ کو جسے ابھی وہ اپنی مرضی کے مطابق موڑ نہیں پاتا تھا، اطاعت اور رضامندی کے اظہار کے طور پر بہ دقت سینے کے بائیں حصے پر دل پر رکھ لیا۔

آگرہ دو مہینوں میں بارش کی لپیٹ میں تھا۔ گرمی تو کم ہو گئی تھی لیکن ہر شے میں سرایت کر جانے والی نمی نے ناک میں دم کر رکھا تھا۔ باہر کے لکھنے کا کاغذ تک نم ہو گیا تھا۔ کپڑے کئی کئی دنوں تک سوکھ نہیں پاتے تھے۔

باہر کیس اور نہیں گیا تھا، آگرے ہی میں مقیم تھا۔ وہ ہر روز شام کو وسیع و عریض باغ کے کافی اندر واقع اپنی خلوت گاہ میں چلا جاتا تھا جو ایک دوسرے سے ملے ہوئے چار کمروں پر مشتمل چھوٹی سی عمارت تھی۔ اس کی صفائی دو خادموں کے سپرد تھی۔ طاہر کو آفتابہ جی بنا دیا گیا تھا لیکن اس کا کام پانی اور شراب پیش کرنے سے کہیں زیادہ قلمی کتابوں، مسودوں، صاف کاغذ، قلم اور روشنائی وغیرہ کا خیال رکھنے سے متعلق تھا۔ تب سے زیادہ پرسکون اور آرام دہ کمرے میں ایک ہشت بغل میز رکھی ہوئی تھی جس کے پاس بیٹھ کر باہر لکھا کرتا تھا۔ پہلو والے کمرے میں دسترخوان پر صراحیوں میں عرق گلاب، لیمو اور سنگترے کے شربت، ایک طشتری میں پان، ڈلی اور نشاط انگیز قوام رکھے رہتے تھے۔

طاہر نے ایک روز دسترخوان پر غزنی کی خوشبودار شراب کی صراحی رکھ دی لیکن باہر نے اسی شام کو اسے ٹوک دیا:

”اسے یہاں سے ہٹا لیجئے! ضیافتوں میں جتنی شراب پی جاتی ہے اتنی ہی بہت ہے۔“

اس کے بعد طاہر نے خلوت گاہ میں کبھی شراب نہ لانے کو اپنا اصول بنالیا۔

کبھی باہر اندرونی کمرے میں تمام شب کام کرتا رہتا تو طاہر بھی صبح تک بیدار رہتا تھا۔

باہر کو علم ہوتا تھا کہ اس کا سابق بیگ ڈیوڑھی میں جاگ رہا ہے اور وہ بعض اوقات طاہر کے پاس آکر کچھ دریافت بھی کر لیتا تھا۔

ایک بار باہر نے پوچھا:

”طاہر بیگ، آپ کو یاد ہے، ہم نے بدخشاں میں ارچہ کے جنگلات میں بے حد بھینی خوشبودار والی ایک گھاس دیکھی تھی؟ یہ گھاس وہ کات میں بھی بہت پائی جاتی ہے اور آسمان یا نئے لاؤ میں بھی... ہلکے نیلے سے رنگ کی ہوتی ہے۔ میں نے ایک بار اس کا نام کسی دفتر میں درج کیا تھا پر وہ مل نہیں رہا ہے... شاید کابل میں رہ گیا۔“

”اس گھاس کو گھوڑے کھاتے ہیں؟“

”ہاں، بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ زمین پر کچھوں کی شکل میں پھیلتی ہے۔“
 ”بیٹا تو نہیں؟“

”ہاں ہاں، بیٹا، آفریں! بیٹا... بو آتا کا زیادہ درست ہے! کچھوں کی شکل میں اگتی ہے جیسے شاخ سے ٹہنیاں نکلتی ہیں۔ تیناق یعنی شاخ، ٹہنی، بدشاخاں میں یہ گھاس بیٹا کھلاتی ہے۔“
 کبھی کبھی باہر طاہر سے ایسے واقعات کے متعلق جوان دونوں کو پیش آئے تھے یا ان مقامات کے بارے میں جہاں سے وہ کبھی گزرے تھے، ضروری تفصیلات بھی دریافت کر لیا کرتا تھا۔
 ایک بار نصف شب بیت چکی تھی تو باہر نے طاہر کے پاس آکر اپنے یہ اشعار بڑے مغموم لہجے میں سنائے:

عرصے سے کوئی یار نہ میرا دیار ہے
 پل بھر کو بھی نہیں مجھے حاصل قرار ہے
 آنے کو اپنی مرضی سے آیا ہوں میں یہاں
 جانے کا پر یہاں سے نہیں اختیار ہے

ان اشعار سے طاہر کے دل پر کچھ ایسی چوٹ پڑی کہ منہ سے آہ نکلتے نکلتے رہ گئی۔
 دونوں خاموش ہو گئے، اپنی اپنی زندگی کے بارے میں، اپنی اپنی بیگمات کے بارے میں سوچنے لگے۔ باہر کو سب سے زیادہ ماہم بیگم کی یاد ستانے لگی اور طاہر کو رابعہ کی۔
 ”آخر ان سے ہماری ملاقات کب ہو سکے گی، اعلا حضرت؟ ہمیں آگرے میں تیار ہتے ہوئے کتنے دن بیت چکے ہیں!“

”راستے اب بھی بہت ہی پر خطر ہیں، خاص طور سے خواتین کے لئے۔ اور طاہر بیگ، گھریلو زندگی کی راحتوں کی فکر کرنے کا یہ وقت بھی نہیں۔ رانا سنگرام سنگھ جنگ کی تیاریاں کر رہا ہے۔“
 ”لیکن اس نے تو ابراہیم لودھی کے خلاف آپ سے اسی وقت معاہدہ کر لیا تھا جب ہم لوگ کابل میں تھے۔“

”اس راجپوت کا اصل مقصد یہ تھا کہ ہماری مدد سے دہلی اور آگرے پر قابض ہو جائے۔ اس کی شجاعت پر ذرا بھی شک نہیں کیا جاسکتا لیکن وہ چالاک بھی ہے اور اس کا خیال تھا کہ ابراہیم لودھی سے جنگ کے بعد ہم لوگ واپس لوٹ جائیں گے۔ اب وہ دیکھ رہا تھا کہ ہم تو یہاں ٹھہر گئے ہیں، عمارات تعمیر کر رہے ہیں اسی لئے ہم سے ٹکر لینے پر آمادہ ہو گیا ہے، اپنی طاقت بڑھا رہا ہے۔ اس نے اپنے چوڑے نکل کر بہت سے علاقوں پر قبضہ بھی کر لیا ہے۔ وہ تو ہمیں مغل کہتا ہے

حالانکہ اسے معلوم ہے کہ ہم ترک ہیں۔ رانا سنگرام سنگھ ان سبھوں کو اپنے ارد گرد اکٹھا کر رہا ہے جو ہم سے خار کھاتے ہیں، ناخوش ہیں۔“

”بجا فرمایا اعلیٰ حضرت نے۔ ویسے ناخوش لوگوں کی یہاں بھی کوئی کمی نہیں۔۔۔ اور ان کی ناراضگی کے اسباب بھی ہیں۔“

ظاہر کی اس بات کا مقصد بابر کو اس واقعے کی یاد دلانا تھا جو چند دنوں قبل قلعہ آگرہ میں پیش آیا تھا۔

محل کے عقبی حصے میں قلعے کی فیصل تک کافی لمبی چوڑی زمین خالی پڑی ہوئی تھی۔ بابر نے حکم دیا کہ اس کے وسط میں ایک باولی کھودی جائے۔ تیریز سے آگرہ آجانے والے سلیمان رومی کے منصوبے کے بموجب یہ باولی بہت گہری کھودی جانی تھی اور اس میں مختلف سطحوں پر تین بڑے بڑے حوض بنائے جانے تھے۔ باولی کی تہ میں بننے والے بہت بڑے حوض تک پہنچنے کے لئے اوپر سے بالکل سطح آب تک میڑھیاں بھی بنائی جانی تھیں۔ مختصر یہ کہ بہت زیادہ کام انجام دیا جانا چاہئے تھا لیکن بابر نے حکم دیا تھا کہ باولی کی تکمیل چھ مہینوں میں ہو جانی چاہئے۔ اتنے میں موسم باراں شروع ہو گیا۔ ہندوستانی کاریگروں نے مشورہ دیا کہ برسات کے زمانے میں باولی کی کھدائی نہ کی جانی چاہئے لیکن ان کی ایک بھی نہ سنی گئی اور انہیں کام کرنے پر مجبور کر دیا گیا۔ تین روز قبل غلیظ طوفان کا ایک حصہ ڈھے گیا تھا اور نیچے کھدائی کرتے ہوئے چار مزدور دب گئے تھے۔ مٹی ہٹا کر انہیں باہر نکالا گیا تو پتا چلا کہ تین مرچکے ہیں اور چھوٹا ریزہ کی ہڈی ٹوٹ جانے کے باعث زندگی بھر کے لئے معذور ہو چکا ہے۔ ہندوستانی کاریگروں نے مطالبہ کیا کہ جس ٹھیکیدار کی غلطی سے یہ حادثہ ہوا ہے اسے سزا دی جائے لیکن وزیر محمد دلدائی نے انہیں کام سے علیحدہ کر دیا اور الزام لگایا کہ جو کچھ ہوا وہ دراصل انہی کی بد احتیاطی کا نتیجہ تھا۔ اس کے بعد تین ہندوستانی کاریگر شاہی محل سے بھاگ کھڑے ہوئے اور غالباً ”رانا سنگرام سنگھ کے ہاں چلے گئے۔“

ظاہر نے مٹی میں دب جانے والے مزدوروں کی لاشیں دیکھی تھیں اور ان کے ہاتھوں کے رنگ نے اسے ویدیشن چند کے ہاتھوں کی یاد دلادی تھی۔

ظاہر نے پوچھا:

”آپ کو معلوم ہے، عالی جاہ کہ باولی کی زمین کیسے ڈھے گئی تھیں؟“

”ہاں، مجھے محمد دلدائی نے بتایا تھا۔“

”بسبب یہی کہ وہ حادثہ ٹھیکیدار کی غلطی کا نتیجہ تھا۔۔۔“

”کھدائی کرنے والوں کو خود ہی محتاط رہنا چاہئے تھا۔ میں نے حکم دیا ہے کہ کنوؤں کی دیواروں کو تنخے اور ٹیکس لگا کر مضبوط کر دیا جائے۔ اس طرح کام کرنے والوں کی جان کو کوئی خطرہ نہ لاحق ہو گا۔“

”لیکن سنا ہے کہ معمار تو بھاگ کھڑے ہوئے۔“

”یہ کام نئے ٹھیکیدار کے سپرد کر دیا گیا ہے، نئے معمار بلا لئے گئے ہیں۔ اگرے میں معماروں کی کوئی کمی تھوڑی ہے۔“

اس کا مطلب یہ تھا کہ کام روکا نہ جائے گا، جاری رہے گا حالانکہ زمین ایک بار پھر ڈھس سکتی تھی، اوروں کی جانیں بھی لے سکتی تھی۔

ذرا دیر قبل ہی بابر کے اشعار سن کر طاہر کے دل میں مختلف جذبات کے ساتھ ہی ساتھ ان اشعار کے خالق سے شدید محبت کا جذبہ بھی امنڈ پڑا تھا لیکن اب اسے ایسا لگا جیسے اس جذبے کی لہر ختم ہو گئی ہو، جیسے ان دونوں کے درمیان اجنبیت کی سرد ہوائیں چلنے لگی ہوں۔ طاہر نے سوچا کہ آخر ایک ہی فرد کے دل میں اپنے عزیز و قریب افراد اور اپنے وطن سے شدید محبت اور غیروں کے دکھ درد سے بے نیازی کے جذبات بیک وقت کیسے رہ پاتے ہیں؟ وہ بابر سے جانے کب سے محبت کرتا رہا ہے! تپاک اور سرد مری... شہ زوری اور حسن۔ آخر اس الجھی ہوئی سمجھتی کو کیسے سلجھایا جائے؟ آخر اس گرداب سے کیسے نکلا جائے؟

طاہر کے دل کو کافی نہیں لگی۔

۵

مٹی ڈھننے سے دب کر ہلاک ہو جانے والے مزدوروں کی لاشوں کو چاشنی گیر ہملول نے بھی جو شاہی مطبخ میں بادشاہ کے لئے کھانے تیار کر رہا تھا، دیکھا تھا۔ اس کے سینے میں پانی پت کی جنگ کے دوران دشمنوں کے ہاتھوں اپنے بیس سالہ بھائی کے ہلاک کر دیئے جانے کا حادثے میں مزدوروں کی موت کا، ملکہ بیدہ کی توہین کا اور ان ساری باتوں کا انتقام لینے کی آگ بھڑک اٹھی تھی جو فاتحین کی وجہ سے ہو رہی تھیں۔

اس چاشنی گیر کے پاس احمد نے ملکہ بیدہ کی ایک کنیر کے ذریعے زہر پہنچا دیا تھا۔ ایک دوسری کنیر نے جو کسی نہ کسی طرح شاہی محل میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئی تھی، ہملول کی ملکہ کی اس ہدایت سے بھی مطلع کر دیا تھا کہ اسے عجلت سے کام لیتا چاہئے ورنہ موسم باران کے ختم ہوتے ہی بابر رانا شگراں سنگھ کے خلاف مہم پر روانہ ہو جائے گا۔

زہر، بہت ہی کم، صرف دو چنگی زہر چار تہہ کئے ہوئے سفید کاغذ کی پڑیا میں چھپا ہوا تھا۔ یہی وہ خطرناک ہتھیار تھا جس کی ذریعہ ہملول نہ صرف یہ کہ اپنے بھائی کی موت کا انتقام لیتا چاہتا تھا بلکہ اپنے وطن سے بیرونی فائقین کو بھی بھگا دینے کا خواہاں تھا۔ دراصل احمد اس چاشنی گیر کو یقین دلا چکا تھا کہ بابر کا کام تمام کر دیا گیا تو باقی سب فائقین ہندوستان سے واپس چلے جائیں گے اور ابراہیم لودی کا بیٹا تخت نشین ہو جائے گا۔

بابر کے اپنے چاشنی گیر بھی تھے جن کی ذمہ داری یہ تھی کہ تمام کھانوں کے شاہی دسترخوان پر لگائے جانے سے قبل دیکھیں ہی میں چکھ کر جانچ لیا کریں۔ لیکن مٹن میں جو چند چاشنی گیر کام کر رہے تھے وہ اس وقت کچھ کھانوں کو لے کر شاہی دسترخوان پر لگانے کے لئے جا چکے تھے۔ ہملول نے چپ چاپ اپنی بگلی جیب سے زہر کی پڑیا نکالی اور احتیاطاً چاروں طرف نظریں دوڑانے کے بعد تھوڑا سا زہر ایک چپاتی پر چھڑک کر اسے چینی کی رکاب پر رکھ دیا۔ دراصل اسے ملکہ بیدہ نے ہدایت ہی یہی کی تھی کہ زہر کے سفوف کو دیکھنے کے بجائے جن کے کھانے پہلے ہی چکھ لئے جاتے ہیں، بابر کے کھانے کی رکابی یا پیالے میں ڈالنا۔

اتنے میں ہوا کے تیز جھونکوں سے باہری دروازہ بھڑ سے بند ہوا اور ہملول نے گھبرا کر باقی زہر کو چولھے میں پھینک دیا۔ اس نے ایک بار پھر چاروں طرف نظریں دوڑائیں اور اس کی گھبراہٹ جاتی رہی۔ اب اس نے بڑے اعتماد کے ساتھ چپاتی پر گوشت کی بوٹی رکھ کر اوپر سے کچھ گھی بھی ڈال دیا۔

ذرا ہی دیر بعد ایک خدمت گار آکر چینی کی اس رکابی کو محل کے اس حصے میں اٹھالے گیا جہاں بابر کھانے پر بیٹھا تھا۔ وہ اپنے ساتھ باریک باریک کٹی اور تلی ہوئی گاجروں کی طشتری بھی اٹھالے گیا۔

احمد نے اس چاشنی گیر کو یقین دلا دیا کہ زہر سے کھانوں کے ذائقے پر کوئی اثر نہ پڑے گا اور کھاتے وقت ذرا بھی شک نہ ہو گا کہ کھانے میں زہر ملا ہوا ہے۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ یہ زہر اپنا ذائقہ دیر سے دھیرے دھیرے کھائے گا۔ ہملول کو یقین تھا کہ وہ محل میں شور مچنے سے قبل ہی قلعے کے پھانک سے باہر نکل کر غائب ہو جائے گا لیکن اس اثناء میں ایک نہایت ہی غیر متوقع واقعہ پیش آیا۔ ایک چاشنی گیر اس کا راستہ روک کر دروازے میں آن کھڑا ہوا۔

”خزگوں کا گوشت ہمارے لئے بھی بچا رکھا ہے کہ نہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”صاحب، آپ لوگوں کے لئے تو قلیہ رکھا ہے۔“

”نہیں، ہمیں تو خرگوش کا گوشت ہی چاہیے۔“

”وہ تو تھوڑا ہی تھا، صاحب۔ سب کاسب شاہی دسترخوان کے لئے بھیج دیا گیا۔“

”نہیں، میں جانتا ہوں، بہت تھا۔ آخر ہمارے لئے کیوں نہیں رکھا؟ بولو؟“ ہٹا کٹا چاشنی گیر

غرایا۔

”میں نے سارا گوشت نہیں ملا تھا، صاحب۔“

”تو اب تل دو! جلدی کرو!“

بہلول بادل ناخو استہ چولھے کے پاس لوٹا اور گھبراہٹ کے عالم میں کام کرنے لگا۔ اس نے دوبارہ

گھی گرم کیا اور خرگوش کے گوشت کی بوٹیاں کڑا ہی میں ڈال دیں۔

تاریکی بڑھ گئی۔ رات نے محل کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ تیز ہواؤں کے ساتھ موسلا دھار

بارش جو شام کو شروع ہوئی تھی، اب بھی جاری تھی۔

اتنے میں اچانک پریدار سپاہی ادھر ادھر دوڑنے بھاگنے لگے اور کسی نے زور سے پکارا:

”حکیم! حکیم صاحب کو بلوایئے!“ چاشنی گیر جو کچھ نہیں سمجھ سکے تھے، ایک دوسرے کو ڈھکیلتے

ہوئے لپکے۔ شور لمحہ بہ لمحہ بڑھتا گیا اور بادشاہ کے کھانے کے کمرے کے دروازے کے سامنے بھیڑ

سی جمع ہو گئی۔ طاہر باغ میں واقع خلوت گاہ سے انتہائی تیزی کے ساتھ دوڑتا ہوا کھانے کے کمرے

میں پہنچ گیا۔

بابر کو ابکیاں آری تھیں، تے ہو رہی تھی۔ اس کا چہرہ نیلا پڑ گیا تھا۔ وہ ہانپتا ہوا اضطرابی کیفیت

کے ساتھ باہر نکلنے کے لئے دروازے کی طرف بڑھا لیکن دو قدم بھی نہ چل سکا، پاؤں لڑکھڑانے

لگے۔ طاہر نے لپک کر اسے سمارا دیا۔

حکیم یوسفی فوراً ہی آگیا۔

”برآمدے میں بستر بچھا دو“ اس نے خادموں سے کہا۔

”نہیں، احاطے میں!“ بابر نے خرخراتی ہوئی آواز سے کہا اور ابکیائیوں کا دوبارہ دورہ پڑنے سے

دھرا ہو گیا۔

”عالی جاہ، احاطے میں تو بارش ہو رہی ہے۔ برآمدے میں بہتر رہے گا۔“

بابر کو سہارا دے کر برآمدے میں لایا اور بستر پر لٹا دیا گیا۔ حکیم نے اسے بلا نوشوں کے دل کو

مضبوط کرنے والی دوا سونگھنے کو دی۔

”میں نے شراب نہیں پی تھی۔ کھانے میں کچھ ملا تھا!“ اس کے بعد وہ ”بادرچی کو حراست میں

لے لو!“ ہی کہہ پایا تھا کہ اٹھ کر دوبارہ چینی کی چلچلی پر چمک گیا۔ دوسرے دو افراد نے بھی اس کھانے کا کچھ حصہ کھایا تھا۔ انہیں بھی تے ہوئی لیکن بابر سے کچھ کم۔

ہسلو کو سپاہیوں نے نہیں بلکہ خود چاشنی کیڑوں ہی نے پکڑ لیا اور جلاؤنے آس سے پوچھ گچھ کی تو اس نے جلد ہی سب کچھ اگل دیا۔ احمد، ملکہ بیدہ اور اس کی دونوں کینوں کی گرفتاری کے لئے فوراً ہی سپاہی روانہ کر دیئے گئے۔

بابر کی حالت تمام شب خراب رہی۔ جب بھی تے ہونے لگتی تھی یا تیز بخار کے باعث جسم کا درد بڑھ جاتا تھا تو اس کے مقررین پریشان و متفکر ہو جاتے تھے کہ شاید آخری گھڑی آن پڑی۔ حکیم یوسفی بابر بابر کے پیٹ کی دھلائی کرتا رہا، یکے بعد دیگرے دوا کیں دیتا اور یقین دلاتا رہا:

”انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا، اعلا حضرت۔ ہم آپ کو صحت یاب کر دیں گے۔“

بابر کو لگ رہا تھا جیسے دنیا ٹوٹ کے جب دھندلے دھندلے سے ٹکڑوں میں منقسم ہوئی جا رہی ہے اور ان کے ساتھ ہی ساتھ اس کا دل، ہیمپٹرے اور معدہ باہر نکلے پڑ رہے ہیں۔ اس کی آنکھوں کے سامنے عجب رنگ برنگے سے دھبے رقصاں تھے جن کے درمیان کبھی ہمایوں، کبھی بیدہ اور کبھی مسکین ماہم بیگم کی جھلک نظر آ جاتی تھی۔

بابر کراہ رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں بدبدا رہا تھا (حالانکہ اسے لگ رہا تھا جیسی اونچی آواز سے کہہ رہا ہو: ”آخر میں نے مرزا ہمایوں کو کابل کیوں بھیج دیا؟ اور انہیں وہاں سے بد خشاں جانا ہے کیونکہ ہماری شمالی سرحدوں کے حالات ایک بار پھر اتر ہو گئے ہیں۔۔۔ برسات ختم ہو جاتی تب جاتے۔۔۔“ بابر پر بے ہوشی سی طاری ہو گئی اور اس کے سامنے امیر تیمور آن کھڑا ہوا جس کے سرخ و سیاہ دستار میں کوہ نور، ہیرا چمک رہا تھا۔ پھر اسے ہوش آگیا اور وہ سوچنے لگا: ”یہ بلا سر سے نہ ٹلی تو آخری لحات میں نہ میرا جگر گوشہ میرے پاس ہو گا نہ ہی شریک زندگی ماہم بیگم۔ قاصدوں کے ان تک پہنچنے اور ان دونوں کے آگرہ آنے میں کم از کم تین مہینے لگ ہی جائیں گے۔ اور میرا انتقال تو ہفتے بھر میں ہو سکتا ہے۔ نہیں، کل، آج، ابھی!“

”خوصلے بلند رکھئے، عالی جاہ۔ ہمت نہ ہاریئے“ طاہر نے منت بھرے لہجے میں کہا۔ ”آپ کے ساتھ تو ہم لوگ جانے کتنی ہی بار موت پر فتح حاصل کر چکے ہیں!“

”لیکن ہم پر۔۔۔ ایسی تو کبھی بھی۔۔۔ نہیں گزری تھی۔۔۔ ہے نا طاہر جان؟ ذرا قریب آ جاؤ، طاہر بیگ“ بابر نے رک رک کر سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

جب بھی بابر ”آخر یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا؟!“ سوچتا اور سیاہ و سرخ تھکے ہوئے تھوکتا

ہوا چلچلی پر جھٹکا، طاہر اسے سہارا دیتا اور اس کے پسینے میں لت پت چہرے اور جسم کو پونچھے لگتا تھا۔ ناقابل برداشت اندرونی درد سے بار بار باہر کی سانس رکنے سی لگتی تھی، آنکھوں میں آنسو آجاتے تھے۔ طاہر یہ سب دیکھ دیکھ کر اسی خیال سے مغموم ہو رہا تھا کہ اس کے لئے باہر کی ان تکالیف کا کچھ حصہ خود جھیل لینا کسی بھی طرح ممکن نہیں ہے۔ اسے باہر سے اتنی زیادہ ہمدردی محسوس ہو رہی تھی کہ کسی کسی وقت اسے لگتا جیسے خود بھی زہر کھالیا ہو۔

تے ہونے کے دوروں کے مختصر درمیانی وقفوں میں سے ایک میں جبکہ باہر آنکھیں بند کئے بے جان سالیٹا ہوا تھا، اس عہدیدار کو قریب آنے کی اجازت دے دی گئی جس نے گرفتار کر لئے جانے والوں سے پوچھ سمجھ کی تھی۔

”مختفرا“ معاملے کا لب لباب بیان کر دیجئے، صرف لب لباب“ یوسفی نے اسے چپکے چپکے آگاہی

دی۔

خاص بات جو باہر کو معلوم ہونی چاہئے تھی وہ تھی بیدہ کا اعتراف جرم۔ ملکہ نے تسلیم کر لیا تھا کہ بیرونی بادشاہ کو زہر دینے کا منصوبہ اسی نے بنایا تھا، اسی نے اس معاملے میں ضروری افراد کا انتظام کیا تھا نیز یہ کہ اس طرح اس نے اپنے بیٹے کی موت کا انتقام لیا ہے۔ تفتیش کرنے والے نے اس سے یہ بھی معلوم کرنے کی کوشش کی کہ کیا سازشیوں کا کوئی تعلق رائا سنگرام سنگھ سے بھی تھا مگر بیدہ نے جواب دینے سے انکار کر دیا۔ عہدیدار باہر کی اجازت کے بغیر ملکہ کو کچھ اگلوانے کے لئے اذیت دینے کی جرات نہ کر سکا۔

”جواب... جواب تو اسے دینا ہی ہوگا!“ باہر نے مرتعش آواز سے کہا کیونکہ پھر مروڑاٹھنے لگی تھی۔ ”اور وہ حرام زادہ باورچی! کمبخت کو ملازم رکھا!... اس پر اعتبار کیا!... اس کے پکائے ہوئے کھانے کھاتا رہا اور اس نے غداری کی!...“ باہر کے ٹھنڈا پسینہ پھوٹ نکلا اور حکیم یوسفی نے عہدیدار کو وہاں سے چلے جانے کا اشارہ کیا۔

”اعلا حضرت! ان بد معاشوں کو تڑپا تڑپا کر ہلاک کیا جانا چاہئے تاکہ دوسروں کو عبرت ہو۔“

”ان تینوں کو رواج کے مطابق سزائے موت! بیدہ کو... بعد میں۔“

”جو حکم۔“

حکیم یوسفی باہر کی جان بچانے کے لئے دو دونوں اور دو راتوں تک جدوجہد کرتا رہا۔ اس کے بعد اس نے اطمینان کی سانس لی۔

”خدا کا ہزار ہزار شکر کہ اس نے ہمارے فرماں روا کو حیات نو عطا کر دی... اب آپ دودھ پیا

کریں اور زیادہ سے زیادہ سونے کی کوشش کرتے رہیں۔۔۔“

بابر سونے کی کوشش کرتا تھا لیکن نیند برائے نام ہی آتی تھی، بس آنکھیں بند کئے لیٹا رہتا تھا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے وہ اتھاہ غار اب بھی منڈلاتا رہتا تھا جس کے دھانے پر وہ دونوں تک کھڑا رہا تھا، عین دھانے پر! ان ہمیائیک دنوں کے بعد اس کے دل میں جس نہایت ہی طاقتور جذبے نے جنم لیا اسے نئی زندگی پانے کا جذبہ ہی کہا جاسکتا تھا۔ اب اس کے لئے زندگی کا مختصر سے مختصر لمحہ بھی تمام سلطنتوں، تمام خزانوں، ساری شہرت و ناموری اور دنیا کے سارے تختوں اور تاجروں سے بھی زیادہ عزیز ہو گیا تھا۔ اس کی اہمیت سے ہلکان اور بے حال روح اور نحیف جسم کے اندر جیسے کچھ جل کر خاکستر ہو گیا تھا اور اب وہ دنیا کو بالکل ایک نئی نگاہ سے دیکھنے لگا تھا۔ وہ سوچتا کہ زندگی انسان کو ایک بار، محض ایک ہی بار ملتی ہے تو پھر اس شخص کی بدبختی کا کیسے اندازہ لگایا جاسکتا ہے جو خود اس کی عمر تک بھی پہنچنے سے قبل ہی اپنی زندگی سے محروم ہو گیا ہو؟ مثال کے طور پر اس کا دشمن ابراہیم لودھی اس سے چار سال چھوٹا تھا۔ کیا ملکہ بیدہ، ان بان والی وہ خاتون جس نے یہ جرم کیا تھا، اپنے بیٹے کی موت کو فراموش کر سکتی تھی، بابر کو صرف اس بنا پر معاف کر سکتی تھی کہ بابر نے سب کے سامنے اسے اپنی ماں بنا لیا تھا؟۔۔۔ وہ سوچتا کہ فتح بے پایاں مسرتوں سے ہمسکار کر دیتی ہے لیکن خطرناک بھی ہوتی ہے۔ فتح کے نشے میں فاتح اپنی ذات، اپنی طاقت اور لوگوں پر اپنے اثرات کا بہت بڑھا چڑھا کر اندازہ لگانے لگتا ہے۔ یہ بات نہ ہوتی تو بھلا وہ ایسے باورچی پر کب اعتبار کر سکتا تھا جو اتنے برسوں تک وفاداری کے ساتھ بیدہ کی خدمات انجام دے چکا تھا۔ اس کا یہ اقدام خود کو بہت کچھ سمجھ بیٹھنے ہی کا نتیجہ تھا۔ اگر وہ اس خوش فہمی میں نہ مبتلا ہو گیا ہوتا کہ لوگوں کے، اس ملک کے لوگوں کے دلی جذبات کو سمجھنے پر قدرت رکھتا ہے تو کیا اسے اپنے خلاف بیدہ کی آنکھوں میں چھپی ہوئی نفرت نظر نہ آ جاتی۔ بیدہ کی آنکھوں کی وہ بجلی کے کوندے جیسی چمک تو اسے اب کہیں جا کر یاد آ رہی تھی۔ اسے ماہم بیگم کی یہ بات بھی یاد آ رہی تھی کہ بیرونی حملہ آور کی تلوار کے زخم صدیوں تک نہیں بھرتے۔ اس بات پر کان نہ دھرتا، اس بات کی سچائی کو تسلیم نہ کرنا کتنی بڑی خود فریبی تھی! اسی وجہ سے تو وہ بیدہ کے فریب کا بھی شکار ہو گیا تھا اور خود اپنے فریب کا بھی۔ لیکن اگر اس طرح کے زخم صدیوں تک نہیں بھرتے تھے تو کیا اس کی زندگی اپنے اور اس ملک کے لوگوں کے درمیان حائل خلیج کو دور کرنے کے لئے کافی ہو سکتی تھی؟ یا پھر یہ آرزو بھی محض خود فریبی ہی تھی، محض سراب ہی؟ کہیں یہ اس بات کی سزا تو نہیں تھی کہ اس کی مسموں کے دوران بے گناہوں کا، نتوں کا خون بہایا گیا تھا؟

اس قسم کے خیالات اور فکروں سے بابر کی حالت دوبارہ بگڑنے لگی۔ اسے مستقبل پہلے سے بھی زیادہ تاریک نظر آنے لگا۔

اس سب کے باوجود زندگی کی قوتیں زیادہ موثر ثابت ہوئیں۔ تاریکی میں جھللاتی ہوئی روشنی دھیرے دھیرے بڑھتی اور تیز ہوتی گئی۔

مٹیوں کا سلسلہ بند ہو گیا۔ رات کو وہ سکون کے ساتھ سونے بھی لگا تاہم صبح کو بستر سے اٹھنے کی کوشش کرتا تھا تو چکر آنے لگتا تھا۔

”یہ فضا بہت جاتی رہے گی“ حکیم نے اسے یقین دلایا۔ ”اعلا حضرت“ ابھی آپ لیٹے ہی رہا کریں، ذرا جسم میں طاقت آنے دیجئے۔

”کتنے دن؟“

”ایک ہفتہ اور۔ میں آپ کا تھوڑا سا خون نکال لیتا ہوں۔ خون میں بچے کچے زہر کو نکل جانا چاہئے۔“

”میں دیے ہی بالکل بے جان ہو رہا ہوں۔“ بابر نے مخالفت کی۔ ”خون نہ نکالے۔ مجھے جلد از جلد مختلف لوگوں سے بیگیوں سے ملاقاتوں کا سلسلہ دوبارہ جاری کرنا چاہئے۔ ظاہر ہے کہ لوگوں میں سرگوشیاں شروع ہو گئی ہوں گی کہ میں نکما اور کمزور ہو گیا ہوں۔ ہمیں ایک طاقتور دشمن سے ٹکر لینی ہے۔ وہ بغلیں بجا رہا ہو گا۔ باغی سر اٹھانے لگیں گے۔“

... صحت یاب ہو جانے کے کچھ دنوں بعد بابر نے ایک خط کابل روانہ کیا جس میں اس نے اس واقعے کی تفصیلات اتنی سچائی کے ساتھ ایسے پرسکون انداز میں درج کیں کہ بعد میں پورے خط کو اپنی ترک میں شامل کر لیا۔ لیکن پرسکون لہجے کے اس خط میں بھی اس دہشت کی پرچھائیاں نمودار ہو گئیں جو سر پر منڈلاتی ہوئی موت کے احساس سے اس کے دل پر طاری ہو گئی تھی۔ ”میں نے اس سے قبل کبھی بھی زندگی کی شیرینی کو اتنی شدت کے ساتھ نہیں محسوس کیا تھا۔ میرا ایک شعر ہے:

جو دہلیز تک موت کی جا چکا ہے
وہی قیمت زندگی جانتا ہے

اس واقعے کا جب بھی خیال آتا ہے، بری طرح مضطرب ہو جاتا ہوں۔“

بابر کے خطرے سے باہر ہو جانے کے بعد تیسرے دن اس کے حکم پر بیگ، اعلا عمدیدار اور سلطنت کے تمام علاقوں کے حاکم دربار میں جمع ہوئے۔ بابر عقی دروازے سے اندر داخل ہوا اور

دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا شہ نشیں پر پہنچ کر تخت پر بیٹھ گیا۔ درباریوں نے اپنے اپنے عہدہ و منصب کے اعتبار سے اپنی جگہیں سنبھال لیں تو ملکہ بیدہ کے اندر لائے جانے کا اشارہ کیا گیا۔ ملزمہ اندر آئی اور دو سپاہی اس کے دائیں اور بائیں طرف کھڑے ہو گئے۔

وہ سفید لباس میں ملبوس اپنے سفید بالوں والے سر کو پورے فخر سے اٹھائے ہوئے اندر آئی تھی پھر بھی اس نے تخت کی طرف رخ کر کے تعظیماً سر کو کچھ خم کر دیا۔ اس نے ایک ہی نظر میں شہ نشیں کی میڑھیوں، تخت پر بیٹھے ہوئے بابر کے زرد زرد سے چہرے، حلقوں میں دھنسی ہوئی اس کی آنکھوں اور شاندار دستار میں لٹکے ہوئے ہیروں کی چمک دمک کا جائزہ لے لیا۔ اس کا حوصلہ بڑھ گیا اور فوراً ہی بڑی آن بان سے تن کر کھڑی ہو گئی۔

سماعت شروع ہو گئی۔ بیدہ کو لانے والے عہدیدار نے دریافت کیا کہ شہنشاہ کی جان لینے کی سازش میں سزائے موت پانے والے افراد کے علاوہ اور کون کون ملوث تھا۔

”یہ سازش نہیں، میرا انتقام تھا!“ بیدہ نے کہا۔ ”انتقام اس خون کا جو آپ کے بادشاہ نے بہایا ہے۔ میری مدد بملول، احمد اور دو کنیزیوں نے کی تھی۔ انہیں انتقام لینے والے شہیدوں کا درجہ نصیب ہوا، بہادروں کی موت ملی۔ اب میری باری ہے۔ میں موت سے ذرا بھی خائف نہیں۔ میں اپنے لخت جگر کے غم میں جل کر خاک ہو چکی ہوں۔ قتل کرا دیجئے مجھے، اڑا دیجئے میری خاک کو ہواؤں میں۔“

اس نے یہ سب فارسی میں کہا جسے سب نے سمجھ لیا۔ سب خاموش رہے۔ بابر پر واضح ہو گیا کہ نڈر بیدہ سر سے کفن باندھ کے آئی ہے اسی لئے زہر میں بچھے ہوئے الفاظ استعمال کر رہی ہے تاکہ بادشاہ چراغ پا ہو کر فوراً ہی جلا دیا جائے، حکم دے کہ نئی ماں کو سخت سے سخت ازیتیں دی جائیں۔۔۔ بابر نے سوچا کہ ایسا کرنے کا مطلب یہ ہو گا کہ جیت بیدہ کی ہوگی۔ اس کی بے خونی اور بے باکی کے متعلق طرح طرح کے قصے چاروں طرف مشہور ہو جائیں گے اور اسے شہرت و دوام حاصل ہو جائے گی۔ بیدہ چاہتی ہے کہ بعد میں اسے احترام کے ساتھ یاد کیا جائے۔

بابر نے اپنے غصے کو دبا دیا۔ اسے تو بیدہ پر ویسے ہی صبر و تحمل اور عزم کے ساتھ فتح حاصل کرنی تھی جیسے بیدہ کے دیئے ہوئے زہر کے اثر پر حاصل کی تھی۔ اچانک اس کے جسم میں پیدا ہونے والے تشنگ نے زہر دئے جانے کے واقعے کی یاد تازہ کر دی لیکن اس تشنگ کی طرف درباریوں کا دھیان نہ گیا۔

بابر خاموش رہا۔ اتنے میں ملک واد کو رانی بول پڑا:

”سلطان ابراہیم کی والدہ صاحبہ، خود کو انتقام لینے والے جانباز خاتون بنا کر پیش کرنے کی کوشش نہ کیجئے۔ آپ نے شاہ عالی کو فریب دے کر بڑی کمینہ حرکت کی ہے!۔۔۔“

”خاموش ہو جا، غدار!۔۔۔ مجھے تو اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے یہ کرنا ہی تھا۔“

”آپ نے تو ماں کے مقدس نام کو بھی داغ دار کر دیا۔ عالی جاہ نے جب آپ کو اپنی منہ بولی والدہ کہہ کر آپ کی توقیر بڑھائی تھی تو شدت جذبات سے سب لوگوں کے سامنے ہی آپ کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔“

”آنسو! وہ نفرت کے آنسو تھے! ہونہ، بھلا میں خود کو اس شخص کی ماں تصور کر سکتی تھی جس کے ہاتھوں میرے ابراہیم دنیا سے اٹھ گئے! کبھی نہیں!“

بابر اب بھی خاموش رہا۔ کرانی نے بلند آواز سے کہا:

”لیکن آپ کے بیٹے کے پاس تو شاہ بابر کی فوج سے دس گنا بڑا لشکر موجود تھا۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ آپ کے بیٹے کو اگر فتح حاصل ہو جاتی تو وہ اپنے دشمنوں میں سے ایک کو بھی زندہ نہ چھوڑتا۔ جنگ بہر حال جنگ ہی ہوتی ہے۔ آپ کے دل میں ذرا بھی انصاف ہو تا تو آپ کبھی بھی اتنی مکاری کے ساتھ زہر کا سارا نہ لیتیں۔ شاہ بابر تو ایمان داری سے برسرِ پیکار ہوئے تھے، میدان جنگ میں، تلوار کے مقابلے میں تلوار اٹھا کر۔“

”میں عورت ہوں، تلوار اٹھا کے نہیں لڑ سکتی۔ میری تلوار تو وہی زہر تھا۔ بیرونی حملہ آوروں نے پانی پت کے میدان میں ہمارے ہزاروں سپاہیوں کو ہلاک کر دیا، سارے ہندوستان کو اپنے قبر و غضب کا نشانہ بنا لیا۔ مجھ جیسی کتنی ہی مائیں آج سو گوار ہیں۔ جانے کتنی بی بیویاں آہ و بکا کرتی ہوئی اپنے شوہروں کے ساتھ سستی ہو چکی ہیں۔ میں نے جو زہر دیا وہ انہی بیرونی حملہ آوروں کے کئے کی سزا تھا۔ اس زہر میں بیواؤں اور یتیموں کے آنسو شامل تھے!“

یہ سب سن کر بیک چڑھ گئے۔ ایک لمبی دائرہ والے بیک نے بابر کے سامنے سر جھکا کر تجویز پیش کی:

”اعلا حضرت، بہت سن چکے ہم اس خطی بوہیا کی بکواس! جلا کو حکم دیجئے کہ اس کی زبان کھینچ لے!“

”ہاں ہاں، میری کنیز کی طرح مجھے بھی پھرے ہوئے ہاتھ کے سامنے پھکوا دو، روندو! ڈالو!“ بیدہ غصے سے چیخ اٹھی۔ ”میں ذرا بھی خائف نہیں، ذرا بھی!“

کیا اس ننتی ماں کو کسی شہید کی سی موت مرنے دیا جانا چاہئے؟ بابر سوچ میں پڑ گیا۔ افس، کتنی

بھیا تک بات ہوگی یہ! خود اس کے بچوں کی مائیں آخر اسے کس نظر سے دیکھیں گی؟ ماہم بیگم کیا کہیں گی؟ ابھی کچھ ہی دنوں قبل اس نے ترک میں ہرات سے متعلق باب مکمل کیا تھا، خدیجہ بیگم کی موت کے متعلق لکھ چکا تھا۔ خدیجہ اپنی مکاری اور دعا بازی میں بیدہ سے کم نہ تھی لیکن جب اس شیبانی خان کے اشارے پر اس خطبی پر شہوت پرست بیک منصور بخشی کے ہاتھوں شہید کی موت حاصل ہو گئی تھی تو وہ عوام کی یادوں کا تابندہ جزو بن گئی تھی۔ خدیجہ کی موت کی بناء پر بہت سے لوگ اب بھی شیبانی خان سے نفرت کئے جا رہے تھے۔ وہ خود بھی اپنے حقیقت نگاری کے عہد کے باوجود جبر و تشدد کا شکار ہو جانے والی خدیجہ بیگم کی موت کا قصہ لکھتے وقت اس نوعیت کے جذبات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

وہ سوچنے لگا کہ اسے کیا طرز عمل اپنانا چاہئے کہ اس کے خلاف لوگوں کے دلوں میں نفرت کے جذبات نہ گھر کر جائیں۔

بیک چیج چیج کر مطالبہ کر رہے تھے کہ بیدہ کو لٹائے موت دی جائے۔

”اس ہنگام کو پھرے ہوئے ہاتھی کے پیروں سے روندوا دیا جائے!“

”بورے میں بند کر کے بلند پتار سے نیچے پھینک دیا جائے!“

بابر نے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور بیگم نے اپنی چیخ و پکار بند کر دی۔

”گلتا ہے کہ ان محترمہ کے لئے“ بابر نے پرسکون لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ”صرف ایک ہی سزا ہو سکتی ہے، موت سے بھی میسب تر سزا... آپ لوگ سن چکے ہیں، ان کی باتوں سے تو ایسا ظاہر ہوتا ہے گویا کہ ان کا دل ساری ماؤں، بیواؤں اور یتیموں کے حال پر آہ و بکا کر رہا ہے نیز یہ کہ انہوں نے اپنے زہر کو بھی گویا کہ ان سبھوں کے آنسوؤں ہی سے تیار کیا تھا۔ یہ سب جھوٹ ہے۔ خود ان کا بیٹا ابراہیم پنجاب، بنگال، گوالیار اور دوسرے علاقوں کے حکمرانوں سے مسلسل جنگ کرتا رہتا تھا۔ اس خانہ جنگی میں ہر سال کتنے افراد لقمہ اجل بن جاتے تھے؟ ذرا بتائیے تو ملک واد صاحب۔“

”گزشتہ تین برسوں میں ہی ہمارے ساٹھ ہزار سے زائد لشکری کام آگئے تھے“ کرانی نے فوراً ہی جواب دیا۔

”لیجئے، سن لیا تا آپ لوگوں نے... ان محترمہ کے بیٹے نے اس تخت پر سے“ اور بابر نے تخت کے ہتھے پر ہاتھ مار دیا۔ ”دس برسوں تک حکمرانی کی! ہندوستان کی آبادی بہت ہے... جنگوں کے لئے، ایک دوسرے کو تباہ کرنے کے لئے یہاں آدمیوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ سلطان ابراہیم کے پاس مال، روزی مگوں کوئی نہیں تھی جس نے ہمارے کے سپاہی بھرتی کرتا رہتا تھا۔ وہ سونا

بہرہ کرتا رہتا تھا، اسے تغیرات پر صرف نہیں کرتا تھا، محض سپاہیوں کو ہی بھرتی کرتا رہتا تھا تاکہ وہ سینکڑوں ہزاروں کی تعداد میں اس کی خاطر اپنی جانیں قربان کرتے رہیں اور سپاہی اپنی جانیں گناتے رہیں جس کا سبب اکثر یہ ہوتا تھا کہ سلطان ابراہیم اچھا سپہ سالار نہ تھا۔ کسی سپہ سالار کی لیاقت و مہارت کا اندازہ محض اس کی فتوحات ہی سے نہیں بلکہ اس کے نقصانات سے بھی لگایا جاتا ہے۔ پانی پت کے میدان میں ہمارے دو ہزار لشکر کام آئے لیکن سلطان ابراہیم نے فن حرب میں اتنے زیادہ اناڑی پن کا ثبوت دیا کہ اس کے تیس ہزار سپاہی ہلاک ہو گئے۔ وہ بھی صرف ہماری ٹکڑوں اور توپوں ہی کی وجہ سے نہیں بلکہ خود اس کے ہاتھوں کی وجہ سے بھی۔ شاید سلطان ابراہیم بھی اپنے ہی ہاتھی کا شکار ہو گیا ہو، میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ ارے ابراہیم کی والدہ! باہر نے بلند کھنکٹی ہوئی آواز سے کہا۔ ”اگر ملکہ بیدہ اتنی ہی زیادہ انصاف پسند ہیں، اگر ہلاک ہو جانے والے سپاہیوں کی بیواؤں اور یتیموں کے لئے ان کے دل میں اتنا ہی زیادہ درد ہے تو آخر انہوں نے داہیات خانہ جنگیوں میں ہزاروں افراد کے ہلاک ہی کیوں ہونے دیا؟ اپنے بیٹے کو روک کیوں نہیں؟ اسے آخر بلا وجہ خون کیوں بہانے دیا؟“

”میں تو صرف ماں ہوں، بادشاہ کو حکم دینا میرے بس کی بات نہ تھی“ بیدہ نے الزام لگانے کے بجائے اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔

”اور ہم یہاں خانہ جنگیوں کا خاتمہ کرنے کے لئے آئے ہیں۔ ہم اس عظیم ملک کو متحد کر کے ایک عظیم الشان اور طاقتور سلطنت قائم کر رہے ہیں۔ ہم یہاں نئی تغیرات کرائیں گے، ملک کو خوشحال بنائیں گے۔ جس کام کا بیڑہ اٹھایا ہے اسے مکمل کر کے رہیں گے! عیاد و مکار ملکہ کے لئے سب سے بھیا تک سزا بھی ہوگی کہ ان کے لاکھ چاہنے کے باوجود، ان کے زہر اور غصے کے باوجود ہم ہمیں رہیں گے اور ان سب کاموں کو انجام دیں گے جنہیں انجام دینے کی اہلیت نہ خود ان میں تھی اور نہ ہی ان کے بیٹے ابراہیم میں!“

”آفریں!“ ملک داد کرانی اطمینان کی سانس لے کر کہہ اٹھا۔

لوگوں نے محسوس کر لیا کہ دلائل کے اس مقابلے میں بھی بابر کو فتح حاصل ہو گئی ہے۔

”اگر سازشی خاتون کے دل میں بیواؤں اور یتیموں کا اتنا ہی زیادہ درد ہے جتنا کہ یہ کہہ رہی ہیں تو ہم حکم دیتے ہیں۔۔۔ عبد الکریم بیگ!“

بائیں جانب کی قطار سے ایک فریہ اندام بیگ اٹھ کھڑا ہوا: ”خادم ہمہ تن گوش ہے!“

”ہم یہ کام آپ کے سپرد کر رہے ہیں۔۔۔ بیدہ خانم کو ان کی ساری دولت سے محروم کر دیا جائے۔“

اس دولت سے جتنا کے کنارے ایک خیرات خانہ تعمیر کیا جائے۔ ملکہ کے خدام اور کنیرس وہاں کام کریں اور ملکہ کے خزانے سے تھیموں اور بیواؤں میں اس وقت تک خیرات تقسیم کی جاتی رہے جب تک یہ خزانہ ختم نہ ہو جائے۔“

”اعلا حضرت کا حکم سر آنکھوں پر!“

”اور ان کی سن رسیدہ بیدہ خانم کی محترم بیگ، زندگی کے آخری ایام تک حفاظت کیجئے۔“

”کیا فرمایا عالی جاہ نے؟“ عبد الکریم ہکا بکا رہ گیا۔ ”مزائے موت نہ دی جائے گی کیا؟“

”مجھے جو کچھ کہتا تھا، کہہ چکا۔“

سزائے موت نہ ملے گی؟ متوقع، مطلوبہ، لیکن بہر حال میب موت کے سردلس کو نہ جھیلنا پڑے گا؟ بیدہ کے دل میں یہ خیال تیزی سے آیا اور اچانک اس نے زندگی کی گرم گرم سانسون کے لمس کو محسوس کیا، اس کی روح لرزا ٹھٹی، نرم پڑ گئی، ایسا لگا جیسے اس کے اندر کوئی نارٹوٹ گیا ہو۔ ملکہ بیدہ نے چہرے کو ہاتھوں سے ڈھک لیا اور رو پڑی۔

فتح پور سیکری

۱

مورخ خواند میر، شاعر شباب معما، ابراہیم قانونی جنہیں بابر نے مدعو کیا تھا، ہرات سے آگرے کے لئے روانہ ہوئے اور تقریباً تین مہینوں تک سفر کرتے رہے۔

ان لوگوں نے ورہ خیر کو پار کیا جس کی رفعتوں نے ان کے دلوں میں خوف اور ناامیدی کے جذبات بیدار کئے اور ان کے اس خیال کو تقویت پہنچائی کہ پروردگار کی تخلیق کردہ قدرت کی عظمتوں اور وسعتوں کے مقابلے میں انسان محض ایک ذرہ خاک کی حیثیت رکھتا ہے۔ انہوں نے دریائے سندھ اور گھنے جنگلات کو پار کیا اور خواند میر کو غالباً ”پہلی بار احساس ہوا کہ دنیا کتنی وسیع و عریض، کتنی بے کراں ہے۔ یہ علاقے جنہیں کوئی گھڑسوار ایک ہفتے میں تو کیا ایک مہینے میں بھی پار نہیں کر سکتا تھا، درحقیقت بے کراں تھے اور اب ایک ہی سلطنت کا جزو بن چکے تھے۔ مسافروں کو بمشکل ہی یقین ہو رہا تھا کہ وہ ایک ہی سلطنت کے اندر محو سفر ہیں جس میں بلخ سے کابل تک، کابل سے لاہور اور لاہور سے دہلی تک سارے علاقے میں بابر کے احکام و فرامین کے بے چون و چرا تعمیل کی جاتی تھی۔“

بابر کے مدعو کئے ہوئے ان افراد نے اس حقیقت کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ ان کے اور ماورالنہر اور خراسان سے دہلی کا سفر کرتے ہوئے صاحبان فنون کے ساتھ مختلف علاقوں کے صوبیداروں، سرحدی گشتی دستوں اور مال گزاری، ڈاک اور مہمان خانوں کے ذمے داروں نے بہت ہی مہذب برتاؤ کیا۔ ”لگتا تھا جیسے ہم لوگ سفیر ہوں“ شاعر شہاب معملانی نے بعد میں کہا تھا اور واقعی صورت حال کچھ ایسی ہی تھی۔ جب یہ لوگ کسی ایسے شہر یا گاؤں سے گزرنے لگتے جہاں لیئروں کی وجہ سے ذرا بھی خطرے کا امکان ہوتا تو خواند میر اور اس کے ہم سفروں کی حفاظت کے لئے دو سو سپاہیوں تک کے دستے بھیج دیئے جاتے تھے۔

کاروں سراؤں میں بھی ان ”شاہی مہمانوں“ کے لئے بہترین کمروں میں مفت قیام و طعام کا انتظام ہوتا تھا اور وہاں سے روانگی کے وقت راستے کے لئے کافی مقدار میں چاول، گوشت اور گھی وغیرہ ساتھ کر دیئے جاتے تھے۔ چھوٹے موٹے مصارف کے لئے انہیں کچھ نقد رقم بھی دے دی جاتی تھی۔ ان لوگوں کو کہیں گھوڑے بدلنے کی ضرورت ہوتی تھی تو راستے کے ٹکراؤں اور ڈاک کے ذمہ داران سب سے پہلے ان کے لئے گھوڑوں کا انتظام کر دیتے تھے۔

خواند میر کو راستے میں بابر کے پاس آتے ہوئے اصلی سفیر اور ہندوستان آتے ہوئے تاجروں کے قافلے اکثر نظر آتے تھے۔ آگرے کے مغرب میں واقع قصبے سیکری میں بابر کو ایک اور جنگ میں جو پانی پت کی جنگ سے بھی کہیں زیادہ اہمیت رکھتی تھی، رانا سنگرام سنگھ کے لشکر پر فتح حاصل ہو جانے کے بعد ان حکمرانوں کی تعداد تیزی سے بڑھتی جا رہی تھی جو بابر کے پاس اپنے سفیر بھیج رہے تھے۔ کوئی اسے مبارک باد بھیج رہا تھا، کوئی اس کی اطاعت قبول کر رہا تھا اور کوئی اس کے ساتھ مل جل کر پرامن طور پر رہنے کی تجویز پیش کر رہا تھا۔ لاہور میں خواند میر کی ملاقات ایران کے سفیر سے ہوئی جو تہمز سے شاہ اسماعیل کے بعد تخت نشین ہونے والے اس کے بیٹے شاہ ہمسپ کی طرف سے دیگر شاندار تحائف کے علاوہ بابر کے حرم کے لئے چوکس قوم کی دو حسینائیں بھی ساتھ لئے جا رہا تھا۔ یہ لڑکیاں سفید اونٹ کے محل میں جس پر سونے کے پتھر چڑھے تھے، سفر کر رہی تھیں۔

لاہور کے مشرق میں موہن خواند میر کی ملاقات ایک پڑاؤ پر سمرقند اور تاشقند کے سفیروں سے بھی ہوئی۔ اب بابر کی ہندوستان کی سلطنت کو اس کے کٹر دشمنوں یعنی شیبانی خاندان کے حکمرانوں نے بھی تسلیم کر لیا تھا۔ خود بابر بھی ماضی کے تلخ واقعات کو فراموش کر دینے کی خواہش ظاہر کر چکا تھا اور اس کے سفیر ہندوستان سے قیمتی تحائف کے ساتھ سمرقند اور تاشقند کا دورہ کر چکے تھے۔

سمرقند سے کوچ کنجی خان نے بابر کے لئے سات اونٹوں پر پر سانگی قسم کی بہترین کشش 'کان بادام' قسم کی انتہائی شیریں خشک خوبائیاں، بخارا کی تیز اور خوشبودار شرابیں اور ماورالنہر کی انواع و اقسام کی مشہور اور بے نظیر چیزیں بھیجی تھیں اور ان اشیاء کے ساتھ ہی ساتھ دو سو اسی گھوڑے بھی۔ بابر نے سمرقند کے سفیر سے "دہشت بہشت" باغ کے اندر جتنا کئے جانے والے محل میں پورے شاہی آداب و مراسم کے بموجب ملاقات کی تھی۔ "ہمیں بادشاہوں کی جیسی عزت بخشی گئی" خان کے سفیر نے جو اپنے وطن کو واپس جا رہا تھا، خواند میر سے اپنی ملاقات کے دوران فخریہ بیان کیا۔

"خواند میر صاحب" میں نے ہندوستان میں اتنا سونا دیکھا جتنا شاید کسی نے بھی، کہیں بھی، کبھی بھی نہ دیکھا ہو گا۔ شاہ بابر سونے کے تخت پر بیٹھے ہوئے تھے۔ تخت کے سامنے بہت لمبا چوڑا قالین بچھا ہوا تھا۔ صوبیدار بادشاہ کو سالانہ جو سونا دیتے ہیں وہ براہ راست لا کر اسی قالین پر ڈھیر کیا جا رہا تھا۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ دھیرے دھیرے قالین سونے سے پوری طرح ڈھک گیا، صرف ڈھکا ہی نہیں بلکہ اس کے اوپر سونے کا اونچا سا ڈھیر بھی لگ گیا۔"

خواند میر سمجھ گیا کہ بابر نے آل شیبانی کی سونے کی حرص و ہوس سے واقفیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ تماشا جان بوجھ کر دکھایا ہو گا۔ اس نے دل ہی دل میں ہنستے ہوئے دریافت کیا:

"اور عالی نسب سفیر کو بھی "سفیر کا حصہ" ملا؟"

"شاہ بابر نے جو پیش ہما خلعت پہنایا اس میں ہیرے موتی جڑے ہوئے تھے جس کا مطلب یہ تھا کہ لباس بھی آپ کا اور ہیرے موتی بھی آپ کے۔ پھر انہوں نے قالین پر سے ڈھیروں سونا اٹھا کر میرے حکمران کوچ کنجی خان کی لئے بطور تحفہ مجھے دیا۔ ان اشرافیوں کو شمار تک نہیں کی گیا۔"

"کوئی معاہدہ بھی ہوا؟"

"جی ہاں۔ اب ہم لوگ ایک دوسرے کے ہاں آزادی کے ساتھ آجائیں گے، تجارت کر سکیں گے۔ ہم لوگ ہندوستان سے ریشم، مسالے اور طرح طرح کی عجیب و غریب چیزیں خریدیں گے اور ان لوگوں کے ہاتھ خشک میوہ جات اور گھوڑے وغیرہ فروخت کریں گے۔ سفر تو یقیناً طویل ہے پھر بھی ہمیں امید ہے کہ اب کاروانوں کی تعداد میں اضافہ ہو جائے گا خاص طور سے اس لئے اور بھی کہ شاہ بابر نے اپنی ساری سلطنت میں تاجروں کو زیادہ محصولوں کی ادائیگی سے مستثنیٰ کر دیا ہے۔ ازبیک، تاجیک، ہندوستانی، ایرانی اور عرب تاجروں کی آمدنیوں میں بہت اضافہ ہو جائے گا۔ تاجر اور دستکار اس بادشاہ سے بہت خوش ہیں۔ ہم بھی بہت خوش ہیں۔ شاہ بابر کا ایک نیا قانون البتہ

ہیں پسند نہیں آیا۔“

”کون سا قانون؟“

”پتا چلا ہے کہ ساری سلطنت میں مے نوشی کو ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ کہتے ہیں کہ خود بابر نے بھی توبہ کر لی ہے، سرعام قسم کھائی ہے کہ اب کبھی نہ پئیں گے۔ سارے جام و ساغر تو ڈالے گئے۔ غزنی سے چودہ اونٹوں کا ایک خاص قافلہ شاہ بابر کے لئے عمدہ قسم کی شرابیں لے کر دو مہینے کے سفر کے بعد آگرے پہنچا تو انہوں نے شرابوں میں نمک ڈال دینے کا حکم دے دیا۔ آپ، خود ہی سو پئے، شراب کی فروخت اور اس کی درآمد پر پابندی لگا دی گئی ہے۔ اب میافوتوں میں شراب نہیں پی جاتی۔ کیا خاک لطف رہ گیا!“

یہ خبر جس نے کوچ کنجی خان کے سفیر کو اتنا مضطرب کر دیا تھا، خواند میر کو پہلے ہی سے معلوم تھی۔ وہ راستے میں بابر کے اس فرمان کو جو اس کی سلطنت کے تمام علاقوں کو بھیج گیا تھا، پڑھ چکا تھا۔ خواند میر کو یاد تھا کہ فرمان میں کہا گیا تھا کہ اسلام کے فروغ اور اس کی فتح سے متعلق جدوجہد کا آغاز خود اپنی عادات قبیحہ کے خلاف جدوجہد سے کیا جانا چاہئے۔ فرمان میں بڑے دلکش اور موثر انداز سے کہا گیا تھا: ”میں نے، میرے فاتح خدام نے اسلام کا بول بالا کرنے کے جوش میں آکر سونے چاندی کی تمام سراچیوں اور جاموں کو جو اپنے تعداد اور تابانی سے میری محفلوں کی شان اسی طرح بڑھاتے تھے جس طرح کواکب آسمان کی بڑھاتے ہیں، زمین پر پھینک دیا اور ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے غریبوں میں تقسیم کر دیا۔ انشاء اللہ جلد ہی ہم اسی طرح اپنے دشمنوں کے بھی ٹکڑے ٹکڑے کر دیں گے۔“

”بابر کی یہ خواہش پوری ہوئی تھی اور اس نے رانا سنگرام سنگھ کو شکست فاش دے دی تھی۔ جہاں تک شراب پر پابندی لگائے جانے کا تعلق تھا تو اس سے خواند میر کو کوئی افسوس نہ ہوا بلکہ خوشی ہی ہوئی۔ یہ مورخ جانتا تھا کہ شراب تو اب بھی پی جائے گی لیکن یہ فرمان شرابیوں کو قابو میں رکھنے میں بہر حال معاون ثابت ہو گا۔ خواند میر کو حسین بیٹرا اور اس کے بیٹوں کا افسوس ناک قصہ یاد تھا۔ نو سال قبل جب بابر دوسری بار ہرات گیا تھا تو خواند میر تیمور خاندان کے اس حکمران کی بلا نوشی دیکھ کر سہم گیا تھا اور اس کے دل میں خیال آیا تھا: ”کیا ایسی نادر صلاحیتوں والا شخص بھی اپنی صلاحیتوں کو غرق مے ناب کر دے گا؟“

یہی سبب تھا کہ سفیر کی بیان کی ہوئی اس بات کو سن کر ”شاہی مہمان“ کو اتنی زیادہ مسرت حاصل ہوئی تھی۔

خاند میر کی عمر پچاس سے تجاوز کر چکی تھی اور اس کی صحت بھی زیادہ اچھی نہیں رہتی تھی۔ وہ بابر کی دعوت منظور کرنے سے قبل اتنی طویل اور ہلکان کو دینے والے سفر پر روانگی کے معاملے میں بہت زیادہ شش و پنج میں مبتلا رہا تھا۔ اسے ہندوستان کی گرمی سے ڈر لگتا تھا اور اس بات سے سخت الجھن محسوس ہوتی تھی کہ بادشاہوں کی زندگیاں مسلسل متغیر اور طرح طرح کے رواج و زوال سے معمور رہتی ہیں... لیکن خاند میر ہرات میں گزشتہ چند برسوں سے کچھ اتنی تلخ اور ناخوشگوار زندگی گزار رہا تھا کہ اسے بابر کی یادستانے لگی تھی اور آخر کار اس نے روانگی کا فیصلہ کر ہی لیا تھا۔ اس نے اپنی ساری امیدیں بابر ہی سے وابستہ کر دی تھیں اور بابر کی نئی سلطنت میں سفر کے دوران جب بھی اسے بابر کے نیک کاموں اور منصوبوں کا کوئی ثبوت ملتا تھا تو اس کے دل پر نامعلوم مستقبل کے اندیشوں سے چھایا ہوا کھراچھٹ جاتا تھا...

خاند میر اگرے میں داخل ہوا تو اسے خوبصورت اور سنگ مرمر سے آراستہ نئی عمارات، نئے نئے باغات، باغات میں شاداب یلوں سے ڈھکی ہوئی سنہری بارہ دریاں اور رنگ برنگے پھولوں کے چمن نظر آنے لگے۔

اس نے یہ سب دیکھا اور بابر کو اس سے کہیں زیادہ عظیم تصور کرنے لگا جتنا کہ اس سے قبل کرتا رہا تھا۔

بابر اپنی علالت کے باعث بہت دیر ہو گیا تھا، جسم میں ذرا بھی طاقت نہیں باقی رہ گئی تھی۔ خاند میر کو بابر کی نفاہت کا اس وقت اور بھی واضح طور پر احساس ہو گیا جب وہ فتح پور سیکری کے قریب واقع چھوٹی سی پہاڑی پر سیر کرنے کے لئے گئے۔

یہ پہاڑی جسے لگتا تھا کہ کسی پراسرار قوت نے دھرتی کے سینے سے نکال کر وسیع اور شاداب میدان میں کھڑا کر دیا ہے، قدرت کا عجوبہ سا معلوم ہو رہی تھی۔ بابر کو یہ جگہ وادی فرغانہ میں اوش کے قریب واقع پہاڑی بوراتاغ کی یاد دلاتی رہتی تھی۔ دونوں میں فرق صرف اتنا تھا کہ بوراتاغ پہاڑی کے وامن میں بورا سائے نام کی ندی بہتی تھی اور یہاں پہاڑی کے قریب صاف و شفاف پانی کی ایک جھیل دور تک پھیلی ہوئی تھی۔

بابر نے خاند میر کو بڑے فخریہ انداز میں سنگ مرمر کی وہ چھوٹی چھوٹی خوبصورت بارہ دریاں دکھائیں جن کی تعمیر گھنے درختوں کے درمیان حال ہی میں مکمل ہوئی تھی۔ یہ شاہی فیانتوں اور ملاقاتوں کے لئے تعمیر کی گئی تھیں۔ پہاڑی سے نیچے جھیل تک پتھروں کی سیڑھیاں بھی بنادی گئی تھیں۔ بابر نے خاند میر کو بڑے جوش و خروش کے ساتھ اپنے تعمیراتی منصوبوں کی تفصیلات بتائیں

جن میں سے کچھ کو عملی جامہ پہنایا جا رہا تھا اور کچھ پر جلد ہی کام شروع ہونے والا تھا۔ خواند میر نے بادشاہ کے چہرے کو غور سے دیکھا: رخساروں کی ہڈیاں ابھرتی تھیں، آنکھوں کے ارد گرد اور پیشانی پر بھی شکنیں پڑ چکی تھیں۔ اسے حیرت ہوئی کہ با راتی جلدی بوڑھا ہو گیا۔ وہ دونوں جھیل کی طرف اترنے لگے تو باہر نے جیسے خواند میر کے دل کے خیالات کو بھنپ کر کہا:

”میں نے بھی عجیب قسمت پائی ہے، خواند میر صاحب۔ اپنے ماحول کی زندگی کو جتنا آیا وہ خوشنما بناتا جا رہا ہوں اتنی ہی زیادہ تیزی سے خود پر مردہ ہوتا جا رہا ہوں۔“

”اتنی تیزی سے تو نہیں... ویسے عالی جاہ، کیا واقعی اب آپ کو اپنا خیال نہ رکھنا چاہئے؟“

”ظاہر ہے کہ رکھنا چاہئے... پر کیا کروں، سلطنت جیسے جیسے وسعت اختیار کرتی جا رہی ہے ویسے ہی ویسے مشکلات میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا ہے، میں تو یہ کہوں گا کہ ان مشکلات پر قابو پانا زیادہ تکلیف دہ ہوتا جا رہا ہے۔ یہاں عظیم الشان سلطنت کے قیام کا خیال جب میرے دل میں آیا تھا تو میں پوری طرح سمجھ نہیں سکا تھا کہ ایسی ایسی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ روز و شب کی جانفشانی، طرح طرح کے اندیشے اور جدوجہد مسلسل جدوجہد... بالکل ایسا لگتا ہے جیسے آتش فشاں کو ہزاروں کے درمیان زندگی گزار رہا ہوں... کچھ کہہ نہیں سکتا کہ مجھ میں اپنے منصوبوں کی تکمیل کے لئے کافی قوت باقی رہ سکے گی یا نہیں۔“

”یقیناً باقی رہی گی، عالم پناہ۔ مجھے اس کا پورا یقین ہے۔ ابھی تو آپ بچپاس کے بھی نہیں ہوئے، عمر کے اعتبار سے طاقتور مرد ہیں۔“

”لیکن ہندوستان آنے کے بعد سے مجھے لگ رہا ہے کہ یہاں ہر سال اس زندگی کے جو پروردگار نے مجھے عطا کی ہے، پانچ یا دس سال کھودیتا ہوں۔ بخار، بے خوابی...“

خواند میر نے اس روز صبح کو باہر کے ہندوستان میں لکھے ہوئے اشعار کے دیوان کا مطالعہ کیا تھا۔ بادشاہ کی ان اداس باتوں کو سن کر اسے دیوان کی ایک رباعی یاد آگئی:

تپ کی یہ تیزی مجلس کر مجھے تڑپاتی ہے
رات کلنے کو ہے پر نیند نہیں آتی ہے
ہے غم و صبر کا جیسا ہی تپ اور نیند کا حال
ایک تو بڑھتا ہے اور دوسری گھٹ جاتی ہے

بابر کی آنکھیں شب بیداری کے باعث سرخ ہو رہی تھیں اور ہوا کے ہلکے سے جھونکے سے بھی

ان میں پانی آجاتا تھا۔

”کہیں یہ شراب سے احتراز کے لئے خود پر جبر کرنے کا نتیجہ تو نہیں ہے؟“ خواند میر نے سوچا
کیونکہ دیوان میں یہ اشعار بھی شامل تھے:

ترک کی سے نوشی، میں نے توبہ کرلی، کیا کروں
کیسے ہو جینا، میں مانوں بات کس کی، کیا کروں
کچھ پشیمان ہو کے کھاتے ہیں نہ پینے کی قسم
میں پشیمان ہوں کہ توبہ میں نے کی تھی، کیا کروں

”عالی جاہ“ میں نے سنا ہے کہ کچھ حکیموں کو بے خوابی کا علاج کرنا آتا ہے۔“

”ہرات کے حکیم یوسفی میرے معالج ہیں۔ انہوں نے سب تدبیریں کر دی کھیں پر خاک بھی افاقہ
نہ ہوا۔ وہ کہتے ہیں: ”آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔ امور سلطنت کی فکریں چھوڑ دیجئے، رات بھر
فکر سخن نہ کیا کیجئے...“ یہ سب ناممکن ہے!... بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ کسی ملک کا بادشاہ اس ملک کا
خیال ہی نہ کرے؟ میں سلطنت کی فکروں کو بس شعر کہتے وقت ہی فراموش کرتا ہوں یا پھر اس وقت
جب اپنی کتاب میں کچھ لکھنے بیٹھتا ہوں۔ لیکن اگرے میں تو مجھے لکھنے کے لئے وقت ہی میسر نہیں
ہوتا یہ صورت حال میرے لئے ناقابل برداشت ہے اس لئے سیکری کی سیر کے لئے نکل کھڑا ہوا۔
یہاں ذرا سکون مل جاتا ہے اور لکھتا بھی کچھ بہتر ہی ہوں۔ کئی مثنویاں لکھ ڈالیں۔ رات آنکھوں
میں کاٹنے اور لکھتے رہنے کا اب تو عادی ہو چکا ہوں۔“

”علیل ہونے کے باوجود مسلسل کام کر کے خود کو ہلکان کرتے رہتے ہیں“ خواند میر نے سوچا۔
”داغ کو آرام کا موقع نہیں ملتا اسی وجہ سے نیند نہیں آتی۔“ لیکن یہ کہہ کر حکیم یوسفی کی رائے کی
کھل کر تائید کرنا بابر کے سلسلے میں احترام کے جذبات کے مد نظر نامناسب ہوتا۔ یہ بات اس لئے
بھی نامناسب ہوتی کہ بابر کبھی کسی معاملے میں بھی خود پر رحم نہیں کرتا تھا، ہر کام میں اپنی
صلاحیتوں اور قوتوں کو ان کی آخری حد تک استعمال کرتا تھا اور اسی نوعیت کے پہچان سے اسے
اطمینان بھی حاصل ہوتا تھا۔ بابر کو اس اطمینان قلب سے محروم کرنا نامناسب اور بے رحمانہ
اقدام ہوتا۔

”خدا آپ کو طاقت اور حوصلہ عطا فرمائے“ خواند میر نے اپنی دلی آرزو کا اظہار کیا۔

بابر اپنے متعلق مزید گفتگو نہیں کرنا چاہتا تھا اس لئے اس نے موضوع بدل دیا:

”یہ بتائیے، خواند میر صاحب کہ آپ کو اپنی کتاب ”حبیب السیر“ لکھتے ہوئے کتنے سال ہو چکے

ہیں؟“

”گیارہ سال‘ عالی جاہ۔ میں نہیں سمجھتا کہ یہ مکمل ہو چکی ہے۔۔۔ دراصل میں ہرات میں کچھ لکھ ہی نہیں پارہا تھا۔ گزشتہ چند برسوں میں ہرات پر کیا کیا نہیں گزری۔ کبھی ایک دشمن نے قبضہ کیا، کبھی دوسرے نے اس سے چھین لیا، کبھی نذر آتش کیا گیا تو کبھی موسم سرما میں ٹھہرنے پر مجبور ہو گیا۔“

”یاد ہے جب ہم انیسہ مینار کی اوپری منزل پر کھڑے باتیں کر رہے تھے تو آپ نے گھبرا کر پوچھا: ”ہرات کی قسمت کا ستارہ ڈوب رہا ہے کیا؟“ آپ کا اندیشہ درست ثابت ہوا۔“

”ہرات کو برے دن دیکھنے پڑے اور سمرقند نے بھی ہمارے لئے اپنی آغوش وا کرنے سے انکار کر دیا۔ ماورالنہر اور ایران کے باہمی تعلقات میں عداوت کی دیواریں حائل ہو گئیں۔ یہ تعلقات ہماری کئی گزشتہ نسلوں کے لئے کتنی مفید ثابت ہوئے تھے، انہی تعلقات کی بدولت کتنی ہی صاحبانِ صلاحیت اوج کمال پر پہنچے تھے! انڈ سلطانوں نے ماورالنہر کو کز اور تنگ نظر شیوخ کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہے۔ سمرقند کے ایک عالم نے تقریباً اٹھ بار ہو کر بتایا تھا کہ الیغ بیک کی رصد گاہ کھنڈر میں تبدیل ہو چکی ہے اور شر کے حکمران کو ان سب باتوں سے کوئی دلچسپی ہی نہیں۔ لوگ رصد گاہ کی دیواروں کو گرا کر ان کی اینٹوں کو اپنے گھروں اور باڑوں کی مرمت میں استعمال کر رہے ہیں۔“

”ہم یہاں ایک اجنبی ملک میں محلات و مدارس تعمیر کر رہے ہیں جب کہ وہاں کے لوگ اپنی عمارتوں کو مسمار کر رہے ہیں۔ کیسا کھیل ہے تقدیر کا، سچ ہے نا؟ میں اپنے پرانے وطن کو چھوڑ کر چلا آیا اور اب اپنی تمام قوتیں اپنے نئے وطن ہندوستان کے لئے وقف کر رکھی ہیں تاہم ایسے لحاظ بھی آتے ہیں جب محسوس ہوتا ہے کہ نالائق فرزند ہوں، بد قسمت آدمی ہوں۔“

”سب کچھ اللہ کی مرضی سے ہوتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے انسان قسمت کے لکھے کو مٹا نہیں سکتا۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے لیکن میں تو آپ کے نقش قدم پر چلتا ہوا ہندوستان آیا ہوں۔ اپنی مرضی سے۔ میں تاریخ کے واقعات کو بدلنے اور ان واقعات کی الجھی ہوئی گتھی کو سلجھانے کی طاقت نہیں رکھتا اس لئے اس گتھی کو اپنے خیالوں میں سلجھانا چاہتا ہوں، اپنی دلچسپی اور پیشے کے موضوع یعنی تاریخ کے اہم ترین دھاگے کو تلاش کرنا اور سمجھنا چاہتا ہوں۔“

بابر کو خواند میر کی یہ بات اچھی لگی۔ وہ اپنے گھوڑے کو خواند میر کے گھوڑے کے قریب لے آیا اور دونوں کے گھوڑے پہلو پہ پہلو چلنے لگے۔

”بجا فرمایا آپ نے۔ واقعات کی گتھی میں ہماری خواہشات اور تمنائیں بھی الجھی ہوتی ہیں۔“

ان کے علاوہ اس مسمیٰ میں اور بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔ تاریخ بے پایاں ہوتی ہے، ہمیشہ بدلتی رہتی ہے۔ اسے گردشِ فلک کہتے ہیں اور اس گردشِ فلک کی قوت محرکہ ہی وہ اہم ترین دھاکہ ہے۔ ٹھیک ہے نا؟

خواند میر بابر کے دلائل کو بیچ میں بولے بغیر غور سے سنتا رہا۔ بابر نے اپنی بات جاری رکھی:

”لیکن ہماری جگہ کہاں ہے؟ یا یہ کہ کسی ستارے کی جگہ کہاں ہے؟ نہیں، میں اس مسئلے کو دوسری طرح سمجھتا ہوں... ہم کسی پہاڑ پر کھڑے ہیں۔ اگر پہاڑ کا وہ حصہ جس پر کھڑے ہیں، نیچے کی طرف پھسلنے لگے تو ہم ٹھہرے رہنے کی کتنی ہی کوشش کیوں نہ کریں، ہر صورت اسی پہاڑ کے ساتھ پستیوں کی جانب لڑھکتے چلے جائیں گے۔ ماوراء النہر میں اسی طرح کا نیچے کھسکتا ہوا ایک پہاڑ اپنے ساتھ ہی ساتھ مجھے بھی نیچے لے آیا تھا۔ لیکن اگر تاریخ کا پہاڑ... جی نہیں، اگر ہمارے پیروں تلے کا پہاڑ بلند ہونے لگے، اس کی طاقت اندر سے بڑھنے لگے تو ہم اس رفتار سے کیوں زیادہ تیز رفتار کے ساتھ بلندیوں پر پہنچ جائیں گے جس سے خود چڑھنے پر پہنچ پاتے۔ ہمیں عقل، دور اندیشی اور ہمت سے کام لینا چاہئے، ایسے ہی کسی بلند ہوتے ہوئے پہاڑ کو تلاش کر کے اس کے اوپر کھڑے ہو جانا چاہئے۔ خواند میر صاحب دراصل اس وقت ہندوستان مجھے ایسا ہی پہاڑ معلوم ہو رہا ہے... یہ سب ہے کہ میں یہاں وہ سب کچھ حاصل کر لینے کی امید رکھتا ہوں جو سمرقند اور ہرات میں نہیں حاصل کر سکا تھا۔“

”جی ہاں، عالی جاہ۔ تاریخ کا پسپا اپنی رفتار بدلتا رہتا ہے۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا جب ماوراء النہر اور خراسان میں علوم و فنون پورے عروج پر تھے، ان کی مثال بلند ہوتے ہوئے کوہساروں کی سی تھی۔ خوارزم میں البیرونی، بخارا میں ابو علی ابن سینا، طوس میں فردوسی، بلال سفون میں محمود کا شعری اور یوسف خاص حاجب۔ کیسی کیسی عظیم ہستیاں موجود تھیں! ہم اور آپ تسلیم کرتے ہیں کہ ان سب کے کارناموں میں ہی تاریخ کے معانی و مفاہیم مضمر ہیں۔ اس کے بعد چنگیز خان کے لشکر نے تاریخ کے پہلے کی حرکت کو ”پہاڑ“ کے بلند تر ہونے کے عمل کو سال ہا سال کے لئے روک دیا۔ سمرقند میں الف بیک کی اور ہرات میں جامی اور نوائی کی سرگرمیوں سے ایک نئے دور کا آغاز ہوا اور استعداد و صلاحیت رکھنے والے نئے لوگ منظر عام پر آئے۔ گردشِ فلک کی بات آپ نے بالکل بجا فرمائی ہے، عالی جاہ۔“ خواند میر کو اچانک ہوش آگیا کہ وہ کس سے مخاطب ہے۔ ”فلک بدخواہ نے سوچا کہ عظیم لوگوں کی تعداد بہت بڑھ چکی ہے اور اس نے ہماری مخالفت کے لئے شیانی کے خانہ بدوشوں کو بھیج دیا۔ علوم، فنون، تعمیرات۔ سب کے سب زوال کا شکار ہو گئے... آخر کار صاحبان

علوم و فنون نے آپ کے پیچھے پیچھے ہندوستان کا رخ کیا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ نئے دور کا آغاز یہیں ہوگا۔۔۔ اجنبی ملک میں زندگی گزارنا یقیناً تکلیف دہ ہوتا ہے لیکن یہ دیکھ کر کہ افکار و مسائل سے بھری ہوئی بے کراں دنیا میں ایک ملک ہندوستان بھی ہے جہاں دانش و حکمت کی، علم و فن کی عزت کی جاتی ہے، کتنی خوشی ہوتی ہے، کتنی توانائی مل جاتی ہے جسم کو! ”پھر خواند میر نے اچانک مسکراتے ہوئے کہا: ”اب مجھے امید ہے کہ آپ کی عنایات اور سرپرستی کی بدولت اپنی کتاب ”حبیب الیر“ مکمل کر لوں گا۔“

”مجھے یہ جان کر بہت خوشی ہوئی اور میں ہر طرح سے آپ کی مدد کرنے کو تیار ہوں۔“

”آپ کا یہ ناچیز خادم ہرات میں کئی برسوں تک میر علی شیر نوائی کے کتب خانے میں کام کر چکا ہے، حسین بیٹرا کے کتب خانے میں نادر قلمی نسخوں کے مطالعے پر بھی بہت وقت صرف کیا کرتا تھا۔ لیکن وہ کتب خانے تو اب یہاں سے بہت دور ہیں، بہت دور۔۔۔“

خواند میر جانتا تھا کہ باہر نے ایک بہت بڑا کتب خانہ قائم کر رکھا ہے جہاں پچاس افراد کام کرتے ہیں اور ایسے نادر قلمی نسخوں کا ذخیرہ موجود ہے جیسے ہرات میں بھی نہیں پائے جاتے۔ اور قلمی نسخوں کے بغیر کسی ماخذ کے بغیر مورخ کیسے کام چلا سکتا تھا ”شاہی کتب خانے تک ہر ایک کی رسائی کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔ خواند میر موقع شناسی کے ساتھ خاموش رہا لیکن باہر خود ہی بول پڑا:

”آپ ہماری وجہ سے اتنا طویل سفر کر کے یہاں آئے ہیں تو کیا ہم آپ کو کام کرنے کی تمام آسانیاں بھی نہ فراہم کریں گے؟ میں اپنے کتب خانے کے مہتمم عبداللہ کو ہدایت کر چکا ہوں کہ وہ آپ کی مدد کریں۔ کتب خانے میں بہت سی ہندوستانی کتابیں موجود ہیں۔ عبداللہ کی ماتحتی میں منسکرت جاننے والے علما مترجم کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کو اپنے کام میں شامل کر لیجئے۔۔۔“

”خادم اس احسان عظیم کا شکریہ الفاظ میں ادا کرنے سے قاصر ہے، عالی جاہ۔ لیکن اعلا حضرت میری گستاخی معاف فرمائیں تو ایک اور درخواست بھی ہے۔“

”ضرور“ فرمائیے نا خواند میر صاحب ”اور کیا چاہئے؟“

”شاید آپ کو یاد ہو کہ ہرات میں آپ نے اپنی سوانح عمری کا ایک حصہ پڑھ کر سنایا تھا۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ اسے عرصے سے قلم بند کرتے رہے ہیں۔ اس حصے کو سننے کے بعد مجھے اس کتاب سے گہری دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ اگر اس کا کوئی حصہ مکمل ہو چکا ہو اور مجھے مطالعے کا موقع نصیب ہو سکے تو یہ میرے لئے معلومات اور عقل و دانش کا سرچشمہ ثابت ہوگا۔“

بابر نے کچھ دیر تک جواب نہ دیا، گھوڑے کے سر کی طرف جس نے کنوٹیاں کھڑی کر لی تھیں، خاموشی سے دیکھتا رہا۔ خواند میر کی یہ خواہش پوری کرنے کو اس کا جی نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ گزشتہ دو برسوں سے تزک یعنی بابرنامے کو مکمل ہی نہیں بلکہ از سرنو لکھ بھی رہا تھا۔ اس کے دو اسباب تھے۔ پہلی وجہ تو یہ تھی کہ ایک بار اس کے کچھ حصے ہندوستان میں اچانک شروع ہونے والے موسلا دھار بارش سے متاثر ہو گئے تھے۔ تیز ہواؤں سے خیمہ الٹ گیا تھا، کچھ اوراق ہمیشہ کے لئے ضائع ہو گئے تھے، کچھ کے حروف مٹ گئے تھے اور بہت سے اوراق گنڈ ہو گئے تھے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ کتاب کی حیثیت کو زیادہ موثر اور مواد کو زیادہ مبنی بر حقیقت بنانا چاہتا تھا۔

”میں اس بارے میں سوچوں گا، خواند میر صاحب“ بابرنے روکھے پن سے کہا۔

پہاڑی کی گود میں پھیلے ہوئے باغ کے اندر ٹھنڈے پانی کا ایک چشمہ بھی تھا۔ بابر کا اس کے پانی سے پیاس بجھانے کو جی چاہا۔ ویسے اس کے قریب بیٹھ کر سستا بھی بہت خوشگوار ثابت ہوتا تھا۔ زمین کے سینے سے ہلکی ہلکی آوازوں کے ساتھ پھونتی ہوئی پانی کی دھار میں ریت کے صاف ذرات بھی ملے ہوئے تھے جو پانی پر پڑتی ہوئی دھوپ میں بمشکل ہی نظر آرہے تھے۔

”چاروں طرف کیسی خاموشی چھائی ہوئی ہے، ماحول کتنا پرسکون ہے!“ خواند میر نے کہا۔
 ”نصرت بھی نہیں کیا جاسکتا کہ دو سال قبل ہی یہاں اتنا خونیں معرکہ ہوا تھا۔“

”جی ہاں، رانا سنگرام سنگھ سے ہونے والی جنگ شاید میری سب سے بھیانک سب سے زیادہ خون خرابے والی جنگ تھی... ہاں، یاد آگیا، جنگ سے قبل تک کے تمام واقعات اور جنگ کی تفصیلات میں ”بابرنامے“ میں لکھ چکا ہوں۔ شام کو میں اس کے کچھ نقل شدہ اوراق آپ کو دے دوں گا۔ مطالعے کے بعد اپنی رائے مجھے بتا دیجئے گا... دراصل میں نے آپ کو یہاں مدعو ہی اس لئے کیا تھا، خواند میر صاحب کہ آپ جیسا زبان داں دانش مند مشیر کی حیثیت سے میرے قریب رہے۔“

”جہاں پناہ نے اس ناچیز کو جتنی عزت بخشی اتنی زندگی میں کبھی بھی نہیں نصیب ہوئی تھی۔“

”ہم دونوں ہی عظیم میر علی شیر کے ادنیٰ شاگرد ہیں...“

۲

خواند میر کو سیکری پہاڑی کے شمالی حصے میں گھنے باغ کے اندر بنا ہوا ایک مکان دے دیا گیا جس میں تین کمرے تھے اور نقش و نگار سے آراستہ ایک برآمدہ۔ برآمدے سے صاف و شفاف پانی کی جھیل کا نظارہ بہت خوبصورت معلوم ہوتا تھا۔

خواند میر نے بابر کی قلمی کتاب کا مطالعہ شام کو کھانے کے بعد شروع کیا۔ اسے فوراً ہی یاد آگیا کہ بابر نے اس کے کچھ حصے ہرات میں سنائے تھے تو اس پر کیا رد عمل ہوا تھا۔ اسے بابر کے سیدھے سادے اسلوب نگارش پر حیرت ہوئی تھی اور کچھ برا بھی لگا تھا۔

قلمی نسخے میں انداز تحریر کی اس سادگی کا اور بھی زیادہ احساس ہو رہا تھا:

”ہندوستان میں طرح طرح کے پھول پائے جاتے ہیں“ بابر نے لکھا تھا۔ ”ایک ہوتا ہے گڑھل۔ اس کا تنا گلاب کے بیڑے اونچا ہوتا ہے۔ اس کا پھول، انار کے پھول سے زیادہ شوخ رنگ کا اور سرخ گلاب کے برابر ہوتا ہے۔ لیکن گلاب کی کھلی سے صرف ایک ہی پھول نکلتا ہے جب کہ گڑھل کی کھلی کے کھلنے پر اس کے بیج سے دل کی شکل کی ایک چیز نکلتی ہے اور اس کی پتیاں بھی کھل کر پھول بن جاتی ہیں۔ اس طرح یہ اپنی نوعیت کا جڑواں پھول بن جاتا ہے۔ گڑھل کا پھول بے حد خوبصورت ہوتا ہے۔ لیکن یہ دن بھر میں ہی مرمجھا جاتا ہے۔“

”میں نے اپنے لشکریوں کے اطمینان اور لشکر گاہ کی حفاظت کے خیال سے حکم دیا کہ جن جگہوں پر ارابے نہیں کھڑے کئے جاسکتے وہاں خاص قسم کی اونچی چوٹی یا تیاں ایک دوسرے سے سات آٹھ کڑی کے فاصلے پر رکھ کر انہیں کچے چڑے سے ایک دوسرے سے باندھ دیا جائے۔۔۔ جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں، میرے لشکریوں پر حالیہ واقعات اور بے بنیاد افواہوں کے باعث گھبراہٹ اور خوف طاری تھے۔ دوسری طرف بدخواہ منجم محمد شریف اس جنگ کے سلسلے میں مجھ کو تو کوئی سلیقے کی بات نہیں بتاتا تھا لیکن لشکریوں کو یہ کہہ کہہ کر خوف زدہ کرتا پھر رہا تھا کہ جنگ کا ستارہ مغرب میں ہے اور مغرب کی سمت سے جنگ شروع کرنے والا ہار جائے گا۔ اور ہمارا لشکر مغرب ہی میں تھا۔ آخر اس بد معاش باتونی سے یہ سب دریافت کس نے کیا تھا؟ اس کی سخت نے میرے سپاہیوں کے حوصلے اور بھی زیادہ پست کر دیئے لیکن میں نے اس کی ایک بھی نہ سنی اور جنگ کے تمام ضروری تیاریاں جاری رکھیں۔۔۔“

اسی طرح بابر نے جو کچھ دیکھا تھا اور جو اس پر گزری تھی اس کی سیدھی سادی زبان میں تصویر کھینچ دی تھی۔ بعض عبارتیں یقیناً دلکش تھیں لیکن یہ تشبیہات اور استعارات سے آراستہ ویسی ”مرصع“ زبان نہ تھی جس کا خواند میر بچپن ہی سے عادی تھا۔ اسے مطالعے کے دوران احساس ہوا کہ بابر اپنا ایک مخصوص انداز نگارش رکھتا ہے۔

لیکن کیا یہ سب مناسب بھی تھا؟ کسی بادشاہ کی سرگزشت کے لئے یہ طرز تحریر موزوں بھی تھا؟ خواند میر کی پرورش و تعلیم اس کے والد کے ہاتھوں ہوئی تھی جو خود بھی مشہور مورخ تھا۔ وہ

اپنے بیٹے سے کہا کرتا تھا کہ تاریخی کتابیں انتہائی معزز و ممتاز افراد کے لئے لکھی جاتی ہیں جو اپنی زندگیوں میں بہت سے تلخ اور تکلیف دہ حقائق سے واقف ہو جانے کی بناء پر کتابوں میں خوشگوار اور مسرور کن حقائق ہی کے متلاشی رہتے ہیں۔ وہ کہتا تھا کہ حکمرانوں کے دلوں کو خوش کرنے کے لئے واقعات کو شاعرانہ تشبیہات اور شاندار القاب پر مشتمل مرصع نثر میں بیان کیا جانا چاہئے۔

خواند میر کو مطالعے کے دوران بابر کا اسلوب و لکھن بھی معلوم ہو رہا تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ اسے حیران و ششدر بھی کئے دے رہا تھا۔

مثال کے طور پر وہی حصہ جہاں بابر نے ہمایوں کے خط کے جواب میں لکھا ہوا اپنا خط پیش کیا تھا جس میں بیٹے کو تلقین کی گئی تھی: ”انداز تحریر میں سادگی کو ملحوظ رکھا کیجئے۔ آپ بے حد نفاست کے ساتھ لکھنے کی کوشش کرتے ہیں جس کی وجہ سے بعض جگہیں عجب بے فنی اور ناقابل فہم سی معلوم ہوتی ہیں۔ واضح اور عام فہم زبان استعمال کیا کیجئے“ عبارت کو جان بوجھ کر خوبصورت بنانے کی کوشش نہ کیا کیجئے۔ اس طرح آپ کو بھی آسانی ہوگی اور پڑھنے والے کو بھی۔“

اس کا مطلب تو یہ تھا کہ خوش بیانی سے جس کا کبھی وہ خود بہت ہی پر جوش حامی رہ چکا تھا، بابر سوچ سمجھ کر، جان بوجھ کر احتراز کر رہا تھا۔ مورخ کو بابر کا یہ فیصلہ پہلے کی طرح اس وقت بھی اچھا نہ لگا۔

اس نے کتاب رکھ دی، کمرے سے نکل کر برآمدے میں آگیا، باغ کے رات کے وقت کے پرسکون ماحول پر نظر دوڑائی اور پھر جھیل کو جس کی سطح پر چاندنی کی مانند پھیلی ہوئی تھی، تکتے لگا۔ اس کے تصور میں بابر مسلسل منڈلائے جا رہا تھا۔

خواند میر تقریباً گیارہ برسوں سے اپنی زندگی کی اہم ترین تصنیف ”حبیب السیر“ کو مکمل کرنے میں مصروف تھا۔ وہ مروجہ اسلوب میں اپنے ”ناچیز میں“ کو پوری طرح کھو کر، اسی انداز سے لکھ رہا تھا جسے اپنانا اپنا فرض تصور کرتا تھا وہ اس طرز نگارش کی پابندی کرنے، اس کے بموجب خود کو ڈھال لینے کا عادی ہو چکا تھا۔ ادبی تحریروں میں ”میں“ پر زور دینا معیوب خیال کیا جاتا تھا لیکن بابر تو بار بار اپنا تذکرہ لکھنے سے ذرا بھی نہیں شرماتے، خواند میر نے سوچا۔ یہی نہیں، وہ تو اپنی ناکامیوں کے بارے میں بھی، خدا انہیں معاف کرے، انسان کی ذلیل حرکتوں کے بارے میں بھی لکھتے ہیں ان کی کتاب کے اس قسم کے جملے اور فقرے تو سمجھ میں آنے والے ہیں: ”مجاہدین اسلام، باغ شجاعت کے اشجار، دیودار کی مانند صف آرا ہو گئے“، ”ان کی صفیں شرع محمدی کی طرح مستقیم و مستحکم تھیں“، ”پیدل سپاہیوں کے نام جو دشت شجاعت کے شیر ہیں، میدان جنگ کے دیروں میں

سب سے زیادہ دلیر ہیں۔“ لیکن یہ تو بابر کے الفاظ نہیں ہیں، یہ تو جنگ کے بعد شیخ زین کے لکھے ہوئے فتح نامہ کے اجزا ہیں جسے بابر نے اپنی کتاب میں محض اس لئے شامل کر لیا تھا کہ خود انہیں لشکریوں کی تعداد اور دونوں افواج کی حالت کی تفصیلات نہ لکھنی پڑیں... اور بابر کو زہر دینے کی جو کوشش کی گئی تھی اس کے سلسلے میں بابر تسلیم کرتے ہیں، اپنی آپ بیتی میں لکھ بھی دیتے ہیں کہ انہیں ”زور دار تے پاخانے میں ہوئی“۔۔۔

”کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے، پروردگار“ مورخ نے سوچا۔

”یہ طرز تحریر بھونڈا ہے پر بڑی کشش رکھتا ہے... عالم و فاضل بادشاہ ظہیر الدین بابر نے جس بے باکی کے ساتھ حقیقت نگاری کی ہے وہ یقیناً بڑی دلکش ہے۔ رہا میں تو میرا اسلوب ویسا ہی ہے جیسا کہ اوروں کا، میری تحریروں میں تکرار بھی پائی جاتی ہے اور یکسانیت بھی۔ بابر کا ایک مخصوص طرز نگارش ہے، مخصوص اور بے مثال۔ وہ خود بھی یکتا و یگانہ ہیں!“

خواند میر کمرے میں لوٹ آیا۔ اس نے قلمی نسخے کا دوبارہ مطالعہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ تاریخ کی ایسی ایک بھی کتاب اس کی نظروں سے نہیں گزری جس میں واقعات کو اور ”واقعات کی گتھی“ کو بھی اتنی درستی اور حقیقت پسندی کے ساتھ بیان کیا گیا ہو۔ بابر نے جس بے باکی کے ساتھ اپنا تجربہ کیا تھا، جس طرح اپنے مصائب اور غلطیوں کے متعلق صاف صاف لکھا تھا وہ سب اب خواند میر کو خاص طور سے بہت دلچسپ معلوم ہوا اور اس نے اپنے اعتماد اور خلوص کی کشش سے مورخ کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔

خواند میر نے ایک بار پھر ان سطروں کو تلاش کیا جنہوں نے اسے متحیر کر دیا تھا: ”میں نے اس سے قبل کبھی بھی زندگی کی شیرینی کو اتنی شدت کے ساتھ نہیں محسوس کیا تھا!“ بابر نے اسی جگہ پر اس خیال کا اظہار ایک شعر میں بھی کیا تھا:

جو دلیز تک موت کی جاچکا ہے
وہی قیمت زندگی جانتا ہے

بابر نامے کا مطالعہ کرتے وقت خواند میر کو ایک عام فانی انسان نظر آنے لگا جو اس کے لئے دھیرے دھیرے زیادہ واضح، اس کے دل سے زیادہ قریب ہوتا جا رہا تھا۔

لیکن بہت سے تاجدار اس بات کو کتنا ناپسند کرتے تھے کہ وہ عام لوگوں جیسے نظر آئیں! شروع میں خواند میر نے بابر کے عجیب و غریب اسلوب کا بھی یہی مطلب نکالنا چاہا۔ اس نے سوچا کہ آخر بابر کو مرصع زبان لکھنے پر اپنا وقت ضائع کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ وہ تو بادشاہ ہیں اسی لئے سادگی

کو اپنانے کی، مروجہ ادبی اقدار کو ٹھکرا دینے کی جرات کر سکتے ہیں۔
خواند میر نے اپنے اس خیال کی بنا پر بابر کی تکلیف دہ حد تک غیر معمولی انداز بیان سے ایک
طرح کی مصالحت سی کر لی۔ اس کے بعد اس نے اسلوب کے بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دیا کیونکہ وہ
ان واقعات سے مسحور ہونے لگا جنہیں بابر نے حیرت انگیز تفصیل اور بے نظیر صاف گوئی کے ساتھ
بیان کیا تھا۔

وہ بابر کی تصنیف کا تمام رات اور اگلے روز صبح سے شام تک مطالعہ کرتا رہا۔
بابر کو کسی وجہ سے بہ عجلت آگرہ لوٹ جانا پڑا۔ دو دنوں کے بعد وہ صبح کے وقت ہی سیکری آن
پہنچا کیونکہ دن کی گرمی کے باعث رات کے وقت گھڑ سواری کو بہتر تصور کرتا تھا۔
وہ اس وقت اس سے بھی زیادہ وادماندہ سا نظر آ رہا تھا جتنا خواند میر کو تین روز قبل لگا تھا۔ تاہم
اس نے خود کو ہشاش بشاش دکھانے کی کوشش کرتے ہوئے چشمے کے ہلکے ہلکے شور میں خواند میر
سے دریافت کیا:

”میری عدم موجودگی میں یہاں آپ کا جی تو نہیں او بے لگا تھا؟“

”نہیں، جہاں پناہ۔ میں تو اس دوران برابر آپ ہی سے گفتگو کرتا رہا۔“

”ابھی تک پوری کتاب نہیں پڑھ سکے؟“

”پہلی ہی رات کو ایک ہی نشست میں پڑھ لی تھی۔ بعد میں کئی بار پڑھ چکا ہوں۔ میں تو اس کے

سوا کسی اور چیز کے بارے میں سوچ ہی نہیں پارہا ہوں۔“

”مکلف برتنے کی کوئی ضرورت نہیں، خواند میر صاحب۔ حقیقت کا اظہار کیجئے۔“

”حقیقت کا؟ حقیقت تو یہ ہے کہ آپ نے مجھے قتل کر دیا۔“

خواند میر نے یہ بات سنجیدگی سے کہی اور اس کی آنکھوں سے ادا سی جھلکنے لگی۔

”وہ کیسے؟... میں اور آپ کو قتل کر ڈالوں؟“

”قتل کیا اپنی سادگی سے! آپ نے اپنے انداز تحریر کی سادگی اور وضاحت کے ذریعے ثابت

کر دیا کہ ہمارا عام طرز نگارش، مغلق اور شہسخت و استعارات سے آراستہ طرز نگارش کتنا لغو

ہے!“

بابر نے اطمینان کی سانس لی اور مسکراتے لگا:

”اچھا، تو یہ تھا آپ کا مطلب!... لیکن میری مجبوریوں کو بھی ملحوظ رکھئے نا۔ مرصع عبارت لکھنے

کا میرے پاس وقت ہی نہیں تھا۔ ویسے یہ فن مجھے آتا بھی نہیں۔“

”اچھا ہی ہوا کہ فضول باتوں کے لئے آپ کو وقت نہ مل سکا۔“ خواند میر نے باہر کے مذاق کو اہمیت نہ دی یا پھر سمجھ ہی نہ سکا۔ ”خادم کی دلی مبارک باد قبول فرمائیے“ اعلا حضرت۔ ترکی میں اتنی شاندار کتاب پہلے کبھی بھی نہیں لکھی گئی تھی!“

”لیکن ابھی تو اسے مکمل کرنا ہے۔ کچھ ابواب کھو بھی گئے ہیں۔“

”مجھے پورا یقین ہے کہ انہیں آپ دوبارہ لکھ لیں گے۔۔۔ نئے ابواب کا بھی اضافہ کریں گے۔۔۔ میں اسی شاندار تصنیف کے بارے میں سوچتا رہا ہوں، ایسی کتاب تو اب تک نہ فارسی میں لکھی گئی تھی اور نہ ہی ترکی میں۔ میں نے اس بارے میں بہت غور و خوض کیا ہے، عالی جاہ۔ جس طرح میر علی شیر کا نمبر ترکی شاعری کا اہم ترین شاہکار ہے اسی طرح مجھ جیسے مورخ کے نزدیک بابر نامہ ترکی نثر کا اہم ترین شاہکار ہے۔ میرے دل میں ان دونوں شاہکاروں نے پہلو پہلو جگہ بنالی ہے۔“

”آپ میری محنت کی اہمیت کو بہت بڑھا چڑھا کر بیان کر رہے ہیں پھر بھی خواند میر صاحب، میں آپ کی فیاضی کے لئے شکر گزار ہوں“ بابر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”لیکن مجھے اس کتاب کو، اس بابر نامے کو ابھی تک مکمل کرنا ہے۔ بڑی عنایت ہوگی اگر اس کی خامیوں کو بھی صاف صاف بیان کر دیں۔“

خواند میر سوچ میں پڑ گیا۔ پھر اس نے ان بڑی اور چھوٹی باتوں میں سے کسی کو بھی نہ چھپانے کا فیصلہ کیا جن سے وہ متفق نہ تھا۔

”میں صرف چند صفحات کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں، اعلا حضرت۔۔۔ آپ نے ہرات کے متعلق، حسین بیتر اور ان کے امراء و روسا کے متعلق بہت تفصیل سے لکھا ہے۔ اس حصے میں تارخوں اور ناموں کی بعض غلطیاں رہ گئی ہیں۔“

”اس معاملے میں مجھے آپ کی مدد درکار ہوگی۔“

”ناچیز نے اپنی رائے ایک الگ کاغذ پر لکھ لی ہے۔ آپ کا قلمی نسخہ واپس کرتے وقت اسے بھی آپ کے خدمت میں پیش کر دوں گا۔“

”میں آپ کا شکر گزار رہوں گا۔“

”عالی جاہ کی اجازت ہو تو میں ایک اور بات بھی عرض کرنا چاہتا ہوں۔“

”ضرور فرمائیے۔“

”ہم مورخین اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں“ خواند میر نے کہنا شروع کیا۔ ”کہ آج تک کوئی بڑی سلطنت درود کرب کے بغیر، خون خرابے کے بغیر وجود میں نہیں آئی۔ انسان بھی، اولاد

آدم بھی اسی طرح پیدا ہوتی ہے۔۔۔ آپ نے ایک بڑی سلطنت خراسان میں قائم کی، دہلی کی سلطنت اور ہندوستان کے دوسرے علاقوں کو سر کیا۔ جنگیں ہوتی ہیں تو بہر حال خون بہتا ہی ہے۔ جو قبائل آپ کی عداوت پر کمر بستہ تھے ان کے لوگوں کو آپ نے سبق سکھانے کے لئے سزائے موت کے احکام صادر کئے تھے۔ ان احکام کا تذکرہ بھی آپ نے بابر نامے میں کر دیا ہے۔ اس واقعے کو بھی قلم بند کر دیا ہے کہ شمالی ہند کے باجوڑ قلعے میں آپ کے سپاہیوں نے تین ہزار افراد کو قتل کر دیا تھا۔ پانی پت کی جنگ کے موقع پر قید کر لئے جانے والے کئی سو سپاہیوں کو آپ کے تیر اندازوں نے جس طرح ہلاک کر دیا تھا اس کا تذکرہ بھی آپ نے کر دیا ہے۔۔۔ حقیقت نگاری ایک عظیم مقصد ہے، یہ بات مجھ پر واضح ہو گئی لیکن اس نوعیت کی تفصیلات آپ کی کتاب کو پڑھنے والی آئندہ نسلوں کے دلوں پر کیا اپنی گہری چھاپ نہ ڈالیں گی؟ عالی جاہ کو اپنی نیک نامی کا خیال نہ رکھنا چاہئے کیا؟ یہ تفصیلات کتاب سے نکال دی جائیں تو کیسا رہے؟“

بابر کو اچانک محسوس ہوا کہ اس کا حلق سوکھ گیا ہے، اس میں جلن ہونے لگی ہے۔ اس نے فوراً ہی کوئی جواب نہ دیا، چشمے کے کنارے بیٹھ کر اس کے شفاف پانی کو چلو میں بھر لیا۔ صاف اور ٹھنڈے پانی کا لمس اسے بہت خوشگوار معلوم ہوا۔

”میں سمجھتا ہوں، خواند میر صاحب کہ آپ نے یہ بات میرے سچے خیر خواہ کی حیثیت سے کہی ہے۔ ان سارے واقعات کو قلم بند کرتے ہوئے ظاہر ہے کہ مجھے کافی دشواری پیش آئی تھی۔۔۔ میں نے ایک بار تیمور صاحب قرآن کو خواب میں دیکھا تھا۔ انہوں نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا تھا کہ جنگیں خون خرابے کے بغیر نہیں ہوا کرتیں۔۔۔ حقیقت بھی یہی ہے۔۔۔ لیکن آج کل تو بے خوابی کے باعث رات رات بھر پریشان رہتا ہوں۔۔۔ یہ ساری تفصیلات کاغذ پر منتقل کر دی ہیں تاکہ دل کو کچھ سکون میسر ہو سکے۔ آئندہ نسلوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ یہ سب کیسے پیش آیا تھا۔ انہیں ان سارے آلام و مصائب کا علم ہونا چاہئے جو ہم پر کئے جانے والے مظالم اور ہمارے ہاتھوں دوسروں پر کئے جانے والے مظالم۔۔۔ دونوں کا نتیجہ تھے۔“

خواند میر کو بابر کے کچھ اشعار یاد تھے جن میں دونوں طرح کے آلام و مصائب کی ترجمانی کی گئی تھی۔ اس نے ایک لحاظ سے خود ہی دیکھ لیا کہ بابر صرف مفادات سلطنت ہی کی ٹکروں سے نہیں بلکہ اس جدوجہد سے بھی پریشان رہتا تھا جو اس کے دل میں بادشاہ اور شاعر و فنکار کے درمیان مسلسل جاری رہتی تھی۔ بابر ایک ایسے حکمران کی حیثیت سے جو زندگی بھر ایک طاقتور اور متحد سلطنت کے قیام کا کوشاں رہا تھا، وہ سب کچھ کرنے کے لئے مجبور تھا جسے شاعر بابر کے لئے یاد کرنا،

اس کے بارے میں اپنا نقطہ نظر ظاہر کرنا اور لکھنا اتنا زیادہ اہمیت کا حامل تھا۔ شاہ حسین یہ قرا اور شاعر علی شیر زوائی کے درمیان اختلافات کا جو طوفان اٹھاتا رہتا تھا وہ بابر کے وجود کے اندر ایک ہی شخص اور ایک ہی دل کے اندر قیامت ڈھا رہا تھا۔

”جہاں پناہ“ آپ کے الفاظ میرے خیالات کی یہ نسبت کیسے زیادہ قائل کرنے والے ہیں۔ دراصل تجربات کے تلخ اثمار دوسروں کے لئے باعث عبرت ہو سکتے ہیں۔ تاہم ہمیں اپنے اخذ کردہ اہم نتیجے کو فراموش نہ کرنا چاہئے۔ آپ کو یاد ہے کہ آپ نے اپنے آخری دورہ ہرات کے موقع پر اپنی زندگی کو کاہے سے شبیہ دی تھی؟ یہ چشمہ آپ کو کسی بات کی یاد نہیں دلا رہا ہے کیا؟“

”جی ہاں۔ مجھے یاد ہے۔ میں نے آپ سے کہا تھا کہ میری زندگی اس چشمے کی مانند ہے جو کوستانی چٹانوں کے ٹوٹ کر گرنے سے دب کر رہ گیا ہو۔“

”درست فرمایا آپ نے۔ تو کیا اب آپ کو ایسا نہیں لگتا کہ ماورالنہر میں جو چشمہ چٹان کے نیچے دب گیا تھا وہ ہندوستان میں دوبارہ پھوٹ نکلا ہے؟“

”آپ نے یہ بات بڑی خوبصورتی سے کہہ دی۔ میرے اندر اگر کوئی چشمہ ہے تو وہ ہے میری شاعری، میری تخلیقات۔۔۔ آپ مجھ پر معترض نہ ہوں، میں تو عرصے سے محسوس کر رہا ہوں کہ تخت و تاج کسی شخص کو انحطاط اور گم نامی سے نہیں بچا سکتے۔ اپنے وطن لوٹنا میری قسمت میں نہیں لکھا ہے۔ کاش میری شاعری اور ترکی میں لکھی ہوئی کتابیں ہی وہاں تک پہنچ جائیں۔ کاش آپ کو معلوم ہو تاکہ مجھے اندجان، سمرقند اور تاشقند کی یاد کتنی زیادہ ستاتی رہتی ہے۔ وہیں تو میں بڑا ہوا تھا، آدمی بنا تھا۔“

اچانک بابر کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے اور اس نے جلدی سے نظریں جھکا لیں۔

”اعلا حضرت، آپ تو خود ہی فرماتے رہتے ہیں کہ ہندوستان آپ کا دوسرا وطن بن چکا ہے۔ آپ کی کتابوں سے اس کی شہرت کو بھی چار چاند لگ جائیں گے۔“

”یہ تو درست ہے کہ میں نے اپنی زندگی کے آخری برسوں کو ہندوستان کے لئے وقف کر دیا ہے لیکن بادشاہ کی بے رحمانہ ذمہ داریوں کو پورا کرنا میرے لئے روز بہ روز دشوار تر ہوتا جا رہا ہے۔“

”عالی جاہ، اس وقت تو آپ کے دل پر شاعر کی حکمرانی ہے۔ لیکن۔۔۔ اگر آپ نے بادشاہ کی زندگی نہ بسر کی ہوتی تو شاید آپ بابر نامہ نہیں لکھ سکتے تھے۔ اور پھر کیا آپ یہاں بادشاہ یا سپہ سالار ہی کی حیثیت سے نہیں آئے تھے؟“

خواند میر کی دلی خواہش تھی کہ بابر کے دل میں ایک دوسرے سے جدوجہد کرتے ہوئے بادشاہ

اور شاعر کے درمیان صلح ہو جائے۔

”چلے“ میں اپنا قلمی نسخہ لے لوں“ بابر نے سب کچھ سمجھتے ہوئے تھکی تھکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”جنگ جو بابر کے چشمے پر کوئی اور چٹان گرنے سے قبل شاعر بابر اور مؤرخ بابر اپنی کتاب کو مکمل کر لیتا چاہتا ہے۔“

ایک بار پھر آگرہ

۱

ناقابل برداشت گرمیاں ایک بار پھر شروع ہو گئیں۔ بابر اپنا زیادہ تر وقت خلوت گاہ میں گزارتا اور بابر نامے کو لکھتا رہتا تھا۔ تیز پیاس اسے ہر وقت پریشان رکھتی تھی، پھلوں کے ٹھنڈے ٹھنڈے عرق پیتا رہتا تھا لیکن پیاس تھی کہ کسی طرح بجھنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ ایک روز طاہر طلائی قاب میں تازے انگوروں کے گچھے رکھ کر لایا تو بابر حیرت میں پڑ گیا:

”یہ کہاں سے لے آئے؟“

”ہشت بہشت باغ سے، جہاں پناہ۔ آپ نے سمرقند سے انگور کی قلمیں منگوا کر گلوائی تھیں، یاد ہے نا؟“

دھلے ہوئے انگوروں پر پانی کے قطرے چمک رہے تھے۔ ”بالکل شبنم جیسے لگتے ہیں“ بابر نے سوچا، ایک گچھے کو اٹھا کر منہ کے پاس لے گیا اور اس میں سے انگور کھانے لگا۔ اسے ایسا لگا جیسے یہ اس کے بچپن کا زمانہ ہو، جیسے وہ سردریا کے کناروں پر، سمرقند اور اندجان کے باغوں میں پہنچ گیا ہو۔ ”شکر ہے، پروردگار۔ پیاس جس نے پریشان کر رکھا تھا، جاتی رہی، جسم میں تازگی بھی محسوس ہونے لگی۔“

”حیرت ہوتی ہے!“ بابر نے خوش ہو کے کہا۔ ”جہنما کے کنارے انگور پکنے لگے! سفید سمرقندی بے دانہ کشمش! انہیں تو ماہم بیگم کو دکھانا چاہئے۔ طاہر جان، قاب لے کے ان کے پاس چلے تو۔“

ماہم بیگم گزشتہ سال موسم خزاں کے آخری ایام میں قابل سے آگرہ آگئی تھی۔ وہ باغ زرافشان میں بنے ہوئے محل ہی میں رہتی تھی جہاں بادشاہ کو تہائی میں وقت گزارنا بہت پسند تھا۔ بابر طاہر کے ساتھ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا محل کی طرف چل پڑا۔ بارش زرا دیر قبل ختم ہو گئی لیکن آسمان پر کالے کالے بادل اب بھی چھائے ہوئے تھے۔ بابر بار بار طاہر کے ہاتھ کی قاب کو دیکھتا

جا رہا تھا جس میں رکھے ہوئے انگور سونے کی طرح چمک رہے تھے، لگتا تھا جیسے سنہری شعاعیں براہ راست سمرقند سے ان کالے کالے بادلوں کو چیرتی ہوئی نیچے اتر رہی ہوں۔

ماہم بیگم محل کے برآمدے میں چوکی کے پاس بیٹھی ہوئی ہمایوں کو خط لکھ رہی تھی۔ وہ ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی اٹھ کر کورٹس بجالائی۔

”ارے ذرا ان انگوروں کو تو چکھئے، ماہم بیگم۔ سمرقند کے انگوروں جیسے لگتے ہیں نا؟“

لیکن اس وقت ماہم بیگم کا کچھ کھانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ اس نے طاہر سے قاب لے کر چوکی کے اوپر رکھ دی۔

طاہر بادشاہ اور ملکہ کو تنہا چھوڑ کر چلا گیا۔

ماہم بیگم کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے، اس سے بات ہی نہیں کی جا رہی تھی۔ باہر مضطرب ہو گیا:

”کیا ہوا، ماہم بیگم؟ آپ کی آنکھوں میں یہ آنسو کیوں؟“

”سانس لینے میں ذرا دقت ہو رہی ہے۔۔۔“

ماہم بیگم کی عمر چالیس سے تجاوز کر چکی تھی۔ مناپے کے مارے جسم تھلٹھلانے لگا تھا اور پھولے پھولے سے چہرے میں ذرا بھی کشش نہیں باقی رہ گئی تھی۔ اسے کابل کی خشک کوہستانی ہوا کی عادی ہونے کی بنا پر جتنا کے کنارے کی ٹھن بھری نمی میں خاصی دشواری محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے ہندوستان کی مڈھال کر دینے والی گرمی کے بارے میں کچھ سن رکھا تھا اور کسی حد تک اسی باعث آگرہ آجانے کو تین برسوں تک ٹالتی رہی تھی۔ لیکن گزشتہ کچھ دنوں سے باہر کا اصرار بڑھ گیا تھا اس لئے بادل ناخواستہ چلی آئی تھی۔

”بارش ہونے لگتی ہے تو مجھے بھی دقت محسوس ہوتی ہے“ باہر نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

”گھبرائیے نہیں، جلد ہی عادی ہو جائیں گی۔۔۔ لیجئے، ذرا ان انگوروں کو تو چکھئے۔“

ماہم بیگم کا جی تو نہیں چاہ رہا تھا پھر بھی اس نے ایک کچھ سے دو انگور تو ذکر منہ میں رکھ لئے اور باہر کو خوش کرنے کے لئے کہا:

”خوب پک گئے ہیں۔ بہت لذیذ ہیں۔“

”آپ خط لکھ رہی تھیں؟“

”جی ہاں، مرزا ہمایوں کو۔ لیکن عالی جاہ، مجھے سانس لینے میں دقت بارش کی وجہ سے نہیں بلکہ

ذہنی کرب کے باعث محسوس ہوتی ہے۔“

اچانک جیسے دھارا سا پھوٹ نکلا۔ ماہم بیگم سسکیاں بھر بھر کے تیزی کے ساتھ کہنے لگی:

”میں مرزا ہمایوں کی یاد میں تڑپتی رہتی ہوں۔ آپ تو لگتا ہے کہ جان بوجھ کر میرے لخت جگر کو ہمیشہ ہی مجھ سے دور بھیجتے رہتے ہیں۔ میں کابل میں تھی تو مرزا ہمایوں جتنا اور گنگا کے کناروں پر جسے بیٹھے تھے۔ میں یہاں آگئی ہوں تو وہ بد خشاں چلے گئے۔ انہوں نے بد خشاں کے حالات درست کئے اور چند دنوں کے لئے آگرہ آئے تو آپ نے انہیں صوبیدار بنا کر سنبھل روانہ کر دیا۔ جہاں خطرہ ہوتا ہے وہاں ان کا پہنچنا ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ کسی دور دراز علاقے میں ذرا بھی گڑبڑ ہوتی ہے تو آپ فوراً ہی مرزا ہمایوں کو وہاں روانہ کر دیتے ہیں! اور میں ہمہ وقت اپنے جگر گوشے کی فکر میں گھلتی رہتی ہوں۔ میرا تو کلیجا پاش پاش ہوا جا رہا ہے!“

”لیکن آپ اتنی متفکر کیوں ہوتی ہیں، ماہم بیگم؟... مرزا ہمایوں بڑے شجاع ہیں، انہوں نے تو خود ہی کہا تھا کہ انہیں سنبھل بھیج دیا جائے۔“

”آپ متفکر نہیں ہوئے کیونکہ آپ کے ماشاء اللہ کئی بچے ہیں۔ میرے تو بس ایک مرزا ہمایوں ہی ہیں۔ تین بچوں کو سپرد خاک کر چکی ہوں، تین کو! تصور فرمائیے تاکہ ایسی ماں پر کیا بیت رہی ہوگی! مرزا ہمایوں ہی تو میرے لئے سب کچھ ہیں، میرے اکلوتے فرزند ہیں!“

اور ماہم بیگم پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

ان آنسوؤں میں بابر کو صرف ماں کے غموں اور فکروں ہی کی نہیں بلکہ برسوں قبل خود اس نے ماہم بیگم کی جو توہین کی تھی اس کی جھلک بھی نظر آنے لگی۔ صرف ماہم بیگم ہی بابر سے بے لوث محبت کرتی تھی لیکن اس کے علاوہ بابر کے دو بیگمات اور بھی تھیں۔

اتنے میں آٹھ سالہ گل بدن جس نے ہلکا پھول دار لباس پہن رکھا تھا، دوڑی دوڑی وہاں آئی اور اپنے والد سے لپٹ کر اچھلنے کودنے لگی۔ لیکن جب اس نے ماہم بیگم کو اٹکبار دیکھا تو فکر مند ہو کے بے حس و حرکت کھڑی ہو گئی۔

بابر ماہم بیگم کو یاد دلایا کہ آخوندال اور گل بدن بھی تو اسی کے بچے ہیں لیکن ضبط کر گیا۔

ماہم بیگم نے اپنی شکایات کا سلسلہ جاری رکھا:

”آخر مرزا کامران بھی تو اسی طرح آپ کے فرزند ہیں جیسے کہ مرزا ہمایوں۔ لیکن وہ تو اپنی والدہ کے ساتھ مزے سے لاہور میں زندگی گزار رہے ہیں۔ بھلا میرے مرزا ہمایوں ہی تمام مصائب میں آپ کے لئے سپر کیوں بنتے رہیں؟“

بابر جھلا اٹھا:

”اس لئے کہ وہ دلی عہد ہیں، اس لئے کہ میرے بعد وہی تخت نشیں ہوں گے، ماہم! انہیں مشکلات کا عادی ہونے دیجئے۔ میں ان کی عمر کا تھا تو اس سے کہیں زیادہ بلاؤں کو جھیل چکا تھا!“

”لیکن میں ماں ہوں! ان کی یاد میں، ان کی فکر میں میری توجان نکلی جا رہی ہے۔ مگر آپ کو میرا خیال کرنے کی کیا پڑی ہے۔ آپ کے تو اور بھی بیگمات ہیں، مجھ سے زیادہ جوان۔“

گل بدن دیوان خانے کے وسط میں بت بنی کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے اس قسم کی گفتگو پہلی بار سنی تھی۔ باپ جھلایا ہوا، ان لوگوں کی طرف سے منہ موڑے ہوئے کھڑا تھا۔ ماں اٹکیا رہی تھی۔ گل بدن سوچ رہی تھی کہ پہلے اس کے والدین ایک دوسرے سے کتنی زیادہ محبت کرتے تھے۔ کابل سے آگرے تک سفر میں وہ دیکھتی ہی رہی تھی کہ اس کی ماں کتنی بے چین ہے، شوہر سے ملاقات کے تصور سے کتنی شاداں و فرحاں ہے۔ کتنی خوشی ہوئی تھی اس کے والد کو ماہم بیگم کی آمد پر! اس نے جلالی جھیل کے کنارے ان لوگوں کا خیر مقدم کیا تھا اور ماہم بیگم کے گھوڑے کی لگام تھام کر اس کی ساتھ ساتھ دور تک پیدل چلتا رہا تھا۔ بعد میں گل بدن نے جو کسی کی بناء پر بڑی متحس تھی، لوگوں کو یہ کہتے سنا تھا کہ باہر کے علاوہ اور کسی بھی مسلمان بادشاہ نے اپنی بیگم کے سلسلے میں اتنے زیادہ اعزاز و احترام کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔

اس وقت گل بدن کسی طرح سمجھ ہی نہیں پا رہی تھی کہ آخر اس کے والدین کو کیا ہو گیا ہے۔ بہر حال اس پر یہ ضرور واضح ہو گیا تھا کہ کوئی ایسی دلی بات ہو گئی ہے۔

پارنے بیٹی کو شش و پنج میں مبتلا دیکھا تو جلدی سے چوکی کے پاس گیا اور قاب سے انگوڑے کے ایک کچے کو اٹھا کر گل بدن کی طرف بڑھایا:

”لہجے صاحب زادی، کھائیے۔ پھر جا کر باغ کی سیر کیجئے۔“

گل بدن جس کا پیارا پیارا چہرہ متشکر نظر آنے لگا تھا، باہر چلی گئی۔ باہر چوکی کے قریب لوٹ آیا اور دھیرے سے گلے پر بیٹھ گیا۔

”ہاں، ماہم بیگم، میں قصور وار ہوں۔ ظاہر ہے کہ کسی مسلمان کے لئے کئی بیویاں رکھنا ضروری نہیں ہے۔۔۔ لیکن مجھے تو کسی ایک جگہ پر آرام و سکون کے ساتھ بیٹھنا نصیب ہی نہ ہوا، زندگی کا نصف سے زائد حصہ تو مہموں اور جنگوں کی نذر ہو گیا۔ میرا تین شاداں کرنا ایک ایسی غلطی تھی جو ناقابل معافی ہے۔ میری ایک بھی بیگم خوش نہ رہ سکی حالانکہ میری دلی آرزو تھی کہ آپ تینوں مسرور و مطمئن رہیں۔ آج آپ کی حالت کو دیکھ کر مجھے بیگمات کی باہمی رنجشوں اور سوتوں کی اولاد کے درمیان پنپتی ہوئی عداوتوں کا خاص طور سے احساس ہوا۔۔۔ مجھے امید تھی کہ اس نوعیت کی

پریشانیوں جو ہمیں اپنے آباء و اجداد سے ورثے میں ملی ہیں، ہماری زندگیوں میں زہر نہ گھول سکیں گی ... لیکن افسوس کہ انہی پریشانیوں کے باعث آپ تک کو جو میری محبوب ترین بیگم ہیں، پھوٹ پھوٹ کر رونا پڑ رہا ہے ... آپ کو اس اذیت میں مبتلا دیکھ کر میرا دل بیمار ٹکڑے ٹکڑے ہو جا رہا ہے۔“

ماہم بیگم نے باہر کے زرد پڑ جانے والے چہرے کی طرف دیکھا اور اسے لگا جیسے یہ زردی اسے پہلی بار نظر آ رہی ہو۔ اس نے جلدی سے آنسو پونچھ ڈالے۔

”شاہ عالی، آپ مجھ سے ناراض نہ ہوں۔ میں کمزور عورت ہوں اور آپ بادشاہ۔ اپنے درد و غم کا اظہار آپ سے نہ کروں تو اور کس سے کروں؟ آپ کی ہمدردی سے مجھے سکون مل جاتا ہے۔“

”سارے مصائب کی جڑ یہی تو ہے کہ میں بادشاہ ہوں۔ مجھ سے جو غلطیاں اور گناہ سرزد ہوئے ان کی وجہ بھی یہی ہے، وہ بھی تخت و تاج حاصل کرنے اور ان سے جتنے رہنے ہی کی خواہش کا نتیجہ تھے۔ میں نوجوانی میں وہ کات کے کوساروں پر پیدل منڈلایا کرتا تھا، زنجیروں سے آزاد ہونے کا کوشاں رہتا تھا لیکن مجھے کوئی ایسا نجات دہندہ ہی نہ مل سکا جو مجھے اقتدار اور حکمرانی کے بار سے نجات دلا سکتا۔ اب تو یہ بار میرے لئے ناقابل برداشت ہو چکا ہے۔ اب تو یہی امید رکھتا ہوں کہ اس بار کو مرزا ہمایوں سنبھال لیں گے۔“

اچانک ماہم بیگم پر واضح ہو گیا کہ باہر کے دل میں کیا ہے لیکن اسے اپنے اس قیاس پر یقین نہ آیا۔

”ماہم بیگم، آپ اپنا خط مکمل کیجئے اور میری طرف سے لکھ دیجئے کہ مرزا ہمایوں جلد از جلد آگرہ واپس آجائیں۔ وہ میرے سامنے، میری زندگی ہی میں تخت نشین ہو جائیں ... لکھئے، لکھئے نا، میں دستخط کروں گا۔“

”جہاں پناہ بخوئی جانتے ہیں کہ مرزا ہمایوں تخت و تاج کی ہوس نہیں رکھتے ... یہ ناچیز تو بس اتنا ہی چاہتی ہے کہ وہ یہاں آجائیں اور میری نگاہوں کے سامنے رہیں۔“

”لکھئے کہ وہ واپس آجائیں ... تخت نشین ہونے کے لئے! صرف اسی مقصد کے تحت آئیں ... لیکن فی الحال میرے اس فیصلے کی آپ کے علاوہ کسی اور کو بھٹک بھی نہ لگنی چاہئے۔“

آخر کار جب ماہم بیگم کو باہر کے فیصلے کی سنجیدگی کا یقین ہو گیا تو اس نے پوچھا:

”لیکن آپ؟ آپ کا ایل واپس تشریف لے جانا چاہتے ہیں کیا؟“

”میں؟ مجھے تو محسوس ہو رہا ہے کہ سفر آخرت کی گھڑی قریب آن پہنچی ہے۔ میری آنکھیں بند

ہو جائیں تو میت کو کابل لے جا کر سپرد خاک کر دیجئے گا۔۔۔ ویسے زندگی میں جو تھوڑے سے دن باقی رہ گئے ہیں انہیں آگرے میں ہی گزاروں گا۔۔۔ زیادہ عرصے تک جینے سے رہا۔۔۔ لکھنے کو بہت کچھ لکھنے کو جی تڑپا رہتا ہے۔ امور سلطنت میں الجھے رہنے والے آدمی کو ظاہر ہے کہ اس کے لئے وقت نہیں ملتا۔ بہر حال اب لکھوں گا۔۔۔ اب مجھے تخت، تاج، محل۔ کچھ بھی نہ چاہئے۔ میرے لئے اکیلا ظاہر آفتابہ جی ہی کافی ہو گا۔۔۔ مہربانی کر کے مرزا ہمایوں کو میرے اس فیصلے کے بارے میں صاف صاف لکھ دیجئے۔“

ماہم بیگم کف افسوس لئے لگی کہ خاوند کو بیکار ہی پریشانی میں ڈال دیا۔
 ”مجھے معاف کر دیجئے جہاں پناہ۔ اس قسم کی کوئی بات تو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔۔۔ یہ تو ناقابل یقین ہے، ناممکن ہے! میں مرزا ہمایوں کو یہ کیسے لکھ سکتی ہوں کہ عالی جاہ جن کا وہ اتنا زیادہ احترام کرتے ہیں، تخت سے دست بردار ہو رہے ہیں۔“
 باہر کھڑا ہو گیا! اس نے بڑے عزم کے ساتھ کہا:
 ”آپ نہیں لکھ سکتیں تو میں خود لکھ دوں گا۔“

وہ دیوان خانے سے نکل کر باغ میں آیا تو اسے گل بندن نظر آئی جو بڑی چوکی کے ساتھ اس کی طرف دیکھ رہی تھی جیسے کہ بھانپ گئی ہو کہ اس کے والد کو اس وقت کتنے دشوار لمحات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ باہر نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف ہاتھ ہلا دیا۔

۲

باہر کا خط سنبھل پہنچا تو ہمایوں علیحدہ تھا لیکن خط سے باہر کے خفیہ فیصلے کا علم ہوتے ہی اس نے اپنے مقررین سے کہا:

”مجھے جلد از جلد آگرہ پہنچا دیجئے!“

دہلی پہنچنے پر ہمایوں کا بخار بڑھ کر خطرناک صورت اختیار کر گیا۔ ہندو بیگ نے ہمایوں کی علالت سے شاہی خاندان کو مطلع کرنے کے لئے فوراً ہی ایک قاصد کو آگرہ روانہ کیا اور دہلی کے نامور مکئیوں کو بلوایا کیونکہ وہیں علاج ضروری ہو گیا تھا۔

لیکن کسی بھی دوا سے افادہ نہ ہوا۔ حکیم اصل مرض کی تشخیص تک نہ کر سکے۔ جانے کیا بخار تھا جس سے ہمایوں کا جسم روز و شب جلتا رہتا تھا اور اس کی رنگت سیاہ پڑ گئی تھی۔

ماہم بیگم آگرے سے انتہائی تیز گھوڑوں کی گاڑی پر دہلی پہنچ گئی۔

اس نے سوچا کہ دریائی راستے سے سفر مریض کے لئے آسان ثابت ہو گا اس لئے ہمایوں کو کشتی

کے ذریعے آگرہ لایا گیا۔ آٹھ سپاہی ڈھکی ہوئی پاکلی میں اسے زرافشان باغ میں لائے۔ باہر نے بے ہوش بیٹے کو دیکھا تو اسے لگا جیسے اس کے دل کا کوئی تار ٹوٹ گیا ہو۔ اسے وہ پاکلی بھی تابوت جیسی معلوم ہوئی۔

ہمایوں غشی کے عالم میں رہ رہ کے بڑبڑانے لگتا تھا۔ ایک روز اس نے بمشکل بھاری رات گزارنے کے بعد صبح ہی صبح آنکھیں کچھ کچھ کھول دیں اور سر ہانے چپ چاپ کھڑے ہوئے اپنے والد کو پہچان لیا۔ وہ اٹھ بیٹھنے کی کوشش میں پلنگ پر کسمایا لیکن اس کا سر فوراً ہی پیچھے کی طرف لڑھک گیا۔

”ہم آپ کی خدمت میں ... آپ کے بغیر ... نہیں نہیں ...“ ہمایوں نے کہا، اسے ایک بار پھر ڈراوے خواب دکھائی دینے لگے اور وہ چیخ اٹھا: ”آگے بڑھو، قلب پر حملہ کرو ... مارو! نہیں! چلا گیا ... ٹھہر جاؤ! ...“

ہمایوں کا دم گھٹنے سا لگا۔ وہ بستر پر ترپنے لگا اور پھر کوٹ بدل کر دوبارہ بے ہوش ہو گیا۔ مرض پر شاہی جیسوں کا بھی کچھ بس نہ چل سکا۔ ماہم بیگم کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھری مگی رہتی تھی، باہر ناقابل بیان رنج و غم میں مبتلا رہتا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ ہمایوں کی جان کو آئے دن جو کسم میں ڈال ڈال کے، اسے زمانے کی سختیاں جھیلنے پر مجبور کر کر کے خود ہی اس کی اس سنگین علالت کا باعث بنا ہے۔ لوگ دشوار حالات میں باہر پر بھروسہ کرنے کے عادی ہو چکے تھے، ہر ایک امید رکھتا تھا کہ باہر اس کی حفاظت کرے گا لیکن اس بار تو باہر خود ہی لاچار اور بے بس ہو کر رہ گیا تھا۔ اسے خود ہی دلا سے اور سہارے کی ضرورت تھی۔

یہ دلاسا اور سہارا بالکل غیر متوقع طور پر بزرگ شیخ الاسلام نے دیا۔

”اعلا حضرت، امید کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیے۔ پروردگار مرزا ہمایوں کو صحت یاب کر دے گا۔ لیکن جب بہترین حکما بھی ناکام رہیں“ شیخ الاسلام نے کہا۔ ”تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ خدا آپ سے کوئی قربانی چاہتا ہے۔ آپ اپنی کوئی بیش بہا شے اللہ کے نام پر بطور صدقہ دے دیجئے۔“

”بیش بہا شے؟“ باہر حیرت میں پڑ گیا۔ ماہم بیگم کتنی ہی بھیڑوں کی قربانی کرا کے ان کا گوشت غریبوں میں تقسیم کرا چکی تھی۔ غریبوں کی مدد کرنے کا یہ اقدام رضائے الہی کے عین مطابق تھا۔ آخر شیخ الاسلام کی مراد کون سی بیش بہا شے سے تھی؟

”اعلا حضرت، اسی بڑے ہیرے کو صدقے میں دے دیا جانا چاہئے۔“

”کون سے بڑے ہیرے کو؟ کوہ نور کو؟“

شیخ الاسلام نے اثبات میں سر ہلادیا۔

”شیخ صاحب، یہ میرا زیادہ قیمتی ہے یا میری زندگی؟“

”یہ کیا فرما رہے ہیں آپ، عالی جاہ! ایسے ایسے ہزاروں میرے تو آپ کی جھنجکیا کے برابر بھی وقعت نہیں رکھتے!“

”مال دنیا کی کیا وقعت ہے جو مرزا ہمایوں کی جان کا بدل ہو سکے“ بابر نے بلند آواز سے کہا تاکہ تمام حاضرین سن لیں۔ ”میں میرے سے کہیں زیادہ قیمتی شے کی قربانی پیش کروں گا۔ میں مرزا ہمایوں پر اپنی جان نذا کروں گا! خدا شرف قبولیت بخشے!“

حاضرین سہم گئے، حیران و ششدر ہو کر بابر کی طرف دیکھنے لگے۔ بابر دھیرے دھیرے چلتا ہوا بے ہوش لیٹے ہوئے ہمایوں کے سر ہانے جا کھڑا ہوا۔

”میرے لخت جگر، میرے فرزند ارجمند ہمایوں! میں پروردگار سے دعا کرتا ہوں“ بابر نے دعا مانگتے کے انداز میں کہا۔ ”کہ وہ آپ کو صحت یاب کر دے اور آپ کی یہ خطرناک بیماری مجھے مل جائے!“

مریض کے کمرے میں موجود حکیم، پیر، شیخ اور بیک سب کے سب مفلوج سے ہو کر رہ گئے۔ بابر نے ہمایوں کے پٹنگ کے تین چکر لگائے اور برابر دعا مانگتا رہا:

”پروردگار! میں بادشاہ ظہیر الدین بابر اپنی زندگی اپنے بیٹے کو دے رہا ہوں۔ میری اس قربانی کو شرف قبولیت عطا کر، رب العالمین۔ عزرائیل! میری جان نکال لے اور ہمایوں صحت یاب ہو جائیں، پروردگار!“

قریب ہی پردے کے پیچھے موجود ماہم بیگم نے رونا بند کر دیا اور بابر کو سہمی سہمی پر توقع لگا ہوں سے دیکھنے لگی۔ سن رسیدہ شیخ الاسلام بھی بت بن کر رہ گیا، بابر کو کچھ ایسی نظروں سے دیکھنے لگا جیسے ہمایوں واقعی ابھی ابھی بستر علالت سے اٹھ کھڑا ہو گا اور بابر بے جان ہو کر اس کے بستر پر ڈھیر ہو جائے گا۔

لیکن معجزہ نہ رونما ہوا۔ بے ہوش ہمایوں چپکے چپکے بدبویا اور ایک بار پھر خاموش ہو گیا۔

بابر سر جھکا کر خواب گاہ سے باہر نکل آیا۔

۳

نوجوان ہمایوں کے قوی دل نے آخر کار مرض پر غلبہ حاصل کر لیا اور ایک ہفتے کے بعد ہی وہ بستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اگلے روز شام کو وہ اپنے والد سے ملاقات کرنے کے لئے اس کی خلوت گاہ میں

گیا۔

ہمایوں نے دیکھا کہ اس کے والد کا چہرہ پڑمردہ ہو گیا ہے مہری گہری شکنیں نمودار ہو گئی ہیں اور شانے قبل از وقت ہی خمیدہ ہو گئے ہیں۔

”بے خوابی سے جان عذاب میں ہے“ بابر نے بیٹے سے نظریں ملاتے ہوئے کہا۔ ”خیر، آپ بتائیے، اب طبیعت کیسی ہے؟“

”میری جان تو آپ نے بچالی، عالی جاہ۔ مجھے جب سے ہوش آیا ہے تب سے پروردگار سے یہی وعاما نکلتا ہوں کہ آپ نے مجھ پر اپنی جان قربان کرنے کے سلسلے میں جو دعاما لگی تھی وہ قبول نہ ہو۔“

”فرزند عزیز، آپ متشکر نہ ہوں۔ میں ایسا نہ کرتا تو میرے ضمیر کو کبھی بھی سکون نہ میسر ہوتا۔۔۔ اس کے علاوہ آپ کی والدہ کے سلسلے میں مجھ سے جو گناہ سرزد ہو گیا تھا اس کا کفارہ بھی ادا کرنا چاہتا تھا۔“

”لوگ کہہ رہے ہیں کہ موت جو میری ناک میں تھی، اب آپ کو اٹھالے جائے گی۔“

”کیا آپ کو واقعی اس بات کا یقین آگیا؟ ہم بسھی فانی ہیں۔ موت کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے جس کے آتے ہی ہمیں دنیا سے اٹھ جانا ہے۔ آپ میری نہیں بلکہ سلطنت کی فکر کیجئے۔“

”لیکن اعلا حضرت تو مجھ سے یہ بات کچھ اس طرح فرما رہے ہیں گویا کہ تخت مجھے سوئپ چکے ہوں جیسا کہ اپنے خط میں لکھا تھا۔ یقین مانئے، میرے لئے یہی بہت ہے کہ میں سنبھل میں آپ کا صوبیدار رہوں، آپ کا والد محترم۔ سنا ہے کہ وہاں پھر کچھ گڑبڑ ہو رہی ہے۔ آپ اجازت دیں تو دو روز بعد میں سنبھل لوٹ جاؤں۔“

بابر اس خیال سے چند لمحات تک خاموش رہا کہ جو بات وہ کہنے والا ہے اسے ہمایوں خاص طور پر توجہ کے ساتھ سنے۔

”میری بات کو ٹھیک سے سمجھئے، مرزا ہمایوں۔ میرا فیصلہ کسی قسم کی چال نہیں ہے۔ آپ کو جلد از جلد عثمان حکومت سنبھال لینی چاہئے۔ میں دو برسوں سے، اسی لمحے سے جب بیدہ کی سازش سے مجھے زہر دیا گیا تھا، علیل ہوں۔ اب میں اپنی بچی کچی قوت امور سلطنت پر نہیں بلکہ کچھ دوسرے کاموں پر صرف کرنا چاہتا ہوں۔۔۔ آپ سنبھل چلے جائیں لیکن وہاں اپنے کاموں کو نبھانے اور ہندو بیگ کو صوبیدار مقرر کرنے کے بعد فوراً ہی واپس آجائیے گا۔“

ہمایوں پر واضح ہو گیا کہ اسے اپنے والد کی اس خواہش کو بے چون و چرا پورا کرنا چاہئے۔ برسات ختم ہو چکی تھی۔ اب آسمان پر بادل نہیں منڈلاتے رہتے تھے اور بابر راتوں کو بے خوابی

سے پریشان ہو کر باغ میں نکل آتا اور ستاروں کو دیکھنے لگتا تھا۔ اب وہ اکثر بخار میں مبتلا رہتا تھا، خاص طور سے رات کے وقت۔ اس حالت میں وہ آسمان پر نظریں دوڑاتا تو اسے لگتا تھا کہ سارا آسمان مرتعش ہے اور ستارے کسی بہت بڑے گرداب میں چکر کاٹ رہے ہیں۔

دن میں ملاقاتوں کے لئے متعین وقت پر وہ بیگوں اور عہدیداروں سے پہلے ہی کی طرح اب بھی ملاقات کرتا تھا۔ اس کی ملاقاتیں شیخ الاسلام سے بھی ہوتی تھیں لیکن پہلے کی بہ نسبت کچھ کم ہی۔ یہ سارے کے سارے لوگ اب باہر سے بہت زیادہ خوش اخلاقی اور توجہ و التفات کے ساتھ پیش آتے تھے جس کا سبب باہر پر واضح تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ وہی طرز عمل ہے جو ایسے مریضوں کے ساتھ اپنایا جاتا ہے جن کے بچنے کی کوئی امید نہ رہ گئی ہو۔ یہ سب لوگ معجزوں میں یقین رکھتے تھے اور انہیں ذرا بھی شک نہیں تھا کہ باہر نے بیٹے کی جان کے عوض اپنی جان قربان کرنے کے سلسلے میں جو دعا مانگی تھی اسے پروردگار نے قبول کر لیا ہے۔ ہمایوں صحت یاب ہو چکا تھا اور اب موت کی غیر مئی تلوار باپ کے سر پر لہرا رہی تھی، کسی بھی لمحے اپنا کام کر سکتی تھی...

باہر کے لئے ایسے افراد کی نہایت ہی شائستہ مسکراہٹیں اور نہایت ہی ادب کے ساتھ بجالائی جانے والی کورنشٹ بھلا خوشگوار کیسے ثابت ہو سکتی تھیں جو اس کی موت کے منتظر تھے۔ چنانچہ باہر اب اپنا زیادہ تر وقت یا تو ماہم بیگم کے ساتھ گزارتا تھا یا اپنی غلوت گاہ میں۔

ماہ میزان شروع ہوا تو باہر کی طبیعت کچھ اور بھی زیادہ بگڑ گئی۔ جسم پر نہ کہیں کوئی پھوڑا تھا نہ ہی کہیں ورم معلوم ہوتا تھا لیکن سینے کے اندر ہر وقت آگ سی لگی رہتی تھی۔

حکما حیرت سے شانے اچکاتے اور آپس میں مسلسل صلاح مشورہ کرتے رہتے تھے۔ آخر کار وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ بادشاہ کے خون میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی ہے جو شاید زہر کے اثر کا نتیجہ ہے۔ انہوں نے کہا کہ دواؤں کے علاوہ انار کے عرق کا زیادہ مقدار میں استعمال ضروری ہے۔

لیکن کوئی دوا اثر ہی نہیں کر رہی تھی۔ بدن سوکھ کے کاٹا ہو گیا تھا اور طاقت تیزی سے ختم ہوتی جا رہی تھی۔

ہمایوں سنبھل سے واپس لوٹا تو اس نے اپنے والد کو کشادہ دیوان خانے کے وسط میں اونچی جگہ پر بچھے ہوئے پلنگ کے سفید بستر پر لیٹے پایا۔ جو لوگ باہر کو توانا و تندرست اور ہشاش بشاش دیکھتے رہے تھے وہ اب اس کے چہرے پر چھائی ہوئی مرونی اور جسم کو جس میں ہڈیوں کے سوا کچھ بھی تو نہیں بچا تھا، دیکھ کر مفلوج سے ہو جاتے تھے۔

ہمایوں نے پلنگ کے قریب گھٹنوں پر بیٹھ کے اپنے والد کے بے جان ہاتھ کا بوسہ لے لیا۔

بابر کے سرہانے خان زادہ بیگم بیٹھی اس کے چہرے پر مور جھل جھل رہی تھی اور پائنتی میں ماہم بیگم بت بنی بیٹھی ہوئی تھی۔

”یہ آپ کو کیا ہو گیا، عالی جاہ؟“ ہمایوں نے بدحواس ہو کے پوچھا۔ ”آپ نے مجھ پر اپنی جان فدا کرنے کی جو دعا مانگی تھی... یہ اسی کا نتیجہ ہے۔“

ماہم بیگم جس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکل پا رہا تھا، سسکیاں بھرنے لگی۔
بابر نے بانپے پر قابو پا کر بہ دقت دھیرے دھیرے بولنا شروع کیا لیکن اس کے الفاظ واضح اور قابل فہم تھے:

”فرزند عزیز، اس میں آپ کا کیا قصور... علالت تو میرے خون میں سرایت کر چکی ہے۔“
”مجھے حکم دیجئے، ابا حضور... یہ خادم آپ کو صحت یاب دیکھنے کے لئے سب کچھ کرنے کو تیار ہے۔“

”میری صحت کا پوری طرح بحال ہونا تو اب... شاید ممکن نہیں ہے۔ آپ میرے درد کو کچھ کم ضرور کر سکتے ہیں۔“

”وہ کیسے؟ فرمائیے نا!“ ہمایوں کہہ اٹھا۔
”وزیر اعظم کو بلوا لیجئے... اور دوسرے ضروری عہدیداروں کو بھی۔ میں سب کے سامنے عثمان حکومت آپ کو سوپ دوں۔“

”لیکن یقین کیجئے کہ میرے لئے آپ کی زندگی کا ایک لمحہ بھی کہیں زیادہ قیمتی ہے بہ نسبت...“
”یہ بہت ضروری ہے“ بابر نے اس کی بات کاٹتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز سے کہا۔
خان زادہ بیگم نے بھائی کے بستر کو درست کر دیا۔ بابر نے کہا کہ اس کے سر کے نیچے ایک اور ٹکیہ رکھ دیا جائے کیونکہ نیم دراز حالت میں ہو جانے سے اسے بات کرنے میں آسانی ہوگی۔
اور وہ امرا و روسا سے گفتگو کرنے کے لئے تیار ہو گیا۔

بادشاہ ہمایوں، ماہم بیگم اور خان زادہ بیگم نے اگلا سارا دن بھی بابر کے بستر کے قریب ہی کاٹ دیا۔

”مرزا ہمایوں محسوس کرتے ہیں کہ وہ آپ کے اس احسان عظیم کا بدلہ کبھی بھی نہ چکا سکیں گے“ ماہم بیگم نے یہ دیکھ کر کہا کہ بابر کی حالت قدرے بہتر ہے اور وہ اپنے قریبی عزیزوں سے بات چیت کرنے کا خواہاں معلوم ہو رہا ہے۔

”انہیں چاہئے کہ اس احسان کا بدلہ... اپنے... بچوں کو... چکا دیں“ بابر نے رک رک کر کہا۔

”ہم میں سے ...“ امیر تیمور کی ... آل اولاد ... میں سے ... زیادہ تر لوگ ... باہمی عداوتوں میں ... کام آئے ... پسر نے پدر کو قتل کر دیا ... برادر نے برادر کی جان لے لی ... سب کے سب ... غداری اور کیننگی کا شکار ہوئے ... ہم میں سے کچھ جو بہتر تھے، اپنی شرافت کا شکار ہو گئے ... مثلاً خان زادہ بیگم ... انہوں نے میری جان بچانے کی خاطر ... عمر بھر کی اسیری قبول کر لی۔ میری ہمیشہ نے مجھے ایثار سکھایا تھا۔ مرزا ہمایوں ... آپ کو بھی ... اپنے بھائیوں اور بچوں کو ایثار اور شرافت کا پیکر بنانا چاہئے۔“

باہر نے سرگھما کر بنگ کی دوسری طرف تے ہوئے سفید ریٹھی پردے پر نظریں جمادیں۔ ہمایوں نے اب کہیں جا کر دیکھا کہ پردے کے پیچھے کوئی آدمی بیٹھا ہوا ہے۔

”طاہر بیگ“ باہر نے کہا، ”میری کتاب تو اٹھا لائیے۔“

طاہر پردے کے پیچھے سے نکل کر دیوار کے طاق پر سے چری جزدان اٹھا لایا جس میں نئی جلد والی کتاب رکھی ہوئی تھی۔

”آپ کو یاد ہے تا فرزند عزیز،“ کابل کے قریب کو ہستانی علاقے میں آپ نے مجھ سے میری کتاب زندگی مانگی تھی۔ یہ لیجئے ... اب آپ اسے مکمل تصور کر سکتے ہیں، جیسی مجھ سے ممکن تھی ویسی لکھ دی ہے۔“

ہمایوں کو وہ الفاظ یاد آ گئے جو اس وقت اس کے والد نے کہے تھے: ”کتاب مکمل ہونے کے ساتھ ہی ساتھ میری زندگی بھی ختم ہو جائے گی۔“ اس نے باہر نامے کو دونوں ہاتھوں میں لے کر آنکھوں سے لگایا اور جلد کو چوم لیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور باہر نے ایک قطرہ اشک کو سنہری جلد پر گرتے دیکھا۔

”میری ایک درخواست ہے ... خیال رکھئے گا کہ اس کتاب کا آپ کی آئندہ نسلیں بھی مطالعہ کریں۔ میری غلطیوں کا اعادہ نہ کیجئے گا ... اپنے پہلے وطن سے اپنا رشتہ نہ توڑیے گا ... کون جانے، بہت ممکن ہے کہ یہ کتاب کبھی ہندوستان اور ماوراء النہر کو ایک دوسرے سے منسلک کر دے ...“

باہر اپنی کتاب کو وصیت نامے کی طرح چھوڑے جا رہا تھا۔ خان زادہ بیگم کے لئے ضبط کرنا ناممکن ہو گیا:

”باہر جان، میں تو آپ کی بڑی بہن ہوں ... آپ سے پانچ سال بڑی ہوں ... اگر کسی کو اس دنیا سے کوچ ہی کرنا ہے تو پہلے مجھے کرنا چاہئے۔ آپ کو دنیا سے نہ اٹھنا چاہئے، جہاں پناہ! ... باہر جان، برادر عزیز! نہیں! ہرگز نہیں!“

بابر خان زادہ بیگم کے منہ سے ”بابر جان“ سن کر اچانک تصور ہی تصور میں اپنے ایام طفلی کو لوٹ گیا، ایک لمحے ہی کے لئے کیوں نہ سہی لیکن لوٹ گیا۔ ”حضرت اور ”جہاں پناہ“ جیسے الفاظ جن سے غلامی آداب کے بموجب اسے خدام، بیگ، چیتا بیٹا اور حتیٰ کہ منظور نظر بیگم تک مخاطب کیا کرتے تھے، اس وقت ناقابل برداشت ہو گئے۔

”مرزا ہمایوں، آپ نے جانے کتنے برسوں سے مجھے ”اتا“ نہیں کہا۔“

ہمایوں اس عام لفظ کو استعمال کرنے کا ذرا بھی عادی نہیں رہ گیا تھا۔

”والد محترم“ ہمایوں نے کہا لیکن اسے فوراً ہی اندازہ ہو گیا کہ والد کو اس کے منہ سے کوئی اور

ہی لفظ سننے کی توقع ہے اور وہ کہہ اٹھا: ”اتا! اتا جان!“

”الوداع، میرے تخت جگر۔“

خواتین رو پڑیں۔

بابر کے اپنے عزیزوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہونے کے اسی دردناک لمحے میں حکیم یوسفی اندر داخل ہوا۔ اس نے دیکھا کہ بادشاہ کا جسم پسینے سے شرابور ہے اور وہ حلق کی خراہٹ کے ساتھ بمشکل ہی سانس لے رہا ہے۔

”آپ کو آرام کرنا چاہئے“ اعلا حضرت ”حکیم نے کہا اور سفید لمبل کا ٹکڑا لے کر بابر کے چہرے اور گردن کا پسینہ پونچھنے لگا۔ پھر اس نے خان زادہ بیگم اور ماہم بیگم کو دیوان خانے سے باہر چلے جانے کا اشارہ کیا۔

دونوں خواتین دبے پاؤں باہر نکل گئیں۔ تب بابر نے ہمایوں سے جس نے جھک کر اپنا کان اس کے ہونٹوں کے قریب کر دیا تھا، کہا:

”آپ بھی جاپیئے... فرزند عزیز... اب تو آپ کے شانوں پر جانے کتنی ہی ذمے داریوں کا بار آن پڑا ہے۔“

ہمایوں چپ چاپ اپنے والد سے لپٹ گیا، اس کی ہڈیلی انگلیاں چومیں اور وہ بھی باہر چلا گیا۔

تقریباً دو گھنٹوں کے بعد بابر نے طاہر کے ذریعے فضل الدین کو بلوایا۔

میر عمارت لب گور بابر کے چہرے کی طرف نہ دیکھنے کی کوشش کرتا ہوا ہانگ کے قریب آگیا۔

”اعلا حضرت، مجھے یقین ہے کہ آپ کے کارنامے آپ کو صدیوں تک زندہ رکھیں گے۔“

”اب مجھے اعلا حضرت کہنے کی ضرورت نہیں... تخت تو میں مرزا ہمایوں کو سونپ چکا ہوں۔“

”لیکن تخت شعر و سخن پر تو آپ اب بھی جلوہ افروز ہیں، عالی جاہ۔ ہرات میں ہم لوگ علی شیر

نوائی کو حضرت نوائی کہا کرتے تھے۔ آپ نے باصلاحیت لوگوں کو یکجا کرنے کے معاملے میں بھی اور ترکی زبان میں اپنی ادبی تخلیقات کے ذریعے بھی نوائی کی شاندار روایات کو آگے بڑھایا ہے۔ آپ نے ہماری زبان کو فارسی اور عربی کے جیسے بلند مقام پر پہنچا دیا ہے اور یہی وہ مقصد تھا جس کے حصول کے خواب میر علی شیر ساری زندگی دیکھتے رہے تھے۔“

”آپ کے ان نیک الفاظ کے لئے میں آپ کا شکر گزار ہوں، میر عمارت صاحب۔ اور آپ نے اگرے اور سیکری میں عالی شان محل تعمیر کئے ہیں۔ ایسے باغات کی بنیاد رکھی ہے جو رشک جنگ ہیں۔ اگر پروردگار نے مجھے زندگی کے کچھ دن اور عطا کر دیئے۔ تو میری دلی آرزو ہے کہ آپ کی عمرانی میں۔۔۔ ایک مدرسہ۔۔۔ تعمیر کراؤں۔۔۔ سرقد میں بی بی خانم مدرسے کی عمارت کتنی شاندار اور عجیب و غریب ہے۔ میری ہمشیرہ بھی اس قابل ہیں۔۔۔ کہ ہم ان کے۔۔۔ نام کو کثرت جاوداں عطا کریں۔۔۔“

فضل الدین یہ دیکھ کر کہ باہر اپنی بچی کچی قوت استعمال کر کے باتیں کر رہا ہے، خود بڑی گرجوٹی کے ساتھ، جان بوجھ کر جلدی اور تفصیل کے ساتھ باتیں کرنے لگا:

”دراصل خوبصورت عمارتوں کو خواتین کے نام دے کر ان کی شان دوبالا کرنے کا ہمارے ہاں زمانہ قدیم سے ہی رواج رہا ہے۔ سرقد کا مدرسہ بی بی خانم اور مقبرہ تومان آقا ان دونوں کے دلوں کی پاکیزگی اور فرشتہ خوی کو شہرت عطا کر رہے ہیں۔ ہندوؤں میں بھی عورتوں کو بہت عزت دی جاتی ہے اور وہ جن کی عبادت کرتے ہیں ان میں دیوتاؤں کے علاوہ لکشمی، پاروتی اور درگا جیسی دیویاں بھی شامل ہیں۔ وشنو بھگوان کی بیوی کے نام ہیں لکشمی، شری اور کل جن کے معنی ہیں کہ وہ خوش بختی عطا کرتی ہیں۔“

”میر عمارت صاحب، میری ہمشیرہ خان زادہ بیگم۔۔۔ آپ جانتے ہیں۔۔۔ بے رحم زمانے نے۔۔۔ آپ دونوں کو خوش قسمت نہیں ہونے دیا۔۔۔“ یابر دوبارہ گفتگو کے اصل موضوع پر لوٹ آیا، ”وہ بہت ہی غیر معمولی خاتون ہیں۔۔۔ اگر وہ مدرسہ جس کا آپ خواب دیکھتے رہے ہیں۔۔۔ تعمیر کیا جائے۔۔۔ تو اس کا نام۔۔۔ خان زادہ بیگم مدرسہ۔۔۔ رکھے گا۔“

”آپ نے میرے دل کی بات کہہ دی۔۔۔ یہ تو میرا سب سے اہم اور مقدس خواب ہے“ فضل الدین نے سادگی سے کہا۔ ”اگر اس خواب کی تکمیل کے لئے میری زندگی ناکافی ثابت ہوئی تو میں دنیا کو الوداع کہتے وقت یہ کام اپنے بیٹے کے سپرد کر جاؤں گا۔ وہ ہندوستانی معماروں کے ساتھ مل کر اس یادگار عمارت کو تعمیر کرے گا جسے ہماری دونوں قوموں کی طرف سے قلب نسواں کی عظمت کو

ایک حقیر خراج تحسین کی حیثیت سے حاصل ہوگی۔“
 بارپینے پینے ہوا جا رہا تھا سفید ریٹھی لباس جسم سے چپک گیا تھا۔
 ”ماموں جان“ طاہر نے گھبرا کر کہا۔ ”حکیم صاحب نے سخت تائید کی تھی کہ عالی جاہ کو تھکایا
 اور پریشان نہ کیا جائے۔“

فضل الدین نے اتفاق رائے کے طور پر سر ہلایا اور جھک کر بابر کے ہاتھ کا بوسہ لے لیا۔ بار نے
 انگلیوں کے اشارے سے فضل الدین کو کچھ اور قریب بلا کر چپکے سے کہا:
 ”آپ سے... ایک اور بھی درخواست ہے... کابل میں پہاڑی چوٹی پر... ایک باغ ہے... آپ
 کا لگایا ہوا... میری ابدی آرام گاہ... وہیں بنائی جائے... وہ شان و شوکت... کی جگہ نہیں... لیکن
 ... وہاں سے... وادی کا... نظارہ... بے حد خوبصورت لگتا ہے۔“

آنسوؤں سے فضل الدین کا دم کھٹکتے کھٹکتے پچا۔ اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا اور
 اثبات میں سر ہلا کر تقریباً بھاگتا ہوا خواب گاہ سے باہر نکل گیا۔

طاہر نے بابر کے کپڑے تبدیل کر دیئے... وہ تیماردار کے فرائض بڑے سکون کے ساتھ انجام
 دے رہا تھا۔ دوائیں دیتا تھا، پیاس لگنے پر پانی پلاتا تھا، سانس لینے میں آسانی ہونے کے لئے پٹکھا
 جھلتا تھا۔ سارے کام وہی انجام دے رہا تھا، کسی اور کو پٹنگ کے پاس ہی نہیں آنے دیتا تھا۔

اس رات بابر کے کمرے میں بڑی گھنٹن تھیں، فضا عجب بو جھل سی ہو رہی تھی۔ طاہر نے خدمت
 گاروں کو بلایا جنہوں نے اس پٹنگ کو جس پر بابر لیٹا ہوا تھا، برآمدے میں پہنچا دیا۔

ہواؤں میں اند جان کے موسم بہار کی جیسی ہلکی ہلکی سرودی کا احساس ہو رہا تھا۔ آسمان کی تاریک
 وسعتوں میں ستارے تابندگی بکھیر رہے تھے۔ یہ ستارے کسی گرداب مسلسل میں چکر کاٹ رہے
 تھے، ایک دوسرے سے ٹکرا رہے تھے۔ کتنا مہیب تھا یہ نظارہ! بابر نے آنکھیں بند کر کے طاہر کو
 آواز دی:

”جسم سن ہوا جا رہا ہے...“

طاہر نے دھیرے دھیرے بابر کے شانوں اور ہاتھوں پیروں کی مالش کی۔ بابر کو قدرے آرام مل
 گیا اور اس نے ہمت کر کے ایک بار پھر آسمان کی طرف دیکھا۔

ستارے اب اپنی اپنی جگہوں پر ٹھہرے ہوئے تھے، آسمان کی سیاہ بلندیوں میں بڑے سکون کے
 ساتھ نور بکھیر رہے تھے۔ بابر کی نگاہوں نے دب اکبر، قطب تارے اور کنکشاں کو تلاش کر لیا۔

طاہر بھی ان تاروں کی طرف دیکھنے لگا:

”ذرا اس طرف تو دیکھئے، ہمارے قوامیں بھی کھکشاں ایسی ہی نظر آتی ہے۔“

بابر کے تصور نے اسے اندجان میں، بچپن کے بھولے بسرے ایام میں پہنچا دیا۔

کبھی کم سن ظہیر الدین نے سنا تھا کہ کھکشاں دراصل ہیرے کا کوئی پتنگ ہے جو آسمانی ہواؤں میں اپنی ہیرے کی دم کو مزے سے لہراتا ہوا بلند، کچھ اور بلند ہوتا جاتا تھا لیکن کسی غیر مرعی دور کے ذریعے قطب تارے سے بندھے ہونے کے باعث زیادہ دور تک نہیں جاسکتا تھا۔ بچوں کا یہ قصہ ایک بار پھر بابر کے کانوں میں گونجنے لگا۔ لیکن یہ بات کہ آگرے میں آسمان اور ستارے بالکل اسی حالت میں تھے جیسے کہ اس کے زندگی میں قدم رکھتے وقت اندجان میں تھے، اس کے لئے آخری تسکین دہ بات ثابت ہوئی۔ بابر نے بچپن کی دنیا میں اپنی وابستگی کو شیریں کو تھام لینے کی کوشش کی لیکن اچانک تشنج نے اس کے بے جان جسم کو جھنجھوڑ ڈالا۔ تاروں بھرا آسمان ایک بار پھر گرداب میں تبدیل ہو گیا۔ یہ گرداب اس کے اوپر ڈھے پڑا اور اسے اپنے ساتھ دور بہت دور تاریک خلاؤں میں بہا لے گیا...

اختتامیہ

میر عمارت فضل الدین نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں اس مقبرے کی تعمیر تو مکمل کر لی جس کے متعلق بابر نے اپنے انتقال سے قبل اس سے کہا تھا لیکن وہ خان زادہ بیگم کے اعزاز میں مدرسہ نہ تعمیر کرسکا... اس غیر معمولی خاتون کی یاد کو پتھروں کی عمارت کی شکل میں جاوداں کر دینے سے متعلق فضل الدین کے خواب کو تقریباً سو برسوں کے بعد عظیم ہندوستانی معماروں نے آگرے میں ایک دوسری خاتون ممتاز محل کی یاد میں مشہور و معروف تاج محل کی تعمیر کے ذریعے شاید حقیقت میں بدل دیا...

طاہر اپنے ماموں کو کابل میں سپرد خاک کرنے کے بعد ہمایوں کے حکم کے بموجب بابر نامے کی نقلیں لے کر سمرقند، تاشقند اور اندجان گیا جہاں انہیں اہل علم کو سوچ دیا۔ طاہر اور رابعہ نے اپنی زندگی کے آخری ایام کابل میں گزارے۔ ان کا بیٹا سفر میر عمارت کے بیٹے کے ساتھ آگرے ہی میں رہ گیا تھا۔ ان دونوں نے ہندوستان ہی میں شادیاں کیں اور ان کے ورثا مقامی لوگوں میں گھل مل گئے۔

بابر کے انتقال کے دس برسوں کے بعد ہمایوں نے ایک حسین و جمیل خاتون حمیدہ بیگم سے شادی

کی اور اس کے بطن سے تولد ہونے والے بیٹے کا نام جلال الدین اکبر رکھا۔ ماہم بیگم اس سے قبل ہی بیٹے میں جلا ہو کر دنیا سے اٹھ چکی تھی۔ خان زادہ بیگم البتہ زندہ تھی اور اکبر دو سال کا ہو گیا تو اس کی پرورش خان زادہ بیگم ہی کی نگرانی میں ہونے لگی۔ وہ بچے کو پیار کرتے وقت اکبر کہا کرتی تھی: ”ارے شہزادے، آپ تو اپنے دادا جان مرحوم کی جیتی جاگتی تصویر ہیں۔ میرے بھائی بابر جان دو سال کی عمر میں بالکل آپ ہی جیسے لگتے تھے۔ آپ کا ناک نقشہ ہی نہیں بلکہ ہاتھ پاؤں تک بالکل انہی کے جیسے ہیں!“

اکبر اپنے دادا سے محض شکل و صورت کے اعتبار ہی سے مشابہ نہ تھا بلکہ اسے دادا سے جو اپنے عہد کا ایک ممتاز مدبر تھا، اعلا وارفع انسانی صفات اور ہمہ پہلو صلاحیتیں بھی ورثے میں ملی تھیں۔ اکبر، اس کی جیتی بیگم جو دھا بائی اور اس عہد کے دیگر ممتاز افراد کی زندگیوں اور مقدروں کی مصنف نے اپنی اگلی تصنیف میں عکاسی کرنے کی کوشش کی ہے جو ازبیک زبان میں شائع ہو رہی ہے۔

یہاں مصنف بابر کے انتقال کے بعد اس کے متعلق قائم کر لئے جانے والے طرح طرح کے تصورات کے بارے میں مختصراً ”اپنے خیالات کے اظہار کی اجازت چاہتا ہے۔ مثال کے طور پر اسی حقیقت کو لے لیا جائے کہ بابر کو دنیا کے مختلف ممالک میں شہرت ہندوستان میں عظیم مظلوم کی سلطنت کے بانی ہی کی حیثیت سے حاصل ہوئی اور وہ اپنے پیچھے ادبی تخلیقات کا جو ورثہ چھوڑ گیا تھا اس سے خاصے طویل عرصے تک زیادہ تر لوگ ناواقف ہی رہے۔ نام نہاد ”عظیم مغل“ کا تصور جو گزشتہ دو صدیوں سے تاریخ میں عام ہے، دراصل حقائق کا مذاق اڑانے کے مترادف ہے۔ وہ اس لئے کہ بابر کی سلطنت کو اس کی خود نوشت سرگزشت میں، اس کے خاندان کے حکمرانوں کی سرکاری دستاویزات میں اور اس عہد کے مورخین کی تصانیف میں۔ کہیں بھی مغل سلطنت نہیں کیا گیا۔ بابر اور اس کے اغلاف خود کو ترک اور آل تیمور کہتے تھے کیونکہ ان کے تمام آباء و اجداد ترکی بولنے والے برلاس قبیلے سے تعلق رکھتے تھے جس کے ہزاروں افراد آج بھی وسط ایشیا میں آباد ہیں۔

یہ محض اتفاقی بات نہ تھی کہ بابر کی ترکی شاعری اور خاص طور سے اس کی آپ بیتی نے ادبی ازبیک زبان کی تشکیل میں بہت ہی نمایاں کردار ادا کیا۔ بابر کی آپ بیتی کی زبان نہ صرف یہ کہ بول چال کی ازبیک زبان سے بہت قریب تھی بلکہ سادہ و قابل فہم ہونے کی بناء پر اپنے عہد سے اتنی زیادہ آگے بھی تھی کہ موجودہ ازبیکستان میں ساتویں درجے کے اسکولی بچے تک اپنے نصاب میں

شامل بابر نامے کے حصوں کو کسی خاص دشواری کے بغیر ہی سمجھ لیتے ہیں۔

ایران اور افغانستان جیسے ہمسایہ ممالک میں بابر کی تخلیقات سے نسبتاً زیادہ واقفیت ہونے کی بنا پر بابر کو کبھی بھی مغل نہیں کہا گیا۔ لیکن ان مغربی ممالک میں جہاں بابر کے ادبی ورثے سے لوگ عرصے تک ناواقف رہے، اسے غلطی سے ”عظیم مغل“ کہا جانے لگا۔ ہندوستان میں انگریزوں کی نوآبادیاتی حکومت کے دوران جس کے راستے میں بابر اور اکبر کی قائم کردہ طاقتور اور اقتدار اعلیٰ کی حامل سلطنت کی ماضی کی شہرت حائل ہو رہی تھی (خاص طور سے ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے بعد) اس نام نے اور بھی زیادہ مضبوطی کے ساتھ جڑیں پکڑ لیں۔

اہمیت ظاہر ہے کہ نام کی نہیں بلکہ اس حقیقت کی ہے کہ یہ سلطنت تین صدیوں تک قائم رہی اور صرف ہندوستان ہی کی نہیں بلکہ دنیا کی تاریخ پر ایسے تہذیبی اور تمدنی نقوش چھوڑ گئی جو لافانی ہیں۔

بابر کی نسل دنیا میں باقی نہ رہ سکی۔ اس کی آخری نشانیں معمر بہادر شاہ کے دو بیٹوں اور ایک ننھے پوتے کو ۱۸۵۷ء میں انگریز افسر مدسن نے بے رحمی کے ساتھ قتل کرا دیا تھا۔ لیکن زندگی کے اضطراب سے معمور بابر کی لافانی غزلیں آج بھی ازبیکستان میں شادی جیسی پر مسرت تقاریب میں گائی جاتی ہیں۔ تاشقند کی روش شعرا پر بابر کا مجسمہ بھی لگا ہوا ہے۔ اکبر کے عہد میں بابر نامے کا ترکی سے فارسی میں ترجمہ کیا گیا تھا۔ بعد میں اس کے ترجمے اردو، انگریزی، جرمن، فرانسیسی اور دیگر زبانوں میں ہوئے اور دنیا کے بہت سے ممالک میں علما اور ناقدین نے اس کی قدر و قیمت کا تعین کیا۔

بابر کی تخلیقات کو اس سرزمین میں جہاں وہ پیدا ہوا اور پروان چڑھا تھا، بالکل فطری طور پر خصوصیت سے مقبولیت حاصل ہے۔ یہاں کئی اسکولوں اور شاہراہوں کے نام بابر کے نام پر رکھے گئے ہیں۔ بابر کی تخلیقات جنہوں نے ازبیک ادبی زبان کی تشکیل میں نہایت ہی اہم کردار ادا کیا تھا، ازبیک ادبیات عالیہ میں شمار کی جاتی ہیں اور انٹرنیٹ یوٹیوٹوں کے نصاب میں شامل ہیں۔

بابر کے ادبی ورثے کو ہندوستان میں بھی تہذیبی دولت تصور کیا جاتا ہے۔ ہندوستانی عوام کے عظیم فرزند جو ہر لال نہرو نے بابر کی آپ بیتی کے مطالعے کے بعد کہا تھا کہ بابر ایک دلکش شخصیت کا مالک اور نشاۃ الثانیہ کے دور کا ایک ممتاز نمائندہ تھا۔ مشہور ہندوستانی ادیب ملک راج آنند نے بابر نامے کے متعلق یہ رائے ظاہر کی تھی: ”یہ دنیا کی دلکش ترین کتابوں میں سے ایک ہے۔ اسے مصوروں نے چھوٹی چھوٹی تصاویر سے یوں ہی تھوڑی آراستہ کیا تھا۔ یہ تو ہم سب کی دولت ہے۔“

نادر صلاحیتوں اور غیر معمولی مقدر کا حامل یہ شخص جسے دنیا سے اٹھے چار سو پچاس سال سے
زائد مدت گزر چکی ہے، اپنی تخلیقات کی بدولت ہمیشہ یاد کیا جاتا رہے گا۔

(۱۹۶۹ء - ۱۹۸۳ء)

تہماق۔ ایک ترک قبیلہ

☆ قورچی باشی۔ محافظہ دسے کا سردار۔

☆☆ بے قسم۔ دھاری دار۔ بٹنی کپڑا۔

☆ میزان ان دنوں اس علاقے میں رائج ہفتی سال کا ایک مہینہ۔ ۲۲ ستمبر تا ۲۲ اکتوبر

☆☆ کاشین۔ ناکل

☆ قوچینی۔ ترک قبیلے قوچین سے تعلق رکھنے والا۔

☆ واقعی یہ جبرہ اوش میں چار سو سے زائد برسوں تک برقرار رہا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ہی ساتھ اس کے گنبد کی چمک دمک ماند پڑ گئی، دیواروں پر بنے ہوئے گل بونے مٹ گئے اور رنگ برنگ سنگ مرمر پتھریوں چاقوؤں کے دسے بنانے میں کام آیا۔ اب اس کے صرف کھنڈری باقی رہ گئے ہیں۔ یادگار کی بحالی کی تجویز زیر غور ہے جسے امید ہے کہ عملی جامہ پہنا دیا جائے گا۔ (مصنف)

☆ بارہ ہائیوں کو تخت و تاج سوچتے وقت امرا اور بیگمیں سے جو کچھ کہا تھا اسے کل بدن بیکم نے اپنی تصنیف ”ہمایوں نامہ“ میں تفصیل کے ساتھ قلم بند کر دیا تھا۔ اس نے اس بات کا خاص طور سے تذکرہ کیا تھا کہ بارہ ہائیوں کو اپنے سلطنت کی باگ دوڑ سونپ دینے کا فیصلہ بہت پہلے ہی کر لیا تھا اور وہ اپنی زندگی کے باقی ایام باغ و زراعت میں گزارنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ مصنف۔

☆ جنگ سے قبل رانا سنگرام سنگھ کو بارہ کے کچھ فوجی سالاروں اور حاکموں کے خلاف حاصل ہونے والی کامیابیوں کی طرف اشارہ ہے۔

☆ اس زمانے میں سکراں کی جان لینے کی کوشش کو سنگین ترین جرم تصور کیا جاتا تھا اور مجرمین کو شدید جسمانی اذیتوں کے ذریعے ہلاک کئے جانے کی سزا دی جاتی تھی۔ بملوں کی جیتے جی کھال کھینچ لی گئی تھی، احمد کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے گئے تھے اور محل میں زہر پھینکانے والی کینز کو بھروسے ہوئے ہاتھی کے پیروں سے روندوا دیا گیا تھا۔

☆ قزل باش (ترکی)۔ لفظی معنی سرخ سر۔ شاہ اسماعیل نے اپنے لشکریوں کے لئے بارہ گوشوں والی سرخ ٹوپیاں بنوائی تھیں اس لئے ان کا نام قزل باش پڑ گیا تھا۔ بعد میں ان سپاہیوں کی اولاد بھی قزل باش کہلائی۔

☆ یہ قصبات شاہ اسماعیل کے مخالفین نے بیان کی ہوتیں قرآن کی صداقت پر شک کیا جاسکتا تھا لیکن ان کا تذکرہ شاہ کے ایک
خیر خواہ کی تعریف "تاریخ عالم آرائے عباسی" اور خاند میر کی تعریف "میب اللیر" میں کیا گیا ہے۔

☆ یہ اس مشکل کی طرف اشارہ تھا جسے شیانی نے اس بات پر طر کرنے کے لئے اپنی کے ذریعے شاہ کو بھجوا یا تھا کہ اسماعیل
ایک درویش کے خاندان سے قتل رکھتا ہے۔

☆ اسکی بازی۔ حاضر جوابی کا مقابلہ۔

☆ قارا کوڑ۔ پاہ چٹم۔

☆ نوا اور صوت۔ ازبیک کلاسیکی موسیقی کے مقام۔

☆ قتال۔ تقریباً ۱۸۶۸ء کو۔

☆ بیجوں۔ موجودہ دریائے امو۔

☆ ماہم بیگم کا یہ خواب سچ ثابت ہوا اور گل بدن بیگم نے سن شعور کو پہنچنے کے بعد اپنے والد کے نقش قدم پر پہنچے ہوئے نثر میں
تذکرہ لکھا۔ یہ گل بدن کے بڑے بھائی ہمایوں کی سوانح عمری تھی "ہمایوں نامہ"۔ یہ تذکرہ نویسی کی صنف میں اس زمانے کی کسی مسلمان
خاتون کی قلم بند کی ہوئی واحد تعریف ہے۔